مطالعۂ تاریخ

حصۂ دوم

تالیف

آرنلڈ جے۔ ٹائن بی

تلخیص

ڈی۔ سی۔ سومر ویل

ترجمہ

غلام رسول مہر

مجلس ترقیٔ ادب

۲۔ کلب روڈ۔ لاہور

مطالعهٔ تاریخ

حصهٔ دوم

مطالعۂ تاریخ

حصۂ دوم

تالیف

آرنلڈ - جے - ٹائن بی

تلخیص

ڈی - سی - سومرویل

ترجمہ

غلام رسول مہر

○

مجلس ترقیٔ ادب

۲- کلب روڈ - لاہور

طبع اول : مارچ ، ۱۹۶۳ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج (ستارۂ امتیاز)
ناظم مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

مہتمم : محمد ذوالفقار خاں

قیمت : [illegible] روپے

With thanks to and the kind
permission of
Oxford University Press

به اجازت و شکریه آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

فہرست مضامین

ساتواں حصہ

ہمہ گیر مذہبی نظام

آٹھواں حصہ

سورماؤں کے زمانے

نواں حصہ
تہذیبوں کے درمیان مکانی تعلقات

صفحات

دسواں حصہ

تہذیبوں کے درمیان زمانی تعلقات

گیارھواں حصہ

تاریخ میں قانون اور آزادی

صفحات

بارھواں حصہ

مغربی تہذیب کے متعلق امیدوں کا نقشہ

تیرھواں حصہ

خاتمۂ سخن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ مترجم

یہ مسٹر آرنلڈ جے - ٹائن بی کی شہرۂ آفاق کتاب ''مطالعۂ تاریخ'' کی تلخیص کے دوسرے حصے کا ترجمہ ہے - تلخیص کا پہلا حصہ کتاب کی ابتدائی چھ جلدوں کے مطالب پر مشتمل تھا، موجودہ حصے میں آخری چار جلدوں (از ہفتم تا دھم) کے مطالب کو سمیٹا گیا ہے اور خود مسٹر ٹائن بی نے تلخیص کے متعلق جو کچھ بہ طور تحسین فرما دیا ہے، اس سے زیادہ کوئی اور شخص کیا کہہ سکتا ہے -

میں نے پہلی جلد کے ترجمے کا دیباچہ لکھتے وقت مصنف کی شخصیت اور علم و فضل نیز کتاب کی اہمیت کے متعلق جو کچھ عرض کر دیا تھا، اس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں اور اعادہ مناسب بھی معلوم نہیں ہوتا، البتہ یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ میرے اندازے کے مطابق پہلی جلد کی طرح پیش نظر جلد بھی مختلف پہلوؤں سے نہایت اہم مطالب کی حامل ہے، خصوصاً اس کا آخری حصہ تو اتنا اہم ہے کہ ہر پڑھے لکھے فرد کو اس کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہیے - ممکن ہے ہر شخص کو مصنف کے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق نہ ہو لیکن اس کی بالغ نظری، دقیقہ سنجی اور وسعت معلومات میں کسی کے لیے بھی کلام کی گنجائش باقی نہیں رہتی -

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا، پھر کہتا ہوں کہ مصنف کے مخصوص انداز بیان نے اس کتاب سے استفادۂ عام کو بہت مشکل بنا دیا ہے - وہ عجیب و غریب تلمیحات کا شیدائی ہے، خصوصاً اساطیری تلمیحات کا، جن سے اس نے بے تکلفی کے ساتھ کام لیا ہے؛ پھر معروف کے بجائے کم معروف

بلکہ غیر معروف اصطلاحات و تراکیب اس افراط سے استعمال کرتا ہے کہ عام خوانندہ اس کے گراں بہا افکار سے محظوظ نہیں ہو سکتا بلکہ کتاب کا مطالعہ جاری نہیں رکھ سکتا۔ تصنیف و تالیف کا مدعا تفہیم و توضیح ہوتا ہے نہ کہ نمائش و تظاہر علم مگر مسٹر ٹائن بی کی توجہ اول الذکر کے بجائے آخر الذکر پر بدرجہا زیادہ مبذول رہتی ہے۔ حد یہ ہے کہ جہاں بیان کو مشکل بنانے کے عام وسائل اس کی مساعدت نہیں کرتے، وہاں وہ لاطینی، یونانی، فرانسیسی یا کسی دوسری اجنبی زبان کے ٹکڑے بے تکلف لے آئے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علم میں درجۂ کمال حاصل کر لینے کے بعد موصوف کو اپنے انداز بیان کے مشکل ہونے کا احساس نہیں رہا ورنہ وہ کبھی ایسا طریقہ اختیار نہ کرتا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس کتاب کا آخری حصہ بہ وجوہ بے حد اہم ہے، اس میں ان مسائل پر بحث کی گئی ہے جن سے عالم انسانیت کو گہرا تعلق ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس حصے کا مطالعہ اکثر اصحاب کو پیش نظر مسائل پر صحیح اصول کے مطابق غور و خوض میں گراں قدر امداد دے گا۔

پہلی جلد کی طرح پیش نظر جلد کے ترجمے میں بھی میں نے متن کے نظم و استعارات کو انتہائی احتیاط سے برقرار رکھا ہے اور پوری کوشش کی ہے کہ کہیں نظم ٹوٹنے نہ پائے۔ جہاں جہاں توضیحی حواشی ضروری تھے، کم سے کم لفظوں میں لکھ دیے تاکہ خوانندۂ کتاب کو کہیں دقت پیش نہ آئے لیکن ظاہر ہے کہ ایسے حواشی کا دائرہ بہت محدود تھا اور پوری کتاب جن تشریحات و امثلہ کی محتاج ہے، وہ ترجمے کے دائرے سے سے متجاوز تھیں۔

مسلم ٹاؤن۔ لاہور

۳۰- جولائی ۱۹۵۸ء

مہر

نوٹ :— کتاب میں جو حواشی ''مرتب'' کے ہیں ان کے آگے مرتب لکھ دیا ہے، باقی تمام حواشی مترجم کے ہیں۔

دیباچۂ مصنف

میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے دو مرتبہ مسٹر سومرویل کی رفاقت میسر آئی۔ میری کتاب "مطالعۂ تاریخ" کی پہلی چھ جلدوں ——— یکم تا ششم ——— کی تلخیص کے بعد انھوں نے آخری چار جلدوں ——— ہفتم تا دھم ——— کے سلسلے میں بھی یہی ہنرمندانہ کام انجام دے دیا۔ اب خوانندۂ کتاب کے سامنے "مطالعۂ تاریخ" کی مکمل، یکساں اور یک رنگ تلخیص موجود ہے اور یہ تلخیص ایک ایسے فرد کے ہاتھوں مرتب ہوئی جس نے نہ صرف مطالب پر کامل دسترس حاصل کی بلکہ مصنف کے نقطۂ نگاہ اور غرض و غایت کو بھی پوری طرح سمجھ لیا۔

تلخیص کے دوسرے حصے کی ترتیب میں مسٹر سومرویل اور خود میں پہلے کی طرح اکٹھے کام کرتے رہے۔ اشاعت سے پیش تر مسٹر سومرویل کے مسودے پر نظر ڈالتے وقت شاذ ہی مجھے کسی ایسے ٹکڑے کو شامل کر لینے کے لیے کہنا پڑا جسے وہ نظر انداز کر چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کی کتاب میں سے کن کن حصوں کو نظر انداز کر دینا احسن ہے ——— اور مسٹر سومرویل کو اس سلسلے میں حیرت انگیز بصیرت نصیب ہوئی ہے ——— اور یہ پہلو ہر اس شخص پر بہ خوبی روشن ہو گیا ہوگا جس نے تلخیص کے پہلے حصے اور اصل کتاب کا مقابلہ کیا ہے۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میں نے اپنی توجہ صرف ان حصوں تک محدود رکھی جو انھوں نے تلخیص میں لے لیے؛ اس طرح وہ حصے میرے بھی رہے اور ان کے بھی ہو گئے۔ یہ

کام چنداں مشکل نہ تھا اس لیے کہ مسٹر سومرویل نے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میرے مطالب کا خلاصہ پیش کرتے وقت میرے الفاظ کو بہت بڑی حد تک قائم رکھا ہے۔ جہاں انھوں نے کہیں کہیں اپنے نکات و توضیحات کا اضافہ کیا ہے، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے جوڑ مجھ سے ملا دیا ہے۔

میری کتاب بہت طویل ہے اور زمانہ ایسا ہے کہ لوگوں کی دوسری مصروفیات بہت بڑھی ہوئی ہیں، ایسی حالت میں یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ میری کتاب کی تلخیص اعلیٰ پیمانے پر مرتب ہوگئی اور مسٹر سومرویل کی مرتبہ تلخیص کی حیثیت یہی ہے۔ اس طرح کتاب کے مطالب ان شائقین کی دسترس میں بھی آگئے جو اصل کتاب کو پڑھنے کی زحمت نہیں اٹھا سکتے یا ان کے پاس پڑھنے کے لیے وقت نہیں۔ میرے نزدیک اصل کتاب اور تلخیص ایک دوسری کا تکملہ ہیں؛ مجھے امید ہے کہ تلخیص کے دوسرے حصے کو پڑھنے والوں میں سے بعض اصل کتاب میں ضرور غوطہ لگائیں گے اگرچہ پوری کتاب نہ پڑھ سکیں جس طرح کہ تلخیص کا پہلا حصہ پڑھنے والوں میں سے بعض نے کیا تھا۔ اصل کتاب کو پڑھنے والے جواں مرد تلخیص پر نظر ڈالیں گے تو اسے بدیں وجہ بہت مفید پائیں گے کہ اس سے کتاب کے عام عمل استدلال اور اس کی وضع و ترکیب معلوم ہو سکے گی۔ مسٹر سومرویل نے دس جلدوں کی تلخیص میں جہاں اپنی سبک دستی اور مشاقی کا بہترین مظاہرہ کیا، وہ اختتامی حصہ ہے۔

تلخیص کے دونوں حصوں کے دوران میں میرے ساتھ ان کا تعاون حد درجہ خوش گوار تھا۔

آرنلڈ۔ جے۔ ٹائن بی

یکم دسمبر ۱۹۵۵ء

نوٹ

(از مرتب تلخیص)

تلخیص کی اس جلد کا آغاز اصل کتاب کے چھٹے حصے اور تیئسویں باب سے ہوتا ھے - یہ اس حقیقت کی یاد دھانی ھے کہ یہ پوری کتاب نہیں بلکہ اس کا آخری حصہ ھے - جو شخص پہلے حصے کو پڑھے بغیر موجودہ حصے کا مطالعہ شروع کر دے گا، اسے ویسی ھی مشکلات سے سابقہ پڑے گا جیسے کہ ملکہ وکٹوریا کے دور کے کسی تین جلد والے افسانے کی تیسری جلد شروع کر دینے پر اسے پیش آ سکتی تھیں - اس جلد کے آخر میں خلاصۂ مطالب ھے جس میں پوری کتاب کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دیا گیا ھے؛ یہ خاکہ ان اصحاب کے لیے یقیناً مفید ھوگا جو مسٹر ٹائن بی کے ''مطالعۂ تاریخ'' کا ابتدائی حصہ اصل میں یا تلخیص کی شکل میں پڑھ چکے ھیں مگر پورے مطالب ان کے ذھن میں محفوظ نہیں رھے -

میں اس کتاب کے اشاریے کی ترتیب کے لیے مس او - پی - سیلف[1] کا ممنون ھوں -

(ڈی - سی - ایس)[2]
۱۹۵۵ء

۱- Miss O. P. Self -

۲- D. C. Somervell -

چھٹا حصہ

ہمہ گیر سلطنتیں

تیئیسواں باب

مقاصد اور ذرائع

اس کتاب کا آغاز مطالعۂ تاریخ کے لیے ایسے دوائر کی تلاش سے ہوا تھا جو بجائے خود اپنے مکانی و زمانی حدود میں قابل فہم ہوں اور ان کے سلسلے میں خارجی تاریخی واقعات کے حوالے دینے کی ضرورت پیش نہ آئے - ایسی کافی بالذات اکائیوں کی تلاش کرتے ہوئے ہم معاشروں کی اس صنف پر پہنچ گئے تھے جنھیں تہذیبیں کہا جاتا ہے اور اب تک اس مفروضے کی بنا پر کار فرما رہے ہیں کہ جن اکیس تہذیبوں کا سراغ لگانے میں ہم کامیاب ہوئے اُن کی پیدائش ، نشو و ارتقا ، شکست اور انحلال کے تقابلی مطالعے میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو تاریخ انسانیت میں کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتا ہے اور تاریخ انسانیت کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب قدیم معاشروں کے غبار سے پہلی تہذیب چہرہ کشا ہوئی تھی ، لیکن وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے ایسی علامتیں بھی آتی رہیں کہ ہماری یہ پہلی ہر قفلی کلید اُن تمام دروازوں کو کھولنے میں کارآمد نہیں ہو سکتی جن سے گزرے بغیر ہمارا یہ ذہنی سفر منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا -

جن تہذیبوں کے وجود سے ہم متعارف تھے اُن کا تعین کرتے وقت ابتدائی مراحل ہی میں ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اُن میں سے بعض کے درمیان ابویت اور ابنیت کا تعلق ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تعلق کی شہادتیں ایک مقتدر اقلیت ، ایک داخلی پرولتار اور ایک خارجی پرولتار کے بعض مخصوص مجلسی حاصلات میں پائی جاتی ہیں ، جن میں اصل معاشرہ بہ دوران انحلال منقسم ہوا - ہم نے دیکھا کہ مقتدر اقلیتوں نے وہ فلسفے پیدا کیے جو بعض اوقات ہمہ گیر سلطنتوں کے لیے تحریک کا باعث بنے - داخلی پرولتار نے وہ اعلیٰ مذہب پیدا کیے جنھوں نے ہمہ گیر کلیساؤں کی حیثیت اختیار کرنی

چاهی اور خارجی پرولتار نے دور هائے شجاعت پیدا کیے ، جنھیں بربری جنگجوؤں کے المیے قرار دیا جا سکتا ہے - بہ حیثیت مجموعی یہ تجربے اور یہ ادارے بہ ظاهر سابق ولاحق تہذیبوں کے درمیان ایک اتصالی کڑی کی حیثیت رکھتے هیں -

معہذا دو غیر معاصر تہذیبوں کے درمیان یہی اتصالی کڑی نہیں ، جو همہ گیر سلطنتوں ، همہ گیر کلیساؤں اور دور هائے شجاعت کے تقابلی مطالعے سے بروے کار آتی ہے ؛ تہذیبیں شکست کے بعد جن اجزاء میں انحلال پذیر هوتی هیں وہ آن اجنبی عناصر سے مجلسی اور ثقافتی تعلقات پیدا کر لینے میں بھی آزاد هوتے هیں جو انھوں نے دوسری معاصر تہذیبوں سے حاصل کیے - بعض همہ گیر سلطنتیں اجنبی معماران سلطنت کی صنعت گری کا نتیجہ تھیں ، بعض اعلیٰ مذاهب میں اجنبی تاثرات کی روح صاف نظر آتی ہے اور بعض بربری جنگجوؤں نے اجنبی ثقافت کا اثر قبول کیا -

یوں همہ گیر سلطنتیں ، همہ گیر کلیسا اور دور هائے شجاعت معاصر اور غیر معاصر تہذیبوں کے درمیان اتصال پیدا کر دیتے هیں - اب سوال پیدا هوتا ہے کہ کیا هم انھیں کسی ایک تہذیب کے انحلال کا محض ضمنی حاصل قرار دینے میں حق بجانب هیں ؟ یا کیا همیں خود ان کی حقیقی حیثیت معلوم کرنے کی کوشش نہ کرنی چاهیے ؟ جب تک هم ان تین قسموں میں سے ایک ایک کے ادارات کا جائزہ نہ لے لیں کہ آیا یہ بجائے خود مطالعے کا قابل فہم دائرہ هیں ؛ ساتھ هی اس متبادل امکان پر غور نہ کر لیں کہ ممکن ہے یہ بشمول تہذیب کسی عظیم تر کل کے اجزاء هوں ، اس وقت تک هم قطعی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ دور قدیم کے بعد کی پوری تاریخ انسانیت کا هر پہلو همارے پیش نظر آ گیا ہے ؛ لہٰذا اس کتاب کے پانچویں حصے کے اواخر میں هم نے مزید تفتیش و تحقیق شروع کر دی تھی ؛ اب کتاب کے چھٹے ، ساتویں اور آٹھویں حصے میں اس تفتیش و تحقیق کو اتمام تک پہنچانے کی کوشش کریں گے -

فی الحال هماری گفتگو صرف همہ گیر سلطنتوں تک محدود رہے گی - سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آیا یہ سلطنتیں بجائے خود اصل مقصد هیں یا انھیں کسی دوسرے مقصد کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھنا چاهیے ؟ اس سوال کی حقیقت تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ همہ گیر سلطنتوں کی آن

نمایاں خصوصیتوں کو پھر ایک مرتبہ پیش نظر لے آئیں جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۔ اس سلسلے میں اولاً یہ جان لینا چاہیے کہ یہ تہذیبوں کی شکست سے پیشتر نہیں ، بلکہ شکست کے بعد پیدا ہوتی ہیں اور ان سے تہذیبوں کے مجلسی اجتماع میں سیاسی وحدت پیدا کی جاتی ہے ۔ انھیں موسم گرما نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ گرما کے بعد کا وہ دور سمجھنا چاہیے جس میں بارش نہیں ہوتی ۔ یہ دور موسم خزاں کو چھپائے رکھتا ہے اور موسم سرما کے قریب آ جانے کی خبر دیتا ہے[1] ۔ ثانیاً انھیں مقتدر اقلیتیں پیدا کرتی ہیں ، یعنی وہ اقلیتیں جو ایک زمانے میں تخلیقی خصوصیات کی مالک تھیں ، پھر یہ خصوصیات کھو بیٹھیں ۔ تخلیق سے بے بہرگی ان سلطنتوں کی وضع و ساخت کے لیے مہر تصدیق اور ان کے قیام و بقا کے لیے ایک لازمی شرط ہے ، لیکن اسے مکمل تصویر نہ سمجھنا چاہیے ، اس لیے کہ مجلسی شکست کا لاحقہ اور مقتدر اقلیتوں کی پیداوار ہونے کے علاوہ ہمہ گیر سلطنتوں کی ایک تیسری خصوصیت بھی قابل توجہ ہے ، یعنی یہ سنبھالے کا ایک مظہر ہوتی ہیں — اور یہ امر بہ طور خاص قابل توجہ ہے — عمل انحلال دراصل گرنے اور سنبھلنے کا ایک مسلسل منظر ہوتا ہے ، یہاں تک کہ آخری مرتبہ گر جانے کے بعد سنبھلنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہتی ۔ یہ آخری خصوصیت ہی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس نسل کے دل میں شکریے کے جذبات پیدا کرنے کی موجب ہوتی ہے جس کی آنکھوں کے سامنے ہمہ گیر سلطنت کا قیام عمل میں آتا ہے، اس لیے کہ جو دور مصائب انسداد کی مساعی میں ناکامی کے باعث شدید تر ہوتا جا رہا تھا وہ ہمہ گیر سلطنت کا قیام عمل میں آتے ہی بالکل ختم ہو جاتا ہے ۔

یہ خصوصیتیں بہ حیثیت مجموعی ہمہ گیر سلطنت کی ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہیں جو بادی النظر میں مبہم معلوم ہوتی ہے ۔ بلاشبہ یہ مجلسی انحلال کی علامتیں ہیں ، لیکن ساتھ ہی اس انحلال کو روکنے اور ان کا مقابلہ

۱۔ واضح رہے کہ اس فقرے میں مصنف نے خاص امریکی محاورہ استعمال کیا ہے ۔ موسم گرما میں وہاں بارشیں ہوتی ہیں ، پھر ایک دور آتا ہے جس میں بارشیں بالکل رک جاتی ہیں اور موسم میں فی الجملہ سکون رہتا ہے ؛ اسے ”انڈین سمر“ (Indian Summer) کہتے ہیں ۔ اس موسم کو خزاں نہیں کہہ سکتے ، بلکہ یہ خزاں کا پیش خیمہ ہوتا ہے ۔

کرنے کی کوششیں بھی ہیں۔ ہمہ گیر سلطنتوں کی سب سے بڑھ کر نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک مرتبہ قائم ہو جاتی ہیں تو پھر دامنِ بقا سے چمٹی رہنے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہیں رکھتیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ واقعی ان میں زندگی کی سچی روح موجود ہوتی ہے، حاشا وکلا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھے کی عمر بہت لمبی ہو جائے تو وہ مرنے کے لیے بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔

دراصل ہمہ گیر سلطنتوں میں ایسے قوی رجحان پائے جاتے ہیں جن سے احساس ہو سکتا ہے کہ وہ بجائے خود اصل مقصد تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سلطنتیں مجلسی انحلال کے عمل کا ایک خاص دور ہوتی ہیں۔ اگر اس کے سوا انھیں کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے تو صرف اتنی کہ یہ کسی ایسے مقصد و نصب العین کا ذریعہ ہوتی ہیں جو ان کے دائرے سے باہر ہوتا ہے۔

چوبیسواں باب

لافانیت کا سراب

اگر ہم ان ہمہ گیر سلطنتوں پر اجنبی شاہدوں کی حیثیت میں نہیں ، بلکہ ان سلطنتوں کے شہریوں کی حیثیت میں نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آن (شہریوں) کی خواہش نہ محض یہ ہوتی ہے کہ یہ ارضی دولتیں ہمیشہ کے لیے قائم رہیں ، بلکہ انھیں ان انسانی اداروں کے لافانی ہونے کا بھی پورا یقین ہوتا ہے - عجیب امر یہ ہے کہ بعض اوقات معاصرانہ واقعات اس یقین کے سراسر خلاف ہوتے ہیں - اگر کوئی ناظر زمانی و مکانی لحاظ سے مختلف مقام پر کھڑا ہو کر دیکھے تو اس پر غیر مشتبہ انداز میں واضح ہو جائے گا کہ وہ مخصوص ہمہ گیر سلطنت آس موقع پر احتضار کی آخری حالت میں تھی - وہ ناظر سوال کر سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے آس سلطنت کے شہریوں نے صریح واقعات سے بے پروائی اختیار کرتے ہوئے آسے صحرائی رین بسیرا نہیں ، بلکہ ارض موعود اور انسانی کوششوں کا مرکز و مرجع سمجھ لیا ؟ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جذبات صرف ان ہمہ گیر سلطنتوں کے شہریوں تک محدود رہے جو ملکی معماران سلطنت نے قائم کی تھیں - مثال کے طور پر کسی ہندوستانی کے دل میں برطانوی راج کے لافانی ہونے کی نہ کبھی خواہش پیدا ہوئی اور نہ اس بارے میں اس کی زبان پر کوئی پیش گوئی آئی -

رومی سلطنت یونانی تہذیب کی ہمہ گیر سلطنت تھی - جس نسل کی آنکھوں کے سامنے اس کا قیام عمل میں آیا ، وہ بہ ظاہر انتہائی اخلاص سے دعویٰ کرتی تھی کہ اس سلطنت اور اس کے بانی شہر کو قدرت سے لافانی ہونے کا درجہ عطا ہوا ہے - ٹیبولس[1] (قریباً ۵۴—۱۸ ق - م) نے لافانی شہر

۱- Tibullus -

کی دیواروں کے گیت گائے اور ورجل[1] (۷۰—۱۹ ق-م) نے نسل اینیاس[2] کی رومی اولاد کے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے جوپیٹر دیوتا کی زبان سے کہلوایا کہ میں انہیں وہ سلطنت دیتا ہوں جو کبھی ختم نہ ہوگی - لیوی[3] پورے وثوق سے لکھتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد دوام پر رکھی گئی ہے - هوریس[4] کو شاید اپنے اشعار کے غیر فانی ہونے کا یقین نہ تھا ، لیکن وہ سلطنت رومہ کے مرکزی شہر میں مذہبی مراسم کے سالانہ جشنوں کو دوام کی ایک مستقل مثال قرار دیتا ہے ، مگر دیکھیے اس کے اشعار اب تک لوگوں کی زبانوں پر زندہ ہیں ، نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مزید کتنی مدت تک غیرفانی رہیں گے - یہ ظاہر ہے کہ زمانۂ حال میں تعلیمی اوضاع جن تبدیلیوں کے تختۂ مشق بنے ، ان کی وجہ سے هوریس کے اشعار بہ طور اقتباس پیش کرنے والوں کی تعداد میں افسوسناک حد تک کمی آ گئی ہے - بہ ہر حال یہ واضح ہے کہ هوریس کے اشعار رومیوں کے لامذہبی مراسم سے چار یا پانچ گنی زیادہ مدت تک باقی رہے ہیں - هوریس اور ورجل سے چار سو سال بعد گال کا شاعر روٹیلئس نماٹیانس[5] رومہ کی لافانیت کے نغمے گا رہا تھا ، حالانکہ اس وقت تک ایلارک[6] اس عظیم الشان شہر کو غارت گری کا ہدف بنا چکا تھا۔

۱- Virgil ، لاطینی زبان کا شہرۂ آفاق شاعر جس کی کتاب اینئیڈ کو وہی درجہ حاصل ہوا جو ہومر کی ایلیڈ کو حاصل تھا -

۲- Aeneas ، اینئیڈ کا ہیرو - یہ شخص عام روایت کے مطابق ٹرائے سے نکلا اور قرطاجنہ ہوتا ہوا لیٹیم پہنچا اور وہاں کے بادشاہ کی بیٹی سے شادی کر لی - اسی کو رومی سلطنت کا اصل بانی سمجھا جاتا ہے -

۳- Livy ، رومی مورخ جس نے رومہ کی مفصل تاریخ لکھی - اب اس کے صرف تھوڑے سے اجزاء محفوظ ہیں -

۴- Horace ، لاطینی کا مشہور غنائی شاعر جو دسمبر ۶۵ ق-م میں پیدا ہوا اور اس نے ۸ ق-م میں بمقام رومہ وفات پائی -

۵- Rutilius Namatianus -

۶- Alaric ، مغربی گاتھوں کا سردار جس نے ۴۱۰ء میں رومہ کو فتح کیا ، پھر وہ سسلی پہنچا اور وہیں ۴۱۰ء میں وفات پائی -

تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا تھا - سینٹ جیروم[1] یروشلم کی گوشہ نشینی میں اپنے آپ کو علمی مشاغل کے لیے وقف کر چکا تھا ، اس نے بھی تھوڑی دیر کے لیے مذہبی مصروفیتیں ترک کر کے قریب قریب روٹیلئس ھی کے انداز میں رومہ کی حالت زار پر اپنے رنج و غم اور حیرت زدگی کا اظہار کیا تھا - غرض رومہ کی تباھی پر ایک لا مذھب سرکاری کارکن اور ایک مسیحی پادری جذباتی رد عمل میں بالکل ہم آہنگ تھے، حالانکہ اس واقعۂ ھائلہ کے بارے میں اب ھمیں صاف نظر آ رھا ھے کہ یہ نسلوں سے ناگزیر اور شدنی چلا آ رھا تھا -

رومہ کا سقوط ۴۱۰ء کا واقعہ ھے - اس سے رومی شہریوں کے دل پر یقیناً سخت ضرب لگی ، اس لیے کہ جس سلطنت کو وہ ھمیشہ کے لیے دائم و قائم سمجھے بیٹھے تھے ، وہ اچانک عارضی اور نا پایدار ثابت ہوئی - ٹھیک ایسی ھی ضرب سے خلافت عربیہ کی رعایا کو سابقہ پڑا تھا ، جب ۱۲۵۸ میں تاتاریوں نے بغداد کو مسخر کر لیا تھا - رومی دنیا میں ضرب کا دائرہ فلسطین سے گال تک پھیلا تھا ، عربی دنیا میں ضرب کا دائرہ فرغانہ سے آندلس تک ممتد ہو گیا - نفسیاتی اثر کی شدت و وسعت رومی سلطنت کے مقابلے میں خلافت عربیہ کے متعلق زیادہ حیرت ناک ھے ، اس لیے کہ ھلاکو کی آخری ضرب سے تین چار سو سال پیشتر خلافت عباسیہ کا اقتدار ان وسیع علاقوں کے بیشتر حصے میں بالکل بے اثر ہو چکا تھا ، جو محض برائے نام اس کے تابع چلے آتے تھے[2] -

جاں بلب ھمہ گیر سلطنتوں کے اردگرد مزعوم لا فانیت کا جو ھالہ اور حلقۂ نور قائم ہو جاتا ھے ، وہ زیادہ محتاط بربری قائدوں کو اکثر اس امر پر آمادہ کر دیتا ھے کہ سلطنت کے علاقوں کو تقسیم کرتے وقت خود اس کی رسمی تابعیت قبول کر لیں - مشرقی گاتھوں کے لیڈروں اور دیلمی شیعوں

۱- Saint Jerome -

۲- مصنف کا مقصود یہ ھے کہ عملاً خلافت عباسیہ بہت پہلے ختم ہو چکی تھی ، صرف اس کا ڈھانچا باقی رہ گیا تھا جسے ھلاکو نے ریزہ ریزہ کر ڈالا ، لیکن عام لوگ اس واقعے سے اس طرح متاثر ہوئے گویا ھلاکو نے غیر متوقع طور پر خلافت کو تباہ کر دیا -

کے بویہ سرداروں نے فتوحات حاصل کیں اور وہ حکمرانی کے مناصب پر پہنچ گئے ، لیکن جس حد تک سرکاری حیثیت کے ظواہر کا تعلق ہے وہ شاھنشاھان قسطنطنیہ اور خلفائے بغداد کے نائبوں کی حیثیت میں سب کام کرتے تھے - اگرچہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ فرسودہ ہمہ گیر سلطنتوں کے معاملات کو دانش مندانہ طریق پر سنبھالنے کی یہ کوشش سود مند ثابت نہ ہوئی اور وہ انجام نہ رک سکا جو ان کے لیے مقدر ہو چکا تھا - اس انجام سے خود یہ جنگی گروہ بھی بچ نہ سکے ، اس لیے کہ وہ اپنے ملحدانہ مذہبی عقائد سے چمٹے رہے تھے ، لیکن یہ سیاسی مصلحت اندیشی اُن بربریوں کے ہاتھوں اعلیٰ پیمانے پر کامیاب ہوئی جنھوں نے دانش مندی یا خوش نصیبی سے ہمہ گیر سلطنت کا مذہب اختیار کر لیا اور وہ اس میں بڑے پختہ اور مخلص تھے - مثال کے طور پر رومی سلطنت کی بربادی کے بعد بربریوں نے جو حکومتیں قائم کیں اُن میں سے فرینکوں کے سردار کلووس[1] کی حکومت بہت پختہ اور پایدار ثابت ہوئی - کلووس نے قیام حکومت کے بعد کیتھولک مذہب اختیار کر لیا اور قسطنطنیہ کے شہنشاہ اناس ٹاسیئس[2] سے اپنے لیے نیابت کا پروانہ حاصل کیا ، حالانکہ قسطنطنیہ اس کے حدود حکومت سے بہت دور واقع تھا - اس کی کامیابی کے سلسلے میں یہی شہادت پیش کر دینا بس کرتا ہے کہ جو علاقے اس نے مسخر کیے تھے اُن پر بعد کے حکمرانوں میں سے اٹھارہ کے نام لوئی[3] تھے اور یہ نام کلووس ھی کی ایک ترمیم شدہ شکل ہے -

اس کتاب کے ابتدائی حصے میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ سلطنت عثمانیہ بیزنطینی تہذیب کی ہمہ گیر سلطنت تھی - اس نے بھی مزعوم لا فانیت کے خصائص کی نمائش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور یہ سب کچھ اس موقع پر ہوا جب اسے یورپ کا ''مرد بیمار'' قرار دیا جا چکا تھا - جو جاہ طلب جنگی سردار اپنے لیے مستقل حکومتیں پیدا کر رہے تھے ——— مصر اور شام میں

۱- Clovis ۴۸۱ء میں بادشاہ بنا ، پیرس کو پہلے پہل اسی نے دارالحکومت بنایا -

۲- Anastasius -

۳- Louis - یہ بادشاھان فرانس کا ذکر ہے ، جن میں سے آخری لوئی بہ لحاظ تعداد اٹھارھواں تھا ، یعنی لوئی ھیژدھم -

محمد علی پاشا، البانیہ اور یونان میں علی پاشا والی جنینا، رومیلیا کے شمالی و مغربی گوشے میں پسوان اوغلو والی ودین ——— وہ سب کچھ سلطان کے نام پر کر رہے تھے، حالانکہ اپنے فائدے کے لیے اسے نقصان پہنچا رہے تھے۔ مغربی طاقتوں نے ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا تو انھی کے طور طریقے اختیار کر لیے، مثلاً برطانیہ نے ۱۸۷۸ء میں قبرس کا نظم و نسق سنبھالا اور ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کیا، لیکن دونوں جگہ کاروبار حکومت سلطان ہی کے نام پر جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں برطانیہ کو ترکی سے براہ راست جنگ پیش آگئی۔

سلطنت مغلیہ ہندو تہذیب کی ہمہ گیر سلطنت تھی۔ اس نے بھی انھیں خصائص کی نمایش کی۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے پچاس سال بعد وہ سلطنت گھٹتے گھٹتے صرف اڑھائی سو میل لمبے اور ایک سو میل چوڑے رقبے تک محدود رہ گئی تھی جو ایک زمانے میں بر صغیر ہند کے بہت بڑے حصے پر حکمرانی کا سکہ چلا چکی تھی۔ مزید پچاس سال گزرنے پر اس کا دائرہ سمٹ کر دھلی کے لال قلعے کی دیواروں کے اندر آ گیا، لیکن ۱۷۰۷ء سے ڈیڑھ سو سال بعد بھی اکبر اور اورنگ زیب کا ایک جانشین بہ دستور شاہی تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ممکن ہے یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا، لیکن ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ آراؤں نے اُسے برطانوی راج کے خلاف بغاوت کی سرپرستی کے لیے آلۂ کار بنا لیا، جس کے لیے وہ شاید دل سے تیار نہ تھا۔ کچھ عرصے تک افراتفری جاری رہی پھر مغلوں کے راج کا یہ نشان بھی مٹ گیا، حالانکہ راج دراصل بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔

ہمہ گیر سلطنتوں کی لافانیت کے عقیدے سے چمٹے رہنے کی ایک نہایت نمایاں شہادت یہ ہے کہ جب یہ سلطنتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان پر فنا کی مہر لگ چکتی ہے تو ان کے بھوت کھڑے کر لینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ مثلاً بغداد کی خلافت عباسیہ کو قاہرہ کی خلافت عباسیہ کا لباس پہنایا گیا۔ رومی سلطنت ختم ہوئی تو ایک طرف مغرب میں اس نے مقدس رومی سلطنت کی حیثیت اختیار کی، دوسری طرف آرتھوڈکس مسیحیت کی مشرق رومی سلطنت کا چولا بدلا۔ مشرق بعید کی تہذیب میں سین[1] اور هن خاندانوں کی جگہ سوئی

۱- Ts'in -

اور تنگ[۱] سلطنت نے لے لی - رومی سلطنت کے بانی کا لقب[۲] قیصر اور زار کی شکل میں زندہ رکھا گیا - خلیفہ کا لقب در اصل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانشین کے لیے تجویز ہوا تھا ، لیکن یہ لقب قاہرہ ہوتا ہوا استنبول پہنچا اور اس وقت تک قائم رہا جب تک بیسویں صدی میں مغربیت پسند انقلابیوں نے اسے منسوخ نہ کر دیا -

تاریخی مثالوں کے انبار عظیم میں سے یہ صرف چند مثالیں ہیں ، جو اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ ہمہ گیر سلطنتوں کی لا فانیت کا عقیدہ واضح اور ٹھوس حقائق کی تغلیط و تردید کے باوجود صدیوں تک قائم رہتا ہے - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عجیب و غریب عقیدے کے اسباب کیا ہیں ؟

ایک بدیہی سبب تو وہ قوی اور زبردست اثر ہے جو ہمہ گیر سلطنتوں کے بانی اور ان کے بڑے بڑے حکمران اپنے عظیم الشان کارناموں سے پیدا کر دیتے ہیں - یہ اثر تاثر پذیر اخلاف کے حوالے ہوتا ہے تو اس میں انتہائی زور آ جاتا ہے اور ایک اہم حقیقت مبالغہ آمیز تصورات کی بنا پر ایک ہمہ گیر افسانے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے - دوسرا سبب اصل ادارے کی پرتاثیری ہے - ہمہ گیر سلطنت اس وجہ سے دل و دماغ کو مسحور کر لیتی ہے کہ یہ اس دور مصائب کو ختم کر دیتی ہے جس کی روک تھام کا کوئی بندوبست طویل مدت تک نہ ہو سکا تھا اور سلطنت کا قیام گر کر سنبھل جانے کا ایک بدیہی نشان بن جاتا ہے - رومی سلطنت کا یہی پہلو تھا جس نے انجام کار انٹو نینوں[۳] کے عہد میں یونان کے اہل علم و فضل کا احترام حاصل کیا ، حالانکہ وہ لوگ ابتدا میں اس سلطنت کے دشمن تھے - یہی عہد ہے جس کے

۱- T'ang -

۲- رومی سلطنت کے بانی کا لقب سیزر (Caesar) تھا - مصنف کا مطلب یہ ہے کہ جرمنی کے شہنشاہ کا لقب قیصر (Kaiser) اور روس کے شاہنشاہ کا لقب زار (Tsar یا Czar) سیزر ہی کی ترمیم شدہ شکلیں ہیں -

۳- Age of Antonines ، رومی تاریخ کا وہ دور جو ٹائیٹس انٹونیس کی تخت نشینی (۱۳۸ء) سے شروع ہوا اور اس کے متبنّٰی مارکس آریلئس کی وفات (۱۸۰ء) پر ختم ہو گیا - اس دور کو انتہائی خوش حالی اور اقبال مندی کا دور سمجھا جاتا ہے -

متعلق مشہور مورخ گبن نے بہت مدت بعد یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ اس میں عالم انسانیت نے خوش نصیبی کا بلند ترین درجہ حاصل کر لیا تھا۔ ایر سٹیڈس[1] لکھتا ہے:

اس کارفرمائی سے نجات کی کوئی امید نہ رکھنی چاہیے، جس کی پشتیبانی کے لیے قوت و طاقت موجود نہ ہو۔ اپنے سے اعلیٰ درجے کے آدمیوں کی تابعیت میں آجانا خود مختاری کا دوسرا بہترین بدل ہے۔ یہ بدل رومی سلطنت میں ہمارا بہترین تجربہ بن گیا۔ اس خوشگوار تجربے نے دنیا بھر میں یہ حرکت پیدا کر دی کہ رومہ کا دامن مضبوطی اور قوت سے تھام لینا چاہیے۔ اب دنیا رومہ سے علیحدگی کا خیال بھی دل میں نہ لائے گی، جس طرح کسی جہاز کے مسافر جہازران سے علیحدگی کا خیال دل میں نہیں لا سکتے۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ چمگادڑیں غار میں ایک دوسری سے اور چٹانوں سے چمٹی رہتی ہیں؛ رومہ پر پوری دنیا کے انحصار کی یہ موزوں ترین مثال ہے۔ آج ہر دل کے اضطراب کا مرکز یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس اجتماع سے علیحدگی کی نوبت نہ آجائے۔ یہ خیال کہ رومہ ہمیں چھوڑ جائے گا اس درجے تشویش افزا ہے کہ اس علیحدگی کا تصور بھی دماغ میں نہیں آسکتا۔

اقتدار و وقار کے متعلق وہ تمام جھگڑے ختم ہو چکے ہیں جو گزشتہ زمانے میں لڑائیوں کے آغاز کا سبب بنے رہے۔ بعض قومیں بالکل خوش اور مطمئن ہو گئی ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح بعض ندی نالوں اور دریاؤں کی روانی سے کوئی شور نہیں اٹھتا۔ وہ اس بات پر خوش ہیں کہ محنت و مشقت سے نجات حاصل ہو گئی۔ ان پر یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ پرانی کشمکشیں اور کشاکشیں بالکل بے مقصد تھیں۔ دوسری قوموں کو اب یہ یاد بھی نہیں رہا کہ وہ

۱- P. Aelius Aristeides -

خود ایک زمانے میں اقتدار کی مالک تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پمفیل[1] کے افسانے کی نئی تعبیر اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ جب دنیا کی حکومتیں برادرانہ رزم و پیکار میں اپنے ہاتھوں گھائل ہو کر بستر مرگ پر گر چکی تھیں تو یکایک رومی سلطنت پردۂ غیب سے ظہور میں آئی اور ان سب میں نئے سرے سے زندگی کی روح دوڑ گئی۔ انھیں کچھ معلوم نہیں کہ نئی زندگی کیوں کر حاصل ہوئی، البتہ وہ اپنی موجودہ فلاح و بہبود پر حیرت زدہ ضرور ہیں۔ وہ ان سونے والوں سے مشابہ ہیں جنھیں کسی نے جگا کر ہوش و حواس کی بحالی کا بندوبست کر دیا ہو۔ اب وہ ان خوابوں کو اپنے حافظے کے دامن سے دھو رہی ہیں جو ایک لمحہ پیشتر ان کے لیے باعث تشویش بنے ہوئے تھے۔ اب انھیں یقین نہیں آتا کہ رزم و پیکار جیسی کوئی چیز کبھی دنیا میں موجود تھی۔۔۔۔۔ ساری دنیا اس وقت چھٹی منا رہی ہے۔۔۔۔ اب صرف وہی لوگ اچھی چیزوں سے محرومی کے باعث قابل رحم رہ گئے ہیں جو اس سلطنت کے دائرے سے باہر ہیں؛ اگر ایسے لوگ کہیں ہیں۔۔۔۔۔[2]

اس سوال پر عجیب و غریب تشکک کا اظہار کہ آیا رومی سلطنت سے باہر بھی قابل ذکر لوگ موجود ہیں، خاص توجہ کا محتاج ہے۔ اس قسم کے اداروں کو ہمہ گیر سلطنتیں قرار دینے کے لیے یہی وجہ جواز ہے۔ یہ سلطنتیں جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے نہیں، بلکہ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ہمہ‌گیر تھیں۔ ہوریس اپنی ایک غنائی نظم میں ہمیں بتاتا ہے کہ اب آسے ٹریڈیٹس[3] کی دھمکیوں سے جی ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بے شک پارتھیا کا بادشاہ موجود تھا

۱- Pamphyle، یونانی افسانوں میں یہ ایک ساحرہ تھی جس نے الو کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مشہور ہے کہ اس نے اپنے تمام ہمسایوں کو جادو کے زور سے مختلف جانوروں کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔

۲- ارسٹیڈس کی کتاب In Romam - [مرتب]

۳- Tiridates پارتھیا کا بادشاہ۔

لیکن رومی سلطنت کی طاقت و قوت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی تھی - بالکل اسی طرح مشرق بعید کی ہمہ گیر سلطنت میں مانچو خاندان کے شہنشاہ اپنے سفارتی تعلقات ایسے انداز پر چلاتے تھے گویا تمام حکومتیں، جن میں مغربی دنیا کی حکومتیں بھی شامل تھیں، ماضی کے کسی غیر معین زمانے میں چینی حکمرانوں سے اپنے قیام کے جواز کی سند حاصل کر چکی تھیں -

لیکن یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ یہ سلطنتیں حقیقت میں اپنی اس ظاہری حیثیت سے بالکل مختلف تھیں جسے دیکھ کر ایرسٹیڈس یا دوسرے مدح گستروں نے مختلف زمانوں اور مختلف خطوں میں ان کی ستایش کے گیت گائے -

مصری ہمہ گیر سلطنت کی ان سرحدوں پر، جو نوبیا سے ملتی تھیں، ایک غیر معروف دیوی موجود تھی جسے یونانی افسانہ طرازی کے کمالات نے حبشہ کے ایک فانی بادشاہ کی حیثیت دے دی - سوء اتفاق سے صبح کی غیر فانی دیوی ای اوس[1] اس بادشاہ پر عاشق ہو گئی - اب اس نے اپنے ساتھی دیوی دیوتاؤں سے مطالبہ کیا کہ میرے اس محبوب کو بھی غیر فانی ہونے کا وہی درجہ دے دو جو ہم سب کو حاصل ہے - ان میں سے کوئی بھی یہ الوہی خصوصیت عطا کرنے کے لیے راضی نہ تھا - صبح کی دیوی نے انہیں اتنا تنگ کیا کہ آخرکار سب کو تریا ہٹ کے سامنے سر جھکانا پڑا - انہوں نے حبشہ کے بادشاہ کو غیر فانی تو بنا دیا، لیکن اپنے عطیے میں ایک سقم باقی رکھا، یعنی غیر فانی ہونے کے ساتھ اسے دوامی شباب نہ بخشا اور خود صبح کی دیوی بھی اپنے جوش شوق میں اس سقم کو نظر انداز کر گئی - اس کا نتیجہ مضحکہ خیز بھی تھا اور الم انگیز بھی - ابتدائی رنگ رلیاں چشم زدن میں ختم ہو گئیں - ای اوس اور اس کے غیر فانی محبوب کو اسی مصیبت سے سابقہ پڑ گیا جو ٹیتھونس[2] کو پیش آ چکی تھی - بڑھاپا جسے

۱- Eos -

۲- Tithonus یہ بھی ایک دیوی تھی جو ٹرائے کے ایک خوبرو جوان پر عاشق ہو گئی تھی - اس نے بھی جنون عشق میں اپنے محبوب کے لیے دائمی زندگی کی سند حاصل کی، لیکن اسے دائمی شباب نہ دلا سکی - آخر اس پر بڑھاپا طاری ہوا؛ نہ وہ مرتا تھا نہ نئے سرے سے جوان ہو سکتا تھا - تنگ آ کر دیوی نے اسے ایک ٹڈے کی شکل میں تبدیل کر دیا -

موت کا رحم و کرم والا ہاتھ ختم نہ کر سکتا تھا ، دائمی رنج و الم کا سامان بن گیا اور اس روگ نے ان کا جینا دوبھر کر دیا ۔

اگر اس دنیا میں انسانی روح یا کسی انسانی ادارے کو لافانیت کا درجہ مل جائے تو وہ انجام کار شہادت کے الم زار کی حیثیت اختیار کرلے گا ، خواہ اس کے ساتھ جسمانی درماندگی یا ذہنی ناکارگی موجود نہ بھی ہو ۔ فلسفی شہنشاہ مارکس آریلئس نے لکھا تھا 'یہ کہنا بالکل درست ہے کہ چالیس سال کی عمر کا ہر انسان جو درمیانے درجے کی عقل اور سمجھ رکھتا ہو قوانین قدرت کی یکسانی کی روشنی میں پورے ماضی اور مستقبل کو دیکھ سکتا ہے' ۔ اگر ارواح انسانی کی صلاحیت تجربہ کے لیے یہ اندازہ خوانندۂ کتاب کو کم محسوس ہو تو اس کا سبب معلوم کرنے لیے اس عہد کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس میں مارکس آریلئس نے زندگی بسر کی - گرما کے بعد کا وہ دور جس میں بارشیں بند ہو جاتی ہیں ناقابل برداشت بن جاتا ہے ۔ بلاشبہ رومی سلطنت نے اپنے ماتحت علاقوں کے لیے امن کی دولت مہیا کر دی ، لیکن یونان کی آزادی چھن گئی ؛ اگرچہ اس آزادی سے صرف ایک مختصر سی اقلیت مستفید تھی اور مخصوص حقوق کی مالک اقلیت کی حیثیت میں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ غیر ذمہ دار اور جابر بن جاتی ۔

جب یونانی معاشرے میں شکست کا دور شروع ہونے والا تھا تو افلاطون نے اسے مزید انحطاط سے روکنے اور میخیں ٹھونک کر زیادہ پختہ و پایدار بنانے کی کوشش کی تھی ۔ اس سلسلے میں اس نے مصری ثقافت کی پایداری کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا ، لیکن ایک ہزار سال بعد یہ مصری ثقافت یقیناً موجود تھی اور یونانی تہذیب جاں کنی کی آخری منزل میں پہنچ چکی تھی ۔ اس موقع پر نوفلاطونیوں کے آخری گروہ نے اپنے شہرۂ آفاق استاذ الاساتذہ[1] کے جذبات کے غیرناقدانہ احترام کو ہذیان کے درجے پر پہنچا دیا ۔

جب مصر کی ہمہ گیر سلطنت کا بے روح جسد باقاعدہ چتا پر رکھا جا چکا تھا ، تو یہ پھر بھی بار بار زندہ ہو جانے پر مصر رہی ۔ مصری تہذیب کی آنکھوں کے سامنے اس کے معاصر — منوی ، سمیری اور ہندی ثقافت — ایک ایک کرکے ناپید ہو گئے اور ان کی جگہیں نئی نسلوں نے لے لیں ، بلکہ ان

۱- اس سے مراد افلاطون ہے ۔

نئی نسلوں میں سے بھی بعض فنا کے گھاٹ اترگئیں اور مصری معاشرہ بہ دستور زندہ رہا - مصریات کے طالب علم نے دیکھا ہوگا کہ اولین سریائی ، ھٹی اور بابلی تہذیبیں پیدا ہوئیں اور مر گئیں - یہ سب سمیری تہذیب کے بطن سے نکلی تھیں - پھر سریائی اور یونانی تہذیب پر انحطاط کا دور آیا - یہ دونوں منوی تہذیب سے وجود پذیر ہوئی تھیں - مصری معاشرے کی طبعی میعاد زندگی تو ختم ہو گئی تھی اور اس میں شکست کے آثار پیدا ہو چکے تھے ، تاہم اس کے خاتمے کی مدت بہت طویل ہو گئی - یہ مدت دراصل حد درجہ اُکتا دینے والی تھی ، البتہ بیچ میں انتہائی سرگرمی کے دور بھی آتے رہے ، جن میں خارجی اثرات کے ماتحت اس اونگھتے ہوئے معاشرے کی رگوں میں برق لہریں دوڑتی رہیں -

چین میں مشرق بعید کی تہذیب پر نظر ڈالیں تو اس کے دور خاتمہ میں بھی اجنبیوں سے ترس و خوف کے ایسے ہی جوشیلے مظاہروں کا نقشہ دکھائی دیتا ھے - تاتاریوں میں مشرق بعید کی مسیحی ثقافت کی چاشنی موجود تھی - انھوں نے چین میں اجنبی ہمہ گیر سلطنت کا انتظام کیا - اس سے رد عمل پیدا ہوا اور تاتاری نکالے گئے - ان کی جگہ منگ خاندان کی ہمہ گیر سلطنت نے لے لی جو ملکی سلطنت تھی - اس سلطنت کی تباہی پر جو سیاسی خلا پیدا ہوا تھا ، اس میں بربری مانچو در آئے - ان میں مشرق بعید کی سچی ثقافت کے اثرات بہت کم تھے اور انھوں نے چینی طور طریقے اختیار کر لینے پر بڑی آمادگی ظاہر کی ، تاہم ان کے خلاف بھی زبردست لہریں اٹھیں اور کم از کم جنوبی چین نے زیر سطح مخالفت کبھی ترک نہ کی - ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۴ء تک اس مخالفت نے بغاوت کی شکل اختیار کیے رکھی - جب موجودہ مغربی تہذیب کیتھولک مسیحیت کی شکل اختیار کر کے سولھویں اور سترھویں صدی میں وھاں پہنچی تو اٹھارھویں صدی کے ربع اول میں کیتھولک مذہب کو ممنوع قرار دیا گیا - ۱۸۳۹ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان چین میں مغربی تجارت کے لیے بحری دروازے کھل گئے تو ۱۹۰۰ء میں بغاوت بکسر[1] ظہور پذیر ہوئی جو اہل مغرب کے خلاف تھی - ۱۹۱۱ء میں خاندان مانچو کا استیصال ہوا - اس کے خلاف دو الزام تھے ؛ اول یہ کہ وہ اصلاً اجنبی تھا ، دوم یہ کہ وہ

۱- Boxer Rising -

مغربی مداخلت کی زیادہ خوفناک اجنبی قوت کو چین سے دور رکھنے میں بھی سراسر ناکام ثابت ہوا۔

خوش قسمتی سے زندگی افسانے کے مقابلے میں زیادہ مہربان ہے۔ افسانہ طرازوں نے ٹیتھونس کو لافانیت کی جو سزا دی تھی، وہ تاریخ کی ہمہ گیر سلطنتوں کے حق میں معاف کر دی گئی، یعنی انہیں لامتناہی مدت کی زندگیاں نہ ملیں۔ مارکس آریلئس نے جس آدمی کی عمر کی حد چالیس سال مقرر کی تھی اسے بہ ہر حال مرنا تھا، خواہ وہ زندگی کی لذت گنوا کر پچاس یا ساٹھ سال تک زندہ رہتا۔ جو ہمہ گیر سلطنت موت کے ہر کچوکے پر اچھل کر کھڑی ہو جائے، وہ مرور از منہ سے اسی طرح تحلیل ہو جائے گی، جس طرح نمک کا وہ کھمبا تحلیل ہو گیا، جس کے متعلق کہانیوں میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ پہلے عورت تھی اور منجمد ہو کر نمک کا کھمبا بنی۔

پچیسواں باب

”مکھیو شہد بناؤ“

”شہد کی مکھیو ! تم بے شک شہد جمع کرتی رہو ، مگر یہ صرف تمھارے لیے نہ ہونا چاہیے[1] ۔“ یہ پیش پا افتادہ مثل ایک متعارف تشبیہ کے ذریعے سے تاریخ کی سکیم میں ہمہ گیر سلطنتوں کی متناقض حیثیت کو بخوبی واضح کرتی ہے ۔ یہ عظیم الشان نظام مقتدر اقلیتوں کے آخری کارنامے ہوتے ہیں ، جو وہ جاں بہ لب تہذیبوں کے انحلال پذیر اجتماعات میں انجام دیتی ہیں ۔ ان کا واضح مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی ضائع ہوتی ہوئی قوتوں کو محفوظ کر کے خود اپنی حفاظت کا بند و بست کر لیں ۔ انھیں قوتوں کی تقدیر سے خود اُن کی تقدیر وابستہ ہوتی ہے ۔ یہ مقصد بہ حیثیت عمومی پورا نہیں ہوتا ؛ با ایں ہمہ مجلسی انحلال کی یہ ضمنی پیداواریں تخلیق کے تازہ اعمال میں ایک خاص وظیفہ پورا کرتی ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکتیں ، لیکن دوسروں کی خدمت ضرور انجام دے جاتی ہیں ۔

اگر ایک ہمہ گیر سلطنت کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ دوسروں کی خدمات انجام دینے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے تو سوال یہ ہے کہ ان خدمات سے فائدہ کن کو پہنچتا ہے ؟ اس سلسلے میں تین ممکن امیدوار ہیں — خود اس جاں بہ لب معاشرے کے داخلی پرولتار ، یا خارجی پرولتار ، یا کوئی اجنبی تہذیب جو اس کی معاصر ہو — ان تینوں میں سے کوئی ایک ان خدمات سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔ ہمہ گیر سلطنت کے داخلی پرولتار کی خدمت کا نتیجہ یہ

---

۱ - اصل لاطینی مثل میں لفظ ”صرف“ موجود نہیں ، لیکن جس شاعر نے اس مثل کو نظم کیا ، اسے علم ہوگا کہ اگر مکھیوں کو شہد کا کوئی بھی حصہ نہ دیا گیا تو وہ اپنا کام چھوڑ دیں گی ۔ [مصنف]

ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے مذاہب میں سے کوئی ایک مذہب نشو و نما پاتا ہے اور یہ مذاہب داخلی پرولتار ہی کے دائرے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بوسوے[۱] کہتا ہے: ''ہم نے روئے زمین پر جتنی بڑی سلطنتیں دیکھی ہیں، اُن میں سے ہر ایک نے مختلف ذریعوں سے مذہب کے فائدے اور خدا کے جلال کی خدمت انجام دی ہے۔ خود خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اس کا اعلان کرایا ہے''۔

۱۔ ہمہ گیر سلطنتوں کی ناقلیت

ہمارے لیے دوسرا کام یہ ہے کہ ان خدمات کا تجربیاتی اندازہ کریں جو ہمہ گیر سلطنتیں غیر ارادی طور پر انجام دیتی ہیں، نیز اُن فوائد کا جائزہ لیں جو ان سلطنتوں کی مہیا کردہ سہولتوں سے داخلی پرولتار، خارجی پرولتار یا اجنبی تہذیبیں حاصل کرتی ہیں؛ لیکن سب سے پہلے ہمیں ایک ابتدائی سوال کا جواب دے دینا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ادارہ کیوں کر کسی کی خدمت انجام دے سکتا ہے جو خود غیر متحرک، قدامت پسند اور دقیانوسی ہے؟ بہ الفاظ دیگر جس کی حیثیت ہر لحاظ سے منفیانہ ہے؟ ہم نے کائنات کے زیر و بم کے لیے چینیوں کے طریقۂ تعبیر کو سب سے زیادہ واضح اور اصل کا صحیح شارح پایا تھا؛ سوال کو اُس تعبیر کی اصطلاحات کے مطابق ڈھالا جائے تو پوچھا جا سکتا ہے کہ ایک جامد حالت سکون سے حرکت و عمل کا نیا طوفان کیوں کر پھوٹتا ہے؟ بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں کہ تخلیقی قوت سے چھوٹی سی چنگاری ایک مرتبہ پیدا ہو جاتی ہے تو ہمہ گیر سلطنت کے زیر سایہ اُسے ایک مستقل شعلہ بن جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر دور مصائب کی آندھیوں کے تھپیڑے اُسے لگتے رہتے تو شروع ہی میں یہ چنگاری افسردہ ہو کر رہ جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ خدمت کتنی ہی قیمتی ہو، تاہم اس کی حیثیت منفیانہ ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہمہ گیر سلطنت کے ماتحت مجلسی دائرے کا وہ کون سا خاص پہلو ہے جو تخلیق کی نئی صلاحیت کا مثبت سر چشمہ بن جاتا ہے اور جسے ہم ہمہ گیر سلطنت سے مستفید ہونے والوں

۱۔ Bossuet ایک فرانسیسی پادری، پیدائش ۱۶۲۷ء، وفات ۱۷۰۴ء۔ اس نے تاریخ عالم پر لکچر دیے تھے۔

کے لیے اعلیٰ ترین فائدہ قرار دے سکتے ہیں، اگرچہ بہ ظاہر ہمہ گیر سلطنت خود اس سے عمومی حیثیت میں کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی۔ شاید ایک کلید اس رجحان میں پائی جا سکتی ہے جو قدامت پروری میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اجرائے کار کی ضرورتیں اسے مجبوراً تعمیر پر مجبور کر دیتی ہیں اور اس طرح وہ خود اپنی شکست کا سامان بن جاتی ہے۔

مثال کے طور پر درہم برہم معاشرے کے بچے کھچے ڈھانچے کو ہمہ گیر سلطنت کے سیاسی نظام میں شامل کر لیا جائے تو اس سے نہ تو وہ چیزیں بحال ہوتی ہیں جو تباہ ہو چکی ہیں اور نہ بچے کھچے ڈھانچے کی روز افزوں بربادی کا سلسلہ رکتا ہے۔ اس بے پایاں اور ہر لحظہ وسیع تر ہونے والے مجلسی خلا کا خطرہ حکومت کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے رجحانات کے خلاف عمل پیرا ہو جائے اور خلا کو پر کرنے کے لیے عارضی ادارے تعمیر کرے۔ اس ہمیشہ فراخ تر ہونے والے شگاف کی ایک معیاری مثال ہمیں سلطنت رومہ کی انتظامی تاریخ میں ملتی ہے جو اس کے قیام سے دو صدی بعد تک ہمارے سامنے رہتی ہے۔ حکمرانی کا رومی گر یہ تھا کہ بالواسطہ حکومت کے اصول کی پابندی کی جائے۔ ہمہ گیر یونانی سلطنت کے متعلق اس کے رومی بانیوں کا تصور یہ تھا کہ یہ خود مختار شہروں کا ایک اجتماع ہے اور اس کے حاشیے پر خودمختار ریاستوں کے خطے واقع ہیں جن میں یونانی ثقافت سیاسی نقطۂ نگاہ سے پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکی۔ نظم و نسق کی ذمہ داری مقامی حکمرانوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ اس پالیسی پر سوچ و بچار کے بعد نظر ثانی کبھی نہ کی گئی؛ لیکن اگر ہم "رومی امن" کی دو صدیاں گزر جانے کے بعد سلطنت کے عمومی حالات کا از سر نو جائزہ لیں تو واضح ہو جائے گا کہ انتظامی ڈھانچے میں خاصی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ حاشیہ نشین ریاستوں نے صوبوں کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور صوبے براہ راست مرکزی نظام سے وابستہ ہو چکے تھے۔ مقامی حکومتوں کو اطمینان بخش طریقے کے مطابق چلانے والے انسانی چشمے سوکھ گئے تھے۔ مرکزی حکومت نے جب دیکھا کہ نظم و نسق کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں، وہ مقامی لوگوں میں نہیں پائی جاتیں، تو وہ اس بات پر مجبور ہوئی کہ اول حاشیہ نشین صوبوں کے رؤسا کی جگہ مرکز کی طرف سے شہنشاہ کے نائب مقرر کرے؛ دوم خود مختار شہری ریاستوں کے انتظام کے لیے بھی ناظموں کا تقرر ضروری سمجھا گیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے سلطنت کا نظم و نسق ایک ایسی دفتری حکومت کے حوالے ہو چکا تھا جس کے کارکنوں اور کارفرماؤں نے اپنے مناصب کو میراث بنا لیا تھا۔

نہ مرکزی کارفرما اس میں کوئی تبدیلی کرنے کے خواہاں تھے اور نہ مقامی حکام کسی عائد کردہ تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ دونوں مجبوری کی بے پناہ قوت کے شکار بن گئے۔ بہ ہر حال اس کے نتائج سراسر انقلاب انگیز تھے، اس لیے کہ ان نئے اداروں میں قوت نقل اعلیٰ پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جب مجلسی انحلال کا دور شروع ہوتا ہے تو دو عنصر نمایاں حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک کو ہم نے "حس ابتری" سے تعبیر کیا تھا اور دوسرے کو "حس اتحاد" سے۔ اگرچہ یہ دو نفسیاتی رجحانات موضوعی نقطۂ نگاہ سے ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ مل کو معروضی نقطۂ نگاہ سے یکساں نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ ہمہ گیر سلطنت جو عارضی ادارے معرض وجود میں لاتی ہے وقت اور دور کی مقتدر روح اس میں ناقلیت کی ویسی ہی قوت پیدا کر دیتی ہے جو سمندر یا سطح مرتفع اپنے ہاں کی انسانی نفسیات کی فضا سے نہیں، بلکہ اپنی طبعی حیثیت سے حاصل کرتے ہیں۔

ہم ایرسٹیڈس کا ایک حوالہ پہلے دے چکے ہیں؛ وہ کہتا ہے: "جس طرح سطح زمین تمام انسانوں کو سنبھالے کھڑی ہے اور جس طرح سمندر دریاؤں کو اپنے اندر سمیٹ رہے ہیں، اسی طرح رومہ کی آغوش بھی تمام قوموں کے لیے کھلی ہوئی ہے۔" راقم الحروف ایر سٹیڈس کی تصانیف سے واقف بھی نہیں ہوا تھا جب اس نے لکھا تھا:

> "سلطنت کے متعلق ذاتی احساسات ایک تمثیل کے رنگ میں زیادہ واضح طریق پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس کی حیثیت ایک سمندر کی تھی، جس کے کناروں پر شہری ریاستوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بحیرۂ روم کو دیکھا جائے تو بادی النظر میں یہ ان دریاؤں سے بہت فرو تر معلوم ہوتا ہے جن کے پانی اس کے لیے رونق کا باعث ہیں۔ وہ پانی روح حیات سے معمور ہیں، خواہ گدلے ہوں یا صاف۔ سمندر نمکین اور ساکن و مردہ نظر آتا ہے، لیکن سمندر کا مطالعہ گہری نظر

سے کیا جائے تو ہمیں اُس میں حرکت بھی دکھائی دیتی ہے اور زندگی بھی ۔ اس کی تہہ میں خاموش لہریں مسلسل ایک سمت سے دوسری سمت حرکت کر رہی ہیں اور سطح کا پانی جسے سورج کی حرارت اڑا لے جاتی ہے ، ضائع نہیں ہوتا ، بلکہ دور افتادہ مقاموں اور موسموں میں پھر نیچے گرتا ہے ۔ اُس کا شور زائل ہو جاتا ہے اور وہ حیات بخش بارش کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اوپر کی سطح کا پانی اڑ کر بادلوں کا لباس پہنتا جاتا ہے اور نچلی سطحوں کا پانی درجہ بہ درجہ گہرائی سے اوپر آتا رہتا ہے ۔ گویا سمندر متواتر ایک تخلیقی حرکت میں مصروف ہے اور پانی کے اس عظیم الشان ذخیرے کا اثر اس کے سواحل سے بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے ۔ کہیں یہ موسموں میں اعتدال پیدا کرتا ہے ، کہیں نباتات کی نشوونما کو تیزی بخشتا ہے ۔ اسی ذریعے سے دور افتادہ خطوں کے انسانوں اور جانوروں کے لیے زندگی کا سر و سامان ہوتا ہے ۔ ان میں وہ انسان اور خطے بھی شامل ہیں جنھوں نے اس کا نام بھی نہیں سنا[1] ‘‘ ۔

ہمہ گیر سلطنت کے ذریعے سے جو مجلسی تحریکات وجود میں آتی ہیں اُن کی حرکت عمودی بھی ہوتی ہے اور اُفقی بھی — اُفقی حرکت کی مثال رومی سلطنت میں طبی جڑی بوٹیوں کی نقل و حرکت میں ملتی ہے ۔ اس کی شہادت پلینی[2] کلاں نے اپنی تاریخ طبیعیات میں پیش کی ہے ۔ اسی طرح عربی خلافت میں کاغذ مشرق سے انتہائے مغرب تک پہنچا ۔ کاغذ ۷۵۱ء میں چین سے سمرقند لایا گیا ، ۷۹۳ء میں اس کا استعمال بغداد میں شروع ہوا ۔ وہاں سے یہ ۹۰۰ء میں قاہرہ اور ۱۱۰۰ء کے لگ بھگ فاس[3] میں پہنچا جو اوقیانوس کے عین سامنے ہے ۔

۱- ٹائن بی کی کتاب ’’یونان کی میراث‘‘ (مطبوعہ کلارنڈن پریس آکسفورڈ ۱۹۲۲ء) صفحہ ۳۲۰ ۔

۲- Elder Pliny ، پیدایش ۲۳ء وفات ۷۹ء ۔ یہ طبیعیات کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتا رہا ۔

۳- Fez مراکش کا دارالحکومت ۔

۱۱۵۰ء میں کاغذ جزیرہ نمائے آئی بیریا[1] کے مقام شاطبہ[2] میں رواج پذیر ہوا۔

اُفقی حرکتیں بعض اوقات نظروں سے مخفی رہتی ہیں، لیکن مجلسی اثرات کے اعتبار سے عموماً بہت اہم ہوتی ہیں۔ اس کی مثال ہمیں ٹوکوگاوا شوگنیٹ[3] کی سرگزشت میں ملتی ہے جو جاپان میں مشرق بعید کے معاشرے کی ہمہ گیر سلطنت تھی۔ ٹوکوگاوا کی حکومت نے جزیرۂ جاپان کو باقی دنیا سے الگ کر دینے کا عزم کیا اور قریباً دو صدی تک سیاسی قوت کے بل پر اپنے اس مقصد میں کامیاب رہی، لیکن یہ منفصل جاپانی سلطنت کے اندر مجلسی تغیرات کی رفتار کو روک نہ سکی؛ اگرچہ اس نے جاگیرداری کے نظام کو زیادہ پختہ اور محکم بنا دینے کی کوشش کی تھی جو اسے دور مصائب سے میراث میں ملا تھا۔

> جاپان کے اندر اقتصاد زر کے داخلے نے نرم رفتار، مگر بے پناہ انقلابی قوت پیدا کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیردارانہ نظام حکومت درہم برہم ہو گیا اور دو سو سال سے زیادہ مدت کی علیحدگی کے بعد ممالک غیر سے ربط ضبط بحال ہوا۔ دروازے کھولنے کی ذمہ داری باہر کے بلاوے پر نہیں، بلکہ اندر کے انفجار پر تھی۔ نئی اقتصادی قوتوں کا پہلا اثر یہ تھا کہ شہر میں رہنے والے لوگوں کی دولت میں بہت اضافہ ہو گیا، جاگیرداروں اور دھقانوں کو نقصان پہنچا - - - - - شروط الخدمت جاگیرداروں اور ان کے لواحقوں نے عیش و عشرت کے اُن سامانوں پر اندھا دھند روپیہ خرچ کرنا شروع

۱- Iberian Peninsula جزیرہ نمائے ھسپانیہ و پرتگال۔

۲- Jativa عرب اسے شاطبہ کہتے تھے۔ یہ صوبہ بلنسیہ کا پرانا شہر ہے۔ یورپ میں سب سے پہلے کاغذ یہیں بنا تھا اور یہ مسلمانوں نے بنایا تھا، پھر آہستہ آہستہ اس کا رواج یورپ کے باقی حصوں میں ہوا۔

۳- Tokugawa Shogunate ٹوکوگاوا ایک جرنیل کا نام تھا؛ شوگن جاپانی میں میدان جنگ کے سالار کو کہتے ہیں۔ چونکہ پہلا ٹوکوگاوا جس نے سلطنت کا نظام سنبھالا، سپہ سالار تھا، اس لیے اس کا نظام حکومت ٹوکوگاوا شوگنیٹ کہلاتا ہے۔ انیسویں صدی میں یہ اقتدار ختم ہوا۔

کیا جنھیں کاریگر بناتے اور تاجر فروخت کرتے تھے ۔ عام بیان کے مطابق ۱۷۰۰ء کے آس پاس یہ حالت پیدا ہو گئی تھی کہ جاگیرداروں کے سونے اور چاندے کے پورے انبار شہری لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو گئے تھے ۔ اس کے بعد جاگیرداروں نے قرض پر چیزیں خریدنی شروع کیں ۔ تھوڑے ہی عرصے میں تاجروں نے انھیں قرض کی زنجیروں میں جکڑ لیا اور مجبور کر کے اُن کے حقوق خریدنے لگے ۔۔۔۔ بد عملیوں نے تباہی کی رفتار تیز اور شدید کر دی ۔ تاجروں نے چاولوں کی دلالی اختیار کر لی پھر وہ سٹہ کھیلنے لگے ۔ ان حالات سے سب لوگوں نے نہیں ، بلکہ ایک جماعت کے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ۔ یہ تاجر تھے ، خصوصاً ان میں سے وہ لوگ جو دلال اور ساہوکار تھے ؛ حالانکہ ان شہریوں کو پہلے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور جاگیردار ان میں سے کسی ایک کو محض ہتک آمیز کلمہ کہہ دینے پر قتل بھی کر سکتے تھے ۔ ان شہریوں کا مجلسی درجہ بدستور فرو تر تھا ، لیکن دولت اُن کے ہاتھ میں تھی اور انھوں نے اقتدار حاصل کر لیا تھا ۔ ۱۷۰۰ء میں وہ سلطنت کے اندر نہایت زبردست اور حد درجہ کارفرما عنصر بن چکے تھے ۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں فوج کی باگ دوڑ تھی اُن کا اثر و رسوخ آہستہ آہستہ زائل ہو رہا تھا[1] ۔

اگر ہم ۱۵۹۰ء کو ہمہ گیر جاپانی سلطنت کے قیام کی تاریخ قرار دیں ، جس وقت ہدے اوشی[2] اپنے مخالفوں کو مغلوب کر لینے میں کامیاب ہوا ، تو ہم پر واضح ہوتا ہے کہ ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت میں سمندر کی تہ کے پانی اوپر کی سطح پر آ گئے اور خونریزی کے بغیر اس معاشرے میں مجلسی انقلاب پیدا ہو گیا ، جسے ہدے اوشی کے جانشینوں نے قریباً افلاطونی طریقے

۱- سین سم G. B. Sansom کی کتاب "جاپان ، ایک مختصر ثقافتی تاریخ" (مطبوعہ لندن ۱۹۳۲ء) صفحہ ۲۶۰-۲۶۲ ۔

۲- Hideyoshi ۔

سے معیاری استحکام بخشنے کی کوشش کی تھی - نتیجہ اس لحاظ سے اور بھی اثر انگیز بن جاتا ہے کہ ٹوکوگاوا شوگنیٹ کی ہمہ گیر سلطنت ثقافتی نقطۂ نگاہ سے غیر معمولی طور پر یک رنگ تھی -

ہمہ گیر سلطنتوں کی حیثیت ناقلیت کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جو ہم اپنی تاریخی معلومات سے مہیا کر سکتے ہیں -

۲- نفسیات امن

ہمہ گیر سلطنت کو اس کے بانی دور مصائب کی پریشان حالیوں کے لیے اکسیر کی حیثیت میں عائد کرتے ہیں اور رعایا اس سلطنت کو اکسیر ہی کی حیثیت میں قبول کرتی ہے - نفسیات کی اصطلاحات کے مطابق اس ادارے کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اتحاد و آشتی پیدا کر دے اور یہ اس مرض کا حقیقی علاج ہوتا ہے جس کی صحیح تشخیص ہو چکتی ہے - مرض کی کیفیت یہ ہے کہ گھر کے مختلف افراد بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف کام کرنے لگتے ہیں اور اس انشقاق کا اثر دوگونہ ہوتا ہے - آفقی لحاظ سے یہ انشقاق متخالف مجلسی طبقوں میں پیدا ہوتا ہے اور عمودی لحاظ سے متحارب سلطنتوں میں - دور سابق کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں باہم لڑتی رہتی تھیں ، ان میں سے جو بچ رہتی ہے اسے بانیان سلطنت ہمہ گیر سلطنت کی حیثیت دے دیتے ہیں اور اس سلطنت کے ذریعے سے چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی مقتدر اقلیتوں کے درمیان اتحاد و آشتی قائم کی جاتی ہے جو مسخر ہو چکتی ہیں - عدم تشدد قلب کی ایک خاص حالت ہے اور روش کا ایک اصول ہے جسے مجلسی زندگی کے کسی ایک دائرے میں محدود نہیں رکھا جا سکتا ، لہٰذا ایک مقتدر اقلیت اپنے داخلی تعلقات میں جو اتحاد و آشتی پیدا کرنا چاہتی ہے اسے اس اقلیت کے داخلی اور خارجی پرولتار تک توسیع دی جاتی ہے اور اس اجنبی تہذیب سے بھی اسی قسم کا رابطہ استوار کیا جاتا ہے ، جس کے ساتھ انحلال پذیر تہذیب کا تعلق ہوتا ہے -

یہ عالم گیر اتحاد و آشتی مختلف مستفیدین کو مختلف درجوں میں فائدہ پہنچاتی ہے - مقتدر اقلیت اس کے ذریعے سے ایک حد تک اپنی حیثیت بہتر بنا لیتی ہے - پرولتار کو اس کے ذریعے سے مقابلۃً زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ مقتدر اقلیت کی زندگی کا سر چشمہ خشک ہو جاتا ہے اور

صلح و آشتی کے تمام مسالے مل کر بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ انحطاط کی مدت کو لمبا کر دیں۔ یہ بائرن[1] کا گستاخانہ تبصرہ ہے جو اس نے جارج سوم شاہ انگلستان کی نعش پر کیا تھا۔ یہی مسالے پرولتار کی قوتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمہ گیر سلطنت متارکہ قائم کر دیتی ہے تو پرولتار کی قوت بڑھتی ہے اور مقتدر اقلیت کی قوت میں کمی آتی ہے۔ ہمہ گیر سلطنت کے بانی اس غرض سے رواداری پر عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان کشمکش کے امکانات زائل ہو جائیں۔ اس سے داخلی پرولتار کو موقع مل جاتا ہے کہ ایک ہمہ گیر مذہبی نظام قائم کر دے۔ اس سلطنت کی رعایا کی عسکری روح سو جاتی ہے اور بربریوں کے خارجی پرولتار یا ہمسایہ اجنبی تہذیب کو موقع مل جاتا ہے کہ بہ زور اندر آ جائے اور اس داخلی پرولتار پر تسلط حاصل کر لے جو سیاسی سطح پر سکون پذیری کا پابند ہو جاتا ہے، اگرچہ مذہبی سطح پر کتنا ہی سرگرم ہو۔

باقی رہا یہ امر کہ مقتدر اقلیت اپنے پیدا کردہ حالات سے خود فائدہ اٹھانے میں کیوں نسبتاً ناکام رہتی ہے، تو وہ یوں واضح ہو جاتا ہے کہ یہ نہ کوئی فلسفہ پیدا کرتی ہے نہ کوئی مذہب جو اوپر سے نیچے کی طرف آئے۔ اس کے برعکس یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ داخلی پرولتار ہمہ گیر سلطنت کی پیدا کردہ فضائے امن سے انتہائی فائدہ اٹھاتے ہیں، یعنی وہ ایک اعلیٰ مذہب پیدا کر کے نیچے سے اوپر تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح ہمہ گیر مذہبی نظام قائم ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر مصر کی وسطانی سلطنت[2] ابتدائی ہمہ گیر سلطنت تھی۔ اس کے اندر آزیرس کا مذہبی نظام پیدا ہوا۔ نئی بابلی سلطنت بابل کی ہمہ گیر سلطنت تھی اور اس کی جانشین اجنبی سلطنتوں، یعنی ہخامنشی سلطنت اور سلیوکی بادشاہی میں یہودیت اور زرتشتیت نے ویسا ہی فائدہ اٹھایا۔ رومیوں نے جو امن قائم کر دیا تھا، اس سے متعدد متصادم پرولتاری مذاہب نے استفادہ کیا، مثلاً سیبل اور آئی سس کی پوجا یا متھرائیت یا مسیحیت۔

۱- Byron ، انگریزی زبان کا مشہور شاعر۔

۲- The Middle Empire ۔

چینی دنیا میں جو امن قائم ہوا تھا اس میں ایک ہندی پرولتاری مذہب ، یعنی مہایان اور ایک ملکی چینی پرولتاری مذہب ، یعنی تاؤازم کے درمیان مقابلہ ہوا ۔ عربی خلافت نے اسلام کے لیے اور گپت خاندان کے راج نے ہندی دنیا میں ہندویت کے لیے آگے بڑھنے کے مواقع مہیا کیے ۔ تاتاری سلطنت نے تھوڑے عرصے کے لیے بحرالکاہل کے مغربی ساحل سے بحیرۂ بالٹک کے مغربی ساحل تک شرقاً غرباً اور سائبیریا کے برفستانوں کی جنوبی حد سے صحرائے عرب اور برما کے جنگلات کی شمالی حد تک شمالاً جنوباً امن قائم کر دیا تھا ؛ اس مہلت سے مختلف مذاہب کے مبلغوں نے فائدہ اٹھایا ۔ اگرچہ اس امن کی مدت بہت ہی کم تھی ، تاہم یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس سے نسطوریوں ، مغربی مسیحی کیتھولک کلیساؤں ، اسلام اور مہایان بدھ مت کے لاماؤں کو آگے بڑھنے کا خاص موقع ملا ۔

غرض اعلیٰ مذاہب کے ترجمان اس سازگار مجلسی نفسیاتی آب و ہوا سے اکثر فائدہ اٹھاتے رہے ہیں ، جو ہمہ گیر سلطنتیں پیدا کر دیتی ہیں ۔ بعض حالات میں وہ ترجمان اس نعمت کے معترف بھی رہے ہیں اور اسے انھوں نے ایک سچے خدا کا خاص عطیہ قرار دیا ہے ، جس کے نام پر وہ مذاہب کی اشاعت کرتے رہے ہیں ۔ یسعیاہ ثانی ، عذرا اور نحمیاہ کی کتابوں کے مصنف ہخامنشی سلطنت کو یہودیت کی تبلیغ کے لیے یہواہ کا منتخب آلۂ کار قرار دیتے تھے ۔ اسی طرح پوپ لیو اعظم (۴۴۰ء–۴۶۱ء) کی رائے رومی سلطنت کے متعلق یہ تھی کہ خدا نے مسیحیت کی اشاعت کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا اس سلطنت کے ذمے لگا دیا ہے ۔ وہ اپنے ۸۲ویں وعظ میں لکھتا ہے : ''اس کبھی نہ محو ہونے والے عمل رحمت (روح خدا وندی کا مسیح علیہ السلام کی شکل اختیار کر کے دنیا میں آنا) کے اثرات دنیا بھر میں پھیلانے کی غرض سے خدا نے رومی سلطنت کو وجود بخشا ۔''

عیسائیوں میں یہ خیال عام طور پر رائج ہو گیا تھا ، مثلاً ملٹن نے میلاد مسیح کے متعلق جو نظم لکھی ہے اس میں وہ کہتا ہے :

رزم و پیکار کی کوئی آواز ،\
دنیا کے کسی حصے میں نہیں سنی جاتی ۔\
برچھیاں اور ڈھالیں بیکار ہو گئیں ، انھیں دیواروں پر لٹکا\
دیا گیا ۔

جنگی رتھ بندھے کھڑے ہیں۔
دشمن کے خون کا کوئی ڈھبا ان پر موجود نہیں۔
تریاں اب کسی جنگی گروہ کو صلائے عام نہیں دیتیں۔
بادشاہ خاموش بیٹھے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں احترام
جھلک رہا ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا آقا اور مالک یقینی طور پر
قریب آ گیا ہے۔

ایسے مبارک موقع کو خدا کا عطیہ سمجھنا تعجب انگیز نہیں، تاہم کامیاب تبلیغی مذہبی نظام اور اس عالم گیر سلطنت کے درمیان تعلقات میں، جس کے اندر یہ کام کرتا ہے، رواداری کی فضا ہمیشہ قائم نہیں رہتی، حالانکہ مذہب کے لیے سازگار آغاز کا موقع رواداری ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ رواداری بعض اوقات اپنی ضد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بے شک ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں اس خوفناک نتیجے کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ آسیرس کے مذہب نے جبرو تشدد کو کبھی جائز نہ رکھا اور انجام کار یہ مذہب مصر کی مقتدر اقلیت کے مذہب میں شامل ہو گیا۔ اسی طرح چینی دنیا میں ایک طرف مہایان اور تاؤ ازم، دوسری طرف سلطنت ھن کے درمیان اس وقت تک امن قائم رکھا گیا جب تک دوسری صدی مسیحی کے اختتام پر چین کی ہمہ گیر سلطنت کا نظام درہم برہم نہ ہو گیا۔

جب ہم یہودیت اور زرتشتیت پر پہنچتے ہیں تو ہمارے لیے یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ نو بابلی سلطنت یا ھخامنشی سلطنت کے ساتھ ان کے تعلقات کی شکل کیا رہتی۔ افسوس کہ یہ دونوں ہمہ گیر سلطنتیں اپنی سرگزشت کے ابتدائی مراحل ہی میں ختم ہو گئیں۔ ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ جب ھخامنشی سلطنت کی جگہ اچانک سلیوکی سلطنت اور بعد ازاں دریائے فرات کے مغربی جانب رومی سلطنت نے لے لی تو اجنبی یونانی ثقافت کا دباؤ پڑنے لگا۔ سلیوکی اور رومی سلطنتیں اسی ثقافت کے کامیاب آلہ ہائے کار تھیں۔ اس وقت یہودیت اور زرتشتیت دونوں کی ہیئت بدل گئی۔ پہلے یہ عالم انسانیت کو نجات کا پیغام دیتی تھیں، اب یونانی معاشرے کے جارحانہ اقدام کے خلاف سریانی معاشرے کی ثقافتی جنگ کا آلۂ کار بن گئیں۔ اگر ھخامنشی سلطنت کو بھی دور یونانیت کے بعد کے اوتار، یعنی عربی خلافت

کی طرح لمبی زندگی بسر کرنے کا موقع مل جاتا تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ہخامنشیوں کی روادار شہنشاہی کے ماتحت زرتشتیت یا یہودیت وہی کارنامہ انجام دیتیں جو اسلام نے بعد میں انجام دیا ۔ اسلام اس وجہ سے تدریجاً قدم آگے بڑھاتا رہا کہ بنو امیہ کی روش غیر مسلموں کے متعلق بے پروایانہ تھی ۔ عباسیوں نے بڑے اہتمام سے رواداری کا طریقہ اختیار کیا اور غیر مسلموں کو ''اہل کتاب'' مانا ۔ جب عباسی حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا تو لوگوں نے گروہ در گروہ اسلام قبول کر لیا ، تاکہ وہ ''مسجد'' کے صحن میں پہنچ کر اس طوفان سے محفوظ ہو جائیں جو سیاسی خلا پیدا ہونے کے باعث تیزی سے بڑھا چلا آ رہا تھا ۔

اسی طرح ہندوستان میں گپت سلطنت موریہ سلطنت کے بکھرے ہوئے اجزاء کو از سر نو ملا دینے سے وجود میں آئی تھی اور معلوم ہے کہ موریہ سلطنت ہندوستان میں پہلی ہمہ‌گیر سلطنت تھی ۔ بدھ مت کے بعد جو اعلیٰ مذہب پیدا ہوا ، وہ ہندویت کہلاتا ہے ۔ ہندویت نے بدھ مت کے فلسفے کو خارج کرنے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ گپت سلطنت نے نہ محض اس کی مخالفت ہی نہ کی ، بلکہ سرکاری جبر و تشدد کے کسی اقدام سے بھی اسے عائد نہ کیا ۔ ہندی تہذیب کی روادارانہ اور اتحاد پسندانہ مذہبی خصوصیات سے اس طرز عمل کو کوئی مناسبت نہ ہوتی ۔

یہ ایسی مثالیں ہیں جن میں اعلیٰ مذہب نے ہمہ‌گیر سلطنت کے امن سے فائدہ اٹھایا اور حکومت نے اول سے آخر تک اس کے باب میں رواداری برتی ، لیکن ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں سرکاری جبر و تشدد نے مذہب کی امن پسندانہ ترقی میں خلل ڈال دیا ۔ پھر یا تو اسے شروع ہی میں دبا دیا گیا یا اس کی فطرت و حیثیت تبدیل ہو گئی ، یعنی مذہب نے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا یا مقابلے کے لیے ہتھیار سنبھال کر کھڑا ہو گیا ۔ مغربی کیتھولک مسیحیت سترھویں صدی میں جاپان سے اور اٹھارھویں صدی میں چین سے قریب قریب بالکل خارج کر دی گئی ۔ اسلام نے تاتاریوں کے ماتحت چین کے دو صوبوں میں قدم جمائے ۔ اس کے بعد مسلمان ایک اجنبی اقلیت کے سوا کوئی حیثیت حاصل نہ کر سکے ۔ اُن کی حالت اس درجے بے یقینی کی تھی کہ مجبوراً انھیں بار بار ہتھیار سنبھال کر اٹھنا پڑا ۔

مسیحیت اور رومی سلطنت کے درمیان بھی قوت آزمائی ہوئی ، جس میں

انجام کار مسیحیت نے کامیابی حاصل کی ۔ اس قوت آزمائی سے جو ناخوشگوار اثرات پڑے ان کی حیثیت مقابلۃً بہت معمولی تھی ۔ قسطنطین کے مسیحیت قبول کر لینے تک تین صدیاں گزریں ، اس پوری مدت میں مسیحی کلیسا کو برابر یہ خطرہ لگا رہا کہ خدا جانے کب رومی پالیسی سے تصادم کا موقع آ جائے ۔ شہنشاہی کے دور میں رومی حکومت کو ایک تو ہر قسم کے نجی اجتماعات کے متعلق شبہ تھا ہی ، اس کے علاوہ رومیوں کے دل میں پہلے سے یہ خیال بیٹھا ہوا تھا کہ نجی اجتماعات کو اجنبی مذاہب کی اشاعت یا ان پر عمل کا موقع نہ دینا چاہیے ۔ رومی حکومت دو موقعوں پر اپنی اس سخت گیر پالیسی میں نرمی اختیار کر چکی تھی ۔ اول ہینی بال کے ساتھ جنگ کے نازک دور میں اس نے سیبل کی پرستش کو سرکاری لحاظ سے مسلم مان لیا ؛ دوسرے یہودیت کے متعلق رواداری برابر قائم رہی ، اگرچہ جنونی یہودیوں نے رومہ کو بار بار اشتعال دلایا اور اس وجہ سے یہودی سلطنت کا نقش محو کر دیا گیا ۔ دوسری صدی قبل مسیح میں باخوسیوں کی اوباشی کو سختی سے دبا دیا گیا تھا ، تیسری صدی عیسوی میں مسیحیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ ہوا ، لیکن مسیحی کلیسا سرکاری جبر و تشدد کے جواب میں جبر و تشدد اختیار کرنے سے محترز رہا ۔ اس نے سیاسی یا فوجی اجتماعات کی شکل اختیار نہ کی ۔ اس کا صلہ یہ ملا کہ مسیحیت نے ہمہ گیر مذہبی نظام کا درجہ حاصل کر لیا اور وہی مستقبل کی وارث بن گئی ۔!

تاہم امتحان کی اس منزل سے مسیحی کلیسا صحیح سالم باہر نہ آ سکا ، جسے حلم اور بردباری کی بدولت رومی قوت پر فتح حاصل ہوئی تھی ، اس سبق کو دل میں بٹھا لینے کے بجائے مسیحیت نے شکست خوردہ جابروں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں ، اور جس گناہ نے ان جابروں کو ناکام بنایا تھا ان کے ختم ہو جانے کے بعد اخلاقی انتقام کا گناہ خود اختیار کر لیا ۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مسیحیت نے جبر و تشدد کو اپنا شیوہ بنایا اور وہ لمبی مدت تک اس پر عمل پیرا رہی ۔

مقتدر اقلیت ہمہ گیر سلطنت کی تخلیق و قیام کا بندوبست کرتی ہے ؛ داخلی پرولتار اعلیٰ مذہب پیدا کرتے ہیں اور روحانی سطح پر ہمہ گیر سلطنت سے زیادہ تر فائدہ اٹھاتے ہیں ، البتہ سیاسی سطح پر فائدہ اٹھانے والے دوسرے لوگ ہیں ۔ ہمہ گیر سلطنت کے ماتحت نفسیات امن کی پابندی حاکموں کو

اپنی سیاسی میراث محفوظ رکھنے کے قابل نہیں چھوڑتی - چنانچہ نفسیاتی تخفیف اسلحہ کے اس عمل سے فائدہ اٹھانے والے نہ حاکم ہوتے ہیں، نہ محکوم، نہ مقتدر اقلیت، نہ داخلی پرولتار، بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حدود سلطنت کے باہر سے اٹھ کر اندر آتے ہیں؛ خواہ وہ انحلال پذیر معاشرے کے خارجی پرولتار ہوں یا کسی اجنبی تہذیب کے نمائندے -

ہم اس کتاب میں ایک موقعے پر بتا چکے ہیں کہ جب کوئی تہذیب محو ہوتی ہے ——— واضح رہے کہ یہ حالت شکست و انحلال سے الگ ہے ——— تو ختم شدہ معاشرے کی ہمہ گیر سلطنت پر یا تو بربری جنگجو سردار قابض ہو جاتے ہیں، جو حواشی کے آس پاس بیٹھے تھے یا وہ فاتح سب کچھ سنبھال لیتے ہیں جو کسی دوسرے معاشرے سے متعلق ہوں اور جداگانہ ثقافت لے کر آئیں یا بعض حالتوں میں دونوں کے تصرف سے سابقہ پڑتا ہے، یعنی پہلے ایک آتا ہے پھر دوسرا - بربری یا اجنبی جابر ہمہ گیر سلطنت کی نفسیاتی فضا کے باعث اپنے غارت گرانہ مقاصد کے پیش نظر جو فائدے حاصل کرتے ہیں وہ بالکل ظاہر ہیں اور سرسری طور پر دیکھا جائے تو خاصے وقیع معلوم ہوتے ہیں - ساتھ ہی ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ شکست پذیر ہمہ گیر سلطنت کے متروکہ علاقوں میں جو بربری حملہ آور پہنچتے ہیں، وہ ہیرو ضرور ہوتے ہیں، لیکن اُن کا مستقبل کچھ نہیں ہوتا - بعد میں آنے والی نسلیں اُنھیں بد نام طالع آزماؤں کے سوا کچھ نہیں سمجھتیں اور رزمیہ نظموں کی زبان میں وہ اپنے ہاتھوں اپنے لیے لوح مزار تیار کر جاتے ہیں - ایکی لیز جیسے شخص کو بھی ''ایلئیڈ'' جیسی نظم ہی ہیرو بنا سکتی ہے - باقی رہے اجنبی تہذیب کے مجاہد مشنریوں کے کارنامے تو یہ کلیساؤں کے تاریخی کارناموں کے مقابلے میں غیر متعین اور حوصلہ فرسا ہوتے ہیں -

ہم دو ایسی مثالیں پیش کر چکے ہیں جن میں ہمہ گیر سلطنت قبل از وقت اجنبی فاتحوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئی اور تہذیب پردۂ اخفا میں بیٹھ کر صدیوں تک بے حس و حرکت رہی - اُسے صرف یہ انتظار تھا کہ کب سازگار موقع آتا ہے - یہ موقع پاتے ہی وہ اُٹھی، خلل انگیز تہذیب کو باہر نکالا اور ہمہ گیر سلطنت کا کام اُسی مقام سے سنبھال لیا، جس مقام پر اُس میں خلل پیدا ہوا تھا - ہندی تہذیب نے تقریباً

چھ سو سال کے بعد یہ کارنامہ قوت کے بل پر انجام دیا ، اور سریانی تہذیب تقریباً ایک ہزار سال تک یونانی طوفان میں غرق رہنے کے بعد اُبھری۔ ہندی تہذیب کا کارنامہ گپت سلطنت تھی اور سریانی تہذیب کا عربی خلافت۔ ان دونوں نے وہی ہمہ گیر سلطنتیں سنبھالی تھیں جو بالترتیب پہلے موریہ سلطنت اور ہخامنشی سلطنت کی شکل میں ظہور پذیر ہو چکی تھیں۔ اس کے برعکس بابلی اور مصری معاشرے انجام کار سریانی معاشرے میں جذب ہو گئے؛ اگرچہ بابلی معاشرہ بخت نصر کی نو بابلی سلطنت کی شکست سے چھ سو سال بعد تک بھی اپنا ثقافتی تشخص بحال رکھنے میں کامیاب رہا۔ مصری معاشرے نے یہ تشخص کم و بیش دو ہزار سال تک قائم رکھا ، حالانکہ عام تصور کے مطابق اس کی زندگی وسطانی سلطنت کے ساتھ ہی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔

ایک تہذیب دوسری کو جبراً نگلنے اور ہضم کر جانے کی جو کوشش کرتی ہے ، تاریخی شواہد کی بنا پر اس کے لیے دو متبادل حل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ شہادتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ایسی کوشش انجام کار کامیاب بھی ہو جائے تو نتیجے کے بارے میں یقین حاصل کرنے کے لیے صدیاں ، بلکہ ہزارہا سال درکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ مغربی تہذیب نے اپنی معاصر تہذیبوں کو نگل جانے کی جو کوششیں کیں ، اُن کے نتیجے کے متعلق بیسویں صدی کے مورخوں کو پیش گوئی کرتے وقت انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے ، اس لیے کہ ایسی قدیم ترین کوششوں پر بھی بہت کم وقت گزرا ہے اور جس کہانی کے اوراق ہمارے سامنے یکے بعد دیگرے کھل رہے ہیں ، اس کا بہت ہی تھوڑا حصہ ہم نے دیکھا ہے۔

مثال کے طور پر ہسپانیہ نے وسطی امریکہ کی دنیا فتح کی اور اسے ’’ہسپانیہ نو‘‘ کا نام دیا۔ پہلے ہسپانوی بادشاہوں کی طرف سے وہاں نائب السلطنت مقرر ہو کر جاتے تھے ، پھر میکسیکو میں جمہوریت قائم ہوئی اور نائب السلطنتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اُس جمہوریت نے مغربی حکومتوں کے اجتماع میں داخلے کی کوشش کی اور وہ کامیاب ہو گئی۔ ممکن ہے اس بنا پر سمجھا گیا ہو کہ وسطی امریکہ کا معاشرہ مغربی معاشرے میں جذب ہو چکا ہے اور اس حقیقت کو مسلم مان لینے میں کلام کی گنجائش نہیں ، لیکن میکسیکو میں ۱۸۲۱ء کے انقلاب کے بعد ۱۹۱۰ء میں ایک نیا انقلاب آیا ، جس میں دبا ہوا اور بے حس و حرکت ملکی معاشرہ ایک دم اُبھرا۔ اُس نے

اپنا سر اُٹھایا اور ثقافت کے اس چھلکے کو توڑ ڈالا جسے کیسٹیل [1] کے ھاتھوں نے تیار کیا تھا - جس جسم کو فاتحین ھسپانیہ اپنے خیال کے مطابق قتل کر کے قبر میں سلا چکے تھے ، وہ پھر زندہ ھو گیا - وسطی امریکہ کے اس نشان سے یہ سوال سامنے آگیا ھے کہ مغربی مسیحیت نے آنڈی دنیا یا دوسرے خطوں میں نظر بہ ظاھر جو ثقافتی فتوحات حاصل کیں آیا وہ زود یا بہ دیر اسی طرح سطحی اور عارضی تو ثابت نہ ھوں گی ؟

چین ، کوریا اور جاپان میں مشرق بعید کی تہذیب گزشتہ صدی کے اندر مغربی اثرات کے روبرو سرنگوں ھو چکی تھی - یہ اثرات وسطی امریکہ کے اثرات سے بہ ظاھر بہت زیادہ قوی تھے - اگر چار سو سال کے گہن کے بعد میکسیکو کی ملکی ثقافت از سر نو بروئے کار آگئی تو یہ سمجھ لینا سراسر خلاف احتیاط ھوگا کہ مشرق بعید کی ثقافت کے لیے مغرب یا روس کی ثقافت میں جذب رھنا مقدر ھو چکا ھے -

اب ھندو دنیا پر نظر ڈالیے ؛ یہاں ۱۹۴۷ء میں دو حکومتیں برطانوی راج کی جانشین بن گئیں - کہا جا سکتا ھے کہ میکسیکو میں جو کچھ ۱۸۲۱ء کے انقلاب کے بعد ظہور پذیر ھوا تھا ، وہ ھندوستان میں پر امن طریق پر پورا ھو گیا - یہ سطریں لکھتے وقت پیش گوئی کی جا سکتی ھے کہ سیاسی آزادی نے بہ ظاھر مغربیت کے عمل پر مہر لگا دی اور ھم آزاد حکومتوں کو مغربی قوموں کے اجتماع میں لے آئے ، تاھم یہ بھی ھو سکتا ھے کہ اسے اس معاشرے کی ثقافتی آزادی کی طرف پہلا قدم قرار دیا جائے جو عارضی طور پر مغربی لہروں میں ڈوب گیا تھا -

عربی ممالک آزاد حکومتوں کی حیثیت میں مغربی جمعیت اقوام کے اندر داخل ھو رھے ھیں - انھیں یہ موقع اس وجہ سے ملا ھے کہ وہ عثمانی سلطنت کے سیاسی اقتدار اور ایرانی ثقافت کے رنگ روغن سے آزاد ھو گیے ، جنھوں نے چار صدیوں تک انھیں بے دست و پا بنائے رکھا تھا ؛ لیکن کیا اس امر میں شک کرنے کی کوئی معقول دلیل پیش کی جا سکتی ھے کہ عربی ثقافت کی خوابیدہ قوت بقا زود یا بہ دیر بروئے کار نہ آئے گی اور مغرب کی بدرجہا زیادہ

۱- Castile ، ھسپانیہ کا ایک مرکزی مقام جہاں کے بادشاہ فرڈی ننڈ نے ھسپانیہ کو متحد کیا تھا -

اجنبی ثقافت کے اثرات کو ختم نہ کر ڈالے گی ؟

ثقافتی تبدیلی کے قطعی اثرات کا ہم نے جو جائزہ لیا آس سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ ہمہ گیر سلطنتیں جو خدمات انجام دیتی ہیں آن سے داخلی پرولتار کے سوا کسی کو یقینی اور قطعی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ خارجی پرولتار کے فوائد ہمیشہ ہوائی ہوتے ہیں اور اجنبی تہذیب جو فائدے حاصل کرتی ہے آن میں نا پائداری کا عنصر شامل رہتا ہے ۔

۳۔ سامراجی اداروں کی صلاحیت خدمت

ہم ہمہ گیر سلطنتوں کی دو عمومی خصوصیتوں کے اثرات کا جائزہ لے چکے ہیں ، ایک ناقلیت اور دوسری امن ؛ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ سلطنتیں جو خاص ادارے ارادۃً پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہیں ان سے مستفیدین کیا کام لیتے ہیں ۔ یہ ادارے ایسے کاموں کے لیے بھی استعمال ہوسکتے ہیں جو بانیوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے ۔ ہم نے اداروں کی اصطلاح ایک حد تک عمومی حیثیت میں استعمال کی ہے اور اس میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں : وسائل حمل و نقل ، چھاؤنیاں ، نوآبادیاں ، صوبے ، دارالحکومت ، سرکاری زبانیں اور رسم الخط ، فوجیں ، سول سروس ، شہریت — ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ غور کریں گے ۔

وسائل حمل و نقل

وسائل حمل و نقل کو ہم نے اس لیے سرفہرست رکھا ہے کہ یہ سب سے اہم ادارہ ہے جس پر ہمہ گیر سلطنت کی ہستی موقوف ہوتی ہے ۔ انھیں وسائل کے ذریعے سے سلطنت اپنے علاقوں پر صرف فوجی کنٹرول ہی نہیں ، بلکہ سیاسی کنٹرول بھی قائم رکھتی ہے ۔ انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے سامراج کی بقا کے ان سہاروں میں انسانوں کی بنائی ہوئی سڑکوں سے بدرجہا زیادہ چیزیں شامل ہیں ، اس لیے کہ دریا ، سمندر یا لق و دق صحراؤں کی طبعی شاہراہیں اس وقت تک حمل و نقل کے عملی وسائل نہیں بن سکتیں جب تک ان کی نگرانی کا مؤثر انتظام نہ ہو ۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے وسائل فراہم کیے جائیں ۔ تاریخ جن ہمہ گیر سلطنتوں سے آگاہ ہے ان میں سے اکثر نے اپنے یہاں ڈاک

کے سلسلے جاری کیے اور ڈاک کے منتظمین مرکزی یا مقامی راستوں کی نگرانی کا کام بھی انجام دیتے تھے؛ مثلاً ۳۰۰۰ ق - م میں سمیر اور اکاد کی سلطنتوں میں ڈاک کے انتظام کو سرکاری مشینری کا جزو سمجھا جاتا تھا - دو ہزار سال بعد ہمیں ہخامنشی سلطنت میں یہ ادارہ بدرجہا زیادہ منظم اور اصلح نظر آتا ہے - ہخامنشیوں نے سامراجی وسائل حمل و نقل کے نظام کو صوبوں پر مرکزی حکومت کے کنٹرول کا ذریعہ بنا رکھا تھا - رومی سلطنت اور عربی خلافت نے بھی نظم و نسق میں اس ادارے سے یہی کام لیا -

اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ایسے ہی ادارے تمام ہمہ گیر سلطنتوں میں چین سے پیرو تک پائے جاتے ہیں - چین کی ہمہ گیر سلطنت کے انقلابی بانی سین شی ہونگ ٹی[1] نے اپنے دارالحکومت سے سلطنت کے تمام حصوں تک سڑکیں بنوائیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے نہایت عمدہ انتظامات کیے - اسی طرح انکاؤں نے اپنی فتوحات کو سڑکوں کے ذریعے سے مستحکم بنایا - مثال کے طور پر کزکو[2] سے کوئٹو[3] تک پرواز طائر کے لحاظ سے ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے - سڑک کے ذریعے سے یہ فاصلہ کم و بیش ڈیوڑھا ہو جائے گا، تاہم وسائل حمل و نقل کا انتظام اتنا عمدہ تھا کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر پیغام صرف دس روز میں پہنچ جاتا تھا -

ظاہر ہے کہ ہمہ گیر سلطنتیں جو سڑکیں بناتی اور قائم رکھتی ہیں وہ ان تمام مقاصد کے لیے استعمال ہو سکتی ہیں جن کا بانیوں کو خواب و خیال بھی نہ تھا - اگر رومی سلطنت کی سڑکیں عمدہ نہ ہوتیں تو حملہ آور خارجی پرولتار کے جن جنگجو جتھوں نے سلطنت کے آخری دور میں قزاقی و غارت گری شروع کی وہ اتنی تیزی سے یورشیں نہ کر سکتے، لیکن ایلارک سے بھی زیادہ دلچسپ افراد ان سڑکوں سے کام لیتے ہوئے پائے گئے ہیں - مثلاً قیصر آگسٹس نے پسیڈیا[4] کو رومی امن کے دائرے میں لے لیا تھا، اس طرح

۱- Ts'in She Hwang-ti -

۲- Cuzco - یہ جنوبی امریکہ کے ملک پیرو کا مشہور مقام ہے -

۳- Quito - یہ جنوبی امریکہ کے ملک ایکواڈور میں واقع ہے -

۴- Pisidia - زمانۂ قدیم میں ایشیائے کوچک کئی صوبوں میں بٹا ہوا تھا، ان میں سے ایک پسیڈیا بھی تھا -

نادانستہ اُس نے پولوس رسول کے لیے سفر کا راستہ ہموار کر دیا ، چنانچہ رسول موصوف نے جب پہلا تبلیغی سفر شروع کیا تو وہ پمفیلیا[۱] میں آترا اور پسیڈیا کے شہر انطاکیہ[۲] ، آئی کونیم[۳] لسٹرا[۴] اور ذرب[۵] تک بے خوف و خطر چلا گیا - پھر پومپی[۶] نے بحری قزاقوں کو ختم کر دیا ؛ اس سے پولوس رسول نے یہ فائدہ اٹھایا کہ فلسطین کے شہر قیساریہ[۷] سے آخری بحری سفر پر روانہ ہوا اور اٹلی کے مقام پیوٹی اولی[۸] پہنچ گیا - نہ اسے قزاقوں کا کوئی خطرہ پیش آیا ، نہ طوفان سے سابقہ پڑا اور نہ جہاز کو نقصان پہنچا -

پولوس رسول کے جانشینوں کے لیے رومی امن نے بڑا سازگار مجلسی ماحول مہیا کر دیا تھا - اس سلطنت کو قائم ہوئے دوسری صدی گزر رہی تھی ، اس کے آخری دور میں لیونز[۹] کے سینٹ آئی ری نائیوس[۱۰] نے سلطنت کے وسائل حمل و نقل کو انتہائی خراج تحسین ادا کیا اور کہا کہ یونانی دنیا میں کیتھولک کلیسا کی وحدت انھی وسائل پر موقوف ہے - وہ کہتا ہے ''کلیسا کو یہ انجیل اور یہ عقیدہ ملا اور اگرچہ اس کے پیرو دنیا کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں ، لیکن (وسائل حمل و نقل کی بدولت) کلیسا نے تمام بکھرے ہوئے اجزاء کو اس طرح باہم مربوط کر رکھا ہے گویا وہ سب ایک چھت کے نیچے جمع ہیں'' دو سو سال گزر گئے تو ایک آزردہ لامذہب مورخ امیانوس مارسی لینس[۱۱] نے یہ شکایت کی کہ اسقفوں اور بطریقوں کے جھنڈ

۱- Pamphylia ، ایشیائے کوچک کا ایک قدیم قصبہ جو ساحل بحر پر واقع تھا -

۲- Antioch ، یہ انطاکیہ پسیڈیا میں واقع تھا ؛ اس نام کا ایک اور مشہور شہر شام میں تھا ، جو اب سنجق اسکندرونا میں واقع ہے -

۳- Iconium ، اسے آج کل قونیہ کہتے ہیں ، جہاں مولانا رومؒ کا مزار ہے -

۴- Lystra -

۵- Derbe -

۶- Pompey ، مشہور رومی جرنیل -

۷- Caesarea -

۸- Puteoli - یہ مقام اٹلی کے مغربی ساحل پر نیپلز کے قریب تھا -

۹- Lyons -

۱۰- Saint Irenaeus -

۱۱- Ammianus Marcellinus -

ڈاک کی سڑکوں اور چوکیوں سے فائدہ اٹھا کر ادھر اُدھر بھاگے دوڑے پھرتے اور مجالس کلیسا کا کام انجام دے رہے ہیں۔

ہم بہت سی مثالیں روشنی میں لے آئے ہیں[1] جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جن مستفیدین کے لیے وسائل حمل و نقل نہیں بنے تھے، انھوں نے بھی ان سے انتہائی فائدہ اٹھایا۔ ہم اس رجحان کو ایک ''تاریخی قانون'' کی مثال قرار دے سکتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں اس نتیجے نے اُس دنیا کے مستقبل کی نسبت ایک اہم سوال پیدا کر دیا ہے جس میں مغربیت کا عمل جاری ہے اور اسی دنیا میں موجودہ کتاب کا مصنف اور اُس کے معاصر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۱۹۵۲ء تک اہل مغرب کی ہمت اور ہنرمندی ساڑھے چار سو سال سے استعمال ہوتی رہی ہے اور انھوں نے پوری قابل آبادی اور قابل گزر دنیا میں حمل و نقل کے وسائل کا جال بچھا دیا ہے۔ اُن سے ایسے طریقے پر کام لیا جا رہا ہے کہ سرعت سیر میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ موجودہ مغربی یورپ کے جن ملاحوں نے سب سے پہلے سمندروں میں قدم رکھا، اُن کے پاس لکڑی کے معمولی جہاز یا کچھ بڑے بادبانی جہاز ہوتے تھے جن میں مستول لگا دئے جاتے تھے اور ہوا کے سہارے وہ چلتے تھے۔ اسی طرح وہ تمام سمندروں کے مالک بنے پھر کلوں کے ذریعے سے بہت بڑے بڑے آہن پوش جہاز سمندروں کی سطح پر تیرنے لگے۔ شروع میں گھوڑے گاڑیاں ہوتی تھیں جو گرد و غبار سے اٹے ہوئے راستوں پر چلتی تھیں، پھر کنکریٹ کی سڑکیں بن گئیں جن پر تارکول بچھا دیا گیا اور موٹریں چلنے لگیں۔ ریلوں نے سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کا مقابلہ کیا، ہوائی جہاز خشکی اور تری میں چلنے والی تمام سواریوں سے بازی لے گئے؛ نیز حمل و نقل کے ایسے وسائل بھی تھے جن میں انسانی جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی ضرورت پیش نہ آسکتی تھی، اہل مغرب نے اُن سے بھی کام لیا؛ مثلاً تار، ٹیلی فون، لاسلکی مرئی اور مسموع دونوں[2]—اس سے پہلے دنیا کے اتنے بڑے رقبے نے اتنے

۱- مسٹر ٹائن بی کی جس بڑی کتاب کی یہ تلخیص ہے، اس میں موصوف نے ہمہ گیر سلطنتوں کی بہت بڑی تعداد کے وسائل حمل و نقل کا جائزہ لیا ہے۔ (مرتب تلخیص)

۲- مرئی سے مراد ہے ٹیلی ویژن اور مسموع سے مراد ہے ریڈیو۔

اعلیٰ پیمانے پر انسانی ربط و ضبط کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ان ترقیات کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ انجام کار وہ معاشرہ سیاسی سطح پر متحد ہو جاتا جہاں یہ ترقیات بروئے کار آچکی تھیں ، لیکن یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت مغربی دنیا کی سیاسی توقعات کا مطلع ابھی تک مکدر ہے۔ ممکن ہے کوئی شاہد اس یقین کا اظہار کرے کہ سیاسی اتحاد زود یا بہ دیر عمل میں آجائے گا ، لیکن نہ اس کی تاریخ بتائی جا سکتی ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا طریقہ کیا ہوگا۔ جو دنیا اس وقت تک ساٹھ یا ستر سیاسی حصوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر حصے کی حکومت اپنے محدود اقتدار پر زور دے رہی ہے ، حالانکہ اس میں ایٹم بم بھی ایجاد ہو چکے ہیں ، ظاہر ہے کہ اس میں سیاسی اتحاد اسی معروف طریقے پر عائد کیا جا سکے گا ، جسے عام لفظوں میں '' فیصلہ کن ضرب '' قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اغلب ہے کہ اگر اسی طرح امن قائم کیا گیا ، جیسا کہ بارہا قائم کیا جا چکا ہے ، یعنی کسی بڑی قوت نے جابرانہ طریقے سے کام لے کر اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ کر دیا تو یہ اخلاقی ، نفسیاتی ، سیاسی اور مجلسی بربادی کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ مادی بربادی کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ، اس کا دائرہ مقابلۃً بہت وسیع ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا سیاسی اتحاد رضامندانہ تعاون کے متبادل طریقے سے عمل میں آجائے ، لیکن اس مسئلے کا کوئی بھی حل نکلے ، یہ پیش گوئی پورے اعتماد سے کی جا سکتی ہے کہ وسائل حمل و نقل کا جو عالم گیر جال ہر طرف بچھ گیا ہے وہ ان مستفیدین کے سلسلے میں اپنا تاریخی فرض ضرور بجا لائے گا جن کا خیال بھی ان وسائل کے بانیوں کو نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ فائدہ کون اُٹھائے گا؟ خارجی پرولتار کے بربریوں کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اگرچہ ہمارے یہاں نیے بربری اور نیے اٹیلا ظہور میں آچکے ہیں جیسے کہ ہٹلر یا اُس جیسے دوسرے آدمی ، جنھیں غلط کار تہذیبوں کے گمراہ عنصر قرار دینا چاہیے ، لیکن ہمارے عالم گیر نظام کو اُن لوگوں سے ہراساں ہونے کی کوئی وجہ نہیں جو بیرون حدود کے حقیقی بربریوں کے کم حیثیت باقیات ہیں[1]۔ اس کے برعکس

۱- جس وقت یہ کتاب لکھی جا رہی تھی (۱۹۵۴) کینیا میں ماؤ ماؤ تحریک اس سلسلے کی نہایت نمایاں صدائے احتجاج تھی۔

جو اعلیٰ مذہب موجود ہیں ان کے حلقے آپس میں بھی مل گئے ہیں اور عہد قدیم کی لا مذہب آبادیوں کے آہستہ آہستہ کم ہونے والے حلقوں سے بھی اتصال پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے پیش نظر مواقع سے فائدہ آٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پولوس رسول ایک مرتبہ نہرالعاصی[1] کے کنارے سے آٹھ کر شوق تبلیغ میں دریائے ٹائبر پر پہنچ گئے تھے، اُن کے پیرو بحیرۂ روم سے زیادہ وسیع سمندروں کو قطع کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک پرتگیزی جہاز میں سوار ہوئے اور راس امید کا چکر لگاتے ہوئے اپنے دوسرے سفر میں ہندوستان پہنچ گئے[2]۔ وہاں سے بھی آگے بڑھے اور آبنائے ملکا سے گزرتے ہوئے تیسرے سفر میں چین کے ساحل پر پہنچ گئے[3]۔ پھر وہ ان تھک لوگ بڑے بڑے ہسپانوی جہازوں میں بیٹھے، قادس[4] سے چلے اور اوقیانوس کو عبور کر کے ویرا کروز[5] جا آترے اور بحرالکاہل کو اکا پلکو[6] سے عبور کر کے فلپینز پہنچ گئے۔ محض مغربی مسیحیت ہی وہ زندہ مذہب نہیں جس نے مغربی دنیا کے قائم کیے ہوئے وسائل حمل و نقل سے فائدہ آٹھایا، مشرق آرتھوڈکس مسیحیت بھی مغرب کے آتش بار ہتھیاروں سے مسلح قازقوں کے پیچھے پیچھے دریائے کاما[7] سے بحیرۂ اوکوٹسک[8] پہنچ گئی۔

۱- شام کا ایک دریا جسے انگریزی میں Orontes کہتے ہیں۔ ٹائبر وہ دریا ہے جس کے کنارے رومہ واقع ہے۔

۲- ہندوستان میں مسیحیت کا پہلا مورچہ وہ تھا جو نسطوریوں نے ٹراونکور میں قائم کیا۔ دوسرا مورچہ اُن یسوعی مبلغوں کا تھا جو اکبر کے دربار میں آئے تھے۔

۳- چین کو عیسائی بنانے کی پہلی کوشش نسطوریوں نے ساتویں صدی عیسوی میں کی اور سی نگان (Si Ngan) نے کام کیا۔ دوسری کوشش مغربی مسیحیت نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں کی۔ یہ لوگ خشکی کے راستے چین پہنچے۔ تیسری کوشش سولھویں صدی میں ہوئی اور مبلغ سمندر کے راستوں سے چین گئے۔

۴- Cadiz، ہسپانیہ کی بندرگاہ۔ ۵- Vera Cruz۔

۶- Acapulco، میکسیکو کے مغربی ساحل کی بندرگاہ۔

۷- Kama۔ ۸- Okhotsk، سائبیریا کے مشرقی حصے کا سمندر۔

انیسویں صدی کے افریقہ میں پولوس رسول نے ڈیوڈ لونگ سٹون لباس اختیار کیا، جو اسکاٹ لینڈ کا ایک مسیحی مبلغ تھا اور ڈاکٹری بھی جانتا تھا۔ اس نے انجیل کی تعلیم پھیلائی، بیماروں کا علاج کیا، جھیلیں اور آبشار دریافت کیے۔ اسلام نے بھی تبلیغ کی مہم بڑے زور سے شروع کی۔ یہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ مہایان اپنے اس حیرت انگیز تبلیغی سفر کو از سر نو یاد نہ کرے گا جو اس نے مگدھ سے لوینگ[1] تک اختیار کیا تھا اور اس یاد کو تازہ رکھتے ہوئے ہوائی جہازوں اور ریڈیو کی مغربی ایجادات سے تبلیغ نجات میں وہی کام نہ لے گا جو اس نے ایک مرتبہ چھاپے خانے سے لیا تھا اور چھاپہ خانہ چین کی ایجاد تھا۔

تبلیغی سرگرمیوں میں عالم گیر پیمانے پر جوش و خروش سے جو مسائل سامنے آئے، ان کی نوعیت کلیسائی سیاسیات کی نہ تھی۔ قائم شدہ اعلیٰ مذاہب نے نئے تبلیغی میدانوں میں قدم رکھا تو یہ سوال سامنے آگیا کہ آیا مذہب کی دائمی روح کو ان چند روزہ اور عارضی اتفاقی حوادث سے الگ کیا جا سکتا ہے جو اسے پیش آئے؟ مذاہب کے درمیان ایک دوسرے سے مقابلہ ہوا تو اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی کہ آیا بحیثیت عمومی یہ مذاہب "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول پر قائم رہتے ہوئے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کریں گے یا ان میں سے کوئی ایک دوسرے مذاہب پر فوقیت حاصل کر لے گا؟

مذہبی انتخابیت[2] کا اصول ہمہ گیر سلطنتوں کے بعض حکمرانوں کو بہت اچھا معلوم ہوا، مثلاً الگزانڈر سیورس[3] اور اکبر کو، جن کے دماغ الجھے ہوئے تھے، مگر دل رحم و محبت کے جذبات سے لبریز تھے۔ ان کے تجربات کوئی قابل ذکر نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ یسوعی فرقے کے مبلغوں میں سے

۱- Loyang -

۲- مذہبی انتخابیت سے مراد یہ ہے کہ ہر مذہب سے چند اچھی باتیں لے لی جائیں۔

۳- Alexander Severus، رومی شہنشاہ جو خود لا مذہب تھا، لیکن مسیحیت کا احترام کرتا رہا۔ اکبر کے متعلق جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ سراسر غلط فہمی یا قلت معلومات پر مبنی ہے۔

پہلے پہل جنھوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا ——— مثلاً فرانسس زیوئر[1] اور میٹیو رسی[2] ——— ان کے سامنے بالکل جداگانہ نصب العین تھا۔ وہ پہلے مبلغ تھے جنھوں نے بڑے بڑے سمندروں کی تسخیر کے سلسلے میں مغربی ہنر مندیوں کے فوائد کا صحیح اندازہ کیا۔ ان حوصلہ مند روحانی رہنماؤں نے اسی طرح ہندو دنیا اور مشرق بعید کی دنیا کو مسیحیت کے دائرے میں لانے کی کوششیں کیں، جس طرح پولوس رسول اور اس کے جانشین اپنے عہد میں یونانی دنیا کو مسحور کر چکے تھے۔ اپنے مذہب پر پختہ اعتماد کے علاوہ ان لوگوں کو خاص بصیرت بھی حاصل تھی۔ ان پر واضح ہو گیا کہ ایک اہم شرط کو پورا کیے بغیر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور انھوں نے نتائج کو قبول کرنے میں قطعاً ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ مبلغ اپنے پیغام کو جب تک ان لوگوں کی ذہنی، جمالیاتی اور جذباتی اصطلاحات میں منتقل نہ کرے گا جن میں یہ پہنچانا منظور ہے، اس کے لیے کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ اصل پیغام روح و جوہر کے اعتبار سے جتنا زیادہ انقلابی ہوگا، اتنا ہی زیادہ یہ عمل ضروری ہے کہ اسے متعارف لباس پہنا کر پیش کیا جائے اور یہ پیش کش خوشگوار معلوم ہونی چاہیے۔ اس غرض سے ضروری تھا کہ اصل پیغام کو ان ثقافتی روایات کے لباس سے الگ کر لیا جائے جو مبلغوں کو بطور میراث ملا تھا۔ یوں یہ سوال سامنے آ گیا کہ مبلغ خود ہی یہ اندازہ کریں، مذہب میں روح و جوہر کی حیثیت کس چیز کو حاصل تھی اور روایاتی پیش کش کے سلسلے میں کن کن چیزوں کی آمیزش ہوتی رہی۔

اس مسلک کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ غیر مسیحی معاشروں کے راستے سے سنگ گراں اٹھانے کی کوشش میں ان مبلغوں نے خود اپنے ہم مذہبوں کے راستے میں بھاری پتھر رکھ دیے۔ ہندوستان اور چین کے یسوعی مشنوں کے جہاز انھیں چٹانوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گئے۔ انھیں دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا،

۱- Francis Xavier، ہسپانیہ کا مشہور مسیحی مبلغ جو ۱۵۴۱ء سے ۱۵۴۷ء تک ہندوستان میں، ۱۵۴۹ء سے ۱۵۵۱ء تک جاپان میں اور بعد ازاں چین میں تبلیغ کرتا رہا ۲- دسمبر ۱۵۵۲ء کو وفات پائی۔

۲- Matteo Ricci -

اول مختلف مشنوں کی رقابت ، دوم پاپائیت کی قدامت پسندی ؛ لیکن یہ اصل کہانی کا آخری باب نہیں ۔

مسیحیت فلسطین کی سرزمین میں پیدا ہوئی تھی ؛ اس وقت اسے جن پارچوں میں لپیٹا گیا تھا ، اگر پولوس رسول ساکن طرسوس ، ان پارچوں کو ہنر مندی سے اتار کر الگ نہ کر دیتا ، تو روما میں زمیں دوز مکانوں کے مسیحی آرٹسٹ اور درسگاہ الٰہیات سکندریہ کے مسیحی فلسفی اس مذہب کی روح اور جوہر کو یونانی فکر و تصور کی اصطلاحات میں پیش کرنے کا موقع نہ پاتے اور یونانی دنیا کے حلقہ بگوش مسیحیت بننے کا راستہ کبھی ہموار نہ ہوتا ۔ پھر اگر آریجن[1] اور آگسٹائن[2] کی مسیحیت سے بیسویں صدی عیسوی میں آرایش و زیبایش کے وہ سامان الگ نہ کیے گئے ، جو اس نے اپنے تاریخی سفر کے دوران میں سربائی ، یونانی اور مغربی منزل گاھوں میں مہیا کیے تو وہ کبھی ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے گی جو اس کتاب کی ترتیب و تسوید کے وقت تمام اعلیٰ مذاھب کے لیے فراھم ھیں ۔ اگر کوئی اعلیٰ مذھب عارضی ثقافتی ماحول کا مستقل رنگ قبول کر لیتا ھے تو سمجھ لینا چاھیے کہ وہ اپنے آپ کو ھمیشہ کے لیے غیر متحرک اور در بستۂ مکان بنا لیتا ھے ۔

لیکن اگر مسیحیت دوسرا راستہ اختیار کر لے تو ممکن ھے پھر ایک مرتبہ وھی کارنامہ انجام دے سکے جو اس نے رومی سلطنت میں انجام دیا تھا ۔ رومیوں نے جو وسائل حمل و نقل مہیا کر دیے تھے ۔ ان کے ذریعے سے روحانی تجارت کا سلسلہ بھی جاری رھا ۔ مسیحیت نے اس تجارت میں تمام اعلیٰ مذھبوں اور فلسفوں سے بہترین چیزوں کا مغز لے لیا ۔ مغربیت کے دور حاضر کی ایجادات نے مادی حیثیت سے دنیا کو ملا دیا ھے ۔ اس ماحول میں ھندویت اور مہایان بھی ممکن ھے اتنی خدمت انجام دے سکیں جتنی کہ آئی زز کی پوجا اور نوفلاطونیت نے مسیحیت کی بصیرت اور عمل کے لیے مہیا کی تھی ۔ اگر مغربی دنیا میں بھی سیزر کی سلطنت ایک مرتبہ پھر ابھر کر ڈوبے ——— جیسا کہ اس کی سلطنت چند صدیوں کی ھر اقبال مندی کے بعد درھم برھم یا

۱- Origen ایک یونانی پادری جو ۱۸۵ء میں پیدا ھوا اور بہ مقام صور ۲۵۴ء میں وفات پائی ۔

۲- مسیحی پادری ۳۵۴ء میں پیدائش ، ۴۳۰ء میں وفات ۔

انحطاط پذیر ہوتی ہے ———— تو ایک مورخ ۱۹۵۲ میں مستقبل کے اندر جھانکتا ہوا سمجھ سکتا ہے کہ اخناتون سے ہیگل تک جتنے فلسفے وجود میں میں آئے اور اعلیٰ مذاہب نے جو کچھ چھوڑا ، ان سب کی وارث مسیحیت ہے ۔ اس میں ماں بیٹے کی پوجا بھی شامل ہے جس نے اشتر اور تموز کی شکل میں شاہراہ پر سفر شروع کیا تھا ۔

چھاونیاں اور نو آبادیاں

سامراجی نظام کے وفادار حامیوں کو جابجا بسانا بھی سامراجی وسائل حمل و نقل کا ایک لاینفک جزو ہے ———— خواہ وہ برسرکار سپاہی ہوں یا ملیشیا کے جوان ، یا فوج سے علیحدہ شدہ افراد یا سویلین ۔ ان انسانی چوکیداروں کی موجودگی ، قوت اور نگہبانی سڑکوں ، پلوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی حفاظت کا بندوبست کر دیتی ہے جس کے بغیر یہ چیزیں سامراجی حکام کو بھی کام نہیں دے سکتیں ۔ سرحدی چوکیاں بھی اسی نظام کا حصہ ہوتی ہیں ، اس لیے کہ سرحدی خطوط کو ہمیشہ شاہراہوں کی شاخیں سمجھا جاتا ہے ۔ فوجیں اس غرض سے بٹھائی جاتی ہیں کہ نگہبانی یا دفاع کے فرائض انجام دیں ۔ ہمہ گیر سلطنت نوآبادیاں قائم کرنے پر بھی آمادہ ہو سکتی ہے اور ملک کو دور مصائب میں حصول اقتدار کی جنگ سے جو نقصان پہنچ جاتا ہے ، یہ نوآبادیاں اس کی تلافی کر دے سکتی ہیں ، لہٰذا انہیں تعمیری کارنامے سمجھنا چاہیے ۔

سیزر نے کاپوآ[1] ، قرطاجنہ[2] اور کارنتھ[3] کے برباد شدہ مقامات پر رومی شہریوں کی خود مختار نوآبادیاں قائم کی تھیں تو اس کے پیش نظر یہی مقصد تھا ۔ اس سے قبل یونانی دنیا کی مختلف ریاستوں میں تنازع للبقا کی جو

۱- Capua ، اٹلی کے صوبے کمپانیا کا مشہور شہر جو نیپلز سے سترہ میل شمال میں تھا ۔ یہ رومہ اور قرطاجنہ کی جنگوں میں ہینی بال سے مل گیا تھا ۔ رومیوں نے اسے سخت سزا دی اور تباہ کر ڈالا ۔

۲- Carthage ۔ اہل قرطاجنہ کا دارالحکومت جو تونیسیا میں واقع تھا ، اب اس کے صرف کھنڈرات رہ گئے ہیں ۔

۳- Corinth ۔ یونان کا مشہور شہر ۔

ھنگامہ خیز کشمکش جاری تھی ، اس میں وقت کی رومی حکومت نے کاپوآ کو ھینی بال سے مل جانے کی سزا دیتے وقت بالارادہ اسے ایک عبرت ناک مثال بنانا چاھا تھا - قرطاجنہ کو اس امر کی سزا دی گئی کہ وہ رومہ کو شکست دینے میں قریب قریب کامیاب ھو گیا تھا - کارنتھ کو اکائی لیگ[1] کے رکن کی حیثیت میں اسی مقصد کے لیے بہ طور خود منتخب کر لیا گیا - سیزر سے پیشتر جو جمہوری حکومت قائم تھی ، اس کی قدامت پسند پارٹی نے ان تین مشہور شہروں کی بحالی کی مخالفت بڑی سختی اور شدت سے کی تھی - اس سے یہ نہ سمجھنا چاھیے کہ مذکورہ بالا پارٹی کو ان شہروں کے بحال ھو جانے سے کوئی خاص خطرہ پیدا ھو سکتا تھا ، بلکہ یہ صرف انتقامی جذبے کا کرشمہ تھا اور اس سلوک کے متعلق طویل کشمکش مرور زمان سے وسیع تر سوال کا نشان بن گئی - سوال یہ تھا کہ آیا رومی حکومت کی غایت بقا ایک خاص حکومت کا ذاتی مفاد تھا یا رومی سلطنت پوری یونانی دنیا کی بہبود کے لیے وجود میں آئی تھی ، جس دنیا کا یہ سیاسی پیکر بن گئی تھی ؟ سیزر نے سینٹ پر جو فتح حاصل کی تھی ، وہ در اصل زیادہ آزاد ، زیادہ انسانیت پرور اور زیادہ دوراندیشانہ نقطہ نگاہ کی کامیابی تھی -

سیزر کی قائم کردہ اور پیشتر کی ختم شدہ حکومتوں کے سیاسی کردار و روش کے درمیان واضح اختلافات یونانی دنیا کی سرگزشت کا کوئی مخصوص پہلو نہ تھا ؛ دوسری تہذیبوں کی تاریخوں سے بھی یہی ظاھر ھوتا ھے کہ جب دور مصائب کے بعد ھمہ گیر سلطنت قائم ھوئی تو اختیارات و اقتدار کے صحیح اور غلط استعمال کے متعلق اسی طرح مسلک میں تبدیلی ھوتی رھی - پس اگرچہ یہ تاریخی ''قانون'' ھر جگہ نمایاں ھے ، لیکن یہ مستثنیات سے خالی نہیں - ایک طرف یہ معلوم ھوتا ھے کہ دور مصائب اگر جگہ سے اکھڑے ھوئے اور تلخ روزگار پرولتار پیدا کرتا ھے تو ساتھ ھی آبادکاری کا کام بھی اعلیٰ پیمانے پر جاری رکھتا ھے ——— اس کی مثال میں یونانی شہری نوآبادیوں کی بہت بڑی تعداد پیش کی جا سکتی ھے ، جو سکندر نے ھخامنشی

۱- Achaean League - یونان قدیم کے ایک علاقے کا نام اکائن تھا ، اس کے شہروں نے مقدونیہ کے خلاف ایک جمعیت بنائی تھی جو مدت تک بر سر کار رھی ؛ رومیوں نے اسے تباہ کیا -

سلطنت کی تسخیر کے ضمن میں قائم کیں - اس کے برعکس مقتدر اقلیت میں دل کی تبدیلی شاذ ھی مستحکم و پائدار ھوتی ھے ، حالانکہ یہ تبدیلی ھمہ گیر سلطنت کے قیام کا نفسیاتی مثنیٰ ھے ، اور برابر یہ اندیشہ لگا رھتا ھے کہ کہیں پیشتر کے دور مصائب کی وحشیانہ حرکتیں از سر نو عود نہ کر آئیں - نو بابلی سلطنت در اصل آشوری وحشت و ھیبت کے خلاف بابلی دنیا کے اندر ایک اخلاقی بغاوت تھی ، لیکن خود اُس نے بھی یہودیوں کے استیصال کا سلسلہ جاری کر دیا جس طرح کہ آشوریوں نے یہودیوں کی بیخ کنی کی تھی - ظاھر ھے کہ اس معاملے میں بابل کو نینوی پر کوئی اخلاقی فوقیت دینا سراسر مہمل ھوگا - البتہ یہ کہا جا سکتا ھے کہ جو یہودی بابل پہنچے ، انھیں زندہ چھوڑ دیا گیا - وہ محفوظ رھے یہاں تک کہ سلطنت بابل کے ھخامنشی جانشین نے انھیں وطن واپس جانے کی اجازت دے دی - البتہ نینوی میں جو یہودی پہنچے تھے ، وہ ھمیشہ کے لیے برباد ھو گئے - وھی یہودیوں کے گم شدہ دس قبیلے تھے اور برطانوی اسرائیلیوں کے افکار و خیالات سے باھر ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکتا -

مستثنیات کے باوجود بہ حیثیت عمومی یہ حقیقت بجا رھتی ھے کہ آبادکاری کی نسبتاً تعمیری اور انسانیت پرور پالیسی ھمہ گیر سلطنتوں کے نشانات میں سے ایک نشان ھے -

ھم نے عسکری اور نگران کاری کے مقاصد کے لیے فوجیں متعین کرنے اور مجلسی و ثقافتی مقاصد کے لیے نئی آبادیاں بنانے کے درمیان امتیاز کیا ھے ، لیکن مرور زماں کے ساتھ یہ امتیاز صرف مقصد کی حد تک قائم رہ جاتا ھے ، نتائج کے اعتبار اس کی کوئی حیثیت نہیں رھتی - ھمہ گیر سلطنتیں تعمیر کرنے والے لوگ سرحدات کے ساتھ ساتھ یا اندرون ملک میں باقاعدہ فوج کے لیے جو چھاؤنیاں بناتے ھیں اُن کے ساتھ غیر مصافی آبادی کے بس جانے کو روکا نہیں جا سکتا - رومی فوجیوں کے لیے دوران ملازمت میں قانونی شادیاں کرنے کی ممانعت تھی ، لیکن وہ داشتہ عورتوں کے ساتھ مستقل ازدواجی تعلقات قائم کر لینے کے مجاز تھے اور اس طرح کنبے پیدا کر لیتے تھے - ملازمت ختم ھو جاتی تو داشتہ عورتوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات کو قانونی شادیوں کی حیثیت دے لیتے اور ان کے بچے ناجائز اولاد نہ رھتے - عربوں کے فوجی "مہاجرہ" میں سے ھر ایک شخص کو آن چھاؤنیوں میں بال بچے ساتھ لے آنے کی اجازت

تھی جن میں وہ متعین ہوتے تھے۔ اس طرح رومی اور عرب فوجی غیر مصافی نوآبادیوں کے بانی بن گئے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام سلطنتوں کی فوجی چوکیوں میں بہ ہر حال یہی صورت پیش آتی رہی ہوگی۔

اس طرح اول فوجی چھاؤنیوں سے غیر مصافی نو آبادیاں ظہور پذیر ہوئیں، لیکن بہ راہ راست بھی غیر مصافی آبادیاں قائم ہوتی رہیں۔ مثال کے طور پر شمالی و مشرقی اناطولی اضلاع میں ہخامنشیوں نے ایرانی امرأ کو جاگیریں دے رکھی تھیں، جب یہ اضلاع عثمانیوں کے قبضے میں آئے تو انھوں نے البانیہ کے نو مسلموں کو وہاں جا بجا آباد کیا۔ عثمانی سلطنت کے قلب میں جن مقامات کو تجارتی مرکزوں کی حیثیت حاصل تھی اُن میں ہسپانیہ اور پرتگال سے آئے ہوئے سفارادی یہودی[1] پناہ گیروں کو بسا دیا گیا۔ رومی شہنشاہوں نے بھی اپنی سلطنت کے پس ماندہ علاقوں میں نوآبادیاں قائم کر کے انھیں تہذیب کا مرکز بنایا (کسی علاقے کو لاطینی اور کسی کو یونانی) ایسی نوآبادیوں کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے۔ بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ادرنہ (ایڈریا نوپل) کی ہے جس کا نام اب تک دوسری صدی کے ایک بہت بڑے شہنشاہ کا نام یاد دلا رہا ہے[2]۔ اس شہنشاہ نے تھریس کے بربریوں کو اس نوآبادی کے ذریعے سے مہذب بنانے کی کوشش کی تھی۔ ہسپانوی معماران سلطنت نے وسطی اور جنوبی امریکہ میں اسی پالیسی پر عمل کیا۔ ہسپانیہ کی یہ نوآبادیاتی شہری ریاستیں ایک اجنبی نظم و نسق اور اجنبی عدالتی نظام کے لیے ترویج کا ذریعہ بن گئیں۔ بالکل یہی کیفیت یونانی نو آبادیوں کی تھی اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے ان کی حیثیت طفیلیوں کی سی تھی۔

> انگریزی امریکی نو آبادیوں میں قصبے اور شہر باشندگان ملک کی ضرورتیں پورا کرنے کا ذریعہ بنے تھے، اس کے برعکس ہسپانوی نو آبادیوں میں ملک کی آبادی قصبوں اور شہروں کی ضرورتوں کی کفیل تھی۔ انگریز آبادکار کا اولیں مدعا

۱۔ پرتگال اور ہسپانیہ کے یہودی۔

۲۔ ایڈریا نوپل کے لفظی معنی ہیں، وہ شہر جسے شہنشاہ ہیڈرین نے آباد کیا۔ ہیڈرین رومہ کا مشہور شہنشاہ تھا ۱۱۷ء سے ۱۳۸ء تک حکمران رہا۔

یہ تھا کہ زمین پر زندگی بسر کرے اور کھیتی باڑی سے اپنی ضرورت کی چیزیں بہم پہنچائے؛ ھسپانویوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ شہروں میں رہیں اور اپنے کھیتوں اور کانوں میں حبشیوں یا امریکہ کے اصلی باشندوں سے کام لیں اور اس طرح اپنے گزارے کا انتظام کریں۔
چونکہ کھیتوں اور کانوں کے کارکن ملک کے اصلی باشندے تھے، لہٰذا پوری دیہاتی آبادی اصل باشندوں ھی پر مشتمل رھی[1]۔

داخلی آبادکاری کا ایک نمونہ وہ ھے جو ھمہ گیر سلطنت کی تاریخ کے آخری دور میں خاص اھمیت حاصل کر لیتا ھے، یعنی اُن زمینوں پر بربری کسانوں کو آباد کرنا جو یا تو خود ان بربریوں کے چھاپوں کی وجہ سے برباد ھوگئی ھوں یا ان کی بربادی کا موجب زوال پذیر سلطنت کی کوئی داخلی مجلسی بیماری ھو۔ اس کی معیاری مثال رومی شہنشاہ ڈائیو کلیشئن[2] کے بعد کے دور میں ملتی ھے، یعنی گال، اٹلی اور صوبجات ڈینیوب میں جا بجا جرمنوں اور سرمیشیوں کی نوآبادیاں قائم کی گئیں۔ ان نوآبادیوں کو اصطلاح میں لاے ٹی[3] کہا جاتا تھا۔ یہ مغربی جرمنوں کی زبان میں ایک لفظ ھے جو اُن اجنبیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ھے جنھیں نیم غلام کی حیثیت حاصل ھو اور ھم سمجھ سکتے ھیں کہ یہ لوگ اُن شکست خوردہ بربری حریفوں کے اخلاف تھے، جنھیں سابقہ یورشوں کی بنا پر سزا دینی مناسب سمجھی گئی یا انعام دے کر یورشوں سے روک دیا گیا۔ اس طرح وہ لوگ اس ارض موعود میں امن پسند کاشت کار بن گئے جسے پہلے وہ یورشوں سے برباد کیا کرتے تھے، لیکن واضح رھے کہ بہ نظر احتیاط یہ نوآبادیاں سرحدات کے قریب نہیں، بلکہ اندرون ملک میں قائم کی گئی تھیں۔

۱- سی، ایچ، ھیرنگ C. H. Haring کی کتاب ”امریکہ میں ھسپانوی سلطنت“ مطبوعہ ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۵۹ - ۱۶۰ -

۲- Diocletian رومی شہنشاہ، ۲۸۴ء میں بادشاہ بنا، ۳۰۵ء میں تخت سے دست بردار ھوا، ۳۱۳ء میں وفات پائی -

۳- Laeti -

ہمہ گیر سلطنتوں کے حاکموں نے جو نوآبادیاں اور چھاؤنیاں قائم کیں اُن پر ایک نظر ڈال لینے اور من مانے طور پر آبادیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینے کا معاملہ سامنے رکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادارے دوسرے وجوہ سے خواہ کتنے ہی مفید ہوں، لیکن ان کی وجہ سے ''پرولتاریت'' کا عمل شدت کے ساتھ جاری ہوتا ہے، جسے ہم دور مصائب اور سلطنت ہائے عام کی مشترکہ کوششیں قرار دے چکے ہیں۔ سرحدات پر جو مستقل فوجی چوکیاں بن جاتی ہیں وہ ایسی ''پتیلیوں'' کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں جن میں مقتدر اقلیت داخلی اور خارجی پرولتار کے ساتھ مل کر ایک جنس ہو جاتی ہے اور ان سب کی کایا پلٹ ہوجاتی ہے۔ سرحدی علاقوں کے حاکم اور ان کے حریف بربری جنگجو جتھے مرور زماں سے ایک دوسرے کے اندر جذب ہونے لگتے ہیں۔ یہ عمل انجذاب پہلے فنون جنگ میں شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ثقافت پر پہنچ جاتا ہے، لیکن مقتدر اقلیت پہلے داخلی پرولتار سے مواخات قائم کر کے اپنے آپ کو نچلی سطح پر لے آتی ہے، پھر سرحدات پر خارجی پرولتار سے ربط ضبط پیدا کر کے بربریت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جو لوگ سلطنتیں قائم کرتے ہیں ان کے پاس نہ تو کافی فوجی قوت ہوتی ہے اور نہ سپہ گری کے پیشے کے لیے کافی جذبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کو امداد کے بغیر قائم رکھ سکیں یا اس کی حفاظت کر سکیں۔ اُن کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ مفتوح اقوام میں سے ان لوگوں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کر لیں جو جنگی ہنر مندیوں سے محروم نہیں ہوتے۔ آگے چل کر وہ ان بربریوں کو فوجوں میں لے لیتے ہیں جو سرحدات کے باہر مقیم ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرولتاریت کے عمل سے زیادہ تر فائدہ کسے پہنچتا ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خارجی پرولتار کو سب سے بڑھ کر اور نمایاں فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ بربری لوگ کسی تہذیب کی بیرونی فوجی چوکیوں پر جو تعلیم حاصل کرتے ہیں ——— پہلے حریف کی حیثیت میں، بعد ازاں تنخواہ دار کی حیثیت میں ——— وہ انہیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ جب سلطنت میں شکست کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو وہ سرحدات سے اُٹھ کر شکاری پرندے کی طرح آ گرتے ہیں اور اپنے لیے نئی سلطنتیں پیدا کر لیتے ہیں، لیکن ان کارناموں کی عارضی حیثیت ہم پہلے واضح کر چکے ہیں۔ رومی سلطنت اور عربی سلطنت کی منظم تقسیم نو اور آبادیوں

گے میل جول سے انجام کار بالترتیب اول میں مسیحیت اور دوسری میں اسلام نے سب سے بڑھ کر فائدہ اٹھایا۔

اموی خلافت کی فوجی چھاؤنیوں اور سرحدی چوکیوں سے نمایاں طور پر اسلام کو فائدہ پہنچا، اس لیے کہ یہ چیزیں اُن خوابیدہ روحانی قوتوں کے غیر معمولی پھیلاؤ کے لیے نہایت قیمتی نقاط تائید بن گئیں، جن سے اسلام متشکل تھا اور اس طرح چھ صدیوں میں اس نے اپنا مقصد پورا کر لیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام عرب کی سرحدوں سے باہر نکلا تھا، اس وقت اس کی حیثیت بربری جنگی جتھوں کے ایک فرقہ وار عقیدے کی تھی جو اپنے لیے رومی سلطنت کے صوبوں میں ایک نئی حکومت کی تشکیل کر رہے تھے۔ تیرھویں صدی میں اسلام نے مذہب عام کی حیثیت اختیار کر لی۔ سریانی تہذیب درہم برہم ہو چکی تھی، عباسی خلافت کا حصار زمین بوس ہو گیا تھا، بھیڑوں کا گلہ بان کوئی نہ رہا تھا، اسلام اُن کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔

اسلام کو متعدد حوادث سے سابقہ پڑا، لیکن وہ بدستور قائم رہا، مثلاً بانئی اسلام کی وفات، ابتدائی عرب معماران سلطنت کا زوال، عربوں کے ایرانی جانشینوں کا انحطاط، عباسی خلافت کی تباہی، اُن بربری جانشیں حکومتوں کی بربادی جو خلافت کے کھنڈروں پر تھوڑی دیر کے لیے قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز اسلام کی ترقی کا راستہ نہ روک سکی۔ سوچنا چاہیے کہ اس کا اصل راز کیا تھا؟ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امویوں کے عہد حکومت میں غیر عرب رعایا نے اسلام قبول کر کے جو روحانی تجربات حاصل کیے تھے وہ اسلام کی ترقی کا راز تھے۔ انھوں نے شروع میں اسلام کو زیادہ تر مجلسی اغراض کے لیے اختیار کیا تھا، پھر یہ ان کے دلوں میں جڑ پکڑ گیا اور وہ لوگ اسلام پر عربوں سے بھی بڑھ کر پکے ہو گئے۔ جو مذہب اپنے داخلی محاسن کی برکت سے غیروں کو اس پیمانے پر وفادار بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا وہ اپنے قیام کے لیے اُن سیاسی حکومتوں کا محتاج نہ ہو سکتا تھا جو اسے غیر مذہبی مقاصد کے لیے کامیابی سے استعمال کرتی رہیں۔

اسی طرح تاریخ خلافت سے ظاہر ہوتا ہے کہ معماران سلطنت نے چھاؤنیاں اور نوآبادیاں قائم کرنے کی جس سوچی سمجھی پالیسی پر عمل کیا تھا اور مختلف آبادیوں کی منتقلی اور امتزاج کے لیے جو قواعد و ضوابط بنائے تھے، ان سے بلا ارادہ اور غیر متوقع طور پر ایک اعلیٰ مذہب کی

رفتار اشاعت تیز تر ہوئی - رومی سلطنت کی تاریخ میں بھی اس سبب سے ویسے ہی نتائج پیدا ہوئے -

رومی سلطنت کی پہلی تین صدیوں میں مذہبی اثرات کے حد درجہ ممتاز ناقل سرحدی فوجی چوکیوں کے افراد تھے اور ان ذرائع سے جو مذاہب انتہائی تیزی کے ساتھ پھیلے ، ان میں سے ایک تو ایو پٹر کی وہ پوجا تھی جو ہٹیوں نے شروع کی اور اس پر یونانیت کا رنگ چڑھ گیا تھا - دوسرا مذہب متھرا کی پرستش تھی - متھرا اصل میں ایرانی دیوی تھی اور اس کی سریانی پوجا پر بھی یونانیت کا اثر غالب ہو گیا تھا - یہ دو مذہب دریائے فرات کی رومی چوکیوں سے نکل کر دریائے ڈینیوب کے ساتھ ساتھ ، نیز حاشیے کے جرمن علاقوں اور دریائے رائن ، بلکہ دیوار برطانیہ تک جا پہنچے - اس سے سہایان کے معاصرانہ سفر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کہ وہ ہندوستان سے نکلا اور اپنے طویل سفر کے آخری مرحلوں میں تبت کی سطح مرتفع کے مغربی کناروں کے ساتھ ساتھ دریائے طارم کے طاس سے بحر الکاہل کے کنارے تک چلا گیا - ان تمام حصوں میں چین کی سلطنت عام نے یوریشیائی خانہ بدوشوں کے مقابلے میں فوجی چوکیوں کا زنجیرہ قائم کر رکھا تھا - سہایان نے پھر قدم آگے بڑھایا اور وہ چینی دنیا کی شمالی و مغربی سرحدات سے اٹھ کر اندرون ملک میں پہنچ گیا اور داخلی چینی پرولتار کا مذہب عام بن گیا - بعد ازاں آسے مغربیت مآب دنیا کے چار ممتاز مذاہب میں جگہ مل گئی - متھرائیت اور ایوپٹر کی پوجا کا مستقبل بہت معمولی تھا ، ان کی تقدیر شاہی رومی فوجوں کی تقدیر سے وابستہ ہو چکی تھی - تیسری صدی مسیحی کے وسط میں اس فوج کو عارضی شکست سے سابقہ پڑا - اس طرح اس پر ایسی ضرب لگی جس کے بعد یہ فوجی مذہب سنبھل نہ سکے - ان کی تاریخی اہمیت صرف اتنی رہ گئی کہ وہ مسیحیت کے پیشرو تھے اور اس مذہبی روایت کے مسلسل پھیلتے ہوئے دریا میں انہیں معاونوں کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جو مسیحیت کے طاس میں مل جانے والی متعدد ندیوں کے پانی سے سیراب تھی - مسیحیت نے یہ طاس اپنے لیے تیار کیا تھا اور اسی سے کام لے کر ایک نئے بہاؤ سے رومی سلطنت کی آبیاری کی تھی -

ایوپٹر اور متھرا نے دریائے فرات سے دریائے ٹائن تک شمالی و مغربی سفر میں سرحدی چوکیوں کو سیڑھیاں بنایا - پولوس رسول نے یہی کام ان

نوآبادیوں سے لیا جو اندرون سلطنت میں سیزر اور آگسٹس نے قائم کی تھیں۔ اپنے پہلے تبلیغی سفر میں رسول موصوف نے جن رومی نو آبادیوں میں مسیحیت کا بیج بویا ان میں سے ایک پسیڈیا کی نوآبادی انطاکیہ تھی اور دوسری لسترا۔ دوسرے سفر میں وہ تروآس، فلپی اور کارنتھ کی رومی آبادیوں میں پہنچا، لیکن وہ اپنے سلسلۂ تبلیغ کو اس قسم کی نوآبادیوں تک محدود نہ رکھ سکتا تھا۔ مثال کے طور پر وہ دو سال تک قدیم یونانی شہر افی‌سوس میں قیام گزیں رہا۔ کارنتھ میں وہ اٹھارہ مہینے ٹھہرا۔ یہی مقام ہے جس نے رسولوں کے بعد کے دور میں کلیسا کی زندگی کے اندر نہایت اہم حصہ لیا اور ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں مسیحی جماعت کو جو درجۂ امتیاز حاصل ہوا، وہ ایک حد تک اس رومی نوآبادی کی آفاقی حیثیت کا کرشمہ تھا، جو سیزر نے قائم کی تھی۔

لیکن جس رومی نوآبادی سے مسیحیت نے حقیقی فائدہ اٹھایا وہ کارنتھ نہ تھی، بلکہ لیونز تھی۔ مسیحیت ایک نوآبادی سے دوسری نوآبادی تک پھیلتی گئی اور دارالحکومت میں پہنچ کر بھی اس کی پیش قدمی نہ رکی۔ پولوس رسول کی وفات سے بھی اس کی رفتار ترقی پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑا۔ دریائے رون[۱] اور دریائے ساؤن[۲] کے اتصال سے جو زاویہ بنا ہے وہاں رومیوں نے لگ ڈونم[۳] نام سے ایک نوآبادی ۴۳ ق۔م میں قائم کی تھی، لیکن یہ نوآبادی محض نام کی نہ تھی، بلکہ حقیقی معنی میں نوآبادی تھی۔ اس میں اطالوی الاصل افراد بسائے گئے تھے اور اس کا محل ایسا تھا جسے گال کے اس علاقے کی دہلیز سمجھنا چاہیے جو سیزر کی فتوحات سے سلطنت میں شامل ہوا تھا۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ اس گالیا کوماٹا[۴] کے ذریعے سے رومی ثقافت دور دور تک روشنی پھیلائے، جس طرح گالیا ٹوگاٹا[۵] سے ناربون[۶] کی پرانی رومی نوآبادی روشنی پھیلاتی رہی تھی۔ لگ ڈونم روم اور دریائے رائن کے درمیان واحد رومی چھاؤنی تھی۔ مزید برآں یہ نوآبادی ان تین صوبوں کا محض انتظامی مرکز ہی نہ تھی جن میں گالیا کوماٹا کو تقسیم کیا گیا تھا، بلکہ

۱- Rhone -
۲- Saone -
۳- Lugdunum -
۴- Gallia Comata -
۵- Gallia Togata -
۶- Narbonne -

یہ تینوں گالوں کی کونسل کے لیے سرکاری اجتماع کا بھی مرکز تھی، جہاں ساٹھ یا اس سے زیادہ پرگنوں کے نمایندے وقتاً فوقتاً آگسٹس کی اس قربان گاہ کے آس پاس جمع ہوتے تھے جو دروسس[1] نے ۱۲ ق - م میں بنائی تھی - واقعہ یہ ہے کہ لگ ڈونم کی نوآبادی نہایت اہم سامراجی مقاصد کے لیے معرض وجود میں آئی تھی، لیکن ۱۷۷ء کے آس پاس اس رومی نوآبادی میں ایسی زبردست مسیحی جماعت فراہم ہو گئی تھی جس کے لیے قتل کا حکم صادر کرنا پڑا اور دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی شہیدوں کا خون کلیسا کا بیج بن گیا - بعد کی ربع صدی میں لگ ڈونم ھی کے ایک پادری آئی ری نائی اوس[2] ــــــ ایک یونانی فاضل جو اغلب ہے سریانی الاصل ہو ــــــ کیتھولک مسیحیت کی دینیات کا پہلا نظام مرتب صورت میں پیش کیا -

رومی سلطنت میں مسیحیت نے، خلافت میں اسلام نے اور چینی سلطنت عام میں مہایان نے دنیا دار معماران سلطنت کی قائم کردہ چھاؤنیوں اور آبادیوں سے اپنے مقاصد کے لیے فائدہ اٹھایا، تاھم آبادیوں کی اس منظم تقسیم نو کے غیر ارادی مذہبی نتائج ویسے نمایاں نہ تھے جیسے بخت نصر نے آشوری بربریت کے وسائل اختیار کر کے پیدا کیے - وہ یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا - نئی بابلی سلطنت کے اس مالک و مختار نے نہ محض ایک موجود اعلیٰ مذھب کی ترقی کو تقویت پہنچائی، بلکہ در اصل ایک بالکل نیا مذھب پیدا کر دیا -

صوبے

سلطنت ھائے عام کے بانی جس طرح اپنے علاقے میں چھاؤنیاں اور نوآبادیاں قائم کرتے ھیں اسی طرح صوبے بھی بناتے ھیں جن کے دو مختلف مقصد ہوتے ھیں - اول یہ کہ اپنی سلطنت کو محفوظ رکھیں، دوسرا یہ کہ اس معاشرے کی حفاظت کا انتظام کریں جس کے لیے سلطنت سیاسی نظام مہیا کرتی ہے - رومی سلطنت اور ھندوستان میں برطانوی راج کی تاریخوں کو ھم اس غرض سے بطور دلیل و حجت پیش کر سکتے ھیں کہ سلطنت کی سیاسی تقسیم کے دو بڑے متبادل وظیفے ہوتے ھیں - اول یہ کہ سلطنت قائم کرنے والی

۱- Drusus -

۲- Irenaeus -

قوت کی برتری محفوظ رکھی جائے ، دوم یہ کہ انحلال پذیر معاشرے کے مجلسی نظام میں سابقہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی شکست یا تباہی سے جو سیاسی خلا پیدا ہو جاتا ہے اسے پورا کیا جائے۔

ہمہ گیر سلطنتوں کے بانی اس غرض سے الحاق یا براہ راست نظم و نسق سنبھال لینے کے وسائل اختیار کرتے رہتے ہیں کہ شکست خوردہ حریف کہیں دوبارہ قوت پکڑ کر خطرے کا موجب نہ بن جائے۔ باقی رہا یہ امر کہ ان وسائل سے کس حد تک کام لیا جاتا ہے ، تو یہ ختم شدہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی وفاداری اور پشیانی کے درجے پر موقوف ہے جو سابقہ حاکموں یا رعایا کے دل میں پیدا ہوتا ہے ؛ نیز یہ امر فتوحات کی رفتار یا اس معاشرے کی سابقہ تعریف پر موقوف ہے جس میں سلطنت عام قائم ہوتی ہے۔ کامیاب معماران سلطنت ایک ہی ضرب سے اپنا تسلط قائم کر لیتے ہیں تو انہیں برابر یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی قوت اُن کے کام کو بہ زور درہم برہم نہ کر ڈالے ، خصوصاً اس حالت میں جب یہ حکومت ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سر پر قائم ہوتی ہے جو خود مختاری کے درجے سے جائز یا ناجائز فائدے اٹھانے کی مدت سے عادی بن چکی ہوں۔

مثال کے طور پر چینی دنیا میں پہلی مرتبہ موثر سیاسی اتحاد سین کی ہمہ گیر سلطنت نے پیدا کیا اور یہ کام دس سال میں (۲۳۰ ق - م — ۲۲۱ ق - م) انجام پا گیا۔ تھوڑی سی مدت میں سین خاندان کے بادشاہ چنگ نے چھ اور سلطنتیں تہ و بالا کر ڈالیں اور ایک چینی سلطنت عام قائم کر کے خود سین شی ہونگ تی[1] کا لقب حاصل کر لیا ، لیکن جس تیزی سے اس نے فتوحات حاصل کی تھیں ، اس تیزی سے سابقہ حکمران عناصر کے سیاسی شعور کا شعلہ وہ نہ بجھا سکا اور اسے آگے چل کر جس اہم مسئلے سے سابقہ پڑا ، اسے ایک مورخ سی ماسئن[2] نے شاہنشاہی دارالشوریٰ میں مقابلے کی تقریروں کے ذریعے سے بخوبی نمایاں کیا ہے۔ اس مسئلے کا تصفیہ کسی بھی طریقے پر کیا گیا ہو ، اتنا یقینی ہے کہ انتہا پسندانہ پالیسی کامیاب ہوئی اور ۲۲۱ ق ، م میں سین شی ہونگ تی نے اپنی سلطنت کے تمام علاقوں کو چھتیس فوجی حلقوں میں تقسیم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

۱- Ts'in She Hwang-ti -

۲- Sse-ma Ts'ien -

یہ انتہائی قدم اٹھاتے وقت شاہنشاہ نے چھ مفتوحہ صوبائی ریاستوں میں بھی وہی فوجی اور غیر جاگیردارانہ نظام جاری کیا جو خود اس کی سلطنت میں ایک سو سال سے جاری تھا۔ ظاہر ہے مفتوحہ ریاستوں سے کبھی امید نہ ہو سکتی تھی کہ وہ اس نظام کو پسند کریں گی۔ خود سین شی ہونگ ٹی کی حیثیت ایک سرحدی فاتح کی تھی اور ہمہ گیر سلطنتوں کی تاریخ قیام میں ہم جن شخصیتوں سے روشناس ہیں ہونگ ٹی انہیں کا نمائندہ تھا۔ مفتوحہ ریاستوں کی حکمران جماعت اس کے متعلق وہی رائے رکھتی تھی جو یونان کی شہری ریاستوں نے شاہ مقدونیہ کے بارے میں قائم کی تھی — یعنی اسے بربری سے کچھ ہی بہتر سمجھا جاتا تھا۔ چینی دنیا کے ثقافتی مرکز کے باشندے طبعاً اسی ثقافت کی پوجا کرانے پر تلے بیٹھے تھے جس کے عملی شارح وہ خود تھے۔ جو فلسفی کنفیوشس کے نقش قدم پر چل رہے تھے، انہوں نے لوگوں کو اس بے جا فخر پر زیادہ آمادہ کر دیا تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود کنفیوشس نے چینی معاشرے میں اس مجلسی بیماری کی تشخیص کی تھی کہ روایتی مراسم و اعمال سے غفلت برتی جا رہی ہے اور اس کا حکمی علاج یہ تجویز کیا تھا کہ چین کے اندر جاگیرداری عہد کے آغاز میں جو مزعوم مجلسی اور اخلاق نظام جاری تھا، اس کا احیأ از سر نو کیا جائے۔ نیم خیالی ماضی کی یہ تقدیس سین کے حاکموں اور باشندوں کو چنداں متاثر نہ کر سکی اور غیر شائستہ سرحدی ریاست نے جو ادارے جبراً ملک پر عائد کر دیے تھے، ان کے خلاف سخت خفگی کی لہر دوڑ گئی۔ سین شی ہونگ ٹی نے انتقاماً مزید متشددانہ ذرائع اختیار کر لیے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ یکایک ایک خوفناک دھماکا ہوتا: ۲۱۰ ق۔م میں شاہنشاہ کا انتقال ہوا، ساتھ ہی عام بغاوت پھوٹ پڑی اور سلطنت سین کے مرکز حکومت پر ایک باغی لیڈر نے قبضہ کر لیا، جس کا نام لیوپنگ[1] تھا۔ تاہم چینی سلطنت کے بانی نے جو انقلابی کام انجام دیا تھا، اس کے خلاف یہ کامیاب متشددانہ حرکت سابقہ نظام حکومت کی بحالی کا ذریعہ نہ بن سکی۔ لیوپنگ ان امرأ میں سے نہ تھا، جن سے جاگیریں چھینی گئی تھیں، بلکہ کسان تھا۔ وہ ایک پایدار نظام قائم کرنے میں

۱- Liu Pang -

کامیاب ہو گیا ، اس لیے کہ نہ اس جاگیرداری کو از سر نو بحال کرنے کی کوشش کی جو فرسودہ ہو چکی تھی اور نہ سین شی ہونگ ٹی کے انقلابی بدل کا خیال کیا ۔ اس کا مسلک یہ تھا کہ اپنے پیشرو کا سیزری نصب العین سامنے رکھے ، لیکن اس تک پہنچنے کے لیے قدم بہ قدم آگے بڑھے اور حتی الامکان آگسٹس کے طریق مصالحت پر عمل پیرا رہے ۔

سین سلطنت ۲۰۷ ق ۔ م میں درہم برہم ہوئی اور لیو پنگ کو ۲۰۲ ق ، م میں عام طور پر چینی دنیا کا مالک و مختار مانا گیا ۔ اس مختصر سی درمیانی مدت میں ایک اور باغی لیڈر نے سابقہ نظام بحال کرنے کی کوشش کی تھی ، جس کا نام سیانگ یو[1] تھا ، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا ۔ اس ناکامی کے بعد لیو پنگ چینی دنیا کا مالک و مختار مانا گیا تو اس کا پہلا کام یہ تھا کہ اپنے مستحق رفیقوں میں جاگیریں بانٹیں ۔ اس نے سیانگ یو کے عہد کی جاگیرداریاں بھی بحال رکھیں ، اس لیے کہ سیانگ یو کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعے سے قضیہ ختم کیا تھا ، لیکن جن جرنیلوں کو جاگیریں دیں تھیں ، انھیں یکے بعد دیگرے درجۂ اعلیٰ سے گرا کر موت کے گھاٹ آتار دیا گیا اور دوسرے جاگیرداروں کی جاگیریں بدل دی گئیں یا انھیں عارضی رعایا سے خطرناک گھرے تعلقات قائم کرنے کا موقع دیے بغیر منصب سالاری سے معزول کر دیا ۔ ساتھ ہی لیو پنگ نے شاہنشاہی قوت کی برتری کے قیام و اضافے کے لیے موثر تدبیریں اختیار کیں ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سین شی ہونگ ٹی کی وفات سے ایک سو سال بعد اس کی سلطنت کا نصب العین پورا ہو گیا ، یعنی سارے نظم و نسق کی عنان اختیار مرکز کے ہاتھ میں تھی اور مقامی انتظامات کے جو حلقے قائم کر دیے گئے تھے ، ان کی باگ ڈور موروثی کارندوں کے حوالے تھی ۔ اس مرتبہ کارنامہ درجہ کمال پر پہنچ گیا ، اس لیے کہ لیو پنگ اور اس کے جانشینوں کی شاطرانہ سیاست نے وہ انسانی آلہ کار فراہم کر لیے تھے ، جن کے فراہم نہ ہونے کے باعث سین شاہنشاہ کا عالیشان منصوبہ اندوہناک انجام کو پہنچا تھا ۔

جس حکومت کے اختیارات کی باگ ڈور مرکز کے ہاتھ میں ہو ، اس کا نظم و نسق پیشہ ور سول سروس کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ۔ ھن خاندان

۱۔ Hsiang Yü ۔

جس کا بانی لیو پنگ تھا ، ایک اصلاح اور قابل قبول سول سروس پیدا کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہوا کہ اس نے کنفیوشس کے مکتب فلسفہ سے مصالحت کر لی تھی اور ان فلسفیوں نے سابقہ جنگی امرأ سے جو اتحاد کر رکھا تھا ، اسے آہستہ آہستہ کمزور کر دیا تھا - اس طرح سول سروس کے دروازے ایک وسیع تر طبقہ امرأ کے لیے کھول دیے گئے ، جن کی ثقافتی صلاحیت کا پیمانہ علوم کنفیوشس میں مہارت کے سوا کچھ نہ تھا - پھر یہ تبدیلی تدریجاً عمل میں آئی اور اس کا انتظام ایسی دانشمندی اور ہنروں سے کیا گیا کہ نئے طبقہ امرا نے پرانے طبقہ امرا کا تاریخی لقب — چن زی[1] — بھی اختیار کر لیا اور اس کا اعتراف بھی ایسے انداز میں نہ کیا گیا کہ سمجھا جائے کوئی اہم مجلسی اور سیاسی انقلاب عمل میں آ رہا ہے - اگر اس کارنامے کی پایداری پیش نظر رکھی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جن مدبروں نے ہمہ گیر سلطنتیں قائم کیں ، ان میں ہن خاندان کو سب پر عظمت و فوقیت حاصل تھی - مغربی دنیا رومی شاہنشاہ آگسٹس کے کارنامے سے متعارف ہے ، جو امتیاز میں مقدم الذکر کارنامے سے فروتر تھا - چینی تاریخ میں درجۂ اختصاص حاصل کرنے والے افراد کو نظر انداز کر دیا جائے تو مغربی دنیا کے لوگ لیو پنگ کے تاریخی وجود سے بھی آگاہ نہیں - ممکن ہے دور مستقبل کے کسی عالم گیر معاشرے کے مورخ ، جس کی شاخیں عہد ماضی کی تمام تہذیبوں کے اندر پہنچی ہوئی ہوں ، بہتر حسن تناسب کا ثبوت دے سکیں -

چین کی سلطنت میں صوبائی تنظیمات کی اہمیت کا جائزہ لے چکنے کے بعد ہمارے پاس مزید مثالوں پر غور کرنے کے لیے ہرگز گنجائش نہیں - اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ان صوبائی تنظیمات نے نا دانستہ ان اداروں یا طبقوں کی کیا خدمات انجام دیں ، جن کے فائدے کے لیے یہ بنائے ہی نہ گئے تھے - اس سلسلے میں بھی ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے اور وہ یہ کہ مسیحی کلیسا نے کس طرح رومی سلطنت کی صوبائی تنظیمات کو اپنے فوائد کے لیے استعمال کیا -

کلیسا نے اپنے مذہبی نظام کی ترتیب کے لیے ان شہری ریاستوں سے فائدہ اٹھایا ، جنھیں یونانی مجلسی نظام اور رومی سیاسی نظام میں خلایا کی

۱- Chun tze -

حیثیت حاصل تھی۔ یونانی تہذیب کی روایات جیسے جیسے تدریجاً فرسودہ ہوتی گئیں، شہر نے ایک ایسے مقام کا مفہوم پیدا کر لیا، جو کسی مسیحی بشپ کا مرکز تھا، حالانکہ اس سے پیشتر یہ مقام سول خود اختیاری ادارات کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور رومی دولت اقوام میں اسے بلدیہ کی حیثیت حاصل تھی۔ جس بشپ کا حلقہ اقتدار شہنشاہ ڈائیو کلیشئن کے بنائے ہوئے رومی صوبے میں مرکز سمجھا جاتا تھا، اسے صوبے کے تمام بشپ اپنا رئیس سمجھنے لگے[1] اور یہ آرچ بشپ اس بشپ کو اپنا سردار ماننے لگے جس کے حلقۂ اقتدار کو صوبوں کے مجموعے میں انتظامی مرکز تسلیم کیا جاتا تھا اور ڈائیو کلیشئن کے نظام میں اسے ڈایو سیز[2] کہتے تھے ——— کلیسا نے لفظ لے لیا، مگر اسے ایک بشپ کے دائرہ اقتدار کے لیے استعمال کیا گیا۔ بشپ، آرچ بشپ، اسقف اعظم علاقائی بطرائق اعظم کے تابع تھے اور یہ آخری عہدہ ڈائیو کلیشئن کے نظام فوجی میں 'پری فیکٹ' کے عہدے کے برابر تھا۔ مشرق میں بطریقوں کے چار مرکز بنا دیے گئے، یعنی سکندریہ، یروشلم، انطاکیہ اور قسطنطنیہ اور ڈائیو کلیشئن کے نظام میں انہیں مقامات پر چار ''پری فیکٹ'' اور مغرب میں تین ''پری فیکٹ'' تھے: انھیں ملا کر بطریق رومہ کے ماتحت رکھ دیا گیا۔ اس طرح رومہ کا حلقہ اقتدار بہت وسیع ہو گیا، لیکن اس میں مسیحی آبادی بہت کم تھی۔

مسیحی کلیسا کی یہ علاقائی تنظیم کسی شہنشاہ کے حکم سے وجود میں نہ آئی تھی، یہ تنظیم خود کلیسا نے اس زمانے میں کی جب سرکاری طور پر اس کا وجود تسلیم نہ کیا جاتا تھا، بلکہ وہ ظلم و ستم کا ہدف بنا ہوا تھا۔ اگرچہ اس نظام نے سیکولر حکومت کی صوبائی تنظیمات اختیار کر لی تھیں، تاہم یہ سیکولر حکومت سے بالکل آزاد تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیکولر حکومت کی شکست سے خود اس کلیسائی نظام پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ

۱۔ انگلستان میں یہ مفاہیم دور حاضر تک رائج تھے۔ شہر وہ تھے جن میں گرجے واقع تھے؛ باقی قصبوں کو بوروز Boroughs کہا جاتا تھا۔

۲۔ Diocese ۔ آج کل اس کا اطلاق اسقفی حلقے پر ہوتا ہے، ابتدا میں اس کا یہ مفہوم نہ تھا۔

پڑ سکتا تھا ۔ گال میں شہنشاہی نظام پر تزلزل طاری ہو گیا ، اسے ایک انوکھی تدبیر سے بحال رکھنے کی کوشش کی گئی ، یعنی وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں کے ممتاز افراد کو جمع کر لیا جاتا ، تاکہ ان کے ذریعے سے مقامی امداد حاصل ہو سکے ۔ کلیسا نے اس تدبیر کو سود مند سمجھا اور جب سلطنت ختم ہو گئی تو مسیحی کارکن بھی مختلف علاقوں کے بشپوں کی کانفرنس بلا کر اپنے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے ۔

مثلاً قرون وسطیٰ میں فرانس کے اندر کلیسائی نقشے کی جو کیفیت تھی ، اسے سامنے رکھ کر مؤرخ پر واضح ہو جائے گا کہ گالیا ٹوگاٹا کی شہری ریاستوں اور گالیا کوماٹا کے پرگنوں میں بشپوں کا جال بچھ گیا تھا اور آرچ بشپ ان علاقوں کے لیے مقرر کیے جاتے تھے ، جو ڈائیو کلیشن کی تقسیم کے مطابق آگسٹس کے مقرر کیے ہوئے صوبوں کے سب ڈویژن تھے ۔ صوبے چار تھے : ناربوننسس[1] ، ایکوٹینیا[2] ، لگڈننسس[3] اور بلجیکا[4] ۔ پانچ بطریقی حلقے بھی بدستور قائم تھے ، چار مشرق کی آرتھوڈکس مسیحیت کے دائرے میں اور ایک مغرب کی کیتھولک سر زمین کے لیے اور یہ ہمارے عہد کی بات ہے جب یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں ؛ اگرچہ ان کے علاقوں کی حد بندیوں ، ان کی تقسیم اور کلیسائی عوام کی قومیت میں پندرہ سو سال کی اس مدت کے اندر وسیع تبدیلیاں ہو چکی ہیں ، جس کا آغاز چوتھی عالم گیر کونسل منعقدہ کیلسی ڈون[5] ۴۵۱ء سے ہوتا ہے ۔ بے شک نقصانات سے بھی سابقہ پڑا ، لیکن اس کے مقابلے میں فوائد بھی بہت زیادہ ہوئے ۔ جب بطریقوں کے عہدے قائم کیے گئے تھے تو ان فوائد کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا ۔

حکمرانی کے مرکز

سلطنت ہائے عام کی مرکزی حکومتوں میں یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ مرور زمان کے ساتھ وہ اپنے صدر مقام تبدیل کرتی رہتی ہیں ۔ جو لوگ سلطنتیں قائم کرتے ہیں وہ عموماً اپنے مقبوضہ علاقوں کا صدر مقام ایسی جگہ تجویز

۱- Narbonensis -
۲- Aquitania -
۳- Lugdunensis -
۴- Belgica -
۵- Calchedon -

کرتے ہیں جو ان کے نقطہ نگاہ سے موزوں ہو۔ یا تو وہ اپنا پہلا دارالحکومت قائم رکھتے ہیں (مثلاً رومہ) یا متصرفہ علاقوں کے حواشی میں کوئی نیا مقام تجویز کر لیتے ہیں، جہاں سلطنت قائم کرنے والے کے لیے اپنے وطن سے پہنچنا آسان ہو (مثلاً کلکتہ) لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، سامراجی نظم و نسق کے تجربے یا واقعات کے دباؤ کے ماتحت سہولت کے نقطۂ نگاہ سے نئی جگہیں چن لی جاتی ہیں۔ یہ کام وہ لوگ بھی انجام دیتے رہے ہیں جنھوں نے سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اور یہ ان لوگوں کے ہاتھوں بھی انجام پاتا رہا ہے جنھوں نے ابتدائی سلطنت کی عارضی شکست پر اس کا نظم و نسق از سر نو سنبھال لیا۔ نئے مقام کی تجویز میں صرف ابتدائی سلطنت قائم کرنے والی طاقت ہی کی سہولت مد نظر نہیں رکھی جاتی، بلکہ پوری سلطنت کی مصلحتیں ملحوظ رہتی ہیں۔ نقطۂ نگاہ میں وسعت و ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے اور مختلف حالات میں مختلف مقامات پیش نظر آ جاتے ہیں۔ اگر انتظامی سہولتوں کا خیال ہو تو ایسا مقام تجویز کیا جاتا ہے جسے مرکزی حیثیت حاصل ہو اور جہاں سے آمد و رفت کے لیے سڑکیں سلطنت کے تمام حصوں کے لیے موجود ہوں۔ اگر کسی حملہ آور کے مقابلے میں دفاع کی غرض تمام مقاصد پر مقدم ہوگی تو ایسا مقام تجویز کیا جائے گا جہاں سے سلطنت کی اُس سرحد پر فوجی قوت بہ سہولت پہنچائی جا سکے، جسے خطرہ لاحق ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمہ گیر سلطنتوں کے بانی ہمیشہ ایک نوع کے نہیں ہوتے، کبھی وہ کسی ایسی تہذیب کے نمائندے ہوتے ہیں جو اُس معاشرے کے لیے اجنبی ہو جس کی سیاسی ضرورتوں کا انتظام انھوں نے اپنے ذمے لیا ہے؛ بعض اوقات وہ بربری ہوتے ہیں جو اخلاق اعتبار سے اُس تہذیب کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں جس کی طرف وہ مائل ہوتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر انھیں خارجی پرولتار سمجھنا چاہیے۔ بعض اوقات وہ سرحدی علاقوں کے محافظ ہوتے ہیں اور یہ صورت اکثر پیش آتی رہتی ہے۔ یہ لوگ بیرونی بربریوں کے مقابلے میں سرحد کی حفاظت کا فرض انجام دے کر استحقاق پیدا کر لیتے ہیں کہ تہذیب کے رکن سمجھے جائیں۔ پھر وہ ہتھیار سنبھال کر معاشرے کے اندر در آتے ہیں اور اُسے ایک سلطنت دے دیتے ہیں۔ سب سے آخر میں یہ کہ ——— اور ایسی مثالیں بہت شاذ ہیں ———

ہو سکتا ہے نہ وہ اجنبی ہوں ، نہ بربری اور نہ محافظین سرحد ، بلکہ زیر غور معاشرے کے اندر سے اُٹھے ہوں اور راج دھانی کے باشندے ہوں ۔

جو سلطنتیں اجنبیوں یا بربریوں یا سرحدی محافظوں نے بنائیں اُن کے صدر مقام سرحد کے بجائے مرکز کی طرف مائل تھے ، اگرچہ سرحدی محافظوں کی قائم کی ہوئی سلطنتوں میں دارالحکومت سرحد سے قریب تر ہونا چاہیے ، تاکہ وہ لوگ اپنا ابتدائی کام بہتر طریقے پر پورا کر سکیں ۔ جو سلطنتیں راج دھانی کے باشندوں نے بنائیں اُن کے دارالحکومت کا آغاز طبعاً مرکز سے ہوتا ہے ، اگرچہ کسی خاص حصے میں حملے کا خدشہ پیدا ہو جانے کی بناء پر دارالحکومت کو سرحد کی طرف بھی منتقل کیا جا سکتا ہے ۔ اب ہمیں ان اصول و قواعد کی مثالیں پیش کرنی چاہئیں جن پر راج دھانیوں یا صدر مقامات کے وقوع اور تبدیلی کا انحصار ہے ۔

اجنبیوں کی قائم کی ہوئی سلطنتوں میں سے ہندوستان کے برطانوی راج کی مثال بہت نمایاں ہے ۔ انگریز سمندر کے راستے ہندوستان پہنچے ۔ اُن کی غرض یہ تھی کہ وہاں کے باشندوں سے تجارتی تعلقات پیدا کریں ؛ حکمرانی کا خواب انھوں نے بہت بعد میں دیکھا ۔ انھوں نے بمبئی ، مدراس اور کلکتے میں تجارتی مرکز قائم کیے ۔ آخری مقام اولین سیاسی مرکز بن گیا ، اس لیے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتے ہی کے عقبی علاقے میں دو زرخیز صوبوں[1] پر پہلے پہل سیاسی تسلط قائم کیا اور کسی دوسرے حصے میں اس قسم کا تسلط کم و بیش ایک نسل گزر جانے کے بعد ہوا ۔ کلکتہ ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت تک برطانوی ہند کا مرکز رہا ۔ اس کے بعد ویلزلی (گورنر جنرل ۱۷۹۸ء - ۱۸۰۵ء) نے پورے ہندوستان کو برطانوی حکومت کے ماتحت لانے کا منصوبہ تیار کیا اور پچاس سال سے بھی زیادہ مدت کے بعد یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ، لیکن سیاسی حیثیت سے متحدہ برصغیر کے انتظامی تقاضوں نے آخرکار برطانیہ کی مرکزی ہندوستانی حکومت کا صدر مقام کلکتے سے منتقل کر کے دہلی پہنچا دیا ۔ یہی مقام اس

۱- یہاں مصنف نے سند دیوانی کی طرف اشارہ کیا ہے جو کلایو نے ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم ثانی سے حاصل کی تھی ۔ یہ سند تین صوبوں کے لیے تھی ، یعنی بنگال ، بہار اور اڑیسہ ، نہ کہ دو کے لیے جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے ۔

سلطنت کا طبعی مرکز ہو سکتا تھا - اس میں ایک طرف دریاے سندھ اور دوسری طرف دریاے گنگا اور ان کے معاونوں سے سیراب ہونے والے علاقے شامل تھے -

دھلی محض طبعی صدر مقام ہی نہ تھا ، بلکہ اس کی اہم تاریخی حیثیت بھی تھی - یہ ۱۶۲۸ء سے مغلوں کا دارالحکومت چلا آتا تھا - انگریزوں کی طرح مغلوں نے بھی ہندوستان کو ایک اجنبی سلطنت دی تھی - وہ سمندر کے راستے نہیں ، بلکہ شمالی و مغربی سرحد سے خشکی کے راستے ہندوستان پہنچے تھے - اگر وہ اس مسلک پر عمل پیرا ہوتے جس پر انگریز بعد میں عمل پیرا ہوئے تو کابل کو اپنا دارالحکومت بناتے - انھوں نے یہ نہ کیا - اس کے وجوہ ان کی تاریخ کے تفصیلی مطالعے سے واضح ہو سکتے ہیں - دھلی ان کا پہلا صدر مقام نہ تھا ، اس سے پیشتر آگرہ صدر مقام تھا اور اسے بھی مرکزی حیثیت حاصل تھی -

اگر ہم ھسپانوی امریکہ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جن لوگوں نے وسطی امریکہ میں سلطنت قائم کی ، انھوں نے مستقل طور پر ٹنوچ ٹٹلن[1] (میکسیکو شہر) کو دارالحکومت بنا لیا ——— اسے ''دھلی'' سمجھنا چاہیے ——— اور ویرا کروز کے حقوق نظر انداز کر دیے جو ان کے داخلے کی بندرگاہ تھا ——— اسے ''کلکتہ'' سمجھنا چاہیے[2] ——— پیرو میں انھوں نے بالکل مختلف طریقہ اختیار کیا ، یعنی ''کزکو'' کو جو انکاؤں کا پرانا دارالحکومت تھا ، نظر انداز کر دیا ، حالانکہ یہ ملک کے اندر سطح مرتفع پر واقع تھا اور لیما کو دارالحکومت بنا لیا جو ایک ساحلی مقام تھا - اس کی وجہ بلا شبہ یہ سمجھی جا سکتی ہے کہ پیرو میں بحرالکاہل والے ساحلی علاقے کی سر زمین بہت زرخیز اور ہر لحاظ سے اہم تھی ، میکسیکو میں اوقیانوسی ساحل کی زمین کو یہ حیثیت و اہمیت حاصل نہ تھی -

---

۱- Tenochtitlan -

۲- دھلی سے مراد یہ ہے کہ میکسیکو کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور کلکتے کے ذکر سے یہ غرض ہے کہ ویرا کروز ساحلی مقام تھا ، جسے مرکزی حیثیت حاصل نہ تھی -

عثمانی ترکوں نے مشرق کے آرتھوڈکس مسیحی معاشرے کے لیے ایک سلطنت مہیا کی اور یہ سلطنت اجنبیوں کی قائم کردہ تھی - وہ یکے بعد دیگرے اپنے صدر مقامات بدلتے رہے - پہلے ایشیا میں، بعد ازاں یورپ میں، یہاں تک کہ اُن کے پیش رو بیزنطینیوں کا بے مثل صدر مقام ان کے قبضے میں آ گیا (قسطنطنیہ) -

جب تاتاریوں کے خاقان قبلائی (۱۲۵۹ء - ۱۲۹۴ء) نے مشرق بعید کے معاشرے کے پورے علاقے فتح کر لیے، تو اس نے دارالحکومت منگولیا کے مقام قراقرم سے پیکن میں تبدیل کر لیا، جو چین میں ہے - بے شک قبلائی کی عقل کا فیصلہ یہی تھا، لیکن اُس کے دل میں اپنے آبائی مرغ زاروں کی محبت موجزن تھی اور اس نیم چینی تاتاری مدبر نے اپنے خانہ بدوشانہ احساسات کی تسکین کے لیے چونگ ٹو میں ایک ضمنی صدر مقام بنا لیا، جو منگولیا کی سطح مرتفع کے جنوبی و مشرقی حاشیے پر اُس جگہ واقع ہے جہاں سے سطح مرتفع قریب تر ہے، لیکن پیکن بہ دستور حکومت کا مرکز بنا رہا اور چونگ ٹو کو محض آرام و استراحت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اگرچہ کبھی کبھی یہاں بھی حکومت کا کام انجام پاتا تھا -

ہم چونگ ٹو کو شملے کے برابر رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ اگر قبلائی کو اپنی سطح مرتفع سے محبت تھی، تو برطانوی وائسرائے بھی معتدل آب و ہوا کے لیے ترستے تھے - چونگ ٹو کی ایک مثال برطانیہ سے بھی پیش کی جا سکتی ہے، یعنی بالمورل[1]، اس لیے کہ ملکہ وکٹوریا کا دل بھی پہاڑی علاقوں میں اٹکا ہوا تھا، جس طرح قبلائی اپنی سطح مرتفع کا خواہاں تھا - ہم ایک قدم آگے بڑھا کر کہہ سکتے ہیں کہ فرض کیجیے الیسویں صدی کا کوئی چینی سیاح بالمورل کی دلکشیوں کو ایسے پُر لطف انداز میں پیش کر دے کہ پچیسویں صدی کے کسی چینی شاعر کے دل میں ملکہ وکٹوریا اور اس کی عالی شان استراحت گاہ کو ہمیشہ کے لیے چینی نظم میں محفوظ کر دینے کا جذبہ پیدا ہو جائے -

---

۱- Balmoral، شاہان انگلستان کا ایک محل جو ایبرڈین شہر میں واقع ہے - یہ ایک جاگیر ہے جو ۱۸۴۸ء میں ملکہ وکٹوریا کے شوہر نے خریدی تھی اور وہاں ایک عالی شان محل تعمیر کیا - یہاں کے مناظر بڑے دلکش ہیں -

سیلوکس نکاٹور اُن لوگوں میں سے تھا جنھوں نے سکندر اعظم کی وسیع اور چند روزہ سلطنت کے ایک حصے میں نئی سلطنت قائم کی۔ وہ اپنے دار الحکومت کے متعلق مسلسل دو دلا رہا، اس لیے کہ فیصلہ نہ کر سکا، اس کے سامراجی مقاصد کس سمت کا رخ کرنے سے بوجہ احسن پورے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ابتدا میں اُس کا فیصلہ یہ تھا کہ سابقہ ھخامنشی سلطنت کے صوبۂ بابل پر قبضہ جما لے۔ یہ صوبہ بڑا زرخیز تھا۔ چنانچہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اُس نے سیلوکیا کے نام سے دریائے دجلہ کے دائیں کنارے اپنا دارالحکومت اُس مقام پر بنایا جہاں دجلہ و فرات کے درمیان فاصلہ بہت کم رہ جاتا ہے۔ یہ جگہ بڑی اچھی تھی اور سیلوکیا بہت بڑا شہر بن گیا۔ بعد میں پانچ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک یہ یونانی ثقافت کا نہایت اہم مرکز رہا، لیکن سیلوکس کو فتوحات کا ایک نیا موقع نظر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ رقیب مقدونوی جرنیلوں سے مغربی سمت کے کچھ علاقے چھینے جا سکتے ہیں؛ چنانچہ اس چکر میں مبتلا ہو کر اُس کی دلچسپوں کا مرکز بحیرۂ روم کے ماحول کی طرف منتقل ہو گیا اور اُس نے شام میں انطاکیہ کو اپنا خاص دارالحکومت بنا لیا۔ یہ مقام نہر العاصی[1] کے دھانے سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سیلوکس کے جانشیں اپنی قوت مصر کے بطلیموسیوں اور مشرقی بحیرۂ روم کی دوسری طاقتوں کے خلاف ضائع کرتے رہے اور اُن کے بابلی علاقے بھی پارتھیوں نے چھین لیے۔

یہ تمام مثالیں ان سلطنتوں سے لی گئیں جو اجنبی تہذیبوں کے نمایندوں نے قائم کیں، اب ہم اُن سلطنتوں کے دارالحکومتوں کی موقعیت پر غور کریں گے، جن کی بنیاد بربریوں نے رکھی۔

ایرانی بربریوں نے سریانی معاشرے کے لیے ایک سلطنت عام ھخامنشی سلطنت کے نام سے قایم کی تھی، ان لوگوں کا وطن بنجر پہاڑوں میں واقع تھا جو عام شاھراھوں سے بہت دور ھٹا ھوا تھا۔ ھیروڈوٹس کی تاریخ کے آخری

۱- سیلوکیا نام کے بہت سے شہروں میں سے ایک شہر انطاکیہ کے پاس آباد ھوا تھا جو انطاکیہ کی بندرگاہ تھا۔ رسولوں کے اعمال میں مرقوم ھے کہ اسی سیلوکیا سے پولوس رسول اپنے پہلے تبلیغی سفر میں جہاز پر سوار ھو کر قبرس گئے تھے۔

حصے میں جو کہانی بیان کی گئی ہے ، یہ ہے کہ سائرس اعظم نے جو ہخامنشی سلطنت کا بانی تھا ، ایرانی قوم کی اس تجویز کی سخت مذمت کی کہ اب وہ دنیا کے مالک بن گئے ہیں ، لٰہذا انھیں اپنے وطن کے بنجر پہاڑوں کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر توطن اختیار کر لینا چاہیے جو زیادہ خوشگوار ہو ۔ یہ کہانی بڑی اچھی ہے اور ہم اپنی کتاب کے ابتدائی حصے میں یہ بتا چکے ہیں کہ جہاں ماحول محنت طلب ہو ، وہاں انسانوں میں بلند کارنامے انجام دینے کا جذبہ تازہ رہتا ہے ۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ سائرس کے ہاتھوں مادی سلطنت تباہ ہونے سے ایک سو سال پیشتر ہخامنشیوں کے ایک جد نے اپنا دارالحکومت آبائی وطن سے منتقل کر کے اس میدانی علاقے میں قائم کر لیا تھا جو سب سے پہلے اس کے قبضے میں آیا تھا ۔ اس مقام کا نام ''انسان'' تھا اور یہ شوش کے آس پاس واقع تھا ، اگرچہ اس کی صحیح جگہ اب تک متعین نہیں ہو سکی ۔ جب ہخامنشی سلطنت قائم ہو گئی تو اس کا دارالحکومت سال بہ سال موسموں کے مطابق منتقل ہوتا رہتا تھا اور اس طرح مختلف آب و ہوا والے علاقوں میں کئی دارالحکومت قائم ہو چکے تھے ، لیکن بڑے دارالحکومت یہ تھے : پرسی پولس ، اکبتانا ، شوش ۔ بعض اوقات جغرافیائی سہولت کے لحاظ سے بابل میں بھی سرکاری کاروبار جاری رہتا تھا ۔ یہ مقام سلطنت کا میدانی دارالحکومت تھا ۔

ایرانی معماران سلطنت نے سریانی دنیا کے لیے ابتدا میں جو سلطنت عام قائم کی تھی جب اسے حجازی بربریوں نے تقریباً ایک ہزار سال بعد از سر نو ترتیب دیا تو تاریخ پھر پورے زور سے دھرائی گئی ۔ پہلے معماران سلطنت ایرانی سطح مرتفع پر رہتے تھے اور دوسرے عربی سطح مرتفع پر ۔ بیچ میں ایک ہزار سال تک یونانیوں کی مداخلت جاری رہی ۔ حجاز کی ایک نخلستانی ریاست کے باہم لڑنے والے امیر لوگوں کی طبعی دانش مندی کی یہ ایک برکت تھی کہ انھوں نے پیغمبر اسلام کو دعوت دے کر اپنے یہاں بلا لیا ، جب مکے کی رقیب جماعت انھیں مسترد کر چکی تھی ، اور اس امید پر اپنا لیڈر بنا لیا کہ وہ ان میں اتحاد پیدا کر دیں گے جس کے پیدا کرنے میں وہ خود ناکام رہے تھے ۔ اس طرح یثرب ہجرت کے بعد تیس سال کے اندر ایک ایسی سلطنت کا دارالحکومت بن گیا جس میں ایک طرف سلطنت رومہ کے صوبے شام اور مصر شامل تھے ، دوسری طرف پوری سابقہ ساسانی سلطنت اس

میں مل گئی تھی - دارالحکومت کے سلسلے میں یثرب کا استحقاق اس امر پر مبنی تھا کہ اسی دور افتادہ نخلستان سے اسلامی عرب کی ہمہ گیر سلطنت پیدا ہوئی تھی اور یہ کارنامہ اتنی تیزی سے انجام پایا تھا کہ دیکھتے ہی یقین ہو جاتا تھا یہ سب کچھ خدا کی رحمت سے ہوا - یثرب کا نام از روئے تقدس مدینۃ النبی ، یعنی شہر پیغمبر رکھا گیا - یہ مقام خلافت کا آئینی مرکز کم از کم اس وقت تک ضرور رہا جب تک عباسی خلیفہ منصور نے ۷۶۲ء میں بغداد کی بنیاد نہ رکھی ، لیکن اموی خلفاء نے اس سے پیشتر اپنا دارالحکومت عملاً دمشق کو بنا لیا تھا اور ایک سو سال سے زیادہ مدت تک وہی دارالحکومت رہا -

اب ہم سرحدی محافظوں کی قائم کی ہوئی ہمہ گیر سلطنتوں کے معاملے پر غور کریں گے - مصری تہذیب کی طویل تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے معاشرے کو کم از کم تین مرتبہ اُن سرحدی محافظوں نے اتحاد کی دولت سے سرفرازی بخشی یا جبراً اُسے متحد کر دیا جو نیل زیریں کے بالائی علاقوں سے آئے تھے اور ہر موقع پر ایک سرحدی علاقے نے بڑھتے بڑھتے سلطنت کا درجہ حاصل کر لیا تھا (اگرچہ تیسرے موقع پر فوراً نہیں) ساتھ ہی دار الحکومت پہلی اور دوسری مرتبہ تھیبز (الاقصر) سے ممفس (قاہرہ) میں منتقل ہو گیا ، اس لیے کہ ملک کی آبادی کے بڑے حصے کے لیے یہاں پہنچنا نسبتہً سہل تھا - تیسرے موقع پر ایک سرحدی قلعے کو دارالحکومت بنا لیا گیا جو ڈیلٹا کے شمالی و مغربی گوشے کے قریب تھا اور یہی گوشہ فوجی نقطۂ نگاہ سے خطرے کی زد میں تھا -

یونانی تاریخ میں رومہ کے معاملات بھی مصری تھیبز کی یاد تازہ کر دیتے ہیں - رومہ نے اس وقت نمایاں شہرت حاصل کی جب گالوں پر یونانی دنیا کی نگرانی و نگہبانی کا منصب اٹرسکنوں سے چھین لیا - تھیبز نے بھی اسی بنا پر شہرت حاصل کی تھی کہ دریائے نیل کے پہلے آبشار کی نگرانی و نگہبانی نوبیہ کے بربروں کو الکاب میں شکست دے کر چھین لی تھی - تھیبز کی طرح رومہ کا رخ بھی باہر سے اندر کی طرف پلٹ گیا اور اس نے یونانی معاشرے پر سیاسی اتحاد عائد کر دیا - وہ خود اس معاشرے کا رکن تھا اور بہت سی صدیوں تک اُس سلطنت کا دارالحکومت بنا رہا جو اس نے خود پیدا کی تھی ، تاہم یہ امر قرین قیاس ہے کہ اگر مارک انٹونی کو اپنی مرضی کے مطابق

کام کرنے کا موقع مل جاتا اور جنگ ایکٹیم[1] کا نتیجہ برعکس نکلتا تو جس دور میں رومہ کی فتوحات اوج کمال پر پہنچیں، اسی دور میں یہ بھی امکان تھا کہ رومہ کی جگہ سکندریہ دارالحکومت بن جاتا۔ تین صدی بعد مختلف محرکات سے جن کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی، تیزی سے زوال پذیر سلطنت کا دارالحکومت قسطنطنیہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا موقع بہت اچھا تھا، ساتھ ہی یہ رومہ سے بہت دوری پر واقع تھا۔ آبنائے باسفورس کے اس شہر کا مستقبل بہت شاندار تھا اور یہ بعد کی جانشین سلطنتوں کا دارالحکومت بنا رہا۔ جو شہر دریائے ٹائبر کے کنارے پر واقع تھا، یعنی رومہ وہ مدینہ منورہ کی طرح ایک اعلیٰ مذہب کا مقدس شہر بننے پر قانع ہو گیا۔

قسطنطنیہ دوسرا رومہ بن گیا۔ ماسکو کارل مارکس سے پیشتر کے دور میں تیسرا رومہ بننے کا دعوے دار رہا۔ اب ہمیں روسی آرتھوڈکس مسیحی تہذیب کی سلطنت کے دارالحکومتوں کا مقابلہ پیش نظر لانا چاہیے۔ رومہ کی طرح ماسکو محافظ سرحدی ریاست کا دارالحکومت تھا جو بربریوں کے خلاف نبرد آزما تھی۔ تاتاری خانہ بدوشوں کا خطرہ کم ہو گیا تو ماسکو پر مغربی مسیحیت کے قریبی ہمسایوں نے حملے شروع کر دیے یعنی پولوں اور لتھوانیوں نے۔ جس دور میں ماسکو کا مستقبل دارالحکومت کی حیثیت میں بالکل محفوظ نظر آتا تھا، اس دور میں ایک مغربیت مآب زار بروے کار آ گیا اور اس نے ایک نئے دارالحکومت کی بنیاد رکھ دی، یعنی سینٹ پیٹرز برگ (۱۷۰۳ء)؛ یہ اس علاقے میں واقع تھا جو سویڈن سے چھینا گیا تھا۔ پیٹر اعظم اپنی حکومت کا مرکز اندرون ملک سے منتقل کر کے ایک ایسے مقام پر لے آیا جو فن کاری کے لحاظ سے بدرجہا ترقی یافتہ دنیا کے لیے ایک کھڑکی کی حیثیت رکھتا تھا۔ بالکل اسی طرح سلیوکس نکاٹور نے اپنا دارالحکومت سیلوکیا سے انطاکیہ منتقل کر لیا تھا اور سیلوکیا بہت دور

۱- Actium، یہ جنگ ۲- ستمبر ۳۱ ق-م کو ہوئی تھی۔ اس میں ایک فریق اوکٹیوین (Octavian) تھا جو بعد میں آگسٹس کے نام سے شہنشاہ بنا؛ دوسرا فریق مارک انٹونی (Mark Antony) اور کلوپیٹرا (Cleopetra) ملکۂ مصر تھے۔ آخری فریق نے شکست کھائی۔ انٹونی جو لیس سیزر کا محب خاص تھا۔

مشرقی سر زمین میں واقع تھا ، لیکن دونوں میں اختلافات بھی تھے جن میں سے ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے ۔ سلیوکس نے سلیوکیا کو چھوڑا اور انطاکیہ کو دارالحکومت بنایا ۔ وہ جنوبی و مغربی ایشیا میں ایک اجنبی معمار سلطنت تھا ، لیکن وہ اپنی پیدا کردہ سلطنت سے ہٹ کر ایک ایسے مقام پر آ گیا جو بحیرۂ روم سے بہت تھوڑے فاصلے پر تھا اور یونانی دنیا کے قلب سے اُسے زیادہ قرب حاصل تھا ۔ جس علاقے کو اُس نے چھوڑا تھا ، وہاں کے لوگوں کو اس کے ساتھ کوئی قومی وابستگی نہ تھی ۔ گویا سمجھنا چاہیے سلیوکس نے اپنے وطن کا رخ کر لیا تھا ، لیکن روس کے معاملے میں تمام جذباتی مصلحتیں ترک کردہ ماسکو سے وابستہ تھیں اور مغربی جانب کا وہ خنک آبی راستہ جس پر پیٹر کے دارالحکومت کی کھڑکی کھلتی تھی ، یونانی دنیا کے بحیرۂ روم سے لگا نہ کھا سکتا تھا ۔ سینٹ پیٹرز برگ دو صدی تک دارالحکومت بنا رہا ۔ جب بالشویکوں نے انقلاب بپا کیا تو ماسکو نے پھر اپنی حقیقی حیثیت حاصل کر لی اور سینٹ پیٹر کے شہر کا نیا نام لینن گراڈ[1] رکھا گیا ۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس چوتھے رومہ کی تقدیر تسمیے کے لحاظ سے پہلے کے برعکس ہے ۔ جب رومہ سلطنت کا دارالحکومت نہ رہا تو یہ کاوور[2] اور مسولینی کی کوششوں کے باوجود سینٹ پیٹرز برگ[3] رہا ، یعنی پطرس رسول کا مقدس شہر ۔

تاریخ کی ہمہ گیر سلطنتوں کے فرمانرواؤں کو ایسے ہی محرکات دارالحکومتوں کی موقعیت کے باب میں متاثر کرتے رہے ۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ان دارالحکومتوں کو دوسرے لوگ ، نیز آس پاس کی مقتدر اقلیتیں

۱- Leningrad ، مسٹر سمرویل (مرتب تلخیص کتاب) نے لکھا ہے کہ کوئی پچاس سال ہوئے میرے ایک دوست نے مجھے فرانس کے ایک صوبائی شہر سے خط لکھا : کلیسا کے مخالفوں نے کونسل میں اکثریت حاصل کر لی ہے اور جس بازار کا نام پہلے " روجین بپٹسٹ " تھا ، اب اس کا نام " رو ایمیل زولا " رکھا گیا ہے ۔

۲- Cavour اطالوی مدبر جس نے اٹلی کو متحد کرنے کا کارنامہ انجام دیا ، ۱۸۶۱ء میں وفات پائی ۔

۳- سینٹ پیٹرز برگ کے لفظی معنی ہیں " پطرس رسول کا شہر " ۔

کن اغراض کے لیے استعمال کرتی رہیں ، جو ان دارالحکومتوں کے بنانے والوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے - اس سلسلے میں ہماری گفتگو کا آغاز تصرف اور غارت گری سے ہو گا - فیلڈ مارشل بلوخر[1] ایک ایسی طاقت کا سپہ گر تھا ، جس کے پاس فوجی قوت و استعداد کے سوا کوئی چیز نہ تھی - پرنس ریجنٹ[2] نے جنگ واٹرلو کے بعد بلوخر کو لندن بلایا اور اونچے درجے کے ایک بازار سے گزارا تو بیان کیا جاتا ہے بلوخر کی زبان سے بے اختیار نکلا "کتنا عمدہ مال غنیمت ہے" گویا بلوخر کے نزدیک لندن کی عظمت کا اصل معیار یہی تھا - جو دارالحکومت لوٹے گئے ، ان کی فہرست بڑی طولانی ہے - اگر ہم فاتح غارت گروں کا انجام سامنے رکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرخوری عموماً شدید بد ہضمی کا باعث بنتی رہی -[3] چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی معاشرے اور سولھویں صدی مسیحی کے مغربی معاشرے کو اس بربریت کے ہاتھوں نہ صرف ندامت اٹھانی پڑی ، جس کا سلسلہ اس کے جنگجو لیڈروں نے شروع کر دیا تھا ، بلکہ وہ اس کی وجہ سے خود بھی غارت گری کا شکار ہوئے - یہ جرم دور قدیم کے بربریوں سے سرزد ہوتا رہا تو اس کی پاداش مقابلۃً ہلکی رہی ، لیکن وہ معاشرے اس کی پاداش سے کیونکر محفوظ رہ سکتے تھے ، جن کی بنیاد اقتصاد زر پر رکھی گئی تھی ؟ یونانیوں نے مغربی ایشیا کے خزینہ ہوئے زر لوٹے ،

۱- Blucher ، پروشیا کا جرنیل جس نے ولنگٹن کے ساتھ مل کر واٹرلو کے میدان میں نپولین پر فتح پائی - ۱۸۱۹ء میں انتقال کیا -

۲- پرنس ریجنٹ کا مطلب ہے وہ شہزادہ جسے نائب السلطنت کا منصب ملا ، اس سے مراد برطانیہ کے بادشاہ جارج سوم کا ولی عہد ہے جو بعد میں جارج چہارم کے لقب سے بادشاہ بنا - جارج سوم کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا اس لیے اس کی زندگی میں ولی عہد کو ریجنٹ ، یعنی نائب السلطنت مان لیا گیا تھا -

۳- مصنف نے اپنی عام عادت کے مطابق یہاں گارگنٹوا (Gargantua) کے کھانے کا محاورہ استعمال کیا ہے - ادبی افسانوں کی یہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے لیے بچپن میں ۱۷۹۱۳ گائیں دودھ پلانے کے لیے مہیا کرنی پڑی تھیں - میں نے "پرخوری" سے اصل مفہوم پیش کر دیا -

اهل مغرب نے امریکاؤں کی دولت کے انباروں پر ھاتھ صاف کیے؛ اس طرح سونے کا ایک بے پناہ سیل ہر طرف بہ نکلا، جس سے افراط زر کی ھولناک مصیبت بپا ھو گئی۔ مقدونوی غارت گروں نے پرسی پولس میں اور ھسپانوی لٹیروں نے کزکو میں جو گناہ کیے تھے، ان کی پاداش سائکلیڈز[1] میں آئی اونیا کے ھنر مندوں کو اور سوبیبا میں جرمن کاشت کاروں کو بھگتنی پڑی۔

اب مناسب یہ ھے کہ اس قسم کے گندے اور ناپاک مباحث کو چھوڑ کر بہتر معاملات پر گفتگو کریں۔ سلطنت کے دارالحکومت یقیناً ہر موقع کے ثقافتی اثرات کی درخشانی کے عمدہ مرکز بن جاتے ھیں۔ اعلیٰ مذاھب انھیں اپنے مقاصد کے لیے بہت مفید و سازگار پاتے ھیں۔ جب بخت نصر یہودیوں کو قید کر کے بابل لے آیا تھا تو اس شہر نے ایک اعلیٰ مذھب کی پرورش کا بڑا عمدہ انتظام کر دیا تھا اور یہیں اس مذھب کی روح نے محدود نقطۂ نگاہ چھوڑ کر عالمگیر نقطۂ نگاہ اختیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ھے کہ سلطنت کا دارالحکومت روحانی تخم ریزی کے لیے نہایت عمدہ کھیت بن جاتا ھے، اس لیے کہ یہ دارالحکومت چھوٹے پیمانے پر وسیع دنیا کا خلاصہ ھوتا ھے۔ اس کی چار دیواری میں بہت سی قوموں اور تمام طبقوں کے نمایندے رھتے ھیں۔ بہت سی زبانیں جاننے والے لوگ موجود ھوتے ھیں، اس کے دروازوں سے نکلتے ھی ہر طرف لے جانے والی شاھراھیں مل جاتی ھیں، ایک ھی مبلغ ایسے شہر میں ایک ھی روز نہایت خستہ حال غریبوں کی جھونپڑیوں میں بھی تبلیغ کر سکتا ھے اور شاھی محل میں بھی پیغام حق پہنچا سکتا ھے اور اگر بادشاہ کو وہ ھم خیال بنا لے تو سامراجی نظم و نسق کا پورا کارخانہ تبلیغ مذھب کے لیے اس کی مرضی کے مطابق کارپردازی کر سکتا ھے۔ نحمیاہ نے شوش میں محلات شاھی کے اندر جو پوزیشن حاصل کر لی تھی، اس کی بنا پر یروشلم کے ھیکل کے لیے اردشیر اول[2] کی سرپرستی کا انتظام ھوا۔ جن یسوعی پادریوں کو سولھویں اور سترھویں صدی میں آگرے اور پیکن کے شاھی درباروں میں قدم جمانے کا موقع ملا تھا، وہ بھی نحمیاہ ھی کے

۱- بحیرۂ ایجہ کے جزائر کا ایک مجموعہ۔

۲- Artaxerxes I - یہ نام کی یونانی شکل ھے، فارسی میں اسے اردشیر کہتے ھیں۔

نقش قدم پر چل کر ہندوستان اور چین میں کیتھولک مذہب کے خواب دیکھ رہے تھے۔

دارالحکومتوں کا تاریخی مشن عموماً مذہب سے متعلق پایا جاتا ہے: جس وقت یہ سطریں سپرد قلم کی جا رہی تھیں، اس وقت تک چین کا سامراجی شہر لوینگ[1] انسانی تقدیر پر جو زبردست اثر ڈال رہا تھا، وہ اس امر کا نتیجہ نہ تھا کہ لوینگ نے ایک زمانے میں مشرق بعید کے چو خاندان، بعد ازاں ہن خاندان کے مرکزی حیثیت میں نہایت اہم سیاسی کردار ادا کیا تھا؛ سیاسی اعتبار سے لوینگ نینوی اور صور سے مختلف نہ تھا، لیکن اس کا زبردست اثر تاحال اس وجہ سے باقی رہا کہ یہ مقام مہایان کے بیجوں کے لیے چین کے ثقافتی ماحول کو سازگار بنانے کے سلسلے میں پرورش گاہ کا کام دے چکا تھا۔ اسی پرورش گاہ کی بدولت وہ بیج چینی دنیا کے ہر حصے میں پھیلنے کے قابل ہوئے۔ قرہ قرم اگرچہ مٹ چکا ہے، لیکن اس کا مقام اب بھی غیر مرئی طور پر زندہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ سطح مرتفع کے اس شہر نے تیرھویں صدی عیسوی میں چند روزہ، مگر شہابی سیاسی دور میں بلا ارادہ ایک اور کارنامہ بھی انجام دیا تھا، یعنی وہاں مغرب کے رومن کیتھولک مشنری، وسط ایشیا کے نسطوری داعی اور تبت کی لامائیت کے مبلغین ایک دوسرے سے رو در رو ملے تھے۔

اپنے وطن کے قریب تر آئیے: ۱۹۵۲ء میں آشکارا ہو چکا تھا کہ رومہ کی دوامی اہمیت کے بانی پطرس رسول اور پولوس رسول تھے نہ کہ رومیولس[2]، ریمس[3] یا آگسٹس[4]۔ قسطنطنیہ[5] دوسرا مسیحی رومہ تھا۔ وہ سلطنت عام کے دارالحکومت کی حیثیت میں اپنے سارے مظاہرے پورے

۱- Loyang -

۲- Romulus وہ شخص جس نے رومہ کی بنیاد رکھی اور اسی کے نام پر شہر کا نام رکھا گیا۔

۳- Remus رومیولس کا چھوٹا بھائی جو رومہ کی تعمیر میں شریک رہا۔

۴- Augustus رومہ کا پہلا شہنشاہ جس سے رومی سلطنت کی بنیاد پڑی۔

۵- یہ مصنف کا خیال ہے یا کہنا چاہیے کہ اسے قسطنطنیہ کی عظمت کا مسیحی تصور مانا جا سکتا ہے۔ مشرقی سر زمینوں میں قسطنطنیہ نے صرف

کر چکا، لیکن اسے دنیا میں جو خاص اثر و رسوخ مشرقی آرتھوڈکس کلیسا (جس میں کلیسائے روس بھی شامل ہے) کے پیشوائے اعظم کا مرکز ہونے کی حیثیت میں حاصل ہے جس کو تمام مذہبی رؤسا اب تک ہم سروں میں سب سے بڑا مانتے ہیں۔

سرکاری زبانیں اور رسم الخط

یہ امر بے تامل تسلیم کر لینا چاہیے کہ سلطنت کے لیے ذہنی مخاطبت و مذاکرات کی غرض سے سرکاری ذریعے مہیا کرنا ناگزیر ہے اور یہ محض زبان نہیں ہو سکتی جو بولی جاتی ہے، بلکہ اس کے مرئی ریکارڈ کا بھی کوئی نہ کوئی طریقہ ہونا چاہیے۔ تقریباً تمام سلطنتوں میں مرئی ریکارڈز کے نظام نے سرکاری زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ بلاشبہ انکاؤں نے ایک ایسی مختار مطلق سلطنت قائم کی تھی جس میں ترسیم اعداد کا کوئی نظام موجود نہ تھا اور لفظوں کے بغیر معنویات کے قاعدے مقرر کر لیے گئے تھے، لیکن اسے قوت و طاقت کا ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھ لینا چاہیے۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کسی ایک زبان یا کسی ایک رسم الخط نے سلطنت کے قیام سے پیشتر اپنے تمام ہم سروں کو میدان مقابلہ سے باہر نکال دیا: مصر کی وسطانی سلطنت کی زبان لازمی طور پر قدیم مصری تھی اور رسم الخط تصویری[1] تھا۔ جاپان میں شوگنیٹ کے ماتحت زبان جاپانی ہی رہی اور رسم الخط کے سلسلے میں وہ مخصوص مروج چینی حروف منتخب کر لیے گئے جو پیشتر ہی جاپان میں رائج ہو چکے تھے۔ روسی سلطنت میں زبان روسی رہی اور رسم الخط کے باب میں وہ مختلف حروف اختیار کیے گیے جو اصلاً یونانی ابجد پر مبنی تھے، لیکن سلافی اقوام کے مختلف گروہوں نے

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵]

اس وجہ سے عام شہرت و عظمت حاصل کی کہ وہ صدیوں تک عثمانی ترکوں کی قوت کا مرکز رہا اور وہی مرکز خلافت تھا؛ عثمانی ترک صدیوں تک دنیا کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت کے مالک مانے جاتے تھے۔

۱- Hieroglyphy، پرانا مصری رسم الخط جس میں حروف و الفاظ کے بجائے تصویروں سے کام لیا جاتا تھا۔

انھیں اپنے ڈھنگ پر ڈھال لیا تھا ۔ البتہ یہ طرز عمل عام نہ رہا ، معماران سلطنت سرکاری زبان اور رسم الخط کے باب میں اکثر ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے رہے کہ کسی مسلّمہ و مروجہ شے کی تصدیق سے کام نہ چل سکتا تھا بلکہ مختلف زبانوں اور مختلف خطوں مین سے کسی ایک کو چننے کی مشکل سے سابقہ پڑ گیا تھا ۔

ایسے حالات میں اکثر معماران سلطنت اپنی مادری زبان کو رواج دیتے رہے ؛ اگر اس کے لیے کوئی رسم الخط موجود نہ تھا ، یا تو کوئی رسم الخط مستعار لے لیتے یا ایجاد کر لیتے ۔ ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں کہ معماران سلطنت اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر کسی دوسری زبان کے حق میں فیصلے کرتے رہے جو ان کے متصرفہ علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی تھی یا کسی پرانی معیاری زبان کو رواج دیتے رہے لیکن عام طریقہ یہی رہا کہ معماران سلطنت اپنی قومی زبان اور رسم الخط سرکاری طور پر رائج کر دیتے ، البتہ یہ نہ کرتے کہ اس زبان اور رسم الخط کے سوا اور کسی سے کام نہ لیا جائے ۔

اب ہمیں تاریخ کا جائزہ لے کر مندرجہ بالا تصریحات کے لیے مثالیں پیش کرنی چاھئیں ۔

چینی دنیا میں سین شی ہونگ ٹی نے اس مسئلے کو بڑے شدید اور سخت گیرانہ انداز میں حل کیا ۔ چین کی ہمہ گیر سلطنت کے اس بانی نے حکم صادر کر دیا کہ صرف وہ چینی حروف استعمال کیے جائیں جو سین کی آبائی سلطنت میں سرکاری طور پر رائج تھے ۔ اس طرح اس رجحان کا دروازہ بند کردیا جو دور مصائب میں متعدی مرض کی حیثیت اختیار کر چکا تھا ، یعنی جو صوبائی حکومتیں ایک دوسری کے خلاف رزم و پیکار میں لگی ہوئی تھیں اُن سب نے اپنے اپنے دائروں میں مختلف حروف اختیار کر لیے تھے اور حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کسی ایک حکومت کے حروف اُس کے دائرے سے باہر کے اہل علم بھی جزوی طور پر ھی سمجھ سکتے تھے ۔ چونکہ چینی حروف کی حیثیت تصوری رسم الخط کی تھی ، نہ کہ صوتی کی جس میں آوازوں کی نمایندگی ہوتی ۔ سئن شی ہونگ ٹی کے حکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ چینی معاشرہ ایک متحدہ مرئی زبان سے بہرہ مند ہو گیا ۔ یہ زبان بہ دستور جاری رہی ——— اگرچہ جو زبان بات چیت میں استعمال ہوتی تھی ، اس نے

مختلف حصوں میں ناقابل فہم بولیوں کی حیثیت اختیار کر لی ـــ اسی کے ذریعے سے وسیع پیمانے پر مخابرت کے سلسلے جاری کیے گئے - ایک چھوٹی سی اقلیت اس زبان میں پڑھنے اور لکھنے کی مہارت حاصل کر لیتی تھی - ٹھیک اسی طرح موجودہ مغربی دنیا میں عربی اعداد بہ صورت تحریر مختلف اقوام کے روبرو ایک ہی مفہوم پیش کرتے تھے ، اگرچہ وہ لوگ بول چال میں ان اعداد کو مختلف ناموں سے پکارتے تھے ، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چینی حروف کے متعلق سین شی ہونگ ٹی کی معیار بندی زبانوں کے اس تنوع کو قطعاً نہ روک سکتی اگر دوسری قوتیں اس زبان اور رسم الخط کی وحدت کے لیے مصروف عمل نہ ہوتیں -

چینی حروف کی معیار بندی سے پیشتر منوی سلطنت کا غیر معروف بانی بھی یہ کارنامہ انجام دے چکا تھا - زیر مطالعہ کتاب کی ترتیب کے وقت منوی دنیا کے کسی بھی رسم الخط کی کلید[1] دریافت نہ ہوئی تھی ، لیکن ان کے تتبع سے صاف واضح ہوتا ہے کہ فن تحریر میں انقلابی اصلاح کا عمل جاری ہو چکا تھا - وسطی منوی نمبر II ختم ہو کر وسطی منوی نمبر III[2] شروع ہوا تو کریٹ میں دو جداگانہ تصویری رسم الخط رائج تھے جو وسطی منوی نمبر II میں ظہور پذیر ہوئے تھے ، لیکن انھیں یکایک ختم کر کے ایک نیا رسم الخط جاری کیا گیا جسے ہم مستقیم یا طولی رسم الخط کہہ سکتے ہیں - (طولی خط نمبر الف[3]) سین شی ہونگ ٹی نے جو کام چینی معاشرے میں انجام

۱- اصلی کتاب کی جلد ہفتم تا دہم کی تلخیص شائع ہونے سے پیشتر منوی طولی خط ''ب'' کی کلید دریافت کر لی گئی اور دوسرے فضلاء نے اسے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا -

۲- جیسا کہ تلخیص کی جلد اول کے ترجمے میں واضح کیا جا چکا ہے ، آثار قدیمہ کے ماہروں نے منوی آثار کے لیے تین دور مقرر کیے : I ، II ، III ، پھر ہر دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا : ابتدائی ؛ وسطی اور آخری - وسطی منوی نمبر II ۱۹۰۰ ق - م سے ۱۷۰۰ ق - م تک اور وسطی منوی III ۱۷۰۰ ق - م سے ۱۵۸۰ ق - م تک آتا ہے -

۳- Liner "A" کی کلید ابھی تک دریافت نہیں ہوئی ، یہ خط جزیرۂ کریٹ کے طول و عرض میں رائج تھا اور اس کی زبان غالباً یونانی سے

دیا وہی کام اموی خلیفہ عبدالملک[1] نے سریانی معاشرے میں انجام دیا ؛ اُس نے عربی خلافت کے سابقہ رومی صوبوں میں یونانی کی جگہ عربی زبان رائج کر دی اور سابقہ ساسانی صوبوں میں پہلوی کو سرکاری کاروبار کا ذریعہ بنائے رکھا ۔

اب ہمیں اُن مثالوں پر متوجہ ہونا چاہیے جو زیادہ تر رائج رہیں ، یعنی سلطنتیں متعدد زبانوں اور رسم الخطوں کو قبول کرتی رہیں ۔ ان میں خود اُن کی اپنی زبان اور رسم الخط بھی شامل تھے ۔ ہندوستان میں برطانوی راج قائم ہوا تو انگریزی زبان بانیانِ سلطنت کی مادری زبان تھی ، جسے اُنھوں نے بعض مقاصد کے لیے فارسی کی جگہ رائج کر دیا ۔ فارسی سرکاری زبان کی حیثیت میں مغلوں سے بہ طور میراث چلی آتی تھی ۔ ۱۸۲۹ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے انگریزی کو سیاسی خط و کتابت کا ذریعہ بنا لیا تھا اور ۱۸۳۵ء میں فیصلہ کر لیا کہ اعلیٰ تعلیم اسی زبان میں ہوگی ، لیکن جب ۱۸۳۷ء میں فارسی کو اُس کی سرکاری حیثیت سے الگ کرنے کے لیے آخری قدم اُٹھایا گیا تو انگریزی حکومت نے انگریزی زبان کو اُن تمام مقاصد کے لیے لازم قرار نہ دیا جو پہلے فارسی کے ذریعے سے انجام پاتے تھے ۔ عدالتی اور مالی معاملات میں جن کا تعلق ہر قوم ، ہر ذات اور ہر طبقے کے ہندوستانیوں سے تھا ، فارسی کی جگہ انگریزی نہیں ، بلکہ مقامی زبانیں رائج کردی گئیں ۔ سنسکرت آمیز ہندی زبان جسے ہندوستانی کہا جاتا ہے ، برطانوی پروٹسٹنٹ مشنریوں نے ایجاد کی تھی ، تاکہ شمالی ہندوستان کی ہندو آبادی

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۸]

پیشتر کی مثنوی تھی ؛ بعد میں طولی "ب" (Liner B) ایجاد ہوا جو یونانی زبان کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن کریٹ میں صرف نوسوس تک محدود تھا ۔ البتہ براعظم کے اندر یہ کئی مرغزوں میں استعمال ہوتا تھا ۔

۱۔ عبدالملک بن مروان اموی ۶۸۵ء میں خلیفہ بنا اور ۷۰۵ء میں وفات پائی ۔ جنھیں سابقہ رومی صوبے بتایا گیا ہے ، وہ دراصل عربی صوبے تھے ۔ ان کے باشندوں کی زبان عربی تھی ، ان پر زبردستی یونانی عائد کر دی گئی تھی ۔ عبدالملک نے اسے ختم کر کے ان صوبوں کے تعلق میں عربی کو سرکاری زبان قرار دیا ، تاکہ عوام کو سہولت ہو ۔ مفتوحہ ساسانی علاقوں میں پہلوی اس لیے سرکاری زبان رہی کہ عوام کی سہولت کا تقاضا یہی تھا ۔

تک اپنے خیالات پہنچا سکیں ، اس کا مثنیٰ اردو زبان تھی جو ہندی میں فارسی کی آمیزش سے ہندوستانی مسلمان اپنے لیے ایجاد کر چکے تھے[1] ؛ سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر کسی اجنبی بانی سلطنت کا صرف غیر ملکی زبان کو رواج دینے سے باز رہنا بڑے تدبر اور شفقت کا فعل تھا - ایک سو دس سال بعد بانیان سلطنت کے اخلاف نے راج ہندوستانی رعایا کے اخلاف کو سونپا تو دونوں جانشین حکومتوں نے فیصلہ کیا کہ انگریزی زبان کم از کم عارضی طور پر بہ دستور رائج رہے گی - جو برطانوی راج کے زمانے میں یہ خدمت ٹھیک ٹھیک انجام دیتی رہی تھی - اس کے برعکس شہنشاہ جوزف ثانی (۱۷۸۰ - ۹۰ء۱۷) کی بے نتیجہ کوشش پیش نظر لائیے جس نے ہپسبرگ سلطنت کے اُن باشندوں کو جرمن زبان اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا جو جرمن نہیں بولتے تھے ، حالانکہ اس شہنشاہ کو فرانسیسی انقلاب سے پیشتر کے دور میں مغربی دنیا کے ان بادشاہوں میں گنا جاتا تھا جو مطلق العنانی کے باوجود بڑے روشن خیال تھے - اگرچہ اس سیاسی فرمان کو اقتصادی فوائد اور ثقافتی سہولت کے پیش نظر اچھا سمجھا جا سکتا تھا، لیکن جوزف کی یہ لسانی پالیسی بہت بری طرح ناکام رہی اور اس کے خلاف وہ قومی تحریکات جاری ہوئیں جو ایک صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد ہپسبرگ سلطنت کو پارہ پارہ کر دینے والی تھیں -

عثمانی سلطنت کے ترک آقاؤں نے کبھی وہ مسلک اختیار نہ کیا جس پر عربی خلافت میں کامیابی سے عمل ہو چکا تھا اور جس میں ہپسبرگ شہنشاہی ناکام رہ چکی تھی - بانیان سلطنت کی قومی زبان نظم و نسق کے کاروبار میں استعمال ہوتی تھی ، لیکن سولھویں اور سترھویں صدی میں بھی جب عثمانی اقتدار اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا ، سلطانی محلات کے غلاموں کی عام زبان سرویوں اور کروٹوں کی زبان تھی اور عثمانی بحری فوج میں اطالوی زبان بولی جاتی تھی - دفتری کاروبار میں حکومت عثمانیہ نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کا مسلک اختیار کر لیا ، یعنی رعایا کو اپنے معاملات میں اپنی مرضی کی زبان استعمال کرنے کی اجازت دے دی -

---

۱- ظاہر ہے کہ اردو اور ہندوستانی کی ایجاد کے متعلق مصنف کا دعویٰ سراسر ناواقفیت کا ثبوت ہے -

رومی سلطنت کے جن صوبوں میں یونانی زبان یا تو مادری زبان تھی یا عام بول چال کی زبان ہو گئی تھی ، ان میں لاطینی کو جبراً سرکاری زبان بنانے میں احتیاط کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ لاطینی مخصوص طور پر صرف شہنشاہی فوج میں رائج رہی ، خواہ اُس فوج کے لیے کہیں سے سپاہی حاصل کیے جاتے تھے اور خواہ وہ کہیں متعین ہوتی تھی۔ جو نو آبادیاں لاطینی الاصل یا یونانی الاصل تھیں یا مشرقی سر زمینوں میں قائم ہوئی تھیں ان کے بلدیاتی نظم و نسق کی بھی خاص زبان لاطینی ہی تھی۔ باقی معاملات میں وہی زبانیں استعمال ہوتی رہیں جو پہلے سے رائج تھیں اور ایٹیکا کی زبان کو لاطینی کے پہلو بہ پہلو سرکاری درجہ مل گیا۔

رومیوں نے یونانی زبان کے بارے میں احتیاط و تدبر کا جو مسلک اختیار کیا ، اس کا مطلب صرف یہ نہ تھا کہ ثقافت کے ذریعے کی حیثیت میں یونانی زبان کو لاطینی پر برتری کا خراج پیش کیا گیا ، اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ رومیوں کے قلوب میں دوسروں کے حقوق پر تصرف کو نہیں ، بلکہ تدبر کو فوقیت حاصل رہی۔ گویا یہ تصرف نہیں ، بلکہ تدبر کی یگانہ فتح تھی۔ مغربی سمت میں سلطنت کے جو دور اُفتادہ علاقے تھے وہاں یونانی اور لاطینی کے درمیان مقابلے کا کوئی سوال نہ تھا ، ان صوبوں میں لاطینی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ یونانی زبان کے دائرۂ رواج سے باہر رومیوں کو جس رعایا اور جن حلیفوں سے سابقہ پڑا ، اُن پر لاطینی زبان عائد نہ کی گئی ، لیکن رومیوں نے ایسے طریقے اختیار کیے جن کی وجہ سے لاطینی کی کشش بہت بڑھ گئی اور وہ لوگ اسے استعمال کرنے کو اپنے لیے باعث اعزاز سمجھنے لگے۔ لاطینی نے پر امن طریق پر جو فتوحات حاصل کیں ، وہ انھی زبانوں کے مقابلے میں نہ تھیں جو تحریر میں نہ آئی تھیں ، خود اٹلی میں اسے دوسری اطالوی بولیوں سے مقابلہ پیش آیا مثلاً آسکن[1] اور امبرین[2] نیز الیریا کی بولیوں سے ، مثلاً میسا پین[3] اور وینیشین[4] ، یہ ایک زمانے میں ثقافتی لحاظ سے لاطینی کے برابر درجہ حاصل کر چکی تھیں۔ اٹرسکن زبان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ، وہ اپنے اناطولی وطن کی ثقافتی میراث سے بڑے اونچے پیمانے پر مستفید

۱- Oscan -
۲- Umbrian -
۳- Messapian -
۴- Venetian -

تھی ۔ افریقہ میں لاطینی کو قرطاجنہ کی زبان سے مقابلہ پیش آیا ، ان مقابلوں میں لاطینی کو برابر کامیابی نصیب ہوتی رہی ۔

سمیریا کے بانیان سلطنت نے ، جس کا نام سلطنت اقطاع اربعہ تھا ، رومیوں سے بھی زیادہ ضبط و احتیاط سے کام لیا ۔ انھوں نے نو مولود اکادی زبان کو اپنی سمیری زبان کے برابر درجہ دے دیا ۔ اس سلطنت کے خاتمے سے پیشتر اکادی زبان کامیابی کا درجہ کمال حاصل کر چکی تھی اور سمیری زبان عملاً مردہ ہو چکی تھی ۔

ہخامنشیوں نے سرکاری کاروبار میں اپنی مادری ایرانی زبان کو بہت ہی معمولی درجہ دیا جس طرح کہ سلطنت میں مادر وطن کو بہت معمولی درجہ دیا تھا ۔ دارائے اعظم نے اپنے جو کارنامے بہستان کی چٹان پر کندہ کرائے تھے اور جو سلطنت کی شمالی و مشرقی شاہراہ پر اب تک نمایاں ہیں ، وہ پیکانی خط کی تین مختلف شکلوں میں تھے ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تین شہنشاہی دارالحکومتوں کی تین مختلف زبانیں اس کتبے میں پیش نظر رکھی گئیں : اول شوش کی عیلامی زبان ، دوم اکبتانہ کی مادی ایرانی اور سوم بابل کی اکادی ؛ لیکن اس سلطنت میں جس زبان نے درجۂ کامیابی حاصل کیا ، وہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نہ تھی جنھیں سرکاری طور پر قابل عزت سمجھا گیا ؛ کامیابی حاصل کرنے والی آرامی زبان تھی ، جس کا ابجدی خط بہت سہل اور سبک تھا ۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زبان کی تقدیر بنانے میں سیاست کی بجائے تجارت اور ثقافت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور معلوم ہے کہ آرامی زبان بولنے والے لوگوں کو سیاسی اعتبار سے ہخامنشی سلطنت میں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی ۔ ہخامنشی حکومت نے تجارت کے دائرے میں ایک مسلمہ حقیقت کو چپ چاپ قبول کر لیا اور آخری دور میں آرامی زبان کو سرکاری درجہ دیا ۔ آرامی زبان کی ممتاز ترین کامیابی یہ تھی کہ اس کے رسم الخط نے پیکانی رسم الخط کی جگہ لے لی اور ہخامنشی اقتدار کے بعد آرامی زبان کا رسم الخط ایرانی زبان کا رسم الخط بن گیا ۔

سلطنت موریہ میں فلسفی شہنشاہ اشوک نے (۲۷۳ — ۲۳۲ق ۔ م) بے لاگ انصاف اور عملی سہولتوں کے تقاضوں کی بنا پر متعدد مقامی زبانوں کو قبول کر لیا جن کے لیے دو رسم الخط استعمال ہوتے تھے : اول برھمی ، دوم کھروشتھی ۔ یہ بے تعصبی اور وسیع المشربی شہنشاہ کے اس بنیادی نصب العین

کا کرشمہ تھی کہ اس کی مملکت کے تمام باشندے اس راہ نجات سے آگاہ ہو جائیں ، جو گوتم بدھ نے انسانیت کے سامنے پیش کی تھی - انکاؤں کی سلطنت کے ہسپانوی فاتحوں کے سامنے بھی ایسے ہی مقاصد تھے ؛ چنانچہ انھوں نے بھی اپنی امریکی رعایا میں کیتھولک مذہب کی اشاعت کے لیے وہ زبان استعمال کرنے کی اجازت دے دی جو قویچوا[1] قبیلے میں عام طور پر بولی اور سمجھی جا سکتی تھی -

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ سرکاری زبانوں سے فائدہ کس نے اٹھایا ؟ ہم پر واضح ہوگا کہ جہاں جہاں یہ زبانیں رائج تھیں ، وہاں اول سلطنتیں بحال کرنے والوں نے ان سے فائدہ اٹھایا ، بعد ازاں ہر قسم کی دِنیا دارانہ ایجنسیاں نیز اعلیٰ مذاہب کے داعی ان سے اپنی خواہش کے مطابق کام لیتے رہے - زبانوں اور رسم الخطوں کے متعلق یہ نتیجہ اتنا واضح ہے کہ مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں -

ہم نے اپنے جائزے میں جن زبانوں کا ذکر کیا ان میں سے کسی کی سرگزشت آرامی زبان سے زیادہ قابل توجہ نہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جس سلطنت میں اس زبان کے نشو و ارتقا کا آغاز ہوا اس کے حکمرانوں کی سرپرستی سے یہ سب کے مقابلے میں بڑھ کر محروم رہی - جب سکندر نے ہخامنشی سلطنت کا تختہ الٹ دیا تو اس زبان کو معطل کر کے ایٹیکا کی زبان کو سرکاری درجہ دے دیا گیا - اس طرح ہخامنشی سلطنت کے مغربی علاقوں میں آرامی زبان کی سرکاری حیثیت ختم ہو گئی ، لیکن شاہی سرپرستی سے محرومی کے باوجود اس کی ثقافتی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا ، جن کا آغاز سرکاری سرپرستی سے پیشتر ہی ہوچکا تھا - اس نے مشرق میں اکادی زبان کا اور مغرب میں کنعانی زبان کا بہ حیثیت زندہ زبانوں کے استیصال کر دیا - حالانکہ ہلال زرخیز[2] میں جو آبادیاں سامی زبان بولتی تھیں ، وہ یا تو اکادی استعمال کرتی تھیں یا کنعانی - مثال کے طور پر ہم کہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام

۱- Quichua ، یہ جنوبی امریکہ کا ایک قبیلہ تھا جو اہل ہسپانیہ کے پہنچنے سے پیشتر پیرو کے علاقے پر مسلط تھا -

۲- زرخیز زمین کا وہ خطہ جو صحرائے عرب کے شمال میں مصر سے شام ، عراق اور بابل ہوتا ہوا خلیج فارس تک آتا ہے ؛ اس کی شکل ہلال کی سی ہے -

نے اپنے شاگردوں سے جس زبان میں بات چیت کی وہ بھی آرامی زبان تھی ۔ باقی رہی آرامی ابجد تو اس کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا ۔ ۱۵۹۹ء میں جب مانچو خاندان چین کی تسخیر کے لیے اٹھ رہا تھا تو مانچو زبان کے لیے یہی رسم الخط اختیار کیا گیا ۔ اعلٰی مذاہب نے اسی سے کام لے کر اپنا سلسلۂ اشاعت جاری رکھا ۔ عبرانی کی شکل میں یہ ابجد یہودیوں کی مذہبی کتابوں اور مذہبی دعاؤں کا ذریعہ بنی رہی ۔ اس کی عربی تعبیر نے اسلامی ابجد کی حیثیت اختیار کر لی ۔ اس کی سریانی تعبیر سے دو متضاد غیر آرتھوڈکس مسیحی فرقے یعنی نسطوری اور یعقوبی[1] کام لیتے رہے ۔ اس کی پہلوی تعبیر میں مذہب زرتشت کی مقدس کتابیں لکھی گئیں اور اس کی کھروشتھی تعبیر نے شہنشاہ اشوک کے لیے ایک ایسا ذریعہ مہیا کر دیا ، جس سے اس نے مہاتما بدھ کی تعلیمات اپنی اس رعایا تک پہنچائیں جو پنجاب میں آباد تھی اور پنجاب پہلے ھخامنشی سلطنت کا صوبہ رہ چکا تھا ۔

قانون

دائرۂ عمل مجلسی کے جسے دائرۂ قانون کہنا چاہیے ، تین بڑے حصے ہیں ۔ ایک انتظامی قانون یا قانون نظم و نسق جس میں حکومت سے متعلق رعایا کے حقوق منضبط ہوتے ہیں ۔ اس کے بعد فوجداری اور دیوانی مجموعۂ ضوابط میں ، ان کا تعلق ان اعمال سے ہوتا ہے جن میں فریقین افراد ہوتے ہیں ۔ کوئی حکومت قانون نظم و نسق سے بے پروا نہیں ہو سکتی اور حکومت کا پہلا کام یہی ہے کہ سب سے اپنا اختیار و اقتدار منوائے اور نافرمانی کی ہر حرکت کو دبا دے ــــــــــ حکومت کے خلاف غدروں سے ٹیکس ادا نہ کرنے تک ــــــــــ جو حکومت کی مرضی سے انحراف کا نشان بن سکے ۔ یہی مصلحت حکومتوں کو فوجداری قانون پر متوجہ کرتی ہے ؛ جرم کا ارتکاب کرنے والا شخص اگرچہ براہ راست یا ارادۃً حکومت پر ضرب نہیں لگاتا ، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ شخص حکومت کے مقاصد قیام امن میں خلل انداز ہوتا ہے ؟ باقی رہا

۱۔ Monophysites یہ ایک مسیحی فرقہ تھا جو توحید کا قائل تھا ۔ اسے فرقۂ موحدین بھی کہہ سکتے ہیں ، لیکن اس کا متعارف نام یعقوبی فرقہ ہے ۔

دیوانی قانون ، تو اس کے ضمن میں حکومت جو کچھ کرتی ہے ، اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ رعایا کو فائدہ پہنچے ، خود حکومت کا براہ راست فائدہ اس سے وابستہ نہیں ہوتا ۔ قانون کی اس مد میں ہمہ گیر سلطنتوں کی حکومتوں کے دائرۂ توجہ میں وسیع اختلاف نظر آئے تو اس پر حیران نہ ہونا چاہیے ۔

قانونی دائرے میں ان سلطنتوں کو ایسے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جو صوبائی ریاستوں کو پیش نہیں آتے ۔ ان علاقوں میں مختلف مفتوحہ صوبائی حکومتوں کی رعایا شامل ہوتی ہے ۔ وہ خود تباہ ہوتی ہیں تو اپنے پیچھے ——— دائرۂ قانون ، نیز دوسرے دائروں میں ——— ایسی میراث چھوڑ جاتی ہیں جس سے ان کے تباہ کرنے والوں اور جانشینوں کو مفر نہیں ہوتا ۔ ہمارے سامنے کم از کم ایک مثال ضرور موجود ہے جس میں بانیان سلطنت مفتوحہ رعایا سے اتنے پست اور فروتر تھے کہ اپنا آبائی قانون اس رعایا پر عائد کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے ۔ یہ تاتاری تھے ۔ عثمانیوں نے نظم و نسق کے قانون اور فوجداری قانون کو بڑے اہتمام سے سنبھال لیا لیکن غیر ترک ماتحت آبادیوں کے ضوابط دیوانی سے تعرض گوارا نہ کیا اور سین شی ہونگ ٹی نے ایک جنبش قلم سے اپنی آبائی سلطنت کا قانون پوری سلطنت میں جاری کر دیا تھا تاکہ یکسانی پیدا ہو جائے ۔ اس کا فرمان یہ تھا کہ یہی قانون ان چھ حکومتوں کے دوائر میں بھی رائج رہے جنھیں فتح کیا جا چکا تھا اور ان کا الحاق عمل میں آ چکا تھا اور اس عمل کی کم از کم دو متوازی مثالیں مغربی دنیا میں بھی ملتی ہیں : نپولین نے جو نیا فرانسیسی قانون تیار کیا تھا ، اسے اٹلی ، فلینڈرز، جرمنی اور پولینڈ کے علاقوں میں بھی جاری کر دیا جو اس کی سلطنت میں شامل ہو چکے تھے ؛ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے انگلستان کا قانون رواج ——— جزواً اصل شکل میں اور جزواً مقامی قانون سے تطابق کی شکل میں ——— ملک بھر کے اندر جاری کر دیا جہاں برطانوی حکمرانی کا سکہ رواں ہوا تھا ۔

اپنی سلطنت کے اندر قانونی یکسانی پیدا کرنے میں رومیوں کی رفتار انگریزوں نپولین اور سین شی ہونگ ٹی کے مقابلے میں بہت دھیمی تھی ۔ رومی شہریت کا ایک ممتاز استحقاق یہ تھا کہ رومی قانون کے ماتحت زندگی بسر کی جائے ؛ سلطنت کی رعایا کے مختلف طبقوں کو شہریت کے ترقی پذیر حقوق دینے کا

معاملہ کراکلا[1] کے فرمان مجریہ ۲۱۲ء کے رو سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ خلافت کی تاریخ میں اسلامی قانون کا دائرۂ اقتدار بھی تدریجاً پھیلتا گیا۔ وہ اس طرح کہ خلافت کی غیر مسلم رعایا نے بانیان سلطنت کا مذہب اختیار کر لیا۔ جن ہمہ گیر سلطنتوں میں قانون کی تدریجی معیار بندی سے قریب قریب یکسانی پیدا کر لی گئی اُن میں ایک مرحلہ اور بھی آیا، یعنی سامراج کے کارفرماؤں نے خود اپنے قانون کو ایک متحدہ شکل دے دی۔ رومی قانون کی تاریخ میں ترتیب کا پہلا قدم یہ تھا کہ ۱۳۰ء میں وہ قانون معطل کر دیا گیا جسے ہر حاکم اپنی عہدہ داری کے آغاز میں از سرنو جاری کیا کرتا تھا[2] اور آخری قدم وہ تھے جن کے مطابق ۵۲۹ء میں جسٹینین کا ضابطہ اور ۵۳۳ء میں مبادیات اور تلخیص مرتب ہوئیں۔ سمیریوں کی سلطنت میں قانون پہلے پہل اُن سمیری شہنشاہوں نے مرتب کیا تھا جن کا مرکز حکومت "اُر" تھا؛ بعد ازاں اس قانون کو بابل کے حمورابی نے از سرنو ترتیب دیا۔ دور حاضر کے مغربی ماہر آثار قدیمہ جے۔ڈی مورگن[3] نے ۱۹۰۱ء میں اس قانون کا انکشاف کیا تھا۔

قانون کی از سرنو ترتیب کے لیے مطالبہ آخری شکل اُس وقت اختیار کرتا ہے جب مجلسی تباہی کا مرحلہ قریب آ جاتا ہے اور اصول قانون درجۂ کمال پر پہنچ جاتے ہیں، وقت کے واضعین قوانین تباہی کی بے پناہ قوتوں کے خلاف ہرتی ہوئی جنگ میں بہ عالم اضطرار ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ جسٹینین نے پہلے ایک ضابطۂ قوانین بنوایا، اس کے بعد نئے ضابطوں کا سلسلہ جاری رکھا جو نویلائی[4] کے نام سے مشہور ہیں۔ یہاں اتنا اور کہہ دینا چاہیے کہ قانون ترتیب دینے والوں پر تقدیر عموماً مہربان رہی ہے؛ بلاشبہ قریب کے لوگ ان کے اعزاز و احترام کے لیے تیار نہ ہوئے، لیکن بہت دیر بعد آنے والی

۱- Caracalla، رومی شہنشاہ ۲۱۱ء میں مسند نشین ہوا، ۲۱۷ء تک حکمران رہا۔

۲- اس قانون کا نام ایڈکٹم پرپچوام (Edictum-Perpetuum) یعنی قانون دوامی تھا۔

۳- J. de Morgan۔

۴- Novellae، یہ جسٹینین کے ایک مجموعۂ ضوابط کا نام تھا۔

نسلیں اُن کا احترام ضرور کرتی ہیں اگرچہ جوش جذبات میں اُن کے کام کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتیں۔

ان بے چون و چرا ستائش کرنے والے اخلاف پر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مقدس قوانین ترجمے کے بغیر کارآمد نہیں ہو سکتے اور جب ہم ''ترجمے'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مقصد ویسا ہی سلوک ہوتا ہے جیسا کہ شیکسپیئر کے ایک کردار بوٹم[1] سے کیا گیا تھا۔ پیٹر کوئنس[2] نے جب دیکھا کہ بوٹم کے لیے گدھے کا سر مہیا کر دیا گیا ہے تو اس نے کہا ''واہ بوٹم واہ، خدا تمہیں برکت دے، اب تمہاری حقیقی حیثیت آشکارا ہوئی''۔ جسٹینین کا عہد حکومت ختم ہوتے ہی لمبارڈوں سلافیوں اور عربوں کے حملے کا طوفان اُمڈ آیا؛ اسی طرح سمیریوں اور اکادیوں کی سلطنت کے آخری دور میں حمورابی نے سنار کے میدانی علاقے میں جو زبردست سیاسی اور مجلسی کام انجام دیا تھا وہ کسیوں کے حملوں نے ملیامیٹ کر دیا جو پہاڑی علاقے سے آئے تھے۔ ڈیڑھ سو سال کے وقفے کے بعد جب لیو اور اس کے جانشینوں نے بیزنطینی سلطنت کی از سر نو تعمیر شروع کی تو انھیں معلوم ہوا کہ جسٹینین کے قوانین کے بجائے موسوی قانون میں ان کے لیے زیادہ سازگار سامان موجود ہے اور اٹلی میں مستقبل کی امید جسٹینین کے ضوابط سے نہیں بلکہ سینٹ بینی ڈکٹ کے ضوابط سے وابستہ ہے۔

بہ ہر حال جسٹینین کا مجموعۂ ضوابط مر گیا اور اسے دفن کر دیا گیا لیکن چار سو سال بعد یعنی گیارھویں صدی میں بولون یونیورسٹی کے اندر اسے پھر زندہ کر لیا گیا؛ اس وقت سے اس قانون سے روشنی کی کرنیں نکل نکل کر توسیع پذیر مغربی دنیا کی آخری حدوں تک پہنچنے لگیں اور یہ حدود جسٹینین کے دائرۂ نظر سے بہت باہر تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ بولون کی ذہنی صلاحیت نے قرون مظلمہ کے ایک رومی مجموعۂ ضوابط کو محفوظ رکھا اور عہد نو کے ہالینڈ، سکاٹ لینڈ اور جنوبی افریقہ میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔

۱- Bottom شیکسپیئر کے ڈرامے ''مڈ سمر نائٹس ڈریم'' کا ایک کردار جو سمجھتا ہے کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن حقیقت میں کچھ نہیں کر سکتا (مترجم)۔

۲- Peter Quince۔

آرتھوڈکس مسیحیت میں یہ مجموعۂ ضوابط تین صدی تک معرض اخفا میں رہا اور دسویں صدی مسیحی میں یہ از سر نو بروے کار آیا جب مقدونیہ کے حکمران خاندان نے اسے اپنے آٹھ صدی پیشتر کے سریانی اسلاف کے رنگا رنگ قانون کی جگہ اسے جاری کر دیا۔

ہم یہاں اس مسئلے پر بحث نہ کریں گے کہ ٹیوٹنوں کی بربری حکومتوں کے رواجی قانون میں رومی قانون کیوں کر داخل ہوا اس لیے کہ ان ریاستوں کا مستقبل کوئی نہ تھا؛ ہمارے لیے زیادہ اہم اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ رومی قانون خفیہ خفیہ اس اسلامی قانون میں کیوں کر داخل ہوا جو اُن عرب فاتحوں کا قانون تھا جنھوں نے رومی سلطنت کے متعدد صوبے فتح کر لیے تھے۔ یہاں جن دو عنصروں میں امتزاج پیدا ہوا، وہ باہم ناسازگار تھے؛ امتزاج کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسی چیز معرض وجود میں آ گئی جو کسی بربری ریاست کا صوبائی قانون نہیں بلکہ ایسا ہمہ گیر قانون تھا جس نے بحال شدہ سریانی سلطنت کی ضرورتوں کا جواب مہیا کیا اور جب یہ سیاسی ڈھانچا شکست و ریخت میں آ گیا تو اصل قانون بدستور زندہ رہا اور اسلامی معاشرے کی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا اور اس پر حکمرانی کرتا رہا۔ خلافت ختم ہو گئی لیکن یہ معاشرہ بہ دستور پھیلتا رہا اور یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت معاشرے کا علاقہ انڈونیشیا سے لتھوانیا تک اور جنوبی افریقہ سے چین تک پھیلا ہوا ہے۔

اپنے ٹیوٹن ہم جنسوں کے برعکس ابتدائی دور کے مسلمان عربوں کو پہلے ایک ضرب نے فرسودہ روایتی طریق حیات سے جھنجوڑ کر باہر نکالا، پھر وہ عرب کے نخلستانی اور صحرائی علاقے سے باہر نکل کر رومی اور ساسانی سلطنت کے شہروں میں پہنچے تو مجلسی ماحول کی فوری تبدیلی کا دھچکا انھیں لگا؛ سریانی اور یونانی ثقافتوں کی ضو افگن شعاعیں طویل مدت تک ان پر پڑتی رہی تھیں اور ان شعاعوں نے جمع ہو ہو کر ایک ایسا مجلسی اثر پیدا کر دیا تھا جو (حضرت) محمد (صلعم) کی شخصیت میں ڈرامائی انداز کی شکل اختیار کر کے منظر عام پر آیا۔ آپ کے کارنامے حد درجہ حیرت انگیز اور آپ کی شخصیت حد درجہ قوی اور با اثر تھی، آپ کے الہامات و اعمال قرآن اور احادیث کی شکل میں مرتب ہوئے؛ قرآن اور احادیث ہی کو آپ کے پیرووں نے سرچشمۂ قانون کے طور پر قبول کیا۔ یہ قانون نہ محض ملت اسلامیہ کی زندگی

ھی پر حاوی تھا بلکہ مسلم فاتحوں اور اُن کی غیر مسلم رعایا کے باھمی تعلقات کا فیصلہ بھی انھیں کی بنا پر ھوتا تھا ۔ ابتدا میں غیر مسلم رعایا بہ لحاظ تعداد مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ تھی ، اسلامی فتوحات کی غیر معمولی تیزی اور بے پناھی نے اسلامی فاتحوں کے نئے قانون کو بنیاد تسلیم کر لینے کی غیر دانش مندی سے مل کر نہایت خطرناک اُلجھن پیدا کر دی ؛ ایک مغالطہ زدہ معاشرے کے لیے قرآن و احادیث سے ھمہ گیر قانون اخذ کرنے کا کام ویسا ھی غیر معقول تھا جیسا صحرا میں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے سامنے پانی کا مطالبہ پیش کیا تھا ۔

قانونی غذا کے تلاش کرنے والے قانون دان کے لیے قرآن کی حیثیت پتھریلی زمین کی تھی ۔ جو سورتیں دعوت محمدی کے مکی دور میں ھجرت سے پیشتر نازل ھوئیں ، وہ اس دور سے متعلق تھیں جو غیر سیاسی تھا لٰہذا اُن میں عملی قانون دان کے لیے اس سے بھی کم مواد تھا جتنا کہ اُسے عہد نامۂ جدید یعنی انجیل سے مل سکتا تھا ؛ توحید باری تعالیٰ کے ان تھک اعادے اور شرک و بت پرستی کی مذمت کے سوا بہت کم چیزیں دستیاب ھوتی ھیں ، بلاشبہ یہ چیزیں روحانی اعتبار سے بڑی اھم تھیں ۔ جو سورتیں مدینے میں نازل ھوئیں ، وہ اول نظر میں خاصے مواد کی حامل سمجھی جا سکتی ھیں اور (حضرت) محمد (صلعم) نے ھجرت کے بعد اپنی زندگی میں وہ حیثیت حاصل کر لی جو مسیح (علیہ السلام) کے پیروؤں نے چوتھی صدی عیسوی سے پیشتر حاصل نہ کی تھی ؛ (حضرت) محمد (صلعم) ایک حکومت کے رئیس بن گئے اور اس وقت سے آپ کے ارشادات زیادہ تر عوامی کاروبار سے متعلق رھے ۔ تاھم مدنی سورتوں میں سے بھی خارجی امداد و تقویت کے بغیر ایک جامع نظام قانون تیار کر لینا ویسا ھی ھے جیسا کہ کسی قانونی ھتھکنڈے سے کام لے کر پولوس رسول کے خطوں سے ایسا نظام تیار کر لیا جائے ۔

ان حالات میں ان عملی آدمیوں نے جو عربی خلافت کی بنیاد رکھنے کے ذمہ دار تھے ، نظریے کو اس کے حال پر چھوڑا اور اپنی مدد آپ کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا ۔ انھوں نے عقل سلیم سے کام لے کر قیاس ، اجماع اور رواج کو اپنا مدار کار بنایا ؛ انھیں جو کچھ کہیں سے لینے کی ضرورت تھی لے لیا اور اگر خدا پرست لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ پیغمبر اسلام (صلعم) سے براہ راست اخذ کیا گیا ھے تو یہ امر اور بھی

خوشی کا باعث تھا ۔ اس طرح قانون سازوں نے جن ذخیروں سے فائدہ اٹھایا ، اُن میں سے رومی قانون کو خاص درجہ حاصل تھا ؛ بعض صورتوں میں انھوں نے اس سر چشمے سے مختلف چیزیں براہ راست لے لیں جو شام کی صوبائی تعمیرات میں رواج پا چکی تھیں اور رومی قانون زیادہ تر یہودیوں کے ذریعے سے اسلامی قانون میں پہنچا ۔

یہودی قانون بھی جو (حضرت) محمد (صلعم) کی ھجرت کے موقع تک تاریخ کی طویل منزل طے کر چکا تھا ، اسلامی شریعت کی طرح خانہ بدوشوں کے بربری رواج سے پیدا ھوا تھا ۔ یہ خانہ بدوش شمالی عرب کی سطع مرتفع سے اٹھ کر شام کے شہروں اور میدانی علاقوں میں پہنچے تھے ، انھیں بھی مجلسی ماحول کے فوری اور انتہائی تغیر کی حالت سے سابقہ پڑا تھا ؛ چنانچہ ان اسرائیلیوں نے[1] بھی عربوں کی طرح اس معاشرے کے مروجہ قانون سے فائدہ اٹھایا تھا جو ارض موعود میں جاری تھا ۔

توریت کے احکام عشرہ بلا شبہ خالصةً عبرانی الاصل ھیں لیکن اسرائیلیوں کا دوسرا قانون جو علماء یہود میں ''میثاق'' کے نام سے مشہور ھے ، صاف معلوم ھوتا ھے کہ ضابطۂ حمورابی سے متاثر ھے ۔

سمیری قانون کا اس مجموعۂ ضوابط میں تداخل جو نو صدی بعد آخری دور کے سریانی معاشرے کی ایک مقامی جمعیت کے لیے تیار کیا گیا تھا ، اس امر کی شہادت پیش کر رھا ھے کہ حمورابی کا دور ختم ھونے کے بعد کے ایک ھزار سال میں سمیری تہذیب شام کی سر زمین میں کس پختگی سے جڑ پکڑ چکی تھی ۔ اس کے بعد ھزار سال کا جو دور آیا ، اُس میں قسم قسم کے حیرت انگیز مجلسی اور ثقافتی انقلابات رونما ھوئے لیکن جو سمیری قانون حمورابی کے ضوابط میں جگہ پا چکا تھا اور وہ شاہ مذکور کی شاھی رعایا یا اُن سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں بدستور جاری رھا اور اس کے اثر و رسوخ کی یہ حالت تھی کہ کنعان کے عبرانی بربری فاتحوں کا خام قانون بھی اس سے غیر متاثر نہ رہ سکا ۔ جو بربری ایک اعلیٰ

۱۔ مصنف کا مطلب یہ ھے کہ اسرائیلی بھی اصلاً فلسطین کے باشندے نہ تھے بلکہ عرب کے شمالی صحرا سے اٹھ کر فلسطین گئے تھے جو ابتدا میں شام کا حصہ تھا (مترجم) ۔

مذہب کی پرورش میں لگے ہوئے تھے ، ان کے قانون میں تداخل کے باعث سمیری قانون نے رومی قانون کی طرح تاریخ کے صفحات پر زیادہ گہرا نقش چھوڑا ؛ اتنا گہرا نقش یہ قانون اس وقت نہ پیدا کر سکا جب یہ آن بربریوں کی تقدیر پر اثر انداز ہو رہا تھا جو ذلت خیز طریقے پر میدان عمل سے نکل جانے والے تھے ۔

یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت بھی سمیری قانون ایک زندہ قوت نظر آ رہا ہے ؛ یہ موسوی قانون کی برکت ہے جو اسی قانون کی ایک جداگانہ نقل تھی ۔ اس کے برعکس اسلامی شریعت نہ تو اس وقت رومی قانون کی تنہا حامل ہے اور نہ اُسے زندہ و پائندہ حامل سمجھا جا سکتا ۔

بیسویں صدی عیسوی میں رومی قانون کے سب سے بڑے وارث مشرق آرتھوڈکس اور مغربی کیتھولک مسیحی کلیسا کے خوانین تھے ؛ دوسرے مجلسی اعمال کے دائروں کی طرح دائرۂ قانون میں بھی داخلی پرولتار کا پیدا کیا ہوا کلیدی ادارہ سلطنت کے مستفیدین میں سب سے پہلے آتا ہے ۔

تقویم ، اوزان ، پیمانے اور زر

انسان کی بالکل ابتدائی حالت کے بعد مجلسی زندگی کی ہر سطح پر جن چیزوں کو حد درجے ضروری سمجھا جاتا ہے ، وہ وقت ، فاصلے ، طول ، حجم ، وزن اور قیمت کے اندازے نیز پیمائش کے معیار ہیں ؛ یہ چیزیں حکومتوں کے وجود میں بھی آنے سے پیشتر رواج پا چکتی ہیں اور حکومتیں جب وجود پذیر ہوتی ہیں تو سب سے پہلے انہیں معاملات پر توجہ کرتی ہیں ۔ حکومتوں کے لیے مثبت غایت وجود یہ ہے کہ مشترک مجلسی سرگرمیوں کے لیے مرکزی سیاسی قیادت مہیا کریں اور یہ سرگرمیاں معیاری پیمانوں کے بغیر جاری نہیں ہو سکتیں ؛ حکومتوں کے لیے سلبی غایت وجود یہ ہے کہ اپنی رعایا کے درمیان مجلسی انصاف کا کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور کر دیں اور کاروباری قسم کے بیشتر نجی معاملات میں معیاری پیمانوں کا تعین سامنے آ جاتا ہے لہٰذا ہم کہ سکتے ہیں کہ ہر قسم کی حکومتوں کے لیے معیاری پیمانوں کا انتظام ضروری ہے اور ہمہ گیر سلطنتوں کے لیے یہ چیز خاص توجہ کی محتاج ہے ، اس لیے کہ یہ سلطنتیں اپنی فطرت و نوعیت کے اعتبار سے رعایا کے گوناں گوں

طبقات پر مسلط ہوتی ہیں جن سے صوبائی حکومتوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا ؛ نیز انھیں مجلسی یکسانی سے خاص دلچسپی ہوتی ہے ، یہی یکسانی معیاری پیمانوں کی موجب بنتی ہے اور ان کا انتظام موثر طریق پر ہونا لازم ہے ۔

تمام معیاری پیمانوں میں سے جس چیز کی ضرورت سب سے پہلے محسوس کی گئی ، وہ وقت کی پیمائش کا نظام تھا ، اسی کی بنا پر موسموں کا تعین کیا جا سکتا تھا ؛ گویا سال ، مہینے اور دن کے تین مختلف طبعی دوروں میں یکسانی پیدا کرنا لازم ہو گیا ۔ سب سے پہلے جو وقت پیما ظہور میں آئے انھوں نے بہت جلد دریافت کر لیا کہ ان دوروں کے درمیان جو تناسبات ہیں وہ محض کسری نہیں بلکہ اصم ہیں ، پھر سال کبیر کی تلاش شروع ہوئی جس میں یہ متناقص دور ایک وقت میں شروع ہوں اور چکر کاٹتے ہوئے اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے دوبارہ ایک ہی وقت میں شروع ہوں گے ۔ اس سلسلے میں علم ہیئت کی ریاضیات کا حیرت انگیز عمل شروع ہو گیا ؛ مایائی ، مصری اور بابلی معاشروں نے ان ریاضیات میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے ۔ اس شمار و حساب کے ساتھ ہی تیز فہم ہیئت دانوں نے سورج اور چاند ہی نہیں بلکہ تمام ثوابت و سیار کی دوری حرکات کا اندازہ شروع کر دیا اور آن کی تحقیقات کا افق اتنے فاصلے پر چلا گیا کہ بیان کرنا تو رہا ایک طرف اس کا تصور بھی آسان نہیں ۔ ممکن ہے بعد کے ماہرین علم کائنات کے نزدیک یہ افق بہت تنگ ہو اس لیے کہ آن کی نگاہوں میں خاص ہمارا نظام شمسی ستاروں کی اُس گرد میں جسے ہم کہکشاں سے تعبیر کرتے ہیں ، ایک ذرے سے زیادہ نہیں اور کہکشاں خود اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ کسی زمانے میں ایک نہایت لطیف گیس تھی ؛ اس قسم کی ان گنت اور بے شمار لطیف گیسیں اپنی پیدائش کی تیز چمک دکھانے اور جل کر راکھ ہو جانے والی ہیں ۔

ان بے پناہ وسعتوں کی ذہنی پیمائش کے آخری دور کو چھوڑ کر سورج اور کسی ایک ثابت کی ظاہری حرکات کے درمیان جو تطابقات بار بار پیش آتے ہیں ، ان سے مصریوں کا "شعری دور" پیدا ہوا جو ایک ہزار چار سو ساٹھ سال کا ہوتا ہے ؛ اسی طرح سورج ، چاند اور پانچ سیاروں

کے بار بار پیش آنے والے مشترک دور سے بابلیوں کا سال کبیر پیدا ہوا جو چار لاکھ بتیس ہزار سال کا ہوتا ہے ، مایائی قوم کے دور عظیم میں یہ تین لاکھ چوہتر ہزار چار سو چالیس سال کا بنتا ہے۔ اس طرح اس حساب میں دس مختلف دوروں کو باہم جوڑ دیا گیا ؛ یہ حد درجے درست اور خوفناک حد تک پیچیدہ مایائی تقویم اس قوم کی سلطنت قدیم سے ملحقہ یوکیٹی اور میکسیکی معاشروں کو میراث میں ملی تھی۔

ہیئت دانوں کی طرح حکومتوں کو بھی سالوں کے شمار اور تخمینے نیز بار بار کے دوروں کو ترتیب دینے کی ضرورت پیش آتی ہے ؛ ہر حکومت کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے قیام کا بندوبست کرے اور معمولی درجے کی بھی حکومت یہ سمجھ لیتی ہے کہ وہ اس وقت تک قابل توجہ نہیں بن سکتی ہے جب تک اپنے کارناموں کا کوئی مستقل ریکارڈ پیش نہ کر دے۔ اس سلسلے میں حکومتوں نے ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ اپنے بعض اعمال کو حکمرانی کا سالانہ منصب اختیار کرنے والوں کے ناموں سے منسوب کر دیتے تھے جیسا کہ رومہ میں اس وقت تک ہوتا رہا جب تک انتظام کی باگ ڈور مجلس کے ہاتھ میں تھی۔ مشہور شاعر هوریس اپنی ایک نظم میں بتاتا ہے کہ میں اس سال پیدا ہوا تھا جب مینلیو[1] قنصل کے منصب پر فائز تھا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے لندن کا کوئی باشندہ اپنی تاریخ پیدائش شہر کے کسی بڑے آدمی سے منسوب کر دے جو اس کی پیدائش کے سال لارڈ میئر تھا۔ اس طریقے کی مشکلات کسی توضیح کی محتاج نہیں اس لیے کہ ہر شخص نہ منصب داروں کے نام یاد رکھ سکتا ہے اور نہ اُن کی منصب داری کے سال کسی کے ذہن میں محفوظ رہ سکتے ہیں[2]۔

۱- Manlio -

۲- اسی طرح یہ جملہ کہ پونٹیس پلاطوس کے ماتحت تکلیف اٹھائی جیسا کہ مسیحی کلیساؤں کے مسلمہ عقائد میں مذکور ہے ، محض تاریخ کی توضیح ہے ، شخص کے خلاف الزام نہیں۔ اگر عقائد کے مصنفین الزام لگانا چاہتے تو یہودیوں کو اس جرم کا ذمہ دار قرار دیتے جن سے عیسائی سخت نفرت کرتے تھے ؛ رومی شہنشاہی کے نمائندے کو اس سے کوئی

اطمینان بخش نظام وہی ہو سکتا ہے کہ کسی مخصوص سال کو آغاز تاریخ کے لیے منتخب کر لیا جائے اور بعد کے سالوں کا حساب اسی کے مطابق کر لیا جائے - اس کی معیاری مثالیں متعدد ہیں مثلاً رومہ پر فاشستوں کے قبضے سے دور کا آغاز یا پہلی فرانسیسی جمہوریت کے قیام کا سال یا (حضرت) محمد (صلعم) کا مکۂ معظمہ سے مدینۂ منورہ ہجرت کر جانے کا سال یا ہندی دنیا میں گپت خاندان کے بر سر حکومت آنے کا سال یا یہودیہ میں سلیوکی خاندان کی جانشین مکابی حکومت کے قیام کا سال یا وہ سال جس میں سلیوکس نکاٹور بابل میں دوبارہ داخل ہوا -

اور مثالیں بھی ہیں جن میں دور یا سنین کا آغاز ایسے واقعات سے ہوا جن کی صحیح تاریخیں متنازعہ فیہ ہیں مثلاً اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مسیح علیہ‌السلام واقعی عیسوی سن کے پہلے سال میں پیدا ہوئے تھے اور یہ سن چھٹی صدی عیسوی تک جاری نہ ہوا تھا؛ اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ رومہ کی بنیاد ۷۵۳ ق-م میں رکھی گئی تھی یا پہلا اولمپیائی میلہ ۷۷۶ ق-م میں منعقد ہوا تھا؛ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ دنیا ۷- اکتوبر ۳۷۶۱ ق-م کو (جیسا کہ یہودیوں کا عقیدہ ہے) یا یکم ستمبر ۵۵۰۹ کو (جیسا کہ مشرقی آرتھوڈکس مسیحیوں کا عقیدہ ہے) یا ۲۳- اکتوبر ۴۰۰۴ ق-م کو شام کے چھ بجے (جیسا کہ سترھویں صدی کا اینگلو آئرش مورخ آرچ بشپ اشر[1] کہتا ہے) پیدا ہوئی تھی -

دو سابقہ پاروں میں جو سنوات پیش کیے گئے ہیں، وہ متعلقہ واقعات

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳

تعلق نہ تھا جس کے ساتھ اس نے صلح کر لی تھی - پونٹیس پلاطوس کے ماتحت تکلیف اٹھانے کے جملے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ تثلیث کا اقنوم ثانی ایک تاریخی شخصیت تھا؛ دوسرے مذاہب مثلاً متھرا، آئی سیس یا سیبل کی طرح افسانوی شخصیت نہ تھا (مصنف) - (تثلیث کے تین اقنوم ہیں: باپ، بیٹا، روح القدس - اقنوم ثانی سے مراد بیٹا یعنی حضرت مسیح علیہ السلام ہیں - مترجم) -

۱- Ussher -

کے بارے میں شہادتوں کی معقولیت کے نہ رکھتے ہوئے ترتیب نزولی میں پیش کیے گئے ہیں۔ اب اگر سنوات کی اس فہرست پر اس لحاظ سے ایک نظر ڈالی جائے کہ ان میں کس نے زیادہ وسیع اور پائدار رواج حاصل کیا تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ جس طلسم پر ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہوا، وہ مذہبی تصدیق کا وجود یا عدم تھا۔ ۱۹۵۲ء میں مغربی مسیحیت کا سنہ دنیا بھر میں فوقیت کا مالک تھا؛ اسے اگر کسی زبردست رقیب کا خوف ہو سکتا تھا تو وہ اسلامی سنہ تھا اگرچہ یہودی اپنی مخصوص ضد اور ہٹ کی وجہ سے سنین کا حساب تاریخ تخلیق کے اپنے تخمینے ہی کی بنا پر کر رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی ذہن کی بنا پر وقت کی پیمائش اور انسانی ارواح پر مذہب کی گرفت کے درمیان ایک روایتی تعلق چلا آتا ہے؛ نفس کی ناقابل رسائی لاشعوری گہرائیوں میں اس وہم کی استقامت ان معاشروں کے اندر بھی پائی جاتی ہے جن میں بیرونی عناصر کی آمیزش ہو چکی ہے اور جن کی نگاہوں میں علم ہیئت وقار و وقعت کھو چکا ہے۔ اس کا ثبوت یوں بھی مل سکتا ہے کہ ایسی مثال شاید ہی مل سکے جس میں معقول اصلاح تقویم کی کوئی کوشش کامیاب ہوئی۔ انقلاب فرانس کے معقول قانونی ضوابط طول و عرض عالم میں پھیل گئے، انقلابیوں نے وزن و پیمائش کے جو پیمانے مقرر کیے تھے —— گرام، کیلو گرام، ملی گرام، میٹر، کیلو میٹر، ملی میٹر —— انہیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی لیکن ان کی تقویم لا مذہب اور رومی تقویم کی جگہ نہ لے سکی اس لیے کہ رومی تقویم کو مسیحی کلیسا کی وجہ سے تقدیس کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ پُر لطف امر یہ ہے کہ انقلاب فرانس کی تقویم بڑی ہی جاذب تھی؛ مہینوں کے نام ایسے رکھے گئے تھے جن کے آخری کلمات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کس موسم کے مہینے تھے، تمام مہینوں کو موسموں کے لحاظ سے تین تین گروہوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا۔ ہر مہینے کے تین ہفتے مقرر کیے تھے اور ہر ہفتہ دس دن کا ہوتا تھا؛ باقی رہا یہ امر کہ سال میں جو پانچ دن باقی رہ گئے تھے یعنی غیر لیپ کے سال میں تو ان کی گنتی الگ کر لی جاتی تھی۔ بہ ایں ہمہ یہ تقویم بڑی معقول تھی لیکن وہ ملک اس کی معقولیت کا کیا اندازہ کر سکتا تھا جہاں دسویں، گیارھویں اور بارھویں مہینے کو اکتوبر

نومبر اور دسمبر کہا جاتا ہے[1] ۔

اوپر کے اقتباس میں تسمیے کے لحاظ سے رومیوں کی غلطی کا جو مذاق اڑایا گیا ہے وہ تھوڑی سی تشریح کا محتاج ہے ؛ رومی تقویم میں ابتدائی چھ مہینوں کے نام صرف اعداد کی بنا پر رکھ لیے گئے تھے اور انھیں دیوتاؤں کے ناموں سے منسوب نہ کیا گیا تھا لیکن جب یہ نام رکھے گئے تھے اس وقت ان میں شمار کی غلطی داخل نہ ہوئی تھی ، شروع میں رومہ کا سرکاری سال یکم مارچ[2] سے چلتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ اس مہینے کا نام رومیوں نے اپنے جنگی دیوتا کے نام پر رکھا تھا ؛ اس زمانے میں رومی سلطنت کی حدیں زیادہ وسیع نہ تھیں ، دارالحکومت سے چند روز کے کوچ کے بعد آخری حد پر پہنچ جاتے تھے ، ہر سال نیا حاکم منتخب ہوتا تھا اور وہ ۱۵ مارچ کو اپنے عہدے کا کاروبار سنبھالتا تھا ، اسی تاریخ سے موسم بہار کی جنگی مہمیں شروع ہو جاتی تھیں لیکن جب سلطنت کی سرحدیں اٹلی سے بھی باہر نکل گئیں اور مہمات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تو جو حاکم مقرر ہوتا تھا اُسے دور اُفتادہ علاقوں میں پہنچ کر فوجوں کی کمان سنبھالنے میں بہت وقت لگ جاتا ، اس وقت تک موسم بہت آگے نکل جاتا ۔ عجب بات یہ ہے کہ ھینی بال کے ساتھ لڑائیوں سے بعد کے پچاس سال میں تقویم کا یہ نقص عملاً کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا اس لیے کہ پوری تقویم کا معاملہ تل پٹ ہو گیا تھا ؛ جس مہینے کو موسم بہار کی مہموں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا وہ مہمیں کبھی موسم خزاں میں جاکر شروع ہوتی تھیں مثلاً ۱۹۰ ق ۔ م میں رومی فوج نے سلیوکیوں کو ایشیا کے ایک مقام مگنیشیا میں شکست دی تھی ، اس سال ۱۵۔ مارچ کی سرکاری تاریخ سال سابق کی ۱۶ ۔ نومبر کو پڑی تھی ؛ اسی طرح ۱۶۸ ق ۔ م میں رومیوں نے مقدونویوں کو بمقام پدنا فیصلہ کن ہزیمت دی تھی ، اس سال ۱۵۔ مارچ ۳۱۔ دسمبر کو پڑی تھی ۔

۱۔ یہ اقتباس جے ۔ ایم ۔ ٹامسن کی کتاب انقلاب فرانس سے ہے ، مطلب یہ ہے کہ اکتوبر کے لفظی معنی ہیں آٹھواں مہینہ ، نومبر کے معنی نواں اور دسمبر کے معنی دسواں مہینہ لیکن اب آٹھویں کو دسواں ، نویں کو گیارھواں اور دسویں کو بارھواں کہا جاتا ہے (مترجم) ۔

۲۔ اس مہینے کا نام جنگی دیوتا یعنی Mars پر رکھا گیا ہے (مترجم) ۔

ہم کہ سکتے ہیں کہ رومی اپنی تقویم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ، بد قسمتی یہ ہوئی کہ جس حد تک وہ اسے علم ہیئت کے نقطۂ نگاہ سے درست کرنا چاہتے تھے ، فوجی پروگرام کے مطابق یہ اُتنی ہی قابل ترک بنتی جاتی تھی ؛ چنانچہ ۱۵۳ ق - م میں نئے حاکموں کے کاروبار سنبھالنے کی تاریخ ۱۵ - مارچ سے پیچھے ہٹا کر یکم جنوری کر دی گئی ، نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ کی جگہ جنوری کے مہینے سے آغاز سال ہونے لگا - علم ہیئت کی بیہودگیاں بہ دستور جاری رہیں یہاں تک کہ جولیئس سیزر نے اقتدار مطلق کا منصب حاصل کیا اور ہیئت دان جن نتائج پر پہنچے تھے ، اُنھیں حکماً نافذ کر دیا - یہی اُس تقویم کی ابتدا ہے جسے جولین کیلنڈر کہا جاتا ہے یعنی وہ تقویم جو جولیئس سیزر نے جاری کی ؛ یہ اصلاح کوئی ڈیڑھ ہزار سال جاری رہی - جن چھ مہینوں کے نام طبعی اعداد کی بنا پر مقرر کیے گئے تھے ، اُن میں سے پہلے مہینے کا نام ”جولیئس سیزر“ کے نام پر انگریزی میں ”جولائی“ بن گیا ، اس کے بعد کے مہینے کو آگسٹس کے نام پر اگست کا نام دے دیا گیا ؛ بہ ہر حال جولیئس اور آگسٹس سرکاری لحاظ سے دیوتا قرار پا چکے تھے اور مہینوں کو مسلمہ دیوتاؤں کے ناموں کے علاوہ ان قرار پائے ہوئے دیوتاؤں کے ناموں سے منسوب کر دینا غیر مناسب نہ سمجھا گیا -

جولین کیلنڈر کی بعد کی تاریخ سے واضح ہو سکتا ہے کہ مذہب اور تقویموں کے درمیان کیسا عجیب و غریب تعلق پیدا ہو گیا - سولھویں صدی عیسوی میں واضح ہو چکا تھا کہ اس تقویم میں دس دن کا فرق پڑ گیا ہے ؛ اس فرق کو ختم کرنے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اگر صد سالہ لیپ سالوں کے قاعدے میں تھوڑی سی ترمیم کر لی جائے تو غلطی کے امکانات انتہائی حد تک کم ہو جائیں گے - ذرا غور کیجیے کہ مغربی مسیحیت کا معاشرہ سولھویں صدی عیسوی میں عقل کے بڑے اونچے درجے پر پہنچ چکا تھا اور سینٹ ٹامس اکوی ناس[1] کے دور کی جگہ گلیلیو کا دور شروع ہو رہا تھا - بہ ایں ہمہ ضروری سمجھا گیا کہ تقویم کی اس اصلاح کے لیے پہلا فرمان پوپ سے صادر کرایا جائے ؛ چنانچہ ترمیم شدہ تقویم ۱۵۸۲ء میں پوپ

۱- St. Thomas Aquinas اٹلی کا ایک عالم دین جو تیرھویں صدی میں گزرا ہے (مترجم) -

گریگوری سیزدھم کے نام سے جاری کی گئی لیکن جس انگلستان میں کسی وقت پوپ کو انتہائی احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا ، وہ پروٹسٹنٹ بن چکا تھا اور اس کے نزدیک پوپ کی حیثیت روسہ کے بدنام بشپ کی رہ گئی تھی : شاہ ایڈورڈ چہارم کی دوسری کتاب عبادت میں دعا کی گئی تھی کہ خدا ہمیں اس بشپ کی قابل نفرت اور سنگین بد اخلاقیوں سے نجات دلائے ، ملکہ الزبتھ کے عہد میں جو کتاب عبادت تیار ہوئی تھی ، اس میں سے یہ تکلیف دہ دعا گو حذف کر دی گئی تھی لیکن اصل جذبۂ نفرت بہ دستور باقی تھا ؛ غرض انگلستان اور سکاٹ لینڈ کی حکومتیں ایک سو ستر سال تک اپنی قدیم تقویم پر قائم رہیں ، اس طرح اس زمانے کی تاریخوں کے متعلق مورخوں کو نئے حساب اور پرانے حساب میں امتیاز کی مصیبت سے دو چار ہونا پڑا - ۱۷۵۲ء میں برطانیہ نے بھی بر اعظم یورپ کا ساتھ دینا قبول کر لیا تو اس وقت برطانوی جمہور نے اٹھارھویں صدی عیسوی کی معقولیت سے سرفراز ہونے کے باوجود اتنا شور مچایا کہ سولھویں صدی عیسوی کے کم متنور دور میں کیتھولک دنیا نے بھی نہ مچایا ہوگا - کیا ہم اس کا سبب یہ سمجھیں کہ تقویم کے معاملے میں پارلیمینٹ کا ایک قانون پاپائی فرمان کی آواز خدا کا بہت گھٹیا بدل تھا ؟ تقویموں اور سنوں سے قطع نظر کر کے ہم وزنوں ، پیمانوں اور سکوں پر غور کریں تو مجلسی مروجات کے اس دائرے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں عقل کی حکمرانی ہے اور مذہبی معاملات اس میں خلل انداز نہیں ہوتے ؛ فرانس کے جو انقلابی اپنی نئی تقویم کو رواج دینے میں افسوسناک حد تک ناکام رہے تھے ، انھوں نے نئے وزنوں اور پیمانوں کو رائج کرنے میں ہمہ گیر کامیابی حاصل کی -

سمیریوں کے نظام اوزان اور فرانسیسیوں کے نئے نظام اوزان کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے فرانسیسی مصلحین کی حیرت انگیز کامیابی ان کے دانش مندانہ اعتدال کا کرشمہ تھی ، انھوں نے سابقہ نظام کی حیران کن اور رنگ برنگ جدولوں کی بجائے ایک طریق حساب اختیار کر لیا اور اس مقصد کے لیے عملی نقطۂ نگاہ سے یہی مناسب سمجھا کہ کسور اعشاریہ کا نظام اپنا لیں جو اگرچہ سہولت کا باعث نہ تھا لیکن نسل انسانی کی تمام شاخیں اسے قبول کر چکی تھیں - واضح رہے کہ یہ کسی خاص استحقاق کی بنا پر قبول نہ کیا گیا تھا ؛ صاف وجہ یہ تھی کہ انسان کے ہاتھوں اور ان کے پاؤں کی

انگلیاں دس ہی دس ہوتی ہیں ۔ قدرت کی یہ ایک عجیب ستم ظریفی تھی کہ اس نے ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں سے بعض کو چھ چھ انگلیاں دیں لیکن انھیں گنتی اور شمار کی صلاحیت سے محروم رکھا ، انسان کو عقل عطا کی اور اسے صرف دس ہی دس انگلیاں دیں ۔ کسور اعشاریہ کا نظام اختیار کر لینے میں ایک بڑی دقت یہ تھی کہ اس کے ماتحت نمبروں کو صرف دو اور پانچ میں تقسیم کیا جا سکتا تھا حالانکہ بارہ کا نظام قبول کر لینے سے نمبر دو ، تین اور چار میں بھی تقسیم ہو سکتے تھے لیکن اعشاری نظام ناگریز تھا اس لیے کہ جب کسی معاشرے میں عقل نے نشوو ارتقا پائی اور بارہ کے عدد کی معنوی برتری واضح ہوئی ، اس وقت تک اعشاری نظام عملی زندگی کا لاینفک جزو بن چکا تھا ۔

فرانسیسی مصلحوں نے عشری نظام اختیار کر لیا لیکن اس کے بارے میں احتیاط پر عمل پیرا رہے ، ان کے سمیری پیش رو زیادہ احتیاط پر کاربند نہ رہ سکے تھے ۔ سمیریوں نے بارہ کے عدد کی برکتیں غیر معمولی ذہنی کمال کی بنا پر دریافت کر لی تھیں اور انھوں نے وزنوں اور پیمانوں کے پورے نظام کو دوازدہ گانہ بنیاد پر مرتب کر لیا تھا لیکن انھیں غالباً یہ احساس نہ ہو سکا کہ جب تک وہ اپنے ہم جنسوں کو تمام دائروں میں دوازدہ گانہ طریق حساب کا پابند نہ بنا لیں گے ، اس وقت تک دو جداگانہ بلکہ متضاد طریقے پہلو بہ پہلو قائم رہنے کی مصیبت سے چھٹکارا حاصل نہ ہوگا ۔ سمیریوں کا دوازدہ گانہ نظام اقصائے ارض تک پھیل گیا لیکن گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے یہ نظام اپنے جواں سال فرانسیسی مد مقابل کے سامنے شکست کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ آکسفورڈ کی طرح آر بھی ان مقاصد کا مخزن بن چکا ہے جن کی قدر و قیمت ختم ہو چکی ہے لیکن ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک انگریزی پیمانے کے مطابق بارہ انچ کا فٹ اور بارہ پنس کا شلنگ ہے ، آر کے لیے شکست خوردہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں[1] ۔

جب یہ احساس پیدا ہو گیا کہ کاروبار میں دیانت ایک اہم مجلسی

۱۔ دن کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساٹھ منٹ بھی سمیریوں ہی کی ایجاد ہے ، یہ بھی بہ دستور باقی رہیں گے ۔ فرانسیسی انقلابیوں نے بھی گھڑیوں کو اعشاری بنانے کی کوشش نہ کی ۔ (آر سے مراد سمیریوں کا مرکز ہے ۔ مترجم)

معاملہ ہے تو ہر حکومت نے غلط باٹوں اور گزوں کو قابل سزا جرم قرار دے دیا ؛ اسی ضمن میں سکے ایجاد ہوئے لیکن واضح رہے کہ ساتویں صدی قبل مسیح تک سکوں کا کوئی وجود نظر نہیں آتا ، اگرچہ معاشروں کی وہ قسم جسے ہم تہذیب کے نام سے پکارتے ہیں تین ہزار سال پیشتر وجود میں آ چکی تھی -

اس سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ تھا کہ بعض جنسوں کو ذریعۂ مبادلہ تسلیم کر لیا گیا ؛ ایسی جنسوں کی اصل افادی حیثیت کے علاوہ ان میں ایک اور خصوصیت پیدا ہو گئی لیکن یہ اقدام سکے کی ایجاد کا موجب نہ بن سکا اس لیے کہ جن جنسوں کو مبادلے کے لیے انتخاب کیا گیا تھا ، وہ تعداد ہی بہت زیادہ تھیں اور سب کی سب دھاتیں نہ تھیں - میکسیکی اور آنڈی دنیا میں ہسپانیہ کی فتوحات کے وقت اُن قیمتی دھاتوں کی اتنی بڑی مقدار موجود تھی جسے ہسپانوی فاتح بے اندازہ قرار دے رہے تھے گویا میکسیکی اور آنڈی دنیا کے مقامی باشندوں کو ان دھاتوں کے کانوں سے نکالنے اور صاف کرنے کا راز معلوم ہو چکا تھا ؛ بہ ایں ہمہ انھوں نے ان دھاتوں کو ذریعۂ مبادلہ کے طور پر استعمال کرنے کا کوئی خیال نہ کیا تھا اگرچہ وہ بعض دوسری جنسوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے لگے تھے مثلاً بین خشک ، مچھلی ، نمک ، بحری گھونگھے -

مصری ، بابلی ، سریانی اور یونانی دنیائیں تجارتی لحاظ سے باہم وابستہ ہو چکی تھیں اور قیمتی دھاتوں کو ایسی مقدار میں معیار مبادلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جسے سہولت کے ساتھ تولنا ممکن تھا - یہ عمل سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے جاری تھا ؛ پھر بعض یونانی شہری حکومتوں نے جو بحیرۂ ایجہ کے ایشیائی ساحل پر واقع تھیں ، ایک قدم آگے بڑھایا اور دھاتوں کو ذریعۂ مبادلہ کے طور پر دوسری جنسوں کے برابر رکھ دیا ؛ اس طرح دھاتیں اس عام قاعدے کے تابع ہو گئیں جس کے مطابق غلط بانٹ اور غلط پیمانے ازروئے قانون جرم تھے - یہ ہو چکا تو ان پیش رو شہری ریاستوں نے دو مزید انقلابی قدم اٹھائے : اول ان دھاتوں کو معیار قیمت کے طور پر استعمال کرنے کا معاملہ صرف حکومتوں سے متعلق کر دیا ، دوسرے اس مخصوص سرکاری سکے پر امتیاز کی غرض سے کسی جداگانہ سرکاری تصویر اور کتبے کا انتظام عمل میں آ گیا ؛ اس طرح ان سکوں پر سرکاری ٹکسال میں مضروب ہونے کی مہر

لگ گئی ، ان کے وزن یا حیثیت کے متعلق شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور ہر شخص انھیں اسی درجے میں بے تکلف قبول کر لیتا تھا جو ان پر ثبت ہوتا تھا ۔

کم رقبوں اور کم آبادیوں میں اس قسم کے سکوں کا انتظام چنداں مشکلات کا باعث نہ تھا لہٰذا شہری ریاستیں اس تجربے کا اصل سر چشمہ بن گئیں اور اسے محض اتفاق نہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ ان ریاستوں کی آبادیاں اور دائرہ ہائے حکومت محدود تھے ؛ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ کسی سکے کی افادی حیثیت اسی تناسب سے بڑھتی ہے جتنا کہ اس کے مسلمہ ہونے کا دائرہ پھیلتا ہے ۔ یہ معاملہ اس وقت انجام کو پہنچا جب چھٹی صدی قبل مسیح کے ابتدائی عشرات میں لیڈیا[1] کی بادشاہی نے اناطولیہ کے مغربی ساحل کی تمام یونانی شہری ریاستیں فتح کر لیں ، صرف ملیٹس[2] کی ریاست باقی رہ گئی ؛ اندرون ملک میں بھی لیڈیا کا دائرۂ فتوحات دریائے ہیلس[3] تک جا پہنچا ، ساتھ ہی ایک یونانی شہری ریاست کے سکے کو معیاری سکہ قرار دے کر لیڈیا کے تمام مقبوضہ علاقوں میں رائج کر دیا گیا ۔ لیڈیا کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ شہرت کروئسس[4] کو حاصل ہوئی اور وہی آخری بادشاہ تھا ، اسے دولت و ثروت میں بھی ضرب المثل کا مقام مل گیا ؛ ہم بیسویں صدی عیسوی کے نصف سے گزر چکے ہیں ، اب بھی مغربی زبان میں یہی محاورہ جاری ہے "کروئسس کی طرح دولت مند" ، موجودہ دور کی مغربی دنیا میں جو بڑے بڑے کروڑ پتی پیدا ہوئے مثلاً روتھس چائلڈ[5] ، راک فلر[6] ، فورڈ[7] ، مورس[8] ، ان کی مثال کوئی نہیں دیتا ۔

اس سلسلے میں آخری اور فیصلہ کن قدم اس وقت اٹھایا گیا جب لیڈیا کی بادشاہی وسیع ہخامنشی سلطنت کا جزو بنی ؛ اس وقت سے زر مسکوک کا مستقبل محفوظ ہو گیا ۔ ہخامنشیوں نے سونے کا ایک سکہ جاری کیا جس پر تیر انداز

۱- Lydia -
۲- Miletus -
۳- Halys اس کا موجودہ نام قزل ارمک ہے -
۴- Croesus -
۵- Rothschild -
۶- Rockfeller -
۷- Ford -
۸- Morris -

کی تصویر بنی ہوئی تھی ، اس سکے نے عالم گیر رواج حاصل کیا ۔ ھخامنشیوں نے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے یہاں بھی زر مسکوک جاری کر دیا تھا ؛ اس طرح سکے نے ہندوستان میں رواج پایا ۔ چینی دنیا اگرچہ دور افتادہ تھی تاھم سئن شی ھونگ ٹی کی بگڑی ہوئی سلطنت کو از سر نو ھن خاندان کے حکم ران لیوپنگ کے مدبر ھاتھوں نے از سر نو سنبھالا تو یہ دنیا بھی زر مسکوک کے رواج کے لیے تیار ہو چکی تھی ، ۱۱۹ ق ۔ م میں چین کی شہنشاھی حکومت نے ایک اور حقیقت دریافت کر لی جو اس سے پہلے دریافت نہ ہوئی تھی اور وہ یہ کہ صرف دھاتیں سکہ سازی کے لیے مخصوص نہیں ، دوسری چیزیں بھی اس غرض سے استعمال ہو سکتی ہیں :

چنگ نگان[1] کے شہنشاھی پارک میں سفید رنگ کا ایک بارہ سنگھا تھا ، ایسا جانور کہیں دیکھا نہ گیا تھا ، پوری سلطنت میں اس کا کوئی ہم سر نہ تھا ؛ وزیر کے مشورے کے مطابق شہنشاہ نے اسے ذبح کیا اور اس کے چمڑے سے شاھی نوٹ تیار کیے ، شہنشاہ کا خیال تھا کہ اس قسم کے جعلی نوٹ تیار نہیں ہو سکتے ۔ نوٹوں کی کیفیت یہ تھی کہ چمڑے کے ایک ایک فٹ مربع ٹکڑے کاٹ لیے گئے تھے ، ان کے کنارے بڑے خوبصورت بنائے گئے تھے اور ان پر خوش وضع آرائش کر دی گئی تھی ؛ ہر ٹکڑے کی قیمت تانبے کے چار لاکھ سکوں کے برابر تھی ۔ شاھی خاندان کے افراد شہنشاہ کے سلام کے لیے آتے تو انھیں مجبور کیا جاتا کہ نقد رقم ادا کر کے ایک نوٹ ضرور خرید لیں اور اپنی نظریں اس پر رکھ کر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کریں لیکن ظاھر ہے کہ بارہ سنگھے کا چمڑا زیادہ مقدار کے نوٹ مہیا نہ کر سکتا تھا اور وقت آ گیا جب اس ذریعے سے خزانے کے لیے مطلوب روپیہ حاصل کرنا ممکن نہ رہا[2] ۔

۱- Ch'ang Ngan ۔ ۲- فٹز جیرالڈ کی کتاب ''چین ، ایک مختصر ثقافتی تاریخ'' (مطبوعہ لندن ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۶۴ ، ۱۶۷) ۔

نوٹوں کی ایجاد اس وقت تک موثر صورت میں رائج نہ ہوسکی جب تک چین نے کاغذ اور چھاپہ ایجاد نہ کر لیا ؛ ٹنگ حکومت نے ۸۰۷ء اور ۸۰۹ء میں ایسے کاغذ تیار کیے جن کی شکل چیکوں کی تھی اور ان کے بقیہ حصے خزانے میں محفوظ رکھے گئے لیکن اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ ان چیکوں پر کوئی عبارت چھاپی گئی تھی ، چھپے ہوئے کاغذی نوٹ یقینی طور پر سنگ حکومت نے ۹۷۰ء میں جاری کیے ۔

سکوں کی ایجاد سے اُن حکومتوں کی رعایا کو بلا شبہ فائدہ پہنچا جہاں یہ جاری ہوئے اگرچہ افراط زر اور تقلیل زر کی مصیبتیں بھی ساتھ ساتھ رہیں اور بھاری شرح سود پر لین دین کی ترغیبات بھی موجود تھیں جو اس ایجاد کے ساتھ ساتھ آئیں ؛ زیادہ فائدہ اُن حکومتوں کو حاصل ہوا جو سکے جاری کرنے کی ذمہ دار تھیں ۔ اس ذریعے سے ہر حکومت براہ‌راست رعایا کے سامنے رہنے لگی گویا سکوں نے نہ محض حکومت کے وقار میں اضافہ کیا بلکہ اس کے لیے اشتہار کا بھی نہایت شان دار موقع فراہم کر دیا ۔

جو آبادیاں اجنبی حکومتوں کے ماتحت ہوں اور وہ اس سیاسی محکوسی کو پسند نہ کرتی ہوں ، اُن کے دلوں پر بھی سکوں کے اس اثر و رسوخ سے انکار نہیں کیا جا سکتا ؛ اس کی مثال عہد نامہ جدید یعنی انجیل کے ایک اقتباس سے پیش کی جا سکتی ہے :

> پھر انھوں نے بعض فریسیوں اور ہیرودیوں کو اس کے پاس بھیجا کہ اُسے اس کی باتوں سے پھندے میں ڈالیں اور جب وہ آئے تو اس سے کہا کہ اے اُستاد ! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور تجھ کو کسی کی پرواہ نہیں کیوں کہ تو لوگوں کی طرف داری نہیں کرتا بلکہ خدا کی راہ راستی سے بتاتا ہے ، قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں ؟ ہم دیں یا نہ دیں ؟ اُس نے اُن کا مکر سمجھ کے اُنھیں کہا کہ تم مجھے کیوں آزماتے ہو ؟ ایک دینار میرے پاس لاؤ کہ میں دیکھوں ، وہ لائے ، تب اُس نے ان سے پوچھا کہ یہ کس کی صورت ہے اور کس کا سکہ ہے ؟ انھوں نے کہا " قیصر کا " ۔ یسوع[۴] نے جواب میں اُنھیں کہا " جو چیزیں قیصر کی ہیں قیصر کو اور جو چیزیں خدا کی ہیں خدا

کو دو'' تب وہ اس سے حیران ہوئے[۱]۔

حد درجہ مخالف مذہبی اور سیاسی ماحول میں بھی زر مسکوک جاری کرنے کا یہ لازمی اثر رومہ کی سامراجی حکومت کے لیے حد درجہ قیمتی تھا البتہ ضمناً ٹکسال میں روپیہ ڈھالنے کے دوسرے مالی فوائد بھی تھے۔ سکوں پر شاہنشاہ کی تمثال یہودی آبادی کے دلوں میں ایک خاصا درجہ پیدا کرتی تھی حالانکہ یہودی رومی تسلط کو ناجائز مانتے تھے؛ ان کے عقیدے کے مطابق جو احکام عشرہ یہوہ نے حضرت موسیٰ کو دیے تھے، ان میں سے دوسرے حکم میں خدا نے خود اپنے ہاتھ سے پتھر کی لوح پر یہ واضح حکم کندہ کیا تھا:

> تو اپنے لیے کوئی صورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں یا زمین کے نیچے ہے، مت بنا، تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیوں کہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں[۲]۔

جب ۱۶۷ ق - م میں سلیوکی خاندان کے بادشاہ انٹیاکس چہارم نے اولمپیائی زیوس کا ایک مجسمہ یہواہ کے ہیکل واقع یروشلم کے مقدس ترین مقام پر رکھ دیا تو یہ پیشگوئی پوری ہوتی دیکھ کر یہود میں ہراس و غصے کی کی لہر دوڑ گئی کہ ''وہ خراب کرنے والی مکروہ چیز کو اس میں دھر دیں گے''[۳]، ''اس جگہ جہاں اس کا کھڑا ہونا روا نہیں''[۴] اور اس درجے جوش میں آگئے کہ جب تک سلیوکی حکومت کا ایک ایک نشان مٹا نہ دیا، ان کا جوش نہ تھما۔ پھر جب ۲۶ء میں رومی حاکم پونٹئس پلاطوس رات کی تاریکی کے پردے میں وہ رومی جھنڈے یروشلم لے آیا جن پر بادشاہ کی بڑی بڑی تصویریں بنی ہوئی تھیں تو یہودیوں کا رد عمل اس درجے تیز و تند تھا کہ

۱- مرقس کی انجیل باب ۱۲، آیات ۱۳—۱۷، متی کی انجیل، باب ۲۲ آیات ۱۵ - ۲۱، لوقا کی انجیل، باب ۲۰ آیات، ۲۰ - ۲۵ -

۲- کتاب خروج باب ۲۰ آیات ۴ - ۵ -

۳- دانیال نبی کی کتاب، باب ۱۱، آیت ۳۱ و باب ۱۲، آیت ۱۱ -

۴- مرقس کی انجیل، باب ۱۳، آیت ۱۴ -

پلاطوس کو یہ دل آزار نشان ہٹانے پڑے لیکن دیکھیے یہی یہودی آہستہ آہستہ ایسے بن گئے کہ انہوں نے قیصر کی تمثال والے سکے نہ محض دیکھے بلکہ انہیں استعمال کیا ، کمائے اور جمع بھی کرتے رہے -

رومی حکومت نے بھی سکوں کی قدر و قیمت کا بہ طور ایک حسن تدبیر بہت جلد اندازہ کر لیا تھا :

روما کی سامراجی حکومت نے پہلی صدی عیسوی کے وسط میں سکوں کے وظائف کی قدر و قیمت کا ایسا اندازہ کر لیا تھا جیسا پہلے یا بعد کسی حکومت نے نہیں کیا تھا ، وہ سکوں کو معاصرانہ زندگی کا آئینہ سمجھتی تھی جس میں اس عہد کے سیاسی ، مجلسی ، روحانی اور فنی مقاصد و عزائم منعکس ہوتے تھے ؛ مزید برآں ان سکوں میں دور رس پروپیگنڈے کے بے اندازہ اور یگانہ ممکنات بھی موجود تھے - آج کل خبریں نشر کرنے کے نئے نئے ذریعے وجود میں آگئے ہیں ، ڈاک کے ٹکٹ چھاپنے سے ، ریڈیو اور اخباروں تک مختلف ذریعوں سے کام لیا جاتا ہے ؛ سامراجی سکوں کی بھی ایک زمانے میں یہی حیثیت تھی جہاں سالانہ ، ماہانہ — بلکہ کہا جا سکتا ہے قریباً روزانہ — نئے نئے نمونوں کے ذریعے سے واقعات ریکارڈ کیے جاتے تھے اور جو لوگ حکومت کا کاروبار سنبھالے بیٹھے تھے ، ان کے مقاصد و عزائم مختلف صورتوں میں انعکاس پذیر ہوتے رہتے تھے[1]-

باقاعدہ فوجیں

ہمہ گیر سلطنتوں میں اس امر پر خاصا اختلاف پایا گیا ہے کہ انہیں باضابطہ فوجوں کی ضرورت کس قدر ہوتی ہے ، بعض سلطنتیں ایسی تھیں جنھوں نے فوجوں کی ضرورت بالکل محسوس نہ کی ، باقی سلطنتیں اس گراں خرچ

۱- جے ، ایم ، سی ٹائن .بی کی کتاب : رومی تمغے (نیویارک ۱۹۴۴ ، شائع کردہ امریکن نیومس میٹک سوسائٹی) صفحہ ۱۵ -

ادارے کو ایک افسوس ناک ضرورت سمجھ کر قبول کرتی رہیں ؛ چنانچہ انھوں نے ایسی فوجیں بھی رکھیں جو مسلسل طول و عرض ملک میں چکر لگاتی رہتی تھیں اور ایسی بھی رکھیں جو مستقل چھاؤنیوں میں مقیم رہ کر حفاظت کا انتظام کرتیں ۔ آخر الذکر سلطنتوں کو عموماً آن مشکل اور بعض اوقات لا ینحل مسائل سے سابقہ پڑتا رہا جو یہ گران بار اور اکثر خطرناک ادارے پیدا کرتے رہے لیکن ہمارے پاس ان مسائل کی چھان بین کے لیے وقت نہیں ؛ اس عنوان کے ماتحت جتنے بھی مسائل آ سکتے ہیں ، ہم اپنی بات چیت ان میں سے ایک تک محدود رکھیں گے ۔ یہ مسئلہ حد درجہ دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ؛ نیز اس باب میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے ، اس کے ساتھ اسے گہرا تعلق ہے یعنی یہ کہ مسیحی کلیسیا کے نشو و ارتقا پر رومی فوج کا کیا اثر پڑا ۔

یہ حقیقت پہلے ہی صاف صاف واضح کر دینی چاہیے کہ رومی فوج سے فائدہ اٹھانے میں مسیحی کلیسا کی حیثیت نہ تو سب سے زیادہ نمایاں تھی اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کلیسا نے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا ؛ انحلال پذیر سلطنتوں کے فوجیوں میں سے یہ راہ راست فائدہ اٹھانے والے وہ اجنبی اور بربری تھے جن پر وہ فوجیں مشتمل تھیں ۔ ہخامنشی سلطنت کے آخری دور میں تنخواہ دار یونانیوں کی ایک پیشہ ور فوج ملازم رکھ لی گئی تھی ، اسی کی وجہ سے سکندر اعظم کے لیے ہخامنشی سلطنت کی تسخیر کا دروازہ کھلا ؛ عباسی خلفاء نے اپنی محافظ فوج میں ، رومی سلطنت اور " نئی مصری " سلطنت نے اپنی باقاعدہ افواج میں بربریوں کو بھرتی کر لیا تھا ، اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں بالترتیب ترکی بربری حکومت ، ٹیوٹانی اور سرمشیائی بربری حکومت اور ہکسوس بربری حکومت کے قیام کا باب مفتوح ہوا ۔ یہ امر یقیناً حیرت انگیز ہے کہ کسی فوجی نظام سے کوئی کلیسا فائدہ اٹھائے ، زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مسیحی کلیسا اپنی اصل حیثیت میں سراسر غیر عسکری روایات کا حامل تھا ۔

ابتدائی دور کے مسیحیوں کو خوں ریزی کے خلاف سخت اعتراض تھا لٰہذا وہ کوئی فوجی خدمت انجام دینے کے لیے تیار نہ تھے ، اس سلسلے میں ان کی روش یہودیوں کی روایات کے خلاف تھی ۔ مسیحیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کامیاب و بامراد ظہور ثانی قریب ہے لٰہذا اُنھیں

صبر و سکون کے ساتھ اس ظہور کا انتظار کرنا چاہیے - یہودی مسلسل بغاوتیں کرتے رہے تھے؛ ۱۶۶ ق - م سے ۱۳۵ء تک تین سو سال کی مدت میں انھوں نے پہلے سلیوکی حکومت کے خلاف، پھر رومی حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھائے لیکن مسیحیوں نے قریباً اتنی ہی لمبی مدت میں جو مسیحیت کے آغاز سے رومی حکومت کے ساتھ مصالحت (۳۱۳ء) تک تھی، ایک مرتبہ بھی رومیوں کے خلاف بغاوت نہ کی حالانکہ رومی اُن پر برابر ظلم کرتے رہے تھے - رومی فوج کی ملازمت سے انکار کے سلسلے میں مسیحیوں کے لیے اصل رکاوٹ یہ تھی کہ اول اس ملازمت میں خون ریزی سے مفر نہ تھا نیز دوسرے امور کے علاوہ سزائے موت کا نفاذ بھی فوجیوں ہی سے متعلق تھا، پھر شہنشاہ کے ساتھ غیر مشروط وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا تھا، شہنشاہ کی پوجا بھی کی جاتی تھی اور اس کے لیے قربانیاں کرنے کا دستور بھی رائج تھا، سب سے آخر میں فوجی پرچموں کا احترام اس پیمانے پر کرنا پڑتا تھا کہ اُسے پرستش قرار دینا درست ہوگا؛ انھیں وجوہ کی بناء پر ابتدائی دور کے مسیحی پادری مسلسل ہدایت کرتے رہے کہ فوج میں کبھی ملازم نہ ہونا چاہیے مثلاً اوریجن[1]، ٹرٹولیئن[2] بلکہ لکٹنٹیئس[3] جیسے مذہبی پیشواؤں کی رائے بھی یہی تھی، یہ حقیقت اس کتاب سے واضح ہو سکتی ہے جو شاہنشاہ قسطنطین کے ساتھ مفاہمت کے بعد شائع ہوئی -

یہ امر خاص توجہ کا محتاج ہے کہ رومی فوج کی ملازمت سے مسیحی کلیسا کے گریز کا سلسلہ اُسی وقت ختم ہوا جب اس فوج میں عام لوگوں کی بھرتی اُن کی خواہش و رضا پر موقوف رہ گئی - بے شک جبری فوجی بھرتی کا نظریہ موجود تھا، اُس پر شہنشاہ ڈایوکلیشئن (۲۸۳ء - ۳۰۵ء) نے عمل کا حکم صادر کیا لیکن مسیحی لوگ ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت پیشتر فوج میں بھرتی ہونے لگے تھے - ۱۷۰ء تک اس معاملے کے متعلق کشمکش کے جتنے مواقع سامنے آئے، اُن سے پہلو بچا لیا گیا؛ غیر مصافی مسیحی فوج میں شامل ہونے سے بہ دستور احتراز کرتے رہے لیکن جو لامذہب لوگ

۱- Origen -

۲- Tertullian -

۳- Lactantius -

پہلے سے فوج میں بھرتی تھے اور وہ مسیحیت اختیار کر لیتے تو ان کے ملازم رہنے پر اعتراض نہ کیا جاتا اور وہ بہ دستور فوجی فرائض انجام دیتے رہتے۔ غالباً کلیسا نے اس ڈھیلے پن کو اسی بنا پر حق بجانب سمجھ لیا جس بنا پر وہ دوسری متضاد چیزوں کو برداشت کرتا چلا آیا تھا مثلاً غلامی کو درست سمجھا جاتا تھا اور اس حالت میں بھی جہاں مالک اور غلام دونوں مسیح ہوتے تھے؛ فلی مون کے نام پولوس رسول کے خط کو مقدس نوشتوں میں شامل کر لینا بہ طور خاص قابل توجہ ہے[۱]۔ کلیسا کی امید کے مطابق اس وقت مسیح علیہ السلام کے ظہور ثانی میں اتنا تھوڑا وقت رہ گیا تھا کہ ہر ناگوار شے برداشت کی جا سکتی تھی، سپاہی وہ وقت فوجی خدمت میں اور مسیحی غلام غلامی کی بے بسی میں گزار سکتا تھا۔ تیسری صدی مسیحی میں مسیحیوں کی تعداد رومی معاشرے کے ذمہ دار سیاسی طبقوں میں تیزی سے بڑھنے لگی؛ اول اس لیے کہ مسیحیوں کو دنیوی اعتبار سے خاصی سر بلندی حاصل ہو گئی تھی، دوم اس لیے کہ انھوں نے رومیوں کے طبقۂ بالا کو مسیحی بنانا شروع کر دیا تھا۔ اب رومی فوج کی مجلسی اہمیت کا سوال سامنے آ گیا، مسیحیوں نے عملاً طے کر دیا کہ فوج میں ملازمت کی جا سکتی ہے لیکن نہ تو اصولاً اصل مسئلے کو حل کیا اور نہ اس امر کا انتظار کیا کہ فوج جس حکومت کی آلۂ کار ہے، وہ پہلے مسیحیت قبول کر لے۔ ڈایو کلیشئن کی فوج میں مسیحی عنصر اتنا زیادہ اور با اثر تھا کہ ۳۰۳ء میں مسیحیوں پر سختیاں شروع ہوئیں تو ان کا آغاز مسیحی فوج سے کیا گیا؛ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی صوبوں میں فوج کے اندر مسیحیوں کا تناسب غیر مصافی آبادی میں ان کے تناسب سے زیادہ تھا۔

کلیسا پر فوج کا اثر اس دور میں خاص توجہ کا محتاج ہے جب فوجی خدمت کی ممانعت کا حکم سختی سے جاری تھا۔ جنگ میں آدمیوں کو ویسے ہی بہادرانہ محاسن کا ثبوت دینا پڑتا ہے جن کی نمائش ہر ایک غیر ہردلعزیز مذہب کے پیرو مشغول ہوتے ہیں! ایسے مذاہب کے داعی اکثر جنگی ہتھیاروں اور جنگی فنون کے مصطلحات سے کام لیتے ہیں یہاں تک کہ

۱۔ مصنف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ فلی مون کے نام خط سراسر نجی تھا اور اسے مقدس نوشتوں میں شامل نہ کرنا چاہیے تھا لیکن کر لیا گیا (مترجم)۔

پولوس رسول نے بھی بدیہی طور پر انھیں ذرائع سے کام لیا۔ مسیحی کلیسا نے یہودی روایات کو اپنی قیمتی میراث سمجھ کر محفوظ کر لیا تھا، ان روایات کے مطابق واضح الفاظ میں نیز استعارۃً جنگ کی تقدیس کی گئی تھی لیکن حالات کی تبدیلی سے یہودیوں کی فوجی روایات تو صرف ایک قوی علمی اثر تک محدود رہ گئی، رومیوں کی فوجی روایت ایک زندہ اور مؤثر حقیقت بن گئی۔ جمہوریت کی رومی فوج رومی فتوحات کے بے رحم دور میں یقیناً بڑی مضر اور قابل نفرت چیز ہوگی، خانہ جنگی کے دور کی فوج کو بھی اس سے مختلف تو نہ سمجھنا چاہیے لیکن رومی سلطنت کی فوج نے رومی رعایا سے عزت، احترام بلکہ محبت کا خراج حاصل کر لیا تھا اس لیے کہ وہ فوج لوٹ مار نہ کرتی تھی اور اپنی تنخواہ پر زندگی گزارتی تھی، وہ یونانی دنیا کے مہذب اندرونی حصے کو غارت گری سے پامال نہ کرتی تھی بلکہ سرحدوں پر بیٹھ کر بربریوں کی یورشوں کے مقابلے میں تہذیب کے دفاع کا فرض انجام دیتی تھی؛ یہ ایک ایسا ہمہ گیر ادارہ تھا جو عوام کی فلاح و بہبود کا ضامن تھا لہٰذا اس پر بجا فخر کیا جاتا تھا۔ رومہ کے پادری کلیمنٹ[1] نے ۹۵ء کے آس پاس کارنتھیوں کو جو پہلا خط بھیجا، اس میں لکھا:

> ہمیں اپنے سپاہیوں کی روش پر نظر ڈالنی چاہیے جو ہمارے فرما رواؤں کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ غور کیجیے کہ وہ کس تنظیم، کسی اطاعت گزاری اور کس سرافگندگی سے احکام کی تعمیل کرتے ہیں؛ یقیناً وہ سب کے سب نائب جرنیل یا بڑے حاکم یا سو سو کے افسر یا چھوٹے درجوں کے افسر نہیں لیکن ہر جیش اور ہر یونٹ کا ہر سپاہی شہنشاہ اور حکومت کے احکام بجا لانے کے لیے ہمہ تن آمادہ رہتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کلیمنٹ اپنے مسیحی مخاطبوں کے سامنے فوجی نظم ونسق کی مثال پیش کر کے کلیسا میں ویسی ہی تنظیم پیدا کرنا چاہتا تھا؛ اس کا قول یہ تھا کہ مسیحیوں کو نہ صرف خدا کے احکام کی اطاعت کرنی

۱- Clement -

چاہیے بلکہ مذہبی پیشواؤں کا ہر حکم بھی مستعدی سے ماننا چاہیے۔ مسیحی کلیسا نے فوجی تصورات کے مطابق نشو و نما پائی تو مشنری یعنی داعی مذہب کے لیے خدا کے سپاہی کا لقب تجویز ہوا؛ ساتھ ہی یہ طے ہو گیا کہ مشنری کو ان تمام چیزوں سے الگ ہو جانا چاہیے جو غیر مصافی زندگی میں اس کے لیے رکاوٹوں کا باعث بن سکتی ہیں، ہم جماعت اسی طرح اس کی ضرورتیں پوری کرتے رہیں گے جس طرح سپاہیوں کو محاصل ادا کرنے والے عوام کے روپے سے باقاعدہ تنخواہیں ملتی ہیں۔

مسیحی اداروں کے نشو و ارتقا پر رومی فوج کے اثر کی حیثیت کچھ ہی سمجھ لی جائے لیکن اس کا دائرہ رومی سول سروس کے اثر سے کم تھا البتہ فوج کی مثال نے مقاصد کلیسا کے دائرے میں زیادہ گہرا اثر پیدا کیا۔ مسیحیت میں داخلے کی رسم بپتسمے سے ادا کی جاتی تھی؛ سینٹ سپرین[۱] نے اسے اس فوجی حلف کے برابر قرار دیا تھا جو رومی فوج میں کسی رنگروٹ کو داخل کرتے وقت اٹھوایا جاتا تھا۔ موصوف کہتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ مسیحی سپاہی داعیوں کی صف میں داخل ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ قواعد و ضوابط کے مطابق جنگ کا سلسلہ جاری رکھے، ترک خدمت کے ناقابل عفو گناہ یا ادائے فرائض میں غفلت کی خوفناک بد عملی سے اسے بچے رہنا چاہیے۔ پولوس رسول نے رومیوں کے نام خط میں جو فوجی زبان استعمال کی تھی، اس کی تعبیر ٹرٹولین نے یوں کی تھی کہ راہ فرض سے انحراف کی سزا موت ہے؛ آج کل انجیل کے مسلمہ انگریزی ترجمے میں اس مفہوم کو گناہوں کی پاداش قرار دیا گیا ہے۔ ٹرٹولین کہتا ہے کہ مسیحی زندگی میں جن رسموں اور اخلاقی واجبات کی پابندی لازم ہے، انھیں فوجی اصطلاح میں "تھکا دینے والی مشقت" سمجھنا چاہیے؛ یہ بھی واضح ہے کہ مسیحی مشنری وفاداری سے خدمات انجام دے گا تو ملازمت کے اختتام پر عطیۂ خداوندی کا مستحق سمجھا جائے گا، انعام کے علاوہ اس کے لیے خورو نوش کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان اصطلاحات کے مطابق صلیب کو فوجی

۱- Saint-Cyprian مسیحی پادری ۲۰۰ء میں پیدا ہوا، جب مسیحیوں پر ظلم و جور شروع ہوا تو پہلے اسے جلا وطن کر دیا گیا، ۱۴ ستمبر ۲۵۸ء کو موت کی سزا دی گئی (مترجم)۔

نشان اور مسیح[۴] کو سپہ سالار اعظم مانا گیا؛ حقیقت یہ ہے کہ بیئرنگ گولڈ کے ''مسیحی سپاہیو بڑھے چلو'' والے نظام اور جنرل بوتھ کی مکتی فوج نے وھی اصطلاحات استعمال کیں جو کلیسا کے ابتدائی دور میں مستعمل تھیں لیکن جس فوج نے یہ اصطلاحات دیں ، وہ رومی سلطنت کی غیر مسیحی فوج تھی اور اسے بالکل جداگانہ مقاصد کے لیے منظم کیا گیا تھا ۔

سول سروس

ھمہ گیر سلطنتوں کی سول سروسیں تنظیمات کے درجات میں بھی ایک دوسری سے بہت مختلف رھی ھیں؛ سب سے اونچا درجہ اس سلسلے میں عثمانی سلطنت کو حاصل ھے ۔ اس سلطنت نے انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جہاں تک انسانی فکر و ذھن کی دسترس تھی اور انسانی عزم اسے عمل میں لا سکتا تھا ۔ یہ نظام محض پیشہ ور برادری ھی کی حیثیت نہ رکھتا تھا بلکہ ایسا دنیاوی نظام تھا جس میں دینی نظام کے تمام اوصاف و خصائص موجود تھے ، اسے شدت کے ساتھ دوسرے دائروں سے الگ رکھا گیا تھا ، اس میں انتہائی تنظیم پیدا کر دی گئی تھی اور ایک ایک حصے کی پوری جانچ پڑتال ھو چکی تھی ۔ ھم کہ سکتے ھیں کہ یہ نظام وضع و ھیئت میں یا تو عام انسانی سطح سے بہت بالا تھا یا عام انسانی سطح سے نہایت نیچے تھا؛ اس نظام میں جتنے لوگ شامل تھے ، ان کی حیثیت عام انسانوں سے اتنی ھی جداگانہ تھی جتنا کوئی پرورش کردہ اور سدھایا ھوا گھوڑا یا کتا یا باز اپنے وحشی ھم جنسوں سے جداگانہ سمجھا جا سکتا ھے ۔

سلطنتوں کے لیے سول سروس کا نظام تیار کرنے والوں کے سامنے اکثر یہ مسئلہ آ جاتا ھے کہ امراء کا جو طبقہ بروے کار آ گیا تھا ، اس سے کیا کام لیا جائے؟ پیٹر اعظم نے جب اپنی سلطنت کو مغربی حکومتوں کے پیمانے پر لانے کا کام شروع کیا تو ماسکو میں حد درجے نا اھل اور ناکارۂ طبقۂ امراء موجود تھا؛ اس کے بر عکس جب رومی سلطنت میں بادشاھی قائم ھوئی تو وھاں کا طبقۂ امراء قابلیت کے اعلیٰ پیمانے پر پہنچا ھوا تھا ۔ پیٹر اور آگسٹس دونوں نے امراء کے طبقے سے اپنے ھمہ گیر انتظامی ڈھانچے کے لیے مواد حاصل کیے لیکن دونوں کے محرکات مختلف تھے؛ پیٹر کی غرض یہ تھی کہ اپنے قدامت پسند امرأ کو مغربی نمونے کے قابل ناظم بنا دے ، آگسٹس

نے طبقۂ امرأ کو اس لیے ساتھ نہ ملایا کہ اُن کی خدمات کی ضرورت تھی، صرف اس لیے ساتھ رکھا کہ یہ طبقہ علیحدگی کی حالت میں کہیں اس کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ کرے جو اس کے پیش رو جولئیس سیزر سے وہ طبقۂ امرأ خفگی کی حالت میں کر چکا تھا جسے حکمرانی کے مناصب سے اچانک معزول کر دیا گیا تھا۔ پیٹر اور آگسٹس کے سامنے متضاد مسائل تھے، اس قسم کے مسائل طبقۂ امرأ کی طرف سے عموماً بانیان سلطنت کے سامنے پیش ہوتے رہتے تھے؛ اگر طبقۂ امرأ میں صلاحیت موجود ہو تو وہ شہنشاہ کی ملازمت کو اپنے رتبے سے فرو تر سمجھتے ہوئے قبول نہ کرے گا، اگر یہ طبقہ نالائق ہو تو اس سے کام لینے والے پر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ ہتھیار نکما ہے اس لیے کہ اس کی دھار اچھی نہیں۔

سلطنت قائم ہونے سے بیشتر جو طبقۂ امرأ موجود ہوتا ہے، بانیان سلطنت اپنی سول سروس کے لیے آدمیوں کا انتخاب محض اُسی طبقے سے محدود نہیں رکھتے؛ یہ بڑے بڑے لوگ فوجوں میں بڑے بڑے عہدے لے سکتے ہیں، سول سروس کے لیے متوسط طبقے میں سے قانون دانوں اور پیشہ ور آدمیوں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات بانیان سلطنت کو خوش نصیبی سے وہ آدمی مل جاتے ہیں جو کسی زمانے میں اُن کی خانگی ضروریات کے لیے اچھی خدمات انجام دے چکے تھے۔ برطانیہ کی ہندوستانی سول سروس نے جو کارنامے انجام دیے اور جن خصائص کا اظہار کیا، اُن کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک برطانیہ کی انتظامی تاریخ کے اس باب کا پس منظر سامنے نہ رکھ لیا جائے جو پہلے موجود تھا:

> ۱۸۳۳ء کے قانون نے کارخانوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا ادارہ پیدا کیا۔ یہ ادارہ ایک نئی قسم کی سول سروس کے نشو و ارتقا میں ایک خاص مرحلے کی حیثیت رکھتا تھا .... بنتھم کا دل اس جذبے سے معمور تھا کہ نظم کو سائنس کا درجہ دے دے؛ اس کا نظریہ یہ تھا کہ نظم و نسق سے مراد ہنرمندانہ طریق پر کاروبار کرنا ہے۔ اس کے نتائج بالکلیہ تسلی بخش تھے، اس کے زیر رہنمائی انگلستان نے ایسے کارکن پیدا کر لیے جنھیں کام کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی اور وہ اپنے دائروں میں

آزاد تھے - مفصلات کے مجسٹریٹوں کے بر عکس نئے کارکن علم سے بہرہ مند تھے اور فرانسیسی کمشنروں کے بر عکس یہ حکومت کی مخلوق نہ تھے - انگریزوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اپنے تعلیم یافتہ آدمیوں سے اس طریق پر کام لیا جا سکتا ہے جس میں ان کی آزادی اور عزت نفس محفوظ رہے ...... کچھ دیر کے لیے اس تعلیم یافتہ طبقے کا اصل کام یہ تھا کہ نئی صنعتی دنیا میں جو بدنظمیاں پیدا ہو چکی تھیں، انھیں بروے کار لائے - قانون اصلاح کے بعد جو نسل پیدا ہوئی اس کی سرگزشت کا مطالعہ کرتے وقت جو بات خاص طور پر توجہ کی محتاج نظر آئے گی ، یہ ہوگی کہ قانون دانوں ، ڈاکٹروں ، سائنس دانوں اور اہل علم و فضل نے خرابیوں کی نشان دہی اور نقشہ ہائے عمل کی ترتیب میں نمایاں حصہ لیا[1]-

متوسط طبقے کے پیشہ ور منتظموں کی یہ نئی برادری تھی جو ہندوستان پہنچی ، اس کے کارناموں اور نقائص پر ہم آگے چل کر ایک باب میں کسی دوسرے عنوان کے ماتحت غور کریں گے -

آگسٹس نے ایک نئی سول سروس کی بنیاد رکھی تھی ؛ اس سول سروس نے غارت زدہ ، غیر منظم اور خستہ حال دنیا کی ضرورتیں پوری کیں جن کی ذمہ داری خود وہ اٹھا چکا تھا - ڈیڑھ سو سال پیشتر چینی دنیا میں یہی کام ہن خاندان کے بادشاہ لیو پنگ نے انجام دیا ؛ اگر پائداری کا معیار سامنے رکھا جائے تو اس چینی دھقان کے کام کو رومی شہری آکٹیوین[1] کے کام پر نمایاں فوقیت حاصل ہے ، آگسٹس کا نظام تخلیق سے سات سو سال بعد پارہ پارہ ہو گیا لیکن لیوپنگ کا نظام کم از کم اپنی جزوی حیثیت میں ۱۹۱۲ء تک باقی تھا -

رومی سول سروس کا اصل نقص یہ تھا کہ اس میں پرانے طبقۂ امرا اور

۱- مراد یہ ہے کہ لیوپنگ دھقان تھا اور آکٹیوین (آگسٹس) شہری ، آخر الذکر سے بہتر اور پائدار تر کام کی توقع تھی لیکن لیوپنگ بازی لے گیا (مترجم)-

نئی سامراجی مطلق العنانی کے درمیان اختلاف موجود رہا ، آگسٹس نے لیپ پوت کا انتظام کر دیا تھا لیکن اصل اختلاف دور نہ ہوا۔ اصل میں دو مختلف طبقے پیدا ہو چکے تھے جو ایک دوسرے سے کاملاً الگ تھلگ تھے ؛ ایک پرانے امرأ کا طبقہ تھا، دوسرا سول سروس کے ان کارکنوں کا جنھیں طبقۂ امرأ سے کوئی تعلق نہ تھا ، دونوں نے اپنے اپنے راستے اختیار کر رکھے تھے ۔ یہ اختلاف تیسری صدی عیسوی میں بہت نازک صورت اختیار کر گیا اور پرانے طبقۂ امرأ کو انتظامی ذمہ داری کے تمام عہدوں سے الگ کر دیا گیا لیکن اس وقت تک لوکل شہری خود اختیاری حکومت کا انحطاط آخری درجے پر پہنچ چکا تھا۔ کام بہت بڑھ گیا تھا اور ڈایو کلیشئن کو سول سروس کے مستقل ملازموں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کرنا پڑا ؛ اس ضرورت کی بنا پر ملازموں کا مجلسی درجہ کم کیے بغیر چارہ نہ تھا ۔ اس ضمن میں چین کے ہن خاندان کی سول سروس کے حالات خاصے دانش آموز ہیں، وہاں ابتدا ہی میں ملازمتوں کو قابلیت سے وابستہ کر دیا گیا تھا ؛ ۱۹۶ ق ۔ م میں جب سلطنت کی بحالی پر چھ سو سال گزرے تھے ، شہنشاہ نے حکم دے دیا کہ ہر سرکاری ملازمت کے لیے قابلیت کی بنا پر امیدوار چنے جائیں اور صوبوں کے حاکم چنے ہوئے آدمیوں کو مرکز میں بھیج دیں تاکہ مرکزی حکومت کے افسر انھیں رکھنے یا رد کر دینے کا آخری فیصلہ کر سکیں۔

چین کی سول سروس کے اس نظام نے اس وقت قطعی شکل اختیار کی جب لیوپنگ کے جانشین ہن وتی[1] (۱۴۰ ق ۔ م ، ۸۷ ق ۔ م) نے فیصلہ کیا کہ امیدواروں کے لیے قابلیت کا معیار کیا ہوگا ؛ معیار یہ رکھا گیا کہ ہر امیدوار کنفوشئس کی تصانیف کے کلاسیکی ادب میں مہارت کا ثبوت دے اور کنفوشئس کے فلسفے کو وقت کے علماء کی تشفی کے مطابق بیان کر سکے۔ اس طرح دوسری صدی قبل مسیح کے ان علما کو جن کا تعلق کنفوشئس کے مکتب سے تھا ، چین کے سامراجی نظام میں حسن تدبیر سے حصے دار بنا دیا گیا ؛ خود کنفوشئس بھی زندہ ہوتا تو اس صورت حال پر حیران رہ جاتا۔ یہ سیاسی فلسفہ عہد ڈایو کلیشئن کی یونانی دنیا کے محض ظاہری علمی سرمایے کے

۱- Han Wuti -

مقابلے میں منظم پیشہ ورانہ روح پیدا کرنے کے لیے زیادہ مؤثر تھا؛ یوں اُس سے چینی سول سروس میں روایتی اخلاق کی وہ شان پیدا ہو گئی جس سے رومی سول سروس محروم رہی -

ھن سلطنت اور رومی سلطنت نے اپنی مجلسی اور ثقافی میراثوں سے سول سروس پیدا کی - پیٹر اعظم جس صورت حال سے دو چار ہوا اس کا تقاضا ہی یہ تھا کہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھائے، ۱۷۱۷ء اور ۱۷۱۸ء میں اس نے انتظامی تعلیم و تربیت کے لیے کئی مرکز قائم کیے جن کی غرض یہ تھی کہ رومیوں کو نظم و نسق کے نئے مغربی طریقے سکھائے جائیں، اس نے سویڈن کے جنگی قیدیوں کو ان مرکزوں میں تعلیم و تربیت کی غرض سے مقرر کر دیا، نیز روسیوں کو کوانٹس برگ[1] بھیجا تاکہ وہاں پروشیا کے طریقۂ نظم و نسق کی تعلیم پا سکیں -

جہاں سول سروس اس نوع کے غیر ملکی اداروں کی پیروی میں بنائی جائے گی جیسا کہ پیٹر کی رومی سلطنت میں ہوا تو ظاہر ہے کہ افراد کی خاص تربیت کے لیے ضرور انتظامات کرنے پڑیں گے لیکن ویسے بھی خاص تعلیم و تربیت کا انتظام کسی نہ کسی درجے میں ضروری ہوتا ہے - انکائی، ھخامنشی رومی اور عثمانی سلطنت میں شہنشاہی محلات کے اندر جو لوگ موجود تھے، وہ ایک طرف سامراجی حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے مرکزی حیثیت کے مالک تھے، دوسری طرف نظم و نسق کا بار سنبھالنے والوں کی تربیت کے بھی ذمہ دار تھے - بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ شاہی محلات میں تعلیم و تربیت کا انتظام ان لوگوں کے لیے کر دیا جاتا تھا جو ابتدا میں ساقی گری کے لیے بھرتی ہوتے تھے اور جنھیں عام اصطلاح میں زیر تربیت ملازم سمجھنا چاہیے: کزکو کے انکائی دربار میں تعلیم کے لیے ایک باقاعدہ نصاب مقرر تھا اور مختلف مرحلوں پر تعلیم پانے والوں کا امتحان لیا جاتا تھا؛ ھخامنشی سلطنت کے متعلق ھروڈوٹس کا بیان ہے کہ ایرانی امرأ کے تمام بچے شاہی دربار میں پانچ سال کی عمر سے بیس سال کی عمر تک تعلیم پاتے تھے اور انھیں تین چیزیں سکھائی جاتی تھیں ——— اول سواری، دوم تیر اندازی، سوم راست گفتاری - عثمانی دربار نے ابتدائی دور میں بمقام بروصہ ملازمین کی تعلیم کا خاص بندوبست

۱- Konigsberg -

کر دیا تھا ، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک سلطان مراد ثانی (۱۴۲۱ء - ۱۴۵۱ء) نے ادرنہ میں شہزادوں کی تعلیم کے لیے ایک مستقل درس گاہ قائم کر دی ، اس زمانے میں ادرنہ سلطنت عثمانیہ کا دارالحکومت تھا۔ سلطان مراد ثانی کے جانشین سلطان محمد ثانی (۱۴۵۱ء - ۱۴۸۱ء) نے نیا طریقہ اختیار کیا اور سول سروس کے لیے عثمانی امرأ کے بیٹوں کو بھرتی کرنے کے بجائے مسیحی غلاموں کی بھرتی شروع کر دی ؛ ان میں وہ لوگ بھی ہوتے تھے جو مسیحیت چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیتے تھے ، وہ بھی جو مغربی مسیحی دنیا سے جنگی قیدیوں کی حیثیت میں ترکی پہنچتے تھے ، وہ بھی جو سال به سال مشرق کی آرتھوڈکس مسیحی رعایا کی طرف سے بہ طور خراج پیش ہوتے تھے ، اس عجیب و غریب ادارے کی کیفیت کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں پیش کی جا چکی ہے۔

عثمانی سلاطین نے اپنے غلام ملازموں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر لیا تاکہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سلطنت کا کاروبار زیادہ عمدگی سے جاری رہے اور عثمانی امرأ بڑی حد تک اس دائرے سے حذف ہو گئے۔ رومی بادشاہوں نے بھی شاہی محلات کے ملازموں سے مجبوراً اسی قسم کا کام لیا اور سامراجی نظام میں امرأ کی حیثیت محدود کر دی ؛ رومی سلطنت میں نظم و نسق کا سب سے بڑا حصار مرکزی حکومت تھی اور شاہی محلات کے پانچ منتظم افسر شاہی وزارت کے منصب پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن یہ حقیقت واضح کر دینی چاہیے کہ اُن مناصب پر بھی جو امرأ کے لیے مخصوص سمجھے جاتے تھے ، کسی کا زیادہ دیر تک قائم رہنا ممکن نہ تھا خصوصاً جب وہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا تھا ، اُس کے لیے پریشانی کے دور کا آغاز ہو جاتا تھا۔ کلاڈیس اور نیرو کے وزیر لا محدود اختیارات کے مالک بن گئے تھے اور یہ امر شدید اعتراضات کا باعث بنا ؛ چنانچہ فلیویائی[1] شہنشاہوں اور اُن کے جانشینوں کو یہ تمام کلیدی منصب یکے بعد دیگرے تاجروں کے حوالے کرنے پڑے۔

یوں رومی سول سروس کی تاریخ میں تجارت پیشہ گروہ نے آہستہ آہستہ مستحکم حیثیت پیدا کر لی ، شاہی غلاموں یا امرأ کے گروہ اُن کے مقابلے

۱- Flavian Emperors آگسٹس کے جانشیں نیرو تک فلیویائی شہنشاہ کہلاتے ہیں (مترجم)۔

میں ٹھہر نہ سکے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تجارت پیشہ گروہ اپنے فرائض انتہائی مستعدی ، قابلیت اور دیانت سے انجام دیتا تھا اور اس طرح اس کا بر سر اقتدار آ جانا ہر لحاظ سے حق بجانب ثابت ہوا ۔ جو طبقہ جمہوری نظام کی آخری دو صدیوں میں نفع اندوزی ، محاصل کی اجارہ داری اور سود خواری کی وجہ سے ثروت و اقتدار کا مالک بن چکا تھا ، اس کا یہ طریق کار آگسٹس کے قائم کردہ سامراجی نظام کی ممتاز ترین کامیابی کا مظہر تھا ۔ برطانوی ہند کی سول سروس کے ملازمین بھی تجارت پیشہ جماعت ہی سے بھرتی کیے جاتے تھے ؛ یہ لوگ ابتدا میں اس تجارتی کمپنی کے ملازم تھے جس کا واحد مقصد مالی نفع حاصل کرنا تھا ، وطن سے بہت دور ناسازگار آب و ہوا میں ملازمت پر آمادہ ہو جانے کا اصل محرک یہ امر تھا کہ شاید وہاں اپنے طور پر تجارت کر کے دولت کے بڑے ذخیرے جمع کیے جا سکیں ۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی ایک سہل فوجی کامیابی کے باعث یکایک مغل سلطنت کے زرخیز ترین صوبے میں حقیقی اقتدار کی مالک بن گئی تو کمپنی کے ملازمین ایک خاص وقت تک انتہائی ڈھٹائی سے رشوتیں لینے کی ترغیبات میں الجھے رہے اور انہوں نے وہی کام کیا جو رومی تاجر زیادہ مدت تک رومی سول سروس میں انجام دیتے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رومی سول سروس کے آدمیوں کی طرح برطانوی سول سروس کے آدمی بھی موسمی شکاری پرندوں کے بجائے ایسے سرکاری ملازم بن گئے جن کا اصل مقصد ذاتی نفع اندوزی[1] نہ تھا اور جن کے ہاتھ میں بہت وسیع سیاسی اختیارات تھے ، تاہم انہوں نے ان کا غلط استعمال کرنے کی کبھی کوشش نہ کی ۔

ہندوستان میں برطانوی ملازمین کے کردار و عمل میں یہ خوش گوار تغیر ایک حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس فیصلے کا نتیجہ تھا کہ ملازموں کو نئی سیاسی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے صحیح تعلیم دینے کا فیصلہ

۱۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں اس لیے کہ انگریز ملازموں کی خاطر نظم و نسق کے خرچ کے مصارف اتنے بڑھ گئے تھے جس کی نظیر نہیں مل سکتی ۔ انگریز اسی لیے ہندوستان آتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کر لیں ، مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد انہیں پنشنیں ملتی تھیں ، بڑی بڑی تنخواہوں کے علاوہ ان کے لیے خاص الاؤنس مقرر تھے ، نظم و نسق کے اس ڈھانچے کو عوام کی مالی حیثیت سے کوئی مناسبت نہ تھی (مترجم) ۔

کر لیا گیا تھا - ۱۸۰۶ء میں کمپنی نے ہرٹ فورڈ کاسل[1] میں ایک کالج قائم کیا جس میں نئے ملازموں کو نظم و نسق کی تربیت دی جاتی تھی؛ تین سال بعد یہ کالج ہیلی بری[2] میں منتقل کر دیا گیا، یہ باون سال قائم رہا اور اس نے جو کام انجام دیا، وہ مستقل تاریخی حیثیت اختیار کر گیا - ۱۸۵۳ء میں یعنی نظم و نسق کمپنی کے بجائے حکومت کے ہاتھ منتقل ہونے سے کچھ ہی مدت پیشتر پارلیمنٹ نے فیصلہ کر دیا کہ آئندہ سول سروس کے امیدواروں کے لیے مقابلے کے امتحان ہوں گے اور اس مقابلے میں یونیورسٹیوں یا پبلک سکولوں سے امیدوار لیے جائیں گے - ہیلی بری کالج ۱۸۵۷ء میں بند ہوا، اس کی باون سال کی زندگی میں رگبی کے آرنلڈ آئے اور چلے گئے اور وہ جس نصب العین کے لیے مساعی تھے، وہ نصب العین ان کی وجہ سے اور ان جیسے دوسرے معلموں کی وجہ سے تمام پبلک سکولوں میں نشر ہو گیا - ہندوستان کی سول سروس میں شامل ہونے والے لوگ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سکولوں اور یونیورسٹیوں میں وہ تمام علوم حاصل کرتے تھے جنھیں مغربی لوگ کلاسیکی زبانیں اور کلاسیکی ادبیات قرار دیتے تھے؛ اُن کا نقطۂ نگاہ مسیحیت کے سلسلے میں بھی خاصا زور دار ہوتا تھا اگرچہ مسیحیت کے متعلق ان کے تصورات و عقائد مبہم سے رہتے تھے۔ اس اخلاقی اور ذہنی تعلیم و تربیت کی مثال چین میں کنفوشیئس کے علوم سے پیش کی جا سکتی ہے جس کی ضرورت سے چینی سول سروس کا کوئی آدمی بے نیاز نہ ہو سکتا تھا اگرچہ یہ سول سروس دو ہزار سال پیشتر قائم ہو چکی تھی -

اب اگر ہم معاملے کے اس پہلو پر غور کریں کہ سلطنتوں نے اپنے مقصد کے لیے سامراجی سول سروس کے جو نظام قبول کیے ان سے زیادہ فائدہ کس نے اٹھایا تو جواب ملے گا کہ زیادہ فائدہ اٹھانے والی ان سلطنتوں کی جانشیں حکومتیں تھیں لیکن صرف وہ حکومتیں جن میں اس بیش بہا میراث سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تھی - اس فہرست سے ہمیں رومی سلطنت کی ان جانشیں ریاستوں کو خارج کر دینا چاہیے جو مغرب میں واقع تھیں؛ انھوں نے سامراجی سول سروس سے بہت کم سیکھا جسے انھوں نے درہم برہم کر ڈالا

۱- Hert Ford Castle -

۲- Hailey-bury -

اور کلیسا سے خوب سبق حاصل کیے جس کے دائرے میں وہ داخل ہو چکے تھے لیکن ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ خود کلیسا نے بھی رومی سول سروس ہی سے فائدہ اٹھایا ۔ ہم فائدہ اٹھانے والی جانشین حکومتوں کی پوری فہرست پیش نہیں کر سکتے لیکن یہ کہ سکتے ہیں کہ برطانوی ہند کی سول سروس سے انڈین یونین اور پاکستان دونوں نے فائدہ اٹھایا[1]۔

سب سے بڑھ کے فائدہ اٹھانے والا کلیسا تھا ۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مسیحی کلیسا کا مقدس نظام رومی سلطنت کے نظام پر مبنی تھا ، اسی قسم کی بنیاد و اساس مصر کی نئی سلطنت نے تھیبز میں رکھی تھی جس سے آمن راع کے پروہت کے ماتحت مصری مذہبی نظام نے فائدہ اٹھایا ؛ اسی قسم کی بنیاد و اساس ساسانی سلطنت نے مذہب زرتشت کے لیے رکھی تھی ، آمن راع کے اعلیٰ پروہت کو تھیبز کے فرعونوں کی شکل دے دی گئی تھی اور مذہب زرتشت کے سب سے بڑے موبد نے ساسانی شہنشاہ کی حیثیت اختیار کر لی ۔ ڈایو کلیشئن کے بعد کے رومی شہنشاہوں کا وارث پوپ بن گیا ، غیر مذہبی انتظامی اداروں نے کلیسا کے لیے زیادہ وسیع خدمات انجام دیں ، محض تنظیمی قالب ہی مہیا نہ کیا بلکہ ان کے نقطۂ نگاہ اور ماہیت میں بھی تبدیلی پیدا کی اور بعض حالتوں میں ذہنی اور اخلاق اثرات بھی خاصے وسیع تھے ۔

تین ایسی تاریخی شخصیتیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں سے ہر ایک نے مغربی سر زمینوں کے اندر کیتھولک کلیسا کے نشو و ارتقا میں فیصلہ کن حصہ لیا ، یہ تینوں شخصیتیں رومی سامراج کی سول سروس سے متعلق تھیں ۔ امبروسیس[2] (۳۴۰ء - ۳۹۷ء) سول سروس کے ایک افسر کا بیٹا تھا جس نے اپنے پیشے میں اونچا منصب حاصل کر لیا ۔ سینٹ امبروس اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتا ہوا لگیوریا[3] اور آئی میلیا[4] کے صوبے میں گورنر بن گیا تھا ،

---

۱ - حقیقت یہ ہے کہ برطانوی سول سروس سے پاکستان کو نقصان ہی پہنچا ، فائدہ کوئی نہ پہنچا اس لیے کہ یہ نظام مالی اعتبار سے حد درجہ گراں خرچ تھا اور معنوی اعتبار سے یہ عموماً برطانوی عہد کی سطح پر رہا گویا صوری یا معنوی لحاظ سے اس میں پاکستانی قومیت کی روح پیدا نہ ہو سکی (مترجم) ۔

۲ - Ambrosius -

۳ - Liguria -

۴ - Aemilia -

۴۷۳ء میں اُسے اپنا یہ یقینی سرکاری منصب خلاف مرضی چھوڑنا پڑا اور عوام نے جوش و خروش سے اُسے میلان میں اونچا مذہبی عہدہ دے دیا۔ کیسیوڈورس[1] (۴۹۰ء - ۵۸۵ء) نے طویل زندگی پائی اور وہ مدت تک اٹلی میں مشرقی گاتھوں کے بادشاہ تھیوڈورک کی خدمات انجام دیتا رہا؛ بعد ازاں اس نے اپنی دیہاتی جائداد میں جو جنوبی اٹلی میں واقع تھی، ایک خانقاہ قائم کر دی جو مونٹ کاسینو میں سینٹ بینی ڈکٹ کی خانقاہ سے مشابہ تھی؛ سینٹ بینی ڈکٹ کے راہبوں کو خدا کی محبت میں کھیتوں کے اندر سخت مشقت کرنی پڑتی تھی، وہ لوگ کبھی ایسی سخت ریاضتوں پر آمادہ نہ ہو سکتے اگر اُن کے دل میں کیسیوڈورس ایسے آدمی نے مستحکم جذبہ نہ پیدا کر دیا ہوتا، وہ لامذہبوں کی کلاسیکی کتابوں اور بڑے بڑے مقدس پادریوں کی تصانیف کی نقلیں کرتے رہتے تھے۔ تیسرا آدمی گریگوری اعظم[2] (۵۴۰ء - ۶۰۴ء) تھا، وہ مدت تک اونچے عہدے پر ممتاز رہا، پھر کیسیوڈورس کی پیروی کرتے ہوئے اُس نے روما کے آبائی محل میں ایک خانقاہ قائم کر دی۔ اس طرح اپنی اُمید اور خواہش کے خلاف پاپائیت کی بنیاد مستحکم کرنے کا ذمہ دار بن گیا۔ سول سروس کے ان تین بلند پایہ افراد میں سے ہر ایک نے اپنے پیشے سے حاصل کیے ہوئے تجربات کلیسا کی خدمت میں لگا دیے اور اس خدمت میں اُن صلاحیتوں اور روایتوں کو تقویت پہنچائی جو انھوں نے سول سروس کے دوران حاصل کی تھیں۔

شہریتیں

ہمہ گیر سلطنتیں عموماً متعدد محارب صوبائی حکومتوں کے جبری اتحاد سے پیدا ہوتی ہیں لٰہذا اُن کے آغاز میں حاکموں اور محکوموں کے درمیان ایک وسیع خلیج پائی جاتی ہے؛ ایک طرف وہ گروہ ہوتا ہے جو سلطنت قائم کرتا ہے، یہ گروہ ایک مقتدر اقلیت کا نمائندہ ہوتا ہے جو پہلے دور کے متقابل مقامی گروہوں کے درمیان بقا کی طویل کشمکش سے زندہ بچ نکلتی ہے، دوسری طرف مفتوحہ آبادی ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس گروہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے کہ محکوم اکثریت میں سے آدمی مقتدر اقلیت میں شامل ہوتے

۱- Cassiodorus -

۲- Gregory -

جاتے ہیں ؛ اس طرح انجام کار حاکموں اور محکوموں کے درمیان ابتدائی تقسیم کا ہر نشان کاملاً محو ہو جاتا ہے۔

ایک ممتاز مستثنیٰ مثال جس میں سیاسی حقوق ولایت سلطنت قائم ہونے کے بعد ربع صدی کے اندر اندر حاصل کر لیے گئے ، چینی دنیا میں ملتی ہے۔ چینی دنیا میں ہمہ گیر سلطنت (۲۳۰ ق - م - ۲۲۱ ق - م) میں قائم ہوئی ، چھ حکومتیں ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں ، سٹن نے کامیابی حاصل کی اور چھ کی چھ اس کی تابع ہو گئیں لیکن ۲۰۷ ق - م میں ھن خاندان کے بانی ننگ نے سٹن کے دارالحکومت سٹن نیگ پر قبضہ کرلیا تو سلطنت ختم ہو گئی۔ چینی سلطنت کی پوری آبادی کے لیے سیاسی حقوق بلدیت ۱۹۶ ق - م میں دیے گئے ؛ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس سیاسی کارنامے سے بہ یک جنبش قلم چینی معاشرے کے بنیادی ، اقتصادی اور مجلسی نظام میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو سکتا تھا ، اس معاشرے کا بہت بڑا حصہ کسانوں پر مشتمل تھا جو ٹیکس ادا کرتے رہے اور ایک مختصر سا حکمران طبقہ ان ٹیکسوں کی بنا پر پلتا رہا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ چینی دنیا کے سرکاری بہشت زار میں داخلے کے لیے قابلیت و صلاحیت ذریعہ بن گئی اور جس شخص میں بھی صلاحیت ہوتی خواہ وہ کسی طبقے یا گروہ کا ہوتا ، سرکاری منصب حاصل کر لیتا۔

طویل مدت تک برسر کار رہنے والی تاریخی قوتیں جو اتحاد انگیز اثر پیدا کرتی ہیں ، وہ قانون سازی کے ذریعے یکساں درجہ عطا کر دینے سے پیدا نہیں ہو سکتا ؛ ہندوستان میں برطانوی راج نے یورپینوں ، یوریشیائیوں اور ایشیائیوں کے لیے ، امریکہ کی ہسپانوی سلطنت میں یورپینوں، کری اولیوں[1] اور دیسی باشندوں کے لیے یکساں درجہ تسلیم کیا گیا تھا لیکن ان دونوں دائروں میں حاکموں اور محکوموں کے درمیان جو مجلسی خلیج حائل تھی ، اس میں کوئی کمی نہ آئی البتہ رومی سلطنت کی تاریخ میں ایک مثال ملتی ہے جس میں ابتدا کی حکمران اقلیت آہستہ آہستہ اپنی سابقہ رعایا میں ضم ہوتی گئی اور ابتدائی خلیج محو ہو گئی لیکن یہاں بھی محض قانونی لحاظ سے رومی شہریت کا درجہ عطا کرنے کی بنا پر سیاسی مساوات بروے کار نہ آئی - ۲۱۲ء میں کراکلا

۱- Creoles یہ لفظ آن ہسپانویوں یا یورپینوں کے لیے مستعمل تھا جو امریکی مقبوضات میں پیدا ہوتے تھے (مترجم) -

نے ایک فرمان جاری کیا جس کے رو سے رومی سلطنت کے تمام آزاد مرد رومی شہری قرار پائے؛ صرف چند معمولی مستثنیات رکھی گئیں لیکن زندگی کے حقائق کو قانون کے مطابق بنانے کے لیے ایک سو سال کا سیاسی اور مجلسی انقلاب درکار تھا۔

رومی سلطنت، بادشاہی کے عہد میں جس سیاسی مساوات کی طرف بڑھ رہی تھی اور جو ڈائیو کلیشئن کے عہد میں حاصل ہوئی، اُس سے کیتھولک مسیحی کلیسا نے فائدہ اٹھایا۔ اس کلیسا نے دوگونہ شہریت کا بنیادی خیال رومی سلطنت سے لیا؛ دوگونہ شہریت دراصل ایک آئینی تدبیر تھی جس کے مطابق ایک طرف ہمہ گیر معاشرے کی رکنیت سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو گیا، دوسری طرف محدود تر وفاداریوں یا مقامی علائق سے الگ ہونے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ بادشاہی کے ماتحت رومی سلطنت میں رومہ کے تمام شہری (ایک چھوٹے سے طبقے کے سوا) کسی نہ کسی مقامی بلدیے کے بھی شہری تھے جو رومی نظام سیاست کے مطابق ایک آزاد شہری ریاست تھی، یونانی شہری ریاستوں کے روایتی حقوق اسے حاصل تھے اور اُسے تمام باشندوں پر ویسا ہی اثر و رسوخ میسر تھا جیسا کہ ماں کو اپنے بچوں پر ہوتا ہے۔ اس غیر دینی رومی ڈھانچے کے مطابق کلیسائی نظام بڑھا، پھلا پھولا اور ایک ایسی تنظیم عمل میں آگئی جس میں مقامیت اور ہمہ‌گیری دونوں کے درمیان موافقت تھی؛ مسیحی جس کلیسا سے حلف وفاداری اٹھاتے تھے، وہ وفاداری کسی شہر کی مقامی مسیحی آبادی سے بھی متعلق ہوتی تھی اور کیتھولک مسیحی کلیسا کی آبادی سے بھی جو یکسانیٔ عقیدہ و عمل کی وجہ سے تمام مقامی کلیساؤں پر حاوی ہوتا تھا۔

ساتواں حصہ

ہمہ گیر مذہبی نظام

چھبیسواں باب

ہمہ گیر مذہبی نظاموں اور تہذیبوں کا تعلق

متبادل تصور

۱- مذہبی نظام بہ حیثیت سرطان

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمہ گیر مذہبی نظام تہذیب کی شکست کے بعد دور مصائب میں وجود پذیر ہوتے ہیں اور ہمہ گیر سلطنت قائم ہو جاتی ہے تو اس کے سیاسی ڈھانچے میں وہ فروغ پانے لگتے ہیں - ہم اس کتاب کے ایک سابقہ حصے میں یہ بھی دیکھ چکے ہیں، ہمہ گیر سلطنتوں کے قائم کردہ اداروں سے استفادے میں اولین درجہ ہمہ گیر مذہبی نظاموں ہی کو حاصل ہوتا ہے، پر اس پر حیران ہونے کی کون سی وجہ ہے کہ ان سلطنتوں کے سرگرم حامی اختر تقدیر کی گردش کے دور میں اپنے دائرۂ اثر کے اندر ہمہ گیر مذہبی نظاموں کو پنپتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتے؛ یوں یہ مذہبی نظام سامراجی حکومتوں اور ان کے حامیوں کی نظروں میں ایک مجلسی سرطان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جنھیں وہ نظام سلطنت کے انحطاط کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

رومی سلطنت کے عہد زوال میں مسیحیت کے خلاف ایک فرد قرارداد جرم ترتیب پا رہی تھی، اس کی ابتدا دوسری صدی مسیحی کے اختتام سے قریب سلسوس[1] کے حملے سے ہوئی تھی اور یہ مغرب میں اس وقت آخری منزل پر پہنچی جب سلطنت پر نزع کا عالم طاری تھا - یہ معاندانہ احساس ۴۱۶ء میں روٹیلیس نماٹیانس[2] کے قلب سے لاوے کی طرح اس وقت پھٹ نکلا

۱- Celsus -

۲- Rutilius Namatianus -

جب اس نے بنجر جزیروں میں مسیحی راہبوں کی آبادی کا ملال افزا نظارہ دیکھا یا اس کے انداز فکر کی طرح سمجھنا چاہیے کہ جزیروں کو اس نے مسیحی راہبوں سے حشرات الارض کی طرح پٹا ہوا پایا۔ سامراجی رومہ کے اس سخت جان اور لا مذہب گال پجاری نے کہا:

اب ہم حرکت میں آتے ہیں تو جزیرۂ کپریریا[1] اپنا سر اٹھاتا ہے سمندر کے پانی سے؛ یہ جزیرہ نہایت حقیر اور بد منظر ہے اور پٹا ہوا ہے ان آدمیوں سے جو سورج کی روشنی سے دور بھاگتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو "راہب" کہتے ہیں اور کوئی سا یونانی نام اختیار کر لیتے ہیں اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں سب سے الگ تھلگ رہیں، کسی کی نگاہ اُن پر نہ پڑے، وہ گریزاں ہیں قسمت کی شادمانیوں سے اور ہراساں ہیں اس کی تلخ نوائیوں سے، وہ رنج و غم سے آزاد رہنے کی خاطر رنج و غم کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں؛ بیمار دماغ کی یہ کتنی عجیب و غریب دیوانگی ہے کہ وہ لوگ اتنے خواہاں ہیں ہر شر سے ڈرنے کے اور ہر خیر کو ٹھکرانے کے۔

بحری سفر کے اختتام سے پیشتر روٹیلئس نے ایسے ہی ایک اور جزیرے کا زیادہ ملال افزا منظر دیکھا جس نے خود اس کے ایک ہم وطن کو مسحور کر لیا تھا؛ چنانچہ وہ کہتا ہے:

لہروں کی پٹی باندھے ہوئے گارگن[2] سمندر کے بیچ میں سے سر اٹھاتا ہے، پسا[3] اور سرنوس[4] کے درمیان؛ ایک ایک جانب، دوسرا دوسری جانب۔ مجھے اس کی چٹانوں

۱- Capraria یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو سارڈینیا کے شمال مشرق میں اٹلی کے مغربی ساحل کے قریب واقع ہے (مترجم)۔

۲- Gorgon ایک اور چھوٹا سا جزیرہ جو کپریریا کے شمال میں ہے۔ یہ پسا سے قریب ہے (مترجم)۔

۳- Pisa اٹلی کا مشہور شہر جو مغربی ساحل پر واقع ہے (مترجم)۔

۴- Cyrnus یہ پسا کے جنوب میں ہے (مترجم)۔

سے نفرت ہے، یہ یاد تازہ کر دیتی ہیں ایک دردناک حادثے کی جو پچھلے دنوں یہاں پیش آیا؛ میری اپنی قوم کا ایک فرد یہاں جیتے جی موت کی آغوش میں چلا گیا۔ پچھلے دنوں ہماری قوم کے اونچے خاندان کے ایک نوجوان نے جس کے پاس نہ دولت کی کمی تھی، نہ بیوی اور رشتہ داروں سے محروم تھا، لیکن دیوانگی نے اسے عزیزوں اور وطن سے الگ کر دیا، اوہام میں مبتلا ہو کر جلا وطنی اختیار کر لی اور تلاش کی ایک شرمناک جگہ چھپنے کے لیے۔ وہ ستارہ سوختہ بد بخت سمجھے بیٹھا تھا کہ آسمانی روشنی کی چنگاری غلاظت میں فروغ پاتی ہے، اس نے خود اپنی زندگی کے جسم پر بے دردی سے تازیانوں کی ایسی ضربیں لگا لیں کہ غیظ و غضب میں آئے ہوئے دیوتا بھی شاید ویسی ضربیں نہ لگاتے۔ یہ مذہبی نظام سرسی[1] کے تیار کیے ہوئے دارو سے بھی زیادہ برا ہے؛ وہاں تو صرف جسم ہی تبدیل کیے جاتے تھے، یہاں دل و دماغ ماؤف کیے جاتے ہیں۔

ان اشعار سے آمرائیت کی وہ روح ٹپکتی ہے جو ابھی تک لا مذہب تھی اور سمجھ رہی تھی کہ رومی سلطنت یونانی دارالاصنام کی روایتی پرستش ترک کر دینے کے باعث تباہی کے گڑھے میں گری جا رہی ہے۔

گرتی ہوئی رومی سلطنت اور ابھرتے ہوئے مسیحی کلیسا کے درمیان اس نزاع نے ایک ایسا مسئلہ پیدا کر دیا جس نے نہ صرف براہ راست متعلقہ معاصرین ہی کے احساسات کو گرمایا بلکہ بعد کی نسلیں بھی وقت کی وسیع خلیج پر سے اس پر نظر ڈالتی رہیں تو متاثر ہی ہوتی رہیں۔ گبن[2] اپنی

۱۔ Circe یونانی افسانوں کی مشہور ساحرہ جس نے یولی سس کے ساتھیوں کو ایک خاص دارو پلا کر سؤر بنا دیا تھا۔ خود یولی سس پر اس کے دارو نے کوئی اثر نہ کیا کیوں کہ اس نے ایک جڑ کا عرق پی لیا تھا جسے سرسی کے دارو کے لیے تریاق کی حیثیت حاصل تھی (مترجم)۔

۲۔ Gibbon مشہور مورخ جس کی کتاب ''زوال و انحطاط رومہ'' لازوال شہرت پا چکی ہے۔ ۱۷۳۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۹۴ء میں وفات پائی (مترجم)۔

کتاب کے اکہتر ابواب کا خلاصہ نو لفظوں میں پیش کرتا ہوا کہتا ہے کہ ''میں نے بربریت اور مذہب کی کامیابی بیان کی ہے'' لیکن ظاہر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو سلوس اور روٹیلئس کا طرف دار ثابت کیا ہے ؛ اس نے اینٹونینی عہد میں یونانی تاریخ کی انتہائی ثقافتی برتری کا دور جس رنگ میں دیکھا تھا ، وہ سولہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بہ دستور صاف اور روشن نظر آ رہا تھا ۔ گبن کے نزدیک اس کی حیثیت ثقافتی چرنی کی تھی ؛ اسی چرنی سے کھا پی کر گبن کے جد امجد کی نسل کی مغربی دنیا نے ھچکچاتے ہوئے ایک نئے پہاڑ کی اوپر اٹھتی ہوئی ڈھلان پر قدم رکھا تھا جہاں سے یونان کے ماضی کی توام چوٹیاں پھر ایک مرتبہ اپنی اصل شان میں جلوہ گر نظر آتی تھیں ۔

جو نظریہ گبن کی تصنیف میں مضمر تھا ، اسے بیسویں صدی کے ایک ماہر بشریات نے بڑے واضح اور صاف انداز میں پیش کر دیا ہے اور وہ شخص اپنے دائرے میں خاصی بلند حیثیت کا مالک ہے ۔ وہ کہتا ہے :

> مادر کلاں کا مذہب اپنے وحشیانہ مراسم اور روحانی آرزوؤں کے عجیب و غریب امتزاج کے ساتھ اسی نوع کے مشرقی عقیدوں میں سے ایک عقیدہ تھا جو لامذہبی کے آخری دور میں رومی سلطنت کے اندر رواج پذیر ہوئے ؛ ان عقیدوں نے یورپی اقوام کو زندگی کے اجنبی نظریات سے شرابور کیا اور تہذیب قدیم کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالیں ۔
>
> یونانی اور رومی معاشرے کی بنیاد یہ تھی کہ فرد جماعت کے اور شہری حکومت کے تابع ہے ؛ اس کے مطابق دولت کی حفاظت انسان کا سب سے بڑا نصب العین تھی اور فرد کی حفاظت موجودہ دنیا یا آنے والی دنیا میں اس بڑے نصب العین کے بعد آتی تھی ۔ اس نصب العین کی رو سے جو خود غرضی کے ہر شائبے سے پاک تھا ، یورپی شہری ابتدا ھی سے ایسی تربیت پاتے تھے کہ ان کی زندگیاں خدمت عوام کے لیے وقف رہتی تھیں اور وہ اجتماعی بہبود کے لیے اپنی جانیں دے دینے پر آمادہ رہتے تھے ؛ اگر وہ اس بڑی قربانی سے پہلو تہی بھی کرتے تو ہمیشہ اُن کے دل پر یہ اثر رہتا کہ یہ فعل کمینگی پر مبنی تھا اور انھوں

نے ذاتی بقا کو قومی مفاد پر ترجیح دینے میں غلطی کی تھی۔ مشرقی عقیدوں کی اشاعت سے اس صورت حال میں تغیر پیدا ہو گیا: ان عقیدوں نے انسانی روح کو خدا کی معیت میں وقت گزارنے پر آمادہ کردیا، زندگی کا صرف ایک مقصد باقی رہ گیا یعنی روح کی دائمی نجات؛ اس کے مقابلے میں حکومت کی بقا اور اقبال مندی و خوشحالی کے مقاصد بالکل بے حقیقت سمجھ لیے گئے۔ بد اخلاقی اور خود غرضی کی اس تعلیم کا ناگریز نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خدمت عوام سے کنارہ کشی میں قدم آگے بڑھاتے گئے اور ان کی توجہ صرف روحانی افکار و امیال پر مرتکز ہو گئی، موجودہ زندگی سے وہ متنفر ہو گئے اور اسے آنے والی بہتر اور دائمی زندگی کے لیے ایک آزمائشی اور امتحانی زمانہ سمجھنے لگے، اُن ولیوں اور درویشوں کو ہردلعزیزی حاصل ہو گئی جو دنیا داری کے معاملات سے گریزاں رہتے اور ہر لحظہ روحانی تفکر و تدبر میں ڈوبے رہنا انہیں پسند تھا؛ عام لوگوں کے نزدیک یہی انسانیت کا سب سے اونچا نصب العین بن گیا، حب وطن اور جواں مردی کا قدیم نصب العین پس پشت ڈال دیا گیا حالانکہ محبان وطن ہی تھے جو ذات سے بالکل بے پرواہ ہو کر اپنی زندگیاں ملک کی بھلائی کے لیے قربان کر دینے پر آمادہ رہتے تھے؛ لوگوں کو ''ارضی شہر'' لغو اور حقیر معلوم ہونے لگا اور اُن کی نظریں ''خدائی شہر'' پر جم گئیں جو آسمانی بادلوں میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔

اس طرح مرکز کشش موجودہ زندگی سے آئندہ زندگی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس سے عالم عقبیٰ کو کتنا ہی فائدہ پہنچا ہو لیکن اس حقیقت میں شبہ نہیں کہ عالم دنیا کو نہایت سخت اور شدید نقصان پہنچا: سیاسیات میں انحلال عمومی کی حالت پیدا ہو گئی، جن رشتوں نے عوام کو حکومت اور کنبوں سے وابستہ کر رکھا تھا وہ ڈھیلے پڑ گئے،

معاشرے کا ڈھانچا انفرادی عناصر کی طرف منتقل ہو گیا اور اس طرح از سر نو بربریت کا دور آ گیا ۔ تہذیب اسی صورت میں وجود پذیر ہوتی ہے کہ تمام شہریوں کے درمیان سرگرم تعاون پیدا ہو جائے اور وہ رضامندی سے شخصی مقاصد کو خیر مشترک کے تابع کر دیں ؛ انسانوں نے ملک کی حفاظت میں لڑنے سے انکار کر دیا بلکہ ان میں بشری جذبہ ہی باقی نہ رہا ، اپنی روحوں اور دوسروں کی روحوں کو بچانے کی غرض سامنے رکھ کر انھوں نے مادی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی جسے وہ شر سمجھ کر تباہ ہوتے دیکھنا پسند کرنے لگے ۔ اوہام کا یہ سلسلہ ایک ہزار سال تک جاری رہا ۔ قرون وسطیٰ کے اختتام پر رومی قانون ، ارسطو کا فلسفہ ، ادبیات و فنون قدیم از سر نو زندہ ہوئے تو یورپ دوبارہ زندگی اور کردار کے متعلق اپنے اصلی مقاصد کی طرف پلٹا اور اس نے دنیا کے متعلق زیادہ دانش مندانہ اور زیادہ جواں مردانہ نقطۂ نگاہ اختیار کیا ؛ تہذیب کے آگے بڑھنے میں جو طویل وقفہ آ گیا تھا ، وہ ختم ہو گیا ، مشرقی یورش کی لہریں لوٹ گئیں ، یہ ابھی تک لوٹی چلی جا رہی ہیں[1] ۔

۱۹۴۸ء میں یہ سطریں لکھی جا رہی تھی تو مذکورہ بالا لہریں پیچھے ہی ہی ہٹ رہی تھیں ۔ راقم الحروف سوچ رہا تھا کہ " سنہری شاخ "[2] کا فاضل مصنف اگر اپنی کتاب پر چوتھی اشاعت کے لیے نظر ثانی کر رہا ہوگا تو زندگی اور کردار کے وطنی نظریات کی طرف یورپ کے رجوع کے سلسلے میں بعض ان طور طریقوں کے متعلق اس کی رائے کیا ہوگی جو مذکورہ بالا اشتعال انگیز ٹکڑے کی اشاعت کے بعد اکتالیس سال میں بروئے کار آ گئے ۔ فریزر اور اس

۱- Sir J.G. Frazer ، کی کتاب : " سنہری شاخ : ایڈونس ، ایٹس ، آسی رس : مشرقی مذاہب کی تاریخ کے بعض پہلو " صفحہ ۲۵۱ - ۲۵۳ - مصنف ایک جگہ حاشیے میں اعتراف کرتا ہے کہ مشرقی مذاہب کی اشاعت ہی تہذیب قدیم کے زوال کا واحد سبب نہ تھی ۔

۲- Golden Bough ۔

کے ہم خیال معاصر بن نئے انداز کے مغربی لا مذہبوں کی اس نسل کے آخری افراد تھے جس کا ظہور پہلے پہل پندرھویں صدی میں اٹلی کے اندر ہوا تھا اور جن کا مکتب اقلیت پسند بھی تھا اور روادار بھی - ۱۹۵۲ء تک ان لوگوں کو ان بے درد ، جذباتی اور تشدد پسند جانشینوں نے میدان سے نکال باہر کیا جو غیر مذہبی مغربی معاشرے کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھرے تھے - فریزر کے الفاظ ایلفرڈ روزن برگ نے از سر نو دھرائے مگر اس کا لب و لہجہ دوسرا تھا ؛ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ روزن برگ اور فریزر دونوں ایک ہی نوع کے نظریوں کا تار و پود تیار کر رہے تھے جو پہلے گبن نے پیش کیا تھا -

ہم اس کتاب کے ابتدائی حصے میں تفصیلاً ثابت کر چکے ہیں کہ یونانی معاشرے میں بہت پہلے شکست کے آثار نمودار ہو چکے تھے اور مسیحیت یا دوسرے ان مشرقی مذاہب کی مداخلت بعد میں ہوئی جو مسیحیت کے ناکام رقیب تھے - ہماری تحقیق و تفتیش کا نتیجہ یہ تھا کہ اعلیٰ مذاہب کبھی کسی تہذیب کی موت کے مجرم قرار نہیں پائے ؛ تاہم یہ الم انگیز حادثہ تاحال امکان سے خارج نہیں ہوا ، اس مسئلے کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنی تحقیق عالم اکبر یعنی کائنات سے عالم اصغر یعنی انسان کی طرف جاری رکھنی چاہیے ، بہ الفاظ دیگر ہماری تحقیق کا رخ تاریخ ماضی کے حقائق سے فطرت انسانی کے مستقل خصائص کی طرف ہونا چاہیے -

فریزر کا دعویٰ یہ ہے کہ اعلیٰ مذاہب بنیادی طور پر مجلسی مقاصد کے خلاف ہوتے ہیں اور ان کے اس روگ کو لاعلاج سمجھنا چاہیے - سوال یہ ہے کہ اگر انسانی دلچسپیوں کا مرکز تہذیبوں کے مقاصد کی جگہ اعلیٰ مذاہب کے مقاصد کی طرف منتقل ہو جائے تو کیا یہ درست ہے کہ ان مجلسی اقدار کو لازماً نقصان پہنچتا ہے جو تہذیبوں کے پیش نظر ہوتی ہیں ؟ یعنی کیا روحانی اور مجلسی اقدار کے درمیان تضاد و تناقض کی حالت قائم ہے ؟ اگر انفرادی روح کی نجات کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دے لیا جائے تو کیا واقعی تہذیب کے نظام کی بنیاد کھو کھلی ہو جاتی ہے ؟ فریزر کے نزدیک ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے ؛ اگر اس جواب کو درست تسلیم کیا جائے تو ماں لینا چاہیے کہ انسانی زندگی ایک ایسا المیہ ہے جو آج تک کسی ناٹک میں دکھایا نہیں گیا - راقم الحروف کا عقیدہ ہے کہ فریزر کا جواب غلط ہے اس لیے کہ یہ جواب اعلیٰ مذاہب اور انسانی ارواح کی فطرت و طبیعت کے متعلق

غلط فہمی پر مبنی ہے۔

انسان نہ تو بے غرض چیونٹی ہے نہ غیر مجلسی عفریت بلکہ وہ ایک "مجلسی حیوان" ہے جس کی شخصیت دوسری شخصیتوں کے ساتھ ربط و تعلق ہی کے ذریعے سے نمایاں ہوتی اور نشو و نما پاتی ہے؛ بہ الفاظ دیگر معاشرہ ایک ایسی مشترک سرزمین کے سوا کچھ نہیں جس پر مختلف افراد کے تعلقات و روابط کا جال بچھا ہوا ہے۔ مختلف افراد کی سرگرمیوں کے سوا یہ وجود پذیر ہی نہیں ہو سکتا اور خود افراد معاشرے کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے؛ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ہم جنسوں کے ساتھ فرد کے تعلقات میں نیز خدا کے ساتھ تعلقات میں کوئی بے ربطی نہیں۔ عہد قدیم کے آدمی کا روحانی تصور سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہل قبیلہ اور دیوتاؤں کے درمیان کامل اتحاد تھا، اختلاف نہ تھا اور اہل قبیلہ کے درمیان اجنبیت پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ باہم مستحکم مجلسی رشتے قایم ہو گئے تھے۔ خدا کے تعلق میں انسان کے فرض اور ہمسایے کے تعلق میں فرض کے درمیان ربط و ضبط کی چھان بین خود فریزر کر چکا ہے اور ابتدائی دور کے انسان کی زندگی سے اس کی مثالیں سامنے آ چکی ہیں، انحلال پذیر تہذیبیں اس کے ثبوت پیش کر چکی ہیں؛ پھر کیا ہم یہ سمجھیں اس ربط و ضبط کو اعلیٰ مذاہب اختلاف و بے ربطی میں تبدیل کر دیتے ہیں جیسا کہ فریزر کہتا ہے؟ نظر و عمل دونوں کے رو سے اس کا جواب نفی ہی میں معلوم ہوتا ہے۔

استخراجی نقطۂ نگاہ سے ہم چھان بین شروع کریں تو ظاہر ہے کہ شخصیتوں کا تصور اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب ہم انہیں روحانی سرگرمیوں کے آلہ ہائے کار مان لیں اور روحانی سرگرمی کا قابل تصور دائرہ مختلف روحوں کے درمیان تعلقات پر مبنی ہے۔ انسان خدا کی تلاش میں نکلتا ہے تو ایک مجلسی عمل انجام دیتا ہے اور اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ خدا کی محبت اس دنیا میں کار فرما ہوئی اور مسیحؑ عالم انسانیت کے کفارے کے لیے آیا تو انسان کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ خدا کی مانند بنانے کی کوشش کرے جس نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا اور اس کوشش میں یہ عمل بھی شامل ہے کہ مسیحؑ کی مثال سامنے رکھتے ہوئے اپنے ہم جنسوں کے فائدے کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دے؛ لہٰذا اپنی روح کو بچانے کی کوشش کے سلسلے میں خدا کی تلاش نیز اپنے ہمسائے کے سلسلے میں ادائے فرض کی کوشش کے درمیان

تضاد و تناقض سراسر باطل ہے :

> یسوع[۴] نے اُسے کہا : خداوند کو جو تیرا خدا ہے ، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری سمجھ سے پیار کر ؛ پہلا اور بڑا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند ہے کہ تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا آپ کو[۱]۔

یہ امر محتاج تصریح نہیں کہ زمین پر مجاہد کلیسا کے ذریعے سے دنیوی معاشروں کے عمدہ مجلسی مقاصد بدرجہا زیادہ کامیابی سے پورے کیے جا سکیں گے اور خود یہ معاشرے جن کا نصب العین یہی مقاصد ہیں اور ان سے بلند تر کوئی چیز سامنے نہیں ، اس پیمانے پر کامیاب نہیں ہو سکتے ؛ بہ الفاظ دیگر اس زندگی میں انسانوں کی روحانی ترقی اپنے ساتھ جو نہایت عمدہ مجلسی ترقی لاتی ہے ، وہ کسی دوسرے ذریعے سے میسر نہیں آسکتی - بنی بن[۲] نے اپنی تمثیل میں لکھا ہے کہ زائر کی نظریں اس چھوٹے دروازے کو نہ پا سکیں جس میں سے گزر کر وہ نیک عملی کی زندگی بسر کر سکتا تھا ، اُس وقت اس دروازے کا سراغ ملا جب اس نے دور اُفق پر چمکتی ہوئی روشنی دیکھ لی[۳]۔

۱- متی کی انجیل ، باب ۲۲ ، آیت ۳۷ - ۳۹ -

۲- Bunyan -

۳- بنی ین کی کتاب کے پہلے حصے میں مسیحی زائر اور اس کے دو ساتھیوں کا کردار ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے جسے ہم ''مقدس انفرادیت'' کہ سکتے ہیں لیکن کتاب کے دوسرے حصے میں اس ناقص تصور کی اصلاح کر لی گئی ہے ؛ وہاں ہمیں زائروں کا ایک گروہ ملتا ہے جس کے افراد محض روحانی نصب العین کی طرف پیش قدمی ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ راستے میں ایک دوسرے کی دنیوی خدمات بھی انجام دے رہے تھے - اس سے موسیو نوکس (Knox) کے دل میں اس کتاب کا خیال پیدا ہوا جو اس نے ''روحوں کا کھیل'' کے نام سے لکھی - اس میں وہ بتاتا ہے کہ بنی ین نے کتاب کا پہلا حصہ راسخ العقیدہ مسیحی کی حیثیت میں مرتب کیا ، دوسرے حصے کی ترتیب کے وقت اس کی حالت بالکل بدل گئی اور اس کے پردے میں انگلستان کی ایک کیتھولک مسیحی عورت بولنے لگی -

ہم نے جو دعوے یہاں مسیحیت کی اصطلاحات میں پیش کیے ، اُن سب کو دوسرے اعلیٰ مذاہب کی اصطلاحات میں بھی منتقل کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ مسیحیت کی روح وہی ہے جو تمام اعلیٰ مذاہب میں بہ طور گروہ جاری و ساری ہے ؛ تمام اعلیٰ مذاہب مختلف دریچے ہیں جن سے خدا کی روشنی گزرتی ہوئی انسانی روحوں کو منور کرتی ہے ، ممکن ہے ان دریچوں کی شفافی اور جلوہ گزاری یا ان میں سے گزر کر آنے والی کرنوں کے انتخاب کے درجات مختلف ہوں ۔

جب ہم نظریے سے ہٹ کر عملیات کی طرف آتے ہیں اور شخصیت انسان کی فطرت کے بجائے تاریخ کے مکتوب ذخیرے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے لیے یہ ثابت کرنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے کہ مذہبی آدمیوں نے معاشرے کی عملی ضرورتوں کی خدمت بہتر طریقے پر انجام دی ہے ۔ ہم اسی سی[1] کے سینٹ فرانسیس[2] یا سینٹ ونسنٹ دی پال[3] یا جان ویسلے[4] یا ڈیوڈ لونگ سٹون[5] کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں لیکن اندیشہ ہے ہمیں طعنہ دے دیا جائے گا کہ ہم ایک ایسی چیز ثابت کر رہے ہیں جو کسی ثبوت کی محتاج نہیں لہٰذا ہم اس طبقے کے افراد کی مثالیں پیش کریں گے جنھیں قاعدے میں مستثنیات کی حیثیت حاصل ہے اور عام طور پر ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے ۔ اس طبقے کے آدمیوں کو ایک طرف ”خدامست“ اور دوسری طرف ”مجلسی دشمن“ قرار دیا جاتا ہے یعنی وہ مقدس بھی ہیں اور مضحکہ خیز بھی ؛ انھیں سنکی کی اس پھبتی کا پیکر سمجھنا چاہیے ”اچھے آدمی مگر اس لفظ کے بدترین معنی میں“ ، میرا اشارہ مسیحی جوگیوں کی طرف ہے جیسے سینٹ انٹونی[6] اپنے صحرائی علاقے میں یا سینٹ سائمون[7] اپنے ستون کے اوپر ۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ہم جنسوں

۱- Assisi اٹلی کا ایک مقام (مترجم) ۔
۲- Francis (۱۱۸۲ء - ۱۲۲۶ء) ایک اطالوی پادری (مترجم) ۔
۳- Vincent de Paul (۱۵۷۶ء - ۱۶۶۰ء) ایک فرانسیسی پادری (مترجم) ۔
۴- John Wesley (۱۷۰۳ء - ۱۷۹۱ء) ایک انگریز مبلغ مسیحیت (مترجم) ۔
۵- Livingstone (۱۸۱۳ء - ۱۸۷۳ء) مشہور سکاٹ پادری ، ڈاکٹر اور مکتشف (مترجم) ۔
۶- Antony ۔ ۷- Symeon ۔

سے کامل علحدگی اختیار کر لی تھی لیکن نتائج پر نظر رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ زیادہ گہرے اور سرگرم تعلقات کا آغاز کر رہے تھے اور ان تعلقات کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اگر وہ کنارہ کش نہ ہوتے اور دنیوی مشاغل میں اپنی زندگیاں گزار دیتے تو یہ دائرہ اتنا وسیع نہ ہوتا ؛ انھوں نے اپنی خلوت گاھوں میں بیٹھ کر دنیا پر اتنا گہرا اثر ڈالا جو کوئی شہنشاہ اپنے دارالحکومت میں بیٹھ کر نہ ڈال سکتا تھا ؛ خدا سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش میں انھوں نے جو تقدس حاصل کیا ، وہ دراصل مجلسی فعل ھی کی ایک شکل تھی اور اس فعل سے انسانوں پر ایسا زوردار اثر ڈالا جو سیاسی سطح پر کوئی دنیوی مجلسی خدمت نہ ڈال سکتی تھی :

> بعض اوقات کہا گیا ہے کہ مشرق رومی کا راہبانہ نصب العین وقت کی دنیا سے بے نتیجہ کنارہ کشی کے سوا کچھ نہیں تھا - - - - خیرات بانٹنے والے جان کی سرگزشت سے پتا چلایا جا سکتا ہے کہ بزنطینی اپنی انتہائی مصیبت کے وقت میں خود بخود اس راہب کی طرف امداد اور دل جمعی کے لیے متوجہ ہوئے اس لیے کہ اسی سے پوری همدردی اور دست گیری کا یقین تھا - - - - بزنطینی راہبیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مجلسی انصاف کا زبردست جذبہ موجزن تھا ، وہ غریبوں اور مظلوموں کی حمایت کے لیے برابر تیار رہتی تھی[۱]-

۲- مذھبی نظام بہ حالت تکوین

ہم نے اس رائے سے اختلاف کیا کہ مذھبی نظام سرطان کی حیثیت رکھتے ھیں جو تہذیب کے زندہ ریشوں کو کہا جاتا ہے لیکن فریزر کی کتاب سے جو اقتباس اوپر پیش کیا جا چکا ہے ، اس کے آخری حصے کے نظریے سے ہم اب بھی

۱- ای ڈاز (Dawes) اور این - ایچ بینس (Baynes) کی کتاب ''تین بزنطینی ولی'' (Three Byzntine Saints) مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۴۸ء ، صفحہ ۱۹۷ - ۱۹۸ -

اتفاق کر سکتے ھیں یعنی یہ کہ یونانی معاشرے کے آخری دور میں مسیحیت کی جو لہریں بہ صورت مد بڑھی چلی آ رھی تھیں ، اُن پر جزر کی کیفیت طاری ھو گئی اور وہ پیچھے کی طرف لوٹ گئیں ؛ نیز مسیحیت اختیار کر چکنے کے بعد مغرب میں جو معاشرہ بروے کار آیا ، وہ اسی نوع کا تھا جس نوع کا یونانی معاشرہ مسیحیت سے پہلے تھا - اس رائے سے مذھبی نظاموں اور تہذیبوں کے درمیان تعلق کا دوسرا ممکن تصور سامنے آ جاتا ھے - اس بارے میں موجودہ دور کے ایک فاضل نے اپنا خیال بہ الفاظ ذیل پیش کیا ھے :

> پرانی تہذیب کی تقدیر پر مہر لگ چکی تھی - - - - اس کے برعکس آرتھوڈکس مسیحی کے نزدیک کلیسا کو ھارون کی حیثیت حاصل تھی - زندگی اور موت کے درمیان جسے ھم موجودہ دنیا اور آئندہ دنیا کی درمیانی منزل قرار دے سکتے ھیں ، یہ مسیح[۴] کا جسم تھا اس لیے ھمیشہ قائم رھنے والا تھا - یہ ایسی چیز تھی جس کے لیے جینا اور کام کرنا واقعی قابل قدر معلوم ھوتا تھا ، اسے دنیا سے بھی ویسا ھی تعلق تھا جیسا سلطنت سے ؛ یوں کلیسا کا نظریہ ایک بیش بہا مرکزی نقطہ بن گیا جس کے ارد گرد نئی تہذیب نے تدریجاً واضح صورت اختیار کی[۱]۔

اس نظریے کے مطابق ھمہ گیر مذھبی نظاموں کی علت بقا سامنے آ جاتی ھے ؛ ھم جن معاشروں کو تہذیبیں کہتے ھیں ، یہ نظام ان کی زندگی کے بیش بہا جوھر کو اس خطرناک دور خلا میں زندہ رکھتے ھیں جو تہذیبوں کے ایک فانی نمائندے کی بربادی اور دوسرے کی پیدائش کے درمیان وقوع پذیر ھوتا ھے - یوں ھم کہ سکتے ھیں کہ مذھبی نظام کو تہذیبوں کے سلسلۂ پیدائش کا ایک حصہ سمجھنا چاھیے یعنی ایک تتلی اور دوسری تتلی کے درمیان تین حالتیں پیش آتی ھے : پہلے انڈا بنتا ھے پھر اس کے اندر وجود کی ابتدائی تشکیل عمل میں آتی ھیں ، آخر یہ وجود پیلے کی حیثیت اختیار کرتا ھے - راقم الحروف کو اعتراف کرنا چاھیے کہ وہ تاریخ میں مذھبی نظاموں کے

۱- ایف - سی - برکیٹ (Burkitt) کی کتاب ابتدائی مشرقی مسیحیت (Early Eastern Christianity) ، صفحہ ۲۱۰ - ۲۱۱ -

کار منصبی کے متعلق اس نظریے پر سالہا سال سے مطمئن ہے جسے ایک حد تک مربیانہ اور سرپرستانہ نظریہ[1] سمجھا جا سکتا ہے اور وہ اب تک اسی تصور کو درست سمجھتا ہے کہ مذہبی نظاموں کی حیثیت پہلے کی ہے نہ کہ سرطان کی لیکن اس کا یہ عقیدہ بھی ہو گیا ہے کہ مذہبی نظاموں کے متعلق حقیقت کا یہ صرف ایک معمولی پہلو ہے، اب ہمیں اس پہلو کی چھان بین کرنی چاہیے۔

جو تہذیبیں ۱۹۵۲ء تک زندہ تھیں، اگر ہم اُن پر ایک نظر ڈالیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اُن میں سے ہر ایک کے پس منظر میں کوئی ہمہ گیر مذہبی نظام موجود تھا جس کے ذریعے سے ہر تہذیب کسی قدیم‌تر تہذیب سے ملحق ہوئی: مغربی تہذیب اور آرتھوڈکس مسیحی تہذیب دونوں مسیحی کلیسا کے ذریعے سے یونانی تہذیب کے ساتھ وابستہ ہوئیں، مشرق بعید کی تہذیب نے مہایان کے ذریعے سے چینی تہذیب کے ساتھ وابستگی پیدا کی، ہندو تہذیب نے ہندویت کے ذریعے سے ہندی تہذیب کے ساتھ رشتہ جوڑا، ایرانی تہذیب اور عربی تہذیب دونوں نے اسلام کے واسطے سے سریانی تہذیب کے ساتھ الحاق پیدا کیا؛ غرض ان تمام تہذیبوں کی حالت پہلگی میں کوئی نہ کوئی مذہب ضرور کارفرما تھا اور معدوم تہذیبوں کے جو بچے کھچے اجزا مختلف شکلوں میں باقی ہیں اور اُن پر ہم کتاب کے ابتدائی حصے میں بحث کر چکے ہیں، وہ سب مذہبی کھال اور پوست ہی کی شکل میں محفوظ رہے

۱- جس قلب میں روحانیت کے لیے ذکاوت حس موجود ہو، اس میں یہ نظریہ اطمینان کے بجائے رنج و قلق پیدا کرتا ہے: ''ایک معیاری تہذیب معرض شکست میں آ گئی، مسیحیت یسوع مسیح[۴] کے پاکیزہ مذہب کی حامل نہ رہی بلکہ ایسا مذہب بن گئی جو انتشار پذیر دنیا کے لیے مجلسی سیمنٹ کے طور پر مفید ہو سکتا تھا۔ اسی حیثیت میں اس نے قرون مظلمہ کے بعد مغربی یورپی تہذیب کی پیدایش نو میں امداد دی، یہ ہوشیار اور بے چین اقوام کے برائے نام عقیدے کی حیثیت میں اب تک قائم ہے، اس کے مقاصد کے ساتھ زبانی ہمدردی کے لیے بھی تیار نہیں؛ باقی رہا اس کا مستقبل تو اس کے بارے میں کون پیش گوئی کر سکتا ہے؟ (بارنس کی کتاب ''مسیحیت کا ظہور''، صفحہ ۳۳۶)۔

مثلاً یہودی اور پارسی - ان بچے کھچے اجزاء کو ہم مذہبی نظاموں کے ایسے ''پیلے'' قرار دے سکتے ہیں جو ''تتلی'' کی شکل اختیار کرنے میں ناکام رہے - جس عمل کے ذریعے سے کوئی تہذیب پیشرو کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، مذہبی نظام کو پیلہ مان کر اس کا تجزیہ کیا جائے تو تین حالتیں سامنے آتی ہیں جیسا کہ آئندہ پیش ہونی والی مثالوں کے جائزے سے واضح ہوگا، ہم انہیں ''خیال سازی''، ''حمل سازی'' اور ''قرب ولادت'' سے تعبیر کر سکتے ہیں- ترتیب تاریخی کے اعتبار سے ہم انہیں تین حالتوں کے برابر گردان سکتے ہیں: اول تہذیب قدیم کی حالت انحلال، دوم حالت خلا اور سوم نئی تہذیب کی حالت پیدائش -

عمل الحاق کے سلسلے میں حالت ''خیال سازی'' اس وقت شروع ہوتی ہے جب مذہبی نظام غیر مذہبی ماحول کے مہیا کردہ مواقع سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہوتا ہے؛ اس ماحول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہمہ گیر سلطنت زندگی کے بہت سے اداروں اور طریقوں کو ناگزیر طور پر معطل کر کے رکھ دیتی ہے جن سے معاشرے کے دور ارتقاء ہی میں نہیں بلکہ دور مصائب میں بھی روح حیات کو غذا ملتی رہتی ہے - ہمہ گیر سلطنت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کامل امن و سکون پیدا ہو جائے لیکن مصیبتوں سے نجات کی جو صورت پیدا ہوتی ہے، اس میں ناکامی و نامرادی کے اجزاء بھی مل جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ زندگی محض توقف اور ٹھہراؤ ہی سے اپنی حفاظت کا فرض انجام نہیں دے سکتی - اس صورت حال میں ابھرتا ہوا مذہبی نظام ساکن دنیوی معاشرے کی حد درجے مطلوب خدمت انجام دے کر خود اپنی زندگی بنا سکتا ہے، وہ انسانیت کی رکی ہوئی سرگرمیوں کے لیے نئی راہیں کھول سکتا ہے - رومی سلطنت میں:

> لا مذہبی پر مسیحت کی فتح نے خطیب کے لیے خطاب و تقریر کے نئے عنوان مہیا کر دیے، منطقی کے لیے بحث و استدلال کے نئے نکتے پیدا ہو گئے؛ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ذریعے سے وہ اصول سامنے آگئے جن کی کارفرمائی معاشرے کے ہر حصے میں مسلسل محسوس کی جا رہی تھی، اس نے ٹھہرے ہوئے مواد کو اندرونی گہرائیوں سے اٹھا کر اوپر اچھال دیا، دور دور تک پھیلی ہوئی سلطنت کی

بے پروا آبادی میں ہنگامہ خیز جمہوریت کے جذبات برانگیختہ کر دیے، ارتداد کے خوف نے وہ کام انجام دیا جو ظلم کا احساس انجام نہ دے سکتا تھا؛ اس نے انسانوں کی کایا پلٹ ڈالی، وہ بھیڑوں کی طرح ایک جابر سے دوسرے جابر کے ہاتھوں میں منتقل ہونے کے عادی تھے، اب وہ کلیسا کے سرگرم حامی اور سلطنت کے زبردست باغی بن گئے؛ جس فصاحت و بلاغت کی صدائیں نسلوں سے آسودگی کی آغوش میں سوئی پڑیں تھیں، وہ گریگوری کے منبر سے اٹھ کر ہر جگہ گونجنے لگیں، جس روح کا چراغ فلپی کے میدانوں میں گل ہوا تھا، وہ اتھاناسئس[1] اور امبروز[2] کے ذریعے سے از سرنو زندہ ہو گئی[3]۔

یہ فقرے جتنے فصیح اور بلیغ ہیں اتنے ہی سچائی پر مبنی ہیں لیکن ان کا تعلق دوسری حالت سے ہے جسے ہم ''حالت حمل سازی'' قرار دے چکے ہیں۔ پہلی حالت نے جو فتح سے پیشتر کی کشمکش کے ساتھ تعلق رکھتی تھی، عام مردوں اور عورتوں کو اعلٰی قربانیوں کا روح افزا موقع دے دیا تھا؛ یہ قربانیاں اس زمانے میں ان لوگوں کے آبا و اجداد کے لیے عظمت و شان اور المیے کی حیثیت رکھتی تھیں جب رومی سلطنت نے دور مصائب کو ختم کر کے ہر طرف بے کیف امن پیدا نہیں کیا تھا۔ یوں ''خیال سازی'' کی حالت میں مذہبی نظام وہ سرگرمیاں اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جنھیں حکومت نہ آزاد چھوڑتی ہے اور نہ ان سے کام لیتی ہے؛ ساتھ ہی یہ نظام ایسی نئی راہیں پیدا کر دیتا ہے جن پر یہ سرگرم قوتیں گامزن ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد حالت ''حمل سازی'' آتی ہے تو مذہبی نظام کا دائرہ عمل بہت وسیع ہو جاتا ہے؛ یہ ان ممتاز افراد کو اپنی خدمت کے لیے کھینچ لیتا ہے جن کی صلاحیتیں دنیوی نظام میں کامیاب کارفرمائی کا موقع نہ پا سکیں، لوگوں کی بہت بڑی تعداد

۱- Athanasius چوتھی صدی مسیحی میں آرتھوڈکس مسیحیت کا بہت بڑا حامی (۲۹۶ء - ۳۷۲ء) (مترجم)۔

۲- Ambrose اس کے حالات پہلے لکھے جا چکے ہیں (مترجم)۔

۳- لارڈ میکالے کا مقالہ تاریخ پر۔

یکایک ابھرتے ہوئے ادارے میں شامل ہو جاتی ہے ۔ پھر یہ اسی رفتار سے آگے بڑھتا ہے جس رفتار سے انحلال پذیر معاشرہ اپنے انجام کی طرف پیش قدمی کرتا ہے ، اس کی ترقی کا دائرہ بھی انحلال پذیر معاشرے کے دائرۂ تنزل کے عین مطابق ہوتا ہے ؛ مثال کے طور پر انحلال پذیر چینی تہذیب میں مہایان کی کامیابی دریائے زرد کے طاس میں بدرجہا زیادہ مکمل تھی جسے یوریشیائی خانہ بہ دوش پامال کر چکے تھے ، دریائے ینگسی کے طاس میں مہایان کو کامیابی کا وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا اس لیے کہ وہاں طویل مدت تک حملہ آوروں کا مقابلہ جانبازی سے ہوتا رہا ۔ اسی طرح یونانی دنیا میں لاطینی صوبوں کے باشندوں نے جوق در جوق چوتھی صدی مسیحی میں مسیحیت اختیار کر لی ، اسی زمانے میں مرکز حکومت منتقل ہو کر قسطنطنیہ چلا گیا اور مغربی صوبوں کو عملاً نظر انداز کر دیا گیا ؛ انحلال پذیر سریانی دنیا میں اسلام کی ترقی اور انحلال پذیر ہندی دنیا میں ہندویت کی ترقی سے بھی انھیں کوائف کا اظہار ہوتا ہے ۔

ایک ہمہ گیر مذہبی نظام نے حالت ”قرب ولادت“ میں ایک ابھرنے والی تہذیب کے لیے اقتصادی سطح پر جو نہایت موثر و معتبر میراث چھوڑی ، اس کا نظارہ ہم معاصر مغربی دنیا کی زبردست اقتصادی قوت میں کر سکتے ہیں ۔ نیا غیر مذہبی معاشرہ مغرب کے کیتھولک مسیحی کلیسا کے ”پیلے“ سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش مدت دراز سے کر رہا تھا ؛ یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت یہ عمل آزادی کم و بیش اڑھائی سو سال میں منزل تکمیل پر پہنچا لیکن آپ غور فرمائیں کہ مغربی صنعت و حرفت کے حیرت انگیز اور دیو پیکر ڈھانچے میں اب بھی ایسے آثار نمایاں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مغربی مسیحیت کی راہبیت کی ایک ضمنی پیداوار ہے ۔ اس عظیم الشان مادی عمارت کی نفسیاتی بنیاد و اساس یہ عقیدہ ہے کہ جسمانی محنت و ریاضت ایک فرض ہے اور اس ریاضت کا اعزاز و احترام لازم ہے ۔ محنت کے متعلق یونانی تصور یہ تھا کہ یہ پایۂ ثقاہت سے گرا ہوا مشغلہ ہے اور اس میں انسان کی تذلیل ہوتی ہے ۔ دیکھیے یونانی تصور سے یہ انقلابی انحراف کبھی عمل میں نہ آتا اگر سینٹ بینی ڈکٹ کی وجہ سے محنت و ریاضت کو تقدس کا درجہ نہ مل چکا ہوتا ؛ اسی بنیاد پر بینی ڈکٹ کے نظام راہبی نے مغرب کی اقتصادی زندگی کا زرعی نظام

تیار کیا اور اسی کی بنا پر سسطرونی نظام راہبی[1] کی دانشمندانہ سرگرمیوں نے صنعت و حرفت کا بالائی ڈھانچہ منضبط کر دیا یہاں تک کہ راہبوں کے بتائے ہوئے اس "منارۂ بابل" کے متعلق دنیا دار ہمسایوں کی حرص کمال پر پہنچ گئی اور وہ اپنی دراز دستیوں کو زیادہ دیر تک روک نہ سکے؛ خانقاہوں کی غارت‌گری مغرب کی موجودہ سرمایہ دارانہ اقتصادیات کا ایک ابتدائی سرچشمہ تھی۔

باقی رہا سیاسی دائرہ تو ہم اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں دیکھ چکے ہیں کہ پاپائیت ایک ایسی مسیحی جمہوریت تیار کر رہی تھی کہ جس کے ماتحت عالم انسانیت کو یہ موقع مل سکتا تھا کہ وہ محدود حکمرانیوں اور ہمہ‌گیر سلطنتوں دونوں کے فوائد سے بہ یک وقت بہرہ مند ہوتی رہے، نیز دونوں کے نقائص سے محفوظ رہے۔ کلیسائی تاج پوشی کے ذریعے سے آزاد بادشاہوں کی سیاسی حیثیت کو اپنی برکتوں سے مشرف رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ پاپائیت سیاسی زندگی میں وہی تعدد اور تنوع واپس لا رہی تھی جو یونانی معاشرے کے دور نشو و ارتقاء میں بہت بارور ہوا تھا، جس سیاسی نا اتفاق اور نزاعات نے یونانی معاشرے کے لیے تباہی کے اسباب مہیا کیے تھے، اسے بالادست روحانی اختیار و اقتدار سے کم کرنا اور قابو میں رکھنا منظور تھا اور معلوم ہے کہ پاپائیت رومی سلطنت کی مذہبی جانشین کی حیثیت میں پورے روحانی اختیار و اقتدار کی مدعی تھی؛ گویا متفرق دنیوی بادشاہوں کے بارے میں یہ راہ عمل طے ہو چکی تھی کہ وہ ایک مذہبی چوپان کے زیر ہدایت مل جل کر رہیں گے۔ کئی صدیوں کی آزمایشوں اور غلط کاریوں کے بعد یہ سیاسی و مذہبی تجربہ ناکام ثابت ہوا اور اس کی ناکامی کے اسباب پر کتاب کے ابتدائی حصے میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں اس کا ذکر صرف اس لیے آیا کہ مسیحی کلیسا نے حالت "قرب ولادت" میں جو کار منصبی انجام دیا، اس کی کیفیت واضح ہو جائے۔ اسی طرح ابھرتی ہوئی ہندو تہذیب کے سلسلے میں

۱۔ Cistercian یہ ایک راہبانہ نظام تھا جس کی بنیاد گیارھویں صدی عیسوی میں سنیٹ بینی ڈکٹ کے قائم کردہ نظام کے ایک فرد نے رکھی۔ وہ کہتا تھا کہ بینی ڈکٹ کے اصول و قواعد کی پابندی نہیں کی جاتی؛ گویا یہ بینی ڈکٹ کے نظام کو ازسرنو اصل شکل میں زندہ کرنے کی ایک تحریک تھی۔

سیاسی یک جہتی کے متعلق برھمنوں کی مذھبی برادری نے بھی یہی کار منصبی انجام دیا تھا ؛ برھمنوں نے راجپوت حکمران خاندانوں کی حکومتیں اسی طرح جائز و درست تسلیم کر لیں جس طرح مسیحی کلیسا نے کاووس[1] یا پیپن[2] کی حکومت درست تسلیم کر لی تھی -

جب ہم آرتھوڈکس مسیحیت میں مسیحی کلیسا کے اور مشرق بعید میں مہایان کے سیاسی کارمنصبی کا جائزہ لیتے ھیں تو معلوم ھوتا ھے کہ ان دونوں معاشروں میں مذھبی نظاموں کی سرگرمیاں سابقہ تہذیب کی ریاست ھائے عام کے بھوت ازسرنو زندہ کر لینے کی وجہ سے محدود ھو گئی تھیں ——— چین کی ھن سلطنت میں سوئی[3] اور تیانگ[4] کا احیا اور روسی سلطنت میں بیز نطین (مشرق روم) کا احیا - مشرق بعید کے معاشرے میں مہایان کو نئی جگہ مل گئی ، وہ متعدد مذھبوں اور فلسفوں میں سے ایک تھا جو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو عوام کے ایک ھی انبوہ کی روحانی ضروریات پوری کر رھے تھے - مہایان نے مشرق معاشرے کی زندگی میں اپنا کام چپ چاپ جاری رکھا اور ثقافتی اعتبار سے کوریا اور جاپان کو مشرق بعید کے ھم فکر و ھم عقیدہ بنانے میں حصہ لیا ؛ یہاں مہایان کا کام ویسا ھی تھا جو ھنگری ، پولینڈ اور سکنڈینیویا کو مغربی مسیحیت کے دائرے میں لانے کے لیے مغرب کے کیتھولک کلیسا نے یا آرتھوڈکس مسیحی تہذیب کی ایک شاخ روس کی سر زمین میں لگا دینے کے لیے مشرق کے آرتھوکس کلیسا نے انجام دیا -

جب ھم سیاسی دائرے سے ھٹ کر ثقافتی دائرے پر متوجہ ھوتے ھیں اور یہ دیکھتے ھیں کہ مذھبی نظاموں نے حالت "قرب ولادت" میں ابھرتی ھوئی تہذیب کے لیے کیا ثقافتی خدمات انجام دیں تو ھمیں معلوم ھوتا ھے کہ مثلاً مہایان کو سیاسی دائرے سے خارج کر دیا گیا تو اس نے ثقافتی دائرے

۱- Clovis ، فرانس کا بادشاہ جو اول اس لیے مشہور ھے کہ اس نے مسیحیت اختیار کی ، دوسرے اس وجہ سے مشہور ھے کہ اس نے بڑی فتوحات حاصل کیں (۴۶۷ء - ۵۱۱ء) (مترجم) -

۲- Pepin ، شارلیمن کا باپ ، وفات ۷۶۸ء (مترجم) -

۳- Sui -

۴- T'ang -

میں اپنی موثر حیثیت ازسرنو بحال کر لی ؛ پائدار ذہنی قوت مہایان کی اس میراث کا ایک حصہ تھی جو اسے فلسفے کے ابتدائی بدھ دبستان سے ملی تھی - اس کے برعکس مسیحیت کے پاس اپنا کوئی فلسفیانہ نظام نہ تھا اور وہ ہنر مندی کا ایک عجیب و غریب کارنامہ دینے پر مجبور ہوئی یعنی اس نے اپنا عقیدہ یونانی دبستانوں کی اجنبی ذہنی اصطلاحات میں پیش کیا - مغربی مسیحیت میں یونانی علوم کی یہ آمیزش بارھویں صدی عیسوی میں اور بھی مستحکم و پائدار ہو گئی جب ارسطو کے قبول پر مہر تصدیق لگ گئی اور اس کی وجہ سے یونانی علوم کو تقویت پہنچی - مسیحی کلیسا نے یونیورسٹیاں قائم کر کے اور ان کی تربیت کا انتظام فرما کر مغرب میں ذہنی ترقی کی نہایت عمدہ خدمت انجام دی لیکن کلیسا کے ثقافتی اثر سب سے بڑھ کر فنون لطیفہ کے دائرے میں نمایاں ہوا ؛ یہ بیان اس درجہ روشن ہے کہ کوئی مثال پیش کرنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے -

ہم مذہبی نظاموں کے اس کارہائے منصبی کا جائزہ مکمل کر چکے ہیں جو وہ حالت "پیلگی" میں انجام دیتے ہیں لیکن اگر ہم کسی بلند منظر پر پہنچ جائیں جہاں سے وہ تمام تہذیبیں جو تاریخ سے روشناس ہو چکی ہیں، ایک دوسری کے ساتھ ربط و تعلق کی حالت میں بہ یک وقت دیکھی جا سکیں تو ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگے گی کہ صرف مذہبی نظاموں کے "پیلے" ہی کسی تہذیب کو پیشرو سے وابستہ کرنے کا واحد ذریعہ نہیں - ایک مثال لے لیجیے : یونانی معاشرہ منوی معاشرے سے ملحق ہوا لیکن ہمارے سامنے کوئی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر سمجھا جا سکے کہ منوی دنیا کے اندر کسی بھی مذہبی نظام نے نشو و نما پائی تھی اور اس نے یونانی معاشرے کے لیے "پیلے" کا کام انجام دیا ؛ ابتدائی دور کی بعض تہذیبوں کے داخلی پرولتار میں اعلیٰ مذاہب ناقص و نامکمل شکل میں ضرور نمودار ہوئے (اور ممکن ہے دوسری تہذیبوں میں بھی نمودار ہوئے ہوں جن کا سراغ دور حاضر کے محقق اب تک نہیں لگا سکے) لیکن یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی نامکمل خاکہ وہ درجہ حاصل نہ کر سکا جس کی بنا پر بعد میں آنے والی تہذیب کے لیے "پیلے" کا وظیفہ انجام دے سکتا - ہمارے سامنے جتنی مثالیں موجود ہیں، ان کے معائنے سے واضح ہوتا ہے کہ دوسرے دور کی تہذیبوں ——— یونانی ، سریانی ، ہندی وغیرہ ———

میں سے کوئی بھی مذہبی نظام کے واسطے سے پیشرو کے ساتھ وابستہ نہ ہوئی اور تمام معلوم ہمہ گیر مذہبی نظاموں نے دوسرے دور کی تہذیبوں کے انحلال پذیر مجلسی ڈھانچوں میں نشو ونما پائی ۔ اب تیسرے دور کی تہذیبوں کو پیش نظر لائیے ؛ ان میں سے متعدد معرض شکست میں آ چکی ہیں یا دور انحلال میں داخل ہیں (اور ممکن ہے سب کا انجام یہی ہو) تاہم ان میں سے کسی میں بھی مذہبی نظاموں کی دوسری فصل کاشت ہونے کی قابل قبول شہادت نہیں ملتی ۔

غرض ہمارے سامنے جو تاریخی سلسلہ ہے ، اسے یوں ترتیب دیا جا سکتا ہے :

۱۔ ابتدائی دور کے معاشرے ۔
۲۔ پہلے دور کی تہذیبیں۔
۳۔ دوسرے دور کی تہذیبیں ۔
۴۔ ہمہ گیر مذہبی نظام ۔
۵۔ تیسرے دور کی تہذیبیں۔

اس نقشے کو سامنے رکھ کر ہم اس سوال پر غور کر سکتے ہیں کہ آیا مذہبی نظام ایک خاص دور کی تہذیبوں کے لیے نسل کشی کی سہولتیں بہم پہنچانے کے علاوہ بھی کچھ ہیں یا نہیں ؟

۳۔ مذہبی نظام معاشروں کی اعلیٰ صنف کی حیثیت میں

(الف) <u>ایک نئی گروہ بندی :</u> ہم اب تک اس مفروضے کی بنا پر غور و فکر کرتے رہے ہیں کہ تہذیبوں کو تاریخ میں ممتاز ترین درجہ حاصل ہے اور مذہبی نظاموں کے کار منصبی کو صرف ضمنی اور تبعی درجہ دیا جا سکتا ہے ، خواہ اس کار منصبی کو مزاحم (سرطان) سمجھا جائے یا معاون ''پیلہ'' ۔ آئیے اب اس پہلو پر غور کریں کہ ممکن ہے مذہبی نظاموں کو ممتاز ترین حیثیت حاصل ہو اور ممکن ہے تہذیبوں کی سرگزشتوں کو ان کی تقدیروں کے نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ مذہب کی تاریخ پر ان کے اثرات و عواقب کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اور تعبیر کرنا درست ہو ۔ ہو سکتا ہے یہ خیال نیا اور مبنی بر تناقض معلوم ہو لیکن تاریخ تک رسائی کا یہی طریقہ تھا جو اس مجموعۂ کتب کے سلسلے میں استعمال کیا گیا جسے ہم بائبل کہتے ہیں ۔

اس نظریے کے مطابق ہمیں تہذیبوں کی علت بقا کے تعلق میں اپنے تمام

سابقہ مفروضات پر نظر ثانی کرنی چاہیے؛ ہمیں یوں سوچنا چاہیے کہ دوسرے دور کی تہذیبیں نہ اس غرض سے وجود پذیر ہوئی تھیں کہ اپنے مخصوص کارنامے انجام دیں نہ ان کی وجود پذیری کا یہ سبب تھا کہ تیسرے دور کے لیے اپنی ہم جنسیں پیدا کریں ، ان کی غایت صرف یہ تھی کہ مکمل اعلیٰ مذاہب کی پیدائش کے لیے سازگار مواقع بہم پہنچاویں - چونکہ اعلیٰ مذاہب کی پیدائش دوسرے دور کی تہذیبوں کے انحلال اور شکست و ریخت کا نتیجہ تھی لہٰذا ان کی سرگزشتوں کے آخری ابواب کو ——— وہ ابواب جن سے ان کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ناکامی و نامرادی ٹپکتی ہے ——— اہمیت کے مستحق سمجھنا چاہیے ؛ اس طرح ہمیں ابتدائی تہذیبوں کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ وہ بھی اسی غرض سے وجود میں آئی تھیں - اپنے جانشینوں کے برعکس ابتدائی دور کی تہذیبیں مکمل مذہبی نظاموں کو جنم نہ دے سکیں ، ان کے داخلی پرولتار نے جو نامکمل اعلیٰ مذاہب پیدا کیے ——— تموز اور اشتر کی پرستش ، نیز آسی رس اور آئی زیز کی پرستش ——— وہ بارآور نہ ہو سکے لیکن ان تہذیبوں نے دوسرے دور کی تہذیبوں کو جنم دے کر اپنا وظیفہ بالواسطہ پورا کر دیا جن کی آغوش میں مکمل مذہبی نظام رونما ہوئے اور ابتدائی دور کی تہذیبوں نے جو ناقص مذہبی نظام پیدا کیے تھے ، انھوں نے دوسرے دور کے اعلیٰ مذاہب کی تخلیق کے لیے تحریک کے ذریعے سے اپنا فرض انجام دے دیا -

اس تشریح کے مطابق پہلے دور اور دوسرے دور کی تہذیبوں کا اٹھنا اور گرنا ، ابھرنا اور ڈوبنا دراصل ایک ترنم کے مختلف اجزاء کی حیثیت رکھتا ہے ——— جس کا مشاہدہ ہم دوسرے سلسلوں میں کر چکے ہیں ——— گویا پہیے کی مسلسل گردش اس گاڑی کو بڑھاتی جا رہی ہے جسے پہیے نے اٹھا رکھا ہے - اگر ہم یہ سوال کریں کہ تہذیب کے پہیے کی گردش میں جو نزولی حرکت ہے ، وہ کیوں کر مذہب کی گاڑی کو آگے بڑھانے کی موجب بنتی ہے تو اس کے جواب میں یہ حقیقت ابھر کر ہمارے سامنے آ جائے گی کہ مذہب ایک روحانی حرکت ہے اور روحانی ترقی ایک قانون کے تابع ہے جسے ایسچیلس[1] نے دو لفظوں میں پیش کر دیا تھا اور جس

۱- Aeschylus ، ایک مشہور یونانی ڈراما نگار (۵۲۵ ق-م—۴۵۶ ق-م) (مترجم)

کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تکلیف کا تختۂ مشق بن کر سبق حاصل کرتے ہیں۔ اگر ہم روحانی زندگی کی فطرت کے اس وجدان کا اطلاق اس روحانی جدوجہد پر کریں جس نے مسیحیت اور اس جیسے دوسرے اعلیٰ مذاہب ——— مہایان اسلام اور ہندویت ——— کے ظہور کی شکل میں درجۂ کمال حاصل کیا، تو ہم پر واضح ہوگا کہ تموز، ایٹس، ایڈونس اور آسی رس کا عشق بھی مسیح[۴] کے عشق ہی کی ایک جھلک تھا۔

مسیحیت روحانی ابتلا کے اس دور میں پیدا ہوئی تھی جو یونانی تہذیب کی شکست و ریخت کا نتیجہ تھا لیکن اسے ایک طویل داستان کا صرف آخری باب قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسیحیت کی جڑیں یہودیت اور زرتشتیت تک پہنچتی تھیں اور یہ جڑیں دوسرے دور کی دو اور تہذیبوں کی شکست میں پیدا ہوئی تھیں یعنی بابلی تہذیب اور یونانی تہذیب۔ اسرائیل اور یہودیہ کی بادشاہیاں جن میں یہودیت کے سر چشمے ملتے ہیں، سریانی دنیا کی بہت سی متحارب صوبائی حکومتوں میں سے تھیں، ان پر دنیوی حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیا گیا، ان کے سیاسی عزائم ختم کر دیے گئے؛ ان تلخ تجربات کی آغوش میں یہودیت نے جنم لیا، اس کا بلند ترین مظاہرہ ''مصیبت زدہ خادم'' کے نوحوں میں ملتا ہے[۱] جو چھٹی صدی قبل مسیح میں سریانی دور مصائب کے آخری ہنگاموں اور ہخامنشی سلطنت کے قیام کے وقت مرتب ہوئے۔

لیکن اسے داستان کا آغاز نہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ مسیحیت کی یہودائی جڑ کے ساتھ ایک موسوی جڑ بھی تھی اور اسرائیل و یہودا کے مذہب کا یہ پیغمبرانہ دور ایک سابقہ دنیوی حادثۂ عظیم کا نتیجہ تھا یعنی مصر میں نئی سلطنت کا انحلال جس کے داخلی پرولتار میں بنی اسرائیل بھی اپنی روایات کے مطابق جبراً شامل کر لیے گئے تھے۔ انہیں روایات میں بتایا گیا ہے کہ یہودی تاریخ کے مصری دور سے پیشتر ایک سمیری دور بھی گزر چکا تھا

۱۔ اس قسم کے بہت سے ٹکڑے یسعیاہ ثانی میں ملتے ہیں خصوصاً باب ۵۳ میں (مصنف)۔ یسعیاہ ثانی سے مراد کتاب یسعیاہ کا وہ حصہ ہے جو چالیسویں باب سے آخر تک ہے۔ محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ حصہ یسعیاہ نبی کا نہیں ہو سکتا بلکہ بعد میں ایک فرد یا مختلف افراد نے مرتب کیا۔ (مترجم)۔

جس میں حضرت ابراہیمؑ ایک خدائے بر حق سے الہام پا کر اپنے شہر آر سے کنارہ کش ہوئے تھے جس کی قسمت پر قضا کی مہر لگ چکی تھی اور یہ سمیری تہذیب کے دور انحلال کا واقعہ ہے ۔ اس طرح ثابت ہو گیا کہ روحانی ترقی کی طرف پہلا اقدام جس کی آخری منزل مسیحیت تھی ، روایتاً ہمہ گیر سلطنت کی اس تباہی سے وابستہ ہے اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے جو اب تک مورخوں کے علم میں آیا ؛ اس تناظر میں مسیحیت روحانی ترقی کا سب سے اونچا درجہ قرار پاتی ہے اور یہ نہ محض دنیوی حوادث عظیم کے تواتر میں زندہ رہی بلکہ ہر ایک حادثے سے افزائش پذیر اثرات بھی لیتی رہی ۔

اس نقطۂ نگاہ سے مذہب کی تاریخ میں یکسانی اور ترقی پذیری نمایاں ہے ؛ اس کے برعکس تہذیبوں کی سرگزشتوں میں تعدد بھی موجود ہے اور ترجیح و تکرار بھی اور یہ فرق بعد زمان میں بھی پایا جاتا ہے اور بعد مکان میں بھی ۔ مسیحیت اور دوسرے تین اعلٰی مذاہب بیسویں صدی تک زندہ و قائم چلے آتے ہیں ، ان کے درمیان جو قرب پایا جاتا ہے وہ معاصر تہذیبوں میں نہیں مل سکتا ؛ مہایان اور مسیحیت کے درمیان قرب خاص طور پر بہت ظاہر و باہر ہے اس لیے کہ دونوں خدا کو ایثار دوست نجات دہندہ مانتے ہیں ۔ اسلام اور ہندویت دونوں نے ماہیت ذات کے متعلق خاص بصیرت اور حقیقت بینی کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے دونوں نے امتیازی شان اور امتیازی مقاصد پیدا کر لیے : اسلام نے توحید کو از سر نو پختہ بنیادوں پر قائم کیا ، اس کے برعکس اس اہم حقیقت پر مسیحیت کی گرفت بداہۃً کمزور اور ڈھیلی ڈھالی رہی ہے ؛ ہندویت نے شخصیت خدا کو انسانی عقیدت و نیاز کے مرکز کی حیثیت میں از سر نو پختہ کیا حالانکہ ابتدائی بدھ مت کے نظام فلسفہ میں خدا کے وجود ہی سے بہ ظاہر انکار کی صورت پیدا ہو گئی تھی ۔ یہ چاروں اعلٰی مذہب ایک ہی موضوع کی چار مختلف تعبیریں ہیں ۔

اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کم از کم یہودی الاصل مذاہب یعنی مسیحیت اور اسلام میں کس وجہ سے وحدت الہام کی جھلک اب تک چند نادر روحوں تک محدود رہی جب کہ عام نظریہ اس کے خلاف ہے ؟ ہر یہودی الاصل مذہب کا مسلمہ فیصلہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی کھڑکی سے جو روشنی آتی ہے ، وہی اصلی ، حقیقی اور کامل روشنی ہے ،

باقی مذاہب اگر بالکل تاریکی میں نہیں تو کم از کم شفق کی روشنی میں ضرور بیٹھے ہیں۔ ہر مذہب کے ہر فرقے نے بھی دوسرے فرقوں کے مقابلے میں یہی نقطۂ نگاہ اختیار کر لیا؛ ان مختلف الاسما فرقوں کا مشترک اور متفق علیہ امور کو مان لینے اور ایک دوسرے کے دعاوی کو تسلیم کرلینے سے انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ لادریّین کو کفر بکنے کا موقع مل گیا۔

اب اگر ہم سوال کریں کہ آیا یہ الم انگیز صورت حال لا متناہی مدت تک قائم رہے گی؟ تو ہمیں پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اس سلسلے میں "لا متناہی" کا مطلب کیا ہے؟ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی تک انسانی تاریخ بچپن کی حالت میں ہے اور قرینہ یہی ہے کہ ہزاروں سال تک یہ حالت باقی رہے گی؛ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے نئے دریافت کردہ تباہی خیز وسائل سے کام لے کر اس سیارے پر حیوانی زندگی کا چراغ ہی گل کر ڈالے۔ اس نظریے کی روشنی میں یہ تصور سراسر لغو معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب کے درمیان موجودہ تنگ نظری کی حالت لا متناہی مدت تک جاری رہے گی؛ یا تو مختلف مذاہب غرا غرا کر اور بھونک بھونک کر ایک دوسرے کو بالکل ختم کر ڈالیں گے اور ان کا کچھ نشان باقی نہ رہے گا جیسے کہ کلکنی کی بلیوں نے ایسی ہی سرگرمیوں سے اپنا ہر نشان مٹا دیا[1] یا پھر متحدہ انسانی نسل مذہبی اتحاد میں نجات پائے گی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم اس اتحاد کی فطرت و حیثیت کے متعلق کوئی تصور قائم کر سکتے ہیں اگرچہ اس کی

۱۔ کلکنی آئر لینڈ کا ایک مقام ہے۔ ایک مرتبہ وہاں بغاوت ہوئی اور فوج کا ایک دستہ متعین کر دیا گیا؛ ان فوجیوں نے وقت گزاری کے لیے کئی مشغلے پیدا کر لیے، ایک مشغلہ یہ تھا کہ فوجی دو بلیاں پکڑ لیتے اور ان کی دمیں باہم باندھ کر انہیں اوپر اچھالتے۔ افسروں نے اسے بند کرنا چاہا۔ ایک موقع پر یہ کھیل جاری تھا کہ اچانک بالا دست افسر قریب آ نکلا، ایک سپاہی نے ہمت کر کے تلوار اٹھائی اور بلیوں کی بندھی ہوئی دمیں بیچ میں سے کاٹ دیں، بلیاں بھاگ گئیں، افسر نے دموں کے کٹے ہوئے ٹکڑے دیکھے تو استفسار کیا۔ اسے بتایا گیا کہ دو بلیاں آپس میں لڑ رہی تھیں، دونوں ایک دوسری کو کھا گئیں اور صرف دموں کے ٹکڑے باقی رہ گئے۔ اس سے کلکنی کی بلیوں کا مذکورہ بالا محاورہ پیدا کر لیا گیا (مترجم)۔

حیثیت کتنی ہی آزمایشی ہو؟

جن مذاہب کا درجہ اونچا نہیں ، وہ طبعاً مقامی ہوتے ہیں ، انہیں قبیلوں یا چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے مذاہب سمجھنا چاہیے ؛ ہمہ گیر سلطنتوں کے قیام کے بعد ایسے مذاہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی ، ان کے حلقے بہت وسیع ہو جاتے ہیں جن میں اعلیٰ مذاہب اور دوسرے مذاہب لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش بنانے کے لیے مقابلہ کرتے ہیں ؛ ان حالات میں مذہب شخصی پسند کی چیز رہ جاتا ہے ، ہم اس کتاب کے مطالعے میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس حقیقت کا جائزہ لے چکے ہیں ۔ رومی سلطنت میں جو انعام انجام کار مسیحیت کے حصے میں آیا ، اس کے لیے متعدد مذاہب سرگرمی سے کوشاں تھے ؛ ایک ہی میدان میں ——— اور اس مرتبہ میدان عالمگیر ہے ——— مختلف مذاہب کی پہلو بہ پہلو تبلیغی سرگرمیوں کے نئے ہنگامے کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ ہخامنشی ، رومی ، کوشانی ، ہن اور گپت سلطنتوں کے دائرے میں ایسی سرگرمیوں کی سرگذشتوں سے ظاہر ہے کہ دو باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی ؛ یا تو کوئی ایک مذہب اپنے ہم سروں پر مکمل کامیابی حاصل کر لے گا یا مختلف متقابل مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ صلح کر کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے لگیں گے جیسا کہ چینی اور ہندی دنیا میں ہوا لیکن یہ دو نتیجے ایک دوسرے سے اتنے مختلف نہیں جتنے کہ بادی النظر میں ظاہر ہوتے ہیں اس لیے کہ کامیاب مذہب کی فائز المرامی کا راز بھی عموماً یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے حریفوں کے بعض نمایاں خط و خال کو اپنا لیتا ہے ۔ فتح مند مسیحیت کے دارالاصنام میں بھی ایک طرف سبل اور آئی زیز کی مورتیوں نے حضرت مریمؑ ”مادر خدا“ کا روپ اختیار کر لیا ، دوسری طرف متھرا اور سورج دیوتا کی وضع قطع اور خط و خال حضرت مسیحؑ کی صورت میں متشکل ہو گئے ؛ با ایں ہمہ دو متبادل نتیجوں کا فرق بہت اہم ہے اور بیسویں صدی کی مغربی دنیا کے افراد اپنے معاملے کے متعلق پیش آنے والے حالات سے بے پروا نہیں رہ سکتے ۔

سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے زیادہ قرین قیاس نتیجہ کون سا ہے ؟ جب یہودی الاصل مذاہب میدان میں سرگرم عمل تھے تو زمانہ ماضی میں نا رواداری کا دور دورہ تھا ۔ جب ہندی خصوصیات کو درجۂ اقتدار حاصل تھا تو ” زندہ رہو اورزندہ رہنے دو“ پر عمل ہوا ۔ پیش نظر سوال کا جواب ان

حریفوں کی فطرت سامنے رکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے جو اعلیٰ مذاہب کی راہ میں آ سکتے ہیں۔

مسیحیت نے جب یہودیت کی یہ اصل قبول کر لی تھی اور اس کا اعلان بھی کیا جاتا رہا کہ ''خدا محبت ہے'' تو پھر اس نے متضاد یہودی نظریہ کیوں از سر نو قبول کیا کہ ''خدا غیور ہے'' ؟ یہ رجعت جس کے آغاز سے مسیحیت کو حد درجہ الم انگیز روحانی نقصان پہنچا ، اس وجہ سے اختیار کی گئی کہ ''قیصر'' کی پوجا کے خلاف موت و حیات کی جنگ میں مسیحیت کے لیے کامیابی کا اور کوئی راستہ نہ تھا اور کلیسا کی فتح یابی کے بعد امن قائم ہو گیا تو یہواہ اور مسیح[۴] کا متضاد تعلق ختم نہ ہوا بلکہ زیادہ پختہ اور پکا ہو گیا ؛ اس دور میں مسیحی شہیدوں کی اولوالعزمی و انتہا پسندی نے مسیحی ظالموں کے تعصب کی شکل اختیار کر لی۔ مسیحیت کی تاریخ کا یہ ابتدائی باب بیسویں صدی کی مغربیت مآب دنیا کی روحانی امیدوں اور آرزوؤں کے لیے بڑا منحوس تھا اس لیے کہ لویتان[۱] کی پرستش نے جس پر ابتدائی مسیحی کلیسا نے بہ ظاہر کاری ضرب لگائی تھی ، دوبارہ سر اٹھایا ہے ، اس نے مطلق العنان حکومت کی مکروہ شکل اختیار کر لی ہے اور مغربی دنیا کے دل و دماغ کی تنظیمی اور مکانکی صلاحیتوں نے اسے ایک خوفناک شیطانی آلہ بنا دیا ہے جو نہ صرف جسموں کو بلکہ روحوں کو بھی اس پیمانے پر غلام بنانے کے درپے ہے جو زمانۂ ماضی کے بد ترین عزائم والے جابر کی دسترس میں بھی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی مغربیت مآب دنیا میں خدا اور قیصر کی جنگ پھر ایک مرتبہ لڑی جائے گی ؛ یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ اس صورت میں مجاہد کلیسا کے وظیفے کی بجا آوری پھر مسیحیت کے ذمے عائد ہو جائے گی اور یہ وظیفہ اخلاق اعتبار سے حد درجے باعث

۱۔ Leviathan ۔ یہ ایک عبرانی لفظ ہے جس کا صحیح تلفظ ''لو یاتان'' ہے لیکن بائیبل کے تراجم میں اسے ''لویتان'' ہی لکھا گیا ہے ؛ کہیں اس کا ترجمہ ''سمندر کا مچھ'' کیا گیا ہے اور کہیں ''گھڑیال'' ، کہیں یہ لفظ استعارۃً مصری جابروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عبرانی میں اس کے لفظی معنی ہیں ''کنڈلی مارے ہوئے'' ، اس جانور پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو سانپ کی طرح خم کھاتا ہوا چلے (مترجم)۔

عزت مگر روحانی اعتبار سے حد درجے خطرناک ہے۔

جو مسیحی بیسویں صدی کی پیداوار ہیں، انھیں یہ امر بھی پیش رکھنا چاہیے کہ "قیصر" کی پرستش کے خلاف دوسری جنگ میں مسیحی کلیسا کامیابی سے سرفرازی پائے تو یہ امکان بھی ہے کہ یہواہ پرستاری کی جانب اسے پہلے جس رجعت سے سابقہ پڑا تھا، اس کی تلافی کیے بغیر ایک اور رجعت کا مرحلہ پیش آ جائے؛ تاہم اگر اس بات پر ان کا ایمان پختہ ہے کہ دکھ اٹھانے والے مسیح[۴] کی شکل میں پیکر محبت بن کر ظاہر ہونے والا خدا انجام کار پتھر کے بے حس دلوں کو گوشت کے حساس قلوب بنا دے گا تو وہ سیاسی لحاظ سے متحد دنیا میں مذہب کے متعلق یہ تصور بھی قائم کر سکتے ہیں کہ مسیح[۴] کا الہامی پیغام پرستاریٔ یہواہ اور پرستاریٔ قیصر دونوں کی زنجیروں سے عالم انسانیت کو آزادی دلا دے گا۔

چوتھی صدی مسیحی کے اختتام پر فتح مند مسیحی کلیسا نے جب ان لوگوں کو ظلم و جور کا تختہ مشق بنایا جو اس کے حلقہ بگوش بننے کے لیے تیار نہ تھے تو لا مذہب سماچوس[۱] نے اس روش کے خلاف مندرجہ ذیل الفاظ میں احتجاج کیا:

ایسے پر اسرار وجود کے قلب تک صرف ایک ہی راستے سے
ہم نہیں پہنچ سکتے۔

اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ ظلم و جور کے بانی مسیحیوں کے مقابلے میں ایک لا مذہب آدمی حضرت مسیح[۴] سے زیادہ قریب تھا۔ رافت و فیاضی بصیرت کا سر چشمہ ہے، خدائے برحق تک پہنچنے کے لیے یکسانی ممکن نہیں اس لیے کہ انسانی فطرت پر تنوع کی چھاپ لگی ہوئی ہے جو خود خدا کی تخلیق کی دستاویز ہے اور یہ تنوع مفید و نفع بخش ہے؛ مذہب کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسانی روحوں کو آسمانی روشنی سے منور ہونے کے قابل بنائے اور یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک خدا کے پرستاروں کا تنوع ٹھیک ٹھیک منعکس نہ ہو۔ اس بنا پر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ اعلیٰ مذاہب میں سے ہر ایک زندگی کا جو طریقہ سکھاتا ہے اور خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے، وہ بڑے نفسیاتی نمونوں میں سے کسی نہ کسی

۱- Symmachus - چوتھی صدی عیسوی کا ایک رومی حاکم (مترجم)۔

کے لیے موافق و موزوں ثابت ہو سکتا ہے جن کے خط و خال تدریجاً بیسویں صدی کے ان لوگوں کے ذریعے سے روشنی میں آ رہے ہیں جنھیں انسانی علم کے اس نئے میدان (نفسیات) میں علمداری کا رتبہ حاصل ہے۔ اگر ان مذاہب میں سے ہر ایک وسیع حلقے میں کسی مسلمہ انسانی ضرورت کو حقیقةً پورا نہیں کرتا تھا تو وہ اتنی لمبی مدت تک انسانی عقل کے اتنے بڑے حصے کی اطاعت گزاری کا مرجع کیوں کر رہ سکتا تھا۔ اس توضیح کے مطابق موجودہ اعلیٰ مذاہب کا تنوع یا تخالف رکاوٹ نہ بن سکے گا بلکہ اسے نفوس انسانی کے تنوع کا لازمہ سمجھا جائے گا۔

اگر مذہب کے بارے میں اس تصور کو درست مان لیا جائے تو یہ تہذیبوں کے کار منصبی کے متعلق ایک نئے دور کا دروازہ کھول دے گا، اگر مذہب کی گاڑی مسلسل اپنی صحیح سمت میں بڑھی چلی جا رہی ہے تو تہذیبوں کے عروج و زوال کی دوری اور عودی حرکت نہ صرف متضاد ہے بلکہ ضمنی اور تبعی بھی ہے؛ ممکن ہے اس کے مقصد کی تکمیل اور اس کی اہمیت کے انکشاف کی شکل یہی ہو کہ (مذہب کی) جو گاڑی زمین پر پیدائش، موت، پیدائش کے رنج افزا چکر میں پڑی ہوئی دوری گردش میں مشغول ہے، آسمان کی جانب صعود میں اس کی معاون بن جائے۔

اس بنا پر پہلے اور دوسرے دور کی تہذیبوں کا وجود تو حق بہ جانب ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن تیسرے دور کی تہذیبوں کا معاملہ اس لحاظ سے بادی النظر میں مشتبہ معلوم ہوگا۔ پہلے دور کی تہذیبوں نے اپنے دور انحطاط میں اعلیٰ مذاہب کے ناقص ڈھانچے تیار کیے؛ دوسرے دور کی تہذیبوں نے اعلیٰ مذاہب کو درجہ تکمیل تک پہنچا دیا اور وہ ان سطور کی تسوید کے وقت تک قائم ہیں؛ جو نئے مذاہب تیسرے دور کی تہذیبوں کے داخلی پرولتار کی تخلیقات میں دریافت کیے جا سکتے ہیں، وہ تو چنداں قابل توجہ معلوم نہیں ہوتے۔ اگرچہ جارج ایلیٹ[1] کے قول کے مطابق پیش گوئی ایک ایسی غلطی ہے جس کا ارتکاب انسان سراسر بے وجہ اور بے سبب کرتا ہے

۱۔ George Eliot ۔ یہ ایک مشہور انگریز عورت کا اختیار کردہ علمی نام تھا جس کا اصل نام ''میری این ایوانز'' (Evans) تھا (۱۸۱۹ء - ۱۸۸۰ء)۔ وہ انیسویں صدی کے ممتاز ناول نگاروں میں سے تھی (مترجم)۔

تاہم کوئی خاص خطرہ قبول کیے بغیر یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ نئے مذاہب انجام کار کسی اہمیت کے مالک ثابت نہ ہوں گے ۔ تاریخ کے اس نقطۂ نگاہ کی بنا پر جو ہم اب پیش کر رہے ہیں ، دور حاضر کی مغربی تہذیب کے لیے ایک وجۂ جواز یہ سمجھی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے وہ مسیحیت اور اس کے دوسرے ہمسر مذاہب کے لیے عالمگیر پیمانے پر ایک دنیوی مقام اتصال مہیا کرنے کی خدمت انجام دے سکے ؛ مغربی تہذیب ان مذاہب پر بنیادی عقائد و اقدار کی وحدت بھی واضح کر سکتی ہے اور یہ تلخ حقیقت بھی ان کے سامنے لا سکتی ہے کہ بت پرستی کا خطرہ مجسم صورت میں نمودار ہو چکا ہے اور انسان اپنی اجتماعی پرستش کے شر انگیز چکر میں مبتلا ہو سکتا ہے ۔

(ب) مذہبی نظاموں کے ماضی کی اہمیت : ہم نے اس باب کے سابقہ عنوان پر بحث کرتے ہوئے جو موقف اختیار کیا ، اس پر ان لوگوں کی طرف سے اعتراض ہو سکتا ہے جو مذہب کو محض تصنع ، بناوٹ اور خوش خیالی کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کی طرف سے بھی اعتراض ہو سکتا ہے جو مذہبی نظاموں کی مذمت اس بنا پر کرتے رہتے ہیں کہ یہ جن اصول و عقائد کے مدعی ہیں ، ان کے مطابق عمل کا شایاں نمونہ پیش نہیں کرتے ۔ اول الذکر اعتراض کا جواب مطالعۂ تاریخ کی اس کتاب کے دائرۂ بحث سے خارج ہے ؛ اگر ہم اپنی گفتگو صرف آخر الذکر اعتراض تک محدود رکھیں تو ہمیں یہ تسلیم کر لینے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ معترض کے پاس اصل الزام کے لیے مواد کا خاصا ذخیرہ موجود ہے ۔ مسیحی کلیسا کے رہناؤں ہی کو لے لیجیے ، انھوں نے ابتدائی دور سے زمانۂ حال تک مختلف اوقات میں بانیٔ مذہب سے قریب قریب کامل انحراف میں بھی تامل نہ کیا مثلاً یہودیوں سے مذہبی پیشواؤں کا نظام نیز فریسیت ، یونانیوں سے بت پرستی اور شرک کو لے کر اپنا لیا ؛ جو لوگ زیادہ تر حقوق پر قابض تھے ، ان کے لیے قانونی حمایت کا وتیرہ اختیار کر لیا اور یہ رومیوں کی میراث تھی ، دوسرے مذاہب کو بھی اسی قسم کے اعتراضات کا ہدف بنایا جا سکتا ہے ۔

اس نوع کی خامیوں کے اسباب بیان کیے جا سکتے ہیں لیکن عہد وکٹوریا کے ایک بذلہ دوست مذہبی پیشوا جیسے کے طنزیہ فقروں سے ان کے لیے جواز پیش نہیں کیا جا سکتا ۔ اس مذہبی پیشوا سے جب پوچھا گیا کہ پادری اتنے احمق کیوں ہوتے ہیں ؟ تو اس نے بے توقف جواب دیا : ” تم ان سے اور کیا

امید رکھ سکتے ہو؟ ہمیں دنیا داروں ہی میں سے پادری منتخب کرنے پڑتے ہیں۔" مذہبی نظام فرشتوں پر نہیں بلکہ گناہگار انسانوں ہی پر مشتمل ہوتے ہیں؛ ہر معاشرے کے ہر دور کی درسگاہوں کی مانند مذہبی نظام بھی اس ماحول سے کچھ زیادہ آگے نہیں ہوتے جس میں وہ وجود پذیر ہوتے ہیں، زندگی بسر کرتے ہیں اور حرکت و عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ معترض پھر اپنے اصل الزام کی طرف عود کرتا ہوا عہد وکٹوریا کے مذہبی پیشوا کا طنزیوں رد کر سکتا ہے کہ بے شک پادری دنیا داروں ہی میں سے لیے جاتے ہیں لیکن بہترین آدمی منتخب کرنے کے بجائے بدترین لیے جاتے ہیں، سر جوش کے بجائے تلچھٹ پر قناعت کر لی جاتی ہے۔ موجودہ مغربی دنیا کے مسیحی کلیسا پر سیاست دوست مخالفوں نے جو الزام لگائے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کلیسا ترقی کے پہیوں کے لیے رکاوٹ بنا رہا ہے:

> مغربی مسیحی دنیا میں مسیحیت کے بعد کی مغربی تہذیب کا نشو و ارتقا سترھویں صدی سے شروع ہوا، اس سے کلیسا کے دل کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں دنیا داری کو فروغ نہ ہو جائے اور لوگ نئی لا مذہبیت کی طرف نہ لوٹ جائیں۔ اس خوف سے کلیسا نے ایمان کو اس مجلسی نظام سے وابستہ کر دیا جو رخصت ہو رہا تھا؛ آزاد خیالوں، تجدد پسندوں اور سائنس دانوں کی غلطیوں کے خلاف عقبی حملوں کے دوران میں کلیسا نے بے احتیاطی سے سیاسی قدامت پسندی کی روش اختیار کر لی یعنی جاگیرداری، امرا پرستی، سرمایہ داری اور قدیم نظام کی حمایت شروع کر دی۔ اس طرح وہ سیاسی رجعت پسندوں کا حلیف بلکہ اکثر آلہ کار بنا رہا، انیسویں صدی میں یہ آزادی پسند، جمہوریت کی مذمت کے لیے بادشاہی اور طبقہ امرا کا حامی بن گیا، بیسویں صدی میں اس نے مطلق العنانی کی مذمت کے لیے آزادی پسند جمہوریت کی طرف داری اختیار کر لی؛ غرض انقلاب فرانس کے وقت سے کلیسا کی روش پیش نظر رکھی جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ بہ اعتبار سیاست وہ وقت سے ایک قدم پیچھے ہی رہا۔ موجودہ دنیا

میں مسیحیت کے خلاف کارل مارکس کے ہم خیالوں کی نکتہ چینی کا خلاصہ یہی ہے ؛ اس نکتہ چینی کا مسیحی جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جب ایک انحلال پذیر معاشرے کے گدرینی[1] سؤر اندھا دھند نیچے کی طرف جا رہے ہوں تو کلیسا کا فرض یہی ہے کہ گلے کے پیچھے پیچھے چلے اور جتنے سؤروں کی توجہ ڈھلوان کی بالائی سمت کی طرف منعطف کرا سکے کرا دے[2]۔

جن لوگوں کے قریب مذہب کی حیثیت شیخ چلی کے منصوبے سے زیادہ نہیں ، انھیں نیز بہت سے دوسرے لوگوں کو یہ اعتراضات اس نقطۂ نگاہ میں پختہ تر کر دیں گے جو انھوں نے پہلے سے اختیار کر رکھا ہے ؛ اس کے برعکس جو لوگ زیر مطالعہ کتاب کے مصنف کی طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مذہب زندگی کی نہایت اہم اور ضروری چیز ہے ، وہ اس عقیدے کی بنا پر اپنی نظریں دور پیچھے کی طرف لے جائیں گے اور اس ماضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے مستقبل کا تصور قائم کریں گے جو نسبتاً بہت مختصر تھا اور ماضی کے دھندلکے میں مستور ہو گیا ۔ وہ یہی سوچیں گے کہ اگر ہائیڈروجن بم یا ایسے ہی کسی دوسرے حکمی حربے کے ذریعے سے نسلی خود کشی کا دور نہ آیا تو ہمارا مستقبل اتنی لمبی دیر تک جاری رہے گا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔

(ج) قلب و دماغ کی آویزش : اب سوال یہ ہے کہ خدا کو ڈھونڈنے والی روحیں مذہب کے جوہر و روح کو اس کے اتفاقی متعلقات سے کیوں کر الگ کریں ؟ جو دنیا عالمگیر پیمانے پر متحد ہو رہی ہے ، اس میں مسیحی ، بدھ ، مسلمان اور ہندو اس راستے پر پیش قدمی کس طرح کر سکیں گے ؟ روحانی روشنی کے ان طلب گاروں کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے یعنی وہ راستہ جس پر ان کے پیش رو چلے تھے اور وہ مذہبی روشنی کے اس درجے پر پہنچے تھے جو بیسویں صدی مسیحی کے اعلیٰ مذاہب کی نمائندہ روشنی تھی ۔ اگر

۱- Gadarene Swine ۔

۲- مارٹن وھائٹ Martin White کا تبصرہ جو مصنف کو بھیجا گیا (مترجم) ۔

ان کی اضافی روشنی کا مقابلہ ابتدائی دور کی لا مذہبیت سے کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ انھوں نے حیرت انگیز ترقی کی لیکن وہ اپنے پیشرووں کی محنت و مشقت کے ثمرات پر قناعت نہیں کر سکتے ، ان کے دل و دماغ کے درمیان ایک معرکہ اور ایک کشمکش بپا ہے ، اسے لاینحل نہیں چھوڑا جا سکتا اور حل کی صورت یہی ہے کہ روحانی دائرے میں قدم آگے بڑھایا جائے۔

اس کشمکش کا حل اسی وقت مل سکتا ہے جب معلوم کر لیا جائے کہ یہ کیوں کر پیدا ہوئی ؟ اور ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ دل و دماغ کے درمیان موجودہ معرکے کی اصل و علت غیر واضح نہیں۔ یہ معرکہ اعلیٰ مذاہب پر موجودہ دور کی مغربی سائنس کے دباؤ سے شروع ہوا ؛ سائنس نے مذاہب کو س مرحلے پر جا لیا جب وہ اپنی قدیمی روایات کا پشتارہ اٹھائے لیے چلے جا رہے تھے ، اگر موجودہ دور کا سائنٹیفک نقطۂ نگاہ روشنی میں نہ آتا تو یہ روایات اس حالت میں اب تک متروک ہو جاتیں۔

مذہب اور اقلیت کے درمیان یہ پہلا مقابلہ نہ تھا جس سے تاریخ روشناس ہوئی۔ اس سے پیشتر مقابلے کی کم از کم دو مثالیں ضبط تحریر میں آ چکی ہیں ؛ ہمیں ان دو میں سے پہلے وہ مثال سامنے لانی چاہیے جس کا تعلق قریبی دور سے ہے اور جس میں چاروں زندہ مذاہب کو اپنی سرگزشتوں کے ابتدائی دور میں پرانی عقلیت سے مقابلہ پیش آیا اور چاروں اس کے ساتھ مصالحت کر لینے میں کامیاب ہوگئے۔ ان میں سے ہر ایک مذہب کی آرتھوڈکس دینیات کسی مسلمہ غیر دینی فلسفے سے مطابقت کی پیداوار ہے جسے ابھرتا ہوا مذہب نہ رد کر سکتا تھا اور نہ نظر انداز کر سکتا تھا اس لیے کہ یہ نظام فکر معاشرے کی تربیت یافتہ اقلیت کی ذہنی فضا پر مسلط تھا اور وہی اقلیت مذہبی نظام کا تبلیغی دائرہ تھی۔ مسیحی اور اسلامی دینیات مسیحیت اور اسلام کو یونانی فلسفے کی اصطلاحات میں پیش کرنے کا نتیجہ تھیں اور ہندو دینیات میں ہندویت کو ہندی فلسفے کا لباس پہنایا گیا ؛ مہایان کے متعلق ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ ہندی فلسفے کا ایک دبستان تھا جس نے مذہب کی شکل اختیار کر لی لیکن ساتھ ساتھ اس کی فلسفیانہ حیثیت بھی قائم رہی۔

اسے داستان کا باب اول نہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ ابھرتے ہوئے مذاہب سے مقابلہ پیش آنے کے وقت تک جن فلسفوں کے مستقل نظام فکر قائم

ہو چکے تھے ، ان کی حیثیت ایک زمانے میں پُر زور ذہنی تحریکوں کی تھی ۔ اپنی زندگی کے عہد شباب اور دور نشو و ارتقا میں ــــــــ جسے موجودہ مغربی سائنس کے دور نشو و ارتقا سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے ــــــــ ہندی اور یونانی فلسفوں کو دور قدیم کے ان مذاہب سے سابقہ پڑ چکا تھا جو ہندی اور یونانی تہذیبوں کو ابتدائی عہد کے انسانوں سے میراث میں ملے تھے ۔

بادی النظر میں معلوم ہوگا کہ یہ دو مثالیں خاص یقین افروز ہیں ۔ اگر عالم انسانیت مذہب و عقلیت کے دو سابقہ مقابلوں سے سلامت باہر نکل آیا تو کیا یہ موجودہ معرکے کے نتیجے کی نسبت ایک اچھا شگون نہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سابقہ دو مقابلوں میں سے پہلے میں وہ مسئلہ پیدا ہی نہ ہوا تھا جس سے ہم اب دو چار ہیں ؛ دوسرے مقابلے میں اس کا ایسا حل نکالا گیا جو اس وقت کے زمان و مکان کے لیے بڑا موثر تھا لیکن اب یہ ایک مشکل بن گیا ہے جس سے بیسویں صدی کی مغربیت مآب دنیا کو سابقہ پڑا ہے ۔

طلوع پذیر فلسفے اور روایتی لامذہبیت میں جب مقابلہ پیش آیا تھا تو قلب و دماغ کے درمیان مصالحت کا کوئی سوال ہی در پیش نہ تھا اس لیے کہ کوئی ایسی مشترک بنیاد ہی سامنے نہ تھی جس پر ان دونوں کے درمیان تصادم رو نما ہو سکتا ۔ دور قدیم کے مذہب کا مغز و جوہر عقیدہ نہیں ، عمل ہوتا ہے اور مذہب سے وابستگی کا معیار یہ نہیں ہوتا کہ کسی خاص عقیدے کو قبول کیا جائے ، یہ ہوتا ہے کہ مقررہ مراسم میں شرکت کی جائے ۔ دور قدیم کے مذہب کے اعمال بجائے خود مقصود ہوتے ہیں ؛ عاملوں کے دل میں یہ احساس کبھی نہیں ابھرتا کہ خاص مراسم کی بجا آوری کے پس پردہ کوئی اور حقیقت موجود ہے جس کا تصور یہ مراسم پیش کرتے ہیں ؛ ان مراسم کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے سے جن اثرات کے پیدا ہونے کا یقین ہوتا ہے ، ان کے سوا مراسم کے کوئی معنی نہیں ہوتے ۔ اس قسم کی مذہبی فضا میں فلسفیوں کا ظہور ہوتا ہے تو وہ انسانی ماحول کے خاکے ذہنی اصطلاحات کے مطابق تیار کرتے ہیں اور ان کے لیے ”سچ“ اور ”جھوٹ“ یا ”صحیح“ اور ”غلط“ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ۔ فلسفی جب تک روایتی مذہبی مراسم ادا کرتے رہتے ہیں ، ان میں اور مذہب میں تصادم کی نوبت ہی نہیں آتی ؛ فلسفے میں کوئی شے ایسی نہیں ہوتی جو فلسفی کو مذہبی مراسم کی بجا آوری

سے باز رکھے اور مذہبی مراسم میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی ، جسے کسی فلسفے سے متصادم قرار دیا جائے ۔ بہر حال فلسفوں اور قدیم مذہبوں کے درمیان مقابلے ضرور ہوئے لیکن تصادم کبھی نہ ہوا البتہ اس کلیے میں ایک استثنا موجود ہے تاہم اس کا معائنہ بھی قریب سے کیا جائے تو وہ دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے ۔ استثنا سقراط[1] کا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سقراط فلسفی شہید تھا جسے عقوبت کیش لامذہبیت نے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ حالات کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ عدالتی قتل دو مد مقابل فریقوں کی وحشیانہ سیاسی کشمکش کا ایک واقعہ تھا جو پیلو پونیسی جنگ[2] میں ایتھنز کی شکست کے بعد پیدا ہوئی تھی ؛ اگر ایتھنز کے فاشستوں کا لیڈر سقراط کے شاگردوں میں محسوب نہ ہوتا تو سقراط بھی اسی طرح بہ اطمینان اپنے بستر پر جان دیتا جس طرح چین کی لامذہب دنیا میں سقراط کے مثنیٰ کنفیوشئیس نے دی ۔

جب اعلیٰ مذاہب منظر عام پر آئے تو ایک صورت حال کی نمود ہوئی ، ان کے ساتھ بھی روایتی مراسم کے گراں قدر پشتارے چلے آ رہے تھے ؛ یہ مراسم ان معاشروں میں مروج تھے جن میں مذاہب کا اولین ظہور ہوا تھا لیکن ان مذہبی مراسم کو جن کی حیثیت سمندر میں ڈوب جانے والے جہاز کے اس مال اسباب کی تھی جو سمندر پر تیرتا رہتا ہے ، مذہب کے جوہر قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ ان اعلیٰ مذاہب کی ایک جدید اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ذاتی الہامات کی بنا پر اپنے لیے اطاعت گزاری کا دعویٰ پیش کیا ، یہ الہامات ان مذاہب کے پیغمبروں کو ہوئے تھے ، ان الہامات کے مجموعے فلسفیوں کے دعاوی کی طرح بیان حقائق کی شکل میں پیش کیے گئے ؛ اس طرح حقیقت ایک متنازعہ فیہ ذہنی حلقہ بن گئی اور اختیارات کے دو آزاد حلقے پیدا ہوگئے : ایک نبوی الہام کا ، دوم فلسفیانہ عقل و دانش کا ، ان میں سے

۱- Socrates ، یونان کا مشہور فلسفی اور داعیٔ حق ، (۴۶۹-۳۹۹ ق-م) ، عدالت کے فیصلے کے مطابق وہ زہر کا پیالہ پی کر فوت ہوا (مترجم) ۔

۲- Peloponnesian War ۔ یہ یونان کی ریاستوں کے درمیان ۴۳۱ ق-م سے ۴۰۴ ق-م تک جاری رہی ، اس میں بڑے فریق دو تھے ؛ ایک ایتھنز ، دوسرا سپارٹا (مترجم) ۔

ہر ایک کا دعویٰ یہ تھا کہ ذہن و دماغ کے پورے دائرۂ عمل پر اسے برتری حاصل ہے۔ عقلیت اور مذہبی مراسم پہلو بہ پہلو خوشگوار زندگی بسر کرتے رہے تھے لیکن عقلیت و الہام کے لیے ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' کے اصول پر عمل پیرا رہنا غیر ممکن ہو گیا؛ گویا حقیقت نے دو شکلیں اختیار کر لی تھیں، ان میں سے ہر ایک علی الاطلاق صحت و درستی کی دعوے دار تھی اور ان میں باہم کشمکش بھی جاری تھی۔ اس نئی اور تکلیف دہ صورت حالات میں محض دو ہی متبادل راستے رہ گئے تھے: یا تو حقیقت کی دونوں شکلوں کے حریف حامیتی مصالحت کی کوئی صورت پیدا کرتے یا ان کے درمیان ایسی جنگ ہوتی کہ کوئی ایک فریق ہمیشہ کے لیے میدان سے نکل جاتا۔

جن مقابلوں میں ایک طرف یونان اور ہندی فلسفے تھے، دوسری طرف مسیحیت، اسلام، بدھ مت اور ہندوبت؛ ان کے سلسلے میں فریقین نے امن پسندانہ طریق پر مصالحت و مفاہمت کی شکل پیدا کر لی، فلسفہ چپ چاپ اس پر راضی ہو گیا کہ مجموعہ ملہمات کے خلاف عقلی نکتہ چینی سے محترز رہے گا، اس کے بدلے میں اسے اجازت مل گئی کہ انبیاء کے پیغامات کی تشکیل از سر نو فلسفیانہ انداز میں کرے۔

ہمیں شک کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ مصالحت اخلاص و خوش دلی پر مبنی تھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسے مسئلے کا حقیقی حل قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ سائنٹفک حقیقت اور پیغمبرانہ حقیقت کے درمیان تعلقات کا کوئی واضح اور قطعی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ نئی ذہنی ترتیبات کی اصطلاح میں جسے دینیات کہا جاتا ہے، حقیقت کی دو شکلوں کے درمیان یہ مصالحت محض زبانی تھی اور جن فارمولوں کو عقائد میں مقدس مانا گیا تھا، وہ پائدار ثابت نہ ہوئے؛ حقیقت کے مشتبہ معانی جس صورت میں مبہم پائے تھے، اسی صورت میں مبہم چھوڑ دیے؛ دوسری کشاکش اور دوسرے معرکے کا یہ برائے نام حل اس نسل کے حوالے ہوا جو اس میں معاون ہونے کے بجائے زیادہ رکاوٹ ہی بن سکتی تھی؛ غرض صحیح حل تو نکل نہ سکا البتہ یہ معاملہ واضح ہو گیا کہ حقیقت کا لفظ فلسفیوں اور سائنسدانوں، نیز پیغمبروں کی اصطلاح میں ایک نوع کے حقائق کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ عرفان کی دو مختلف شکلوں کے لیے متحدہ نام ہے۔

مصالحت کی جو کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں، اسے پیش نظر رکھتے

ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ معرکہ آرائی کا زود یا بہ دیر دوبارہ شروع ہو جانا نا گزیر تھا - جب الہامی حقیقت ایک مرتبہ سائنس کی اصطلاح میں مرتب ہو چکی تھی تو سائنس دانوں کو ہمیشہ کے لیے اس مجموعۂ اصول پر نکتہ چینی سے روکا نہ جا سکتا تھا جو ایک وقت میں سائنس کے رو سے درست مانے جا چکے تھے ؛ اس کے برعکس مسیحیت کے اصول جب ایک مرتبہ عقلیت کی زبان میں مدون ہو گئے تو وہ علم کے ان تمام دوائر پر کامل اقتدار کے دعوے سے باز نہ رہ سکی جو عقلیت کے طبعی حدود میں شامل تھے - سترھویں صدی مسیحی میں موجودہ دور کی مغربی سائنس نے یونانی فلسفے کا لباس اتار پھینکنا شروع کیا اور غور و تحقیق کے نئے ذہنی راستے پیدا کیے تو رومی کلیسا کا پہلا قدم یہ تھا کہ بیدار ہوتی ہوئی مغربی عقلیت کو اپنے (کلیسا کے) قدیم یونانی ذہنی حلیف کے خلاف جارحانہ اقدامات سے حکماً روک دے ؛ گویا زمین کو مرکز کائنات قرار دینے کا نظریۂ ہیئت مسیحی عقائد کا ایک بنیادی جزو تھا اور گلیلیو[1] نے بطلیموسی[2] نظام کی جو تصحیح کر دی تھی وہ ایک دینی غلطی تھی -

۱۹۵۲ء میں سائنس اور مذہب کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہوئے تین سو سال گذر چکے تھے اور کلیسائی کارفرماؤں کی حیثیت ویسی ہی ہو چکی تھی جیسی حکومت برطانیہ اور حکومت فرانس کی حیثیت مارچ ۱۹۳۹ء میں تھی جب ہٹلر چکوسلواکیا کے باقیات کو تباہ کر چکا تھا - دو سو سال تک کلیسا کے قبضے سے سائنس یکے بعد دیگرے ایک ایک علاقہ چھین رہی تھی ؛ ہیئت ، تکوین ، تاریخ ، حیاتیات ، طبیعیات ، نفسیات ، ان میں سے ہر ایک علم کو بالکل نئے اصول پر مدون کیا گیا تھا جنھیں مسلمہ مذہبی تعلیمات سے کوئی مناسبت نہ تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ مذہب کے یہ نقصانات کہاں پہنچ کر رکیں گے -

---

۱- Galileo ، مشہور اطالوی ہیئت دان (۱۵۶۴ء—۱۶۴۲ء) ، اس نے کاپر نیکس کے نظام کی تصدیق کی کہ تمام سیارے سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں (مترجم) -

۲- Ptolomy ، مصر کا مشہور عالم ہیئت و جغرافیہ ، یہ دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے ، عربی کی کتاب المجسطی اسی سے منسوب ہے ، اس کا نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج چاند ستارے زمین کے گرد گھومتے ہیں (مترجم) -

بعض مذہبی کار فرماؤں نے صورت حالات کا اندازہ کرتے ہوئے یہی مناسب سمجھا کہ کلیساؤں کے لیے کامل سکوت اختیار کیے رکھنا ہی آخری امید گاہ ہے۔

رومن کیتھولک کلیسا میں جو لوگ لکیر کے فقیر تھے، ان کا جوش و خروش سب سے پہلے اس پاپائی کونسل میں نمایاں ہوا جو ۱۸۶۹ء—۱۸۷۰ء میں منعقد ہوئی تھی، بعد ازاں ۱۹۰۷ء میں نئی روشنی کے خلاف مردودیت کا اعلان شائع ہوا، شمالی امریکہ کے پراٹسٹنٹ کلیسا نے بائیبل کی بنیادی اور اساسی حیثیت کو مدارکار بنایا۔ اسلامی دنیا میں بھی پر جوش قدامت پسندانہ تحریکیں جاری ہوئیں مثلاً وہابیت، ادریسیت، سنوسیت اور مہدیت لیکن یہ تحریکیں قوت و طاقت نہیں، ضعف و ناتوانائی کا نشان تھیں؛ ان سے یہ پتا چلتا تھا کہ اعلیٰ مذاہب تیزی سے گہرے غار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس نشان کو بد شگونی کے سوا کچھ نہیں سمجھا جا سکتا کہ انسانیت کے انقیاد و عقیدت پر اعلیٰ مذاہب کی گرفت ہمیشہ کے لیے زائل ہو جائے گی اس لیے کہ مذہب انسانی فطرت کی بنیادی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہے۔ جب مذہب کے لیے عوام کی گرسنگی انتہا پر پہنچ جاتی ہے اور ان میں پریشان کن روحانی بد حالی نمودار ہو جاتی ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں ایسی کچی دھاتوں سے مذہب کے ذرات نکالنے کا جذبہ پیدا ہو جائے جو کوئی امید پوری نہیں کر سکتیں لیکن تسلی کا اس کے سوا ذریعہ بھی کیا ہے؟ اس کی معیاری مثال ہمیں اس حیرت انگیز قلب ماہیت میں ملتی ہے جس کی بناً پر سدھارتھ گوتم کے شاگردوں نے اپنے رہنما کے پیغام کی ترتیب کے وقت اس کے حد درجے لا شخصی فلسفے سے مہایان نکال لیا۔ بیسویں صدی مسیحی کی مغربیت مآب دنیا میں ویسے ہی قلب ماہیت کے ابتدائی آثار نظر آ رہے ہیں، یہ قلب ماہیت مارکس کے مادی فلسفے پر روسی ارواح کے اندر دیکھا جا سکتا ہے جو مذہب کی روایتی روحانی غذا سے محروم ہو چکی ہیں۔

جب بدھ مت کو فلسفے کے بجائے مذہب کا لباس پہنایا گیا تو اس کا خوشگوار نتیجہ ایک اعلیٰ مذہب تھا لیکن اگر اعلیٰ مذاہب میدان عمل سے خارج ہو گئے تو ان کی خالی جگہیں فروتر مذاہب سنبھال لیں گے؛ فاشزم،

کمیونزم ، نیشنل سوشیلزم اور اس قسم کے دوسرے جدید دنیوی نظاموں کے پیرو اتنی قوت حاصل کر گئے کہ متعدد ملکوں کی حکومتوں پر انھوں نے قبضہ کر لیا اور بے پناہ جبر و تشدد سے کام لے کر اپنے اصول و طرق عمل نافذ کر دیے۔ اپنی اجتماعی قوت کے تحفظ میں انسان کی قدیم خود پرستی کے از سر نو ظہور و بروز کی یہ سنگین مثالیں اصل وبا کے پھیلنے کا نشان نہیں؛ حد درجے خطرناک علامت یہ ہے کہ جو ملک مسیحیت سے منسوب اور جمہوریت کے مدعی ہیں ، ان کی ۵/۶ آبادی کے ۵/۴ کا مذہب آج کل عملاً زمانہ قدیم کے عہد لامذہبی کی طرح قومیت کی پرستش ہے اور اسے حب وطن کا خوبصورت نام دے دیا گیا ہے لیکن یہ اجتماعی خود پرستی ہی تنہا وہ شے نہیں جسے تقدیس کا درجہ مل گیا ہے اور اسی کو بار بار آنے والی قدیم ترین روح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ قدیم ترین معاشروں کے بچے کھچے اجزا اور غیر مغربی تہذیبوں کے ویسے ہی قدیم ترین دھقان جو نسل انسانی کے تین چوتھائی حصے پر مشتمل ہیں ، اب انھیں مغربی معاشرے کے داخلی پرولتار میں جبراً داخل کیا جا رہا ہے اور تاریخی مثالوں کی روشنی سے مدد لیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معمولی حیثیت کے ان نئے رنگروٹوں کا یہ انبوہ عظیم جن آبائی مذہبی معمولات کے ذریعے سے اپنی مذہبی ضرورتوں کی تسکین کا بندوبست کرے گا ، اغلب ہے وہ ان پرولتار کے فلسفی آقاؤں کے خالی قلوب میں بھی سرایت کر جائیں۔

ان حالات کے پیش نظر ظاہر ہے کہ مذہب پر سائنس کی فتح کامل دونوں فریقوں کے لیے تباہی خیز ثابت ہوگی اس لیے عقلیت اور مذہب دونوں انسان کی بنیادی صلاحیتیں ہیں۔ ہزار سال کی جو ایک چوتھائی مدت ۱۹۱۴ء کو ختم ہوئی ، اس میں مغربی دنیا کا سائنسدان اپنی سادہ لوحی سے اس یقین پر شادان و فرحاں تھا کہ اسے نئی نئی ایجادات میں لگے رہنا چاہیے ، اس طرح دنیا بہتر سے بہتر ہوتی جائے گی :

جب سائنس دان مزید نئی ایجادات کر لیں گے
تو ہم پہلے سے زیادہ مسرور و شادان ہو جائیں گے [1]

۱- ایچ بلاک (Belloc) کی ایک ظریفانہ نظم ''بجلی کی روشنی'' (Electric Light) ، غالباً یہ موضوع آکسفورڈ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے ۱۸۹۰ء میں چنا تھا۔

لیکن سائنس داں کے اس یقین کی تہ میں دو بنیادی غلط فہمیاں موجود تھیں : اول یہ کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مغربی دنیا نے فلاح و بہبود کا جو بلند مرتبہ حاصل کیا ، اسے سائنسدان اپنے کارناموں کا کرشمہ قرار دیتا تھا ، دوم اسے یقین تھا کہ نئی حاصل کردہ فلاح و بہبود بہ دستور قائم رہے گی ؛ یہ ارض موعود نہ تھی بلکہ بنجر زمین تھی جو نکڑ سے گھومتے ہی سامنے آ گئی تھی -

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو چھوڑ کر نیچر کی قوتوں پر قابو پا لینا سائنس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے لیکن یہ کارنامہ انسان کے اپنے ساتھ تعلقات ، ہم جنسوں کے ساتھ تعلقات اور خدا کے ساتھ تعلقات کے مقابلے میں حد درجے حقیر و بے حقیقت ہے - انسانی عقل انسان کو اشرف المخلوقات بنانے کا موقع کبھی نہ پاتی اگر درجۂ انسانیت حاصل کرنے سے پیشتر کے اجداد مجلسی حیوان بننے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند نہ ہوتے اور اگر قدیم زمانے کا انسان اس روحانی سطح پر پہنچ کر مجلسیت کے ان مبادی کی تربیت نہ پا لیتا جنھیں عقل کے لیے اجتماعی اور مجموعی کام انجام دینے کی نا گزیر شرطیں سمجھا جاتا ہے - انسان کے عقلی اور فنی کارنامے یقیناً اس کے لیے اہم ہیں لیکن بجائے خود نہیں بلکہ اس وجہ سے اہم ہیں کہ ان کارناموں نے اسے آن اخلاقی مسائل سے رو در رو ہونے اور نبٹنے پر مجبور کیا جن سے بہ صورت دیگر وہ پہلو تہی کرتا رہتا - یوں موجودہ زمانے کی سائنس نے ایسے اخلاقی مسائل پیدا کر دیے ہیں جو حد درجہ اہم ہیں لیکن انھیں حل کرنے کی صلاحیت کا نہ کوئی ثبوت پیش کیا اور نہ وہ پیش کر سکتی تھی ؛ انسان سے جن اہم سوالات کا جواب مانگا جا رہا ہے ، ان کے باب میں سائنس ایک حرف بھی زبان پر نہیں لا سکتی - یہی سبق سقراط دینا چاہتا تھا جب اس نے طبیعیات کا مطالعہ ترک کرکے روحانی قوت سے تعلق پیدا کیا تھا جو کائنات پر حکمراں ہے اور اسے آگاہی بخشتی ہے -

اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مذہب کا وظیفہ کیا ہے - اسے ذہنی اور عقلی علوم کا ہر دائرہ سائنس کے حوالے کر دینے کے لیے تیار ہونا چاہیے ؛ ان میں وہ دائرے بھی شامل ہیں جو روایۃً مذہب سے متعلق سمجھے جاتے ہیں اور جن پر سائنس اپنا استحقاق جتانے میں کامیاب ہو سکتی ہے - ذہنی دوائر پر مذہب کا روایتی اقتدار ایک تاریخی حادثہ تھا ، ان پر اقتدار سے

دست برداری اس کے لیے مفید ہوئی اس لیے ان دوائر کے انتظام سے اسے قطعاً کوئی سروکار نہ تھا ؛ اس کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ انسانوں کو خدا کی عبادت اور اس کے ساتھ تعلق کے حقیقی مقصد کی طرف بڑھائے ۔ ہیئت ، حیاتیات اور جن دوسرے ذہنی دوائر کا ذکر ہم کر چکے ہیں ، انھیں سائنس کے حوالے کر دینے سے مذہب کو غیر مشتبہ طور پر نفع حاصل ہوا ؛ نفسیات کو سائنس کے حوالے کرنا اگرچہ تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ حوالگی بھی اتنی ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے جتنا کہ اسے تکلیف دہ سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ شاید اس طرح مسیحی دینیات سے وہ تشبیہی پردے الگ ہو سکیں جو انسانی روح اور خالق کے درمیان دور ماضی میں نہایت زبردست موانع بنے رہے ہیں ۔ اگر سائنس اس باب میں کامیابی حاصل کر سکی ، تو وہ روح ایزدی سے دور پھینکنے کے بجائے اس روح کو اپنے سفر کی حد درجے دور افتادہ منزل مقصود سے ایک قدم قریب تر لے آئے گی ۔

اگر مذہب اور سائنس حلم و فروتنی کا شیوہ اختیار کریں اور ان دائروں میں خود اعتمادی سے کام لیں جہاں ان کے لیے حلم و فروتنی اور خود اعتمادی ہی مناسب ہے تو ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جو مصالحت کے لیے سازگار ثابت ہوں لیکن احساسات کے لیے سازگار حالات کا پیدا ہونا عمل کا صحیح بدل نہیں سمجھا جا سکتا اور اگر مصالحت کو بروئے کار لانا ہے تو دونوں فریقوں کو مشترکہ عمل سے اس کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے ۔

زمانہ ماضی میں بھی فریقین مقابلہ اسی کے مطابق کار فرما رہے ہیں مثلاً مسیحیت اور یونانی فلسفہ ، ہندوبت اور ہندو فلسفہ ؛ دونوں مقابلوں میں آویزش اس بنا پر رک گئی کہ مذہبی مراسم اور روایات کو فلسفیانہ اصطلاحات کے قالب میں ڈھال کر دینیات کے ڈھانچے تیار کر لینے کا مصالحانہ طریقہ اختیار کر لیا گیا لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ، یہ طرز عمل دونوں صورتوں میں راہ صواب سے انحراف کا مظہر تھا اور روحانی و ذہنی حقایق کے باہمی تعلق کی نسبت غلط تشخیص پر مبنی تھا ۔ یہ سب کچھ اس غلط مفروضے کی بنا پر اختیار کیا گیا کہ روحانی حقایق کو ذہنی و دماغی اصطلاحات کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے ؛ بیسویں صدی کی مغربیت مآب دنیا میں قلب و دماغ کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس تجربے سے جو انجام کار ناکام ثابت ہوا ، عبرت و تنبہ حاصل کرے ۔

اگر چاروں موجود مذاہب کی مسلمہ دینیات کو نظر انداز کرنا ممکن العمل بھی ہو اور اس کی جگہ وہ دینیات رکھ لی جائے جو موجودہ زمانے کی مغربی سائنس کی اصطلاحات میں مدون ہوئی تو اس کارنامے کا کامیاب سرانجام بھی دراصل سابقہ غلطی کے اعادے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ سائنس کے اصول و قواعد کی بنا پر مرتب کی ہوئی دینیات (اگر ایسی دینیات کا تصور کیا جا سکتا ہے) بھی ویسی ہی غیر تسلی بخش اور عارضی ثابت ہوگی جس طرح فلسفے کی بنا پر مرتب کی ہوئی دینیات ۱۹۵۲ء میں بدھوں، ہندوؤں، مسیحیوں اور مسلمانوں کے لیے چکی کا پاٹ بنی ہوئی ہیں؛ یہ اس وجہ سے غیر تسلی بخش ہوں گی کہ ذہن و دماغ کی زبان روحانی بصیرتوں کی حامل نہیں بن سکتی اور عارضی اور غیر مستقل اس بنا پر ہوں گی کہ ہر وقت جگہ بدلتے رہنا اور سابقہ نتائج کو ٹھکراتے جانے ذہن و عقل کے اعلیٰ اوصاف میں سے ہے۔

پر سوال یہ ہے کہ دینیات کی شکل میں مشترکہ لائحۂ عمل ترتیب دے لینے کی تاریخی ناکامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے، قلب و دماغ کو مصالحت کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا کسی امید افزا سمت و جہت میں مشترکہ سرگرمی اور جد و جہد کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے؟ جس وقت یہ سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں، مغربی آدمی کا دل طبیعیات کی روز افزوں کامیابیوں سے حد درجے متاثر و مسحور ہے۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جزو لایتجزیٰ (ایٹم) کے تجزیے کا عظیم الشان کارنامہ بھی انجام پا چکا ہے لیکن اگر یہ درست ہے کہ طبیعیات پر کنٹرول کے سلسلے میں انسان کی ایک میل پیش قدمی کو بھی وہ اہمیت حاصل نہیں جتنی اہمیت اپنے تعلق میں، ہم جنسوں کے تعلق میں اور خدا کے تعلق میں صحیح طرز عمل کی صلاحیت کے راستے پر ایک انچ پیش قدمی کو حاصل ہے تو انسان کا بلند ترین کارنامہ یہ ہوگا کہ انسانی فطرت کے متعلق روشنی حاصل کرنے کے لیے کوئی نیا دریچہ کھولا جائے۔ ایک معاصر انگریز شاعر کے ہنرمندانہ قلم سے نکلی ہوئی نظم کے مندرجہ اقتباس میں روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی جا سکتی ہے:

اب سمندر کی سطح پر جہاز لوٹتے ہوئے نظر نہیں آتے
جو دنیا کے انتہائی دور افتادہ حصوں سے

یورپ کے مختصر سے گوشے کی جانب آتے تھے
اور اپنے ساتھ نو دریافت شدہ دنیا کی خبریں لاتے تھے -
به ایں همه هر نوع کے تغیرات کے باوجود
ایک دنیا ایسی ضرور باقی ہے جہاں فکر و خیال کے لیے
پرواز کی گنجایش موجود ہے -
یہ بہت دور افتادہ ہے ، پُر اسرار سمندروں نے اسے گھیر رکھا
ہے ، اس کے کناروں کی نسبت یقینی طور پر کچھ معلوم
نہیں -
حال ہی میں انسانوں نے اس کا کھوج لگانا شروع
کیا ہے ؛
اس دنیا کی شکلیں نہایت عجیب و غریب ہیں ، اس کی دھند
میں خوف کی ترکتاز جاری ہے ،
یہاں ملاح نہیں بلکہ ماہرین نفسیات جہاز کھیتے ہیں ،
وہاں نہ خط استوا ہے نہ عرض البلد ہے نہ قطبین ہیں ،
صرف انسانی روح کی نقاب پوش اور مبہم افراتفری ہے[1]-

نفسیات کے حدود میں مغربی دنیا کے سائنٹفک قلوب کا اچانک داخلہ ایک حد تک ان دو جنگوں کا ضمنی نتیجہ ہے جن میں استعمال ہونے والے آلات و اسلحہ نے انسانی نفوس پر تباہی خیز اثر ڈالا ؛ اس سلسلے میں بے نظیر کلینکی تجربات کی برکت سے مغربی ذہن و دماغ نے نفس کی نیم شعوری گہرائیاں دریافت کر لیں اور اس دوران میں اپنے متعلق نیا تصور حاصل کر لیا جو اگرچہ ابھی تک وسیع اور اتھاہ نفسیاتی غار کی سطح پر ایک چھلاوے کی طرح منڈلا رہا ہے -

نیم شعوری حالت کو ایک بچے ، ایک جنگلی آدمی ، ایک وحشی حیوان سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ حالت شعوری حالت سے بھی زیادہ عقلمند ، زیادہ دیانت کیش اور غلطی کی طرف کم مائل ہے ؛ یہ حالت سکونی نقطۂ نگاہ سے تخلیق کے ان اکمل کارناموں میں ہے جنھیں ہم خالق کے رکاؤ

۱- مارٹن سکنر (Martyn Skinner) کی نظم Letters to Malaya III and IV ، صفحہ ۴۱ ، ۴۳ -

کی جگہیں قرار دے سکتے ہیں - اس کے برعکس شعوری انسانی شخصیت حد درجے نامکمل ہے اگرچہ وہ غیر متناسب طور پر اعلیٰ قسم کے وجود سے قریب تر ہے جو انسانی نفس کے ان دو کبھی جدا نہ ہونے والے اور بالکل مختلف اعضا کا صانع اور خالق ہے - اگر مغربی قلوب نے نیم شعوری حالت اس غرض سے دریافت کی ہے کہ اسے اصنام پرستی کا ایک نیا ذریعہ بنا لیں تو وہ خدا کو اپنے سے قریب تر لانے کے تازہ موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے اور خدا کے درمیان ایک نئی دیوار کھڑی کر دیں گے ؛ یقیناً اس سلسلے میں خدا کو قریب تر لانے کا موقع موجود ہے -

کاش سائنس اور مذہب خدا کو قریب تر لانے کے پیش نظر موقع سے فائدہ اٹھائیں اور متحدہ ہو کر خدا کی پروٹین مخلوق یعنی نفس انسانی کی حقیقت و ماہیت نیم شعوری گہرائیوں میں اور شعوری سطح پر دونوں جگہ دریافت کریں - اگر یہ مشترکہ کوشش کامیابی سے سرفرازی پائے تو جانتے ہو انہیں کس انعام کی امید ہو سکتی ہے؟ یہ انعام بڑا ہی شان دار ہوگا کیوں کہ انسان کے لیے روحانی زندگی بسر کرنے کا آلہ ذہن و دماغ نہیں بلکہ نیم شعوریت ہے ؛ یہی نیم شعوریت شعر ، موسیقی اور مرئی فنون کا سرچشمہ ہے ، یہی وسیلہ ہے جس سے کام لے کر روح خدا کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کرتی ہے - روحانی انکشافات کے اس کیف انگیز سفر میں پہلا کام یہ ہوگا کہ قلب کے وظائف میں بصیرت حاصل کی جائے اس لیے کہ قلب کے اپنے اسباب ہیں جو عقل کی گرفت میں نہیں آ سکتے ؛ دوسرا کام یہ ہوگا کہ عقلی حقیقت اور وجدانی حقیقت کو اپنے اپنے دائروں میں واقعی حقیقتیں سمجھتے ہوئے ، ان کے درمیان اختلاف کی حیثیت و نوعیت کا سراغ لگایا جائے ؛ تیسرا کام یہ ہوگا کہ بنیادی حقیقت کی زیریں چٹان میں سرنگ لگائی جائے جس پر عقلی اور وجدانی حقیقتیں قائم ہیں ؛ آخری کام یہ ہوگا کہ کائنات نفس کی سب سے نچلی چٹان کو توڑنے کی کوشش کی جائے تاکہ خدا کا نظارہ کیا جاسکے جو انتہائی اندرونے میں مقیم ہے -

جس انتباہ کو نیک نیت دین داروں نے بد قسمتی سے نظر انداز کر دیا ، اسے انجیل میں ٹیپ کی حیثیت حاصل ہے یعنی خدا کی مرضی نہ ہوئی کہ اپنے بندوں کے لیے علم کلام و منطق کو ذریعۂ نجات بنائے [1]۔

۱- Ambrose ، کتاب اول ، باب پنجم -

لڑکوں کو میرے پاس آنے دو اور انھیں منع نہ کرو
کیوں کہ خدا کی بادشاہت ایسوں ہی کی ہے ----- جو
کوئی خدا کی بادشاہت کو چھوٹے لڑکوں کی طرح قبول
نہیں کرتا ، اس میں کبھی داخل نہ ہوگا[1]۔

عقل کے نقطۂ نگاہ سے نیم شعوریت کی حیثیت ایک بچے جیسی مخلوق کی ہے خواہ اسے حلیمی کی حالت میں خدا سے سر ملانے کی حیثیت میں دیکھا جائے جس کی پیروی عقل نہیں کر سکتی یا خدا کو اس غیر منظم بے ربطی کی حیثیت میں دیکھا جائے جسے عقل پسندیدہ نہیں قرار دے سکتی۔ اس کے برعکس نیم شعوریت کے نزدیک عقل کی حیثیت ایک بے درد مدعیٔ فضیلت کی ہے جس نے روح کو بیچ کر طبیعیات پر معجز نما اقتدار خریدا اور خدا کے نور کو گھٹاتے گھٹاتے عام روشنی کے درجے پر پہنچا دیا لیکن نہ عقل خدا کی دشمن ہے اور نہ نیم شعوری دنیا کائنات کے حدود سے باہر ہے ؛ عقل اور نیم شعوریت دونوں خدا کی مخلوق ہیں ، ہر ایک کے لیے ایک دائرۂ عمل اور وظیفہ مقرر ہے اور اگر وہ اپنے حدود سے تجاوز نہ کریں تو انھیں ایک دوسرے کا مذاق اڑانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

(د) <u>مذہبی نظاموں کا مستقبل :</u> اگر بیسویں صدی میں پیدا شدہ نسل انسانی قلب و دماغ کے درمیان مصالحت کی امید باندھ سکتی ہے تو یہ امید بھی رکھ سکتی ہے کہ قلب و دماغ مذہبی نظاموں کے ماضی کی اہمیت کے باب میں متفق ہو جائیں گے ؛ مذہبی نظاموں اور تہذیبوں کے درمیان تعلقات کے بارے میں ہم جو چھان بین اور جو تحقیق و تفتیش کر رہے ہیں ، اس کے آخری مراحل میں قدم رکھنے کا یہ ابتدائی نقطہ ہوگا۔ ہم نے پہلے یہ طے کیا کہ مذہبی نظام سرطان نہیں ، پھر ہمارے سامنے یہ معاملہ آیا ہے کہ وہ ضمناً وظیفۂ ''پیلہ'' ادا کر سکتے ہیں ، اب ہم اس امکان پر غور کر چکے ہیں کہ وہ معاشرے کی اعلیٰ صنف ہو سکتے ہیں ؛ ہم اس بارے میں اپنا آخری فیصلہ اس وقت تک صادر نہیں کر سکتے جب تک یہ نہ جان لیں کہ مذہبی نظاموں کے ماضی سے ہمیں ان کے مستقبل کے متعلق کیا روشنی

۱- لوکا کی انجیل ، باب ۱۸ ، آیات ۱۵—۱۷ (مترجم)۔

ملتی ہے اور یہاں ہمیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخی وقت کے پیمانے سے ناپا جائے تو اعلیٰ مذاہب اور ان کے لیے قائم شدہ نظام حد درجے حدیث السن اور نوعمر ہیں ۔ ایک بھجن عہد وکٹوریا کے مقامات عبادت میں بہت مقبول تھا ، اس میں یہ شعر بھی آئے ہیں :

بہت سے دور گزر چکے ہیں اور اب
اس کا سفر خاتمے کے قریب پہنچ چکا ہے ،
مسیحی کلیسا اب (گھر کی جانب) چل رہا ہے
اور چاہتا ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جائے ۔

یہ بات معرض تحریر میں آ چکی ہے کہ ایک پادری نے اپنی جماعت کو دوسرا مصرع یوں تبدیل کر لینے کی ہدایت کی :

اس کا سفر ابھی شروع ہوا ہے ،

اور یہ ترمیم ان حقائق کے عین مطابق ہے جو پیش نظر کتاب کے مصنف کے نزدیک درست ہیں ؛ زمانۂ قدیم کے معاشروں سے مقابلہ کیا جائے تو تہذیبیں کل کی مخلوق معلوم ہوتی ہیں اور اعلیٰ مذاہب کے نظاموں کی عمر قدیم ترین تہذیبوں کی عمر سے بہ مشکل نصف ہوگی ۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مذہبی نظام کا وہ کونسا پہلو ہے جو اسے تہذیب اور قدیم معاشرے دونوں سے ممتاز کرتا ہے اور جس کی بناء پر ہم نے اسے اس جنس کی ایک الگ اور اعلیٰ نوع قرار دیا جس میں یہ تینوں شامل ہیں ؟ مذہبی نظاموں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان میں خدائے برحق شامل ہے ؛ انسان کے لیے خدائے برحق کی اس رفاقت نے جس کی جانب قدیم ترین مذاہب نے رسائی کا راستہ پیدا کیا اور اعلیٰ مذاہب نے اس رفاقت کو حصول کی منزل میں پہنچایا ، معاشرے کی اس نوع (مذہبی نظام) کو ایسے محاسن سے مزیّن کر دیا جو ابتدائی معاشروں یا تہذیبوں میں نہیں پائے جاتے ۔ مذہبی نظاموں کا یہی اعلیٰ وصف تھا جس کی بدولت انہوں نے انسانی معاشرے کے بد ترین دشمن ——— تفرقے ——— سے نجات دلائی ؛ یہی وصف تھا جس کی برکت سے معنئ تاریخ کا عقدہ حاصل ہوا ۔

تفرقہ اس لیے انسانی زندگی میں بد ترین دشمن کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس دنیا سے انسان مقابلے کے لیے مجبور ہے ، اس کی تمام چیزوں میں سب سے بدقوارہ اور بےڈھب یہی ہے ؛ وہ ایک ہی وقت میں مجلسی حیوان بھی ہے

اور ایسا حیوان بھی جو اپنے افعال میں مختار ہے ۔ ان دو عنصروں کی آمیزش کا مطلب یہ ہوا کہ جو معاشرہ محض انسانوں پر مشتمل ہوگا ، اس میں پیوستہ و متواتر آراء کی نزاع جاری رہے گی اور اگر انسان اپنی رائے کو بدل لینے کے لیے تیار نہ ہو جائے تو یہ نزاع خودکشی کی منزل پر پہنچا دے ۔ انسان کی رائے میں تبدیلی اس کی نجات کے لیے لازم ہے ورنہ آزاد اور تسکین ناپذیر ارادہ اسے روحانی قوت تو عطا کرتا ہے مگر خدا سے بے گانہ بنا دیتا ہے ۔ یہ خطرہ انسان سے پیشتر کے اس مجلسی حیوان کی گھات میں نہ تھا جو روحانی صلاحیت سے — اچھی یا بری — بہرہ مند ہوا تھا کہ نفس کی نیم شعوری حالت سے اوپر اٹھ سکتا ؛ نیم شعوری حالت میں کسی سعی و کوشش کے بغیر ہی خدا سے ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ سلبی اعتبار سے یہ بابرکت حالت سکون اس وقت ختم ہوئی جب حالت حرکت میں انسانی شعور و آگاہی اور شخصیت تخلیق ہوئے اور خدا نے نور کو ظلمت سے جدا کیا ۔ انسان کا شعوری وجود معجز نما روحانی ترقی کے حصول کے لیے خدا کا ایک منتخب وسیلہ ہے لیکن یہ اپنے آپ کو الم انگیز افتادگی کی گہرائی میں بھی گرا سکتا ہے ؛ یہ حالت اس وقت پیش آتی ہے جب خدا کی صورت پر بننے کے غرور کا نشہ اسے خود پرستی پر آمادہ کر دیتا ہے ۔ خودکشی کی طرف لے جانے والی فریفتگیٔ نفس جو کبر و غرور کے گناہ کا ثمرہ ہے ، دراصل ایک روحانی گمراہی ہے اور انسانی روح غیر مستقل توازن کی حالت میں جو انسانی وجود کا جوہر ہے ، اس گمراہی کی مرتکب ہو سکتی ہے ۔ "انا" روحانی رجعت کے ذریعے سے نروان کی حالت سکون میں پہنچ کر بھی اپنے آپ سے بچ نہیں سکتا ۔ دوبارہ حالت سکون پر پہنچ جانا جس پر انسان کی نجات موقوف ہے ، حقیقت میں وہ امن ہے جو اپنے آپ کو بیچارگی کی حالت میں فنا کر دینے کا نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ یک آہنگی کا ثمرہ ہے ۔ نفس کا وظیفہ یہ ہے کہ طفلانہ چیزوں کو اٹھا پھینکنے کے بعد بچے کی طرح پھر ایک طفلانی خوبی پر قابض ہو جائے ؛ "انا" کو خدا کے عطا کیے ہوئے عزم سے کام لے کر مردانہ وار جد و جہد کے ذریعے سے خدا کے ساتھ طفلانہ انداز میں مصالحت کر لینی چاہیے ، اس طرح خدا کی رحمت کا ظہور ہوگا ۔

اگر انسانی نجات کا راستہ یہی ہے تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ بڑا کٹھن اور ناہموار ہے ؛ تخلیق کے عمل عظیم نے اسے انسان عقیل بنا دیا ، ساتھ ہی

اس کے لیے ہم جنسوں کے ساتھ موافقت حد درجے مشکل ہو گئی ؛ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک مجلسی حیوان میں جس کے لیے محنت و مشقت کے بغیر چارہ نہیں، تعاون کا جوہر ضرور ہونا چاہیے ورنہ وہ برباد ہو جائے گا۔

انسان کی مضمر مجلسیت کے باعث ہر انسانی معاشرے کو بالقوہ ہمہ گیر ہونا چاہیے لیکن ۱۹۵۲ء تک کوئی ایسا انسانی معاشرہ وجود میں نہ آ سکا جس نے مجلسی سرگرمیوں کی ہر سطح پر عالم گیر حیثیت حاصل کی۔ بلا شبہ موجودہ دور کی دنیادارانہ مغربی تہذیب اقتصادیات اور فن کاری کی سطح پر عمومیت و ہمہ گیری کی مالک بن گئی لیکن اسے سیاسی اور ثقافتی کامیابی اس پیمانے پر نصیب نہ ہو سکی ؛ دو عالم گیر جنگوں کے تباہ کن تجربات کے بعد یہ امر یقینی نہ رہا کہ آیا ''ضرب کاری'' کے اس بھیانک اور متعارف ذریعے کے سوا دنیا کو سیاسی اعتبار سے متحد کیا جا سکتا ہے جو تہذیبوں کی تاریخ میں ہمہ گیر اتحاد کا لازمہ بنی رہی ہے۔ بہ ہر حال اس قسم کی بھدی اور بھونڈی تدبیر سے کام لے کر انسانیت کو متحد نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر خدا کی وحدت کے عقیدے کو مدار عمل بنایا جائے اور وحدانی ارضی معاشرے کو خدا کی دولت مشترکہ کا دائرہ سمجھ لیا جائے تو اس کا ضمنی نتیجہ انسانیت کا اتحاد ہوگا۔

خدا کی دولت مشترکہ کے ہمہ گیر معاشرے اور اس محدود معاشرے میں جس کی مثالیں تہذیبیں پیش کرتی رہیں، وسیع خلیج حائل ہے اور روحانی جست کے بغیر اس خلیج کو عبور نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ عہد کے ایک مغربی فلسفی نے اس صورت حال کی تصویر خوب کھینچی ہے، وہ کہتا ہے :

> انسان بہت محدود معاشروں کے لیے وضع ہوا تھا، عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ابتدائی معاشرے محدود ہی تھے۔ اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ عہد قدیم کی انسانی روح بہ دستور موجود ہے اور وہ ان عادات و خصائل میں چھپی بیٹھی ہے جن کے بغیر تہذیبیں وجود پذیر نہ ہو سکتی تھیں۔۔۔۔ مہذب انسان اور زمانہ قدیم کے انسان میں بڑا فرق علم کے گراں قدر ذخیرے اور حاصل کردہ عادات میں ہے۔۔۔۔ طبعی انسان اکتسابی خصائص میں مستور ہو گیا لیکن وہ بہ دستور موجود ہے اور حقیقۃً اس میں کوئی تغیر نہیں

ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کہنا غلط تھا کہ ''فطرت کو تم ہنکا بھی دو تو بگٹٹ واپس چلی آئے گی''۔ حقیقت یہ ہے کہ تم فطرت کو ہنکا ہی نہیں سکتے، وہ ہر لحظہ اپنے اصل مقام پر موجود رہتی ہے؛ اکتسابی خصائص نہ تنظیم پیدا کر سکتے ہیں اور نہ توارث کی صورت میں اپنے آپ کو منتقل کر سکتے ہیں جیسا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ عہد قدیم کی فطرت بے شک دبی رہے لیکن وہ شعور کی گہرائیوں سے باہر نہیں جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اکثر مہذب معاشروں میں زندہ رہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے مہذب معاشرے اگرچہ ویسے نہیں جن کے لیے ہم وضع ہوئے تھے لیکن ان میں ایک بنیادی پہلو ضرور موجود ہے اور وہ یہ کہ دونوں محدود ہیں اور ان کے دروازے سب کے لیے کھلے نہیں رکھے گئے ۔ ہمیں جن چھوٹے چھوٹے دائروں سے وجدانی مناسبت تھی، تہذیبیں ان کے مقابلے میں بہت وسیع ہیں لیکن ان میں بھی چھوٹے دائروں کی یہ خصوصیت موجود ہے کہ بعض لوگوں کو ان میں شامل کیا جاتا ہے اور بعض کو باہر رکھا جاتا ہے؛ قوم کتنی ہی بڑی ہو تاہم اس میں اور عالم انسانیت میں محدود اور لا محدود، بند اور کھلے کا فرق کسی تصریح کا محتاج نہیں ۔

بند معاشرے اور کھلے معاشرے، شہر اور انسانیت کے درمیان جو فرق ہے، وہ صرف درجے کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے ۔ ایک دولت کا اتحاد حقیقتاً اس ضرورت پر مبنی ہے کہ وہ دوسری دولتوں کے مقابلے میں اپنی حفاظت کر سکے، ہر فرد اپنے ہم وطن سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ اسے اجنبیوں سے نفرت ہے؛ یہ عہد قدیم کے انسان کا وجدان تھا اور وہ تہذیب کے سطحی پردوں کے نیچے بہ دستور موجود ہے ۔ ہم اب بھی اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں کے لیے اپنے اندر محبت کا ایک طبعی جذبہ پاتے ہیں اور انسانیت کے ساتھ محبت کو ایک اکتسابی ذوق کی حیثیت حاصل ہے؛ ہم پہلی چیز پر براہ راست پہنچ جاتے ہیں اور دوسری

چیز کو ہمارے ہاں ثانوی حیثیت حاصل ہے ۔ مذہب خدا ہی کے واسطے سے انسانوں کو ہم جنسوں کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے ، فلسفی ہمیں عقل ہی کے ذریعے سے شخص انسان کا احترام اور جملہ انسانوں کے حقوق کی عزت سکھاتے ہیں ؛ دونوں صورتوں میں ہم کنبے اور قوم کے مرحلوں سے گزر کر ہی انسانیت کے تصور پر پہنچتے ہیں[1] ۔

بہ ہر حال خدا کا واسطہ پیدا کیے بغیر انسانیت کا اتحاد ممکن نہیں ؛ اگر آسمانی رہنما کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان تفرقے کے دلدل میں جا پھنسے گا جو اس طبعی مجسلیت کی ضد ہے ، نیز وہ الم انگیز معما اس کے لیے باعث اذیت ہوگا جو مجلسی مخلوق ہونے کی حیثیت میں اس کے اندر مضمر ہے ۔ خدائے واحد و برحق جس معاشرے کا رکن نہیں ، اس میں انسان جس حد تک اپنا وظیفہ ادا کرنے کے لیے ساعی رہتا ہے ، اسی حد تک اپنی مجلسی فطرت کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے ؛ معما یہ ہے کہ انسان جو مجلسی عمل انجام دیتا ہے ، وہ زمین پر ایک فرد کی زندگی کے محدود دائرے سے ازروئے زمان و مکان بہت زیادہ وسیع ہے ۔ پس تاریخ کو اگر ہر حصہ دار فرد کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایسی کہانی ہے جو کسی احمق نے کہی اور اس کا مقصد و مدعا کچھ نہیں لیکن جب انسان تاریخ میں خدائے واحد و برحق کے عمل کی جھلک دیکھتا ہے تو اس بہ ظاہر بے معنی شور و غضب میں روحانیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے ۔

اس طرح تہذیب عارضی طور پر ایک قابل فہم دائرہ ہو سکتی ہے لیکن خدا کی دولت مشترکہ کے سوا اخلاقی اعتبار سے قابل قبول دائرۂ عمل پیدا نہیں ہو سکتا اور زمین پر شہر خدا کی رکنیت انسانی روحوں کے سامنے صرف اعلیٰ مذاہب نے پیش کی ۔ ارضی تاریخ میں انسان کی جزوی اور عارضی مشارکت اس صورت میں معنی خیز ہوتی ہے جب وہ زمین پر خدا کے رضاکار معاون کی حیثیت میں کام کرے ؛ اسی صورت میں انسان کی بے حقیقت کوششوں کے اندر آسمانی قدر و قیمت رونما ہوتی ہے اور تاریخ کی یہ حیثیت انسان کے لیے

۱- برگساں کی کتاب فرانسیسی زبان میں ۔ مذہب و اخلاق کے دو سر چشمے ، صفحات ۲۴ ، ۲۸ ، ۲۸۸ ، ۲۹۳ ، ۲۹۷ ۔

اس درجے بیش بہا ہے کہ موجودہ دور کی غیر دینی مغربی دنیا میں ایک پوشیدہ مسیحی فلسفۂ تاریخ ان لوگوں نے باقی رکھا جو آگے چل کر مذہب سے الگ ہو کر عقلیت سے رشتہ جوڑ لینے والے تھے:

چونکہ بائیبل اور انجیل پر ان کا عقیدہ ہے، وہ پیدائش کی کہانی اور خدا کی بادشاہت کے اعلان کو مانتے ہیں اس لیے مسیحیوں نے تاریخ کی مجموعیت اور کایت کے لیے ایک ترتیب کا بندوبست کر لیا۔ بعد ازاں اس نوع کی جتنی کوششیں کی گئیں، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اعلیٰ مقصد باقی نہ رہا جو ان قوتوں کی کارفرمائی کی وجہ سے جنھیں خدا کا بدل سمجھا جاتا تھا، عہد وسطیٰ کی ترکیب و ترتیب میں وحدت کا ضامن تھا لیکن معاملے کی عام نوعیت پہلے کی سی رہی اور یہ تصور سب سے پہلے مسیحیوں کے دماغ میں آیا تھا کہ تاریخ کے لیے بہ حیثیت مجموعی ایک قابل فہم تعبیر کا بندوبست کر دیں جو انسانیت کے آغاز کا راز بھی بتائے اور اس کا مقصد و نصب العین بھی متعین کر دے ـ ـ ـ ـ ڈی کارٹ[1] کے فلسفے کا پورا نظام اس تصور پر مبنی ہے کہ خدا قادر مطلق ہے، اس نے ایک لحاظ سے اپنے آپ کو خلق کیا اور دائمی حقائق کو وجود بخشا جن میں ریاضیات کے حقائق بھی شامل ہیں، اس نے کائنات کو عدم محض سے پیدا کیا اور مسلسل عمل تخلیق سے اس کی بقا کا ذمہ دار ہے؛ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام چیزیں پھر عدم میں چلی جاتیں جہاں سے خدا کی مرضی انھیں عالم وجود میں لائی تھی ـ ـ ـ ـ لائبنز[2] کے معاملے پر غور کرو؛ اگر خالص مسیحی عناصر کو اس کے نظام فلسفہ سے الگ کر

۱- Descartes، فرانسیسی فلسفی اور ریاضی دان (۱۵۹۶ء - ۱۶۵۰ء) (مترجم)۔

۲- Liebnitz، ایک جرمن فاضل اور ریاضی دان (۱۶۴۶ء - ۱۷۱۶ء) (مترجم)۔

دیا جائے تو باقی کیا رہ جائے گا ؟ بلکہ اس کا بنیادی مسئلہ بھی باقی نہ رہے گا یعنی خدائے کامل کی رضا سے کائنات تخلیق ہوئی اور چیزیں وجود میں آئیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ واقعہ بڑا عجیب ہے اور اسے بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اگر ہمارے معاصرین شہر خدا اور انجیل کا نام نہیں لیتے تو اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اس کے اثر سے محفوظ رہے ؛ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو ان چیزوں کے بل پر زندہ ہیں جنھیں انھوں نے فراموش کر دینا پسند کیا[1]۔

سب سے آخر میں یہ کہ جو معاشرہ خدائے واحد و برحق کا پرستار ہو، اسی سے امید ہو سکتی ہے کہ وہ اس شے کو باہر رکھے گا جسے اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں ''تقلید کی خطرناکی'' سے تعبیر کیا گیا تھا۔ تہذیب کی مجلسی تشریح الاعضا میں ''ایکیلیز کی ایڑی (Achilles' heel)''[2] یہ ہے کہ تقلید و نقالی پر انحصار کیا جائے اور اس کو یہ سمجھتے ہوئے مجلسی ڈرل کے طور پر انجام دیا جائے کہ عام لوگ لازماً لیڈروں کی پیروی کرتے رہیں گے ۔ جب قدیم معاشرے کے اوصاف و خصائص میں تحول کے ذریعے سے تہذیب وجود پذیر ہوتی ہے تو حالت سکون بدل کر حالت حرکت بن جاتی ہے ، اس وقت عام لوگ آبا و اجداد کی تقلید کے بجائے اپنی نسل کے خلّاق انسانوں کی تقلید شروع کر دیتے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح مجلسی پیش قدمی کا جو دروازہ کھلتا ہے ، وہ باب موت پر جا کر ختم ہو اس لیے کہ ہر انسان محدود حیثیت ہی میں تخلیقی کارنامے انجام دے سکتا ہے اور جو کچھ انجام دیتا ہے ، اس کے بارے میں یقین و قطعیت کا دعویٰ مشکل ہے ۔ غرض جب ناگزیر ناکامی سے سابقہ پڑتا ہے اور اس بناء پر مسحوریت کا دور بھی ناگزیر طور پر ختم

۱۔ گلسن (Gilson) کی کتاب ''قرون وسطیٰ کے فلسفے کی روح'' (The Spirit of Medieval Philosophy) ۔

۲۔ ایکیلیز (Achilles) ہومر کی نظم ایلیڈ کا ایک ہیرو تھا ، اس کا جسم ہر مہلک آلے سے محفوظ تھا ، صرف ایڑیاں اس خصوصیت سے محروم تھیں ؛ چنانچہ ایڑی پر زخم لگنے کے باعث وہ مارا گیا ۔ محاورے میں ایکیلیز کی ایڑی یا پاشنہ کو کسی زبردست قوت کی کمزوری اور ضعف کی علامت سمجھنا چاہیے (مترجم)۔

ہو جاتا ہے تو لیڈر اپنے اس اقتدار و اختیار کو بحال رکھنے کے لیے قوت و طاقت سے کام لیتے ہیں جو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے غصب سمجھا جاتا ہے ؛ دولت خدا میں اس خطرے کا سد باب یوں ہو جاتا ہے کہ دنیوی تہذیبوں کے عارضی لیڈروں کی جگہ معاملہ خدا کی طرف پلٹ جاتا ہے جو تمام انسانی حرکت و عمل کا سر چشمہ ہے ۔

خدا کی پیروی میں انسانی روحوں کو کبھی ان مایوسیوں اور محرومیوں سے سابقہ نہیں پڑتا جو زیادہ سے زیادہ با خدا آدمیوں کی پیروی میں بھی پیش آسکتی ہیں اور جن کے باعث بے چین پرولتار کے اخلاقی رشتے اس مقتدر اقلیت سے منقطع ہو جاتے ہیں جس میں تخلیقی جوہر باقی نہیں رہتا ۔ غرض روح اور خدائے واحد و برحق کے درمیان جو تعلق ہے ، وہ مطلق العنان آقا اور بے بس غلام کے تعلق کی سطح پر کبھی نہیں آ سکتا اس لیے کہ اعلیٰ مذاہب میں سے ہر ایک نے مختلف درجات میں خدائے قادر و مطلق کا تصور خدائے رحمان و رحیم کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس رحیم و کریم خدا کو مرنے والے خدائے مجسم کی شکل میں پیش کرنا اثبات عدل الٰہی کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ مسیح کی پیروی کو اس المیے کی زد سے محفوظ کر دیتا ہے جو اس تقلید میں مضمر ہوتا ہے جس کا رخ اصلاح نا یافتہ انسانی شخصیتوں کی طرف ہو ۔

ستائیسواں باب

مذہبی نظاموں میں تہذیب کا کار منصبی

۱- تہذیبیں تشبیہوں کی حیثیت میں

ہم یہ چھان بین کر چکے ہیں کہ مذہبی نظام جو اعلیٰ مذاہب کے پیکر ہوتے ہیں، دراصل روے زمین پر نظاموں کی وہ مختلف شکلیں ہیں جو "شہر خدا" سے قریب پہنچتی ہیں اور معاشرے کے وہ اصناف جن کی واحد اور یگانہ نمائندہ خدا کی دولت مشترکہ ہے، روحانی اعتبار سے تہذیبوں کے مقابلے میں زیادہ بلند رتبہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس چھان بین کی درستی کے قائل ہو گئے ہیں تو اب ہمیں اپنے تجربے میں ایک قدم آگے بڑھانا چاہیے اور سابقہ مفروضے کو الٹ کر یوں غور کرنا چاہیے کہ تاریخ میں تہذیبوں کے کار منصبی ہی کو برتری حاصل ہے؛ مذہبی نظاموں کے کام کی حیثیت محض ضمنی اور تبعی ہے بہ الفاظ دیگر تہذیبوں کی اصطلاحات میں مذہبی نظاموں پر غور کرنے کے بجائے ہمیں مردانہ وار قدم بڑھا کر مذہبی نظاموں کی اصطلاحات میں تہذیبوں پر غور کرنا چاہیے۔ اگر ہمیں کسی مجلسی سرطان کی تلاش ہو تو وہ ضرور مل جائے گا لیکن مذہبی نظاموں میں نہیں جو تہذیبوں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لیتے ہیں بلکہ تہذیبوں میں جو مذہبی نظاموں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ اگر ہم مذہبی نظاموں کو "پیلے" سمجھتے ہیں جن کے واسطے سے ایک تہذیب دوسری تہذیب کی شکل میں جنم لیتی ہے تو ہمیں جانشین تہذیبوں کو مذہبی نظاموں کے ظہور کی تمہید و تشبیب سمجھنا چاہیے اور ملحقہ تہذیبوں کو روحانیت کی اعلیٰ سطح سے مراجعت قرار دینا چاہیے۔

اگر ہم اس دعوے کی تصدیق کے لیے مسیحی کلیسا کی تکوین کو ایک آزمائشی معاملے کی حیثیت میں پیش نظر رکھ لیں اور کم مایہ مگر اہم شہادت سامنے لائیں کہ کس طرح خالص دنیوی الفاظ کو مذہبی معانی اور استعمال کا لباس پہنایا گیا تو لسانیات کی یہ شہادت اس امر کا ثبوت فراہم کرے گی کہ مسیحیت ایک مذہبی موضوع تھی مگر اس کی تمہید و تشبیب سراسر دنیوی تھی اور یہ تمہید و تشبیب یونانی سلطنت میں محض رومیوں کی سیاسی کارگزاری ھی پر نہیں بلکہ خود یونانیت کے تمام احوال و ظروف پر مشتمل تھی -

مسیحی کلیسا خود اپنے نام کے لیے اس مخصوص اصطلاح کا مرھون ہے جو ایتھنز کی شہری ریاست میں مستعمل تھی اور اس کا اطلاق شہریوں کی اس مجلس عام پر ھوتا تھا جو سیاسی کاروبار کے لیے منعقد کی جاتی تھی - مسیحیت کے مذہبی نظام نے ''ایکلیزیا''[۱] کا لفظ مستعار لیا لیکن دو معنوں میں استعمال کیا ، یہ رومی سلطنت کے سیاسی نظام کا پرتو تھا ؛ مسیحی استعمال میں ''ایکلیزیا'' کا اطلاق اول مقامی مسیحی جماعت پر ھوتا تھا ، دوم مسیحیت کے عالمگیر نظام پر -

جب مقامی اور عام مسیحی کلیسا دو مذہبی طبقوں میں منظم ھوا ، ایک عام لوگ جنھیں براہ راست مذہب سے زیادہ واقفیت نہ تھی اور دوسرے پادری — اور جب پادریوں کے مختلف درجے قرار دیے گئے تو اس سلسلے میں بھی تمام اصطلاحات یونانی اور لاطینی الفاظ کے غیر دینی ذخیرے ھی سے مستعار لی گئیں - عام لوگوں کے لیے ''لیٹی''[۲] کا لفظ وضع ھوا ، یہ ایک فرسودہ یونانی لفظ لاؤس[۳] سے نکلا جو با اقتدار لوگوں کے مقابلے میں عام لوگوں کے لیے استعمال ھوتا تھا ؛ پادریوں کے طبقے کے لیے کلرجی[۴] کا لفظ وضع

۱- Eccleasia جس کے ایک معنی ھیں ایتھنز کے آزاد شہریوں کی مجلس ، دوم یہ مذہبی مجلس کے لیے استعمال ھوتا ھے ، کلیسا اسی سے نکلا (مترجم) -

۲- Laity یعنی عام مسیحی جو براہ راست مذہبی علوم و مشاغل میں مصروف نہیں ھوتے (مترجم) -

۳- Laos -

۴- Clergy -

ہوا ، یہ یونانی لفظ ''کلیروس''[۱] سے ماخوذ تھا ، یونانی زبان میں اس کے عام معنی ''حصے'' کے تھے لیکن عدالتی بول چال میں یہ لفظ میراث میں ملی ہوئی جائداد کے کسی مخصوص حصے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ؛ مسیحی کلیسا نے اسے اپنی جماعت کے اس طبقے کے لیے اختیار کیا جسے خدا نے پیشہ ور پروہتوں کی طرح اپنی خدمت کے لیے مخصوص کر لیا تھا ۔ باقی رہا ''لفظ آرڈرس''[۲] (آرڈینز[۳] یعنی درجات سلسلہ) تو یہ لفظ رومہ کے سیاسی نظام میں ان طبقات کے لیے استعمال ہوتا تھا جو سیاسی لحاظ سے خاص درجے کے مالک تھے مثلاً سینیٹروں کا نظام[۴] ؛ مسیحی مذہبی نظام میں سب سے اونچے درجے کے ارکان کو نگران و نگہبان کہتے تھے یعنی ''ایپس کو پوئی''[۵] جو انگریزی میں بشپ بن گیا ۔

مسیحیوں کی مذہبی کتابوں کو جب تک ''تابیلیا''[۶] ———— کتابیں ———— نہیں کہا گیا ، ان کے لیے وہ نام تجویز ہوا تھا جو رومیوں کے دفتر مالگزاری کی اصطلاح میں بہت مدت سے مروج تھا یعنی سکرپٹورا[۷] ؛ باقی رہا دو عہد ناموں کا مسئلہ تو انھیں یونانی میں ''ڈیاتھیکائی''[۸] اور لاطینی میں ''ٹسٹیمنٹا''[۹] کہتے تھے اس لیے کہ انھیں قانونی دستاویز یا میثاق کے برابر سمجھا جاتا تھا ، بہ الفاظ دیگر خدا نے اپنے بندوں کی ارضی

۱- Kliros -

۲- Orders -

۳- Ordines -

۴- Senatorial Order -

۵- Episcopoi -

۶- Ta biblia یہ الفاظ دیگر بائیبل کتب کے معنی میں استعمال ہوتا تھا (مترجم) -

۷- Scriptura گویا بائیبل کا لفظ اختیار کرنے سے پیشتر انھیں Scriptures کہتے تھے جس کے لفظی معنی ہیں ''نوشتے'' (مترجم) -

۸- Dia—thekai -

۹- Testamenta جس سے لفظ ٹسٹیمنٹ نکلا یعنی عہد نامہ ؛ اولڈ ٹسٹیمنٹ ''عہد نامۂ قدیم'' ، نیو ٹسٹیمنٹ ''عہد نامۂ جدید'' -

زندگی کو درست اصول پر چلانے کی غرض سے دو مرتبہ اپنی رضا بتائی اور اس کا دستور واضح کر دیا ۔

ابتدائی دور کے منتخب مسیحیوں کو روحانی زندگی کے لیے خاص وضع کی تربیت دی جاتی تھی اور مشق کرائی جاتی تھی ، تربیت کو ''ایسی سس''[۱] کہتے تھے ؛ اولمپیائی اور دوسری یونانی کھیلوں کے لیے کھلاڑیوں کو جو بدنی تربیت دیتے تھے اور جو کسرت کراتے تھے ، اس کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا تھا ، اسی سے ''ایسیٹک''[۲] نکلا ۔ ابتدا میں مسیحیوں کو شہید بننے کی تربیت دی جاتی تھی لیکن جب تکلیفوں اور ظلموں کا ابتدائی دور ختم ہو گیا تو پھر انھیں تارک الدنیا بننے کی تربیت دی جانے لگی ، انھیں اینکورائٹ[۳] کہتے تھے ؛ یہ صحراؤں کی تنہائی میں نکل جاتے تھے اور یونانی کھلاڑیوں کی طرح فوجداری عدالت یا اکھاڑے میں عوام کے لیے تماشا نہ بنتے تھے ؛ ان کے لیے ایک یونانی اصطلاح وضع ہوئی یعنی اینکوریٹیس[۴] ، یہ اصطلاح ابتدا میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو یا تو عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر فلسفیانہ غور و فکر کے لیے خلوت نشین ہو جاتے تھے یا ان کے نزدیک شدید محاصل کے خلاف خاموش احتجاج کی موثر شکل یہی تھی ۔ یہ لفظ عام جوشیلے مسیحیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا خصوصاً مصری مسیحیوں کے لیے جو صحرا (ایری موس[۵]) میں چلے جاتے تھے (اس لیے کہ صحرا قریب تھا) ، وہ سمجھتے تھے کہ خلوت اور تنہائی میں ایک تو دنیا کے شر سے محفوظ رہیں گے ، دوسرے خدا سے تعلق پیدا کرنے میں آسانی ہوگی ؛ چنانچہ یہ لوگ ایری مائٹ[۶] یا ہرمٹ[۷] کہلانے لگے ۔ جب ان خلوت

۱- Ascesis ۔

۲- Ascetic ریاضت کش لوگ ، مسیحی اصطلاح میں راہب (مترجم) ۔

۳- Anchorite بہ معنی درویش (مترجم) ۔

۴- Anachoretes جس کے معنی ہیں الگ تھلگ ہو جانا ، خلوت اختیار کر لینا (مترجم) ۔

۵- Eremos بہ معنی صحرا (مترجم) ۔ ۶- Eremite ۔

۷- Hermit یعنی صحرا نشیں ، درویش ، راہب (مترجم) ۔

گزینوں (منکوئی ، منک[1]) نے اپنے نام کے لفظی معنی کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے[2] منظم جماعتی زندگی اختیار کر لی اور ان تنہائی پسندوں اور الگ تھلگ رہنے والوں کی جمعیت (مونیسٹیرین[3]) کے لیے جو جگہیں تجویز ہوئیں ، ان کے لیے لاطینی کا نام ''کن ونٹس''[4] اختیار کیا گیا جو یا تو ابتدا میں ان عمارتوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن میں سہ ماہی عدالتیں مقدموں کے فیصلے کرتی تھیں یا ایوان تجارت کے لیے استعمال ہوتا تھا ۔

ابتدا میں یہ حالت تھی کہ تمام مقامی کلیساؤں میں وقتاً فوقتاً اجتماعات ہوئے اور عبادت کا بھی کوئی منظم اور بندھا ہوا طریقہ نہ تھا لیکن جب باقاعدہ مختلف اوضاع اور مختلف دعاؤں کے شدید قاعدے مقرر ہو گئے تو عام مذہبی عبادات نے ایک معین شکل اختیار کر لی (لائی ٹورجیا یا لٹرجی[5]) ۔ یہ نام ابتدا میں اس برائے نام رضاکارانہ خراج کے لیے استعمال ہوتا تھا جو ایتھنز کی دولت مشترکہ کے اندر چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں رائج تھا ؛ یہ در اصل ایک زائد ٹیکس تھا لیکن اس کی بدیہی ناخوشگواری کو زائل کرنے کے لیے ایک معزز نام اختیار کر لیا گیا تھا ۔ اس طریق عبادت میں سب سے اہم رسم عشائے ربانی کی تھی جس میں عبادت گزار حضرت مسیح ؑ سے رفاقت کا زندہ تجربہ حاصل کرتے تھے ، وہ روٹی کھا کر اور شراب پی کر اس رسم میں حصہ لیتے تھے (سیکر منٹم[6]) ؛ یہ مسیحی رسم لامذہب رومیوں کی ایک رسم سے ماخوذ تھی جو نئے رنگروٹ کو رومی فوج میں داخل کرتے

۱۔ Monachoi یہ فرانسیسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں تنہا رہنے والا ، خلوت گزیں ، انگریزی کے لفظ منک (Monk) کا یہی مطلب ہے (مترجم) ۔

۲۔ مطلب یہ ہے کہ جب تنہائی ، علیٰحدگی اور خلوت نشینی کے بجائے اجتماعی زندگی اختیار کر لی تو یہ اصل نام کی خلاف ورزی ہوئی (مترجم) ۔

۳۔ Monesterion ، اسی سے انگریزی کا لفظ Monastry بنا یعنی راہب خانے یا خانقاہیں (مترجم) ۔

۴۔ Conventus ، انگریزی کن ونٹ (Convent) (مترجم) ۔

۵۔ Leitourgia یا Liturgy ، یعنی مسیحی عبادت (مترجم) ۔

۶۔ Sacramentum ۔

وقت ادا کی جاتی تھی ؛ باقی رہی ہولی کمیونئن[1] (عشائے ربانی) کی اصطلاح تو یہ ایک یونانی لفظ کوئی نونیا[2] سے لی گئی جس کا لاطینی ترجمہ کمیونیو[3] ہے ؛ یہ لفظ عموماً ہر مذہبی مشغلے میں اور خصوصاً سیاسی مشغلے میں حصہ لینے کے لیے استعمال ہوتا تھا ۔

مادی لفظ سے روحانی معنی پیدا کرنا اس طرز عمل کی ایک مثال ہے جسے ہم نے اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ''اثیریت'' سے تعبیر کیا تھا اور اسے نشو و ارتقا کا ایک نشان قرار دیا تھا ۔ یونانی اور لاطینی الفاظ پر اثیریت کا عمل جاری ہونے کا یہ سرسری موازنہ ——— جسے بہ آسانی پھیلایا جا سکتا ہے ——— ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یونانیت حقیقۃً اناجیل کا مقدمہ تھی اور اس کی وجہ بقا مسیحیت کے لیے تمہید و تشبیب کی خدمت انجام دینے کے سوا کچھ نہ تھی ؛ بہ الفاظ دیگر ہم نے ایک امید افزا راہ تحقیق میں قدم رکھا ہے ، اس تعبیر کے مطابق ظاہر ہوا کہ جب ایک تہذیب کی زندگی ایک زندہ مذہب کے پیدا ہونے کی تمہید ہے تو پیشرو تہذیب کی موت کو ایک مصیبت نہیں بلکہ اسے داستان کا ایک مناسب اختتام سمجھنا چاہیے ۔

۲۔ تہذیبیں رجعت قہقری کی حیثیت میں

موجودہ عہد کے مغربیوں کی عادت ہے کہ وہ مذہبی نظاموں کی تاریخ کا مطالعہ تہذیبوں کی سرگزشتوں کے رنگ میں کرتے ہیں ؛ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اگر اس عادت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بالکل الٹا طریقہ اختیار کریں تو تاریخ کس رنگ میں نظر آئے گی ؟ یوں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دوسرے دور کی تہذیبیں اعلیٰ مذاہب کی تمہیدیں تھیں لٰہذا ان تہذیبوں کو شکست و ریخت اور انحلالات کی بنا پر ناکام قرار نہ دینا چاہیے بلکہ کامیاب قرار دینا چاہیے اس لیے کہ انھوں نے اعلیٰ مذاہب کی پیدائش میں ہاتھ بٹایا اور امداد دی ۔ اس بناء پر تیسرے دور کی تہذیبوں کے متعلق بھی یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان اعلیٰ مذاہب سے رجعت قہقری کی حیثیت

۱۔ Holy communion (عشائے ربانی) ۔

۲۔ Koinonia ۔

۳۔ Communio ۔

رکھتی تھیں جو سابقہ تہذیبوں کے کھنڈروں سے اٹھے ۔ اگر ہم ان ختم شدہ تہذیبوں کے روحانی نتیجے کو دنیوی اسقاط حمل کا کفارہ سمجھتے ہیں تو ان تہذیبوں کے دنیوی کارناموں کا اندازہ بھی اسی معیار پر کرنا چاہیے جنھوں نے اپنے کلیسائی ''پیلے'' سے علیحدگی اختیار کر کے از سرنو دنیوی زندگی بسر کرنی شروع کی ؛ ہمیں یہی دیکھنا چاہیے کہ روح کی زندگی پر ان سے کیا اثر پڑا اور بداھۃً یہ اثر ناسازگار ہے ؟

ہمارے سامنے ایک آزمایشی معاملہ موجود ہے یعنی قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحی جمہوریت سے موجودہ دور کی غیر دینی مغربی تہذیب کا ظہور ۔ ہم نے تحقیق کا جو طریقہ اس باب کے نصف اول میں اختیار کیا تھا ، اسی کے مطابق قدم بڑھائیں یعنی الفاظ کے معنی اور استعمال میں تغیرات کی شہادتیں پیش کرتے جائیں تو اغلب ہے اس سے مزید روشنی ملے ، چنانچہ ہم لفظ ''کلیرک''[۱] سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں ۔ نظام مقدس میں جو کلرک (پادری) ہوتا ہے ، اس کے پہلو بہ پہلو انگلستان کے غیر دینی نظام میں کلرک وہ ہوتا ہے جو دفتر کا معمولی کام انجام دیتا ہے ؛ امریکہ میں کلرک اسے کہتے ہیں جو کسی دکان میں قیمتیں ادا کرنے کے مقام کے قریب بیٹھا ہوا سب کچھ لکھتا رہتا ہے ۔ کنورشن[۲] کا مفہوم ایک وقت میں روح کو خدا کی طرف لگانا تھا ، آج کل اس لفظ کا اطلاق ایسے معاملات پر ہوتا ہے مثلاً کوئلے سے بجلی پیدا کرنا یا پانچ فی صد راس المال کو تین فی صد میں تبدیل کر دینا ۔ ہم آج کل روحانی ''معالجات''[۳] کا ذکر بہت کم سنتے ہیں البتہ دواؤں کے ذریعے سے جسمانی معالجات کا ذکر عام ہے ، جو لفظ ابتدا میں ہولی ڈے[۴] تھا ، وہ ہالی ڈے[۵] بن گیا ۔ لسانی اعتبار سے یہ مثالیں جو اثیریت

۱- Cleric ۔

۲- Conversion ، جس کے لفظی معنی ہیں تبدیل کرنا ، انقلاب ، معکوسیت ، ضد ، عکس وغیرہ (مترجم) ۔

۳- Cures ، مصنف کا مطلب یہ ہے کہ روحانی معالجات کا ذکر حذف ہو گیا صرف جسمانی معالجات کا ذکر زبانوں پر رہ گیا ، یہ اس امر کا ثبوت ہے معاشرے کی دینی حیثیت میں ضعف آ گیا (مترجم) ۔

۴- Holy day (مقدس دن) ۔ ۵- Holiday یعنی یوم تعطیل ۔

کے صریح خلاف ہیں ، معاشرے کے غیر دینی اور سراسر دنیوی ہونے کی واضح علامتیں ہیں :

فریڈرک دوم[1] اس عظیم القدر انوسنٹ[2] کا شاگرد تھا اور اسی کی نگرانی میں تربیت پائی تھی جس نے کلیسائی نظام حکومت کی بنیاد استوار کی ؛ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اس کے تصور سلطنت میں کلیسائی نظام کی جھلک صاف نمایاں تھی - پوپ برابر اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ اٹلی اور سسلی کو پطرس رسول کی میراث قرار دے کر اپنے قبضے میں لے لیں - فریڈرک دوم کے نزدیک یہ پوری جائداد آگسٹس کی میراث بن گئی ، وہ جانتا تھا کہ جن دنیوی اور دماغی و ذہنی قوتوں کو کلیسا نے اپنی روحانیت میں ضم کر رکھا ہے ، انھیں الگ کرائے اور انھیں کی بنا پر ایک نئی سلطنت کی تعمیر پایۂ تکمیل پر پہنچائے - - - - - ہمیں فریڈرک کی اطالوی رومی سلطنت کی اہمیت کا اندازہ بخوبی کر لینا چاہیے : یہ اطالوی اتحاد پر مبنی ایک وسیع سلطنت تھی جس کے اندر تھوڑی دیر کے لیے جرمن ، رومی اور مشرقی عناصر فراہم ہو گئے تھے ، خود فریڈرک شاہنشاہ عالم اور سلطان معظم تھا ، رومہ کا تاج پہننے والوں میں وہ آخری بادشاہ تھا جن کی قیصریت باربروسا[3] کی طرح محض جرمن

۱- Friderick II (۱۱۹۴ء — ۱۲۵۰ء) جرمنی کا مشہور بادشاہ جو (Hohenstaufen) خاندان میں سے تھا (مترجم) -

۲- Innocent - اس سے مراد پوپ انوسنٹ سوم ہے جو ۱۱۹۸ء میں پاپائیت کی مسند پر بیٹھا اور ۱۲۱۶ء میں فوت ہوا - وہ بڑا زبردست پوپ تھا ، اس نے یورپ کے تمام بادشاہوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا (مترجم) -

۳- Barbarosa ، یعنی فریڈرک اول بادشاہ جرمنی (۱۱۲۱ء - ۱۱۹۰ء) ، اس نے ۱۱۸۸ء میں نئی صلیبی جنگ کا بیڑا اٹھایا تھا اور دو سال بعد شام میں غرقاب ہوا (مترجم) -

بادشاہی ہی سے وابستہ نہ تھی بلکہ سسلی کی مطلق العنان
مشرقیت سے بھی اسے وابستگی حاصل تھی - یہ سب کچھ
جان لینے کے بعد ہم پر واضح ہو سکتا ہے کہ دور احیاء علم
کے تمام مطلق العنان فرمانروا خواہ سکالات[۱] ہوں یا
مونٹ فیلٹر[۲] ، وسکونتی[۳] ہوں یا بورجیا[۴] یا میڈیچی[۵] ،
ہر لحاظ سے فریڈرک دوم کے بیٹے یا جانشین تھے -

ہوہن سٹافن خاندان کے فریڈرک کے جانشینوں کی جو فہرست اوپر دی گئی ہے ، اس میں مزید اضافے کیے جا سکتے اور وہ بیسویں صدی تک چلے آئیں گے - موجودہ دور کی مغربی دنیا نے جو غیر دینی تہذیب پیدا کی ، ایک لحاظ سے وہ فریڈرک ہی کی سپرٹ کی نمود تھی ؛ یہ کہنا بالکل فضول سمجھا جائے گا کہ کلیسا اور بادشاہوں کے درمیان جو کشاکش ہوتی رہی ، اس میں قصوروں کا ذمہ دار صرف ایک فریق تھا - ہم یہاں جو نکتہ پیش کرنا چاہتے ہیں ، یہ ہے کہ مسیحی کلیسا کے بطن سے غیر دینی تہذیب کی غیر طبعی پیدائش کس وجہ سے عمل میں آئی ؟ اس وجہ سے کہ ایک مطلق العنان حکومت کے یونانی ادارے کا احیاء ہو چکا تھا جس میں مذہب کو سیاسیات کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا -

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب ایک تہذیب تیسرے دور میں مذہبی نظام سے علیحدگی اختیار کرتی ہے تو کیا دوسرے دور کی جانشین تہذیب میں احیاء کو تکمیل عمل کا لازمی اور ناگزیر ذریعہ سمجھنا چاہیے؟ اگر ہم ہندو تہذیب کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو وہاں ہمیں موریوں یا گپتوں کی سلطنت کا متوازی احیاء نظر نہیں آتا لیکن اگر ہم ہندوستان سے ہٹ کر چین پر متوجہ ہوں اور مشرق بعید کی تہذیب کے وطن میں اس کی سرگزشت کا معائنہ کریں تو ہمیں رومی سلطنت کے احیاء کا ایک غیر مشتبہ اور واضح مثنٰی ہن سلطنت

۱- Scala - ۳- Visconti -
۲- Montefeltre - ۴- Borgia -
۵- Medici - یہ مختلف اطالوی خاندان تھے جن میں سے ایک ایک کے متعدد افراد برسر کار رہے - بورجیا پوپ ایلگزنڈر ششم کا بیٹا تھا اور اس کی بہن لوکریزیا بورجیا نے بھی بڑی شہرت پائی (مترجم)-

کے سوئی اور تنگ احیاء میں ملتا ہے ؛ فرق صرف یہ ہے کہ سامراج کا چینی احیاء مقدس رومی سلطنت کے یونانی احیاء کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ کامیاب تھا بلکہ مشرق آرتھوڈکس مسیحی معاشرے کے دائرے میں بیزنطینی سلطنت کے یونانی احیاء پر بھی اس لحاظ اسے ترجیح حاصل ہے۔ ہماری موجودہ چھان بین کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر خاص توجہ کا محتاج ہے کہ تیسرے دور کی تہذیب کی تاریخ میں جس طرح پیشرو کا احیاء انتہائی حد پر پہنچ جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ اس مذہبی نظام کی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے میں انتہائی کامیابی حاصل کر لے گی جو اس کی پیشرو کے زمانے میں پیدا ہوا۔ مہایانی بدھ مت جاں بہ لب چینی دنیا کو اپنی طرف کھینچنے میں اسی طرح کامیاب ہوا جس طرح مسیحیت جاں بہ لب یونانی دنیا کو کھینچنے میں کامیاب ہوئی ؛ چینی خلا کے بعد پستی کا جو دور آیا، اس میں یہ بدھ مت مشرق بعید کے اندر اوج کمال پر پہنچ گیا، بعد ازاں اس میں زوال آگیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مردہ تہذیب کا احیاء، زندہ اعلیٰ مذہب سے رجعت پر دلالت کرتا ہے اور احیاء جس حد تک آگے بڑھے گا، اسی پیمانے پر رجعت عمل میں آئے گی۔

اٹھائیسواں باب

زمین پر عسکریت کی دعوت مقابلہ

سابقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو غیر دینی تہذیب مذہبی نظام سے انقطاع اختیار کرتی ہے، وہ پیشرو تہذیب کی زندگی سے مختلف عناصر کی امداد لے کر کامیابی کے راستے پر گامزن ہوتی ہے لیکن ابھی یہ معاملہ غور طلب ہے کہ اس انقطاع کا موقع کیوں کر پیدا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ 'مفاسد کے آغاز' کے لیے ہمیں اس مذہبی نظام کی کسی خامی یا غلطی کی تلاش کرنی چاہیے جس کے نقصان پر یہ انفجار رو نما ہوتا ہے۔

مذہبی نظام کے لیے ایک خوفناک مرحلہ خود اس کی علت بقا میں مضمر ہوتا ہے، وہ روئے ارض پر اس وجہ سے جنگ جویانہ حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ اس دنیا کو شہر خدا کی طرف لانے کا تقاضا یہی ہوتا ہے؛ اس کا مطلب یہ ٹھہرا کر مذہبی نظام کو غیر دینی اور روحانی دونوں قسم کے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ زمین پر ایک ادارے کی حیثیت میں منظم ہو جاتا ہے۔ وہ منحرف ماحول میں خدا کا کام انجام دینے کی غرض سے اپنی اثیری برہنگی کو وسیع ادارتی کھال سے چھپا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس کی صورت حال کو اس کی روحانی فطرت سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی لہٰذا اس امر پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اولیا کے مجمع کی کسی ارضی چوکی پر آفت نازل ہو جاتی ہے اس لیے کہ وہ مجمع اس دنیا میں کوئی روحانی کام اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک غیر دینی مسائل کے حل پر توجہ نہ ہو اور اس حل کے لیے ادارتی آلات و مسائل کے بغیر کام نہیں چلتا۔

اس سلسلے کا مشہور المیہ ہلڈی برنیڈ کے پاپائیت[1] کی سرگزشت ہے اور

۱- Hildebrandine Papcy - اس سے مراد گریگوری ہفتم کا عہد پاپائی ہے جس کا اصل نام ہلڈی برانڈ تھا (مترجم)۔

هم اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں بتا چکے ہیں کہ کس طرح علل و معلولات کی بہ ظاہر ایک نا گزیر سلسلہ بندی نے ہلڈی برنیڈ کو بلند چٹان کے ایک خطرناک حصے پر پہنچایا ۔ پادریوں میں مالی اور شہوانی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں ، انھیں ختم کرنے کے لیے جو کشمکش پیش آگئی تھی ، ہلڈی برنیڈ اگر اس میں پوری قوت سے شریک نہ ہو جاتا تو وہ خدا کی سچی خدمت گزاری کا شرف کھو بیٹھتا اور پادریوں کی یہ اصلاح اس وقت تک انجام نہ پا سکتی تھی جب تک نظام کلیسا کو زیادہ سے زیادہ سخت اور بے لچک نہ بنا لیا جاتا ۔ اس نظام میں استحکام پیدا کرنے کی صورت یہی تھی کہ پاپائیت اور سلطنت کے حقوق اقتدار کی حد بندی ہو جاتی ؛ چونکہ جاگیردارانہ نظام کے دور میں پاپائیت اور سلطنت کے وظائف بے طرح خلط ملط ہو چکے تھے لہٰذا ہلڈی برنیڈ پاپائیت کے نقطۂ نگاہ سے اطمینان بخش حد بندی کا بندوبست اس وقت تک نہ کر سکتا تھا جب تک سلطنت کے حدود میں مداخلت نہ کرتا اور اس مداخلت کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنا بالکل ناگزیر تھا جسے کوئی بھی سلطنت پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھ سکتی تھی ۔ اس وجہ سے کشمکش شروع ہوگئی ؛ ابتدائی تصادم صرف اعلانات و منشورات تک محدود رہا لیکن بہت جلد اس نے باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کرلی جس میں فریقین نے قوتیں استعمال کیں گویا دونوں طرف سے روپیہ بھی استعمال ہوا اور توپیں بھی ۔

ہلڈی برنیڈ کے کلیسا کا المیہ روحانی رجعت کی ایک نمایاں مثال ہے ۔ اس المیے کا سبب یہ ہوا کہ کلیسا دنیوی معاملات میں الجھ گیا اور اسے اپنا اصل کام انجام دینے کے سلسلے میں عمل کے غیر دینی طریقے اختیار کرنے پڑے ۔ ایک اور بھی صاف اور عریض راستہ ہے جو روحانی اعتبار سے تباہ کن دنیا داری پر منتج ہوتا ہے ؛ مذہبی نظام بعض اوقات اپنے معیار کے مطابق عمل پیرائی کی کوشش میں بھی روحانی لحاظ سے رجعت قہقری پر پہنچ جاتا ہے ، دنیوی معاشروں کے صحیح مجلسی مقاصد کے متعلق خدا کی مرضی صرف جزوی طور ہی پر معلوم ہو سکتی ہے اور یہ دنیوی مقاصد ان لوگوں کے ذریعے سے زیادہ کامیابی کے ساتھ پورے ہو سکتے ہیں جو ان مقاصد کو آخری نصب العین نہیں سمجھتے بلکہ کسی بلند تر نصب العین کے لیے ساعی ہوتے ہیں ۔ اس قانون کے عمل کی دو معیاری مثالیں موجود ہیں یعنی

سینٹ بینی ڈکٹ اور پوپ گریگوری اعظم کے کارنامے ۔ یہ دونوں روحانی شخصیتیں چاہتی تھیں کہ مغرب میں خانقاہی طریق زندگی کو رواج دیں لیکن ان دو شخصیتوں نے جنہیں دنیا داری سے کوئی تعلق نہ تھا ، اپنے روحانی کام کے سلسلے میں ضمناً وہ عظیم القدر اقتصادی کارنامے انجام دیے جو دنیادار مدبروں کے ہاتھوں کبھی انجام نہ پا سکتے تھے ۔ ان اقتصادی کارناموں کی تعریف و ستائش وہ مورخ بھی کریں گے جو مسیحیت کے پیرو ہیں اور وہ مورخ بھی جو کارل مارکس کے اصول پر کار بند ہیں لیکن اگر یہ تعریف و ستائش بینی ڈکٹ اور گریگوری کے کانوں تک دوسری دنیا میں پہنچ سکے تو انہیں حسرت و افسوس کے ساتھ اپنے خداوند کا وہ قول یاد آ جائے گا کہ جب سب لوگ تمہاری تعریف کرنے لگیں تو تم پر افسوس اور اگر وہ اس دنیا میں دوبارہ آ جائیں تو انہیں یہ دیکھ کر سخت رنج ہو کہ ان کی روحانی کوششوں سے جو اقتصادی نتائج نکلے ، ان کے اخلاقی اثرات کیا برآمد ہوئے۔

حوصلہ فرسا حقیقت یہ ہے کہ روحانی مشقتوں سے ضمناً جو مادی نتائج پیدا ہوتے ہیں ، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ محض روحانی کامیابی ہی کے وثیقے ہوتے ہیں؛ نہیں ، وہ ایسے پھندے بھی ہوتے ہیں جن میں روحانی پہلوان اس سے بھی زیادہ بری طرح اُلجھ جاتا ہے جس طرح ہلڈی برنیڈ سیاست اور جنگ میں اُلجھ کر تباہ ہوا تھا ۔ سینٹ بینی ڈکٹ کے زمانے سے نام نہاد اصلاح مذہب میں کلیسائی اداروں کی غارت گری تک ایک ہزار سال کی خانقاہی تاریخ سب کو معلوم ہے ، پراٹسٹنٹوں یا مسیحیت کے مخالفوں نے جو الزامات عائد کیے ہیں ، ان سب کو صحیح سمجھنا غیر ضروری ہے ؛ جو اقتباس آگے پیش کیا جا رہا ہے ، وہ موجودہ زمانے کے ایک فاضل کی تحریر سے ہے اور اس کے خانقاہوں کے خلاف تعصب کا شبہ نہیں ہو سکتا ؛ یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ جو تفصیلات اس اقتباس میں پیش کی گئی ہیں ، وہ اس دور سے تعلق نہیں رکھتیں جسے رہبانی اور خانقاہی نظام کا آخری اور بد ترین دور سمجھا جاتا ہے یعنی اصلاح مذہب سے پیشتر کا دور :

> صدر خانقاہ اور خانقاہ کے درمیان جو خلیج حائل ہوئی وہ مال و دولت کی فراہمی نے پیدا کی ؛ وقت گزرتا گیا اور خانقاہوں کی جائدادیں اس درجے وسیع ہو گئیں کہ ہر خانقاہ کے صدر کو زمینوں کے انتظامات اور ان سے متعلقہ

ذمہ داریاں کسی دوسری طرف متوجہ ہی نہ ہونے دیتی تھیں ۔ اس طرح خود راہبوں کے درمیان بھی جاگیروں اور فرائض کی تقسیم جاری تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر خانقاہ نے بجائے خود مستقل حیثیت اختیار کرلی تھی ، اس کی آمدنی بھی الگ رکھی جاتی تھی اور اس کی ذمہ داریاں بھی خاص تھیں ۔ ڈام ڈیوڈ نوئلز[1] کہتا ہے کہ ایسے ہی کاروبار میں ہر خانقاہ کی صلاحیت و قابلیت صرف ہو رہی تھی ؛ صرف ونچسٹر ، کینٹربری اور سینٹ ایابنس[2] جیسی خانقاہیں مستثنٰی سمجھی جا سکتی ہیں جہاں زبردست دماغی اور فنی مفاد کار فرما تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی خانقاہیں بھی تھیں جن کے پاس جائدادیں اور جاگیریں نہ تھیں مگر ان میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے لوگ موجود تھے ؛ ان لوگوں کو وسیع جاگیروں اور جائدادوں والی خانقاہوں میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھانے کا موقع مل جاتا تھا[3]۔

لیکن یہ کہ دینا چاہیے کہ جن راہبوں نے اپنے درجے سے نیچے اتر کر کامیاب کاروباری آدمیوں کی حیثیت اختیار کر لی تھی ، صرف انھیں روحانی رجعت کی بدترین مثال نہ سمجھنا چاہیے ؛ شہر خدا کے باشندے کے لیے اس دنیا میں بدترین شے یہ نہیں کہ وہ سیاسیات میں حصہ لینے لگے یا کاروبار میں مشغول ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ اس ادارےکو بت بنا کر پوجنے لگے جو زمین جنگجو مذہبی نظام کے لیے نامکمل مگر ناگزیر طور پر پیکر مہیا کرتا ہے ۔ اگر بہترین کی تخریب بدترین شے ہے تو مذہبی نظام کی پرستش ایک ایسے بت کی پرستش ہے کہ کسی انسانی و مکوڑے کو لوتیان سمجھ کر پوجنا اتنا برباد کن نہ ہوگا ۔

۱- Dom David Knowles -

۲- Winchester ، Canterbury ، Saint Albans ، یہ تینوں انگلستان کے مقامات ہیں (مترجم) ۔

۳- جے ۔ آر ۔ ایچ مورمین (Moorman) کی کتاب تیرھویں صدی میں انگلستان کی کلیسائی زندگی (Church Life in England in the 13th Century) صفحات ۲۷۹—۲۸۰ ، ۲۸۳ ، ۳۵۳ ۔

جب کوئی مذہبی نظام اس عقیدے میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ محض حق کا حامل ھی نہیں بلکہ حق کی مکمل اور معین شکل میں اس کا واحد حامل ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مذہبی نظام بت پرستی میں مبتلا ہو گیا اور ایورنس[1] کی پستی میں قدم رکھنے کا خاص امکان اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس پر کوئی زبردست ضرب لگتی ہے ، بالخصوص اس حالت میں کہ ضرب لگانے والا خود اس نظام کا رکن ہو ۔ اس کی معیاری مثال رومن کیتھولک مذہب کی وہ مجلس کلیساء ہے جو ٹرنٹ میں قائم تھی[2] اور جو تحریک اصلاح مذہب کے مقابلے کے لیے قائم ہوئی تھی یا کہ لیجیے ، جس نقطۂ نگاہ سے غیر رومن کیتھولک اسے دیکھتے تھے ۔ یہ سطریں سپرد قلم کرنے کے وقت تک اس پر چار سو سال پورے ہو چکے تھے اور وہ مجلس چوکس کھڑی تھی ؛ اس کی وضع و ہیئت ویسی ہی سخت تھی ، جیسے اس کو نگرانی میں کسی ڈھیل کی کوئی گنجائش نہ تھی ، اس نے پاپائیت کا بھاری خود سر پر پہن رکھا تھا ، مقدس قیادت کا چار آئینہ سینے پر بندھا تھا ، دعاؤں کے سخت و شدید نظام کے زیر و بم پر وہ خدا کے روبرو احترام کا اقرار کرتی رہتی تھی ؛ اس بھاری اداری زرہ بکتر کا نیم شعوری مدعا یہ تھا کہ اس دنیا کے دوسروے مادی اداروں میں سے جو ادارے حد درجے مستحکم و مضبوط ہیں ، ان سے بھی استحکام میں بازی لے جائے ۔ بیسویں صدی مسیحی میں ایک کیتھولک نقاد پرائسٹنٹ تاریخ کے چار صد سالہ دور کی روشنی میں پورے وثوق سے کہ سکتا تھا کہ ٹرنٹ والی کونسل سے پیشتر کے کیتھولک مذہب کے ہلکے ساز و سامان کے خلاف بھی بے اطمینانی قبل از وقت تھی ۔ یہ دعویٰ درست اور قابل قبول بھی ہو تو اس سے نہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ مشکلات و موانع کا دور کرنا ہر حال میں غیر مناسب ہوتا ہے نہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ٹرنٹ کی کونسل

۱۔ Avernus ۔ لفظی معنی ''پرندوں کے بغیر''۔ کمپانیا (اٹلی) میں ایک جھیل ہے جس کی سطح پر سے گندھک کے نیز دوسرے بدبودار ابخرات برابر اڑتے رہتے ہیں ، وہ کسی پرندے کے حلق سے نیچے اتر جائیں تو وہ فوراً مر جاتا ہے ، شاعروں نے اسے دوزخ کے طبقات کا باب داخلہ قرار دے لیا (مترجم) ۔

۲۔ رومن کیتھولک مذہب کی وہ کونسل جو ٹرنٹ (ٹائرول) میں ۱۵۴۵ء ۔ ۱۵۶۳ء تک منعقد ہوئی ، اسے (Tridentine) کونسل کہتے تھے (مترجم) ۔

نے غلطیوں کا جو انبار لگا دیا تھا وہ غیر مناسب نہ تھا[1]۔

ہم اعلیٰ مذاہب سے غیر دینی تہذیبوں کے مہمل اعادے تک رجعت قہقری کے بعض اسباب کا سراغ لگا سکے ہیں اور ہر مثال کے سلسلے میں یہی واضح ہوتا رہا کہ افتادگی کی رفتار تیز تر ہوتی گئی اس لیے نہیں کہ ضرورت اس کی متقاضی تھی یا کوئی بیرونی قوت اس کی حرکت میں موید ہو گئی تھی بلکہ صرف اس ابتدائی گناہ کی بنا پر جو انسانی فطرت میں مضمر ہوتا ہے ۔ لیکن اگر اعلیٰ مذاہب سے رجعت ابتدائی گناہ کا نتیجہ ہے تو کیا ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رجعت ناگزیر ہوتی ہے ؟ اگر اسے ناگزیر مان لیا جائے

۱۔ سابقہ پارہ اور اس کے ساتھ کتاب کا یہ بقیہ حصہ مصنف نے ٹائپ کرا کے اپنے دوست مسٹر مارٹن وھائٹ (Wight) کے پاس بھیج دیا ۔ اصل کتاب میں دوست مذکور کے متعدد تبصرے شامل ہیں ، ان میں سے ایک یہ بھی ہے : رومن کیتھولک نقاد انھیں الفاظ میں جواب دے گا جو آپ بارہا نقل کر چکے ہیں یعنی انجام پر نظر رکھو ۔ یہ پورا حصہ محض قیاس کی بنا پر لکھا گیا ہے ، یہ ابھی تک وقوع میں نہیں آیا ، کیا یہ واقعہ نہیں کہ رومن کلیسا بیسویں صدی میں اس سے زیادہ قوی اور با اثر ہے جتنا ٹرنٹ کی کونسل کے وقت تھا ؟ ۱۸۷۰ء میں اس کلیسا نے پوپ کی معصومیت کو اپنے عقائد میں شامل کر لیا حالانکہ اس وقت اس کا اثر و رسوخ پست درجے پر آ گیا تھا ، ۱۹۵۰ء میں اس کلیسا نے حضرت مریم[4] عذرا کی عید استقبال کو اپنے عقائد کا جزو بنایا ۔ کیا یہ ویسا ہی قرین وقوع نہیں کہ رومن کلیسا اپنی ٹرنٹ والی زرہ کے ساتھ تنہا مغربی ادارہ ہو گا جو نئی لا مذہب مطلق العنان کمیونسٹ حکومت کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہو جائے گا اور اسی سلسلے میں وہ تنہا مغربی ادارہ ہو گا ؟ کیا یہی وجہ نہیں کہ ماسکو ویٹی کن کو خاص خوف اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے ؟ اگر یہ سچ ہے تو اسے ڈینو سار کی کھال سے نہیں ، ایک طویل اور کامیاب محصوریت سے تشبیہ دینی چاہیے ؛ کیتھولک تاریخ کے عہد ٹرنٹ کو نظر باز گشت میں برطانوی تاریخ کا وہ چرچلی دور قرار دینا چاہیے جو (دوسری جنگ عظیم میں) فرانس کی شکست سے شروع ہوا اور اس وقت تک جاری رہا جب تک یورپ پر اتحادیوں نے آخری کامیاب حملہ نہ کیا ۔

تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین پر جنگ جوئی کا چیلنج بڑا سخت ہوتا ہے اور کوئی مذہبی نظام اس کے مقابلے میں کھڑا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں پھر ابتدائی نظریے کی طرف رخ پھیرنا پڑے گا یعنی یہ کہ مذہبی نظام تہذیبوں کے مہمل اعادے کے لیے عارضی ''پہلے'' کا وظیفہ انجام دینے کے سوا کسی بھی کام کے نہیں ہوتے لیکن کیا اسے قطعی حقیقت مان لینا چاہیے؟ پھر کیا ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ خدا کی طرف سے جو روشنی ہماری طرف آتی ہے، وہ ہمیشہ ایک ناقابل فہم تاریکی میں مستور ہو جاتی ہے۔ اسے ماننے سے پیشتر ہمیں ان تنویرات پر پھر ایک مرتبہ نظر ڈال لینی چاہیے جو اعلیٰ مذاہب کے ظہور سے اس دنیا میں آتی رہیں اس لیے کہ ممکن ہے گزشتہ روحانی تاریخ کے یہ ابواب اس رجعت کے بعد روحانی بحالی کے لیے فال نیک ثابت ہوں جس میں جنگ جُو مذہبی نظام مبتلا ہو سکتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی روحانی پیش قدمی کے جو سنگ ہائے میل جابجا حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، دوسرے انبیاؑ اور مسیحؑ کے ناموں پر نصب ہیں، ایسے مقامات پر نصب ہیں جنھیں ایک ناظر غیر دینی تہذیبوں کی شکست اور ان کے انقطاع سفر کے مقامات قرار دے گا؛ تجربیاتی شہادت کی بنا پر ہمارے لیے یہ سمجھنے کی وجہ موجود ہے کہ ممکن ہے انسان کی مذہبی تاریخ کے ان اعلیٰ نقاط اور غیر دینی تاریخ کے ادنیٰ نقاط کا یہ توافق انسان کی ارضی زندگی کا ایک ''قانون'' ہو۔ اگر واقعہ یہی ہے تو ہمیں اس نتیجے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ غیر دینی تاریخ کے اعلیٰ نقاط مذہبی تاریخ کے ادنیٰ نقاط سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور دنیاداری کے زوال پر جو مذہبی کارنامے انجام پاتے ہیں، انھیں محض روحانی پیش قدمی ہی نہیں بلکہ روحانی بحالی بھی قرار دیا جا سکتا ہے، کہانی کی روایتی تعبیر کے مطابق انھیں بحالیاں ہی قرار دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر عبرانی اساطیر میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت خدا سے اس برگشتگی و سرکشی کے بعد شروع ہوئی جس کے ذمہ دار برج بابل کے خود اعتماد معمار تھے؛ حضرت موسیٰؑ کا وظیفہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ خدا کی برگزیدہ قوم کو راہ نجات پر لگائیں جس کے لیے مصر کی ہانڈیوں کے گوشت سے لذت اندوزی روحانی اعتبار سے نا مبارک ثابت ہوئی تھی؛

انبیائے بنی اسرائیل کی دعوتوں میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ لوگوں کو اس روحانی روگردانی سے تائب ہونے کی دعوت دیں، یہ روگردانی یہواہ کے اس عطا کیے ہوئے ملک سے مادی فائدے حاصل کرنے کا نتیجہ تھی جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔ حضرت مسیح[۴] کی موت ایک دنیادار مورخ کو یونانی دور مصائب کی تمام تکالیف سے لبریز نظر آتی ہے، ان کی دعوت کو انجیلوں نے ایسے انداز میں پیش کیا ہے گویا خدا نے خود مداخلت ضروری سمجھی اور جو میثاق ایک زمانے میں صرف اسرائیل سے لیا گیا تھا، اسے تمام عالم انسانیت تک پھیلا دیا اس لیے کہ اسرائیل کی روحانی میراث کو اس کی اولاد نے فریسیوں کے رسوم پرستی، صدوقیوں کی مادیت، ہیرودیسیوں کی موقع پرستی اور زیلقوں[۱] (جنونی یہودیوں) کے شدید تعصب سے آلودہ کر دیا تھا۔

اس بنا پر روحانی تنویر کے چار عظیم الشان واقعات در اصل چار روحانی گرھنوں کا نتیجہ تھے، ساتھ ھی چار دنیوی تباھیاں آچکی تھیں۔ ھم کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں دیکھ چکے ھیں کہ مادی اعتبار سے مشکل اور سخت ماحول عظیم الشان دنیوی کارناموں کی پرورش گاھیں ثابت ھو سکتے ھیں؛ اس طرح جن احوال و ظروف میں روحانی اعتبار سے مشکلیں اور دقتیں پیش آتی ھیں، ان سے مذھبی مجاھدات کے لیے خاص سازگاری کی امید رکھی جا سکتی ھے۔ روحانی اعتبار سے مشقت خیز ماحول وہ ھوگا جہاں روحانی بلند پروازیوں پر ھر طرف سے مادی اقبال مندی کا دباؤ پڑے گا؛ دنیوی خوش حالی کے مضر اور سم آلود ابخرات عوام کو پیکر حریت بنا دیتے ھیں لیکن وھی ابخرات زیادہ حساس اور مشقت پسند روحوں کو اس دنیا کی دل فریبیوں کے مقابلے پر بھی آمادہ کر سکتے ھیں۔

اب یہ سوال سامنے آتا ھے کہ کیا بیسویں صدی مسیحی کی دنیا میں مذھب کی طرف از سر نو توجہ کو روحانی پیش قدمی کی علامت سمجھا جائے گا یا اس کے متعلق یہ رائے قائم کی جائے گی کہ زندگی کے ٹھوس حقائق سے

۱- Zelotes، یہودیوں کا ایک نہایت سخت گیر اور انتہا پسند فرقہ جس کے افراد موسوی شریعت کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بے تکلف موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے (مترجم)۔

ناممکن کنارہ کشی کی یہ نہایت گری ہوئی کوشش ہے؟ اس سوال کا جواب ایک حد تک اس اندازے پر مبنی ہوگا جو روحانی نشو و ارتقا کے ممکنات کی نسبت کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس اغلب صورت حال کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ موجودہ دور کی مغربی تہذیب کی عالم گیر وسعت مستقبل قریب میں ایک ایسی سیاسی شکل اختیار کر سکتی ہے جو بنی نوع انسان کے نصب العین کو سیاسی اعتبار سے پورا کر دے گی اس لیے کہ پورے کرہ ارض پر ایک ایسی دولت مشترکہ قائم ہو جائے گی جس میں مادی حدود کا کوئی نشان باقی نہ رہے گا۔ اس سلسلے میں اس امکان پر بھی غور کیا جا چکا ہے کہ اس عالم گیر دولت مشترکہ میں چاروں زندہ اعلیٰ مذاہب کے پیرو یہ تسلیم کر لینے پر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ ان کے جداگانہ نظام ایک خدائے برحق تک پہنچنے کے جداگانہ راستے میں اور انھیں ایک مبارک و مسعود نور کی جداگانہ جزوی جھلکیاں قرار دینا چاہیے۔ ہم یہ خیال بھی پیش کر چکے ہیں کہ اس روشنی میں تاریخی مذہبی نظام وحدت میں کثرت کا مظہر بن سکتے ہیں اور اس طرح وہ مل جل کر ایک واحد مجاہد مذہبی نظام کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ سب کچھ اسی طرح واقع ہوگا تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین پر خدا کی بادشاہت قائم ہوگئی ہے؟ بیسویں صدی کی مغربی دنیا میں اس سوال سے مفر نہیں اس لیے اکثر غیر دینی نظریات کا مدعا زمین پر کسی نہ کسی نوع کی جنت کے سوا کچھ نہیں، راقم سطور کے نزدیک اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔

نفی میں جواب دینے کی بدیہی وجہ معاشرے کی فطرت اور انسان کی طبیعت میں نمایاں ہے؛ معاشرہ شخصیتوں کے دوائر عمل کے درمیان ایک مشترکہ زمین کے سوا کیا ہے اور انسانی شخصیت میں جس طرح نیکی کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح بدی کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ جس طرح کے واحد مجاہد مذہبی نظام کے قیام کا تصور ہم نے پیش کیا ہے، وہ انسان کو ابتدائی گناہ سے پاک نہ کر سکے گا؛ بلاشبہ یہ دنیا خدا کی بادشاہت کا ایک حصہ ہے لیکن ایسا حصہ جو خدا سے باغی ہے اور صورت حال ایسی ہے کہ یہ ہمیشہ باغی ہی رہے گا۔

آٹھواں حصہ

سورماؤں کے زمانے

انتیسواں باب

المیے کی رفتار و روش

۱۔ ایک مجلس بند

جب جاذب و خلاق اقلیت مقتدر اقلیت بن کر نفرت انگیز صورت اختیار کر لیتی ہے اور ارتقاء پذیر تہذیب بگڑتے بگڑتے شکست کی منزل میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تہذیب سے پیشتر کے معاشرے میں جو لوگ عقیدت مند بنے تھے اور وہ تہذیب کے دور ارتقاء میں ثقافتی تنوبر کے اثرات سے مختلف درجوں میں متاثر ہوتے رہے تھے، اجنبیت اختیار کرلیتے ہیں ، ان سابقہ عقیدت مندوں کی روش بدل جاتی ہے اور وہ تہذیب کی نقالی اور تقلید کے بجائے دشمنی اختیار کر لیتے ہیں ، دشمنی جنگ پر منتج ہوتی ہے - یہ جنگ اور یہ کشمکش دو متبادل نتیجوں میں سے کوئی ایک نتیجہ ضرور پیدا کرتی ہے : جس محاذ پر مقامی حالات جارح تہذیب کو یہ موقع دے دیتے ہیں کہ وہ کسی طبعی سرحد کی طرف پیش قدمی کرتی جائے مثلاً کوئی سمندر آ جائے جس میں جہاز رانی نہیں ہوئی ، کوئی صحرائی علاقہ ہو جس میں پہلے آمد و رفت کا کوئی نشان موجود نہیں یا کوئی ایسا پہاڑی سلسلہ آ جائے جس میں سے گزرنا مشکل ہو تو سرحدی بربری قطعی طور پر مفتوح ہو جاتے ہیں لیکن جہاں ایسی کوئی طبعی سرحد موجود نہیں ہوتی ، جغرافیائی حالات ان بربریوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ جہاں پسپا ہونے والے بربریوں کے عقب میں نقل و حرکت کے لیے لامتنہاھی گنجائش موجود ہو تو ہر لحظہ بدلنے والا جنگی محاذ زو دیا بہ دیر کسی ایسے خط پر پہنچ جائے گا کہ جارح تہذیب کی فوجی برتری بے اثر ہو جائے گی۔ اس لیے کہ جارح کے جنگی مرکز سے محاذ کا فاصلہ ہر لحظہ بڑھتا جائے گا۔

ایسے خط کے ساتھ ساتھ جنگ کے لیے نقل و حرکت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا ، آگے بڑھنے کی کوئی شکل نہ رہے گی اور کسی فوجی نتیجے پر پہنچے

بغیر جنگ ٹھہراؤ کی صورت اختیار کر لے گی ، دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابلے میں جم کر بیٹھ جائیں گے اور پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے یعنی وہی صورت عود کر آئے گی جو تہذیب کی خلاق اقلیت اور اس کے عقیدت مندوں کے درمیان تہذیب کی شکست سے پیشتر موجود تھی البتہ ان کے مابین رزم و پیکار کے شعلے نہ بھڑکے تھے لیکن دونوں فریقوں کے درمیان نفسیاتی تعلقات ایسی صورت اختیار نہ کریں گے کہ دشمنی ختم ہو جائے اور ایک کی خلاقیت کا اثر حسب سابق دوسرے پر پڑنے لگے ؛ وہ جغرافیائی حالات بھی بحال نہ ہوں گے جن کے ماتحت ثقافتی روابط کا سلسلہ جاری ہوا تھا ۔ دور نشو و ارتقاء میں تہذیب نے اردگرد کے بربری گروہوں کے لیے ایک چوڑی دہلیز کے ساتھ ساتھ روک تھام کا بندوبست کر لیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ موقع بھی پیدا کر دیا تھا کہ وہ جب کسی راستے سے اندر آنا چاہیں تو بہ آسانی اندر آجائیں ؛ جب دوستی نے دشمنی کی شکل اختیار کی تو یہ ناقل ثقافتی دہلیز ایک فوجی محاذ بن گئی ، یہ تبدیلی اُن حالات کا جغرافیائی مظہر ہے جو سورماؤں کا دور پیدا کرتے ہیں ۔

سورماؤں کا دور درحقیقت جنگی محاذ کے واضح اور منقح ہونے کا مجلسی اور نفسیاتی نتیجہ ہے ؛ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان واقعات کے نتائج کی تفتیش کریں ۔ اس تفتیش کے سلسلے میں ایک ضروری پس منظر یہ ہے کہ ان بربری جنگی گروہوں کا موازنہ کر لیں جو مختلف ہمہ گیر سلطنتوں کی سرحدات کے مختلف حصوں میں بیٹھے ہوتے ہیں ؛ اس قسم کا موازنہ ہم نے کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ جنگی گروہ فرقہ وار مذاہب اور رزمیہ نظموں کے دوائر میں نمایاں کارنامے انجام دیتے ہیں ، موجودہ تفتیش کے سلسلے میں ہم سابقہ مباحث کو دوہرائیں گے نہیں صرف مثالیں پیش کریں گے ۔

ایک فوجی سرحد کو ہم ایک ایسے زبردست بند سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں جو ایک مسدود وادی میں تعمیر کیا گیا ہو ؛ یہ انسانی ہنر مندی اور قوت کا ایک نہایت زبردست کارنامہ ہوتا ہے جس میں قدرت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن یہ کارنامہ مشتبہ ہوتا ہے اس لیے کہ کوئی ہنر مندی انسان کو قدرت کے مقابلے میں کامیاب ہونے کا حوصلہ نہیں دلا سکتی اور اسے پاداش ضرور بھگتنی پڑے گی ۔

''مسلمان عربوں کی ایک روایت مظہر ہے کہ ایک زمانے میں یمن کے اندر آبپاری کے لیے مہندسوں نے ایک عظیم الشان بند تیار کیا تھا جو بند مارب یا سدمارب کے نام سے مشہور تھا؛ یمن کے مشرق پہاڑوں کا پانی وہاں ایک وسیع ذخیرہ آب کی شکل میں جمع ہوتا تھا اور اس سے بہت بڑے علاقے میں آبپاری کی جاتی تھی، اعلیٰ پیمانے پر کھیتی باڑی ہوتی تھی جس سے گنجی ہوئی آبادی کے لیے غلہ پیدا کیا جاتا تھا۔ روایت مظہر ہے کہ کچھ مدت گزر جانے کے بعد یہ سد یا بند ٹوٹ گیا، پانی کے جمع شدہ ذخیرے نے ارد گرد کے علاقے کی ہر چیز تباہ کرڈالی اور ملک کے باشندوں کی حالت اس درجے نازک ہو گئی کہ بہت سے قبیلے ترک وطن پر مجبور ہوئے[1]۔

اس کہانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عربوں میں ہمہ گیر جہاں گردی کا ابتدائی جذبہ کیوں کر پیدا ہوا جس نے انجام کار انھیں ایک طرف ٹین شن[2] اور دوسری طرف جبل البرانس[3] کے پار پہنچا دیا؛ اگر ہم اسے ایک مثال قرار دے لیں تو یہی کہانی ہر بڑی سلطنت کی سرحدوں کے تعلق میں درست ثابت ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ فوجی بند کے ٹوٹنے سے جو مجلسی مصیبت پیش آتی ہے، آیا اُسے ناگزیر سمجھنا چاہیے یا اُس کی روک تھام کا بندوبست ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں اُن مجلسی اور نفسیاتی اثرات کا تجزیہ کرنا چاہیے جو ایک تہذیب اور اس کے خارجی پرولتار کے باہم طبعی تعلقات میں بند تعمیر کرنے والوں کی مداخلت سے پیدا ہوتے ہیں۔

۱- کائٹانی (Caetani) کی کتاب ''مشرقی کہانیوں کا مطالعہ''، جلد اول، صفحہ ۲۶۶ -

۲- Tien Shan، چینی ترکستان کی شمالی سرحد کا ایک پہاڑ جس کی بعض چوٹیاں ۲۴ ہزار فٹ بلند ہیں، شن چینی زبان میں پہاڑی سلسلے کو کہتے ہیں (مترجم) -

۳- Pyrenees، ہسپانیہ اور فرانس کا درمیانی پہاڑ جسے عرب جبل البرانس کہتے تھے، یہ پرینیز کی تعریب تھی (مترجم) -

بند تعمیر کرنے کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ اوپر کی طرف پانی کا ایک ذخیرہ مہیا ہو جاتا ہے؛ یہ ذخیرہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن بہ ہر حال محدود ہوتا ہے، اس میں اپنے طاس کے اندر آنے والے پانی کا بھی صرف ایک حصہ سما سکتا ہے؛ بند کے ساتھ ہی پانی میں ڈوبے ہوئے خطے اور اس کے باہر کے بلند اور خشک خطے کا فرق بالکل واضح ہوگا۔ ہم اس سے پیشتر ایک سلسلۂ بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ جو بربری سرحد کے قریب ہوتے ہیں، اُن کی زندگی میں اور جو ذرا دور ہوتے ہیں، اُن کی غیر منقطع خوابیدگی کی حالت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ سلافی قوم کم و بیش دو ہزار سال تک پری پٹ[1] کی دلدلوں میں چپ چاپ قدیمی طور طریقوں پر زندگی بسر کرتی رہی حالانکہ اسی زمانے میں پہلے اکائی بربریوں کے اندر ہنگامے کا جوش و خروش پیدا ہوا؛ وہ منویوں کی بحری حکمرانی کے اس ارضی حاشیے کے قریب تر تھے جو یورپ کی سمت تھا؛ نیز ٹیوٹانی بربریوں کو ایسے ہی تجربے سے سابقہ پڑا اور وہ رومی سلطنت کی یورپی حد سے قریب تر بیٹھے تھے۔ سوال یہ ہے کہ "ذخیرۂ آب" کے بربری کیوں غیر معمولی طور پر جوش میں آتے رہے؟ انہیں تگ و دو کی وہ سرگرمی اور بے پناہی کہاں سے ملی جس کی بنا پر سرحدیں توڑ کر اندر داخل ہونے کے قابل بن گئے؟ ان سوالوں کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں مشرقی ایشیا کے جغرافیائی ماحول پر اپنی تمثیل کے رنگ میں نظر ڈالنی چاہیے۔

چین کے دو صوبے شن سی اور شان سی ہیں اور چین کی بڑی دیوار ان صوبوں میں سے بھی گزرتی ہے؛ آؤ ہم فرض کر لیں کہ اس خطے کی کسی بلند وادی کے آر پار ایک خیالی بند تعمیر ہو چکا ہے. جسے ہم اپنی تمثیل کے مطابق سرحد قرار دے سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں پانی کا جو زبردست ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور ہر لحظہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے، وہ اصلاً کہاں سے آتا ہے؟ بہ ظاہر یہ پانی اسی ندی میں سے آئے گا جس پر بند باندھا گیا ہے لیکن اس کا اصل سر چشمہ یہ ندی نہیں اس لیے کہ بند اور

۱- Pripet Marshes، پولینڈ اور روس کے درمیان یہ دلدلیں کوئی تیس ہزار مربع میل کے رقبے میں تھیں، اب ان کا بڑا حصہ ختم ہو چکا ہے (مترجم)۔

پن دھارے میں فرق بہت تھوڑا ہے اور پن دھارے کے پیچھے منگولیا کی خشک سطح مرتفع پھیلی ہوئی ہے؛ پانی کا اصل سر چشمہ بند کے اوپر کی طرف نہیں بلکہ نیچے کی طرف دیکھنا چاہیے، اصل سر چشمہ منگولیا کی سطح مرتفع نہیں بلکہ بحرالکاہل ہے جس کے پانی کو آفتاب کی حدت بخارات بنا کر اڑاتی ہے، مشرقی ہوا ان بخارات کو ٹھنڈے خطے میں پہنچاتی ہے تو یہ جم جاتے ہیں، پھر مینہ بن کر ندی کے طاس میں گر جاتے ہیں؛ مطلب یہ ہے کہ سرحد کی بربری سمت میں جو نفسیاتی قوت آہستہ آہستہ فراہم ہوتی رہتی ہے، اس کا صرف حقیر سا حصہ سرحد پار کے بربریوں کی اپنی فرومایہ مجلسی میراث سے حاصل ہوتا ہے، بہت بڑا حصہ جو اس تہذیب کے وسیع ذخیروں سے حاصل کیا جاتا ہے جس کی حفاظت کے لیے بند تعمیر کیا گیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ نفسیاتی قوت کی ہیئت کیوں کر تبدیل ہوتی ہے؟ عمل تبدیل کی کیفیت یہ ہے کہ ایک ثقافت کے اجزأ میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور نئی ثقافت ترکیب پانے لگتی ہے۔ ہم اس کتاب کے کسی دوسرے حصے میں ثقافت کی مجلسی تنویر کو نور کی مادی تنویر سے مشابہ قرار دے چکے ہیں، یہاں ہمیں ان قوانین کو پیش نظر رکھ لینا چاہیے جن پر ہم سابقہ بحث کے سلسلے میں پہنچے تھے۔ پہلا قانون یہ ہے کہ ثقافت کی اصل کرن نور کی اصل کرن کی طرح جب کسی مخالف شے سے گزرتی ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی ایک عکس شعاعی کی شکل میں بکھر جاتے ہیں۔

دوسرا قانون یہ ہے کہ یہ انتشار کسی اجنبی مجلسی وجود کا دباؤ نہ ہونے کی حالت میں بھی واقع ہو سکتا ہے بشرطیکہ جس معاشرے سے روشنی پہنچ رہی تھی، وہ معرض شکست میں آ جائے اور اس میں انحلال شروع ہو جائے۔ ارتقا پذیر تہذیب کی تعریف یہ ہے کہ اس کی ثقافت کے اجزائے ترکیبی ——— اقتصادی، سیاسی اور ٹھیٹھ ثقافتی ——— ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں؛ اس طرح انحلال پذیر تہذیب کی تعریف یہ ہے کہ اس کے تینوں اجزائے ترکیبی میں ناموافقت اور بے آہنگی پیدا ہو جائے۔ ہمارا تیسرا قانون یہ ہے کہ اصل ثقافتی کرن کی رفتار اور قوت دخل دراصل اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی اجزاء کی رفتاروں اور قوت دخل کے مختلف درجے ہوتے ہیں جو انتشار کے بعد ان کے آزادانہ دور و فعل کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں،

اقتصادی اور سیاسی اجزاء غیر منتشر ثقافت کے مقابلے میں زیادہ تیز چلتے ہیں، ثقافت کے اجزاء کی رفتار سست ہوتی ہے۔

غرض انحلال پذیر تہذیب اور فوجی سرحد کے پار علیحدہ شدہ خارجی پرولتار کے باہم مجلسی تعلقات میں تہذیب کی منتشر تنویر پر افسوسناک افلاس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے؛ سچ یہ ہے کہ اقتصادی اور سیاسی تعلق یعنی تجارت اور جنگ کے سوا ہر تعلق عملاً حذف ہو جاتا ہے، تجارت مختلف اسباب کی بناء پر زیادہ سے زیادہ محدود ہو جاتی ہے اور جنگ زیادہ سے زیادہ سخت و شدید شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ایسے تطابقات کی مثالیں بھی پیش کی جا چکی ہیں جن کی پہچان مشکل نہیں اور خالص نئی تخلیقات کی مثالیں بھی دی جا چکی ہیں؛ یہاں ہمیں صرف یہ بتانا چاہیے کہ جو بربری ''ذخیرہ آب'' کے اندر رہتے ہیں، وہ کسی متصل تہذیب کے اعلیٰ مذہب کی وہ شکل اختیار کر سکتے ہیں جسے الحاد سمجھا جاتا ہے (مثال کے طور پر گاتھوں نے ایرین مسیحیت[1] اختیار کر لی) اور کسی متصل سلطنت عام کی قیصریت مطلق العنان بادشاہی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، یہ قیصریت قبائلی قانون پر نہیں بلکہ فوجی اقتدار پر مبنی ہوتی ہے اور بربریوں کی تخلیقی قوت رزمیہ نظموں کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔

۲۔ دباؤ کا تراکم

سرحدات کے قیام سے جو مجلسی بند تعمیر ہوتا ہے، مادی بند کی طرح وہ بھی قانون قدرت کی دسترس سے باہر نہیں جاتا؛ جو پانی بند کے اوپر کی طرف جمع ہوتا ہے، وہ نیچے کی طرف کے پانی سے سطح برابر کرنے کے درپے رہتا ہے، مادی بند کی تعمیر کے سلسلے میں انجینئر جگہ جگہ ایسے دریچے رکھ لیتے ہیں جن میں سے فالتو پانی باہر نکل جاتا ہے اور جو پانی بند کے اندر رہ سکتا ہے،

۱۔ اس مسیحی فرقے کا بانی سکندریہ کا ایک پادری ایریس (Arius) تھا جو چوتھی صدی مسیحی میں گزرا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ مسیح[4] خدا کے برابر نہیں یعنی اقانیم ثلاثہ میں سے باپ اور بیٹا برابر نہیں ہو سکتے، دوسرے مسیحی فرقوں نے اسے ارتداد قرار دیا، گاتھوں نے یہی مسیحیت اختیار کی تھی۔ (مترجم)

وہ محفوظ رہتا ہے ؛ یہ دریچے ضرورت کے مطابق کھولے اور بند کیے جا سکتے ہیں۔ فوجی سرحدوں کے سیاسی انجنیئر بھی اس قسم کی حفاظتی تدابیر کو نظر انداز نہیں کرتے جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا لیکن اس سلسلے میں حفاظتی تدابیر ہی طوفان کی رفتار تیز تر کرنے کی موجب بن جاتی ہیں۔ مجلسی بند کے قیام کے سلسلے میں دباؤ کو اس طرح کم کرنا ممکن العمل نہیں جس طرح عام بندوں میں فالتو پانی کو نکال کر دباؤ کم کر لیا جاتا ہے ؛ مجلسی ذخیرہ آب میں سے پانی باہر نکالنے کی شکل صرف یہ ہے کہ بند کی بنیاد کھو کھلی کردی جائے اس لیے کہ اس کا پانی عام بندوں کے پانی کی طرح موسم کی تری اور خشکی سے بڑھتا گھٹتا نہیں بلکہ اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے مسلسل زیادہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ حملے اور دفاع کے درمیان جو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے ، اس میں انجام کار حملہ ہی کامیاب ہوتا ہے ، وقت بربریوں کی مساعدت کرتا ہے ؛ ممکن ہے ان کے لیے سرحدوں کو توڑ کر انحلال پذیر تہذیب کے کشش انگیز حلقے میں داخل ہونا بہت متاخر ہو جائے لیکن یہی تاخیر سورماؤں کا دور پیدا کرنے کی لازمی تمہید ہے ، اس میں تہذیب کے اثر سے بربریوں کی روح متاثر ہوتی رہتی ہے اور اس تہذیب میں داخل ہونے سے انھیں روک دیا جاتا ہے ؛ بہ ہر حال بند ٹوٹ جاتا ہے اور بربریوں کو من مانی یورشوں کا موقع مل جاتا ہے۔

سرحدی بندوں کی تعمیر سے وہ مجلسی قوتیں حرکت میں آ جاتی ہیں جو انجام کار بند تعمیر کرنے والوں کے لیے لازماً تباہی کا موجب بنتی ہیں۔ بربریوں کے سلسلے میں بے تعلقی کی پالیسی اختیار کرنا ممکن نہیں ؛ سامراجی حکومت کا فیصلہ خواہ کچھ ہو لیکن تاجر اور من چلے لوگ ناگزیر طور پر سرحدات سے باہر جانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہمہ گیر سلطنت کی سرحد سے قریب رہنے والے لوگوں اور سرحد پار کے بربریوں کے درمیان اشتراک مقاصد کی ایک نمایاں مثال رومی سلطنت اور آن ہن یوریشیائی خانہ بدوشوں کے تعلقات میں ملتی ہے جو چوتھی صدی مسیحی کے اختتام پر یوریشیائی سطح مرتفع سے باہر نکلے۔ اگرچہ یہ لوگ غیر معمولی طور پر تندخو بربری تھے اور اگرچہ رومی سلطنت کی یورپی سرحدوں پر ان کا اقتدار عارضی تھا لیکن اس مختصر سے دور کے متعلق معاصرانہ تحریروں کے تھوڑے سے ذخیروں میں مواخات کی تین نمایاں مثالیں موجود ہیں ؛ ان میں سب سے زیادہ

حیرت انگیز مثال یہ ہے کہ آرسٹیس[1] نام ایک رومی شہری نے ہن گروہ کے مشہور جنگی سردار اٹیلا سے تعلقات پیدا کیے ، یہ شخص اٹیلا کا سکریٹری بن گیا اور اس کا بیٹا روم‌یولس آگسٹس[2] مغربی رومی سلطنت کا شہنشاہ بنا اگرچہ اس کی پیشانی پر اس سلسلے کا آخری شہنشاہ ہونے کا داغ لگا ہوا ہے۔

جو سامان غیر مؤثر سرحدوں سے گزرتا ہوا باہر پہنچتا رہا ، اس میں سے جنگی اسلحہ کو خاص اہمیت حاصل تھی ؛ بربری جتھے اپنی یورشوں کو ہرگز مؤثر نہ بنا سکتے اگر انھیں وہ ہتھیار نہ ملتے جو تہذیب کے کارخانوں میں ڈھلے تھے۔ برطانیہ نے ہندوستان میں جو سلطنت قائم کی تھی ، اس کی شمال مغربی سرحد پر ۱۸۹۰ء کے بعد ”قبائلی علاقے میں گولی ، بارود اور بندوقیں پہنچتی رہیں - - - - - اس وجہ سے سرحدی جنگ کی کیفیت یک لخت بدل گئی“[3]۔ اس سے پیشتر سرحد پار کے پٹھان اور بلوچ اعلیٰ درجے کے مغربی اسلحہ جنگ میں سے وہی لے سکتے تھے جو برطانیہ کی ہندوستانی فوجوں سے لوٹ لے جاتے تھے ؛ اگر خلیج فارس کی بندرگاہوں میں سے بوشہر اور مسقط اسلحہ کی مسلسل درآمد کا ذریعہ نہ بن جاتے تو کبھی تشویش کی صورت پیدا نہ ہوتی ، یہ اسلحہ برطانوی تاجروں کے ذریعے سے درآمد ہوتے تھے۔ یہ اس رحجان کی ایک حیرت انگیز مثال ہے کہ نجی مفاد کو سلطنت کے مقاصد پر ترجیح دی گئی اور سرحد پار کے بربریوں سے ایسا کاروبار کیا گیا جو مفاد عامہ کے خلاف تھا کیوں‌کہ سامراجی حکومت کے لیے ان بربریوں کو روکے رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

سرحد پار کا بربری محض ان اعلیٰ تدبیروں کو اختیار کرنے ہی پر قانع نہیں رہتا جو وہ ہمسایہ تہذیب سے سیکھتا ہے بلکہ وہ ان تدبیروں میں مزید خوبیاں پیدا کر لیتا ہے مثلاً کارولنجی سلطنت[4] اور وسیکس کی بادشاہی کی

۱- Orestes -

۲- Romulus Augustulus -

۳- ڈیویز (Davies) کی کتاب ”شمالی و مغربی سرحد کا مسئلہ“ ، ۱۸۹۰ء-۱۹۰۸ء ، صفحہ ۱۷۶ -

۴- Carolingain ، یہ اس سلطنت کا نام ہے جو چارس مارٹل کی اولاد نے قائم کی تھی اور جس کا مشہور بادشاہ شارلمین تھا (مترجم)۔

بحری سرحدوں پر جن سکنڈینویائی بحری قزاقوں نے یورشیں کی تھیں ، انھوں نے جہازسازی اور ملاحی کا فن فریسین[1] جزیروں کے آدمیوں سے سیکھا تھا جو نومولود مغربی مسیحیت کی بحری سرحدوں پر بیٹھے تھے ۔ سکنڈینویائی قزاقوں نے اس فن سے پورا فائدہ اٹھایا ، سمندر پر قبضہ کر لیا اور جارحانہ جنگ شروع کر دی جو صرف ساحلوں تک محدود نہ رہی بلکہ مغربی مسیحی ملکوں کے دریاؤں میں بھی پہنچ گئی ۔ دریاؤں میں سے گزرتے ہوئے جب وہ لوگ ایسے مقامات پر پہنچے جہاں جہاز رانی اور کشتی بانی کے لیے مزید گنجائش نہ تھی تو انھوں نے ایک اَور ذریعہ جنگ مستعار لے لیا اور مسروقہ گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہو کر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا ؛ سواری کا فن انھوں نے فرینکوں کے رسالے سے سیکھا تھا جس طرح ملاحی کا فریسین جزیروں سے حاصل کیا تھا ۔

جنگ کے سلسلے میں اسپ سواری کی تاریخ بہت طویل ہے ، یہاں ہم ایک حد درجے ڈرامائی مثال پیش کرتے ہیں جس میں بربریوں نے اسپ سوار ہو کر اُس تہذیب کے خلاف جنگ کی جو گھوڑے کو نئی دنیا میں پہنچانے کی ذمہ دار تھی اور جہاں اس سے پیشتر گھوڑا موجود نہ تھا ؛ کولمبس کے بعد کے دور میں مغربی مسیحیت کے مداخلت کنندوں نے گھوڑا امریکہ پہنچایا ۔ پرانی دنیا کا یہ پالتو جانور خانہ بدوش گلہ بانوں کے طریق زندگی کا اہم وسیلہ بنا رہا تھا ؛ دریائے مسس سپی کے آس پاس کے میدان گلہ بانوں کے لیے بہشت‌زار کی حیثیت رکھتے تھے لیکن وہاں کے قبائلی لوگ صرف پیدل ہی محنت و مشقت اٹھا کر شکار کھیلا کرتے تھے ۔ جب گھوڑا اس خطے میں پہنچا تو اس نے تارکین وطن اور دیسی باشندوں دونوں کی زندگی پر انقلابی اثر ڈالا لیکن اُس کی صورتیں مختلف تھیں : گھوڑا ٹکساس[2] ، ونزویلا[3] اور ارجنٹینا[4] کے میدانوں میں اُن خانہ بدوشوں کے لیے گلہ بانی کا ذریعہ بن گیا جو ڈیڑھ سو پشتوں سے

۱۔ Frisian ، یہ چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک سلسلہ ہے جو ڈنمارک سے ہالینڈ تک چلا آتا ہے (مترجم) ۔

۲۔ Texas (ریاستہائے متحدہ امریکہ) ۔

۳۔ Vanezuela (جنوبی امریکہ) ۔

۴۔ Argentina (جنوبی امریکہ) ۔

کاشتکار چلے آتے تھے لیکن ہسپانوی حکومت کے دائرے سے باہر جو وسیع میدان تھے ، اُن کے قبائلی بہت جلد تیز رو سواروں کے جنگی جتھے تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے - یہی ہسپانوی مقبوضات اور انگریزی نو آبادیاں آگے چل کر ریاستہائے متحدہ امریکہ بننے والی تھیں ؛ بے شک اس مستعار شے نے سرحد پار کے بربریوں کو قطعی کامیابی کی منزل پر نہ پہنچایا لیکن وہ اپنی آخری شکست کو التوا میں ڈالنے پر قادر ضرور ہو گئے -

انیسویں صدی مسیحی میں شمالی امریکہ کے مرغزاروں کے اندر رہنے والے ''سرخ انڈین'' نے یورپی مداخلت کنندوں کا ہتھیار خود ان کے خلاف استعمال کیا اور درآمد کیے ہوئے گھوڑے کی مدد سے میدانی علاقوں پر تصرف کے خلاف جنگ جاری رکھی - اٹھارھویں صدی مسیحی میں انھیں لوگوں نے یورپینوں کی بندوقوں سے فائدہ اٹھا کر مقابلہ جاری رکھا تھا اور وہ گھات میں بیٹھ کر گولیوں سے بہت نقصان پہنچاتے تھے ، جنگل ان لوگوں کی مساعدت کر رہا تھا - ایسے مواقع پر یورپینوں کے عام طریقہ ہائے جنگ ——— فوجوں کی باقاعدہ صف بندی ، صفوں کی ترتیبات میں منظم تبدیلی ، پوری فوج کی ایک انداز پر آتشباری ——— عام حالات میں کتنے ہی مؤثر ہوتے لیکن سرخ انڈین کے مقابلے میں سوچے سمجھے بغیر استعمال کیے جاتے تو سخت گزند پہنچتا ، انھوں نے بندوق کا استعمال امریکی جنگلات کی مہیا کردہ فضا کے مطابق بنا لیا تھا - جب آتش بار ہتھیار ایجاد نہیں ہوئے تھے تو اس زمانے کی جارح تہذیب نے جن اسلحہ کو رواج دیا تھا ، دریائے رھائن کے پار شمالی یورپ کے جنگلوں میں رہنے والے بربریوں نے انھیں اپنے خاص حالات کے مطابق استعمال کرنے میں خوب مہارت پیدا کر لی تھی اور جرمنی کو رومیوں کی فتح و تسخیر سے بچا لیا تھا ؛ اس زمانے میں جرمنی جنگلات سے پٹا پڑا تھا ، گال کا علاقہ بڑی حد تک جنگلات سے صاف ہو چکا تھا اور وہاں کھیتی باڑی ہو رہی تھی لہٰذا وہ علاقہ نہ بچ سکا ، جرمن بربریوں نے ٹیوٹوبرگر والڈ[۱] کے مقام پر نو عیسوی میں رومیوں کو ایسی تباہی خیز شکست دی تھی کہ پھر انھیں جرمنی کا رخ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا -

رومی سلطنت اور شمالی یورپ کے بربریوں کے درمیان جو فوجی سرحد آئندہ

۱- Teutoburger Wald ، جرمنی کا ایک سلسلہ کوہ (مترجم) -

چار سو سال کے لیے قائم ہو گئی ، اس کی کیفیت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ اس سرحد کے آگے وہ جنگل تھا جو برفانی دور کے خاتمے کے وقت سے بہ دستور چلا آ رہا تھا ، اسے رومیوں کی ان تدبیروں پر فوقیت حاصل تھی جن کے بل پر وہ بحیرۂ روم سے اٹھ کر دریائے رھائن اور دریائے ڈینیوب پر پہنچ گئے تھے ؛ یہ سرحدی خط رومی سلطنت کی بدنصیبی کی بناء پر براعظم یورپ میں سب سے لمبا تھا اور جیسے جیسے سرحد پار کے بربریوں کی جنگی صلاحیت بڑھتی رہی ، اس سرحد پر رومی فوج کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا ، بربریوں کی روک تھام ہی اس فوج کا اصل وظیفہ تھی۔

مغربی طور طریقے اختیار کرنے والی دنیا کی جانب بربریوں کی روک تھام کے لیے جو سرحد بنی ہوئی تھی ، اس پر یہ کتاب ترتیب دیتے وقت بھی چھوٹی چھوٹی حکومتیں موجود تھیں ؛ یہ زمین کے قابل آبادی اور قابل گزر حصے کا محض ایک چھوٹا سا جزو ہیں ، یہاں بربریوں کے دو غیر انسانی مگر نہایت زبردست حلیفوں (جنگل اور پہاڑ) کو موجودہ زمانے کے مغربی دنیا کے صنائع نے شکست دے دی ، جنگل فولادی اسلحہ کے مقابلے میں بے بس رہ گئے ، پہاڑوں میں موٹروں اور ہوائی جہازوں کی مداخلت شروع ہو گئی لیکن یہ ضرور کہ دینا چاہیے کہ بربریوں کے حلیفوں میں سے پہاڑ مقابلے میں بڑا سخت جان ثابت ہوا اور بربریت کی پہاڑی عقبی فوج (ساقة الجیش) بعض جدید ترین وسائل کو جو مغرب کی فوجی تکنیک نے صنعت گری کے ذریعے سے پیدا کیے تھے ، اپنی سر زمین پر اپنے فائدے کے لیے بڑی ہنرمندی سے استعمال کرتی رہی اگرچہ اس کی حیثیت امید موہوم کی تھی۔ اس تدبیر سے ریف کے پہاڑی باشندوں نے مراکش کے حلقہ ہائے اثر کی ہسپانوی اور فرانسیسی سرحد پر ہسپانیہ کو بہ مقام انول ۱۹۲۱ء میں ایسی تباہ کن شکست دی جیسی چیروسی[1] اور اس کے ہمسایوں نے ۹ء میں ٹیوٹوبرگر والڈ پر ویروس[2] کو دی تھی اور اس کے تین لشکر تباہ کر دیے تھے ، ۱۹۲۵ء میں

۱- Cherusci جرمنی کا ایک قبیلہ جو رومیوں کے خلاف لڑائی میں پیش پیش تھا (مترجم)۔

۲- Verus رومی فوجوں کا سپہ سالار جس کے تین لشکر تباہ ہو گئے اور اس نے خودکشی کر لی (مترجم)۔

شمالی و مغربی افریقہ کی فرانسیسی حکومت کے پائے بھی ہل گئے تھے ؛ اسی ہنرمندی سے کام لے کر وزیرستان کے محسود برطانوی حکومت کی مساعیٔ تسخیر کا مقابلہ اٹھانوے سال تک کرتے رہے ، ۱۸۴۹ء میں یہ سرحد حکومت برطانیہ نے سکھوں سے لی تھی اور ۱۹۴۷ء میں اپنی یہ خوفناک میراث پاکستان کے حوالے کی -

۱۹۲۵ء میں ریفیوں کے حملہ آور دستے خشکی کی اس تنگنائے کو منقطع کر دینے کے قریب پہنچ گئے تھے جو مراکش میں فرانس کے حلقہ اثر اور شمالی و مغربی فرانسیسی سلطنت کے درمیان ذریعہ اتصال تھی ؛ اگر ریفی مجاہد اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے (اور کامیابی میں بہت ہی معمولی کسر رہ گئی تھی) تو بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل کے ساتھ فرانس کی پوری سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا - ۱۹۱۹ء - ۱۹۲۰ء کی مہم وزیرستان میں محسود بربریوں اور ہندوستان کی برطانوی فوجوں کے درمیان قوت آزمائی بھی برطانوی راج کے مقاصد کے لیے اتنی ہی اہم تھی ؛ جنگ ریف کی طرح اس مہم میں بھی بربری جنگجو کی قوت کا راز یہ تھا کہ اس نے دور حاضر کے اسلحہ کو اپنی سر زمین پر انتہائی ہنر مندی سے استعمال کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا اور جس طریق استعمال کو ان اسلحہ کے مغربی موجد درست سمجھتے تھے ، وہ بربریوں کے لیے نا مبارک تھا - جو سامان ۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء کی جنگ کے دوران میں یورپی میدان ہائے جنگ کے لیے تیار ہوا تھا اور جو منظم فوجوں کے درمیان ہموار زمین پر کامیابی سے استعمال ہوتا رہا تھا ، وہ ان قبائلی گروہوں کے خلاف حد درجے غیر موثر ہوا جو پہاڑوں کی کمین گاہوں میں چھپ جاتے تھے[1] -

سرحد پار کے جو بربری جنگی مشاقی میں وہی کمال حاصل کر چکے ہوں

۱- اسی طرح ہسپانیہ و پرتگال کے جزیرہ نما کی جنگ ۱۸۰۸ء - ۱۸۱۴ء میں تجربہ کار فوجیوں نے جن تدبیروں سے کام لے کر نپولین کی فوجوں کو بار بار شکست دی تھی ، وہی تجربہ کار فوجی ۱۸۱۴ء میں نیواورلیانز کے مقام پر انتہائی سہولت سے شکست کھا گئے اس لیے اینڈریو جیکسن (Andrew Jackson) نے ان کے خلاف سرحدیوں کے سے طور طریقے استعمال کیے تھے -

جس کا ثبوت محسودوں نے ۱۹۱۹ء میں اور ریفیوں نے ۱۹۲۵ء میں دیا ، انھیں شکست دینے کے لیے خطرہ زدہ سرحد کے اندر کی قوت کو انتہائی کوششیں عمل میں لانی پڑتی ھیں ؛ اگر انھیں فوجوں کی تعداد ، ساز و سامان کی فراوانی اور روپے کی شکل میں پیش نظر رکھا جائے تو کہنا پڑتا ھے کہ ان کو ضدی اور ھٹیلے مخالف کے حد درجے محدود وسائل سے کوئی مناسبت نہیں ھوتی -

حقیقت یہ ھے کہ جس شے کو مسٹر گلیڈ سٹون نے ۱۸۸۱ء میں "تہذیب کے وسائل"[1] قرار دیا تھا ، وہ اس قسم کی جنگ میں جتنی امداد پہنچا سکتے ھیں تقریباً اتنی ھی رکاوٹ بھی ڈال سکتے ھیں ، وجہ یہ کہ برطانوی ھند کی فوجوں کی نقل و حرکت کثیر ساز و سامان کے باعث جس پر اس کی برتری کا اظہار تھا ، خلل بھی واقع ھو جاتا تھا ؛ برطانوی ھند کی فوجیں اپنے ساز و سامان کی کثرت کے باعث تیزی سے مؤثر ضرب نہ لگا سکیں ، محسودوں کے لیے ایسی کوئی رکاوٹ موجود نہ تھی - تعزیری مہم کا مقصد سزا دینا تھا لیکن ایسے لوگوں کو سزا کیوں کر دی جا سکتی تھی ؟ کیا انھیں افلاس کی آخری منزل پر پہنچا دیا جاتا ؟ وہ تو پہلے ھی حد درجے مفلس تھے اور اس صورت حال کو اپنی زندگی کے لوازم میں شمار کر چکے تھے خواہ یہ انھیں پسند تھی یا نہ تھی ؛ ٹامس ھابز[2] کی اصطلاح میں ان کی زندگیاں ابتدائی طبعی حالت پر پہنچ چکی تھیں یعنی وہ سب سے الگ تھلگ تھے ، غریب تھے ، غلیظ اور وحشی تھے ، ان کے پاس ساز و سامان کی کمی تھی - اس صورت حال کو بد تر بنانے کا کوئی امکان نہ تھا ، اگر امکان ھوتا بھی تو کون کہ سکتا ھے کہ وہ اسے کوئی اھمیت دینے کے لیے تیار تھے ؟ ھم یہاں اس نقطے پر پہنچ رھے ھیں جو اس کتاب کے ابتدائی حصے میں کسی دوسرے مبحث پر گفتگو کرتے ھوئے

۱- اشارہ گلیڈ سٹون کی اس تقریر کی طرف ھے جو آئرلینڈ کے مسئلے پر اس نے دارالعوام میں کی تھی ؛ آئرلینڈ میں قومی تحریک اور دھشت انگیزی شروع ھو چکی تھی ، گلیڈ سٹون نے کہا تھا کہ تہذیب کے وسائل لا متناھی ھیں - یہ رائے غلط تھی ، چالیس سال بعد تہذیب کے وسائل ختم ھو گئے اور آزاد آئرلینڈ کے معاھدے پر دستخط کرنے پڑے -

۲- Thomas Hobbes ، ایک انگریز فلسفی ، پیدائش ۱۵۸۸ء ، وفات ۱۶۷۹ء (مترجم) -

واضح کیا جا چکا ہے یعنی ابتدائی دور کا معاشرہ کسی ایسے معاشرے کے مقابلے میں بہ آسانی اور زود تر بحال ہو جاتا ہے جو اونچے درجے کی مادی تہذیب سے استفادہ کر رہا ہو ۔ اس کی مثال اس معمولی سے کیڑے مکوڑے کی ہے جسے دو حصوں میں کاٹ دیا جائے تو جب بھی پروا نہیں کرتا اور اپنے کاروبار کا سلسلہ جاری رکھتا ہے لیکن ہمیں ریفیوں اور محسودوں کے معاملے کو چھوڑ دینا چاہیے جواب تک تہذیب پر اپنے حملوں کو کامیاب نتیجے پر نہ پہنچا سکے اور اس المیے کی کیفیت پانچویں ایکٹ یعنی آخری دور میں دیکھنی چاہیے ۔

سرحدی جنگوں کے جس زور نے فوجی قوت کے توازن میں آہستہ تغیر پیدا کیا ، وہ تہذیب کو تدریجاً کمزور کرتا رہتا ہے اس لیے کہ مالی بوجھ بڑھ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے محاصل بڑھانے پڑتے ہیں ۔ اس کے بر عکس بربریوں کی جنگی بھوک میں تیزی اور شدت پیدا ہوتی ہے ؛ اگر بربری سرحد سے پار بیٹھا ہوا ابتدائی دور کے انسانوں کی زندگی بسر کرتا رہتا تو اس کی قوتوں کا بیشتر حصہ وسائل امن کے لیے وقف رہتا اور اس نے مصالحانہ فضا میں محنت سے جو کچھ پیدا کیا ، وہ تعزیری مہموں میں تباہ ہوتا اور اس پر نسبتاً زیادہ دباؤ پڑتا ۔ ابتدائی دور کا معاشرہ ہمسایہ تہذیب سے بہ اعتبار اخلاقیات الگ ہوتا ہے تو اس المیے میں بربری اپنے سابقہ امن پسندانہ مشاغل ترک کر دیتا ہے اور سرحدی رزم و پیکار کے فنون میں درجۂ اختصاص پیدا کر لیتا ہے ؛ پہلے وہ اپنی سرگرمیوں کو صرف دفاع تک محدود رکھتا ہے لیکن آگے چل کر متبادل تدبیر کے طور پر کسب معاش کے زیادہ ہیجان انگیز طریقے اختیار کر لیتا ہے یعنی ”تلوار اور برچھی سے فصل بوتا اور کاٹتا ہے“ ۔

دو محارب فریقوں کے درمیان سرحدی جنگ کے مادی نتائج میں یہ نمایاں فرق اخلاق کی منزل پر اور زیادہ بری صورت میں منعکس ہوتا ہے یعنی اس منزل پر فرق زیادہ وسیع اور تیز ہو جاتا ہے ۔ انحلال پذیر تہذیب کے افراد کے لیے لا متناہی سرحدی جنگیں مالی مصارف میں روز افزوں اضافہ کرتی ہیں ؛ اس کے بر عکس محارب بربریوں کے لیے یہ جنگیں ہرگز بوجھ کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ آگے بڑھنے کا ایک موقع پیدا کرتی ہیں ، وہ ان پر مشوش نہیں ہوتے بلکہ مزے لیتے ہیں ۔ ان حالات میں اس امر پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ جو فریق سرحدیں قائم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور خود مصائب کا شکار

بن جاتا ھے ، وہ ایک آخری تدبیر اختیار کیے بغیر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے نہیں کرتا ؛ آخری تدبیر کا مقصد یہ ھوتا ھے کہ بربری حریفوں کو اپنی رفاقت پر آمادہ کرے - ھم کتاب کے ابتدائی حصے میں اس پالیسی کے نتائج کا جائزہ لے چکے ھیں ، یہاں ھمیں اپنی سابقہ دریافت پیش نظر رکھ لینی چاھیے یعنی سرحدوں کو درھم برھم ھونے سے بچانے کے لیے جو تدبیر اختیار کی جاتی ھے ، وہ اس مصیبت کے نزول کی رفتار تیز تر کر دیتی ھے جس سے بچنے کے لیے یہ قدم اٹھوایا جاتا ھے -

رومی سلطنت کی تاریخ میں ایسی مثال موجود ھے ؛ جب سرحدی جنگوں میں پلہ سرحدی بربریوں کی طرف جھکنے لگا تو یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بربریوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی روک تھام کے لیے بھرتی کر لیا گیا لیکن یہ تدبیر ناکام ھوگئی - شہنشاہ تھیوڈوسیئس اول[1] کے نظم و نسق کا ایک مخالف نقاد لکھتا ھے کہ بربریوں کو رومیوں کے فنون جنگ سکھا دیے گئے ، ساتھ ھی سلطنت کی کمزوریاں بھی ان پر آشکارا ھو گئیں :

> رومی فوجوں میں ڈسپلن ختم ھو چکی تھی ، رومیوں اور بربریوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رھا تھا ، دونوں قسم کے فوجی صفوں میں بالکل مل جل گئے تھے ، فوجی یونٹوں کی تعداد کے متعلق جو رجسٹر تھے ، وہ بھی باقاعدہ مکمل نہ رکھے جاتے تھے ؛ جو بربری اپنے جنگی جتھوں کو چھوڑ کر رومیوں کی شہنشاھی فوج میں داخل ھو گئے تھے ، وہ رومی صفوں میں آزادانہ طور پر شامل ھو گئے ، پھر گھروں میں واپس چلے جاتے اور اپنی جگہ دوسرے لوگوں کو بھیج دیتے اور جب چاھتے دوبارہ رومیوں کے ماتحت ملازمت اختیار کر لیتے - یہ انتہائی بد نظمی جو رومیوں کے فوجی نظام میں عام ھو چکی تھی ، بربریوں کی نگاھوں سے اوجھل نہ رہ سکتی تھی ؛ گویا باھم ربط ضبط کے دروازے چوپٹ کھول دیے گئے تھے اور جو لوگ واپس جاتے ، وہ پوری خبریں اپنے ساتھیوں کو پہنچا دیتے - بربری اس

۱- Theodosius -

نتیجے پر پہنچے کہ رومیوں کے سیاسی نظام کا سارا سلسلہ درہم برہم ہو رہا ہے اور یہ امر حملے کی ترغیب کا باعث بن گیا[1]۔

جب ایسے تربیت یافتہ تنخواہ دار بڑے بڑے گروہوں کی شکل میں ایک فریق کو چھوڑ کر دوسرے فریق میں شامل ہو جاتے ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ وہ اکثر متزلزل سلطنت پر آخری ضرب لگانے کے باعث بن جاتے ہیں لیکن یہ نکتہ ہنوز توضیح طلب ہے کہ یہ لوگ کیوں اپنے آقاؤں کے خلاف قدم اٹھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور ایسا اکثر ہوتا رہا ہے۔ کیا اُن کا ذاتی مفاد اُن کے پیشہ ورانہ فرائض کے مطابق نہیں ہوتا؟ جو تنخواہ انہیں باقاعدہ ملتی ہے، وہ اس لوٹ مار کے مقابلے میں زیادہ فائدے کا باعث ہوتی ہے جس کا موقع پہلے انہیں وقتاً فوقتاً ملتا رہا ہے، پھر وہ غداری کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تنخواہ دار بربری کو جس سلطنت کی حفاظت کے لیے ملازم رکھا جاتا ہے اس کے خلاف قدم اٹھاتے وقت وہ اپنے مادی مفاد کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تاہم اس فعل میں کوئی ندرت نہیں۔ آدمی شاذ و نادر ہی اپنے اقتصادی مفاد کو بنیاد عمل بناتا ہے اور تنخواہ دار غدار کا طرز عمل ایک ایسے جذبے کا نتیجہ ہوتا ہے جسے اقتصادی مصلحت بینی سے بھی زیادہ قوی سمجھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ بربری جس سلطنت سے تنخواہ لیتا ہے، اُس کے خلاف اس کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اس طرح دونوں فریقوں کے درمیان ایک اخلاقی انشقاق رونما ہو جاتا ہے؛ یہ انشقاق اُس کاروباری معاملے کی بناء پر بالاستقلال درست نہیں ہو سکتا اس لیے کہ بربری اپنی دلی خواہش کے مطابق ملازمت اختیار نہیں کرتا اور جس تہذیب کی حفاظت کا وہ ذمہ اٹھاتا ہے، اس میں حقیقی حصہ داری کا بندوبست نہیں ہوتا: اس کی روش میں تہذیب کے لیے وہ جذبۂ احترام اور وہ جذبۂ تقلید باقی نہیں رہتا جو اُس کے آبا و اجداد کے دلوں میں موجزن تھا یعنی جب تہذیب دور نشو و ارتقا میں تھی اور اس میں جاذبیت و کشش کے جوہر موجود تھے۔ تقلید کی رو کا پانسا پلٹ جاتا ہے، بربریوں کی نگاہوں میں اس کا وقار باقی نہیں رہتا بلکہ اس کے

۱- زوزی مس (Zosimus) کی تاریخ، کتاب چہارم، باب: ۳۱-

نمائندوں کی نگاھوں میں بربریوں کا وقار حقیقت ثابتہ اختیار کر لیتا ھے :

> '' ابتدائی رومی تاریخ کے متعلق بتایا گیا ھے کہ یہ عام لوگوں کی سرگذشت ھے جنھوں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ آخری دور میں یہ کیفیت پیدا ھو گئی کہ غیر معمولی آدمیوں کے لیے معمولی روزانہ کاروبار جاری رکھنے کے سوا کوئی گنجائش نہ رھی ؛ چونکہ سلطنت صدیوں تک معمولی آدمیوں کی تربیت و تعلیم کے لیے وقف رھی تھی اس لیے آخری دور کے غیر معمولی آدمی زیادہ تر بربری دنیا سے حاصل کیے گئے مثلاً سٹلی چو[۱] ، آئی ٹیس[۲] وغیرہ''[۳]۔

۳۔ طوفان اور اس کے نتائج

جب بند ٹوٹتا ھے تو جو پانی بند کے اوپر مدت سے جمع ھو رھا تھا ، وہ انتہائی شدت سے سیل کی شکل میں بہتا ھوا سمندر میں جا ملتا ھے ، مدت سے جمع شدہ قوتوں کا یہ انفجار سہ گانہ مصیبت کا باعث بنتا ھے : اول پانی کا سیل بند کے نیچے کی طرف مزروعہ زمینوں میں انسان کے تعمیر کیے ھوئے تمام وسائل برباد کر دیتا ھے ؛ دوم جس پانی سے فصلوں کو زندگی مل سکتی تھی ، وہ سمندر میں پہنچ جاتا ھے جہاں سے واپس نہیں آسکتا اور انسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا ؛ سوم پانی کے نکل جانے سے ذخیرۂ آب خالی ھو جاتا ھے ، اس کے کنارے خشک ھو جاتے ھیں اور جو سبزی نمی کی وجہ سے جڑ پکڑ چکی تھی ، وہ ھمیشہ کے لیے سوکھ جاتی ھے ؛ بہ الفاظ دیگر جو پانی بند کی موجودگی میں ھر قسم کے فوائد کا سرچشمہ تھے وہ ھر مقام پر

۱۔ Stilicho ، ونڈال قوم کا ایک فرد تھا جس نے رومی سلطنت کے آخری دور میں بڑی اعلیٰ خدمات انجام دیں ، ۴۰۸ ء میں دھوکے سے اسے قتل کیا گیا (مترجم)۔

۲۔ Eetius ، ایک رومی جرنیل جس نے ایٹیلا کو شکست دے کر شہرت حاصل کی (مترجم)۔

۳۔ کولنگ وڈ اور مائرس کی کتاب '' عہد رومہ کی برطانوی اور انگریزی نو آبادیاں''۔

تباهی پھیلا دیتے ہیں ، ان زمینوں میں بھی جہاں سے یہ گزرتے ہیں اور اُن زمینوں میں بھی جو ان کے نیچے ڈوب جاتی ہیں ، یہ سب کچھ بند کے ٹوٹتے ہی پیش آجاتا ہے ۔

قدرت کے مقابلے میں انسانی جد و جہد کی یہ کہانی اس صورت حال کے لیے صحیح تمثیل کا کام دیتی ہے جو فوجی سرحدوں کے ٹوٹنے سے پیش آتی ہے ؛ اس سے جو مجلسی حوادث رو نما ہوتے ہیں وہ تمام متعلقہ گروہوں کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں لیکن تباہی کا حلقۂ اثر یکساں نہیں ہوتا اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ توقعات کے بالکل خلاف ہوتا ہے ۔ اس مصیبت کے سب سے بڑے شکار تباہ ہونے والی سلطنت کے باشندے نہیں ہوتے بلکہ وہ بربری ہوتے ہیں جنھیں بہ ظاہر کامیابی و کامرانی سے سرفراز سمجھا جاتا ہے ، اُن کی فتح مندی ہی دراصل شکست کی تمہید بن جاتی ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فتح مندی کا سبب کیا ہے ؟ اس کی اصل وجہ وہ سرحدیں ہوتی ہیں جو محض تہذیب ہی کے لیے دفاعی حصار کا کام نہیں دیتیں بلکہ حملہ آور بربریوں کے لیے بھی ایک خدا ساز حفاظت کا باعث ہوتی ہیں اور وہ اپنے آپ تباہ کرنے والی شیطانی قوتوں سے بچے رہتے ہیں ، جو ان کے سینوں میں موجود ہوتی ہیں ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرحد پار کے جو بربری سرحدوں کے قریب تر ہوتے ہیں ، اُن کی اُلجھنوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ؛ سرحدوں کے اندر کی تہذیب جو نفسیاتی قوت پیدا کرتی ہے ، اس کا تسلسل ان بربریوں کی ابتدائی دور کی اقتصادیات اور اداروں کو درہم برہم کر دیتا ہے ، اُن کے درمیان اور ارتقا پذیر تہذیب کے درمیان زیادہ مکمل اور نتیجہ خیز ربط ضبط میں موانع موجود رہتے ہیں ۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ بربری جب تک سرحدی دائرے سے باہر رہتے ہیں ، وہ اجنبی نفسیاتی قوت کو ثقافتی مقاصد میں صرف کرتے ہیں مثلاً سیاسی ، فنی اور مذہبی ——— یہ چیزیں ایک حد تک ادارہ ہائے تہذیب سے مستعار لی جاتی ہیں اور ایک حد تک بربریوں کی اپنی تخلیق ہوتی ہیں ۔ جب تک سرحد کا بند محفوظ رہتا ہے ، بربری جس نفسیاتی اختلال کی زد میں آتے ہیں ، وہ اختلال خاص حدود سے تجاوز نہیں کرتا اور اس سے پست ہمتی پیدا نہیں ہوتی ؛ بچاؤ کا یہ ذریعہ اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک سرحدیں قائم ہوں اور بربری ان سرحدوں کو توڑنے پر تلے رہتے ہیں ۔ غرض جب تک سرحدیں موجود

رھتی ھیں وہ ابتدائی دور کے آدمی کے لیے گمشدہ ڈسپلن کا ایک حد تک بدل ثابت ھوتی ھیں ، ان کی وجہ سے بربری کسی نہ کسی کام میں لگا رھتا ھے ؛ یا تو اس کا مقصد یہ ھوتا ھے کہ کوئی غرض حاصل کرے یا یہ ھوتا ھے کہ مشکلات سے عہدہ برآ ھو۔

جب سرحدیں ٹوٹ جاتی ھیں تو تحفظ کا اصل ذریعہ بھی ختم ھو جاتا ھے ، ڈسپلن کا نظام درھم برھم ھو جاتا ھے ، ساتھ ھی بربری کے ذمے وہ کام آ پڑتے ھیں جنھیں پورا کرنا اُس کے لیے سخت مشکل ھوتا ھے ؛ اگر سرحد پار کا بربری اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں زیادہ وحشی ھو اور اُس نے ادھر اُدھر سے مختلف چیزیں مستعار لے لی ھوں تو وہ ختم شدہ سلطنت کے لاوارث علاقوں میں ایک نئی حکومت قائم کر کے پہلے سے زیادہ پست ھمت ھو جاتا ھے۔ جب تک سرحد قائم رھتی ھے ، اُسے سستی یا سہل انگاری کا موقع نہیں ملتا ، وہ کامیاب چھاپوں کے ذریعے سے لوٹ کا جو مال حاصل کرتا ھے ، اُسے ان تعزیری مہموں کی روک تھام کے سلسلے میں مشقتیں اور مصیبتیں اٹھانے میں خرچ کر دیتا ھے جو اس کے چھاپوں کا طبعی نتیجہ ھے۔ جب سرحدیں ٹوٹ جاتی ھیں تو یہ صورت باقی نہیں رھتی جیسا کہ ھم اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں دیکھ چکے ھیں ، بربری مہذب علاقوں کے اندر پہنچتے ھیں تو یا تو گِدّوں کی باعث ننگ حیثیت اختیار کر لیتے ھیں جو جانوروں کی لاشیں کھاتی ھیں یا ان کیڑوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ھیں جو انسانی لاشوں میں پیدا ھوتے ھیں۔ اگر یہ تشبیہیں ناخوشگوار معلوم ھوں تو کہہ لیجیے کہ بربریوں کے فتح مند جتھے تہذیب کے کھنڈروں میں گھس کر ھوش و حواس کھو بیٹھتے ھیں جن کی قدر و قیمت کا انھیں کوئی اندازہ نہیں یا انھیں ایسے شریر لڑکے قرار دے لیجیے جو گھر اور درس گاہ کے کنٹرول سے آزادی حاصل کر لیتے ھیں اور بیسویں صدی مسیحی کی بڑھتی ھوئی شہری آبادی کے لیے من جملہ دوسرے مسائل کے ایک اھم مسئلہ بنے ھوئے ھیں :

> یہ معاشرے جن خصائص کا اظہار کرتے ھیں ، وہ اچھے ھوں یا برے ، واضح طور پر لڑکوں کے خصائص ھیں ۔۔۔ ان کا بنیادی پہلو ۔۔۔۔ آزادی ھے یعنی قبائلی قانون کی بندشوں سے مجلسی ، سیاسی اور مذھبی آزادی ۔۔۔۔۔ سورماؤں کے دور میں جو خصوصیات ھمارے سامنے آتی ھیں ،

وہ نہ بچپن کی ہوتی ہیں اور نہ دور بلوغ کی - - - - -
سورماؤں کے دور کے نمائندہ آدمی کو ہم صرف نوجوان ہی
سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں - - - - - صحیح تمثیل کے
لیے ہمیں اس نوجوان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو ماں
باپ کے کنٹرول سے آزاد ہو چکا ہو اور اس کے خیالات بھی
بہت اونچے ہوں - ایسی مثالیں آن والدین کے بچوں میں
ملتی ہیں جو بیرونی اثر یا سکول کے یا کسی دوسرے اثر کے
باعث ایسا علم حاصل کر لیتے ہیں جو انھیں ماحول سے
بلند تر پوزیشن میں پہنچا دیتا ہے[1]-

بربریوں کے درمیان ابتدائی دور کے مراسم ختم ہو جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو قوت اور طاقت پہلے مختلف گروہوں کے ہاتھ میں تھی، وہ ایک مختصر سی جماعت کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے؛ یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ایک سردار کے ساتھ ذاتی وفاداری کی بنا پر وابستہ ہو جاتے ہیں - جب تک کوئی تہذیب اپنی سلطنت کے اندر کسی نہ کسی شکل میں اقتدار محفوظ رکھتی ہے، بربری سردار اور آن کے ساتھی حائل حکومتوں[2] کی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں: رومی سلطنت کی جو سرحد دریائے رھائن کے زیریں حصے پر تھی، وہاں سیلئن فرینک[3] اس کے محافظ تھے، وہ چوتھی صدی مسیحی کے وقت سے پانچویں صدی کے وسط تک یہ خدمات انجام دیتے رہے - ہماری بیان کردہ صورت حال کی یہ بھی ایک مثال ہے لیکن فاتح بربری معدوم سلطنتوں کے اندر جو جانشیں حکومتیں قائم کرتے ہیں، آن کے انجام سے ظاہر ہے کہ بربری اپنی معمولی درجے کی سیاسی صلاحیت سے گھٹیا درجے کی چیز پیدا کرتے ہیں اور وہ اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتی اور آن مسائل کو حل نہیں کر سکتی جو ہمہ گیر حکومت کے تدبر کے لیے بھی

۱- چیڈوک (Chadwick) کی کتاب ''سورماؤں کا دور''، صفحہ ۴۴۲ - ۴۴۴ -

۲- Buffer States، آن حکومتوں کو کہتے ہیں جو دو کے بیچ میں حائل ہوں (مترجم)-

۳- Salian Franks: یہ فرینکوں کا ایک گروہ تھا (مترجم) -

لا ینحل ثابت ہو چکے تھے۔ بربریوں کی جانشیں حکومت اس کام میں اندھا دھند ہاتھ ڈال دیتی ہے جسے وہ پورا نہیں کرتی اور صرف اس بنا پر یہ جسارت کر لیتی ہے کہ دیوالیہ سلطنت اپنا وقار و اعتماد کھو چکی تھی۔ یہ گنوار لوگ خود اپنا ناگزیر انجام قریب تر لے آتے ہیں، اخلاقی آزمائش کا دباؤ ان کی قوت توڑ دیتا ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اپنے اندر ایک مہلک نامحکمی ہوتی ہے۔ جس سیاست اور سیاسی جماعت کا انحصار ان مسلح لٹیروں کی ناقابل اعتماد وفاداری پر ہوتا ہے جو اپنے آپ کو ایک غیر ذمہ دار فوجی قائد سے وابستہ کر لیتے ہیں، وہ سیاست اور وہ جماعت اس قوم کی حکومت کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی جس کا کاروبار چلانے میں تہذیب بھی ناکام رہی؛ ابتدائی دور کے ہم جنس گروہ ٹوٹ کر بربری جتھے بن جاتے ہیں اور یہ جتھے تیزی سے ٹوٹتے ہیں تو اجنبی رعایا بن کر رہ جاتے ہیں۔

مہذب ملک میں مداخلت کرنے والے بربری جتھے در اصل اپنے آپ کو اخلاقی شکست کا ہدف بنا لیتے ہیں اور یہ مداخلت کا ناگزیر نتیجہ ہے لیکن وہ روحانی کشمکش کے بغیر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے نہیں کرتے؛ اس روحانی کشمکش کے نشانات ان کے افسانوں، مذہبی رسموں اور عام طرز عمل کی ادبی دستاویزوں میں ملتے ہیں۔ بربریوں میں ایک افسانہ عام ہے جس میں ہیرو کو کسی نہ کسی دیو یا عفریت سے لڑنا پڑا تاکہ اس خزانے پر قبضہ کر لے جسے اس غیر ارضی دشمن نے روک رکھا تھا اور انسانیت اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتی تھی۔ یہی عام مضمون ہے جو گرینڈل[1] اور اس کی ماں سے بیوولف[2] کی جنگ کے افسانوں میں بیان ہوا؛ یہی افسانہ مختلف شکلوں میں تقریباً ہر جگہ ملے گا مثلاً سیگ فریڈ[3] نے اژدھا سے جنگ کی، پرسیوس[4]

۱- Grendel -

۲- Beowulf ، یہ ایک اینگلو سیکسن نظم کا ہیرو تھا، جس نے گرینڈل اور اس کی ماں کو مارا (مترجم)۔

۳- Siegfried ، ایک ٹیوٹانی افسانے کا ہیرو (مترجم)۔

۴- Perseus ، یہ ایک یونانی افسانے کا ہیرو ہے، افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ تین نہایت بدصورت عورتیں تھیں جنھیں گارگن کہتے تھے، ان کے بالوں کی جگہ سانپ لٹک رہے تھے۔ ان میں سے دو غیرفانی تھیں اور ایک فانی، فانی کو پرسیوس نے مارا تھا (مترجم)۔

نے گارگن کے ٹکڑے اڑائے ، پھر ایک بحری عفریت کو قتل کر کے اینڈرومیڈا[۱] کو حاصل کیا جسے مذکورہ عفریت نگل جانے والا تھا؛ جے سن[۲] نے اُس سانپ کو شکست دی جو سنہری اُون کا محافظ تھا اور ھرقل[۳] نے سر بروس[۴] کو اغوا کیا ۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ افسانہ ایک نفسیاتی کشمکش کا مظہر تھا جو بربری کی اپنی روح کے اندر جاری تھی ؛ کشمکش کا مدعا یہ تھا کہ انسان کے روحانی خزانے کی حفاظت کی جائے اور سرحدوں کے ٹوٹنے سے جو شیطانی قوت نفوذ کر آئی تھی ، اُسے روکا جائے ۔ ھم کہ سکتے ھیں کہ یہ افسانہ اُس آسیب کو اُتارنے کے مراسم کی ایک ادبی تصویر ھے جس میں فوجی اعتبار سے کامیاب اور روحانی اعتبار سے آزار رسیدہ بربری اپنی تباھی خیز نفسی بیماری کے عملی علاج کے سلسلے میں مبتلا ھو جاتا ھے ۔

سورماؤں کے دور کے خاص حالات کے مطابق جو خاص عملی معیار پیدا ھوتے ھیں اُن پر ایک اَور نقطۂ نگاہ سے بھی غور کیا جا سکتا ھے ؛ جو بربری سردار مادی سرحدیں ٹوٹ جانے کے باعث ایک خستہ حال تہذیب کے مالک بن جاتے ھیں ، اُن کی روحوں کے اندر ایک تباھی خیز شیطانی قوت ابھر آتی ھے ، اس قوت کی غارت گری کی روک تھام کے لیے خاص اخلاقی حدیں قائم کر دی جاتی ھیں ۔ اس سلسلے میں نمایاں ترین مثالیں دو ھیں : اول ایکائیوں کی ھومرانہ نظمیں ، آئی ڈوس[۵] اور نیمی سس[۶] یعنی شرم اور غصہ اور امویوں کا تاریخی 'حلم' :

۱- Andromeda ، یونانی افسانے کی حسین لڑکی جسے ایک بحری عفریت نگل جانے والا تھا ، پرسیوس نے عفریت کو مار کر لڑکی کو بچایا اور اُس سے شادی کر لی ، موت کے بعد اسے ستارہ بنا دیا گیا (مترجم) ۔

۲- Jason ۔ ۳- Herakles ۔

۴- Cerberus ، یہ ایک کتا تھا جس کے تین سر تھے اور خطہ ھائے دوزخ کا اسے محافظ مانا جاتا تھا ، رستم کی مردانگی کے سات مختلف واقعے تھے جسے ھفت خواں کہا جاتا ھے ۔ ھرقل کے ساتھ افسانوں میں ایسے بارہ واقعے منسوب ھیں ، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ سربروس کو کھینچ کر زمین پر لے آیا تھا (مترجم) ۔

۵- Aidos ، بمعنی شرم (مترجم) ۔

۶- Nemesis ، بمعنی غصہ (مترجم) ۔

عزت کی طرح آئی ڈوس اور نیمی سس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جب انسان آزاد ہوتا ہے اور اُس پر کوئی پابندی باقی نہیں رہتی تو اس وقت ان کا عمل شروع ہوتا ہے ۔ اگر آپ کسی ایسی قوم کی مثال سامنے لائیں - - - - جو پرانی پابندیوں کو توڑ چکی ہے اور اس میں سے کسی طاقتور اور زبردست سردار کا انتخاب کریں جو کسی سے نہ ڈرتا ہو تو آپ کو پہلے پہل یہ خیال ہوگا کہ یہ آدمی اپنے ہر خیال کو جامۂ عملی پہنانے میں آزاد ہے ؛ ساتھ ہی آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ بے قانونی کے درمیان بھی کوئی ایسا فعل ضرور سرزد ہوگا جس پر اس کے دل میں بے چینی پیدا ہو جائے گی ۔ اگر ایسا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ اُسے اپنے فعل پر پشیمانی ہوئی اور یہ بات اُسے ستا رہی ہے ؛ اگر یہ فعل سرزد نہیں ہوا تو آیندہ کے لیے اس سے احتراز کرے گا ، سبب یہ نہیں کہ اس پر کوئی مجبوری عائد ہو گئی ، یہ بھی نہیں کہ بعد ازاں اس کا نتیجہ ایسا نکلے گا جو اس کے لیے مفید نہ ہوگا ، صرف اس لیے کہ وہ "آئی ڈوس" (شرم) محسوس کرے گا - - - آئی ڈوس (شرم) وہ احساس ہے جو انسان کے دل میں اپنے کسی فعل کے لیے رو نما ہوتا ہے ، نیمی سس وہ احساس ہے جو دوسرے کا عمل دیکھ کر پیدا ہوتا ہے یا یہ کہ لیجیے کہ غصہ وہ احساس ہے جو آپ کے خیال کے کے مطابق آپ کے کسی عمل کے متعلق دوسروں کے دل میں پیدا ہوگا - - - فرض کیجیے کہ آپ کو کوئی دیکھ نہیں رہا ، اس حالت میں بھی فعل کے متعلق غصے کا احساس پیدا ہونا چاہیے لیکن کوئی ہے نہیں جس کے دل میں یہ احساس پیدا ہو ۔ اگر آپ اپنے کسی فعل کے لیے ناپسندیدگی کی بناء پر شرم محسوس کریں تو سمجھنا چاہیے کہ آپ اس بات سے آگاہ ہیں کہ کوئی نہ کوئی شخص آپ کے اس فعل کو نا پسند کرتا ہے اور اس کی تصدیق و تائید

> کے لیے تیار نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ زمین پانی اور ہوا سب کو زندہ آنکھیں ملی ہوئی ہیں ، وہ آپ کو دیکھ رہی ہیں اور آپ نے جو کچھ کیا اس پر ناراض ہیں[1]۔

منویوں کے دور شجاعت کے بعد جو حالات رونما ہوئے ، وہ ہومر کی نظم میں بہ خوبی واضح کیے گئے ہیں ؛ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جن افعال پر شرم اور غصے کے احساسات پیدا ہوتے ہیں ، وہ یہ ہیں : بزدلی ، دروغ گوئی ، جعل سازی ، بڑوں کے احترام سے بے پروائی ، بے یار و مددگار لوگوں پر ظلم یا اُن سے غداری :

> غلط افعال کے صدور کے علاوہ لوگوں کے بعض طبقے ہیں جو دوسروں کے مقابلے میں شرم کے زیادہ ہدف بنتے ہیں ؛ بعض ایسے لوگ ہیں جن کی موجودگی میں انسان شرم محسوس کرتا ہے ، خبردار رہتا ہے ، ہیبت پیدا ہوتی ہے اور اس کے دل میں بہتر طرز عمل کی اہمیت کا احساس تیزتر ہو جاتا ہے ، ایسے لوگ کون ہیں ؟ بادشاہ یا بزرگ یا دانش مند یا امیر یا سفیر وغیرہ ، ان کے لیے آپ کے دل میں طبعاً احترام پیدا ہوتا ہے اور ان کی اچھی یا بری رائے کو دنیا میں اہم سمجھا جاتا ہے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ آپ پر واضح ہوگا کہ یہ لوگ نہیں بلکہ دوسرے لوگ ہیں جو شرم کے احساس کو زیادہ ابھارتے ہیں ، جن کی موجودگی میں آپ کو اپنی نالائقی کا احساس زیادہ ہوتا ہے ، جن کی اچھی یا بُری رائے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے اگرچہ اُس کی وجہ بیان نہیں کی جاسکتی ، وہ کون لوگ ہیں ؟ وہ لوگ جو زمین سے محروم ہوئے ، زخم خوردہ لوگ ، بے کس لوگ اور سب سے بڑھ کر وہ جو ہر لحاظ سے بے بسی میں پڑے ہوئے ہیں یعنی مردے[2]۔

۱۔ گلبرٹ مرے کی کتاب ''یونان کی رزمیہ نظموں کا آغاز'' ، صفحہ ۸۳ - ۸۴ ۔

۲۔ گلبرٹ مرے کی کتاب ''یونان کی رزمیہ نظموں کا آغاز'' ، صفحہ ۸۵ - ۸۸ ۔

آئی ڈوس اور نیمی سس مجلسی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہیں ؛ ان کے برعکس حلم صرف سیاسی دائرے کی خوبی ہے ، یہ آئی ڈوس اور نیمی سس کے مقابلے میں کم جاذب ہے لیکن واضح رہے کہ یہ عاجزی یا مسکنت کا اظہار نہیں :

> اس کا حقیقی مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخالف کو جھکنے پر مجبور کیا جائے ، اپنی برتری کا پہلو دکھا کر اس پر گہرا اثر ڈالا جائے ، اپنی روش کا وقار اور داب دکھا کر اسے حیرت میں ڈالا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ حقیقت حال پر غور کیا جائے تو حلم عربوں کے بعض دوسرے محاسن کی طرح نمائش اور دکھاوے کی خوبی ہے ، اس میں حقیقت کے بجائے نمود زیادہ ہے[1] ۔ ۔ ۔ ۔ دل جوئی کی ایک اچھی بات یا ایک لطیفے کے ذریعے سے حلم کی شہرت حاصل کی جا سکتی ہے ، عرب کے ماحول سے اسے بڑی مناسبت تھی اور عرب کا معاشرہ ایسا تھا جہاں تشدد کے ہر فعل کے لیے بے دردانہ انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ معاویہؓ اور اموی جانشینوں نے حلم پر جس طرح عمل کیا ، اس سے عربوں کی سیاسی تعلیم کا کام بہت سہل ہو گیا ، اس طرح صحرا کی بے لگام آزادی کو قربان کر دینے کی تلخیاں عربوں کے لیے شیریں بن گئیں اور وہ حکمرانوں کے مطیع ہوگئے جنھوں نے فولادی پنجے پر مخمل کے دستانے پہن کر سلطنت کا کاروبار چلایا[2] ۔

حلم ، شرم اور غصے کی فطرت کے متعلق ان خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ عہد شجاعت کے خاص حالات کے لیے امن کے یہ معیار کس درجے موزوں تھے ۔ یہ دور اصلاً عارضی ہوتا ہے اور جب اس کا ظہور ہوتا ہے تو یہ طرز عمل بروے کار آ جاتا ہے اور جب یہ دور اختتام کو پہنچتا ہے تو یہ معیار گہنا جاتے ہیں ؛ شرم اور غصے کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی مایوسی کی لہر دوڑ جاتی ہے ، ''فانی انسانوں کے لیے درد اور قلق کے

۱۔ اس کی دلیل معلوم نہ ہو سکی (مترجم) ۔

۲۔ لیمنس (Lammens) کی فرانسیسی کتاب مطبوعہ پیرس ۔

سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور یوم بد کی روک تھام ناممکن ہو جاتی ہے''۔ ہیسیڈ[1] اس امر پر پریشان ہے کہ یہ روشنیاں جو عہد تاریک میں انسانوں کے لیے سہارا بنی رہیں، ہٹ جائیں گی تو دائمی تاریکی کا دور شروع ہو جائے گا۔ اُسے یہ خیال نہیں آیا کہ رات کی ان روشنیوں کا بجھ جانا دن کے طلوع ہونے کا پیغام ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ کسی نومولود نئی تہذیب کے غیر محسوس طور پر آتے ہی شرم اور غصہ آسمان پر چلے جاتے ہیں اس لیے کہ وہ بیکار ہو جاتے ہیں اور نئے محاسن رواج پاتے ہیں جو مجلسی نقطۂ نگاہ سے زیادہ تعمیری ہوتے ہیں اگرچہ جمالیات کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ جاذب نہیں ہوتے۔ ہیسیڈ جس فولادی دور میں پیدا ہونے کا ماتم کر رہا ہے، اس وقت در حقیقت مردہ منوی تہذیب کے کھنڈروں پر ایک زندہ یونانی تہذیب کی عمارت کھڑی ہو رہی تھی؛ حلم پیش رو اُمویوں کے نزدیک حکمرانی کا گر بنا رہا تھا، عباسیوں کے لیے وہ گر بیکار تھا، انھوں نے تدبر سے کام لیتے ہوئے اُمویوں کی کارنامے پر مہر لگائی، رومی سلطنت کی شامی سرحدیں مٹا دیں تاکہ شامی سلطنت از سر نو وجود میں آ جائے۔

بربری لوگ جب ٹوٹی ہوئی سرحدوں سے گزر جانے کے لیے قدم اٹھاتے ہیں تو جو شیطان اُن کے قلب و روح پر قابض ہو جاتا ہے، اُسے جھاڑ پھونک سے اُتارنا ممکن نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ ان تمام محاسن کی شکل بگاڑ دیتا ہے جن سے اس کے معمول مزین ہوتے ہیں؛ شرم کے متعلق وہی الفاظ دہرائے جا سکتے ہیں جو مدام رولاں[2] نے آزادی کے متعلق کہے تھے، ''اے آزادی! کیا کہا جا سکتا ہے کہ تیرے نام پر کتنے جرموں کا ارتکاب ہوا ہے''۔ عہد شجاعت کی ممتاز ترین خصوصیت ہمہ گیر ظلم و جور ہیں، تاریخ کے صفحات بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں اور افسانے بھی ہمیں یہی بتاتے ہیں۔ بگڑا ہوا بربری معاشرہ جس میں ان افعال بد کا ارتکاب ہوتا ہے، اس سے اس

۱- Hesiod، ایک یونانی شاعر (مترجم)۔

۲- Roland، فرانس کے دور انقلاب کی مشہور خاتون، پیدائش ۱۷۵۴ء دوسرے مظلوموں کی طرح یہ بھی انقلابیوں کے ظلم کا شکار ہوئی اور ۱۷۹۳ء میں اسے موت کی سزا دی گئی، آخری وقت میں اس نے آزادی کے متعلق وہ کلمہ کہا تھا جو متن میں نقل ہوا ہے (مترجم)۔

درجے متعارف اور اس کی ہولناکی سے اس درجے بے حس ہوتا ہے کہ بھاٹ ان جنگی لیڈروں کی شہرت کو بقائے دوام کا لباس پہناتے ہوئے وہ گناہ بھی ان سے منسوب کرنے میں متامل نہیں ہوتے جو کبھی ان سے سرزد نہیں ہوئے، انہیں صرف یہی خیال ہوتا ہے کہ اُن کی قوت و طاقت زیادہ سے زیادہ بڑھی ہوئی نظر آئے خواہ اُن کی سیرت کتنی ہی تاریک بن جائے۔ یہ جنگی ہیرو صرف اپنے معروف دشمنوں ہی کے خلاف جرم و جور کے ان افعال کا ارتکاب نہیں کرتے؛ ٹرائے کی غارت گری کے خوفناک واقعات سے کہیں زیادہ خوفناک وہ واقعات ہیں جو خاندان ایٹریوس کے باہمی جھگڑوں میں پیش آئے، خاندان اس طرح باہم لڑنے لگیں تو وہ زیادہ دیر تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتے۔

دور شجاعت کی بربری قوت کا انجام یہی ہے کہ وہ ایک دم اعلیٰ درجے کی اقتدار کی پوزیشن سے گر کر محو ہو جاتی ہے، تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً ایٹیلا کے مرتے ہی ہنوں کا اقتدار گہنا گیا، جن سیرک[1] کی وفات سے ونڈال قوم کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا؛ یہ اور اس قسم کی دوسری مصدقہ تاریخی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ایکائی فتوحات کی لہر بھی ٹرائے کی غرقابی کے بعد درہم برہم ہو گئی؛ غرض ان جنگی سرداروں کی فتوحات کتنی ہی وسعت اختیار کر لیں لیکن وہ اداروں کی تخلیق نہیں کر سکتے، شارلمین جیسے پڑھے لکھے اور نسبتاً مہذب جنگی سردار کی سلطنت کا جو انجام ہوا، وہ ان لوگوں کی ناقابلیت کی ایک روشن دستاویز ہے۔

۴۔ خیال اور حقیقت

سابقہ باب میں جو تصویر پیش کی گئی ہے، اگر وہ حقیقت پر مبنی ہے تو عہد شجاعت کے متعلق آخری فیصلہ بڑا ہی سخت ہونا چاہیے؛ نرم سے نرم رائے رکھنے والے لوگ عہد شجاعت کو ایک مہمل گریز سے تعبیر کریں گے اور سخت رائے ظاہر کرنے والے اسے مجرمانہ اقدام کہ کر ہدف مذمت بنائیں گے۔ مہملیت کا فیصلہ ہمیں عہد وکٹوریہ کے ایک شاعر کی رسیلی نظموں میں ملتا ہے جو بربریت کے نئے دور کی برف باری کے اثرات محسوس کر چکا تھا:

۱۔ Jenseric، ہسپانوی ونڈالوں کا بادشاہ، ۴۰۶ء - ۴۷۷ء (مترجم)۔

ان خوش شکل جنگجوؤں کے حالات پر ایک نظر ڈالو ، یہ
طویل القامت گاتھ !
اس دن سے جب یہ نیلگوں آنکھوں والے بال بچوں کے ساتھ
وسچولا کے سرد مرغزاروں سے اپنے تاریک گھر چھوڑ کر ،
بحیرۂ بالٹک کے کناروں پر پہنچے جہاں ہر طرف عنبر بکھرا
پڑا تھا
اور اپنی مردانگی کی غیر ناپاک قوت کے ساتھ
اپنا مشہور راستہ محسوس کرتے ہوئے غیر معلوم ارض موعود
میں پہنچے -
انہوں نے شہنشاہی لبادے کے اُدھڑے ہوئے حاشیے
پھاڑ ڈالے ،
اس کے لباس پاؤں تلے روند ڈالے ، فوجوں کو شکست دی ،
بادشاہ کو قتل کیا ، اس کے شہر جلا دیے ،
ایتھنز اور رومہ کو لوٹا ، قیصر کو نکال باہر کیا ،
اس مقام پر بیٹھ کر دنیا کے حکمران بن گئے جہاں پہلے رومی
حکمران تھے
لیکن تین صدیوں کی غارت گری اور خونریزی ،
دل کی بے رحمی ، ہاتھ کی وحشیانہ بے دردی ،
اب کچھ باقی نہیں رہا - - - - - یہ گاتھ صرف تباہی کے لیے
قوت کے مالک بنے رہے ،
وہ نہ لکھ سکتے تھے نہ کوئی کام انجام دے سکتے تھے ، نہ
سوچ سکتے تھے ، نہ تخلیق کر سکتے تھے ؛ کھیت موٹھوں ،
پھپھوندی لگے ہوئے گیہوں سے بھرے پڑے تھے ؛ ان کی
درانتیوں کے گیت تھوڑی دیر کے لیے گائے گئے اور کوئی
نشان باقی نہ رہا[1] -

یہ متوازن فیصلہ پندرہ سو سال بعد صادر ہوا لیکن اس سے وہ یونانی شاعر مطمئن نہ ہو سکتا تھا جس کے دل میں یہ تلخ احساس تازہ تھا کہ وہ

۱- روبرٹ برجیز کی نظم ''حسن کا میثاق'' -

منویوں کی بحری حکومت کے بربری جانشینوں کے ماتحت رہتا ہے ، اس مقام کو اخلاقی اعتبار سے گندہ اور غلیظ ہی سمجھا جا سکتا تھا ۔ ہیسیڈ نے منوی دور شجاعت کے بعد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے جو فیصلہ صادر کیا ، اُس میں محض مہملیت ہی نہیں بلکہ مجرمیت پر بھی زور دیا اور یہ عہد نومولود یونانی تہذیب کے لیے خطرے کا باعث بنا ہوا تھا ؛ چنانچہ ہیسیڈ کا فیصلہ بڑا سخت ہے ، وہ کہتا ہے :

> اور ہمارے باپ زیوس نے فانی آدمیوں کی ایک تیسری نسل بنائی ، اسے برنجی نسل قرار دینا چاہیے جسے پہلی نسل سے کوئی مناسبت نہیں : روٹی کبھی اُن کے لبوں سے اندر نہیں گئی ، اُن کے سینوں میں پتھر کے دل تھے جن تک کسی کے لیے پہنچنا ممکن نہ تھا ، وہ بے پناہ قوت کے مالک تھے ، اُن کے بازوؤں کو کوئی شکست نہ دے سکتا تھا جو اُن کے قوی ہیکلوں پر کندھوں سے وابستہ تھے ؛ ان کی زرہیں پیتل کی تھیں ، گھر پیتل کے تھے ، پیتل کے ذریعے سے وہ زمین کاشت کرتے (سیاہ لوہے کے ذریعے سے نہیں) ۔ وہ اپنے ہاتھوں پستی میں گرے اور درک اسفل میں پہنچ گئے ، کوئی نشان باقی نہ رہا ، اُن کی مردانگی کے باوجود موت نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا اور سورج کی روشنی سے وہ محروم ہو گئے[۱] ۔

بربری مجرمانہ حماقتوں سے اپنے اوپر جو مصیبتیں لاتے ہیں ، اُن کے بارے میں اخلاف کا یہ فیصلہ جو ہیسیڈ کی نظم میں پیش کیا گیا تھا ، آخری فیصلہ ہوتا لیکن شاعر خود ایک اَور راستے پر لگ گیا ، وہ کہتا ہے :

> جب یہ نسل زمین میں دفن ہو گئی تو ایک چوتھی نسل پیدا ہوئی ، یہ بھی قرونوس کے بیٹے زیوس نے پیدا کی ؛ یہ پہلی نسل سے بہتر تھی ، اس میں راست بازی زیادہ تھی ، یہ بہادروں کی ایک مقدس نسل تھی جنھیں نیم دیوتا کہنا چاہیے ، یہ نسل بے کنارہ زمین پر وقت سے پہلے پیدا ہو گئی ،

۱۔ ہیسیڈ کی کتاب ”کام اور دن“ ۔

انھیں جنگ کی مصیبتوں نے تباہ کیا ، بعض سات دروازوں[1] والے شہر تھیبز کے نیچے مرے جب وہ اوڈیپس[2] کے لیے لڑ رہے تھے ، بعض جہازوں میں سوار ہوکر حسین ہیلن کی خاطر ٹرائے کی تباہی کے لیے نکل پڑے ، وہاں انجام کی بجلی اُن پر گری، اور وہ موت کی آغوش میں ناپید ہو گئے ، اُن میں سے تھوڑے تھے جنھیں زندہ رہنا نصیب ہوا اور انسانیت سے الگ تھلگ ایک مقام کرونوس کے بیٹے زیوس نے ان کے لیے تجویز کر دیا اور وہ زمین کے کنارے جا بسے - وہ وہاں رہتے ہیں ، اُن کے دل ہر تشویش سے پاک ہیں ، بابرکت ہستیوں کے جزیرے اُن کا وطن ہیں ؛ یہ جزیرے اُس جگہ واقع ہیں جہاں سمندر کی لہروں نے گرداب پیدا کر رکھے ہیں ، خوش نصیب بہادر جنھیں شہد جیسی میٹھی فصل ملتی ہے اور وہ سال میں تین مرتبہ پکتی ہے![3]-

اب سوچنا چاہیے کہ اس اقتباس کا اس ٹکڑے سے کیا علاقہ ہے جو بالکل اس سے پیشتر آیا ہے بلکہ نسلوں کی اس فہرست سے اسے کیا علاقہ ہے؟ اس کہانی نے تسلسل میں دو جگہ خلل پیدا کیا ہے : اول جس نسل پر یہاں تبصرہ کیا گیا ہے ، اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا جس طرح کہ سابقہ نسلوں (سنہری ، روپہلی اور برنجی) یا لاحقہ نسل (فولادی) کے نام تجویز کر دیے گئے تھے ؛ دوم ان چار نسلوں کو بہ لحاظ صلاحیت نزولی ترتیب میں رکھا گیا ، مزید برآں تین سابق نسلوں کی تقدیریں موت کے بعد دنیا پر ان کی زندگی کی روش کے عین مطابق دکھائی گئیں یعنی سنہری نسل زیوس

۱- Thebes ، یونان کا قدیم شہر جس کی بنیاد کیڈمس Cadmus نے رکھی (مترجم) -

۲- Oedipus ، مشہور ہے کہ ایک بحری عفریت سفنکس کی شکل میں نمودار ہوا اور اہل تھیبز کے سامنے ایک معما پیش کیا ، جو اسے حل نہ کر سکتا مارا جاتا - آوڈیپس نے معما حل کیا اور اہل تھیبز کو اس مصیبت سے بچایا (مترجم) -

۳- ہیسیڈ کی نظم -

اعظم کی مرضی کے مطابق اچھی روحوں میں تبدیل ہو گئی ——— وہ روحیں جو زمین کے اوپر رہتی ہیں ، فانی انسانوں کی حفاظت کرتی ہیں اور انھیں مال و ثروت سے شادکام رکھتی ہیں؛ روپہلی نسل پہلی سے فروتر تھی لیکن اسے بھی زمین کے نیچے فانی انسانوں نے ''بابرکت'' کا نام دے دیا اور اسے عظمت و شان کا دوسرا درجہ ملا تاہم اسے بھی عزت کا مقام مل گیا۔ جب ہم برنجی نسل پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ موت کے بعد اس کی تقدیر کے بارے میں ایسا سکوت اختیار کر لیا گیا جس سے بد شگونی اور بد فالی مترشح تھی۔ جو فہرست اس نمونے کے مطابق تیار ہوئی ہو ، اس میں چوتھی نسل کے متعلق یہی آمید رکھی جا سکتی ہے کہ اسے موت کے بعد مجرموں کی اذیتوں سے سابقہ پڑے گا لیکن اس کے بر عکس ہم پر یہ آشکارا ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض برگزیدہ اصحاب کو موت کے بعد بہشت میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے وہ زمین سے بالائی فضا میں ویسی ہی زندگی بسر کر رہے ہیں جو سنہری نسل کے لیے مخصوص رکھی گئی تھی۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برنجی نسل اور فولادی نسل کے درمیان ابطال کی ایک نسل کا لانا حقیقت میں بعد کا خیال تھا جس نے نظم کے تسلسل ، یکسانی اور مفہوم میں خلل پیدا کر دیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کو اس بے ڈھنگی ٹھونسا ٹھونسی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس کا جواب صرف یہ ہونا چاہیے کہ نسل ابطال کی جو تصویر یہاں پیش کی گئی ہے ، وہ شاعر اور اس کے سامعین کے دل و دماغ پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے لیے جگہ پیدا کیے بغیر چارہ نہ تھا؛ واقعہ یہ ہے کہ نسل ابطال برنجی نسل ہی کی داستان کا اعادہ ہے لیکن ہیسیڈ کے حقیقت گوئی کے افسردہ و تلخ انگیز انداز میں نہیں بلکہ ہومر کی خیال آرائیوں کے دل آویز و شاندار انداز میں۔

مجلسی اصطلاحات کے مطابق دور شجاعت صریح حماقت اور مجرمیت معلوم ہوگا لیکن جذبات کے نقطۂ نگاہ سے یہ بہت بڑا ولولہ انگیز تجربہ ہے جس میں وہ دیوار توڑی جاتی ہے جو نسلوں تک بربری حملہ آوروں کے اجداد کے لیے باعث حیرت و استعجاب بنی رہی اور اس بہ ظاہر لا متناہی دنیا میں قدم رکھا جاتا ہے جس میں قدم قدم پر غیر محدود ممکنات سامنے نظر آتی ہیں۔ یہ تمام ممکنات ایک شاندار استثناء کے سوا بحیرۂ مردار کے میوے ثابت ہوتی

ہیں یعنی دیکھنے میں اچھے اور ذائقے میں حد درجے تلخ و نفرت انگیز لیکن دیکھیے! اگرچہ مجلسی اور سیاسی سطح پر بربریوں کی ناکامی و نامرادی ہر لحاظ سے آخری منزل پر پہنچ جاتی ہے مگر یہ کتنا تعجب خیز واقعہ ہے کہ یہی ناکامی و نامرادی بربریوں کے بھاگوں کو تخلیقی داستان طرازیوں میں کامیاب بناتی ہے اس لیے کہ فنون لطیفہ میں کامیابی کے بجائے ناکامی سے بدرجہا زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ کامیابی و فائزالمرامی کی کوئی داستان المیے کی عظمت و برتری حاصل نہیں کر سکتی، سیر و گردش سے جو شگفتگی پیدا ہوتی ہے؛ وہ انجام کار ارباب عمل کی بدمست روحوں میں بے ہمتی کی شکل اختیار کر لیتی ہے؛ بربریوں کے شعرا اپنے مشاہیر کی شرارت اور نا اہلیت کی یاد کو تخیل کا لباس پہنا کر ایک غیر فانی گیت بنا دیتے ہیں، شاعری کی اس سحر خیز اور جادو طراز دنیا میں بربری فاتحین وہ شان و شکوہ حاصل کر لیتے ہیں جو عملی زندگی میں ان کی گرفت سے باہر رہتے ہیں، بے روح تاریخ کا ڈھانچا شگفتہ ہو کر ایک غیر فانی رومان بن جاتا ہے، سورماؤں کی رجزیہ شاعری کا جادو بعد میں آنے والے لوگوں کو مسحور کیے رکھتا ہے۔ اس مسحوریت کی وجہ سے ایک تہذیب کی موت اور اس کی جانشین کی پیدائش کا بے کیف بلکہ نفرت انگیز درمیانی دور ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسے موجودہ تصنیف کی اصطلاح میں دور شجاعت یا سورماؤں کا زمانہ کہا گیا ہے اور یہ تعبیر ارادی طنز سے خالی نہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس التباس کا سب سے پہلا شکار دور تاریک کا شاعر ہوتا ہے یعنی وہ دور جسے عہد شجاعت کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ نظر باز گشت میں بالکل واضح ہے کہ اس دور کو دور تاریکی قرار دینا اس کے لیے باعث ندامت نہیں، اس طرح یہ نمایاں کرنا مقصود ہے کہ بربریوں کی آتش زنی نے جو الاؤ روشن کیے تھے، آہستہ آہستہ ان کا ایندھن جل چکا اور وہ بجھ گئے؛ شعلوں سے داغ دار زمین پر راکھ کا فرش بچھا ہوا نظر آتا ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دور تاریک میں تخلیقی جوہر موجود ہوتا ہے اور دور شجاعت کو اس جوہر سے بالکل عاری ماننا چاہیے۔ وقت گزرتا ہے تو زندگی کی نئی ابھریں نمودار ہوتی ہیں اور راکھ کے فرش والی زمین کی طبعی قوت نمو نئے سبزے کو وجود بخشتی ہے۔ ہیسیڈ کی شاعری اگرچہ ہومر کی شاعری کے مقابلے میں بے روح اور بے کیف نظر آتی ہے تاہم وہ موسم بہار

کی واپسی کے لیے مژدہ بشارت بن جاتی ہے لیکن طلوع سحر سے پیشتر کے دور تاریک کا دیانت کیش وقائع نگار کو رات کی آتش زنی کے واقعات سے متاثر شاعری اس درجے متحیر کر دیتی ہے کہ وہ سورماؤں کی نسل کے ان واقعات کو تاریخی حقایق قرار دے لیتا ہے حالانکہ انہیں بروے کار لانے کا ذمہ دار صرف ہومر کا تخیل تھا۔

ہیسیڈ کا التباس اس وجہ سے اُور بھی تعجب انگیز بن جاتا ہے کہ برنجی نسل کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ اس نے ہومر کی خیالی مخلوق کے علاوہ بربریت کو بھی اس کی حقیقی صورت میں نمایاں کر دیا۔ اس کایے کے علاوہ بھی داخلی شہادت کی بناء پر عہد شجاعت کو سراسر بے بنیاد افسانہ ثابت کیا جا سکتا ہے؛ یہ سورما لوگ برائی میں ڈوبے رہے اور برنجی دور کے لوگوں کی طرح بے دردی سے مارے گئے - جب مصنوعی روشنیاں گل کر دی جائیں، ہنگامہ آرا معرکوں اور ہنگامہ خیز جشن آرائیوں کے باب میں شاعرانہ خیال آرائیوں پر دن کی روشنی میں نظر ڈالی جائے تو جس شے کو والہالا یا قصر شہدا سمجھا جاتا ہے، وہ ایک گندی اور غلیظ جھونپڑی ثابت ہوتی ہے، جن جنگ جوؤں کو قصر شہدا میں داخلے کے حق دار مانا جاتا ہے، وہ حقیقت میں شیاطین دکھائی دیتے ہیں جن کے خلاف وہ قوت آزمائی میں مصروف رہے، شیاطین اور یہ جنگ جُو ایک دوسرے کو تباہ کرتے رہے اور روئے زمین سے مٹتے گئے؛ اس طرح دنیا ان کے اٹھائے ہوئے طوفان بے تمیزی سے نجات حاصل کر گئی اور خود ان لوگوں کے سوا سب کے لیے یہ واقعہ انجام بہ خیر کا مژدہ بن گیا۔

جن لوگوں نے بربری داستان سرائیوں سے دھوکا کھایا، ممکن ہے ہیسیڈ ان میں سے پہلا شخص ہو لیکن وہ آخری شخص نہ تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ دنیا اس وقت کافی متنور ہو چکی تھی لیکن کیا یہ بات حد درجے عجیب نہیں کہ اس دور تنور میں ایک اتائی فلسفی نے بربریوں کی شمالی نسل کے اچھے اثرات کا افسانہ تراشا، اس نے کہا کہ اگر کسی ناکارہ و بے تواں معاشرے میں اس نسل کا خون داخل کر دیا جائے تو وہ اعادۂ شباب کی اکسیر ثابت ہوگا اور زندہ دل فرانسیسی امیر کے اس سیاسی ٹھٹھول کو جرمنوں کی نئی شیطانی بربریت کے داعیوں نے جب ایک نسلی افسانے کی شکل دے دی تو یقیناً اس سے ہمیں دکھ پہنچا۔ افلاطون نے جمہوریت کا نقشہ تیار کیا تھا تو کہا تھا کہ شاعروں کو اس سے جلا وطن کر دینا

چاهیے؛ جب هم تاریخی داستانوں کے مصنفوں اور تیسری رایش[1] کے بانیوں کے درمیان علت و معلول کے سلسلے کا بہ غور معائنہ کرتے هیں تو افلاطون کے مذکورہ بالا قول کی اهمیت هم پر بخوبی واضح هو جاتی هے۔

تاهم ایسے مواقع بھی آئے کہ خواہ مخواہ مداخلت کرنے والے بربری نے اخلاف کی کچھ نہ کچھ خدمت انجام دی مثلاً پہلی نسل کی تہذیبوں اور دوسری نسل کی تہذیبوں کے درمیانی عبوری دور میں یہ بربری مرد، تہذیب اور اس کی جانشین نو مولود میں حلقۂ اتصال بنے رہے جس طرح کہ دوسری نسل کی تہذیبوں اور تیسری نسل کی تہذیبوں کے درمیان عبوری دور میں مذهبی نظاموں کے ''پیلے'' حلقۂ اتصال مہیا کرتے رہے؛ مثال کے طور پر سریانی اور یونانی تہذیبیں پیشرو منوی تہذیب کے ساتھ منوی معاشرے کے خارجی پرولتار کے ذریعے سے ملیں، بالکل یہی تعلق نئی تہذیب کو پیشتر کی سمیری تہذیب سے تھا، اسی طرح هندی تہذیب کا اتصال پیشتر کی سندهی ثقافت سے هوا (اگر هم یہ مان لیں کہ سمیری تہذیب کے علاوہ اس آخری ثقافت کی مستقل حیثیت بھی تھی[2]) ۔ جس طرح خارجی پرولتار جنگی جتھے تیار کرتا هے اسی طرح داخلی پرولتار مذهبی نظام بناتا هے، یہ پرولتار در اصل انحلال پذیر تہذیب سے نفسیاتی علٰحدگی کی پیداوار هوتے هیں اور یہ بھی واقعہ هے کہ یہ پرولتار ماضی کی نہایت قیمتی میراث فراهم کر کے آنے والی نسلوں کے حوالے کرتے هیں۔ یونانی تہذیب نے منوی تہذیب سے جو کچھ حاصل کیا، اگر هم اس کا مقابلہ

۱۔ Third Reich، ریش جرمن زبان میں پارلیمنٹ کے لیے بھی استعمال هوتا هے اور بادشاهی کے لیے بھی۔ نازیوں کے نزدیک جرمن کی قومی حکومتیں تین مرتبہ قائم هوئیں: پہلی جسے مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Emprire) کہتے هیں، یہ ۹۶۲ء سے ۱۸۰۶ء تک رهی، دوسری جو جنگ فرانس و جرمنی کے بعد ولیم اول نے ۱۸۷۱ء میں قائم کی اور یہ قیصر ولیم ثانی کی شکست پر ۱۹۱۸ء میں ختم هوئی، تیسری قومی حکومت وہ تھی جو نازیوں نے هٹلر کے ماتحت قائم کی، اسے تھرڈ رایش کہتے تھے (مترجم)۔

۲۔ مصنف کا مطلب یہ هے کہ وادئ سندھ کی ثقافت کو سمیری تہذیب کا جزو مانا جاتا هے لیکن اگر اسے ایک مستقل حیثیت دی جائے تو هم کہ سکیں گے کہ هندی تہذیب کا علاقہ اس ثقافت کے ساتھ تھا (مترجم)۔

اس شے سے کریں جو مسیحی مغربی تہذیب نے یونانی تہذیب سے حاصل کی تو مندرجہ بالا حقیقت ہم پر پوری طرح آشکار ہو جائے گی ۔ مسیحی کلیسا یونانیت کے اثرات سے حد درجے لبریز ہو چکا تھا ، عہد ہومر کے شعرا کو منوی معاشرے کے سوا کسی شے کا علم نہ تھا ، وہ دور شجاعت کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں گویا اس کے گرد و پیش کوئی دوسری شے موجود نہ تھی البتہ گاہے گاہے اس بہت بڑی لاش کا ذکر آ جاتا ہے جسے بھاٹوں کے مشاہیر گدوں کی حیثیت میں ——— وہ فخریہ انہیں ''غارت گران بلاد'' قرار دیتے ہیں ——— وہ کھاتے اور مزے اڑاتے تھے ۔

اس تصریح کی بناء پر اکائیوں اور اس عہد کے دوسرے بربریوں کی خدمت جنہوں نے ترسیل پذیر وظیفہ انجام دیا ، اس درجے بے حقیقت رہ جاتی ہے جسے کالعدم ماننا چاہیے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی حیثیت کیا تھی ؟ یہ حقیقت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ہم دوسری نسل کی ان تہذیبوں کی تقدیروں کا مقابلہ جو بربریوں کی کٹریوں کے ذریعے سے پیشروؤں کے ساتھ ملحق ہوئیں ، باقی ثانوی تہذیبوں کی تقدیروں سے کریں ۔ جو ثانوی تہذیب پیشرو کے خارجی پرولتار کے ذریعے سے ملحق نہیں ہوئی ، وہ پیشرو کی مقتدر اقلیت کے ذریعے سے الحاق پذیر ہوئی ، یہ صرف متبادل صورت ہے ؛ یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور کی تہذیبوں کے داخلی پرولتار نے اعلیٰ مذاہب کے جو ابتدائی خاکے تیار کیے ، وہ پہلے کی حیثیت اختیار نہ کر سکے ۔

بہ الفاظ دیگر دوسری نسل کی تہذیبوں کے دو گروہ بنتے ہیں : پہلا گروہ ان تہذیبوں کا جو خارجی پرولتار کے واسطے سے پیشروؤں کے ساتھ ملحق ہوئیں ، دوسرا ان تہذیبوں کا جن کا الحاق مقتدر اقلیتوں کے ذریعے سے ہوا ۔ دوسرے پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھیں تو ان گروہوں کے درمیان بعد المشرقین نظر آتا ہے ؛ پہلے گروہ کی تہذیبیں پیشروؤں سے اس درجے مختلف ہوتی ہیں کہ ان کے درمیان علاقہ الحاق بھی بادی النظر میں مشتبہ معلوم ہوتا ہے ، دوسرے گروہ کی تہذیبوں اور پیشروؤں کے درمیان اتنا گہرا تعلق نمایاں ہوتا ہے کہ ان کے جداگانہ وجود کے دعوے کو بھی متنازعہ فیہ سمجھا جا سکتا ہے ۔ آخری گروہ کی تہذیبوں کی تین معلوم مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں : اول بابلی تہذیب جسے یا تو مستقل تہذیب سمجھنا چاہیے یا مان لینا چاہیے کہ وہ سمیری تہذیب کا امتداد تھی ، دوسری یوکاٹائی اور

تیسری میکسیکی تہذیب ، دونوں آخرالذکر تہذیبیں مایائی تہذیب سے یکساں متعلق تھیں ۔ ان گروہوں کا تعین کر چکنے کے بعد ہمیں اختلاف کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے ؛ ثانوی ملحق تہذیبوں (یا کہیے ابتدائی تہذیبوں کے بے روح تنوں) کا گروہ بالکل ناکام رہا اور دوسرے گروہ کی تہذیبیں ——— یونانی سریانی اور ہندی ——— سب کی سب کامیاب رہیں ، سابقہ تہذیبوں میں سے کسی نے بھی مرنے سے پہلے کوئی مذہبی نظام پیدا نہ کیا ۔

اگر ہم اس نتیجے کو پیش نظر لائیں کہ ہمارے سامنے معاشروں کے جو نمونے یکے بعد دیگرے تاریخ وار آتے رہے ، ان کی ترتیب میں قدر و قیمت کا تدریجی عروج نمایاں ہے اور اس سلسلے میں عروج کا انتہائی نقطہ اعلیٰ مذاہب نے حاصل کیا ہے ۔ یہاں ہم یہ دیکھیں گے کہ دوسری نسل (نہ کہ تیسری نسل) کی تہذیبوں کے بربری پہلے بھی اعلیٰ مذاہب کے نشو و ارتقا میں حصہ داری کے اعزاز سے بہرہ مند ہیں ؛ اس کی توضیح مندرجہ ذیل نقشے سے بخوبی ہو سکے گی :

منوی تہذیب ↓ منوی ثقافت کے بعد کے بربری (فلسطینی اور اکائی)

وادیٔ سندھ کی ثقافت ↓ وادیٔ سندھ کی ثقافت کے بعد کے بربری (آریا) ↓ ہندی تہذیب

سریانی تہذیب ↓ اسلام (سریانی تہذیب سے بذریعہ داخلی پرولتار ماخوذ)

یونانی تہذیب

مسیحیت (یونانی تہذیب سے بذریعہ داخلی پرولتار ماخوذ)

مہایان (یونانی اور ہندی تہذیب سے بذریعہ داخلی پرولتار ماخوذ)

ہندویت (جسے داخلی پرولتار کے ذریعے ہندی تہذیب سے اخذ کیا گیا) ۔

عورتوں کا غیر طبعی اقتدار

عہد شجاعت کے بارے میں عام تصور یقیناً یہی ہوگا کہ یہ عہد سراپا مردوں کے کارناموں سے معمور ہوگا اس لیے کہ کیا شہادتوں کی بنا پر یہ عہد وحشیانہ قوت و طاقت کا مجرم ثابت نہیں ہوتا ؟ جب وحشیانہ قوت کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہاں عورتوں کے لیے صنف فائق کے مقابلے میں اپنی حیثیت قائم رکھنے کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے ؟ لیکن یہ منطقی قیاس و استخراج صرف دور شجاعت کی شاعری ہی کے ذریعے سے نہیں بلکہ تاریخی حقائق کے ذریعے سے بھی غلط ثابت ہوتا ہے ۔

اور شجاعت میں سب سے بڑے حوادث عورتوں ہی کی کارکردگی سے پیدا ہوتے ہیں اگرچہ بہ ظاہر عورتوں کے کاروبار کی حیثیت انفعالی ہوتی ہے ۔ اگر جیپیڈائی[1] کے استقبال کا اصل سبب یہ تھا کہ البائن[2] کو روزامنڈ[3] کی آرزو تھی اور یہ آرزو پوری نہ ہوئی تھی تو یہ بھی حقیقت ہے کہ ٹرائے کی تباہی و غارت گری ہیلن[4] کے متعلق پیرس[5] کی خواہش کے پورا ہو جانے کا نتیجہ

۱- Gepidae شمالی اٹلی کا ایک قبیلہ (مترجم) ۔

۲- Alboin ، لمبارڈ قبیلے کا بادشاہ ، ۵۷۱ء میں فوت ہوا ، اس نے بہت سی فتوحات حاصل کیں اور شمالی اٹلی میں لمبارڈوں کی سلطنت قائم کر دی تھی (مترجم) ۔

۳- Rosamund ، جیپیڈائی قبیلے کے بادشاہ کیونی منڈ (Cunemund) کی بیٹی ۔ البائن نے ایک لڑائی میں کیونی منڈ کو قتل کر دیا اور اس کی بیٹی روزامنڈ سے شادی کر لی ۔ مصنف کا مدعا یہ ہے کہ اگر لڑائی کے بغیر روزامنڈ سے شادی ہو جاتی تو جیپیڈائی کے استیصال اور کیونی منڈ کے قتل کی نوبت نہ آتی ۔ یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ البائن نے ایک موقع پر روزامنڈ کو مجبور کیا کہ اپنے مقتول باپ کی کھوپڑی میں شراب بھر کر پیے ، اس واقعے سے وہ اس درجے متاثر ہوئی کہ البائن کو اس نے موقع پا کر قتل کر دیا (مترجم) ۔

۴- Helen ، یونان کی مشہور ہیروئن جو شاہ ٹرائے کے بیٹے کے ساتھ بھاگ گئی ، اس پر یونان و ٹرائے کی جنگ شروع ہوئی اور انجام کار ٹرائے تباہ ہو گیا ۔ ہومر کی مشہور کتاب ایلیڈ کا موضوع یہی واقعہ ہے (مترجم) ۔

۵- Paris شاہ ٹرائے کا بیٹا ، ہیلن کا محبوب اور اغوا کنندہ (مترجم) ۔

تھی - عام صورت حال یہ رہی کہ عورتیں ہی بے تکلف فتنے برپا کرتی رہیں اور انہیں کی وجہ سے مشاہیر ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے - برون ہلڈ[1] اور کریم ہلڈ[2] کے درمیان جھگڑے افسانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، انہیں جھگڑوں کا انجام وہ خوفناک قتل و خونریزی تھی جو اٹزل[3] کے ڈینیوبی ہال میں پیش آئی - ہمیں اس افسانے کا ثبوت برون ہلڈ اور اس کے دشمن فریڈی گنڈ[4] کی عداوت میں ملتا ہے جس کی وجہ سے رومی سلطنت کی جانشین میرو ونجی سلطنت چالیس سال خانہ جنگی میں اُلجھی رہی -

عہد شجاعت میں عورتوں کا اثر صرف اس حد تک محدود نہ رہا کہ وہ اپنے مردوں کو برادرانہ رزم و پیکار کے لیے انگیخت دیتی رہیں : سکندر اعظم کی ماں اولمپیاس[5] اور امیر معاویہ رضؓ کی والدہ ھند نے تاریخ کے صفحات پر جو اثرات چھوڑے ، ان کی مثال کوئی دوسری عورت پیش نہیں کر سکتی ، دونوں نے اپنے بہادر بیٹوں پر مدت العمر کے اخلاق داب و تمکنت کی بناء پر غیرفانی شہرت حاصل کر لی ؛ مستند تاریخ میں سے گونرل[6] ، ریگن[7] اور لیڈی میک بتھ کی مثالیں بہ کثرت پیش کی جا سکتی ہیں - اس صورت حال کی توضیح کے دو پہلو ہیں : ایک مجلسی اور دوسرا نفسیاتی -

مجلسی پہلو یہ کہ دور شجاعت در اصل ایک مجلسی خلا کا زمانہ ہوتا ہے جس میں ابتدائی زندگی کے روایتی مراسم ٹوٹ جاتے ہیں اور نو مولود تہذیب یا

۱- Brunhild -
۲- Kriemhild -
۳- Etzel -
۴- Fredegund -
۵- Olympias -
۶- Goneril -

۷- Regan گونرل اور ریگن برطانیہ کے ایک افسانوی بادشاہ لیئر (Lear) کی بیٹیاں تھیں ، لیئر نے بڑھاپے میں اپنی سلطنت دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دی جو بڑی محبت کی دعوے دار تھیں ؛ سلطنت حاصل کرتے ہی دونوں نے یکے بعد دیگرے لیئر کو اپنے گھروں سے نکال دیا اور انتہائی بے وفائی کا ثبوت دیا - جس لڑکی نے محبت کے لمبے چوڑے دعوے نہیں کیے اور سلطنت میں سے اسے کوئی حصہ نہیں ملا تھا ، وہی آخری دم تک باپ کے حقوق ادا کرتی رہی - شیکسپیئر نے اس کہانی کو ایک غیر فانی ڈرامے کی شکل دے دی -

نو مولود مذہب کے نئے مراسم ترتیب نہیں پاتے ۔ اس عارضی دور میں مجلسی خلا کو وہ مطلق العنان انفرادیت بھرتی ہے ، جس میں اصناف کے درمیان داخلی امتیاز و اختلاف کا بھی کچھ لحاظ نہیں رہتا ۔ یہ امر خاص توجہ کا محتاج ہے کہ اس بے لگام انفرادیت سے جو نتیجے پیدا ہوتے ہیں ، انھیں اصول پرستانہ نسائیت کے نتائج سے الگ کرنا آسان نہیں ہوتا ؛ یہ نتائج ان ادوار کے مردوں اور عورتوں کے دائرہ جذبات یا افق ذہن و دماغ سے بہت دور ہوتے ہیں ۔ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ہم کہ سکتے ہیں کہ داخلی تنازع للبقا میں برتریوں کی کامیابی وحشیانہ قوت پر نہیں بلکہ استقلال ، انتقام جوئی ، کینہ توزی ، مکاری اور غداری پر موقوف ہوتی ہے اور یہ خصائص ایسے ہیں جن سے مردوں اور عورتوں دونوں کی معصیت کار فطرتوں کو یکساں حصہ وافر ملا ہے ۔

اگر ہم اپنے سامنے یہ سوال لائیں کہ دور شجاعت کی منزل امتحان میں جو عورتیں غیر طبعی اقتدار کی مالک بن جاتی ہیں ، آیا انھیں ہیروئن کا درجہ دینا چاہیے یا شیطنت کا پایہ سمجھنا چاہیے کہ وہ حالات کا شکار ہو گئیں ؟ تو اس سوال کا ہمیں کوئی واضح جواب نہ ملے گا ۔ واضح حقیقت یہ ہے کہ ان کی دردناک اخلاق دو گونگی شاعری کے لیے حد درجے موزوں موضوع بن جاتی ہے اور اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ منوی تہذیب کے بعد جو دور شجاعت شروع ہوا ، اس کی رزمیہ نظموں کی میراث میں ایک خاص موضوع عورتوں کا ہے ؛ ایک بدمزاج اور لڑاکا عورت کے جرائم و تکالیف سے ویسے ہی دوسرے افسانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور یادوں کا یہ سلسلہ لا متناہی معلوم ہوتا ہے ۔ جن تاریخی عورتوں کے بے رحمانہ کارنامے رزمیہ شاعری میں منضبط ہو جاتے ہیں ، اگر انھیں معلوم ہوتا کہ ایک روز ان کی یاد عہد وکٹوریا کے ایک شاعر کے تخیل میں حسین عورت کے خواب کا لباس پہن لے گی تو وہ یقیناً برا منہ بنا کر مسکرا دیتیں ، وہ میک بتھ کے پہلے منظر کے بجائے تیسرے منظر کے ماحول کو اپنے لیے زیادہ موزوں سمجھتیں ۔

نواں حصہ

تہذیبوں کے درمیان مکانی تعلقات

تیسواں باب

دائرۂ مطالعہ میں توسیع

اس کتاب میں جس نظریے سے بحث و نظر کا آغاز ہوا تھا، یہ تھا کہ جن تہذیبوں کو تاریخی حقیقت حاصل ہے، وہ بجائے خود مطالعے کا قابل فہم میدان ہیں۔ اگر یہ نظریہ تہذیبوں کی سرگزشتوں کے تمام پہلوؤں کے متعلق محکم ثابت ہوتا تو ہمارا کام اب پایۂ اتمام پر پہنچ جاتا۔ حقیقۃً ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر تہذیب صرف اپنی پیدائش، نشو و ارتقاء اور شکست کی حد تک ایک قابل فہم دائرۂ مطالعہ ہے لیکن انحلال کا دور سامنے آتا ہے تو تہذیب قابل فہم دائرۂ مطالعہ نہیں رہتی۔ تاریخ تہذیب کے اس آخری حصے کو ہم اس وقت تک سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تصور کے ذہنی حلقے کو پھیلا کر حدود تہذیب سے باہر نہ لے جائیں اور خارجی قوتوں کا فشار پیش نظر نہ رکھ لیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک نمایاں مثال پیش کر دینا کافی ہے؛ مسیحیت سریانی فضا میں ابھری تھی، رومی سلطنت نے اس کے لیے یونانی گہوارہ مہیا کر دیا۔

مختلف تہذیبوں کے درمیان مقابلے اور مٹ بھیڑ نے اعلیٰ مذاہب پیدا کرنے میں جو اہم کردار ادا کیا، اس کی توضیح کے لیے ہر عام و مروج تاریخی جغرافیے کا مطالعہ کفایت کرتا ہے؛ اگر ہم نقشہ سامنے رکھ لیں اور اعلیٰ مذاہب کی پیدائش گاہوں پر نشان لگاتے جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ نشانات پرانی دنیا کی وسیع سر زمین کے صرف دو چھوٹے سے ٹکڑوں میں جمع ہو جائیں گے ——— ایک طرف جیحوں و سیحوں کا طاس اور دوسری طرف شام ——— لیکن آخرالذکر خطے کا وسیع مفہوم سامنے رکھ لینا چاہیے یعنی اس سے مراد وہ خطہ ہے جو شمالی عرب کی سطح مرتفع، بحیرۂ روم، اناطولیہ کی جنوبی ڈھال اور آرمینیا کے پہاڑی علاقے سے محصور ہے۔

جیجون و سیحون کے طاس میں مہایان مذہب نے وہ شکل اختیار کی جس شکل میں اس نے دنیائے مشرق بعید کے اندر اشاعت پائی ؛ اس سے پیشتر غالباً زرتشتیت بھی یہیں پیدا ہو چکی تھی - باقی رہا شام تو وہاں کے مشہور مقام انطاکیہ میں مسیحیت کو وہ وضع و ہیئت ملی جس کے ساتھ یہ یونانی دنیا میں پھیلی ، اس سے پیشتر مسیحیت علاقہ جلیل میں فریسی یہودیت کی ایک شکل اختیار کر چکی تھی ؛ یہودیت اور اس کی ہم سر سامریت کا ظہور جنوبی شام میں ہوا تھا ، مارونیوں کی مسیحیت[1] اور دروزیوں کی حاکم پرستانہ شیعیت[2] دونوں نے وسطی شام میں جنم لیا - اعلیٰ مذاہب کی پیدائش گاہوں کا یہ جغرافیائی تمرکز اس وقت اور بھی اہمیت اختیار کر لیتا ہے ، جب ہم منظر کو وسعت دے کر متصلہ خطوں کو بھی بیچ میں لے لیتے ہیں - حجاز در اصل شام ہی کا ایک بڑھا ہوا علاقہ ہے جو بحیرۂ قلزم کے کنارے کی بلند زمین کے ساتھ ساتھ جنوب کی جانب چلا گیا ہے ، اس میں مسیحیت کی ایک ملحدانہ شکل کا مولد بھی شامل ہے ؛ اسی شکل نے آگے چل کر ایک نئے مذہب اسلام کا لباس پہنا - اسی طرح اگر ہم جیحون و سیحون کے طاس کا دائرہ پھیلا لیں تو وادیٔ سندھ میں مہایان کا مولد نیز اصل بدھ مت کا مولد ہماری نگاہوں کے سامنے آ جائے گا ، ایک قدم آگے بڑھ کر ہم وادیٔ گنگا پر پہنچ جائیں گے جس کے وسطی حصے میں بدھ مت کے بعد کی ہندویت نے جنم لیا -

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کی وجہ اور علت کیا ہے ؟ اگر ہم جیحون و سیحون کے طاس اور شام کی خصوصیات پیش نظر رکھتے ہوئے دونوں کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ قدرت نے ان دونوں خطوں کو ایسے مرکز بنایا ہے جہاں ہر طرف سے راستے آتے اور ہر طرف جاتے ہیں مثلاً شام کے مرکز میں طاس نیل ، بحیرۂ روم ، اناطولیہ اور جنوبی و مشرقی یورپ کی اس زمین کے راستے جو ساحل کے عقب میں واقع ہے ؛ علاوہ بریں

۱- مسیحیت کا وہ فرقہ جس کا عقیدہ ہے کہ اگرچہ مسیح کی فطرتیں دو تھیں ایک انسانی دوسری الوہی ، تاہم ان کا ارادہ ایک تھا ، انسانی ارادہ الوہی ارادے میں گم ہو گیا تھا (مترجم) -

۲- دروزی عام روایت کے مطابق فاطمی خلیفہ الحاکم بامراللہ کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کرتا ہے (مترجم) -

طاس دجلہ و فرات اور عرب کی سطح مرتفع سے راستے آتے ہیں ۔ اسی طرح سے جیحون و سیحون کے طاس میں ایک راستہ دجلہ و فرات سے جاتا ہے جو ایران سے گزرتا ہے ، دوسرا راستہ ہندوستان کا ہے جس میں ہندو کش کے دروں سے گزرنا پڑتا ہے ، تیسرا راستہ مشرق بعید سے آتا ہے جو دریائے طارم کے طاس میں سے گزرتا ہے ۔ یوریشیائی سطح مرتفع بھی وہاں سے قریب ہے ، یہی خطہ تھا جہاں کسی زمانے موجودہ بحیرۂ روم کے بالمقابل کسی زمانے میں دوسرا بحیرۂ روم واقع تھا جو خشک ہو گیا ؛ بحیرۂ قزوین[1] ، بحیرۂ ارال[2] اور بحیرۂ بالکش ، اس کے بچے کھچے آثار کی حیثیت میں اب تک موجود ہیں ؛ پہلے سمندر آمد و رفت کا ذریعہ تھا ، اب سمندر نہ رہا لیکن اس خطے میں آمد و رفت کا سلسلہ بدستور جاری رہا ۔

قدرت نے ان دو خطوں کو جن کرداروں کے لیے وضع کیا تھا ، وہ گزشتہ پانچ چھ ہزار سال میں آمد و رفت کے یہ بالقوہ مرکز بخوبی ادا کرتے رہے یعنی اس وقت سے جب اولین تہذیب منظر عام پر نمودار ہوئی ۔ شام مختلف متوالی ادوار میں سمیری اور مصری تہذیبوں ، پھر مصری ، ھٹی اور مغربی تہذیبوں ، بعد ازاں سریانی ، بابلی ، مصری اور یونانی تہذیبوں ، سریانی ، آرتھوڈکس مسیحی اور مغربی مسیحی تہذیبوں کے درمیان میدان مقابلہ بنا رہا ؛ اس میدان میں آخری مقابلہ عربی ، ایرانی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان ہوا ۔ جیحون و سیحون کے طاس میں پہلے سریانی اور ہندی تہذیبوں کے درمیان مقابلہ ہوا ، پھر سریانی ، ہندی ، چینی اور یونانی تہذیبوں نیز سریانی اور مشرق بعید کی تہذیبوں کے درمیان یہی صورت پیش آئی ؛ ان مقابلوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے یہ عجائب خیز "مذہب بردار" حصے متعدد تہذیبوں کی

۱۔ Casprian Sea ، اسے بحیرۂ قزوین بھی کہتے ہیں جو در اصل کیسپئن ھی کی عربی شکل ہے اور اس نام کا ایک مشہور شہر بھی بحیرے سے قریب واقع ہے ۔ اسے بحیرۂ خزر بھی کہتے ہیں ، یہ بھی ایک ترک قبیلہ تھا جو مدت تک اس بحیرے یا جھیل کے کنارے آباد رہا (مترجم) ۔

۲۔ Aral Sea ، ترکستان کا مشہور بحیرۂ جسے پرانے زمانے میں بحیرۂ خوارزم شاہی کہتے تھے ، جیحون اور سیحون اسی بحیرے میں گرتے ہیں (مترجم) ۔

سلطنتوں میں شامل ہوتے رہے اور مختلف تہذیبوں کے درمیان سرگرم ربط و ضبط ہی سے یہ علت بھی واضح ہو سکتی ہے کہ اعلیٰ مذاہب کی پیدائش انہیں مرکزوں میں عموماً کیوں ہوتی رہی -

اس شہادت کی بناء پر ہم ایک ''قانون'' وضع کر سکتے ہیں جس کا مفاد یہ ہوگا کہ اعلیٰ مذاہب کے مطالعے کے لیے کم سے کم قابل فہم دائرۂ مطالعہ ایک تہذیب کے حلقے سے متجاوز ہونا چاہیے بہ الفاظ دیگر وہ ایسا دائرہ ہونا چاہیے جس میں دو یا زیادہ تہذیبوں کے درمیان ربط و ضبط پیدا ہوا ہو یا ان کے مابین مقابلہ پیش آیا ہو ؛ ہمارا اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ان مقابلوں کا وسیع تر مطالعہ کریں جو اعلیٰ مذاہب کی پیدائش کا سبب بنے -

یہ مقابلے ان مختلف تہذیبوں کے درمیان بعد مکانی میں ہونے چاہئیں جنہیں ہم معاصر فرض کیے بیٹھے ہیں لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پیشتر ہمیں یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ تہذیبوں کے درمیان بعد زمانی میں بھی ربط و ضبط پیدا ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں : ایک تو وہ زمانی تعلق ہے جسے ہم ابوت و ابنیت سے تعبیر کر چکے ہیں اور اس پر بحث ہو چکی ہے ؛ دوسرا ربط و ضبط وہ تعلق ہے جو ایک نشوونما یافتہ تہذیب اور کسی مردہ تہذیب کی ''روح'' کے درمیان ہوتا ہے ، ہم ان مقابلوں کو انیسویں صدی مسیحی کے ایک فرانسیسی مصنف کے الفاظ میں نمونۂ احیاء قرار دے سکتے ہیں - اس مصنف نے یہ تعبیر ایک خاص مثال کے لیے اختیار کی تھی اور حق یہ ہے کہ اس تاریخی مظہر کی صرف وہی ایک مثال نہیں - بعد زمانی میں تہذیبوں کے مقابلے کتاب کے آیندہ ابواب کا موضوع ہیں -

اکتیسواں باب

معاصر تہذیبوں کے درمیان مقابلوں کا موازنہ

۱- نقشہ عمل

تہذیبوں کے درمیان مقابلوں کی کیفیت ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہوں تو ایک خوفناک اور پُر پیچ تاریخی بھول بھلیاں سے سابقہ پڑتا ہے لہٰذا ہمارے لیے مناسب یہ ہے کہ اس پریشان کن سفر کے واسطے قدم اٹھانے سے پیشتر خوب غور و فکر کر لیں کہ آیا ہمیں داخلے کا کوئی ایسا مقام بھی مل سکتا ہے جو ہمارے نقطہ نگاہ سے سازگار ہو؟ ہم نے ابتدا میں اپنے ثقافتی نقشے پر جن تہذیبوں کے نام درج کیے تھے، ان کی تعداد اکیس تھی؛ آثار قدیمہ کی کھدائی سے جو حالات روشنی میں آ رہے ہیں اگر ان سے یہ واضح ہو جائے کہ وادیٔ سندھ کی ثقافت سمیری تہذیب سے ایک الگ معاشرے کی دولت تھی اور شنگ ثقافت بھی ایک جداگانہ تہذیب تھی جو چینی تہذیب سے پیشتر گزر چکی تھی تو تہذیبوں کی پوری تعداد تئیس ۲۳ ہو جاتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بعض تہذیبیں معاصرانہ حیثیت میں ایک دوسری کے ساتھ اس طرح منطبق تھیں کہ ان میں ویسے مقابلے ہو ہی نہیں سکتے تھے جن کی ہمیں تلاش ہے؛ پھر بھی ظاہر ہے کہ معاصر تہذیبوں کے درمیان جو مقابلے ہوئے، ان کی تعداد تہذیبوں کی تعداد سے یقیناً زیادہ ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تہذیبوں کی نسلیں تین ہیں، اگر پہلی نسل ہر پہلو سے ختم ہو جاتی اور دوسری نسل کو بھی یہی حالت پیش آتی تو بعد مکانی میں مقابلوں کا مسئلہ ہرگز پیچیدہ نہ رہتا؛ بہ ہر حال ہمیں غور کرنا چاہیے کہ پہلی نسل کی تہذیبوں میں سے الف، ب، ج، د اور ہ کے درمیان کیا مقابلے پیش

آئے اور اس امکان کا کوئی لحاظ نہ رکھنا چاہیے کہ آیا ان میں اور دوسری نسل کی تہذیبوں و ، ز ، ح ، ط اور ی کے درمیان بھی مقابلوں کی نوبت آئی ؟ لیکن حقیقت حال یہ نہیں ، اگر سمیری تہذیب دوسری نسل کی کسی طاقتور تہذیب نو سے مقابلے کے بغیر حوالگی پر آمادہ ہو گئی اور اسے عزت کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا تو مصری تہذیب کی نسل اول کے ٹتھونس[1] کا طرز عمل بالکل جداگانہ رہا۔

ایک پہلو ایسا بھی تھا جس کی بنا پر عہد حاضر تک معاصر تہذیبوں کے درمیان بعد مکانی میں مقابلوں کی تعداد بڑی حد تک کم رہی یعنی مکان کی وسعت اتنی زیادہ تھی یا اس کی نوعیت ایسی تھی جس میں مقابلوں کا کوئی امکان نہ تھا ؛ مثال کے طور پر جب تک مغربی مسیحی تہذیب نے سمندروں کے اندر جہاز رانی کے فن میں کمال بہم نہ پہنچایا تھا اور اس کی تاریخ میں ''عہد حاضر'' کا اضافہ نہ ہوا تھا (قریباً ۱۴۷۵ء—۱۸۷۵ء) پرانی دنیا اور نئی دنیا کی تہذیبوں کے درمیان مقابلے کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی تھی۔ اس کارنامے کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے اور ہم جس غرض سے تاریخ کی بھول بھلیاں میں چھان بین اور غور و تفتیش کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں ، ممکن ہے اس سنگ میل سے سفر کے لیے مناسب راستہ مل جائے۔

جب مغربی ملاحوں نے پندرھویں صدی مسیحی میں جہاز رانی کا فن بہ درجۂ کمال حاصل کر لیا تو انہیں روئے ارض کی آباد اور قابل آبادی زمینوں تک براہ راست رسائی کا موقع حاصل ہو گیا ؛ آہستہ آہستہ مغرب کا اثر تمام دوسرے معاشروں کی زندگیوں میں سب سے زبردست مجلسی اثر بن گیا ،

۱- Tithonus پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ ٹرائے کا ایک خوبصورت اور خوشرو جوان تھا جس پر صبح کی دیوی عاشق ہو گئی تھی۔ دیوی نے فنون عشق میں اس کے لیے غیر فانی زندگی کی سند لے لی لیکن جوانی قائم رکھنے کا خیال نہ آیا ؛ چنانچہ ٹتھونس زندہ تو رہا لیکن بڑھاپا عذاب جان بن گیا ، آخر اس کی درخواست پر صبح کی دیوی نے اسے ٹڈا بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ مصری معاشرہ ٹتھونس کی طرح مرا نہیں البتہ بہت بوڑھا ہو گیا۔ مترجم۔

جب یہ اثر بڑھا تو ان کی زندگیوں میں انقلاب بپا ہو گیا - ابتدا میں معلوم ہو رہا تھا کہ مغربی معاشرہ ساری دنیا کو تہ و بالا کیے جا رہا ہے اور خود اس کی زندگی ہر اثر سے بالکل پاک ہے لیکن موجودہ کتاب کے مصنف کی زندگی میں مغرب اور اس کے معاصرین کے درمیان ایک ایسا مقابلہ پیش آیا جس نے مغربی معاشرے کے افق پر تاریکی کے بادل پھیلا دیے -

مغرب اور ایک اجنبی مجلسی وجود کے درمیان تصادم نے مغرب کے معاملات میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے ، وہ مغرب کی تاریخ کا ایک انوکھا پہلو ہے - ۱۶۸۳ء میں ویانا پر عثمانیوں کے دوسرے حملے کی ناکامی کے بعد سے ۱۹۳۹ء - ۱۹۴۵ء کی جنگ میں جرمنی کی شکست تک مغرب کی قوت و طاقت اس درجے بے پناہ رہی کہ دنیا کے کسی حصے میں مغربی طاقتوں کے مقابلے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا البتہ ۱۹۴۵ء میں قوت و طاقت کی یہ مغربی اجارہ داری ختم ہو گئی کیوں کہ اس وقت سے طاقت و قوت میں درجۂ امتیاز ایک ایسی حکومت کو حاصل ہو گیا جس کی وضع قطع غیر مغربی تھی -

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی تہذیب اور سوئیٹ یونین نیز مغربی تہذیب اور کمیونزم کے تعلقات میں اک گونہ ابہام موجود تھا - سوئیٹ یونین پیٹر کی قائم کی ہوئی روسی سلطنت کی سیاسی جانشین تھی ، یہ روسی سلطنت سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے موڑ پر رضامندانہ مغرب کے طریق زندگی کی معتقد بنی تھی اور اس مفاہمت پر مغرب کے کھیل میں شریک رہی کہ ہر حال میں مغربی قواعد و ضوابط کی پابندی کرے گی - کمیونزم بھی لبرل ازم اور فاشزم کی طرح ایک غیر دینی نظریہ تھا جو مسیحیت کے بدل کی حیثیت میں موجودہ زمانے کی مغربی دنیا کے سینے سے اٹھا - اس نقطۂ نگاہ سے سوئیٹ یونین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے درمیان دنیا میں برتری حاصل کرنے کے لیے نیز کمیونزم اور لبرل ازم کو عالم انسانیت کا عقیدہ بنانے کے لیے جو کشمکش جاری ہے ، اسے مغربی معاشرے کی ایک داخلی نزاع سمجھنا چاہیے لیکن دوسرے نقطۂ نگاہ سے سوئیٹ یونین کو پیٹر کی پیشرو روسی سلطنت کی طرح روس کی آرتھوڈکس مسیحیت کی سلطنت سمجھا جا سکتا ہے جس نے سہولت کے خیال سے نیز اپنی حقیقی حیثیت کو چھپائے رکھنے کی غرض سے مغربی لباس اختیار کر لیا - اسی طرح کمیونزم کو بھی بہ اعتبار نظریہ مشرقی آرتھوڈکس مسیحیت کا بدل مانا جا سکتا ہے

اور اسے لبرل ازم پر اس لیے ترجیح دی گئی کہ لبرل ازم در اصل مغرب کا پیدا کردہ نظریہ تھا ؛ کمیونزم کو بھی اگرچہ مغرب ہی نے پیدا کیا لیکن اہل مغرب کی نگاہوں میں اسے ایک قابل نفرت الحاد و زندیقی کی حیثیت حاصل تھی۔

اصل حالت خواہ کچھ ہو ، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ۱۹۱۷ء کے کمیونسٹ انقلاب نے روسیوں کے احساسات میں مغربیت کے خلاف شدید رجحانات پیدا کر دیے۔ سوئیٹ یونین کا ظہور ہوا تو وہ موجودہ دور کی دو رقیب و حریف عالمگیر قوتوں میں سے ایک بن گئی ؛ اس طرح سیاسی دائرے میں ثقافتی کشمکش کا از سر نو آغاز ہو گیا جو پیشتر اڑھائی سو سال تک ایک ہی انداز کی ثقافت والی طاقتوں کے درمیان داخلی سیاسی نزاعات کا باعث بنی رہی تھی۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مدت مدید تک بہ ظاہر اعتراف شکست کے بعد مغربیت کے خلاف از سرنو کشمکش کے آغاز سے روسیوں نے جو مثال پیش کی تھی ، اکتیس برس بعد چین نے اس کی پیروی کی ؛ کچھ عجب نہیں کہ مناسب اوقات میں جاپانی ، ہندو اور مسلمان بھی اسی راستے پر گامزن ہو جائیں اور وہ معاشرے بھی وہی طریقے اختیار کر لیں جن پر مغربیت کا رنگ چڑھ چکا ہے مثلاً جنوبی و مشرقی یورپ کی آرتھوڈکس مسیحیت یا نئی دنیا میں کولمبس سے پیشتر کی وہ تین تہذیبیں جو اب دبی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ان امور سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے موجودہ دور کی مغربی تہذیب اور دوسری زندہ تہذیبوں کے درمیان تحقیق و تفتیش ہمارے لیے سفر کا ایک موزوں نقطہ ثابت ہو ؛ اس کے بعد ان مقابلوں کو زیر غور لانا ہوگا جو ابتدائی عہد (جسے عام طور پر قرون وسطیٰ کا عہد کہا جاتا ہے) کی مغربی مسیحیت اور اس عہد کے دوسرے ہمسایوں کے درمیان پیش آئے۔ یہ ہو چکے گا تو ہم دوسری تہذیبوں کو پیش نظر لائیں گے جو اب معدوم ہو چکی ہیں اور ان تہذیبوں کو منتخب کریں گے جنھوں نے اپنی معاصر تہذیبوں پر اتنا ہی گہرا اثر ڈالا جتنا مغربی تہذیب نے ڈالا لیکن ہر مقابلے کو زیر غور لانے کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے جو تاریخ کے تفصیلی مطالعے سے بروئے کار آئے گا۔

اس نقشۂ عمل کے مطابق کام شروع کرنے سے پیشتر ہمیں یہ دیکھ

لینا چاہیے کہ مغرب کی تاریخ میں ''عہد جدید'' کا باب کب سے شروع ہوا۔
غیر مغربی مبصر عہد جدید کا آغاز اس وقت سے کرتے ہیں جب ممالک مغرب کا پہلا جہاز ان کے سواحل پر لنگر انداز ہوا اس لیے کہ غیر مغربی لوگوں کی نگاہوں میں مغربی انسان ایک علمی نظریے کے مطابق خود حیات کی طرح بحری مخلوقات تھے۔ مثال کے طور پر مشرق بعید کے عالموں نے عہد جنگ میں مغربی انسانوں کے پہلے نمونے پر نظر ڈالی تو انھیں فوری مقام و ماخذ اور ثقافت کی نمایاں سطح کی بنا پر جنوبی سمندر کے بربری قرار دیا؛ اسی طرح پے در پے جہاں جہاں مقابلے پیش آئے، ہرجائی مغربی ملاح اپنے متحیر شکاروں کی نظروں میں تیزی سے تغیر و تبدل کے مرجع بنے رہے، اپنے ابتدائی ظہور میں وہ سمندر کا ایک بے ضرر حیوان معلوم ہوتے تھے جن کی نسل کے متعلق پہلے کچھ علم نہ تھا لیکن بہت جلد وہ وحشی قسم کے بحری عفریت ثابت ہوئے؛ انجام کار معلوم ہوا کہ وہ خانہ بدوش ذوالحیاتین ہیں جو خشکی پر بھی ویسے ہی نقل و حرکت کے اہل ہیں جیسے سمندر میں۔

خود موجودہ دور کے مغربیوں کے نقطۂ نگاہ سے دور جدید اس وقت شروع ہوا جب مغرب کے آدمیوں نے عہد متوسط کے مسیحی نظام سے نجات حاصل کی۔ اس امید افزا انکشاف کی ابتدا اٹلی میں ہوئی؛ ہوا یہ کہ جس نسل نے مغربی اقوام کی الپس کے پار رہنے والی اکثریت کو اطالویت کے رنگ میں رنگا، وہ نسل وہی تھی جس نے سواحل اوقیانوس (ظلمات) پر رہنے والی مغربی قوموں کو تسخیر بحر میں کامیابی حاصل کرتے دیکھا۔ تاریخ کے ان دو بڑے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم پورے وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ مغرب کی تاریخ میں دور جدید کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں ہوا۔

جب ہم دور جدید کے مغرب اور باقی دنیا کے درمیان مقابلوں کے نتائج پیش نظر لائیں گے تو واضح ہوگا کہ اس دور کے آغاز سے اب تک ساڑھے چار سو سال کا جو زمانہ گزر چکا ہے، وہ حد درجے مختصر ہے اور ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نا مکمل کہانی پر غور کر رہے ہیں۔ اگر ہم اسی قسم کی ایک ابتدائی کہانی پر متوجہ ہوں تو یہ حقیقت اور بھی نمایاں ہو جائے گی۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ دور جدید کے مغرب نے یہ سطور سپرد قلم کرنے کے

وقت تک اپنے معاصروں پر جو اثرات ڈالے ان کے مقابلے میں یونانی تہذیب نے ھٹی، سریانی، مصری، بابلی، ھندی اور چینی معاشروں پر کیا اثرات ڈالے تھے - اس مقابلے کے سلسلے میں اگر ہم سکندر کے عبور ھیلس پانٹ (۳۳۴ ق - م) کو لمبس کے عبور اوقیانوس (۱۴۹۲ء) کے مشابہ قرار دیں تو ۱۹۵۲ء تک چار سو ساٹھ سال کی جو مدت گزری، وہ فریق ثانی کے باب میں ھمیں ۱۲۶ء (یعنی سکندر کے عبور ھیلس پانٹ سے) تک پہنچائے گی اور یہ وہ زمانہ ہے جس سے چند سال پیشتر رومی شہنشاہ ٹراجن[۱] اور اس کے ھائی کمشنر پلینی[۲] نے بیتھینیا[۳] اور پانٹس[۴] کے صوبوں میں مسیحیوں کے غیر معروف فرقے کے متعلق سلوک اور برتاؤ پر خط و کتابت کی تھی، اُس وقت کون اندازہ کر سکتا تھا کہ آگے چل کر مسیحیت کے سر پر کامیابی کا تاج رکھا جائے گا؟ اس تاریخی موازنے سے واضح ہوتا ہے کہ باقی دنیا پر مغربی اثرات کے متعلق ایک مغربی طالب علم کے ذہن سے مستقبل کس درجے پوشیدہ ہو سکتا ہے -

بیسویں صدی میں یہ سطریں لکھی جا رہی ھیں، یونانیت اور اس کے معاصروں کے درمیان جو مقابلہ ہوا تھا، وہ مدت ہوئی ختم ہو چکا اور مورخ اب اس کہانی کو اول سے آخر تک صحیح صورت میں دیکھ سکتا ہے - سوال یہ ہے کہ یہ خاتمہ کب ہوا؟ تلاش کنندے کو بارھویں صدی مسیحی سے آگے نہ جانا پڑے گا جب مشرق بعید کی دنیا اور سریانی دنیا کے اندر یونانی اثرات کے خلاف اتنی قوت سے رد عمل شروع ہو چکا تھا کہ کسی کو اس بارے میں شبہ کی گنجائش ہی نہ رہی تھی - اُس زمانے میں یونانی اثرات مرئی فنون پر بہ دستور نمایاں نظر آتے تھے اور سریانی دنیا میں ارسطو کا فلسفہ اور سائنس عربی زبان کی وساطت سے مشرقی مفکروں کو پیش قدمی پر آمادہ کر رہے تھے -

ان افکار کو مزید مثالوں کے ذریعے سے زیادہ پھیلایا اور محکم بنایا جا سکتا ہے؛ یہ اس دانش مندانہ مقولے کی تصدیق کر رہے ھیں کہ معاصرانہ تاریخ نگاری غیر ممکن ہے لیکن یہ چیز انھیں غیر ممکن امور میں شامل ہے

۱- Trajan -

۲- Pliny -

۳- Bithynia

۴- Pontus -

جن سے باز رہنے پر مورخ اب تک آمادہ نہیں ہوئے اور ان کا یہ طرز عمل بہ ہر حال درست ہے۔ ہم بھی فی الحال اسی ''غیر ممکن'' کام کا بیڑا اٹھا رہے ہیں، خود ہماری آنکھیں کھلی ہیں اور خوانندۂ کتاب کو ہم نے پوری طرح متنبہ کر دیا ہے۔

۲۔ نقشہ عمل کے مطابق اقدامات

(الف) موجودہ مغربی تہذیب کے ساتھ مقابلے

(I) مغربی دنیا اور روس: روسی آرتھوڈکس مسیحیت کی سلطنت عام کا قیام پندرھویں صدی کے آٹھویں عشرے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا؛ ہوا یہ کہ نوووگروڈ کی جمہوریت کو ماسکو کی گرانڈڈچی میں شامل کر لیا گیا، گویا یہ واقعہ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب مغرب کی تاریخ میں دور جدید کے باب کا آغاز ہو رہا تھا۔ روس کے مفکر ''مغربی مسئلے'' سے قبل ازیں متعارف تھے اس لیے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں پولینڈ اور لتھوانیا کی حکومتیں ان علاقوں کے بہت بڑے حصے تک پہنچ چکی تھیں جو روسی آرتھوڈکس مسیحیت کی آبائی جاگیر مانے جاتے تھے؛ سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں میں پولینڈ اور لتھوانیا کی روسی آبادی پر مغربی تہذیب کا اثر مستحکم ہو چکا تھا اس لیے کہ روسی آرتھوڈکس مسیحیت کی رعایا کے ایک حصے اور رومی کیتھولک کلیسا کے درمیان مذہبی اتحاد ہو چکا تھا۔ ضمناً یہ بھی جان لینا چاہیے کہ پولینڈ اور لتھوانیا کی بادشاہیوں میں اتحاد ۱۵۶۹ء میں ہوا تھا، زمینداروں کے امرائی طبقے کو یعقوبی مبلغوں نے مسیحیت کا حلقہ بگوش بنایا، کسانوں کی بہت بڑی تعداد یونانی کلیسا[1] کی رکن بن چکی تھی اور ان لوگوں کو اپنے بہت سے روایاتی مراسم اور معمولات قائم رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی؛ اس وجہ سے سفید روسیوں اور یوکرینی آبادیوں کی اطاعت کے بارے میں مغربی دنیا اور ماسکو کے درمیان جو ناقابل

۱۔ Uniate Church ۔ یہ نام اس مذہبی کلیسائے کے لیے وضع ہوا جو تمام اعمال و مراسم کے لحاظ سے یونانی تھا لیکن کلیسائے رومہ کی برتری کا قائل تھا یعنی پوپ کو پیشوا مانتا تھا۔

انسداد کشمکش شروع ہوئی ، وہ ۱۹۳۹ء - ۱۹۴۵ء کی جنگ کے اختتام تک جاری رہی ، ان لوگوں کو روس کی مشرقی آرتھوڈکس مسیحیت سے الگ کر لیا گیا تھا لیکن طوعاً و کرہاً انھیں دوبارہ روسی حلقے میں شامل کر لیا گیا ۔

یہ سرحدی علاقہ ابتدا میں روسی تھا ؛ بعد ازاں اس پر ایک حد تک مغربیت کا رنگ چڑھ گیا لیکن روس اور دور جدید کی مغربی دنیا کے درمیان مقابلے کا یہ حقیقی میدان نہ تھا ؛ دور جدید کی مغربی ثقافت کی جو شعاعیں پولینڈ کے ذریعے سے باہر نکلیں ، وہ اتنی مدھم تھیں کہ روسی قلوب پر چنداں گہرا اثر نہ ڈال سکتی تھیں ۔ اس سخت و شدید معرکے میں مغربی دنیا کے جن افراد نے نمایاں حصہ لیا ، وہ ساحل اوقیانوس پر بسنے والے لوگ تھے جنھوں نے مغربی دنیا کی قیادت کی باگ دوڑ اطالویوں کے ہاتھ سے چھین لی تھی ، ان میں روس کے وہ ہمسائے بھی شامل تھے جو بحیرۂ بالٹک کے مشرقی ساحل پر آباد تھے ۔ اگرچہ جرمنی کے امیروں اور علاقہ ہائے سواحل بالٹک کے سرمایہ داروں نے اپنی تعداد سے کہیں زیادہ اثر روسی زندگی پر ڈالا لیکن اصل اثر ساحل اوقیانوس ہی پر بسنے والے لوگوں کا تھا جو داخلے کی بندرگاہوں کے ذریعے سے روس میں پہنچا اور روس کی شہنشاہی قوت نے خود ان بندرگاہوں کے دروازے کھول دیے تھے ۔

اس میل جول میں دونوں جانب سے دو قوتیں ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی رہیں ؛ ایک جانب مغربی اقوام کی فنی مہارت تھی اور دوسری جانب روسیوں کا یہ عزم کہ وہ اپنی روحانی آزادی کو حسب سابق محفوظ رکھیں گے ؛ روسیوں کو اپنی تقدیر کی یکتائی پر اتنا بھروسا تھا کہ انھوں نے سمجھ لیا قسطنطنیہ (جسے دوسرا رومہ مانا جاتا تھا) کی خلعت میراث روس کے حوالے ہوئی ہے ؛ ماسکو کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ مسیحی آرتھوڈکس کا مرجع اور آخری حصار ہے ، اسی بنا پر ۱۵۸۹ء میں ایک مستقل مذہبی مرکز ماسکو میں قائم کر دیا گیا ۔ یہی زمانہ ہے جب قرون وسطیٰ کے مغربیوں نے تصرفات کے ذریعے سے روسیوں کی سلطنت کا دائرہ بہت محدود کر دیا تھا اور دور جدید کے مغرب کی فن کاریاں فتح مبین کی حامل بنی ہوئی تھیں ۔

اس خطرے کے مقابلے میں روسیوں نے تین مختلف جواب تیار کیے ؛ اول

مطلق العنان مذہبی جنونیوں[1] کا گروہ یعنی وہ تعصب کیش طبقہ جنھیں عام اصطلاح میں مومن قدیم[2] کہا جاتا تھا؛ دوم وہ ہیرودیسیت[3] جس نے پیٹر اعظم کی عقل و دانش کے لباس میں ظہور کیا۔ پیٹر کی پالیسی یہ تھی کہ روسی سلطنت کو آرتھوڈکس مسیحیت کی سلطنت کے بجائے دور جدید کے مغرب کی ایک سلطنت بنا دے؛ اس پالیسی کو تسلیم کر لینے کا مطالبہ یہ تھا کہ روسیوں نے آرتھوڈکس مسیحیت کا حصار ہونے کا دعویٰ چھوڑ دیا اور وہ دوسری قوموں کی طرح اپنے محدود علاقوں پر قانع ہو گئے حالانکہ اُن کے اصل دعوے کا مقصد یہ تھا کہ ایسا معاشرہ وجود میں آ جائے جو مستقبل میں انسانیت کی اُمید گاہ بن سکے، مومنین قدیم کا دعویٰ یہی تھا۔ اگرچہ پیٹر کی پالیسی بہ ظاہر دو سو سال تک کامیاب نظر آتی رہی لیکن اسے روسیوں کی دلی امداد حاصل نہ ہو سکی؛ ۱۹۱۴ء–۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم میں روس کی فوجی قوت نے ذلت خیز شکست کھائی، اس طرح ایک روشن شہادت مل گئی کہ دو سو سال تک پیٹر کی مغربیت مآب پالیسی نہ صرف یہ کہ روسیوں کے مزاج یا طبیعت کے خلاف تھی بلکہ ناکام بھی رہی اور وقت آنے پر کار آمد ثابت نہ ہو سکی لہٰذا روس کی یکتائی تقدیر کے متعلق اس تصور نے اشتمالی انقلاب کی صورت اختیار کی جو مدت سے حالات کی بے پناہ رفتار کے سبب دب سا گیا تھا۔

روسی کمیونزم (اشتمالیت) در اصل دو مختلف تصورات میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش تھی، ایک طرف روسی تقدیر کا وہ عقیدہ جسے روکنے اور دبانے کی کوئی صورت نہ تھی، دوسری طرف دور جدید کی مغربی فن کاروں کی پیروی جس کے سوا چارہ نہ تھا؛ اس طرح مغرب کی مروجہ آزاد خیالی (لبرل‌ازم) کے خلاف بغاوت کے سلسلے میں دور جدید کا مغربی نظریہ ہی اختیار کیا گیا۔ بہ ظاہر یہ ایک عجیب صورت حال معلوم ہوتی ہے لیکن تسلیم کر لینا چاہیے کہ روس پھر اپنی میراث کی یکتائی پر چلا گیا، لینن اور اُس کے جانشینوں نے بھانپ لیا کہ مغربیت کے خلاف اپنے انتخاب کردہ اسلحہ سے جنگ کامیاب

۱- Zealots -

۲- The Old Blievers -

۳- Herodianism -

نہیں ہو سکتی ، اگر اسلحہ کا تصور محض مادی اصطلاحات تک محدود رہے۔ دور جدید کی مغربیت نے جو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ، اس کا راز یہ تھا کہ روحانی اور دنیاوی بازوؤں کے درمیان کامل تعاون پیدا کر لیا گیا؛ دور جدید کی فن کاریوں نے جو خلا پیدا کیے تھے ، اُن سے مغربی لبرل ازم کے دروازے کھل گئے۔ اگر روس مغرب کے خلاف کامیاب ہو سکتا تھا تو اس کی صورت یہی تھی کہ وہ ایک ایسے عقیدے کا داعی بن جاتا جو برابر کی سطح پر کھڑا ہو کر لبرل ازم کا مقابلہ کر سکتا۔ یوں مسلح ہو کر روس مغرب کا مقابلہ کر سکتا تھا اور ان زندہ معاشروں کی روحانی اطاعت اُسے مل سکتی تھی جو نہ مغربی تھے اور نہ روسی بلکہ اپنی مقامی ثقافتی روایات کے حامل تھے؛ روسی کمیونزم نے محض اس پر قناعت نہ کی بلکہ دشمن کی خیمہ گاہ میں بھی جنگ جاری رکھنے کا بندوبست کر لیا اور خود مغربی قوموں کے وطنوں میں روسی عقیدے کی تبلیغ شروع کر دی۔ یہ موضوع ایسا ہے جس پر ہمیں اپنی کتاب کے ایک آخری حصے میں از سر نو متوجہ ہونا پڑے گا۔

(II) دور جدید کا مغرب اور آرتھوڈکس مسیحی دنیا: آرتھوڈکس مسیحی دنیا میں دور جدید کی مغربی ثقافت اسی زمانے میں پہنچی جب اُس نے روس میں قدم رکھا تھا؛ دونوں صورتوں میں مغربیت کی تحریک سترھویں صدی عیسوی کے اختتام پر جاری ہوئی اور دونوں صورتوں میں یہ تحریک مدت کی عداوت کا رد عمل تھی۔ آرتھوڈکس مسیحیوں کی روش میں تبدیلی کی ایک وجہ یہ تھی کہ مغرب میں نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی یعنی وہ لوگ مذہبی تعصب کی ناروداری کو چھوڑ کر ایسی رواداری پر آ گئے تھے جسے مذہب سے کوئی علاقہ نہ تھا؛ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ مغربی دنیا میں نام نہاد مذہبی جنگیں مدت تک جاری رہیں اور اُن کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی دنیا کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں ، آرتھوڈکس مسیحیت کے دو مختلف حلقوں میں مغربیت کی تحریک نے سیاسی سطح پر دو مختلف راستے اختیار کیے۔

دونوں آرتھوڈکس مسیحی معاشرے زیر غور وقت میں سلطنت ہائے عام کے اجزاء بنے ہوئے تھے لیکن روسی سلطنت عام ایک وطنی پیداوار تھی؛ آرتھوڈکس مسیحیت پر جو سلطنت عام عثمانی ترکوں نے عائد کی تھی وہ باہر سے آئی تھی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ روس میں مغربیت کی تحریک کا مقصد

قائم شدہ شہنشاہی حکومت کی تقویت و استحکام تھا ۔ یہ تحریک ایک انقلابی شخصیت نے جاری کی تھی جسے غیر معمول درجہ حاصل تھا اور حسن اتفاق سے وہ زار بھی تھا ؛ اس کے برعکس سلطنت عثمانیہ میں مغربیت کی جو تحریک جاری ہوئی ، اس کا مقصد یہ تھا کہ سربوں ، یونانیوں اور آرتھوڈکس مسیحیت کی دوسری قوموں کو از سر نو سیاسی آزادی مل جائے گی ۔ یہ تحریک نیچے سے اوپر کی طرف شروع ہوئی ، اس کے ذمہ دار وہ بادشاہ اور روسا نہ تھے جن کے ہاتھ میں کاروبار سلطنت کی باگ تھی بلکہ دوسرے من چلے آدمی تھے ۔

آرتھوڈکس مسیحیوں میں مغرب کے خلاف سترھویں صدی میں جو انقلاب پیدا ہوا ، اس کے اثرات روسیوں کے بجائے سربوں اور یونانیوں میں بدرجہا زیادہ تھے ۔ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ مغرب کے خلاف سابقہ عداوت کے سلسلے میں دونوں کا درجہ کیا تھا ۔ تیرھویں صدی مسیحی میں یونانیوں نے اس نام نہاد لاطینی سلطنت کے خلاف بڑے جوش و خروش سے اقدام کیا تھا جو چوتھی صلیبی جنگ کے فرینکوں نے نصف صدی تک ان پر مسلط رکھی ؛ پندرھویں صدی مسیحی میں انھوں نے آرتھوڈکس مسیحیت اور کیتھولک کلیسا کا اتحاد منسوخ کر دیا جو ۱۴۳۹ء فلارنس کی کونسل میں کاغذ پر رقم ہو چکا تھا اگرچہ اس اتحاد کے ذریعے سے آرتھوڈکس مسیحیوں کو ترک حملہ آوروں کے خلاف مغرب کی جانب سے امداد کا بدرجہا زیادہ امکان تھا ، انھوں نے بادشاہ کو پوپ پر ترجیح دی ۔ ۱۷۹۸ء میں قسطنطنیہ کے یونانی اخباروں نے یروشلم کے لاٹ پادری کا ایک بیان شائع کیا جس میں اس نے بتایا :

> جب قسطنطنیہ کے آخری شہنشاہوں نے مشرقی کلیسا کو پوپ کی غلامی میں دے دینا شروع کیا تو آسمان نے ہم پر خاص رحمت کی اور کفر و الحاد کے خلاف یونانیوں کی حفاظت کے لیے عثمانی سلطنت کو کھڑا کر دیا ؛ یہ سلطنت مغربی قوموں کی سیاسی قوت کے خلاف ہمارے لیے حفاظت اور آرتھوڈکس کلیسا کی حمایت کا ذریعہ بن گئی[۱]

۱- فن لے (Finlay) ۔ کی کتاب ''تاریخ یونان'' (۱۴۶ ق-م - ۱۸۶۴ء) ، جلد پنجم ، صفحہ ۲۸۴-۲۸۵ ۔

مذہبی جنونیوں کے روایاتی نظریے ثقافت کی ہرتی ہوئی بازی میں آخری چال تھی جس نے صرف ایک سو سال سے کچھ زیادہ مدت پیشتر ایک قطعی شکل اختیار کی تھی - آرتھوڈکس مسیحیوں میں ثقافتی تبدیلی کا آغاز لباس کی تبدیلی سے ہوا؛ یہی دور ہے جب وہ ثقافتی لحاظ سے اپنے عثمانی آقاؤں کے بجائے مغربی ہمساؤں کی طرف متوجہ ہو گئے، لباس میں تبدیلی کی شہادت کی تصدیق ثقافتی دائرے میں بھی ہوتی ہے - سترھویں صدی کے ساتویں عشرے میں رعیت کا مجلسی نصب العین یہ تھا کہ وہ عثمانیت کے رنگ میں رنگے جائیں؛ قسطنطنیہ میں انگریزی سفارت خانے کے رمز شناس سکرٹری سر پال رائی کاٹ کا بیان بھی یہی تھا، وہ لکھتا ہے:

> ہر دانش مند آدمی کو یہ حقیقت خوب سمجھ لینی چاہیے کہ یونانی اور ارمنی مسیحی بصد خوشی ترکی عادات و خصائل کی تقلید کرتے ہیں اور وہ اس لحاظ سے زیادہ سے زیادہ ترکوں کے قریب آگئے ہیں - جب انھیں کسی غیر معمولی تقریب میں مسیحی امتیازات کے بغیر شامل ہونے کا حق ملتا ہے تو اس پر انتہائی فخر کرتے ہیں![1]

اس کے برعکس ''ڈیمیٹریس کینٹی میر''[2] کا معاملہ سامنے لائیے؛ وہ رومانیہ کا ایک امیر اور آرتھوڈکس مسیحیت کا پابند تھا، باب عالی نے ۱۷۱۰ء میں اسے مالڈیویا کا رئیس بنا دیا اور اگلے ہی سال وہ عثمانیوں سے غداری کر کے روسیوں سے جا ملا - اس کی جو تصویر ملتی ہے، وہ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے اس نے ایک ایسا کوٹ پہن رکھا ہے جس میں پیچھے کے بال چھپے ہوئے ہیں، اس کے ساتھ نیم آستین پہنی ہوئی ہے، بغل میں ایک نیمچہ لٹک رہا ہے؛ لباس میں اس قسم کی تبدیلیاں دراصل قلب و نظر میں تبدیلیوں کا ایک ظاہری نشان تھیں، مثال کے طور پر ''کینٹی میر'' لاطینی، اطالوی اور فرانسیسی زبانیں بے تکلف پڑھ اور لکھ سکتا تھا - اسی

۱- پال رائی کاٹ (Paul Rycaut) کی کتاب ''سلطنت عثمانیہ کی موجودہ حالت'' -

۲- Demetrius Cantemire -

طرح فناری یونانی[1] جو آرتھوڈکس مسیحیت کے پابند تھے، اٹھارھویں صدی میں اپنے ترک آقاؤں کی نہایت اہم خدمات انجام دیتے رہے اس لیے کہ انھیں مغربی طریق زندگی کے متعلق پورا علم تھا اور عثمانی حکومت کو مغربی طاقتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑے ہوشیار اور دور اندیش سفیروں کی ضرورت پیش آتی تھی، اٹھارھویں صدی میں مغربی طاقتوں کو میدان جنگ میں شکست دینا سہل نہ رہا تھا۔

عثمانی باب عالی کی آرتھوڈکس مسیحی رعایا کو اٹھارھویں صدی میں جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، اُن کا اصل سبب وہ بد نظمی تھی جو سلطنت میں رونما ہو چکی تھی اور یہی بد نظمی سلطنت کے انحلال کا باعث بنی؛ مغربی مسیحیت میں جہاں مذہبی تشکک پیدا ہوا، وہاں انتظامی صلاحیت اعلیٰ پیمانے پر پہنچ گئی اور سیاسی روشن خیالی کا دور شروع ہوا۔ ہیپسی برگ شاہنشاہوں نے جو کیتھولک مذہب کے پیرو تھے، اپنی غیر کیتھولک رعایا پر ظلم و جبر ختم کر دیا اور آرتھوڈکس مسیحیت کے معتقد سرب جو عثمانی سلطنت کو چھوڑ کر اُن علاقوں میں پہنچے تھے جو ہیپسی برگ شاہنشاہوں نے عثمانیوں سے چھین لیے تھے، دور جدید کی مغربی ثقافت کو آگے پہنچانے کا ذریعہ بن گئے یہاں تک کہ یہ ثقافت پوری سرب قوم میں سرایت کر گئی۔ مغربی ثقافت کے اثرات کو آرتھوڈکس مسیحیت کے حلقے میں پہنچانے کا ایک ذریعہ وینس بھی تھا جو ۱۶۶۹ء سے ساڑھے چار سو سال پیشتر یونانی آرتھوڈکس مسیحی جزیرے کریٹ کا مالک چلا آتا تھا اور مختلف اوقات میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے یونان پر بھی حکمرانی کر چکا تھا۔ مغربی اثرات کا ایک سر چشمہ وہ سفارت خانے بھی تھے جو مغربی ممالک نے قسطنطنیہ میں قائم کر لیے تھے۔ عثمانی حکمرانوں کا ایک دستور یہ بھی رہا کہ انھوں نے تمام قوموں کو ایک گونہ داخلی خود مختاری دے رکھی تھی؛ اس طرح سلطنت کے اندر بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں پیدا ہو گئی تھیں جو سلطنت عثمانیہ کے اندر رہنے والی اقوام ہی کو خاص

۱- Phanariot ۔ یہ یونانیوں کا ایک طبقہ تھا جو قسطنطنیہ کے محلۂ فناری میں آباد تھے، انھوں نے سلطنت عثمانیہ میں ذمہ داری کے عہدے حاصل کیے (مترجم)۔

دائرے میں مختار نہ بناتی تھیں بلکہ خود عثمانی رعایا پر بھی حکم چلاتی تھیں، اس صورت حال سے سفیروں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک ذریعہ وہ یونانی تاجر تھے جنھوں نے لندن، لیور پول اور نیویارک میں مرکز بنا لیے تھے۔

یوں دور جدید کے مغربی اثرات خشکی اور تری کے راستوں سے آرتھوڈکس مسیحیت کے بڑے حصے تک پہنچتے رہے اور اس معاشرے کو متاثر کرتے رہے جو اجنبی سلطنت عام کے ماتحت زندگی بسر کر رہا تھا۔ دور جدید کا مغربی طریق حیات اختیار کر لینے کی ابتدائی کوشش سیاسی سطح سے پیشتر تعلیمی سطح پر ہوئی؛ پیرس میں ادمانڈیوس کریس[1] اور ویانا میں وککراڈس[2] کے علمی کاموں کو قرہ جارج[3] اور میلوس ابری نواک[4] کی بغاوتوں پر تقدم حاصل رہا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز پر یہ پیش گوئی بہ اطمینان کی جا سکتی تھی کہ سلطنت عثمانیہ کے یورپی علاقوں میں مغربیت کے طور طریقے ضرور جاری ہوں گے لیکن اس وقت تک ان طور طریقوں کی وضع و ہیئت واضح نہ تھی۔ جس صدی کا اختتام ۱۸۲۱ء پر ہوا اس میں مسیحیوں کے ہمہ گیر مذہبی نظام سے متعلق جو فناری یونانی تھے، انھوں نے رومی سلطنت کے جسد میں نئی روح پھونکنے کے بجائے اپنے خواب کو نئی شکل دے دی تھی یعنی یہ کوشش شروع کر دی تھی کہ مغربی مسئلے کے حل کے لیے سلطنت عثمانیہ کو مختلف اقوام کی ویسی ہی متنور بادشاہیوں کا ایک مجموعہ بنا دیں جیسے کہ ڈینیوب کی ہیپس برگ شاہنشاہی بنانے پر آمادہ تھی؛ فناری

۱- Adhamandios Korais، ایک یونانی ادیب جس نے وطنی تحریک کی تبلیغ و اشاعت میں حصہ لیا (۱۷۴۸ء - ۱۸۳۳ء) (مترجم)۔

۲- Vuk Karadzic، سرویا کا ایک ادیب (۱۷۸۷ء - ۱۸۶۴ء) (مترجم)۔

۳- Qara George، یہ یونان کا ایک افسر تھا، میدان جنگ میں مارا گیا تھا (مترجم)۔

۴- Milos Obrenovic، یہ شخص سروبیا کا بادشاہ بن گیا تھا لیکن رعایا سے اختلافات کی بنا پر ۱۹۰۳ء میں مارا گیا، ملکہ بھی ساتھ ہی قتل ہوئی (مترجم)۔

یونانیوں کے اس عظیم الشان عزم کو متواتر سیاسی کامیابیوں سے بڑی تقویت پہنچی۔

سلاطین عثمانیہ نے اپنی پھیلتی ہوئی مملکت کی مسیحی رعایا کا معاملۂ قیادت لاٹ پادری کو سونپ دیا تھا؛ اس طرح قسطنطنیہ کے لاٹ پادری کو مسیحی باشندوں پر وہ سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تھا جو ساتویں صدی مسیحی میں عربوں کے ہاتھوں شام و مصر کی تسخیر کے وقت سے قسطنطنیہ کے کسی حکمران نے اسے عطا نہ کیا تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں آزاد مسلم عیسائیوں کے طرز عمل نے فناریوں کی سیاسی قوت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ ۱۵۶۶ء میں سلیمان اعظم نے وفات پائی، اس کے بعد ایک سو سال کے اندر اندر مسلمانوں نے بادشاہ کے خاص کارندوں کو اس امر پر مجبور کر دیا تھا کہ سلطنت کے کاروبار میں انھیں بھی شریک کیا جائے اور انھوں نے اپنی اس سیاسی فتح میں یونانیوں کو بھی حصہ دار بنا لیا تھا؛ چنانچہ باب عالی اور بحری بیڑے کے ترجمانان خصوصی کے عہدے تجویز ہوئے، مقصد یہ تھا کہ اس طرح سلطنت عثمانیہ میں رہنے والے یونانیوں کی صلاحیت و قابلیت سلطنت کی خدمت میں صرف کی جائے۔ یونانیوں کو ایسے اور بھی فوائد حاصل ہوئے لیکن غیر یونانی آرتھوڈکس مسیحی رعایا ان میں شریک نہ تھی بلکہ اسے نقصان پہنچا۔

۱۸۲۱ء سے پیشتر کی نصف صدی میں فناری یونانیوں کو امید پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ میں اسی قسم کا اقتدار حاصل کر لیں گے جیسا اقتدار شاہنشاہ جوزف ثانی ڈینیوب کی ہیپس برگ بادشاہی میں جرمنوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت تک مغرب میں انقلابات کے ایسے واقعات پیش آ چکے تھے جنھوں نے فناریوں کے اقتدار کی جڑ کھوکھلی کردی۔ مغرب میں سیاسی تصورات بدلے اور متنور بادشاہی کی جگہ یکایک قومیت نے لے لی۔ سلطنت عثمانیہ کی غیر یونانی آرتھوڈکس مسیحی رعایا پر واضح ہو گیا کہ ترک مسلمانوں کے اقتدار کی جگہ فناری یونانیوں کا اقتدار قبول کر لینے سے خود ان کے قومی تصورات کی تکمیل نہ ہوگی۔ بالکل یہی حالت دریائے ڈینیوب کے آس پاس کی ریاستوں میں رومانوی آبادی کو پیش آئی؛ چنانچہ وہ ایک سو دس سال تک فناری یونانیوں کی حکمرانی کا تجربہ

کر چکے لیکن جب ۱۸۲۱ء میں ہیپس لینڈی[1] نے حملہ شروع کیا اور بار بار اپیلیں کیں کہ فناری یونانیوں کی سرکردگی میں عثمانی حکمرانی سے آزادی حاصل کرنے کا یہ بہت ہی اچھا موقع ہے اور آرتھوڈکس مسیحیوں کو ساتھ دینا چاہیے لیکن رومانویوں میں کوئی اس کے لیے تیار نہ ہوا اور ہیپس لینڈی کی تحریک ناکام ہو گئی۔

فناریوں نے یونانیت کا جو تصور قائم کیا تھا، وہ ناکام ہو گیا؛ یہ ناکامی اس امر کا اعلان تھی کہ سلطنت عثمانیہ کی آرتھوڈکس مسیحی آبادی جو مختلف اقوام پر مشتمل تھی اور مغربی طور طریقے اختیار کر لینا چاہتی تھی، اسے الگ الگ چھوٹی چھوٹی ریاستیں فرانس، ہسپانیہ، پرتگال اور ہالینڈ جیسی قائم کر لینی چاہیے۔ چنانچہ یونان رومانیہ، سرویا، بلغاریہ البانیہ اور جارجیا کی ریاستیں تجویز کی گئیں جن کے باشندے مشترکہ مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی مخصوص زبانوں کی بنا پر متحد ہو سکتے تھے اور اجنبیوں کے مقابلے میں یہی اُن کی ہم وطنی کی بنیاد تھی، لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں جدید مغربی نمونے کی ایسی ریاستوں کے خط و خال واضح نہ رہے تھے، اس وقت سلطنت عثمانیہ کے چند اضلاع بھی ایسے نہ رہے تھے جن کے درمیان لسانی قومیت کی یک جہتی موجود ہوتی، نہ اُن میں مستقل ریاستیں بننے کے جوہر موجود تھے؛ چنانچہ دور جدید کے انقلابی مغربی نمونے کے مطابق نئے سیاسی نقشے بنانے کے لیے لاکھوں کروڑوں باشندوں کو گوناگوں مصائب کا نشانہ بنا دیا گیا۔ مصیبتوں کا یہ سلسلہ زیادہ پھیلتا اور زیادہ رنج افزا ہوتا گیا اس لیے کہ ان علاقوں پر پے در پے جبر و تشدد کا عمل ہوتا رہا۔ وہ آبادیاں بھی اس جبر و تشدد سے بری طرح کچلی گئیں جن میں قومی بنیادوں پر سیاسی تنظیم کی کوئی صلاحیت موجود نہ تھی۔ اس درد ناک کہانی کا آغاز ۱۸۲۱ء سے ہوتا ہے جب یونانی قوم پرستوں نے

۱۔ Hypsi Landi، یہ ایک خاندان تھا جس کے تین آدمی خاص شہرت کے درجے پر پہنچے۔ یہاں مراد الگزانڈر سے ہے (۱۸۲۸ء - ۱۸۹۲ء)، اس نے یونانیوں کو ساتھ لے کر حملے شروع کیے، ناکامی کے بعد ویانا چلا گیا، وہیں وفات پائی۔

موریا[1] میں اسلامی اقلیت کی بیخ کنی کر دی اور اختتام ۱۹۲۲ء میں ہوا جب مغربی اناطولیہ سے آرتھوڈکس مسیحی اقلیت بوریا بستر باندھ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی۔

ان ناگوار حالات میں آرتھوڈکس مسیحیوں کی جو قومی ریاستیں معرض وجود میں آئیں، وہ اتنی چھوٹی تھیں کہ دور جدید کے مغرب کے تعلق میں روس کی طرح وہ کردار ادا نہ کر سکتی تھیں جو مشرقی رومی سلطنت نے دور وسطیٰ کی مغربی مسیحیت کے تعلق میں ادا کیا تھا، وہ چھوٹے چھوٹے مقامی جھگڑوں اور زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے لیے لڑتی رہیں۔ انھیں کشمکشوں میں اُن کی قوتیں ضائع ہوتی رہیں، بے شائبۂ ریب وہ سب سے بڑھ کر ایک دوسری کی دشمن تھیں، بیرونی دنیا کے تعلق میں اُن کی حیثیت وہی تھی جو ''امن عثمانیہ'' سے پیشتر ان کے اسلاف کی تھی۔ اُس زمانے میں یونانیوں، سرویوں، بلغاریوں اور رومانویوں کے سامنے یہ مرحلہ تھا کہ آیا وہ قرون وسطیٰ کے مغربی مسیحیوں کا اقتدار قبول کر لیں یا عثمانیوں کے محکوم بن جائیں؛ عثمانی سلطنت کے خاتمے کے بعد ان کے سامنے یہ مرحلہ آ گیا کہ آیا وہ دور جدید کے لادینی مغربی معاشرے میں شامل ہو جائیں یا پہلے روسی شاہنشاہی بعد ازاں روسی کمیونزم کی ماتحتی قبول کر لیں۔

ان غیر روسی آرتھوڈکس مسیحی قوموں کی اکثریت ۱۹۵۲ء میں فوجی اور سیاسی لحاظ سے روس کے ماتحت تھی، صرف یونان اس سے مستثنیٰ تھا جہاں سویٹ یونین اور جمہوریۂ امریکہ کے درمیان جنگ عظیم کے بعد اعلان کے بغیر جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس جنگ میں دونوں طرف اجنبی محارب طاقتوں کے یونانی نمائندے شریک تھے، روس کو اس میں زک اٹھانی پڑی؛ اسی طرح یوگوسلافیہ بعد از جنگ روسی اقتدار کے دائرے سے نکل گیا اور اُس نے امریکہ کی امداد قبول کر لی۔ جو ریاستیں اس وقت روس کے زیر اقتدار ہیں، اُن کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہے کہ روسی اقتدار کا بالواسطہ استعمال بھی اکثریت کے لیے نفرت انگیز ہے البتہ چھوٹی سی کمیونسٹ اقلیت اس پر خوش ہے جو سویٹ یونین کے کارندوں کی حیثیت میں حکومتوں

۱۔ Morea، یونان کا جنوبی علاقہ جسے خلیج کارنتھ اصل یونان سے الگ کرتی ہے۔

کا کاروبار چلا رہی ہے۔

روسی اقتدار سے اختلاف کی کہانی بہت پرانی ہے۔ انیسویں صدی میں رومانیہ بلغاریہ اور سرویا کے ساتھ روسی تعلقات کی تاریخ سے کئی مثالیں اس اختلاف کی توضیح کے لیے مل سکتی ہیں اور یہ مثالیں روس میں کمیونسٹ انقلاب سے بہت پہلے کی ہیں مثلاً (۱۸۷۷ء - ۱۸۷۸ء) میں روس و ترکی کے درمیان جنگ شروع ہوئی تھی تو روس کو امید تھی کہ اسے سرویا پر پورا اقتدار حاصل رہے گا، روس ہی کی مداخلت سے سرویا محفوظ ہوا تھا ورنہ ترکی فوجیں اسے کچل ڈالتیں، رومانیا پر بھی روس کو پورے اقتدار کی توقع تھی اس لیے کے ڈبروجا کا علاقہ روس ہی نے ترکوں سے لے کر رومانیہ کے حوالے کیا تھا اور بلغاریہ تو صرف روسی قوت کے بل پر عدم محض سے وجود میں آیا تھا لیکن آگے چل کر ثابت ہوا جیسا کہ بے شمار مرتبہ بے شمار مقامات پر ثابت ہوتا رہا کہ بین القومی سیاست میں شکر گزاری کا لفظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوا۔

غیر روسی آرتھوڈکس مسیحی ملکوں میں روس کی مخالفت کا یہ جذبہ بادی النظر میں بہت تعجب انگیز معلوم ہوگا۔ اول یہ کہ آرتھوڈکس مسیحیت ہی روس کا مسلمہ مذہب تھی، دوسرے پرانی سلاف بولی ہی روس، رومانیا، بلغاریا اور سرویا کے کلیساؤں میں مشترک مذہبی بولی کے طور پر استعمال ہوتی تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ مذہبی اور لسانی اتحاد کے باوجود ان قوموں کے ساتھ تعلقات میں روس کو کچھ فائدہ نہ پہنچا جنھیں عثمانی حکومت سے آزاد کرانے کے لیے اس نے ہمیشہ موثر امداد دی تھی؟

اس کا جواب بہ ظاہر یہ ہے کہ جو آرتھوڈکس مسیحی عثمانی سلطنت میں موجود تھے، وہ مغرب کے زیر اثر چلے گئے تھے۔ روس کی طرف ان کے لیے کشش کا باعث نہ سلافیت تھی نہ مذہبی اشتراک، صرف یہ امر تھا کہ روس میں بھی مغربیت کی تحریک میں علم دار کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اسی تحریک پر ان کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں لیکن جب انھیں روس کے معاملات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان غیر روسی مغربیت پسندوں کو معلوم ہو گیا کہ پیٹر نے روس میں مغربیت کی جو تحریک شروع کی تھی اس کی حیثیت بالکل سطحی تھی اور وہی ضرب المثل بالکل درست تھی کہ ایک روسی کو چھیلو تو اندر سے تاتاری نکلے گا۔ اس امر کے لیے معتدبہ

تحریری شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کے مسیحیوں میں روس کا ثقافتی اقتدار سب سے زیادہ ملکہ کتھرائن کے عہد میں رہا (۱۷٦۲ء - ۱۷۹٦ء) - اس کے بعد جیسے جیسے سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں روس کی مداخلت بڑھتی گئی اور جن ''مظلوم مسیحی اقوام'' کا محافظ روس بن گیا تھا ، ان پر روسی خصائص آشکارا ہوتے رہے تو ثقافتی اقتدار میں بھی ضعف آتا گیا -

(III) دور جدید کا مغرب اور ہندو دنیا : جن حالات میں ہندو دنیا کو دور جدید کے مغرب سے سابقہ پڑا وہ بعض معاملات میں ان حالات سے حد درجے مشابہ تھے جو آرتھوڈکس مسیحیت کو پیش آ چکے تھے - یہ دونوں تہذیبیں ہمہ گیر سلطنت کے دور میں داخل ہو چکی تھیں اور دونوں سلطنتوں کے بانی اجنبی تھے جنھوں نے ایرانی مسلم تہذیب کی آغوش میں پرورش پائی تھی - ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت اور آرتھوڈکس مسیحیت میں عثمانیوں کی سلطنت پر بیک وقت نظر ڈالیے - دونوں حلقوں کے مسلمان حکمرانوں کی غیر مسلم رعایا اپنے آقاؤں کی ثقافت سے متاثر ہو رہی تھی جب افق پر دور جدید کا مغرب نمودار ہوا اور دونوں حلقوں میں غیر مسلم رعایا نے نوطلوع ستارے کو اپنی عقیدت کا مرکز بنا لیا ، پھر مغرب کا اثر بڑھتا رہا اور اسلامی معاشرے کی قوت گھٹتی گئی لیکن مشابہت کا یہ پہلو بعض اختلافی امور کو بھی اسی طرح نمایاں کر رہا ہے -

مثلاً سلطنت عثمانیہ کی آرتھوڈکس مسیحی رعایا مغرب کی طرف متوجہ ہوئی تو اسے ایک روایتی تنفر سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑا جو قرون وسطیٰ میں اس تہذیب کے ساتھ تعلق کے ایک افسوسناک تجربے سے پیدا ہوا تھا ؛ اس کے برعکس ہندوؤں کو ثقافتی پالیسی کی تجدید میں ایسی کسی ناخوشگوار یاد سے سابقہ نہ پڑا تھا اس لیے کہ ہندو دنیا اور مغرب کے درمیان سابقے کا پہلا موقع اس وقت پیش آیا جب ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کالی کٹ پہنچا اور دونوں معاشروں کے درمیان تعارف کا آغاز ہوا -

علاوہ بریں ایک اہم اختلاف اور بھی موجود ہے ، آرتھوڈکس مسیحیت کی تاریخ سامنے رکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ سلطنت کی باگ ڈور مسلم بانیوں ہی کے ہاتھ میں رہی یہاں تک کہ اس پر انحلال کا دور طاری ہو گیا - اس کے برعکس تیموری مغلوں کی سلطنت جن کمزور صوبیداروں کے ہاتھ میں آئی

تھی ، وہ اسے یک جا نہ رکھ سکے اور برطانیہ کے تاجروں نے اسے از سر نو ترتیب دیا جو اکبر کے جانشین بن گئے تھے ۔ ان انگریزوں پر واضح ہو چکا تھا کہ جب تک سلطنت کا ڈھانچہ استوار نہ رہے گا اہل مغرب کے لیے تجارتی کاروبار ممکن نہ ہوگا ، نیز اگر وہ خود آگے بڑھ کر سلطنت کو سنبھالنے کی کوشش نہ کریں گے تو فرانسیسی مالک و مختار بن جائیں گے ۔ یوں ہندو دنیا میں مغربیت کی تحریک اس وقت نازک مرحلے میں داخل ہوئی جب ہندوستان اہل مغرب کے زیر حکومت آیا ؛ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں بھی روس کی طرح دور جدید کی مغربی ثقافت اوپر سے نیچے کی طرف آئی ، نیچے سے اوپر کی طرف نہیں جیسا کہ سلطنت عثمانیہ کی آرتھوڈکس مسیحیت میں ہوا تھا ۔

اس صورت حال میں ہندو معاشرے کے برہمنوں اور بنیوں نے وہ کردار کامیابی سے ادا کیا جو غیر روسی آرتھوڈکس مسیحیت میں فناری یونانیوں نے ادا کرنا چاہا تھا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے ۔ ہندوستان کی تمام سیاسی حکومتوں میں وزارت کا منصب ابتدا سے برہمنوں کا استحقاق رہا ہے ، وہ ملحق ہندو معاشرے سے پیشتر بھی ہندی دنیا میں یہی کردار ادا کرتے رہے تھے ۔ مغلوں سے پیشتر جو مسلمان حکمران تھے اور خود مغلوں نے بھی ان ہندو حکومتوں کی یہ مثال قائم رکھی جنھیں ختم کر کے انھوں نے اپنی سلطنت وسیع کی تھی ۔ مسلمان حکمرانوں کی ملازمت میں برہمن وزیروں اور دوسرے چھوٹے درجے کے برہمن عہدیداروں کی وجہ سے ہندوؤں کو یہ اجنبی حکمرانی اتنی ناخوشگوار معلوم نہ ہوئی جتنی اس کے بغیر ہو سکتی تھی ۔ برطانوی راج نے بھی مغل راج ھی کی پیروی کی اور انگریزوں کی اقتصادی سرگرمیوں نے بنیوں کے لیے فائدہ مند مواقع کے دروازے کھول دیے ۔

ہندوستان کی حکمرانی انگریزوں کے قبضے میں آئی تو انھوں نے فارسی کی جگہ انگریزی کو نظم و نسق میں سرکاری زبان بنا لیا ، اس طرح مغربی علم و ادب کو فارسی اور سنسکرت علم و ادب پر اعلیٰ تعلیم کے ذریعے کی حیثیت میں فوقیت مل گئی ۔ اس سے ہندوؤں کی ثقافتی تہذیب پر ویسا ھی زبردست اثر پڑا جیسا کہ پیٹر اعظم کی مغربیت مآب پالیسی سے روس کی ثقافتی تاریخ پر پڑا تھا ۔ دونوں صورتوں میں مغربی زندگی کا رنگ روغن عام

ہو گیا۔ اونچی جاتی کے ہندوؤں نے اس لیے مغربی تعلیم پائی کہ اس کے بغیر وہ ہندوستان کی سرکاری ملازمتوں میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کی تجارت اور حکومت میں مغربی طور طریقوں کے جاری کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کے آزاد خیال پیشے یہاں جاری ہو گئے۔ مثلاً یونیورسٹی فیکلٹی اور وکالت۔ مغربی تجارت اور کاروبار انفرادی کوششوں اور سرگرمیوں پر مبنی تھے اور اس طرح زیادہ منافع کے جو مواقع حاصل ہوئے انھیں صرف یورپینوں کے لیے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

یہ ناگزیر تھا کہ ہندو معاشرے کا یہ نیا عنصر اسی راہ پر لگ جاتا جس راہ پر سلطنت عثمانیہ کی آرتھوڈکس مسیحیت میں فناری یونانی لگ چکے تھے۔ یعنی وہ لوگ اس سلطنت کو اپنے قبضے میں لانے کی کوشش کرتے رہے، جس کی ماتحت وہ زندگی بسر کر رہے تھے اور جسے اجنبی ہاتھوں نے پایۂ تکمیل پر پہنچایا تھا تاکہ اس سلطنت کو مغربی دنیا کی ویسی ہی سلطنت بنا دیں، جیسی دوسری سلطنتیں تھیں اور وہی دستوری نمونہ پیش نظر رکھیں جو عام طور پر رائج تھا، اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے موڑ پر فناریوں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کو اٹھارھویں صدی کی ایک منور بادشاہی بنا دیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے موڑ پر ہندو دنیا کے مغربیت مآب سیاسی لیڈروں نے مغرب کے سیاسی تصورات سے وابستگی پیدا کی اور ہندوستان کی برطانوی سلطنت کو مغربی انداز کی ایک جمہوری قومی سلطنت بنانے کا بدرجہا مشکل کام سنبھال لیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اختیارات انگریزوں کے ہاتھ سے ہندوستانیوں کے حوالے ہوئے۔ گویا اس واقعے پر ابھی پورے پانچ سال بھی نہیں گزرے، لہٰذا سعی و کوشش کے نتیجے کے متعلق کچھ کہنا بہت قبل از وقت ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندو تدبر اجنبی خیرخواہوں کی توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ہوا ہے اور جو سیاسی اتحاد ہندوستان کے بر صغیر میں برطانیہ کا سب سے بڑا تحفہ سمجھا جاتا تھا، اسے جس حد تک محفوظ رکھا جا سکتا تھا، محفوظ کر لیا گیا ہے بہت سے برطانوی مبصر واقعات کی رفتار کو دیکھتے ہوئے پیش گوئی کر چکے تھے کہ برطانوی راج کے ختم ہوتے ہی پورا برصغیر ریاستوں اور چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بٹ جائے گا بلا شبہ یہ پیش گوئی غلط ثابت ہو چکی ہے، البتہ یہ درست ہے کہ ہندوؤں کے نقطۂ نگاہ سے پاکستان کی علٰحدگی کے باعث اتحاد کا دامن داغ دار ہو چکا ہے۔

پاکستان بنانے میں جو شے ہندوستانی مسلمانوں کی محرک ہوئی وہ خوف تھا، جو کمزوری کے احساس سے پیدا ہوا۔ وہ اس حقیقت کو بھولے نہ تھے کہ مغل راج نے جو حکومت تلوار کے زور سے فتح کی تھی، اسے اٹھارھویں صدی عیسوی میں محض تلوار ھی کے زور سے محفوظ نہ رکھا جا سکا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر برطانیہ کی فوجی مداخلت ہندوستان کی سیاسی تاریخ کو مختلف راستے پر نہ لگا دیتی تو سابقہ مغل حکومت مرہٹوں اور سکھوں کے درمیان بٹ جاتی۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ برطانوی راج کے ماتحت ہندو ان سے آگے نکل گئے۔ دونوں قوموں کے درمیان مستقل کشمکش جاری تھی اور ایک برطانوی ثالث کو فیصلہ کرنا پڑا تھا کہ مقابلے کے لیے قلم کی جگہ تلوار استعمال ہونی چاہیے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہندوستانی مسلمانوں نے اصرار کیا کہ انھیں ایک جداگانہ حکومت دے دی جائے اور تقسیم ویسے ھی دردناک نتائج کی حامل نظر آنے لگی، جیسے کہ سابقہ صدی میں عثمانی سلطنت کے تقسیم سے پیدا ہوئے تھے۔ کوشش یہ تھی کہ جن جغرافیائی خطوں میں ملی جلی قومیں آباد تھیں انھیں جداگانہ قومی حکومتوں کے علاقے بنا دیا جائے۔ اس وجہ سے سرحدیں ایسی جگہیں قائم کرنی پڑیں جو انتظامی اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے حد درجہ غیر مناسب تھیں۔ اس کے باوجود اقلیتوں کی بہت بڑی تعداد، حدود فاصل کی دوسری طرف رہ گئی۔ ھراس کے عالم میں لاکھوں پناہ گزیں ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے اپنے گھر بار اور اپنے املاک چھوڑ دیے۔ مشتعل حریف راستے میں ان پر حملے کرتے رہے۔ وہ نئے اور غیر متعارف علاقے میں پہنچے تو ہر ذریعے سے محروم ہو چکے تھے اور انھیں زندگیاں از سر نو شروع کرنی پڑیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سرحد کا ایک حصہ ایسا بھی تھا، جہاں کسی اعلان کے بغیر جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ کشمیر پر قبضہ جمانے کے لیے تھی۔ ۱۹۵۲ء تک ہندوستانی مدبروں نے دھلی اور کراچی دونوں جگہیں زبردست کوشش کیں کہ ہندوستان کو اس خوفناک راستے پر لگنے سے روکا جائے جو سلطنت عثمانیہ کو پیش آیا تھا۔ یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت ہندوستان کے حالات بحیثیت مجموعی حوصلہ افزا معلوم ہوتے ھیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ بہت مختصر سیاسی تجربے پر مبنی ہے اگر دور جدید کے مغربی اثرات واقعی ہندو دنیا کے لیے نازک خطرات کا باعث

ہیں تو اُن کے لیے زندگی کی سیاسی سطح پر نہیں بلکہ اقتصادی تہہ اور روحانی گہرائیوں میں جانا چاہیے ان کے اوپر آنے میں شاید کچھ وقت لگے گا۔

مغربیت کے جو خطرے ہندو دنیا کو پیش آئے وہ بہ ظاہر دو تھے: اول ہندوؤں اور مغربی تہذیبوں کے درمیان کوئی "مشترک ثقافتی پس منظر موجود نہ تھا، دوم جن ہندوؤں نے دور جدید کی مغربی ثقافت کو اپنی ذہنی تحصیلات کا جزو بنا لیا، حالانکہ وہ اُن کے لیے اجنبی تھی، اُن کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی، کروڑوں ان پڑھ مفلس و قلاش دہقان اس سے بالکل ناآشنا رہے۔ یہ فرض کرنے کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں کہ مغربی ثقافت کی مداخلت سطح ہی پر رک جائے گی، بلکہ یہ پیش گوئی کرنے کے لیے محکم وجوہ موجود ہیں کہ جب یہ ثقافت نیچے اترتی ہوئی کسانوں کی جمعیت عظیمہ تک پہنچے گی تو اس کے اثرات بہت ہی نادر اور انقلاب انگیز ہوں گے۔

ہندو معاشرے اور دور جدید کے مغرب کے درمیان جو ثقافتی خلیج حائل ہے، وہ محض اختلاف نوعیت تک محدود نہیں بلکہ صریح تضاد پر مبنی ہے، اس لیے کہ دور جدید کے مغرب نے اپنی ثقافتی میراث کو لادینیت کا جامہ پہنا دیا ہے اور مذہب اس سے بالکل خارج ہے۔ اس کے برعکس ہندو معاشرہ اب تک کاملاً مذہبی ہے۔ یہاں تک کہ اسے ''اندھی مذہبیت'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے متعلق پُرجوش مذہبی نقطۂ نگاہ اور سراسر لادینی نقطۂ نگاہ کا یہ تضاد مختلف مذاہب کے درمیان اختلاف سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لحاظ سے ہندو ثقافت، اسلامی ثقافت اور قرون وسطیٰ کی مغربی ثقافت کے درمیان دور جدید کی لادینی مغربی ثقافت کے مقابلے میں موافقت کے زیادہ پہلو موجود ہیں۔ مشترک مذہبیت کی بنا پر ہندوؤں کے لیے اسلام یا مسیحیت قبول کر لینا چنداں مشکل نہ رہا اور اُنھیں ناقابل برداشت روحانی تناؤ کا حدف نہ بننا پڑا۔ اس کی مثالیں آپ کو مشرقی بنگال کے مسلمانوں اور گوا کے رومن کیتھلکوں میں مل جائیں گی۔

ہندوؤں کی یہ صلاحیت خاص توجہ کی محتاج ہے کہ وہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے اجنبی ثقافت کی طرف جا سکتے ہیں، اس لیے کہ اگر مذہبیت اُن کی تہذیب کا ایک نمایاں پہلو ہے تو دوسرا نمایاں پہلو اُن کی علیحدگی اور کنارہ کشی بھی ہے، یہ کنارہ کشی اُن ہندوؤں میں بے شک باقی نہ رہی، جنھوں نے دور جدید کی لادینی ثقافت پائی۔ اس طرح وہ ہندوستانی زندگی کی سیاسی اور

اقتصادی تعمیر دور جدید کے اصول پر کر سکے ، لیکن یہ لوگ ارواح و قلوب میں انشقاق کے بغیر یہ مفید خدمات انجام نہ دے سکے ۔ انھوں نے برطانوی راج کی آغوش میں پرورش پائی لیکن اپنے دلوں میں مغربی طور طریقوں سے الگ رھے ، جن سے وہ متعارف ھو چکے تھے اس ناموافقت نے جو گھری روحانی الجھنیں پیدا کیں اُن کا مداوہ وہ سیاسی اکسیر نہیں کر سکتی جو مغربی نمونے کی قومی ھندوستانی حکومت کے لیے آزادی حاصل کر لینے کی بنا پر ھاتھ آئی ۔

مغربی تعلیم یافتہ ھندوؤں کی روحانی کنارہ کشی غیر مفتوح رھی اسی طرح مغربی حکمرانوں کی روحانی کنارہ کشی بھی بڑھتی گئی ، جن کے ساتھ برطانوی راج کے ماتحت تعلیم یافتہ ھندوؤں کو سابقہ پڑتا رھا ۔ ۱۷۸۶ء کارنوالس نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ھی نظم و نسق کی اصلاح شروع کر دی تھی ۔ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام اختیارات تاج کے حوالے کر دیے ۔ ساتھ ھی انگریزوں کی اُس حکمران جماعت کے طور طریقوں میں ھندوستانی رعایا کے متعلق نہایت گھرا اور بحیثیت مجموعی نا خوشگوار تغیر پیدا ھو گیا ، جو یورپ سے آئے تھے ۔

اٹھارھویں صدی میں انگریز ملک کے عام مراسم و رواجات کی پابندی کرتے تھے ۔ ان میں اختیارات کے غلط استعمال کا رواج بھی شامل تھا ۔ ھندوستانیوں کے ساتھ اُنھوں نے گھرے دوستانہ روابط پیدا کر لیے تھے ۔ انھیں چکمے بھی دیتے تھے اُن پر ظلم بھی کرتے تھے ۔ انیسویں صدی میں اُن کی اخلاقی حالت بہت بلند ھو گئی ۔ فوری طور پر حاصل کی ھوئی قوت کے جس نشے نے ابتدائی انگریز حکمرانوں کو بنگال میں ذلت کے درجے پر پہنچا دیا تھا اُن کی جگہ اُن انگریز ملازموں نے لے لی جو اخلاقی اعتبار سے دیانت داری کا نیا نصب العین سامنے رکھتے تھے اور اختیار کو ذاتی فوائد کا موقع نہیں بلکہ عوام کی امانت سمجھتے تھے ، لیکن برطانوی نظم و نسق میں اس اخلاقی برتری کے ساتھ ایک پہلو یہ بھی آ گیا کہ انگریزوں نے ھندوستانیوں کے ساتھ ذاتی میل جول کم کر دیا ، یہاں تک کہ دور قدیم کے وہ ھندوستانیت مآب انگریز نواب بدل کر ایسے سرکاری ملازم بن گئے ، جن پر عہدے کی حیثیت میں کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا اور ذاتی طور پر اُن تک رسائی مشکل تھی ۔ ۱۹۴۷ء میں یہ طبقہ ھندوستان سے رخصت ھوا جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کی ھر

صلاحیت وقف کر رکھی تھی البتہ اسے اپنا وطن نہ بنایا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے آزادانہ اور سہل الحصول ذاتی تعلقات کیوں ختم ہوئے جب کہ اُن کے مفید اثرات کا فقدان زیادہ سے زیادہ ناقابل برداشت بن گیا تھا؟ بلاشبہ اس تبدیلی کے متعدد وجوہ ہیں: اول آخری زمانے کے انگریز سرکاری ملازم اپنی کنارہ کشی کے متعلق یہ معقول عذر پیش کر سکتے تھے کہ ادائے فرائض کے سلسلے میں دیانت داری کا اعلیٰ درجہ قائم رکھنے کی کوئی اور صورت نہ تھی؛ کسی انسان کے لیے یہ سلسلۂ ادائے فرائض دیوتا بنا رہنا کیوں کر ممکن تھا جب تک مجلسی حیثیت میں بھی وہ دیوتاؤں کی طرح الگ تھلگ نہ رہتا؟ دوسرا سبب غالباً یہ تھا کہ انگریزوں میں فتح و تسخیر کا غرور پیدا ہو گیا تھا اس لیے کہ ۱۸۴۹ء تک بلکہ ۱۸۰۳ء تک ہندوستان میں انگریزوں کی سیاسی اور فوجی قوت اٹھارھویں صدی کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مجلسی اور سیاسی تعلقات کی تاریخ کے ایک انگریز طالب علم نے بیسویں صدی میں اُن دو وجوہ کے عمل کا خوب تجزیہ کیا ہے:

> جب اٹھارھویں صدی اختتام کو پہنچی تو مجلسی فضا میں تدریجاً تبدیلی پیدا ہوگئی، ایک دوسرے کی دعوتوں کا تواتر گھٹ گیا اور ہندوستانیوں کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ ۔ ۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے لیے انگلستان سے آدمی آتے تھے، اُن کی روش زیادہ سامراجی ہو گئی اور ان کے طور طریقوں میں رعونت اور علاحدگی آ گئی۔ جس خلیج کو مسلمان نوابوں اور انگریز اکابر، سیاسی پنڈتوں اور انگریز عالموں نے پاٹنے کی کوشش کی تھی، وہ خطرناک حد تک وسیع ہو گئی ۔ ۔ ۔ انگریزوں کے اندر ہندوستان کے تعلق میں ایک احساس برتری پیدا ہونے لگا جس کے ادارے خراب اور لوگ بد اخلاق تھے بلکہ اُن کے سدھرنے کی کوئی صلاحیت پائی ہی نہیں جاتی تھی ۔ ۔ ۔ ہندوستان کے اندر ہندوستانیوں اور یورپینوں کے تعلقات کا یہ ایک عجیب پہلو ہے کہ نظم و نسق کی درستگی نے نسلی خلیج کو وسیع کر دیا ۔ ۔ ۔ جس زمانے میں اختیارات کی

باگ ڈور رشوت خور ملازمین کمپنی کے ھاتھ میں تھی، وہ ھر ممکن ذریعے سے روپیہ حاصل کر کے رعایا پر ظلم توڑتے تھے، مختلف عورتیں مستقل طور پر اپنے پاس رکھنے کے علاوہ ناجائز جنسی تعلقات میں بھی انھیں باک نہ تھا۔ اس زمانے میں انگریزوں کو ھندوستانی ثقافت سے گہری دلچسپی تھی، وہ فارسی زبان میں شعر کہتے، پنڈتوں، مولویوں اور نوابوں کے ساتھ بیٹھ کر مجلسی مساوات کی بنا پر باتیں کرتے اور دوستانہ تعلقات بھی رکھتے۔ کارنوالس کے وقت سے مصیبت یہ پیدا ھوئی کہ رشوت کی مسلمہ برائیوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجلسی توازن بھی بگاڑ دیا گیا جس کے بغیر ایک دوسرے کو سمجھنا ممکن نہ تھا۔ کانوالس نے حکمرانوں کی ایک نئی جماعت پیدا کی اور ھندوستانیوں کو اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا؛ رشوت کا استیصال ھو گیا لیکن ساتھ ھی مساوات اور تعاون پر خط نسخ کھنچ گیا۔ خود کارنوالس کے دل میں دونوں چیزوں کے درمیان گہرا تعلق تھا؛ اس نے کہا "میرے نزدیک ھر ھندوستانی رشوت خور ھے"۔ وہ سمجھتا تھا کہ انگریزوں کی رشوت خوری کو معقول مشاھروں کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ھے، لیکن اسے یہ خیال نہ آیا کہ ھندوستانیوں کی رشوت خوری کو بھی اسی ذریعے سے ختم کرنے کی کوشش کرنی چاھیے اور ان کی خیر سگالی حاصل کرنا بھی لازم ھے۔ اس نے اکبر کے منصب داروں کے نمونے پر ایک ھندوستانی دفتری نظام بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی؛ اس دفتری نظام کے کارندے خاص تربیت، مناسب مشاھروں، برابر کے برتاؤ، ترقیات اور اعزازات کی حوصلہ افزائی سے کمپنی کے ساتھ ویسی ھی وابستگی پیدا کر سکتے تھے جیسی مغل افسروں کو شاھنشاہ کی ذات کے ساتھ تھی[1]۔

۱- سپیئر (Spear) کی کتاب "نبابز (Nabobs)؛ اٹھارھویں صدی کے ھندوستان میں انگریزوں کی مجلسی زندگی کا ایک مطالعہ" ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۵۔

اجنبیت کا ایک تیسرا سبب یہ تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان آمد و رفت تیز ہو گئی اور انگریز جلد جلد آنے جانے لگے؛ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے وہ اُسی مقام پر رہتے تھے جو انگریزی سر زمین پر واقع تھا - چوتھا سبب بھی تھا جو غالباً سب سے زیادہ قوی اور موثر تھا، انگریز ہندوستان میں اس کا بانی نہ تھا مگر اس کا شکار ہو گیا؛ جو ہندوستانی آخری دور کے انگریزوں کی علٰحدگی اور کنارہ کشی پر خفگی کا اظہار کرتے رہتے تھے، اگر وہ ایک اور حقیقت پیش نظر رکھ لیتے تو غالبا اُن کی رائے بہتر ہو جاتی یعنی انگریزوں کی آمد سے پیشتر تین ہزار سال تک ہندوستان میں ذات پات کی مصیبتیں چلی آ رہی تھیں؛ ہندو معاشرے نے جو برائی اپنے ہندی پیش رو سے میراث میں لی تھی، اس کی شدت اور وسعت میں بہت اضافہ کر دیا؛ انگریز چلے گئے لیکن جس طرح اُن کے آنے سے پہلے ہندوستان کے باشندے اپنی پیدا کردہ مجلسی برائی کے ہاتھوں مصیبتیں جھیل رہے تھے اُسی طرح اب جھیل رہے ہیں - ہندوستان کی تاریخ پر اس نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال کے دور حکومت میں جس علٰحدگی اور کنارہ کشی کا عمل جاری رکھا، وہ ہندوستان کی خاص بیماری کا ایک ہلکا سا دورہ تھا؛ انگریزوں نے اپنے آخری دور میں جس علٰحدگی پر عمل جاری رکھا، اس کا تکلیف دہ اثر برطانوی راج کے ساتھ ھی غائب ہو گیا؛ انگریزی نظم و نسق نے ہندوستانی کسانوں کی حالت اور توقعات پر جو خوشگوار اثر ڈالا تھا، وہ انگریزوں کی ایسی میراث بن گیا جو شاید برطانوی سول سروس کے ہندو جانشینوں کی گردنوں میں چکی کے پاٹ کی طرح بندھا رہے گا -

انگریزی راج کے ماتحت برصغیر کے طبعی وسائل سے مختلف صورتوں میں فائدہ اٹھایا گیا مثلاً ریلوں کی تعمیر، آبپاری کے انتظامات، سب سے بڑھ کر نہایت عمدہ اور بلند پایہ نظم و نسق - ہندوستان سے انگریزوں کی رخصت کے وقت ہندوستانی کسانوں کو دور جدید کے مغربی فن و ہنر کی مادی منفعتوں کا خاصا اندازہ ہو چکا تھا؛ وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ دور جدید کی مغربی جمہوریت کا سیاسی نصب العین کیا تھا، انھوں نے اپنی آبائی میراث کی حیثیت و کیفیت کے بارے میں سوالات شروع کر دیے تھے - جب ہندوستانی کسان یہ خواب دیکھ رہے تھے تو ساتھ ھی انھوں نے اس خواب کی تعبیر کے دروازے بھی بند کرنے شروع کر دیے اور پیدائش کی کثرت سے ان کی تعداد اتنی

بڑھ گئی کہ اس سے زیادہ کے لیے روزی فراہم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے لیے غذا مہیا کرنے کا ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ؛ انگریزوں کی سرگرمیوں سے غذا پیدا ہوتی رہی لیکن اس سے کسانوں کی انفرادی حالت بہتر نہ ہوئی اور ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ، یہ حالت آپ پر مندرجہ ذیل نقشے سے بہ خوبی واضح ہو سکتی ہے :

سال	آبادی
۱۸۷۲ء	۲۰۶،۰۰۰،۰۰۰
۱۹۳۱ء	۳۳۸،۱۱۹،۱۵۴
۱۹۴۱ء	۳۸۸،۹۷۹،۵۵۵

اور ابھی افزائش کا سلسلہ جاری ہے ۔ انگریزوں کے ہندو جانشین اس سیاسی میراث کا انتظام کیوں کر کریں گے جو نا اہلی کے خفیف سے مظاہرے کی بھی روادار نہیں ؟

آبادی کے بڑھ جانے کا روایتی علاج یہ تھا کہ قحط پڑتے ، وبائیں پھیلتیں ، بد نظمیاں پیدا ہوتیں ، لڑائیاں پیش آ جاتیں ؛ اس طرح آبادی گھٹتے گھٹتے اس درجے پر پہنچ جاتی کہ باقی رہنے والے عادت کے مطابق پست درجے کی زندگی اطمینان سے بسر کر سکتے ۔ مہاتما گاندھی نے بھی آزادی ہند کی تلاش میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ مال تھوسی[1] طریق علاج اختیار کیا جائے البتہ اس کے وحشیانہ وسائل سے احتراز کرنا چاہیے ۔ مہاتما نے کہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی ایک نمود سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکے گی جب تک اُسے مغربی دنیا کی اقتصادی زنجیروں سے آزاد نہ کیا جائے گا ؛ اسی غرض سے مشینوں کے بنے ہوئے سوتی کپڑے کا استعمال ترک کر دیا گیا تھا اور اسی غرض سے ایک مہم چلائی گئی تھی ؛ یہ در اصل مغربی فن کاری کے درخت کی جڑ پر کلہاڑا چلانے کی کوشش کی تھی ۔ یہ مہم ناکام رہی اور اس طرح ثبوت بہم پہنچ گیا کہ ہندوستان مغربی دنیا کی اقتصادی

۱۔ مال تھوس (Malthuse) متوفیٰ ۱۸۳۵ء ، کا نظریہ یہ تھا کہ آبادی کی غیر معمولی افزائش تمدن کے لیے خطرہ ہے لہٰذا ضبط نفس سے کام لیا جائے تاکہ پیدائش کا سلسلہ کم ہو جائے اور آبادی کی افزائش جائز حدود سے تجاوز نہ کرے (مترجم)۔

زنجیروں میں بہت بری طرح جکڑا جا چکا تھا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ کب انتہائی نازک صورت اختیار کرے گا، مدبرین اسے نظر انداز نہیں کر سکتے؛ جن ہندو مدبروں نے ہندوستان کی حکومت سنبھال لی ہے، وہ یقیناً مغربی دنیا کی اخلاقی فضا کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے کا ہم دردانہ حل تلاش کریں گے، گاندھی اور مال تھوس کے حل سے یقیناً کام نہ لیں گے۔ اگر مغربی فکر و نظر کے ہندو مدبروں کی سرگرمیاں اس سلسلے میں ناکام رہیں تو روس کی حریفانہ اکسیر یقیناً ہندوستان کے قومی ایجنڈے کا جز بن جائے گی۔ کمیونسٹ روس کی طرح مغربیت مآب ہندوستان کو بھی کسانوں کا مسئلہ میراث میں ملا ہے جو اقتصادی بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں؛ ہندوستان کے برعکس روس اپنے طور طریقوں کے مطابق اس مسئلے کے حل میں لگ چکا ہے، ممکن ہے کمیونسٹ طور طریقوں کو زیادہ بے رحمانہ اور زیادہ انقلابی سمجھا جائے اور ہندوستان کے کسان یا ہندوستان کے اہل فکر و نظر ان طریقوں کو خوش دلی سے اختیار نہ کر سکیں لیکن مسئلہ بے حد اہم ہے اور یہ امکان موجود ہے کہ مصیبت کے وقت کمیونسٹوں کا پروگرام حکومت ہند کے ایجنڈے میں داخل ہو سکتا ہے۔

(IV) دور جدید کا مغرب اور اسلامی دنیا: مغرب کی تاریخ میں دور جدید کے آغاز کے وقت دو اسلامی معاشرے پشت بہ پشت کھڑے تھے اور انھوں نے مغربی اور روسی معاشرے کے علاقوں سے پرانی دنیا کے تمام راستے روک رکھے تھے: عربی اسلامی تہذیب نے پندرھویں صدی کے اختتام پر بھی افریقہ میں اوقیانوس کا ساحلی علاقہ آبنائے جبل طارق سے سینی گال تک کا علاقہ روک رکھا تھا اور مغربی دنیا کی مسیحیت کے لیے افریقہ میں گزر ممکن نہ رہا تھا۔ نیز عربی اثرات کی لہریں تاریک براعظم (یعنی افریقہ) پر پھیلی ہوئی تھیں؛ ایک طرف سوڈان کی شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ اور دوسری طرف بحر ہند کی طرف سے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ جسے عام طور پر سواحل کہتے تھے۔ بحر ہند دراصل عربوں کے لیے ایک جھیل بن چکا تھا اور وہاں مصری دلالوں کے شرکائے کار یعنی اہل وینس کو قدم رکھنے کا موقع حاصل نہ تھا البتہ وینس والے مصریوں کے ذریعے سے اپنا سامان بحر ہند کی طرف بھجوا دیتے تھے؛ عربوں کے جہاز صرف سویز سے سوفالہ تک چکر لہ

لگاتے رہتے تھے بلکہ وہ آہستہ آہستہ انڈونیشیا میں پہنچ گئے تھے اور اس مجمع الجزائر کو انھوں نے ہندوؤں سے چھین کر مسلمانوں کی ملکیت بنا دیا تھا، پھر اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھے اور انھوں نے جنوبی فلپنیز کے لا مذہب ملائیوں کو مسلمان بنانا شروع کر دیا، یوں بحر الکاہل کے مغربی حصے میں ایک نئی چوکی قائم کر دی۔

ساتھ ساتھ ایرانی اسلامی تہذیب اس سے بھی بدرجہا زیادہ جنگی اہمیت کی موقعیت پر قابض تھی: عثمانی بانیان سلطنت قسطنطنیہ، موریا، قرہ مان، اور طرابزون پر قبضہ جما چکے تھے اور کریمیا میں اہل جنوآ کی نو آبادیوں کو زیر نگین لا کر انھوں نے بحیرۂ اسود کو عثمانی جھیل بنا دیا تھا؛ ترکی زبان بولنے والے دوسرے مسلمانوں نے اسلامی مقبوضات کی سرحدیں بحیرۂ اسود سے والگا کے وسطی بہاؤ تک پہنچا دی تھیں اور اس مغربی محاذ کے عقب میں ایرانی دنیا جنوب مشرق کی طرف پھیلتی پھیلتی ایک طرف چین کے شمالی و مغربی صوبوں یعنی کانسو اور شنسی تک جا پہنچی تھی، دوسری طرف وہ ایران پر چھائی ہوئی تھی، نیز ہندوستان میں بنگال و دکن تک اس کے ڈنکے بج رہے تھے۔

شاہراہوں کی اس زبردست اسلامی ناکہ بندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو مسدود مسیحی معاشروں کی علمدار قوموں نے ویسی ہی زبردست یورش کا انتظام کیا۔ مغربی مسیحیت کی جو قومیں ساحل اوقیانوس پر آباد تھیں، انھوں نے پندرھویں صدی میں نئی قسم کے بحری جہاز تیار کیے جن کے تین مستول ہوتے تھے، رسوں اور بادبانوں کا نہایت عمدہ انتظام کر لیا گیا تھا اور جا بجا مثلث نما بادبان لگا دیے گئے تھے۔ آگے چل کر انھوں نے جہازوں کے آگے اور پیچھے دونوں طرف خاص قسم کے بادبانوں کا بندوبست کر لیا؛ یہ جہاز متواتر مہینوں سمندر میں رہ سکتے تھے اور انھیں بندرگاہوں میں جانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی، ان جہازوں پر سوار ہو کر پرتگیز ملاحوں نے گہرے سمندروں میں آزمائشی سفر شروع کر دیے۔ اس طرح ۱۴۲۰ء کے آس پاس جزیرۂ مڈیرا[1] دریافت

۱۔ Madeira، اوقیانوس یا اٹلانٹک کا ایک جزیرہ جو ہسپانیہ سے جنوب مائل بہ غرب واقع ہے اور نقشے پر مراکش کے محاذ پر ملے گا (مترجم)۔

کر لیا ، ۱۴۳۲ء میں وہ ایزورس[1] پہنچ گئے ؛ غرض عربوں نے ساحل اوقیانوس کے ساتھ ساتھ جو بحری محاذ قائم کر رکھا تھا ، پرتگیزوں نے اس کے بازو میں راستہ پیدا کر لیا اور وہ آگے بڑھتے بڑھتے ۱۴۴۵ء میں راس ورد[2] کے پاس سے ہوتے ہوئے نکل گئے ، ۱۴۷۱ء میں وہ خط استوا پر تھے ، ۱۴۸۷ء - ۱۴۸۸ء میں راس امید کا چکر لگایا ، ۱۴۹۸ء میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ میں لنگر انداز ہوئے - ان کی پیش قدمی بہ دستور جاری رہی ؛ ۱۵۱۱ء میں انہوں نے آبنائے ملکا[3] پر تسلط جمایا ، ۱۵۱۶ء میں بحرالکاہل کے مغربی حصے تک رسائی حاصل کر لی اور اپنے پرچم کی نمائش کانٹن میں کی ، ۱۵۴۲ء - ۱۵۴۳ء میں وہ جاپان کے ساحل پر جا نمودار ہوئے ، گویا پرتگیزوں نے شہاب ثاقب کی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے بڑھتے بحر ہند کی حکمرانی عربوں سے چھین لی -

جس زمانے میں مشرقی جانب بحر پیمائی کرنے والے پرتگیزوں نے مغربی دنیا کے لیے وسیع سمندروں پر حکومت حاصل کر لی تھی اور جنوبی سمت میں عربی اسلامی دنیا کا بازو نرغے میں لے لیا تھا ، اس زمانے میں کشتی رانی کے ذریعے سے مشرقی جانب پیش قدمی کرنے والے ''کاسکوں'' نے اچانک اور انتہائی تیزی سے روسی دنیا کی حدیں بڑھا کر ایرانی اسلامی دنیا کو شمالی سمت سے گھیرے میں لے لیا - پیش قدمی کے اس راستے کو کھولنے کا ذمہ دار ماسکو کا زار آئی ون[4] چہارم تھا جس نے ۱۵۵۲ء میں قازان کو مسخر کیا ؛ قازان شمالی و مشرقی سمت میں ایرانی اسلامی دنیا کا آخری حصار تھا ، اس کے مسخر ہوتے ہی جنگلات اور برف باری کے سوا کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی ، جنگلات اور برف باری خانہ بدوش کاسک جنگجوؤں کے پرانے رفیق تھے -

---

۱- Azores ، یہ بھی ایک جزیرہ ہے جو مڈیرا کی شمالی و مغربی جانب پرتگال کے محاذ میں ہے (مترجم) -

۲- Cape Verede ، یہ سینی گال کی ایک راس ہے ، اس کے سامنے اس نام کا ایک جزیرہ بھی ہے (مترجم) -

۳- Malacca یہ آبنائے ملایا اور سماٹرا کے درمیان واقع ہے ، اسی میں سے ہو کر سنگاپور جاتے اور وہاں سے بحرالکاہل میں داخل ہوتے ہیں (مترجم) -

۴- Ivan IV روس کا پہلا زار جسے خوفناک بھی کہتے ہیں (۱۵۳۰ء - ۱۵۸۴ء) (مترجم) -

چنانچہ روسی آرتھوڈکس مسیحیت کے یہ علمدار پیش قدمی کرتے کرتے کوهستانی یورال سے گزرے ، پھر سائبیریا کے آبی راستوں کے ساتھ ساتھ ۱۶۳۸ء میں بحر الکاهل پر اور ۲۴ مارچ ۱۶۵۲ء کو مانچو سلطنت کی شمالی و مشرقی سرحد پر پہنچ گئے ؛ یوں روسی دنیا اس درجے پھیلی کہ اس نے نہ صرف ایرانی دنیا کا بازو روک لیا بلکہ وہ یوریشیا کی پوری سطح مرتفع پر قابض ہو گئی -

اس طرح ایک صدی سے کچھ ھی زیادہ مدت میں اسلامی دنیا جس کے اندر عربی اور ایرانی معاشرے باهم مل گئے تھے ، کاملاً نرغے میں آ گئی ؛ سولھویں اور سترھویں صدی میں پھانسی کا پھندا شکار کی گردن میں پوری طرح پڑ چکا تھا - عجیب بات یہ ھے کہ اسلامی دنیا یکایک ایک خوفناک خطرے میں مبتلا ھو گئی تاھم خاصی لمبی مدت تک خود مسلمانوں یا ان کے حریفوں کو صورت حال کا کوئی احساس نہ ھوا ورنہ وہ اپنے اپنے مقاصد کو پایۂ تکمیل پر پہنچانے کے لیے قدم اٹھانے میں توقف نہ کرتے ؛ نہ مغربی اور روسی سمت سے کسی نے بے بس شکار کو چھلانگ مار کر دبوچ لینے کی کوشش کی اور نہ مسلمانوں کی طرف سے اس بہ ظاہر حد درجے ھولناک حالت سے بچ نکلنے کے لیے کوئی حرکت شروع ھوئی - ۱۹۵۲ء میں دارالاسلام اپنی اصل حیثیت میں محفوظ تھا البتہ اس کے چند دور افتادہ علاقے چھن گئے تھے ؛ مرکزی حصہ مصر سے افغانستان تک اور ترکی سے یمن تک اجنبی سیاسی حکمرانی یا کنٹرول سے بالکل آزاد تھا - اس وقت تک مصر ، شرق اردن ، لبنان ، شام اور عراق ، برطانیہ اور فرانس کے سامراجی سمندر کی تہ سے ابھر کر سطح پر آ چکے تھے ، ان پر تسلط کا سلسلہ ۱۸۸۲ء میں شروع ھوا تھا اور ۱۹۱۴ء—۱۹۱۸ء کی جنگ میں کمال پر پہنچا ؛ اب عربی دنیا کے قلب کو جو خطرہ لاحق ھو رھا تھا ، وہ مغربی دنیا کی طرف سے نہ تھا بلکہ صیہونیت کی طرف سے تھا[1] -

''مغربی مسئلے'' کے بارے میں مسلم اقوام کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے

۱- مصنف کی یہ رائے بڑی ھی عجیب ھے - صیہونیت یا یہودیت کی حیثیت کیا ھے ؟ وہ مغربی سامراج کا ایک آلہ ھے اور تین مغربی جمہوریتوں کی مجموعی قوت کے بل پر قائم ھے یعنی برطانیہ ، امریکہ اور فرانس (مترجم) -

کے لیے تین چیزوں کو کلیے کی حیثیت حاصل ہے : اول جب دور جدید کی مغربی ثقافت کے اثر نے مسلمانوں کی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل کی تو مسلمان قومیں سیاسی اعتبار سے اپنے معاملات کی مالک و مختار تھیں، روسی بھی اپنی تاریخ کے نازک دور میں اپنی تقدیر کے خود مالک تھے لیکن سلطنت عثمانیہ کے آرتھوڈکس مسیحیوں کی حیثیت اس کے بالکل برعکس تھی؛ دوم مسلمان نہایت عظیم الشان عسکری روایات کے وارث تھے جن کی وجہ سے ان کی نظروں میں اسلامی تہذیب کو خاص حیثیت حاصل تھی؛ سوم آخری دور میں ان کی فوجی قوت کا زوال اور میدان جنگ میں شکست ان کے لیے تعجب انگیز بھی تھی اور ذلت خیز بھی۔

مسلمانوں کے دلوں میں اپنی مشہور عسکری عظمت پر وثوق و اطمینان اس درجے راسخ ہو چکا تھا کہ جب صورت حال منقلب ہو گئی اور ویانا کے دروازے پر انہوں نے شکست کھائی تو اس وقت بھی انہیں کوئی خاص خیال نہ ہوا۔ ایک سو سال بعد مسلمانوں کی عسکریت کا زوال زیادہ سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا؛ ۱۷٦۸ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو ترکوں کو بتایا گیا کہ روسیوں نے بحیرۂ بالٹک میں جو بیڑا تیار کیا ہے، اسے بحیرۂ روم کے راستے قسطنطنیہ لا رہے ہیں لیکن انہیں یقین نہ آیا کہ بحیرۂ بالٹک سے بحیرۂ روم تک بحری راستہ موجود ہے یہاں تک بیڑا سچ مچ آ پہنچا۔ تیس سال بعد وینس کے تاجروں نے مصر کے مملوک کہ حاکم مرادبے کو بتایا کہ نپولین مالٹے پر قابض ہو چکا ہے، ممکن ہے اس کا مقصد یہ ہو کہ مصر پر یورش کرے؛ یہ سنا تو مرادبے نے اس مشورے کی لغویت پر ایک پُر زور قہقہہ لگایا (حالانکہ نپولین نے نہ صرف حملہ کیا بلکہ وہ مملوکوں کو شکست دے کر مصر پر قابض بھی ہو گیا، اس طرح تمام یورپی قوموں پر مصر کی اہمیت پہلی مرتبہ واضح ہوئی)۔

عثمانی دنیا دور جدید کی مغربی جنگی مشینری سے شکست کھا چکی تھی، اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے موڑ پر وہاں مغربیت کی تحریک اوپر سے نیچے کی طرف شروع ہوئی، روسی دنیا میں بھی ایک صدی پیشتر یہی ہوا تھا؛ چنانچہ ترکی فوج کی تنظیم جدید کا آغاز ہو گیا لیکن ایک اہم نکتہ ایسا بھی ہے جس میں عثمانیوں کی پالیسی اور پیٹر اعظم کی پالیسی میں اختلاف تھا۔ پیٹر نے ایک بلند نظر انسان کی طرح بھانپ لیا تھا کہ مغربیت کی تحریک یا تو

ہمہ گیر ہونی چاہیے یا اسے شروع ہی نہ کرنا چاہیے ؛ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس پالیسی کو کامیاب بنانے کی تدبیر یہ ہے کہ اسے محض فوج ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں داخل کر دینا چاہیے اگرچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پیٹر کی پالیسی کامیاب نہ ہو سکی ، مغربیت کے اثرات صرف شہری حلقوں کے بالائی طبقوں تک محدود رہے ؛ انجام کار اس کی پاداش میں کروڑوں دیہاتی عوام کو کمیونزم کے حوالے کرنا پڑا ایکن پیٹر نے جس ثقافتی اقدام کا بندوبست کیا تھا ، اس کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں کہ اس نے حالات کا صحیح اندازہ نہ کیا تھا ، اصل وجہ یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے اس کے لیے پوری سرگرمی سے کام نہ کیا - اس کے برعکس ترکی میں ڈیڑھ سو سال تک (۱۸۶۸ء کی روسی ترکی جنگ سے ۱۹۱۸ء کی عالمگیر جنگ تک) فوج مغربی طور طریقے اختیار کرنے پر دل سے راضی نہ ہوئی ، وہ آخری وقت تک اسی مغالطے میں الجھی رہی کہ اجنبی ثقافت کے مختلف عناصر کو اختیار کرتے وقت یہ ممکن ہے کہ بعض لے لیے جائیں اور بعض ترک کر دیے جائیں - ترکوں نے بعد میں با دل ناخواستہ مغربیت کی جتنی خوراکیں استعمال کیں ، ان کے بارے میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ خوراکوں کا وزن کم تھا اور وہ اصل وقت گزار کر بہت دیر میں پی گئیں ؛ ۱۹۱۹ء میں مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں نے پیٹر کی طرح مغربیت کی ہمہ گیر تحریک خلوص قلب سے جاری کی -

مصطفیٰ کمال نے مغربی انداز کی جو ترک قومی حکومت پیدا کی ، یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ کامیاب رہا ؛ بہ ہر حال اسلامی دنیا کے کسی حصے میں اس انداز کی کوئی اور چیز معرض وجود میں نہیں آئی - البانیا کے طالع آزما محمد علی نے انیسویں صدی کے دوسرے عشر میں مصر کو مغربیت کے رنگ میں رنگنے کی جو کوشش کی تھی ، اس کی نظیر اس عہد کے ترک سلاطین پیش نہ کر سکے ، اس کا حلیہ محمد علی کے جانشینوں نے بگاڑ دیا اور اب وہ دو تہذیبوں کے دوغلے پن کا ایک پیکر ہے جس میں ابتدائی تہذیب اور اختیار کردہ تہذیب کے بعض مذموم و قبیح پہلو موجود ہیں[1] - امان اللہ خاں نے افغانستان میں مصطفیٰ کمال کی نقل کرنی

۱- میرے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ، نیز یہ ناصر کے پیشتر کے دور سے تعلق رکھتی ہے (مترجم) -

چاہی تھی ؛ تاہم اس نقل کو ایک نیم بربری سلطنت کے تربیت ناپذیر میدان میں ایک تجربہ سمجھنا چاہیے ، ہر شخص اسے اپنے رحجان طبعی کی بنا پر المیہ یا طربیہ قرار دے سکتا ہے ، تاہم اس کے ناکام ہونے سے کسی کے لیے بھی اختلاف کی گنجائش نہیں -

ہم بیسویں صدی کے وسط میں پہنچے ہوئے ہیں ؛ جیسا تجربہ امان اللہ خاں کا تھا ؛ ویسے محدود تجربات کی کامیابی یا ناکامی کی بنا پر اسلامی دنیا کے مستقبل کی نسبت حکم نہیں لگایا جا سکتا - مستقبل قریب کے بارے میں فیصلہ مغربی دنیا اور روسی دنیا کے درمیان قوت آزمائی کے نتیجے پر موقوف ہے اور ان دونوں دنیاؤں نے اسلامی دنیا کو گھیرے میں لے رکھا ہے ، ان محارب فریقوں کے نزدیک اسلامی دنیا نے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے -

اسلامی دنیا کے احاطے میں دنیائے قدیم کی تین ابتدائی تہذیبوں کے وطن آگئے تھے ؛ یہ معاشرے اب معدوم ہو چکے ہیں ، انھوں نے نیل زیریں ، دجلہ و فرات اور دریائے سندھ سے جو زرعی دولت حاصل کی تھی ، دور حاضر میں اس کے ازسرنو حصول کا بندوبست مصر و پنجاب میں نیز جزواً عراق میں ہو چکا ہے اور اس کے لیے دور جدید کے مغربی فنون سے کام لیا گیا ہے - اسلامی دنیا کے اقتصادی وسائل میں سب سے بڑا اضافہ نیل کے ان ذخائر کی وجہ سے ہوا جو ان خطوں کے نیچے سے برآمد ہوئے جنھیں زرعی لحاظ سے کبھی کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ ہوئی -

تیل کے یہی ذخیرے تھے جو ایک زمانے میں طبعی طور پر جوش زن تھے اور زرتشتی خدا ترسی نے اسے مذہبی جامہ پہنا کر مقدس آگ کا شعلہ ہمیشہ برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا تھا ، ۱۷۲۳ء میں پیٹر کی دوربین نگاہوں نے اسے اقتصادی حیثیت سے ایک فائدہ رساں چیز قرار دیا تھا ، ڈیڑھ سو سال بعد ایک بالغ نظر انسان کے وجدان نے باکو کے چشموں کو تجارتی حیثیت سے استعمال کرنا شروع کیا - بعد کی تحقیق و تفتیش نے ثابت کر دیا کہ باکو اس زریں سلسلے کی محض ایک کڑی ہے جو جنوبی و مشرقی سمت میں پھیلتا ہوا عراقی کردستان اور ایرانی بختیارستان سے گزر کر جزیرہ العرب کے ان بہ ظاہر بے حیثیت خطوں تک چلا گیا ہے جنھیں کبھی کوئی قدر و قیمت حاصل نہیں رہی - تیل کی وجہ سے کشمکش پیدا ہوئی اور اس نے نہایت نازک حیثیت اختیار کر لی اس لیے کہ قفقاز میں تیل کے روسی ذخائر اور ایران و عرب

میں مغربی طاقتوں کے ذخائر ایک دوسرے کے نشانے کی زد میں واقع ہیں۔

کشمکش اور تناؤ میں ایک اضافہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ اسلامی دنیا عالمگیر وسائل حمل و نقل کا مرکز بن گئی؛ روس اور اوقیانوس کے اردگرد کی مغربی دنیا کے درمیان، نیز ہندوستان، جنوبی و مشرق ایشیا، چین اور جاپان کے درمیان جو زیادہ سے زیادہ کم فاصلے والے راستے ہیں، وہ سب اسلامی دنیا میں سے ہو کر جاتے ہیں خواہ وہ بحری ہوں یا فضائی اور تیل کے چشموں والے نقشے کی طرح شاہراہوں کے نقشے میں بھی روس اور مغرب خطرناک حد تک ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

(V) دور جدید کا مغرب اور یہودی: مغربی تہذیب کی تاریخ کے جدید باب کے بارے میں عالم انسانیت کا آخری فیصلہ خواہ کچھ ہو لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ دور جدید کے مغربیوں نے دو ایسے جرموں کا ارتکاب کیا ہے جن کی بدنامی اور رسوائی کا داغ کبھی اُن کی پیشانیوں سے مٹ نہیں سکتا؛ اُن میں سے پہلا جرم یہ تھا کہ افریقہ سے حبشی غلاموں کے جہاز بھر بھر کر نئی دنیا کے کھیتوں میں مزدوری کرنے کے لیے پہنچاتے رہے؛ دوسرا جرم یہ تھا کہ یہودیوں کی جو آبادی یورپ کی سر زمینوں میں جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھی، اُس کے استیصال میں لگے رہے۔

مغربی دنیا اور یہودیت کے درمیان مقابلے کا الم انگیز نتیجہ در اصل انسان کے ابتدائی گناہ اور مجلسی احوال کے ایک خاص اجتماع کے درمیان تعامل کا کرشمہ تھا، ہمارا کام یہ ہے کہ آخری امر کی یہاں توضیح کر دیں۔

یہودیت جس شکل میں مغربی مسیحیت سے متصادم ہوئی، وہ بالکل ایک غیر معمولی مجلسی مظہر تھا۔ یہودیت ایک ایسی تہذیب ہے جو متحجر باقیات میں سے تھی اور جو ہر شکل میں معدوم ہو چکی تھی؛ یہودیہ میں ایک محدود سریانی ریاست سے یہودیت نکلی اور یہ عبرانی، فونیقی، آرامی اور فلسطینی گروہوں میں شامل تھی۔ سریانی معاشرے کو بابلی اور یونانی ہمسایوں کے ساتھ تصادم سے جو مہلک صدمے پہنچ چکے تھے، اُن سے باقی سب گروہ مٹ گئے اور اُن کی ریاستیں بھی قائم نہ رہیں لیکن یہودیت نے ان صدموں کے بعد اپنے لیے اجتماعی بقا کا ایک خاص بندوبست کر لیا؛ چنانچہ ریاست اور ملک چھن جانے کے بعد بھی یہ لوگ بہ دستور غیر ملکی اکثریتوں اور غیر ملکی حکمرانوں کے درمیان زندہ رہے، یہودیوں کا یہ کامیاب رد عمل اپنی

نوعیت کا کوئی یگانہ واقعہ نہ تھا - جس طرح وہ لوگ اسلامی اور مسیحی دنیاؤں میں اپنی حفاظت کرتے رہے اسی طرح پارسیوں نے بھی ہندوستان میں اپنی بقا کا بندوبست کر لیا تھا ، وہ بھی اسی سریانی معاشرے کے متحجر باقیات میں سے تھے -

پارسیوں کا تعلق ایران سے تھا ، وہ سریانی تہذیب کے حلقہ بگوش بن گئے اور اسے ھخامنشی سلطنت کی شکل میں ایک سلطنت عام عطا کی - یہودیوں کی طرح پارسیوں نے بھی ملک اور حکومت چھن جانے کے بعد زندہ رہنے کے عزم راسخ کا ثبوت پیش کر دیا - انھیں بھی سریانی دنیا اور ھمسایہ معاشروں کے پے در پے تصادم سے نقصان پہنچا ؛ جو تین صدیاں ۱۳۵ء پر ختم ہوئیں ، ان میں یہودیوں کی طرح پارسیوں کے زرتشتی اسلاف نے بھی یونانیت کو نکال باہر کرنے کی ناکام کوششیں کی تھیں - ناکامی کی جو سزا رومی سلطنت نے یہودیوں کو دی تھی ، وہی سزا زرتشتی ایرانیوں کو ساتویں صدی عیسوی میں ابتدائی دور کے مسلمان عرب حملہ آوروں نے دی[1] ؛ یہودیوں اور پارسیوں کی تاریخوں میں یکساں نازک دور آئے لیکن انھوں نے نئے اداروں اور مخصوص نئی سرگرمیوں کی بدولت اپنی اصل حیثیت برقرار رکھی ، انھیں اپنے نئے قانون میں نئے مجلسی سیمنٹ کے لیے مسالا مل گیا - اگرچہ ان کے آبا و اجداد کو جگہ جگہ سے نکالا گیا اور اس طرح ان پر پے در پے اقتصادی تباھیاں نازل ہوئیں لیکن انھوں نے جلاوطنی میں بھی تجارت اور دوسرے کاروبار کی ایسی صلاحیت پیدا کر لی جو ابتدائی زرعی زندگی میں یہ پیدا نہیں کر سکتے تھے -

یہودی اور پارسی گروہ ھی معدوم سریانی معاشرے کے متحجر باقیات نہ تھے ، مسیحیت کی تاسیس اور ظہور اسلام کی درمیانی مدت میں مسیحی "ملحدوں" نے بھی یونانیت کے خلاف سرگرمیوں کا سلسلہ جاری کیا تھا ؛

۱- یہ بالکل غلط ہے کہ عربوں نے پارسیوں کو باہر نکالا یا سزا دی ، بعض لوگ خود لڑائیوں سے ڈر کر باہر نکل گئے اور انھیں دوبارہ واپس جانے کا حوصلہ نہ ہوا - کروڑوں ایرانی اپنے وطنوں میں موجود رہے اور ان پر قطعاً کوئی آفت نازل نہ ہوئی بلکہ ان کے لیے پہلے زمانے سے بہتر زندگی کا انتظام ہو گیا (مترجم) -

ان سرگرمیوں کی وجہ سے نسطوری[1] اور یعقوبی[2] کلیسا پیدا ہوئے، جو اب تحجر کی شکل میں موجود ہیں - یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ محض سریانی معاشرہ ہی نہ تھا جس کی مختلف قوموں نے اپنی حکومتیں کھوئیں، وطنوں سے نکالے گئے اور مذہبی تنظیم نیز کاروبار کی سرگرمیوں کے باعث زندہ رہنے کا انتظام کر لیا؛ اجنبی عثمانی سلطنت کے دور تسلط میں مفتوح یونانی آرتھوڈکس مسیحی بھی ایک حد تک اپنے وطن سے نکالے گئے تھے، انھوں نے اپنی مجلسی تنظیم کے اصول میں تبدیلیاں کر لیں اور نئی اقتصادی سرگرمیاں شروع کر دیں، اس طرح وہ ویسے ہی گروہ بننے کے قریب پہنچ گئے جن کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں -

سلطنت عثمانیہ میں ملتوں کا جو نظام جاری ہوا تھا، وہ درحقیقت معاشرے کی فرقہ وار تنظیم ہی کی ایک منظم تعبیر تھا؛ یہ معاشرہ سریانی دنیا میں خود بخود پیدا ہوا جب کہ سریانی نظام سلطنت بالکل ملیامیٹ ہو چکا تھا اور اشوریوں کی عسکریت کے حملوں نے سریانی اقوام کو باہم خلط ملط کر دیا تھا، بعد ازاں معاشرے کا نظام نئے سرے سے تیار کیا گیا جس کے مختلف جغرافیائی حلقوں میں ملی جلی قومیں آباد تھیں - اس سے پیشتر مختلف قومیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں جغرافیائی حیثیت سے الگ تھلگ تھیں اور انھیں لشتم پشتم اکٹھے کر دیا گیا تھا، یہی تنظیم سریانی معاشرے سے ایرانی اور عرب مسلمان جانشینوں کو ملی تھی اور یہی تنظیم عثمانی، ایرانی، مسلم بانیان سلطنت نے پامال شدہ آرتھوڈکس مسیحیت پر عائد کی -

اس تاریخی تبصرے سے واضح ہو چکا ہے کہ یہودیوں کے جن چھوٹے چھوٹے گروہوں کو مغربی مسیحیت سے سابقہ پڑا، وہ کوئی یگانہ مجلسی مظہر نہ تھے بلکہ اُس قومیت کا ایک نمونہ تھے جو اسلامی دنیا میں نیز پوری مغربی مسیحیت کے اندر ایک معیاری نمونہ بن چکی تھی - اب سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا یہودیت اور مغربی مسیحیت کے درمیان الم انگیز مقابلے کا

۱- Nestorian عیسائیوں کا ایک فرقہ جسے موحد مانا جاتا ہے (مترجم) -

۲- Monophysite، انھیں عام طور پر یعقوبی کہا جاتا ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دو فطرتیں نہیں یعنی الوہی اور انسانی بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نئی فطرت پیدا ہو گئی ہے (مترجم) -

پس منظر فریقین کی خصوصیات کا پس منظر نہ تھا۔

اس سوال کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کی تاریخ میں تین تعجب انگیز پہلو ہیں اور یہ تینوں یہودیت اور مغربی اقوام کے تعلقات کی تاریخ سے مطابقت رکھتے ہیں: اول مغربی معاشرہ ان قوموں کے میل جول سے بنا جو جغرافیائی اعتبار سے الگ تھلگ تھیں اور ان کی اپنی اپنی حکومتیں تھیں؛ دوم اس معاشرے نے آہستہ آہستہ سراسر دیہاتی کسانوں اور مالکان اراضی کے معاشرے کے بجائے فن کاروں اور سرمایہ داروں کے سراسر شہری معاشروں کی حیثیت اختیار کر لی؛ سوم یہ قوم پرور اور متوسط طبقے کا نمائندہ مغربی معاشرہ قرون وسطیٰ سے یکایک ظہور پذیر ہوا جب اسے کوئی حیثیت حاصل نہ تھی اور انتہائی تیزی سے پوری دنیا پر چھا گیا۔

مغربی مسیحیت کا نصب العین یہ تھا کہ ایک متحد گروہ انسانیت ایک خاص علاقے میں موجود ہو؛ اس نصب العین میں اور سامیت کی مخالفت میں جو داخلی تعلق ہے، اس کا اظہار جزیرہ نمائے ہسپانیہ اور پرتگال کی یہودی آبادی کی تاریخ میں ہوتا ہے۔

جب مغربی گاتھ اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر ۵۸۷ء میں کیتھولک بن گئے تو ان کے اور رومیوں کے درمیان جو خلیج حائل تھی، وہ پاٹ دی گئی۔ اس وقت سے مغربی گاتھوں کی متحدہ عیسائی جماعت اور یہودی ملت کے درمیان تناؤ شروع ہو گیا؛ اس تناؤ میں اضافے کا نشان ہمیں ان قوانین سے ملتا ہے جو یہودیوں کے خلاف جاری کیے گئے حالانکہ مغربی گاتھوں میں انسانی ہمدردی کا مادہ ترقی کر گیا تھا اور وہ غلاموں کو مالکوں کے جبر و تشدد سے بچانے کے لیے بھی خاص قوانین جاری کر رہے تھے۔ یہ اخلاق اعتبار سے سر بلند کرنے والے اور اخلاق اعتبار سے گرانے والے قوانین اس امر کی شہادت تھے کہ کلیسا کا اثر حکومت کے کاروبار پر پڑ رہا تھا؛ ان حالات سے مجبور ہو کر ہسپانیہ کے یہودیوں نے شمالی افریقہ کے ہم مذہبوں کے ساتھ سازش کی اور مسلم عربوں کو حملے کے لیے دعوت دے دی۔ ہم پورے وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ عرب اس دعوت کے بغیر بھی فتح و تسخیر کے پھریرے اڑاتے ہوئے ضرور ہسپانیہ پہنچ جاتے؛ بہ ہر حال وہ آئے اور پانچ سو سال تک (۷۱۱ء–۱۲۱۲ء) جزیرہ نمائے ہسپانیہ و پرتگال میں ایک ایسی اسلامی حکومت قائم رہی جس کے ماتحت خود مختار یہودی

آبادی کسی نمایاں خصوصیت کی حامل نہ تھی۔

عربوں کی اس فتح و تسخیر کا مجلسی اثر یہ ہوا کہ یہودی پھر اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے اور وہاں افقی اعتبار سے متحدہ معاشرہ از سر نو قائم ہو گیا جو فاتحین سریانی دنیا سے اپنے ساتھ لائے تھے لیکن یہودیوں کو مسلمانوں کے ماتحت جو فلاح و بہبود حاصل ہوئی تھی، وہ اسلامی حکومت ختم ہو جانے کے بعد قائم نہ رہی اس لیے کہ قرون وسطٰی کے وہ کیتھولک مسیحی بربری جنھوں نے اندلس کی اموی خلافت کو مسخر کیا تھا، ایک یک جنسی دولت اقوام کو اپنا خاص نصب العین بنا چکے تھے؛ چنانچہ ۱۳۹۱ء اور ۱۴۹۷ء کے درمیان یہودیوں کو یا تو اس پر مجبور کیا گیا کہ جلا وطنی اختیار کر لیں یا انھوں نے عیسائیت کے حلقہ بگوش بن کر اپنے آپ کو محفوظ کیا۔

فرقہ وار لحاظ سے وحدت کا نصب العین مغربی مسیحیوں کے پیش نظر تھا، اسی وجہ سے وہ اجنبی یہودیوں کو اپنے درمیان خوش دلی سے رکھنے پر آمادہ نہ ہوئے؛ اس سیاسی مقصد کی تقویت کے لیے اقتصادی اور مجلسی محرکات بھی پیدا ہو گئے۔

مغربی معاشرے کی پیدائش گاہ یونانی دنیا کا وہ دور افتادہ خطہ تھی جہاں یونانیوں کی شہری ثقافت جڑ نہیں پکڑ سکی تھی؛ رومی سلطنت کے مغربی صوبوں میں ابتدائی دور کی زرعی بنیادوں پر شہری زندگی کا جو ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تھا، وہ محرک ہونے کے بجائے پریشانی کا باعث بن گیا۔ رومیوں کا بنایا ہوا یہ اجنبی ڈھانچا اپنے ہی بوجھ کے نیچے دب کر منہدم ہو گیا؛ چنانچہ مغربی دنیا اسی پست اقتصادی سطح پر پہنچ گئی جس پر وہ پہلے بیٹھی تھی یعنی اس زمانے سے پیشتر جب یونانیت نے کوہستان ایپی نائن[1] کے پار یا ٹرھینی[2] سمندر کے آگے اپنی تہذیب کی تخم ریزی شروع کی تھی۔

۱- Appennines، اٹلی کا سلسلہ کوہستان۔ اس لفظ کے لغوی معنی ریڑھ کی ہڈی کے ہیں گویا اٹلی میں اس سلسلۂ کوہ کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے (مترجم)۔

۲- Tyrrhenian Sea، بحیرۂ روم کا وہ حصہ جو اٹلی، سسلی، کارسیکا اور سارڈینیا کے درمیان ہے (مترجم)۔

اس اقتصادی مصیبت کے دو نتیجے نکلے : اول مغربی مسیحی دنیا میں یہودی پہنچ گئے اس لیے کہ اپنی تجارتی صلاحیت اور تنظیمی خصلت کی بنا پر انھیں مغربی دنیا میں روزی پیدا کرنے کا اچھا ذریعہ نظر آتا تھا ؛ دوم دوسرے مرحلے پر غیر یہودی مغربی آبادی نے یہودیوں کے دولت خیز وسائل میں مہارت پیدا کر لی اور یہودیوں کا کاروبار وہ خود سنبھالنے لگے ۔

زمانہ گزرتا گیا اور مغربی دنیا کی غیر یہودی آبادی یہودیوں کے اقتصادی مقاصد پر زیادہ سے زیادہ عزم و ارادہ کے ساتھ کار بند ہوتی گئی ، اس سے غیر معمولی فوائد حاصل کیے جن کے تصور سے بھی دلوں میں سنسنی پیدا ہوتی ہے ۔ بیسویں صدی عیسوی میں مغربی اقوام کا مشرقی ساقہ بھی اقتصادی صلاحیت کے نصب العین کی طرف طویل مسافت میں شکست کھا چکنے کے بعد ایک ناگہانی تبدیل ہیئت پر مجبور ہوا ؛ یہ تحریک ایک ہزار سال پیشتر شمالی اٹلی اور بلجیم کے علمداروں نے بھی چلائی تھی اور اسے یکساں موزونیت کے ساتھ جدیدیت بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور یہودیت بھی ۔ مغرب کی تاریخ میں دور جدید کی مجلسی حیثیت اختیار کر لینے کا نشان یہ ہے کہ انٹونیو کی ایک نئی جماعت پیدا ہوئی ، اس نے شائیلاک کا پورا کام سنبھال لیا ، بعد ازاں وہ جماعت شائیلاک کو باہر نکال دینے کے لیے مضطرب ہو گئی[1] ۔

۱۔ یہاں مصنف نے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے "مرچنٹ آو وینس" کی کہانی پیش نظر رکھی ہے ۔ انٹونیو نے شائیلاک یہودی سے کچھ روپیہ قرض لیا تھا اور اقرار یہ تھا کہ روپیہ بر وقت ادا نہ ہوگا تو انٹونیو کو آدھ سیر گوشت اپنے جسم سے کاٹ کر دینا ہوگا ۔ روپیہ ادا نہ ہو سکا ، شائیلاک نے آدھ سیر گوشت کے لیے مطالبہ پیش کر دیا ، معاملہ عدالت تک پہنچا ۔ انٹونیو کی محبوبہ پورشیا نے وکیل کا بھیس بدل کر مقدمے کی پیروی کی اور شائیلاک سے کہا کہ بے شک انٹونیو کے جسم سے آدھ سیر گوشت کاٹ لو لیکن کم یا زیادہ ہوگا تو اس کی ذمہ داری قبول کرنی ہوگی ؛ غرض شائیلاک نے قرض معاف کر کے پیچھا چھڑایا ۔ یہاں مصنف کا مدعا یہ ہے کہ یہودیوں کا سارا کام دوسرے لوگوں نے سنبھال لیا اور یہودیوں کو خارج کر دیا (مترجم) ۔

یہودیوں اور مغربی دنیا کے غیر یہودیوں کے درمیان اس اقتصادی کشمکش کے بھی عام ڈراموں کی طرح تین ہی ایکٹ ہیں ۔ پہلے ایکٹ میں یہودی حد درجے غیر ہر دل عزیز سمجھے جاتے تھے اور ان کے بغیر گزارا بھی نہ ہو سکتا تھا ، تاہم ان کے ساتھ بد سلوکی ایک خاص دائرے تک محدود تھی اس لیے کہ ظلم کرنے والے غیر یہودیوں کا کام اقتصادی لحاظ سے یہودیوں کے بغیر چل نہ سکتا تھا ۔ دوسرے ایکٹ کا افتتاح یکے بعد دیگرے مغربی دنیا کے تمام ملکوں میں ہوا یعنی غیر یہودی سرمایہ داروں نے تجربے اور ہنر مندی کے علاوہ ضرورت کے مطابق روپیہ بھی حاصل کر لیا اور وہ مقامی یہودیوں کی جگہیں غصب کرنے کے قابل بھی ہو گئے ۔ اس مرحلے پر ——— جو انگلستان میں تیرھویں صدی میں پیش آیا ، ہسپانیہ میں پندرھویں صدی میں ، پولینڈ اور ہنگری میں بیسویں صدی میں ——— غیر یہودی سرمایہ داروں نے اپنی تازہ حاصل کی ہوئی طاقت سے کام لے کر یہودی حریفوں کو میدان سے خارج کر دیا ۔ تیسرے ایکٹ میں غیر یہودی سرمایہ دار اس طرح جم کر بیٹھ چکے تھے اور یہودیوں کے اقتصادی فنون میں انھوں نے اس درجے مہارت حاصل کر لی تھی کہ یہودیوں سے مقابلے کا روایتی خطرہ بالکل محو ہو گیا ۔ غیر یہودی قومی اقتصادیات کی خدمت کے سلسلے میں انھیں یہودیوں کی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے میں بھی قطعاً کوئی باک نہ رہا ؛ چنانچہ ٹسکنی[1] کی حکومت نے ہسپانیہ اور پرتگال سے نکلے ہوئے یہودی پناہ گزینوں کو ۱۵۹۳ء کے آس پاس لیگھارن[2] میں آباد ہونے کی اجازت دے دی تھی ، ہالینڈ اپنے دروازے ۱۵۷۹ء میں کھول چکا تھا ، انگلستان اتنا قوی ہو چکا تھا کہ ۱۲۹۰ء میں یہودیوں کے اخراج کا حکم دے دیا ، پھر قوت پر اعتماد ہی کے پیش نظر ۱۶۵۵ء میں انھیں دوبارہ آ بسنے کی اجازت دے دی ۔

تاریخ مغرب کے دور جدید میں یہودیوں کی اس اقتصادی آزادی کے بعد

۱- Tuscany ، اٹلی کا ایک حصہ جس میں فلارنس ، پسا ، لیگھارن وغیرہ شامل تھے ۔

۲- Leghorn ، اٹلی کی مشہور بندرگاہ جو فلارنس کے سامنے واقع ہے اور اس نام کا ایک صوبہ بھی ہے ۔

مجلسی اور سیاسی آزادی کا دور بھی جلد آ گیا ، یہ مغرب کی مسیحی دنیا میں مذہبی اور نظریاتی انقلابات کا ایک طبعی نتیجہ تھا ؛ پراٹسٹنٹوں کی تحریک اصلاح دین نے کیتھولک کلیسا کے اتحاد کے حریفانہ اتحاد میں رخنے پیدا کر دیے تھے ، سترھویں صدی میں انگلستان اور ہالینڈ ۔ اس بنا پر پناہ گزین یہودیوں کا استقبال کیا کہ انھیں ان پراٹسٹنٹ ملکوں کے رومن کیتھولک دشمنوں کا مظلوم سمجھا جاتا تھا ۔ بعد ازاں پراٹسٹنٹ اور کیتھولک ملکوں میں یکساں رواداری کی روح پیدا ہو گئی ، اس سے یہودیوں نے پورا فائدہ اٹھایا ۔ ۱۹۱۸ء میں یہودیوں کو زندگی کی تمام سطحوں پر یکساں آزادی مل چکی تھی اور دور جدید کی پوری مغربی دنیا کے تمام حلقوں میں وہ جملہ حقوق سے استفادے کے حق دار مانے جا چکے تھے یعنی وقت آ گیا تھا کہ عیسائی اور یہودی خوش دلی سے ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی ۔ جس ڈرامے کو ہم تین ایکٹ کا کھیل سمجھتے تھے اور اس کا انجام نہایت خوشگوار تھا ، اس کا چوتھا ایکٹ شروع ہو گیا جو پہلے تمام ادوار سے بدرجہا زیادہ ہولناک تھا ۔ سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہوا ؟

ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ یہودیوں اور مغربی دنیا کے غیر یہودیوں کے درمیان قانونی امتیازات اگرچہ سرکاری طور پر اٹھ چکے تھے لیکن نفسیاتی امتیازات بہ دستور باقی رہے ؛ ایک غیر مرئی محدود حلقہ ضرور موجود تھا جس میں مغربی دنیا کے غیر یہودی یہودیوں کو بند رکھنا چاہتے تھے ، اسی طرح یہودی بھی بہ طور خود کوشش کر رہے تھے کہ غیر یہودیوں سے الگ تھلگ رہیں ؛ جو معاشرہ قانونی لحاظ سے متحد ہو چکا تھا ، اس میں یہودی اپنے آپ کو مختلف اعتبارات سے باہر نکالا ہوا پاتے تھے ۔ دوسری طرف غیر یہودیوں کا احساس یہ تھا کہ یہودیوں نے فری میسنوں کی طرح اپنا ایک علٰحدہ گروہ بنا رکھا ہے اور متحدہ معاشرے کے ارکان کو جن باتوں سے مساوی حیثیت میں فائدہ اٹھانے کا حق ہے ، ان کے لیے تو یہودی دعویدار ہیں لیکن اپنے حلقے میں کسی کو وہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ؛ غرض دونوں گروہوں نے طرز و روش کا دو گونہ سلسلہ جاری رکھا یعنی ہر گروہ اپنے آدمیوں کے ساتھ اعلیٰ درجے کا برتاؤ کرتا اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ سراسر غیر مناسب برتاؤ کیا جاتا اگرچہ برائے نام تمام شہری برابر تھے اور مجلسی

اعتبار سے اُن کے درمیان کوئی امتیازی حد قائم نہ تھی - ریاکاری کے اس نئے لباس نے عدم مساوات کے پرانے گناہ کو ایک حد تک چھپا لیا لیکن دل سے ہر فریق دوسرے کے خلاف نفرت کا برتاؤ کرتا البتہ باہم دگر خوف و ہراس باقی نہ رہا تھا؛ عمومی حیثیت میں کہا جا سکتا ہے کہ صورت حال اگرچہ اضطراب انگیز تھی لیکن پہلے کی طرح دونوں فریقوں کے لیے بار خاطر نہ تھی -

دونوں گروہوں کے درمیان تعلقات کی بے یقینی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس حلقے میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب غیر یہودیوں کے مقابلے میں ذرا بھی بڑھ جاتا، وہاں سامیت کے خلاف جوش و خروش شروع ہو جاتا - یہ رجحان ۱۹۱۴ء میں لندن اور نیو یارک دونوں جگہ نمایاں ہوا؛ ۱۸۸۱ء سے یہودی روسی سلطنت کے علاقوں پولینڈ اور لتھوانیا کو چھوڑ چھوڑ کر چلے آ رہے تھے کیوں کہ ان پر روسیوں کے ظلم و جور شروع تھے - ۱۹۱۸ء کے بعد اس تحریک نے جرمنی کے علاوہ آسٹریا کے جرمن علاقوں میں نازک صورت اختیار کر لی اس لیے کہ یہودی گیشیا، پولینڈ اور دوسرے مشرق علاقوں سے آ آ کر آباد ہوتے رہے تھے - جرمنوں کے اندر سامیت کی مخالفت بھی ایک موثر عامل تھی جس نے جرمنی کے نیشنل سوشلسٹوں کو بر سر اقتدار پہنچایا - بعد ازاں نیشنل سوشیلسٹوں نے یہودیوں کو کاملاً ختم کر دینے کی جو تحریک جاری کی، اس پر مفصل بحث یہاں ضروری نہیں، حقائق و واقعات جتنے دردناک ہیں، اتنے ہی عوام پر روشن ہیں؛ قومی پیمانے پر شرانگیزی اور برائی کا یہ ایسا مظاہرہ تھا جس کی کوئی مثال تا حال تاریخ پیش نہیں کر سکی -

دور جدید کی مغربی قومیت نے مغربی دنیا کے یہودیوں پر بہ یک وقت دو بازوؤں سے حملہ کیا؛ اس قومیت نے مغربی دنیا کے یہودیوں کو اپنی طرف کھینچا، ساتھ ہی اُن پر دباؤ ڈال کر ایک مخصوص قومیت کی ایجاد پر پہنچا دیا جسے ہم مغربیت مآبی کی اجتماعی شکل قرار دے سکتے ہیں اور یہ انفرادی مغربیت مآبی سے جداگانہ شے ہے - مغربیت مآبی کا مطلب یہ تھا کہ ہر یہودی کو مغربی دنیا کا سرمایہ دار بنا دیا جائے اور اس کا مذہب یہودیت ہی رہے؛ متبادل طریقہ یہ تھا کہ یہودیوں کی آبادی یا اس کے ایک حصے کو ایک طرح کی محدود قومی ریاست بنا دیا جائے جس میں صرف یہودی

شامل ہوں - یہ انداز فکر و عمل اس امر کی شہادت تھا کہ مغربی دنیا کے یہودیوں کی آزادی حقیقی صورت اختیار کر چکی تھی اور وہ مغربیت کے مروجہ مقاصد کا اثر قبول کرنے لگے تھے - صیہونیت کے بانی تھیو ڈور ہرزل[1] کی شہادت کے مطابق یہ تحریک اس لیے جاری ہوئی تھی کہ اندیشہ پیدا ہو چکا تھا کہ شاید قومیت کے دروازے یہودیوں پر بند ہو جائیں ، اس طرح انھیں معاشرے میں جذب کر لینے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور مغربی دنیا کے غیر یہودیوں میں قومیت کے ساتھ لبرل ازم کی تحریک بہت زور پر چلی آ رہی تھی - اس واقعے کو محض اتفاق نہ سمجھنا چاہیے کہ یہودی صیہونیت کی تحریک اسی جغرافیائی حلقے میں اٹھی تھی جہاں سے جرمنوں میں سامیت کی مخالفت کی نئی تحریک جاری ہوئی یعنی ۱۹۱۸ء سے پیشتر کی آسٹروی سلطنت کے وہ علاقے جن کے لوگ جرمن زبان بولتے تھے -

تاریخ جن عبرت ناک واقعات سے لبریز ہے ، اُن میں سے کوئی واقعہ انسانی فطرت کی برائیوں پر ایسی روشنی نہیں ڈالتا جتنا کہ یہودیوں کی نئے نمونے کی قومیت ڈالتی ہے ؛ یہودی نسل پر جو ظلم و ستم ہوئے ، اُن میں سے حد درجے خوفناک ترین ظلم و ستم کا تختۂ مشق بننے کے ساتھ ہی انھوں نے فلسطینی عربوں کے مقاصد کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے ، عربوں کا گناہ اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ فلسطین ان کا آبائی وطن تھا - یہودیوں نے نازیوں کے ھاتھوں جو مصیبتیں برداشت کیں ، اُن سے صیہونیوں نے صرف ایک سبق حاصل کیا یعنی وہ اس جرم کے ارتکاب سے باز نہ رہ سکے جس کے ہدف خود بن چکے تھے بلکہ انھوں نے اپنے سے کمزور قوم پر بے تکلف ظلم و ستم شروع کر دیے - اسرائیلی یہودیوں نے اس حد تک تو نازیوں کی پیروی نہ کی کہ فلسطینی عربوں کو" قیدیوں کے تادیبی کمپوں اور گیس کی کارگاھوں میں بند کر کر کے بالکل ختم کر دیتے لیکن کم و بیش پانچ لاکھ آدمیوں سے وہ زمینیں چھین لیں جو اُن کے آبا و اجداد کے زمانے سے اُن کے قبضے میں چلی آ رہی تھیں اور جن میں وہ پشت ہا پشت سے کھیتی باڑی کر رہے تھے - بے چارے عربوں کو بھاگنا پڑا ، وہ جائدادیں اُٹھا کر ساتھ نہ لے جا سکتے

۱- Theodor Herzl ، اسے سیاسی صیہونیت کا بانی مانا جاتا ہے ، ۱۸۶۰ء میں بہ مقام بوڈاپسٹ میں پیدا ہوا ، ۱۹۰۴ء میں وفات پائی (مترجم) -

تھے ، نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملکیت سے بالکل محروم ہو گئے اور اب اُن لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے وطن سے باہر نکالے جا چکے ہیں ۔

صیہونیت کے تجربے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس نکتے کا ثبوت مل گیا جس کا ذکر اس کتاب کے ابتدائی حصے میں آ چکا ہے یعنی یہودیوں نے جو خصوصیتیں اپنے اندر پیدا کر لیں ، وہ مغربی دنیا میں اُن کی جداگانہ آبادی کے مخصوص حالات کا نتیجہ تھیں ، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ان کی نسلی میراث تھیں ۔ صیہونیت کی تحریک میں متضاد پہلو یہ ہیں کہ جب یہ ایسی قومیت کی تعمیر میں مشغول تھی جسے کاملاً یہودیوں کے لیے مخصوص رکھنا تھا ، وہاں انتہائی سرگرمی سے یہ کوشش بھی کی جا رہی تھی کہ یہودیوں کو مغربی دنیا کی غیر یہودی آبادی میں ضم کر دیا جائے اس لیے کہ یہودی یا تو مغربی دنیا کے ایسے سرمایہ دار بننے لگے تھے جن کا مذہب یہودی تھا یا لا ادری سرمایہ دار ۔ اصل تاریخی یہودی وہ تھے جن کی آبادیاں جگہ جگہ پھیلی ہوئیں تھیں ؛ امتیازی یہودی خصائص و اوصاف یعنی موسوی قانون کی پوری پابندی اور تجارت و مالیات میں انتہائی نیکی ، یہ خصائص ایسے تھے جنھیں یہودیوں کی آبادیوں نے صدیوں کے تعامل سے مجلسی جادو کا درجہ دے دیا تھا ۔ جغرافیائی اعتبار سے بکھری ہوئی آبادی اسی معجز نما صلاحیت کے باعث زندہ رہی ؛ بعد کے دور میں مغربی دنیا کے جو یہودی بروے کار آئے ، خواہ اُن کا تعلق لبرل ازم سے تھا یا صیہونیت سے وہ اپنے تاریخی ماضی سے تعلقات منقطع کر رہے تھے اور صیہونیت کا قطع تعلق دونوں میں سے زیادہ وسیع تھا ؛ اُنھوں نے بکھری ہوئی آبادیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا اور ایک ایسی قوم کی تعمیر شروع کر دی جو خاص سر زمین میں بستی ہو ، بالکل ویسی ہی قومیت جیسی دور جدید کے مغربی پراٹسٹنٹ مسیحیوں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا جنوبی افریقہ کی یونین یا دولت مشترکہ آسٹریلیا میں پیدا کی ۔ صیہونیت پرور یہودی اپنے آپ کو غیر یہودی مجلسی ماحول سے وابستہ کر رہے تھے ؛ باقی رہا اُن کی مذہبی کتابوں کا معاملہ تو جو کچھ اُن کے دل میں پیدا ہوا وہ نہ تو موسوی قانون سے پیدا ہوا اور نہ یہودی انبیاء سے بلکہ وہ ان داستانوں کا نتیجہ تھا جو کتاب خروج اور کتاب یوشع میں بیان ہوئیں ۔

اس روحیت کو لے کر وہ ہر مشکل سے بے پروائی اختیار کرتے ہوئے

جوش و خروش کے ساتھ باہر نکلے اور دماغی کام کے بجائے محنت مزدوری کرنے پر آمادہ ہو گئے ، شہری باشندوں کے طور طریقے چھوڑ کر انھوں نے دیہاتی باشندوں کے طور طریقے اختیار کر لیے ، انھیں تجارت و دلالی کے بجائے پیداوار کا طریقہ پسند آیا ، وہ مالی کاروبار کے بجائے کھیتی باڑی کرنے لگے ، دکان داری کے بجائے جنگ جوئی اختیار کر لی ، شہادت کے بجائے دهشت انگیزی کا طریقہ انھیں زیادہ پسند آیا ، پرانے طور طریقوں کی طرح نئے طور طریقوں میں بھی انھوں نے حیرت انگیز استقامت اور استقلال دکھایا ۔ رہا یہ سوال کہ اسرائیلیوں کا (جیسا کہ فلسطینی یہودی اپنے آپ کو کہتے ہیں) مستقبل کیا ہے تو یہ صرف مستقبل ہی بتائے گا ؛ اردگرد کے تمام عرب اس بات پر تلے بیٹھے ہیں کہ ان اجنبیوں کو نکال باہر کر کے دم لیں گے اور ''ہلال زرخیز'' کے یہ عرب تعداد میں اسرائیلیوں سے بہت زیادہ ہیں لیکن فی الحال قوت و سرگرمی اور صلاحیت و ہنرمندی میں اسرائیلیوں سے پیچھے ہیں ۔

نیز اب تمام مسائل عالم گیر مسائل بن چکے ہیں ، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ سویٹ یونین اور جمہوریۂ امریکہ کا مفاد شرق اوسط میں کیا صورت اختیار کرے گا ؟ جس حد تک سویٹ یونین کا تعلق ہے اس سوال کے باب میں قبل از وقت کچھ کہنا مشکل نظر آتا ہے ؛ جس حد تک جمہوریہ امریکہ کا تعلق ہے ، اب تک اس کی فلسطینی پالیسی میں فیصلہ کن عامل یہ رہا ہے کہ دولت ، رسوخ اور تعداد میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان حد درجے تفاوت ہے ۔ امریکہ میں جتنے یہودی آباد ہیں ، اُن کے مقابلے میں عربوں کی تعداد بہت کم ہے ، لبنان کے مسیحی عربوں کو شامل کر لینے پر بھی تعداد میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ۔ جو یہودی امریکی شہروں میں آباد ہیں ، انھیں وسیع سیاسی اقتدار حاصل ہے ، یہ اقتدار ان کی تعداد سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے ؛ نیو یارک میں ان کی آبادی بہ طور خاص جمع ہے اور امریکہ کی داخلی سیاسیات میں ووٹوں کے مقابلے کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیویارک کو کلیدی حیثیت حاصل ہے ۔ غیر یہودی امریکی مدبروں کے یہ دلائل جمہوریۂ امریکہ کی جانب سے اس امداد کی پوری توجیہ پیش نہیں کر سکتے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ہر نازک دور میں امریکی حکومت یہودیوں کو دیتی رہی ؛ یہ پالیسی محض قدیم داخلی سیاسی سوچ بچار ہی کا عکس نہیں بلکہ ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ صحیح معلومات نہ رکھنے والوں انسانوں کے بے تعلق اور نظریاتی احساسات

کا بھی کرشمہ ہے۔ امریکہ میں نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی تکالیف کا اندازہ اس لیے کر لیا گیا کہ روزمرہ کی زندگی میں وہ یہودیوں سے پوری طرح آشنا تھے لیکن امریکہ میں اس نمونے کے عرب موجود نہ تھے جو فلسطینی عربوں کے معاملات کو اہلِ امریکہ پر موثر انداز میں واضح کر دیتے یعنی اس ضرب المثل کا ایک اور واضح ثبوت مل گیا کہ جو شخص موقع پر موجود نہ ہو بر سر خطا وہی ہوتا ہے۔

(VI) دور جدید کا مغرب اور مشرق بعید نیز امریکہ کی مقامی تہذیبیں :

ہم نے اب تک دور جدید کے مغرب کے ساتھ جن زندہ تہذیبوں کے مقابلے کا جائزہ لیا ، انھیں پہلے مغربی معاشرے سے سابقہ پڑا ، پھر دور جدید میں ان پر اس معاشرے کا اثر پڑنے لگا ؛ ہندو معاشرے کے سلسلے میں بھی ہمارا یہ قول درست ہے اگرچہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس معاشرے کے تعلقات دور جدید کے مغرب سے مقابلتاً کم رہے۔ اس کے بر عکس امریکاؤں میں مغرب کے وجود سے کامل بے خبری اس وقت تک جاری رہی جب تک دور جدید کے مغربی بحر پیما امریکاؤں کے سواحل پر نہ پہنچ گئے ؛ اسی طرح چین اور جاپان میں بھی مغرب سے ناشناسائی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اہل مغرب کے جہاز ان ملکوں کی بندرگاہوں میں لنگر انداز نہ ہوئے۔ لہٰذا ابتدائی دور میں یہ کیفیت رہی کہ مغرب سے جو کچھ بھی آیا اسے شک و شبہ کے بغیر قبول کر لیا گیا اور جو چیزیں اہل مغرب لائے ، ان میں جدت و ندرت کی کشش موجود تھی لیکن کچھ مدت کے بعد حالات نے مختلف صورتیں اختیار کر لیں ؛ اس مشکل مقابلے میں امریکی تہذیبیں ناکام رہیں اور مشرق بعید کی تہذیبیں کامیابی سے سرفراز ہوئیں۔

جن ہسپانوی فاتحین نے وسطی امریکہ اور کوہستان آنڈیز کی دنیاؤں کو مسخر کیا ، ان کے مد مقابل اچھے ہتھیاروں سے بڑی حد تک محروم تھے اور اُنھیں ہدف بن جانے کا کوئی اندیشہ بھی نہ تھا ، ہسپانویوں نے زبردست جنگی قوت سے کام لے کر انھیں مطیع بنا لیا ؛ پھر وہ آبادی کے ان عناصر کو بیخ و بن سے اکھاڑنے لگے جو مقامی ثقافتوں کے حامل تھے اور انھوں نے اپنے آپ کو ایک اجنبی مقتدر اقلیت کی حیثیت میں مسلط کر کے تمام دیہاتی آبادی کو مغربی مسیحیت کے معاشرے میں داخلی پرولتار کا درجہ دے دیا۔ ہسپانیہ سے جو مذہبی اور اقتصادی ظالع آزما وہاں پہنچے ، تمام

مقامی آبادی کو محنت مزدوری کے لیے ان کے حوالے کر دیا گیا، سمجھوتہ یہ تھا کہ یہ زمیندار مبلغین مسیحیت ان لوگوں کو مسیحیت کی رومن کیتھولک شکل کے حلقہ بگوش بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ جو مقامی ثقافتیں بہ ظاہر مٹائی جا چکی تھیں، وہ پھر کسی نہ کسی شکل میں ظہور نہ کر آئیں گی جس طرح سریانی معاشرہ از سر نو تہ سے ابھر آیا اور یونانی اقتدار کے ماتحت ایک ہزار سال گزار چکنے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو از سر نو منظم کر لیا۔

اس کے برعکس مشرق بعید کے دو معاشرے (چینی معاشرہ اور جاپانی معاشرہ) ابتدائی بے خبری کے باعث مہلک خطرے میں مبتلا ہونے کے باوجود زندہ رہے؛ انھوں نے مغربی تہذیب کا موازنہ کیا اور اسے خوب تولا، جب دیکھا کہ یہ کم وزن ہے تو فیصلہ کر لیا کہ اس کو ٹھکرا دیں گے۔ اس عزم کو لباس عمل پہنانے کے لیے انھوں نے ضروری سامان فراہم کیے اور اس سے میل جول نہ رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہو گئے لیکن جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوا، یہ پوری کہانی نہ تھی۔ مغرب نے اپنے آپ کو جس شکل میں پیش کیا تھا، اس سے تعلق منقطع کر لینے کی بنا پر چین اور جاپان مغربی مسئلے کا آخری فیصلہ نہ کر سکے؛ مغرب نے ابتدائی شکست کھانے کے بعد اپنے آپ کو نئی شکل دے لی اور وہ دوبارہ مشرق ایشیا کے افق پر نمودار ہو گیا، اب اس نے مذہب کے بجائے فن کاری کو اپنا خاص تحفہ قرار دے لیا گویا مشرق بعید کے معاشروں کے سامنے معاملے نے یہ صورت اختیار کر لی کہ یا تو انھیں اس نئی مغربی فن کاری میں کامل مہارت کا درجہ حاصل کرنا چاہیے یا اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔

مشرق بعید کے اس ڈرامے میں چینیوں اور جاپانیوں نے بعض صورتوں میں یکساں عمل کیا اور بعض میں ان کے طریقے ایک دوسرے سے مختلف رہے۔ مشابہت کا ایک نمایاں پہلو ڈرامے کے دوسرے ایکٹ میں پیش آیا یعنی چین اور جاپان دونوں ملکوں میں دور جدید کے مغرب کی لادینی ثقافت نیچے سے اوپر کی طرف جاری ہوئی؛ چین میں مانچو سلطنت اور جاپان میں ٹوکوگاوا شوگنیٹ دونوں کو روس کے پیٹر اعظم کے برعکس سبقت سے محروم رہنا پڑا۔ اس ایکٹ کے دوسرے سین میں چین کے برعکس جاپان نے پیٹر کا

طریقہ اختیار کر لیا؛ پہلے ایکٹ میں یعنی سولھویں صدی میں جو مقابلے پیش آئے، ان میں مشرق بعید کے ان دونوں معاشروں نے ابتدا ھی سے مختلف طرز عمل اختیار کر لیا تھا، انھوں نے شروع میں عارضی طور پر اور صرف آزمائشی حیثیت میں خیر مقدم کیا، پھر سولھویں اور سترھوبں صدی میں مغربی ثقافت کے مذہبی حصے کو رد کر دیا؛ اس سلسلے میں چین میں جو ثقافتی تحریک جاری ھوئی وہ اوپر سے نیچے کی طرف تھی اور جو جاپان میں جاری ھوئی وہ نیچے سے اوپر کی جانب تھی۔

اگر کوئی شخص مشرق بعید کے ان دونوں معاشروں کو سامنے رکھ کر دور جدید کے مغرب کے ساتھ چارصد سالہ تعلقات کا خاکہ تیار کرے تو معلوم ھوگا کہ اس خاکے میں چین کے بجائے جاپان کے خطوں میں نشیب و فراز زیادہ ھوں گے؛ مغربی ثقافت کے روبرو حوالگی کا طریقہ اختیار کرنے کے سلسلے میں یا اجنبیوں سے بیزاری کے دور میں بہ سلسلہ علٰحدگی چینی کبھی اس حد تک نہ گئے جس پر جاپانی کاربند ھوتے رھے۔

سولھویں اور سترھویں صدی کے موڑ پر جب کہ جاپان کا سیاسی اتحاد نامکمل تھا، اسے یہ شدید خدشہ لاحق ھو گیا تھا کہ اجنبی فاتحین کہیں جبر و قوت سے کام لیتے ھوئے باھر سے سیاسی اتحاد قائم نہ کر دیں۔ ھسپانویوں نے ۱۵۶۵ء—۱۵۷۱ء میں فلپنیز کو فتح کر لیا تھا، ولندیز ۱۶۲۴ء میں فارموسا پر قابض ھو گئے تھے؛ ان واقعات سے صاف ظاھر تھا کہ جاپان کا حشر کیا ھو سکتا تھا۔ اس کے برعکس چین کا علاقہ بہت وسیع تھا اور اسے بر صغیر کی حیثیت حاصل تھی، اسے اس زمانے کے مغربی قزاقوں سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ ایسے بحری حملہ آور جن کے پاس جدید زمانے کے آلات و اسلحہ نہ تھے، سرسری پریشانی کا باعث کتنے ھی ھوتے لیکن ان کے بارے میں یہ نہ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی بڑا ملک فتح کر لیں گے۔ چین کی سامراجی حکومت کو اس زمانے میں جن خطرات سے حد درجے تشویش ھوئی، وہ یوریشیائی سطح مرتفع کی جانب سے یورشوں کا خطرہ تھا؛ جب سترھویں صدی میں منگ خاندان کی جگہ زیادہ سرگرم اور نیم وحشی مانچو خاندان نے لے لی تو مزید دو سو سال تک براعظم کے اندر سے حملے کا کوئی خطرہ پیدا نہ ھوا۔

چین اور جاپان کے جغرافیائی اور سیاسی مواقع کا یہ اختلاف اس حقیقت

کو واضح کرتا ہے کہ کیوں چین میں سترھویں صدی کے اختتام تک رومن کیتھولک مسیحیت کو دبانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی اور جب اسے دبایا گیا تو یہ کسی سیاسی خطرے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک مذہبی نزاع کا نتیجہ تھا ۔ اس کے برعکس جاپان میں رومن کیتھولک مسیحیت کو انتہائی مستعدی اور بے دردی سے دبا دیا گیا ، جاپان اور مغربی دنیا کے درمیان تمام تعلقات منقطع ہو گئے ، صرف ایک ولندیزی تعلق کا رشتہ باقی رہا ۔ جاپان میں جو نئی مرکزی حکومت قائم ہوئی ، اس کی طرف سے ضربوں کے تسلسل کا آغاز ہڈی اوشی[1] کے اُس فرمان سے ہوا جو ۱۵۸۷ء میں جاری کیا گیا تھا ، اس کا مدعا یہ تھا کہ تمام مغربی مسیحی مبلغوں کو جلا وطن کر دیا جائے ؛ اس سلسلے کے آخری فرمان ۱۶۳۶ء اور ۱۶۳۹ء میں جاری ہوئے جن کی رو سے جاپانیوں کے لیے باہر کا سفر ممنوع قرار پایا اور پرتگیزوں کو جاپان میں توطن سے روک دیا گیا ۔

چین کی طرح جاپان میں علٰحدگی کی پالیسی کا ترک نیچے سے اوپر کو شروع ہوا اور یہ مغرب کے سائینٹفک علوم کے ثمرات سے استفادے کے شوق کا کرشمہ تھا ؛ اس تحریک کے علم داروں میں سے بہتیروں کو فن کاری پر اعتماد و ایمان کی بدولت شہادت سے سابقہ پڑا اس لیے کہ ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان ممانعت کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا ۔ اس سے کچھ ہی دیر بعد ۱۸۵۳ء میں جاپان کے دروازے کھول دیے گئے تھے ؛ جاپان میں پوری تحریک دین و مذہب کے اثرات سے پاک تھی ۔ اس کے برعکس انیسویں صدی میں چین کے اندر جو تحریک جاری ہوئی ، وہ پراٹسٹنٹ مسیحی مشنریوں کی سرگرمی سے وابستہ تھی جو برطانوی اور امریکی تاجروں کے ساتھ آ گئے تھے ؛ ٹھیک اسی طرح پرتگیز جاپان پہنچے تھے تو ان کے ساتھ رومن کیتھولک مسیحی مبلغ چلے گئے تھے ۔ چین میں پراٹسٹنٹ مبلغوں کا اثر جاری رہا ؛ کومن تانگ کا بانی سن یٹ سن ایک پراٹسٹنٹ مسیحی کا بیٹا تھا ، ایک اَور پراٹسٹنٹ مسیحی چینی خاندان نے کومن تانگ کی بعد کی تاریخ میں بڑا زبردست کردار ادا کیا یعنی مدام سن یٹ سن آس کی بہن مدام چیانگ کائی شک اور اس کے بھائی ٹی ۔ وی سونگ نے ۔

۱- Hidey Oshi -

جاپان اور چین میں مغربیت کے لیے جو تحریکیں جاری ہوئیں، ان کے سامنے ایک حد درجے خوفناک کام یہ تھا کہ جو ہمہ گیر وطنی حکومت پہلے سے مضبوطی کے ساتھ قائم چلی آتی تھی، اس کی جگہ نئی حکومت قائم کی جائے؛ اس سلسلے میں جاپان کی تحریک کے داعی چینیوں کے مقابلے میں زیادہ ہشیار، زیادہ مستعد اور زیادہ قابل تھے - کموڈر پیری[1] کا بیڑا ۱۸۵۳ء میں جاپانی سمندروں کے اندر پہنچا تھا، اس سے پندرہ سال بعد ٹوگو گاوا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اس لیے کہ وہ پیش نظر حالات کے مطابق اپنا طرز عمل قائم نہ رکھ سکی، اس کی جگہ انھوں نے ایک ایسی حکومت مرتب کر دی جس نے اوپر سے نیچے تک ایک جامع مغربی تحریک کا بند و بست کر دیا حالانکہ یہ کام بہت مشکل تھا، چینیوں کو اس کام کا صرف نصف سابی حصہ پورا کرنے میں ایک سو اٹھارہ سال لگ گئے - ۱۷۹۳ء میں لارڈ میکارٹنی[2] کی سفارت پیکن پہنچی؛ یہ واقعہ بھی مغربیت کے بڑھتے ہوئے اثر کا ویسا ہی شاندار مظاہرہ تھا جیسا کہ ساٹھ سال پیشتر کموڈر پیری کے بیڑے نے خلیج یدو میں داخل ہو کر انجام دیا تھا - چین کے اندر قدیم حکومت ۱۹۱۱ء میں ختم ہوئی اور اس کی جگہ مغربی نمونے کی کوئی زبردست حکومت قائم نہ ہو سکی البتہ انارکی کا دور شروع ہو گیا جسے کامن تانگ پچیس سال (۱۹۲۳ء—۱۹۴۸ء) میں بھی ختم نہ کر سکی -

اس اختلاف احوال کو ہم چین پر جاپان کی فوجی برتری کے پیمانے سے ناپ سکتے ہیں؛ یہ برتری ۱۸۹۴ء—۱۸۹۵ء کی جنگ چین و جاپان میں نمایاں ہوئی اور پچاس سال بعد تک جاری رہی - اس نصف صدی میں فوجی نقطۂ نگاہ سے چین جاپان کے رحم و کرم پر تھا؛ اگرچہ کشمکش کے آخری دور میں پورے چین کی تسخیر جاپان کے وسائل سے متجاوز تھی لیکن یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر جاپان کی جنگی مشینری کو جمہوریۂ امریکہ کی قوت توڑ کر نہ رکھ دیتی تو تنہا چین کے لیے یہ مشکل تھا کہ اپنی بندرگاہیں یا صنعتی علاقے یا ریلیں جاپان کے قبضے سے آزاد کرا سکتا، یہی چیزیں چین میں مغربی تحریک کی کلیدیں تھیں -

---

۱- Commodore Perry -

۲- Lord Macartney -

بیسویں صدی کے نصف ثانی کے آغاز پر جاپان کا خرگوش اور چین کا کچھوا دونوں قریباً ایک ہی وقت میں تباہی خیز مرکز پر پہنچ چکے تھے ؛ جاپان مغربی دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے فوجی قبضے میں آ چکا تھا اور چین انقلاب کے راستے انارکی سے نکل کر کمیونسٹوں کے فوجی چنگل میں پھنس چکا تھا ۔ ہم اسے مغربی قرار دیں یا غیر مغربی (اس نکتے پر کتاب میں بحث ہو چکی ہے) لیکن مشرق بعید کی ثقافت کے نقطۂ نگاہ سے یہ قطعی طور پر اجنبی نظریہ تھا ۔

سوال یہ ہے کہ دور جدید کی مغربی دنیا اور مشرق بعید کے معاشروں میں دوسرے مقابلے کے پہلے دور کا نتیجہ یکساں طور پر اتنا تباہ کن کیوں ہوا اور اس کی وجہ کیا ہے ؟ چین اور جاپان دونوں ملکوں میں اس مصیبت کا سبب وہ غیر حل شدہ مسئلہ تھا جو ایشیا اور مغربی یورپ کے سامنے یکساں پیش رہا اور ہم ہندو دنیا پر مغرب کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اس مسئلے کا اندازہ کر چکے ہیں ۔ مغربی تہذیب کا جو اثر اُس کسان آبادی پر ہوا جو ابھی تک انسانی زندگی کے ابتدائی مراحل میں تھی اور جو صدیوں سے صرف بقدر ضرورت گزارے کی عادی چلی آتی تھی ، وہی یہاں پیش آیا ؛ اس کسان آبادی کو اب نئے طریقے کی بے چینی کا دارو پلایا جا رہا ہے لیکن وہ ابھی تک حقائق سے رو در رو مقابلے کے لیے تیار نہیں ہوئی اور اُسے یہ احساس نہیں ہوا کہ اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اقتصادی ، مجلسی اور سب سے بڑھ کر نفسیاتی انقلاب کا راستہ اختیار کرنا ناگریز ہے ۔ امال تھیہ[1] کے سینگ کی برکات سے فائدہ اٹھانے کے قابل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ چھڑے سے بندھے ہوئے ان کسانوں کو زمین کے طریق استعمال کے نئے طریقے سکھائے جائیں ، نیز لگان کے نظام کی مروجہ شکل کو بالکل بدلا جائے ، یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ضبط تولید اختیار کریں ۔

ٹوکوگاوا شیگنٹ کے ماتحت جاپان کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اُس

۱- Amalthea ، ایک یونانی افسانے کی ہیروئن جو شاہ کریٹ کی بیٹی تھی ۔ کہا جاتا کہ اُس نے زیوس کو بکری کے دودھ سے پالا تھا ، اس خدمت کے صلے میں اُسے بکری کا سینگ ملا تھا جس سے ہر ضرورت کی چیز بہ افراط مل جاتی تھی (مترجم) ۔

حد تک استحکام پیدا کر لینا ممکن تھا جس حد تک اُس زمانے میں پیدا کیا جا سکتا تھا؛ مختلف ذرائع سے جن میں اسقاط اور بچہ کشی دونوں شامل ھیں ، آبادی کو بڑھنے سے روکا جاتا تھا اور یہ تین کروڑ سے زاید کبھی نہ ہوئی - جب یہ نظام حکومت ختم ھوا تو جس جاپانی مجلسی جسم کو غیر طبعی طریق پر درجۂ انجماد میں رکھا جا رہا تھا ، وہ پگھلنا شروع ھوا اور آبادی انتہائی تیزی سے بڑھنے لگی ؛ سیاسی اور اقتصادی سطحوں پر تغیرات رونما ہوئے لیکن افزائش نسل کا طریقہ از سر نو اختیار کر لینا مغربی اثر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اس امر کا نتیجہ تھا کہ کسانوں نے اپنے پرانے طور طریقے دوبارہ اختیار کر لیے تھے جو پابندیوں کی وجہ سے انھیں ترک کرنے پڑے تھے ، نیز ٹوکوگاوا کے عہد کی منجمد فضا میں ایک نفسیاتی انقلاب بھی پیدا ھو گیا - چونکہ مغربیت کے طور طریقے رائج ھو چکے تھے ، انھوں نے بھی ابتدائی عادت کی طرف پلٹ آنے میں تیزی پیدا کر دی یعنی پیدائش بڑھتی جا رہی تھی لیکن مغربی طرز کی طبعی امداد کا نتیجہ یہ ھوا کہ شرح اموات گھٹ گئی -

ان حالات میں جاپان کے سامنے دو ھی صورتیں رہ گئی تھیں : اول یہ کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے مزید توسیع علاقے کا انتظام کرے یا بم کی طرح پھٹ کر ختم ھو جائے - توسیع کی عملی شکلیں یہی ھو سکتی تھیں کہ یا تو دنیا کو اپنے ساتھ تجارت پر راضی کیا جاتا یا مزید علاقے ، وسائل اور منڈیاں اُن مالکوں سے بہ زور چھینی جاتیں جو فوجی لحاظ سے کمزور اور ضعیف تھے ، عسکری نقطۂ نگاہ سے مغربیت کے طریقے اختیار کرنے والے جاپان کے جارحانہ اقدامات کو روکنے اور اپنے املاک کو بچانے کے قابل نہ تھے ؛ ۱۸۶۸ء سے ۱۹۳۱ء تک جاپان کی پوری خارجہ پالیسی کا خلاصہ یہ ھے کہ وہ ان دو متبادل طریقوں کے درمیان لیت و لعل میں پڑا رہا - اقتصادی قومیت کے بڑھتے ہوئے عالم گیر اثرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاپانی عسکری قوت کی طرف مائل ھو گئے ، پھر ایک تیز اقتصادی طوفان سے پنجہ آزما ہونے کا خوفناک تجربہ کرنا پڑا جو ۱۹۲۹ء کے موسم خزاں میں وال سٹریٹ پر نازل ھوا تھا ، بعد ازاں ساری دنیا میں پھیلا ؛ قریباً دو سال بعد جاپان نے ۱۸ اور ۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کی درمیانی شب میں مکڈن[1] سے اپنے جارحانہ اقدام کی وہ بڑی بازی

۱- Mukden ، چین کا ایک شہر جہاں سے آخری جنگ چین و جاپان کا آغاز ھوا اگرچہ باقاعدہ جنگ ۱۹۳۷ء میں شروع ہوئی -

لگائی جو ۱۹۴۵ء میں اُس کی ناکامی پر منتج ہوئی ۔

چینی چھوٹے چھوٹے جزیروں کے کسی جھنڈ میں مقید نہ تھے بلکہ ایک وسیع بر صغیر میں پھیلے ہوئے تھے لہٰذا وہاں نہ آبادی کا مسئلہ اُس شکل میں پیش ہوا اور نہ اُس کے حل کے لیے ویسی بے دردانہ کوششیں کی گئیں جیسی جاپان نے کیں تاہم یہ مسئلہ چین کے لیے کچھ کم نازک نہ تھا ، اس کے حل کی ذمہ داری اب کمیونسٹ چینی ڈکٹیٹروں کے کندھوں پر آ پڑی ہے ۔ کمیونزم کے ہاتھوں چین کی نظریاتی تسخیر مشرق بعید کے معاشروں پر روسی حملے کا ایک آخری قدم ہے جہاں یہ حملہ کوئی تین سو سال سے برابر جاری ہے ، ہم اس کے ابتدائی مراحل پر زیادہ وقت صرف نہ کریں گے ۔ انیسویں صدی میں جاپان کو پہلی مرتبہ ایک قابل توجہ مد مقابل کی حیثیت میں دیکھا گیا ، اُس وقت روس اور دوسری مغربی طاقتیں رقیب حملہ آور کی حیثیت میں نمودار ہوئیں تاکہ چینی سلطنت کی لاش میں سے جو حصہ اٹھا سکیں اُٹھا لے جائیں ۔ اُس وقت مسئلے کی شکل یہ تھی کہ آیا ہانگ کانگ یا شنگھائی چین میں برطانوی سامراج کے نشو و ارتقا کے لیے ویسے ہی مقامات ثابت ہوں گے جیسے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے نشو و ارتقا کے لیے بمبئی اور کلکتہ ثابت ہوئے تھے؟ اس کے برعکس روس نے ۱۸۶۰ء میں ولاڈی واسٹک پر پورا اقتدار حاصل کر لیا ، ۱۸۹۷ء میں پورٹ آرتھر اجارے پر لے لیا جسے زیادہ مرکزی اور اہم حیثیت حاصل تھی ، جاپان نے روسیوں کی اس کوشش کو ابتدا ہی میں کچل کر رکھ دیا ؛ یہ ۱۹۰۴ء - ۱۹۰۵ء کی جنگ روس و جاپان کا واقعہ ہے جسے جنگوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کی حیثیت حاصل ہے ۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روس کا شیرازۂ جمعیت بکھر چکا ہے اور وہ بد نظمی کا شکار ہو جائے گا ؛ جاپان اگرچہ فتح مند مغربی اتحاد میں اُس حیثیت سے شریک رہا تھا جس کے انتظام میں براہ راست کوئی تعلق نہ ہو تاہم اُس نے بڑے فائدے حاصل کیے لیکن جہاں روسی زار ناکام رہے تھے وہاں روسی کمیونزم نے کامیابی حاصل کر لی اور اس کامیابی کے وجوہ و اسباب کسی نہ کسی شکل میں اس کتاب کے اندر جا بجا پیش کیے جا چکے ہیں ۔ ان وجوہ و اسباب کا تجزیہ کر کر کے ہم عجیب و غریب متضاد صورتوں میں انہیں پیش کر سکتے ہیں اور اس قسم کے اصول ترتیب دیے جا سکتے ہیں کہ قلم تلوار سے بھی زیادہ قوی حربہ ہے ۔ کمیونزم کو

کارل مارکس کی لا دینی انجیل کہا جا سکتا ہے، اس نے روسیوں کے دل میں وہ نفسیاتی کشش پیدا کی جس میں زاریت ناکام رہی تھی، اسی لیے سویٹ یونین کو چین میں نیز دوسرے مقامات میں ایک خوفناک ''پانچویں کالم'' کی حیثیت حاصل ہو گئی؛ کمیونسٹ روس نے آلات و اسلحہ اور مشینری دی یا کہ لیجیے کہ اُس کا کچھ حصہ دیا لیکن روس کے چینی مداح اس قابل ہیں کہ اُس کا کام بہتر طریق پر پورا کر دیں اور اُن پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

(VII) دور جدید کے مغرب اور اس کے معاصروں میں مقابلے کے خاص پہلو:

ہم نے مقابلوں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر جو نتیجے حاصل کیے، اُن میں سب سے اہم یہ ہے کہ دور جدید کی مغربی تہذیب میں لفظ ''جدید'' کے زیادہ سے زیادہ معین معنی کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم اس کا ترجمہ طبقہ متوسط کریں تو معنی زیادہ واضح ہو جائیں گے؛ مغربی اقوام اُسی وقت دور جدید میں داخل ہوئیں جب اُن میں ایک ایسا سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا جو معاشرے میں مقتدر عنصر کی حیثیت اختیار کر سکتا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی تاریخ کا نیا باب پندرھویں صدی کے اختتام پر شروع ہوا تھا اس لیے کہ اُسی زمانے میں مغرب کی زیادہ ترقی یافتہ قوموں میں طبقۂ متوسطہ نے معاملات کی باگ ڈور سنبھالنی شروع کی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مغربی تاریخ کے دور جدید کے اصول کے مطابق اجنبی قومیں اُسی وقت مغربی طور طریقے اختیار کرنے کی اہل مانی جا سکتی تھیں جب ان کے یہاں کا طبقۂ متوسطہ زندگی کے مغربی طریقوں میں داخل ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتا۔ اگر ہم ان مثالوں پر غور کریں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور مغربی طور طریقوں کے نفاذ کے سلسلے میں نیچے سے اوپر کی طرف جانے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یونان کی آرتھوڈکس مسیحی آبادی یا اہل چین و جاپان کی زندگی میں جو مجلسی ڈھانچا پہلے سے چلا آتا تھا، اس میں طبقۂ متوسطہ کے ایسے عناصر موجود تھے جن کے ذریعے سے مغربیت کا خمیر اثر انداز ہوا۔ اس کے برعکس جن قوموں میں مغربیت اوپر سے نیچے کی طرف آئی، ان میں مطلق العنان حاکموں نے اپنی رعایا کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی اور وہ اس وقت کا انتظار نہ کر سکے کہ ارتقا طبعی طور پر معرض وجود میں آ جائے بلکہ جبر سے کام لیا اور اس طرح اپنے ملکی عناصر میں سے کوئی ایسا طبقۂ متوسطہ پیدا نہ

کر سکے جسے صحیح معنوں میں طبقۂ متوسطہ کہا جا سکتا اور وہ مغربیت کی توسیع و اشاعت کا کام دے سکتا؛ انھوں نے اہل علم کی ایک جماعت پیدا کر لی جسے وہ صحیح طبقۂ متوسطہ کے بجائے ایک مصنوعی بدل کے طور پر استعمال کرتے رہے۔

غرض روس نیز اسلامی اور ہندو دنیاؤں میں اہل علم و فضل کا جو گروہ پیدا ہوا، وہ واقعی مغربیت سے متاثر تھا اور اُس میں مغربی طبقۂ متوسطہ کے اوصاف و خصائص بڑی حد تک پائے جاتے تھے البتہ روس کے معاملے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اثر عارضی ثابت ہو سکتا تھا اس لیے کہ پیٹر اعظم کی پیدا کی ہوئی زاریت نے جس روسی اہل علم کے طبقے کو جنم دیا تا کہ روس کو مغربی انداز کے طبقہ متوسطہ کا حامل بنا دے، وہ لوگ دل میں زاریت اور مغربی سرمایہ داروں کے نصب العین دونوں سے باغی تھے اور یہ ۱۹۱۷ء کے انقلابی ہیجان سے بہت پیشتر کا واقعہ ہے؛ ممکن تھا کہ جو صورت حال روس میں پیش آئی، وہ دوسرے مقامات کے اہل علم کے سلسلے میں بھی پیش آتی۔

روسی اہل علم میں سرمایہ داری کے خلاف جو جذبہ پیدا ہو چکا تھا، اُس کی روشنی میں مناسب تھا کہ غیر مغربی اہل علم اور مغرب کے طبقۂ متوسطہ کے درمیان مماثلت و اختلاف کے پہلوؤں کا جائزہ لے لیا جاتا اور یہ دیکھ لیا جاتا کہ غیر مغربی اہل علم غیر مغربی ماحول میں جس کردار کی اداکاری کے ذمہ‌دار بنے ہیں، اُسے کس حد تک پورا کر سکتے ہیں۔

ان کی سرگزشتوں کا ایک مشترک پہلو یہ ہے کہ جن معاشروں میں انھوں نے اپنے پاؤں جمائے، یہ ان کے دائرے کے اندر سے نہیں بلکہ باہر سے آئے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغربی معاشرہ قرون مظلمہ کی تاریکی سے اُبھرا تو اس کی حیثیت زرعی معاشرے کی تھی جس میں قصباتی اور شہری مقاصد بالکل اجنبی معلوم ہوتے تھے اور ان کے مقاصد میں سے بعض کے لیے ابتدا میں وہ اجنبی یہودی کام کرتے رہے تھے جن کی آبادیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ پھر غیر یہودی لوگوں کا طبقہ متوسطہ سامنے آ گیا جس کے دل میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ جو کام یہودی انجام دے رہے ہیں، اُسے یہ لوگ خود انجام دیں۔

دوسرا تجربہ جو دور جدید کے مغربی طبقۂ متوسطہ اور اس کے معاصر

اہل علم میں مشترک تھا ، یہ تھا کہ دونوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے اپنے ابتدائی آقاؤں کے خلاف بغاوت کی ؛ برطانیہ کلاں ، ہالینڈ ، فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں میں طبقۂ متوسطہ اس وجہ سے برسر اقتدار آیا تھا کہ اُس نے بادشاہوں کی جگہ لے لی تھی اور بادشاہوں ہی کی سرپرستی نے نادانستہ طور پر طبقۂ متوسطہ کو دولت و اقتدار کی منزل پر پہنچایا تھا[1] - اسی طرح دور جدید کے آخری عہد کی مغربی سیاسیات میں اہل علم اس لیے برسر اقتدار آ گئے کہ انہوں نے مغربیت کے لیے کام کرنے والے مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف کامیاب بغاوت کی تھی اور یہی حکمران اہل علم کا طبقہ پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے - اگر ہم پیٹر کے زمانے کے روس ، آخری دور کی عثمانی سلطنت اور ہندوستان کے برطانوی راج کی سرگزشتوں میں اس مشترک پہلو کا اجمالی جائزہ لیں تو ہم پر واضح ہوگا کہ اہل علم نے تینوں ملکوں میں نہ صرف بغاوت کی بلکہ اُن کی بغاوتیں قریباً یکساں مدت گزر جانے کے بعد بروئے کار آئیں - روس میں دسمبریوں[2] کے ناکام انقلاب کا واقعہ ۱۸۲۵ء میں پیش آیا ، یہ پیٹر کے اعلان کے خلاف روسی اہل علم کا اعلان جنگ تھا - پیٹر نے ۱۶۸۹ء میں مقتدر حیثیت حاصل کی ، اس سے ایک سو چھتیس سال بعد انقلاب بپا کرنے کی کوشش کی گئی ؛ ہندوستان میں سیاسی بے چینی کا آغاز انیسویں صدی کے اختتام پر ہوا گویا بنگال میں برطانوی راج قائم ہونے کے ایک سو چالیس برس بعد یہ واقعہ پیش آیا ؛ سلطنت عثمانیہ میں انجمن اتحاد و ترقی نے سلطان عبدالحمید ثانی کو ۱۹۰۸ء میں تخت سے اُتارا تھا ، باب عالی نے ۱۷۶۸ء—۱۷۷۴ء کی جنگ روس و جاپان میں ناکامی کا صدمہ برداشت کرنے کے بعد یہ کوشش

۱- مثال کے طور پر انگریزوں کی سرگزشت کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ٹیوڈر خاندان کے مشہور بادشاہوں نے دارالعوام کو جو حقوق دیے تھے ، وہ سٹیورٹ بادشاہوں کے خلاف استعمال کیے گئے -

۲- Decemberist ، یہ انقلابیوں کی ایک جماعت تھی جس نے ۱۸۲۵ء میں روس کے اندر پہلی انقلابی کوشش کی تھی لیکن یہ ناکام رہی ، بہت سے لیڈروں کو سزائے موت دی گئی ، بہت سے لوگ سائبیریا بھیج دیے گئے ؛ چونکہ یہ واقعہ دسمبر میں پیش آیا تھا اس لیے ان انقلابیوں کو دسمبریوں کا نام دے دیا گیا (مترجم) -

شروع کی تھی کہ اپنی مسلم رعایا میں سے خاصی بڑی تعداد کو مغرب کے فنون جنگ کی تربیت دے؛ چنانچہ اس سے ایک سو چونتیس برس بعد انجمن اتحاد و ترقی کا مذکورہ بالا کارنامہ ظہور پذیر ہوا۔

لیکن مماثلت کے ان پہلوؤں کے مقابلے میں ایک اختلاف بھی خاص توجہ کا محتاج ہے۔ دور جدید کا مغربی طبقۂ متوسطہ معاشرے کا ایک داخلی عنصر تھا جو برسر اقتدار آ گیا، نفسیاتی اعتبار سے اس میں اجنبیت کی کوئی چیز موجود نہ تھی؛ اس کے برعکس اہل علم کی جماعتیں دو مشکلوں سے دو چار ہوئیں: اول وہ لوگ نئے تھے، دوسرے وہ لوگ بدیسی تھے اور طبعی نشوو ارتقا کی پیداوار نہ تھے. بلکہ جب اُن کا معاشرہ دور جدید کے اجنبی مغربی معاشرے سے متصادم ہوا اور اُس نے شکست کھائی تو یہ لوگ نمودار ہو گئے، وہ قوت نہیں بلکہ ضعف و ناطاقتی کے نشان تھے؛ یہ اہل علم بہ ذات خود اس ناخوشگوار اختلاف سے پوری طرح آگاہ تھے۔ جس مجلسی خدمت کی بجا آوری کے لیے یہ پیدا کیے گئے تھے، اُسی کی بنا پر معاشرے میں ایک اجنبی عنصر بن گئے؛ جو کام انھیں سرانجام دینا تھا اُس کے لیے شکر و سپاس کے وجدان نے غیر معمولی اعصابی تناؤ کی وجہ سے اُن میں مغرب کے طبقۂ متوسطہ کے لیے نفرت کی تیز آگ مشتعل کر دی، وہی طبقۂ متوسطہ اُن کا آقا تھا وہی اُن کے لیے مصیبت ثابت ہوا، اُسی کو انھوں نے نصب العین بنایا تھا وہی ان کے لیے ہوّا بن گیا۔ جس قزاق سورج کے یہ سحر زدہ سیارے تھے، اُس کے خلاف حد درجے ناخوشگوار دور وسیر کی روش کیٹولس[1] کے ایک رثائی شعر میں خوب واضح ہوئی ہے:

مجھے تم سے نفرت ہے، مجھے تم سے محبت ہے، شاید تم مجھ سے
پوچھو کہ ایسا کیوں ہے؟ میں بتا نہیں سکتا لیکن میرا احساس
یہی ہے اور اس وجہ سے میرا دل اذیت میں مبتلا ہے۔

چونکہ مغربی طبقہ متوسط سے اجنبی اہل علم کی اس نفرت کی شدت واضح تھی لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ لوگ مغربی طبقۂ متوسطہ کے کارنامے انجام دینے کے اہل نہ تھے؛ اس سلسلے میں معیاری مثال روسی اہل علم کی

۱۔ Catullus، ایک رومی شاعر جس نے ۵۴ ق۔م میں وفات پائی (مترجم)۔

خوفناک ناکامی پیش کر رہی ہے؛ ۱۹۱۷ء کے دو انقلابوں میں سے پہلے کے بعد لازم ہو گیا تھا کہ پیٹر نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کے بچے کھچے آثار کو لے کر انیسویں صدی کے مغربی نمونے کی ایک آئینی پارلیمانی حکومت قائم کر دی جاتی لیکن یہ نہ بن سکی۔ کیرنسکی[1] کی حکومت اس لیے بے نتیجہ ثابت ہوئی کہ اسے بھوسے کے بغیر اینٹیں تھاپنے کا کام سونپ دیا گیا تھا یعنی کوئی ایسا طبقۂ متوسطہ موجود نہ تھا جو قابل، خوش‌حال اور تجربہ کار ہوتا اور وقت کا تقاضا یہ تھا کہ پارلیمانی حکومت قائم کی جاتی؛ لینن اس وجہ کامیاب ہوا کہ اس نے وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کے سوا کوئی چیز پیش نظر نہ رکھی، اس کی کمیونسٹ پارٹی ایسی جماعت نہ تھی جس کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ ایرانی مسلمانوں کی تاریخ سامنے لائیے وہاں آپ کو یہی چیز عثمانی بادشاہوں کے غلاموں میں مل جائے گی، یہی چیز قزلباش برادری میں مل جائے گی جو صفویوں نے اپنے عقیدت مندوں میں بنائی تھی، یہی چیز سکھ خالصہ میں مل جائے گی جو مغلوں کے اقتدار کے خلاف اپنے اسلحہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ان اسلامی اور ہندو برادریوں میں روس کی کمیونسٹ پارٹی کے اوصاف و خصائص غیر مشتبہ طور پر واضح ہیں؛ لینن کی جدت طرازی یہ ہے کہ اس نے خوفناک پرانے سیاسی ہتھیار کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا انتظام کر لیا اور یہ ایک غیر مغربی معاشرے میں مغرب کے خلاف استعمال کیا گیا، کمال یہ ہے کہ مغربی فن کاری کے تمام حربوں سے اس سلسلے میں کام لیا گیا اور مغرب کے مروجہ نظریات سے پرہیز کا سلسلہ قائم رہا۔

لینن نے ایک پارٹی کی مطلق العنان حکومت قائم کر کے جو کامیابی حاصل کی، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے بعد اسی مثال کی پیروی اکثر لوگوں نے کی۔ ہم ان پیرووں کا ذکر یہاں نہیں کریں گے جو کمیونسٹ

۱- Kerensky، مشہور روسی لیڈر جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد حکومت میں شامل ہوا اور وزیر جنگ بنا، پھر اسے وزیر اعظم کا عہدہ مل گیا، آخر میں وہ نئی روسی جمہوریت کا صدر بن گیا لیکن بالشویک کام یاب ہوئے تو کیرنسکی کو روس چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا، اس نے اپنے حالات کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی تھی (مترجم)۔

ہونے کے مدعی ہیں ، صرف اُس حکومت کا ذکر کریں گے جو مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی کے باکمال احیاء کے لیے قائم کی ، ساتھ ہی اٹلی میں مسولینی کی حکومت اور جرمنی میں ہٹلر کی نیشنل سوشلسٹ حکومت کا ذکر ضروری ہے ؛ یہ تینوں غیر کمیونسٹ حکومتیں تھیں ، تینوں ایک ایک پارٹی کی حکومتیں تھیں ۔ ترکی کے نئے نظام کو اس وجہ سے یگانہ حیثیت حاصل ہوئی کہ ایک پارٹی کی حکومت تدریجاً بدلتے بدلتے دو پارٹی کی حکومت بن گئی جو آزاد خیال مغربیوں کے اصول پر کار بند ہوئیں اور یہ تغیر پُر امن طریق پر ہو گیا ، اس کے لیے حوادث کی شکل میں کوئی قیمت ادا کرنی نہ پڑی ۔

(ب) قرون متوسطہ کی مسیحیت سے مقابلے

(I) <u>صلیبی جنگوں کا مد و جزر :</u> صلیبی جنگوں کی اصطلاح عام طور پر مغرب کی ان فوجی مہموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو پوپ کی انگیخت سے اور اس کی برکات کے ساتھ یروشلم میں مسیحی حکومت قائم کرنے کے لیے بھیجی گئیں یا ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی حکومت کے قیام کے لیے ہر ممکن اعانت کا بندوبست کریں یا ایسی حکومت قائم ہو کر زائل ہو جائے اور اسے دوبارہ قائم کرنے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھیں ۔ لیکن یہاں ہم اس اصطلاح کو بڑے وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں ، ہم یہاں پر اس اصطلاح میں مغربی مسیحیت کی وہ تمام جنگیں شامل کرتے ہیں جو اس کی تاریخ کے عہد قرون متوسطہ میں سرحدوں پر کی گئیں مثلاً ہسپانیہ نیز شام میں مسلمانوں کے خلاف یا مشرقی رومی سلطنت کی حریف مسیحیت کے خلاف یا شمالی و مشرقی سرحدوں پر بے دین بربریوں کے خلاف ؛ ہم ان تمام جنگوں کو صلیبی اس لیے قرار دیتے ہیں کہ ان میں شامل ہونے والے جنگجو خلوص دل سے سمجھ رہے تھے کہ وہ مسیحی دنیا کی حدیں بڑھا رہے ہیں یا انھیں دوسروں کے حملوں سے بچا رہے ہیں اور ان دعووں کی حیثیت ریائی نہ تھی ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ چاسر[1] زیر غور اصطلاح کی اس توسیع کو درست قرار دے گا ؛ چاسر نے حکایات کینٹر بری[2] کی تمہید میں ایک بہادر

۱- Chaucer ، مشہور انگریزی شاعر ، متوفی ۱۴۰۰ء (مترجم) ۔
۲- Canterbury Tales ، چاسر شاعر کی مشہور کتاب (مترجم) ۔

کی تصویر الفاظ میں پیش کی ہے جسے اعلیٰ پیمانے کا شریف بہادر قرار دیا ہے ، ہو سکتا ہے یہ بہادر اپنے عہد شباب میں کریسی[1] اور پوئٹیرز[2] کی لڑائیوں میں لڑا ہو لیکن شاعر کو مقامی مغربی سلطنتوں کی خاندانی کشمکشوں سے کوئی تعلق نہ تھا ؛ اس نے بہادر کو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جو مغربی مسیحیت کی حدوں پر غرناطے سے روس ، پروشیا اور لتھوانیا تک لڑتا رہا ۔ چاسر یقیناً اسے صلیبی مجاہد قرار نہیں دیتا ، محض ایسا جنگجو قرار دیتا ہے جس نے واضح طور پر مسیحیت کی جنگ میں زندگی بسر کی ۔ ہمارا مدعا فی‌الحال یہ ہے کہ جارح مغربی مسیحیت نے دوسری متعلقہ تہذیبوں پر جو اثر ڈالا ، اس کا جائزہ لینے سے پیشتر قرون متوسطہ کی ان توسیعی جنگوں کی عام حیثیت واضح کر دیں ۔

مغربی معاشرے کے اندر گیارھویں صدی میں قرون متوسطہ کا ظہور بھی اسی حد تک حیرت انگیز ناگہانی ہوا تھا جس طرح پندرھویں اور سولھویں صدی کے موڑ پر دور جدید کا آغاز ہوا اور قرون متوسطہ کی سرگرمیوں نے جس تیزی سے ابتدا میں کامیابی حاصل کی تھی اسی طرح انجام کار یہ ختم ہو گئیں مثلاً اگر چین کا کوئی دانشمند مبصر موجود ہوتا اور وہ پرانی دنیا کے آخری سرے سے تیرھویں صدی مسیحی کے وسط میں حالات کا معائنہ کرتا تو کبھی یہ نہ سمجھ سکتا کہ مغرب کے مداخلت کنندے دارالاسلام اور "رومانیا" (مشرق رومی سلطنت کی آرتھوڈکس مسیحی آبادی کا حلقہ) سے باہر نکالے جانے والے ہیں جیسے کہ وہ نکالے گئے ۔ اسی طرح اگر وہ تین سو سال پیشتر اسی منظر پر پہنچ جاتا تو بھانپ لیتا کہ یہ دو دنیائیں (اسلامی دنیا اور آرتھوڈکس مسیحی دنیا) ان مغربیوں کے حملے کی زد میں ہیں جو بہ ظاہر پست ماندہ اور ناتربیت یافتہ تھے ، مہذب ناظر کی سر زمین کے مغربی حصوں

۱- Crecy ، فرانس کا ایک مقام جہاں اگست ۱۳۴۶ء میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی تھی ، اس میں ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان کے بیٹے نے بڑی ناموری حاصل کی ، وہ سیاہ پوش شاہزادے کے لقب سے مشہور ہوا اس لیے کہ سیاہ رنگ کا زرہ بکتر پہنتا تھا (مترجم) ۔

۲- Poitiers ، فرانس کا ایک قصبہ جہاں ۱۳۵۶ء میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو شکست فاش دی تھی (مترجم) ۔

میں رہتے تھے ، اگر وہ ان دو یونانی معاشروں کے درمیان فرق کا اندازہ کر لیتا نیز سریانی معاشرے کے متعلق جان لیتا کہ وہ اسلامی رنگ میں رنگا جانے والا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا کہ بحیرۂ روم کے طاس اور گرد و پیش کی سرزمینوں پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے ان تین امیدواروں میں سے آرتھوڈکس مسیحیت کے لیے مواقع خوشگوار ہیں اور مغربی مسیحیت کے لیے امید کی فضا سراسر تاریک ہے ۔

قوت و اقتدار کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً دولت ، تعلیم ، انتظامی صلاحیت ، جنگ میں فتح مندی کا اصول ؛ ان معیاروں کی بنا پر دسویں صدی کے وسط کے ہر مبصر کے لیے آرتھوڈکس مسیحیت کو سب پر فوقیت حاصل تھی اور مغربی مسیحیت پستی میں گری ہوئی نظر آتی تھی ۔ اس زمانے میں مغربی مسیحیت کو ایک زرعی معاشرے کی حیثیت حاصل تھی جس میں قصباتی زندگی اجنبی معلوم ہوتی تھی ، سکے کا کوئی خاص رواج نہ تھا ؛ اس کے برعکس آرتھوڈکس مسیحیت میں دولت کی ریل پیل تھی اور روپیہ ہی اقتصادیات کی بنیاد تھا ، کامیاب تجارت اور صنعت و حرفت کی وجہ سے روپے کی کمی نہ تھی ۔ مغربی مسیحیت میں تعلیم صرف پادریوں تک محدود تھی ؛ آرتھوڈکس مسیحیت میں حکمران جماعت اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کر چکی تھی ۔ مغربی مسیحیت کے لیے شارلمین نے ایک نئی رومی سلطنت بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کوشش بے نتیجہ رہی اور پوری مغربی دنیا از سرنو بدنظمی کی تاریکی میں گم ہو گئی لیکن مشرقی آرتھوڈکس مسیحیت میں آٹھویں صدی میں لیوسائرس[1] نے جو نئی رومی سلطنت قائم کی تھی ، وہ بڑی کامیاب تھی اور ان سرزمینوں کی دوبارہ تسخیر کا کام شروع ہو گیا تھا جو ابتدائی رومی سلطنتوں کے زمانے میں مسلمان عرب فاتحوں نے ساتویں صدی میں چھین لی تھیں ۔

جب اسلامی فتوحات کی لہروں میں زور باقی نہ رہا اور وہ خشکی پر پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں تو تھوڑی دیر تک سمندر میں ان کی پیش قدمی

۱- Leo Syrus ، مشرقی رومی سلطنت کے بادشاہوں میں سے لیو نام کے کئی بادشاہ گزرے ہیں ، یہ لیو سوم تھا جس نے شامی خاندان کی بنیاد رکھی (مترجم) ۔

جاری رهی ؛ چنانچہ مغرب[1] کے مسلمان بحری قزاقوں نے نویں صدی میں دونوں مسیحیتوں کی بری طرح خبر لی تھی - آرتھوڈکس مسیحیت نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ کریٹ کو از سرنو مسلمانوں کے قبضے سے نکال لیا لیکن مغربی مسیحیت انتقام کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھا سکی ؛ اس کے برعکس مسلمان حملہ آور اس وقت تک بھی رویرا[2] کے اندر بڑھے جا رہے تھے اور کوہ الپس کے دروں پر قابض ہو رہے تھے -

ہم اپنے مفروضہ چینی مبصر سے اتنی گہری نظر کی امید نہیں رکھ سکتے جتنی اس گہری نظر والے شخص سے جو چند بنیادی حقیقتوں کا بہ یک نظر اندازہ کر لیتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ آرتھوڈکس مسیحیت کی بہ ظاہر ہیبت ناک مغربی سطح کے نیچے مہلک کمزوری موجود ہے ؛ وہ یہ بھی دیکھ لیتا کہ اگرچہ مسیحیت نے بحیرۂ روم میں اپنی قوت کا کوئی قابل ذکر ثبوت نہ دیا تاہم دوسرے محاذوں پر وہ بہت بہادری سے لڑی مثلاً سکنڈے نیویا کے بربریوں اور میگیار حملہ آوروں کے خلاف بلکہ مسلمانوں کے خلاف مغربی مسیحیت کی حدیں ھسپالیہ میں آھستہ آھستہ آگے بڑھنے لگیں تھیں - دسویں صدی کی مغربی مسیحیت اپنے دوسرے حریفوں کے برعکس ایک تہذیب تھی جو عہد نشو و ارتقا میں داخل ہو چکی تھی ، رہبانیت اس کا روحانی حصار تھی اور بینی ڈکٹ کے راھبانہ طور طریقوں میں کلونیا کی خانقاہ نے دسویں صدی عیسوی میں جو نئی روح پیدا کی تھی ، وہ بعد کے مغربیوں کی مجلسی مذھبی اور دنیوی اصلاحات کے لیے بہترین نمونہ تھی -

لیکن دسویں صدی کی مغربی مسیحیت میں زندگی کے یہ آثار بھی ایسے

۱- مغرب عربی لفظ ھے بہ معنی سمت غرب ، افریقہ کے شمالی و مغربی گوشے کے لیے یہ اسلامی نام ھے اور اس میں تیونیسیہ ، الجزائر اور مراکش شامل ھیں - افریقہ کوچک در اصل ایک جزیرہ ھے جسے صحرائے اعظم اصل افریقہ سے اسی طرح جدا کرتا ھے کہ بحیرۂ روم اسے یورپ سے اس طرح جدا نہیں کرتا -

۲- Riviera ، یہ مغربی اٹلی اور مشرق فرانس کے اس ساحلی علاقے کا نام ھے جو خلیج جینوا کے ساتھ ساتھ واقع ھے اور جو سپیزیا (اٹلی) سے نیس (فرانس) تک چلا جاتا ھے (مترجم) -

نہ تھے کہ ہم گیارھویں صدی میں مغربیوں کی قوت کے حیرت انگیز انفجار کا حقیقی سبب دریافت کر سکیں ؛ یہ انفجار دو ہمسایہ معاشروں کے خلاف جارحانہ اقدام کی حیثیت رکھتا تھا ، نہ تو قوت تخلیق سے بہرہ مند تھا اور نہ اسے کوئی قابل قدر واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ مغربی مسیحیوں نے نارمنڈی اور ڈین لا کے اہل سکنڈے نیویا کو مسیحیت کے حلقہ بگوش بنانے کے بعد ان کے جنگی جتھوں نیز ہنگری اور پولینڈ کے بربریوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش شروع کر دی ؛ کلونیا خانقاہ نے رہبانیت میں جو اصلاح کی تھی ، اس کے بعد ہلڈی برینڈ نے پاپائیت کی قیادت میں پورے کلیسائی نظام کی اصلاح شروع کر دی ۔ ایک طرف ہسپانیہ میں مسلمانوں کے خلاف پیش قدمی شروع ہوئی ، عین اسی وقت دوسری طرف جنوبی اٹلی میں مشرقی رومی سلطنت اور سسلی میں اسلامی حکمرانی کے خلاف اقدامات شروع ہو گئے ؛ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بحیرۂ ایڈریاٹک کو عبور کر کے مشرقی رومی سلطنت کے قلب میں نہ پہنچ جائیں لیکن یہ خطرہ بے بنیاد ثابت ہوا ۔ یہ کوششیں پہلی صلیبی مہم (۱۰۹۵ء—۱۰۹۹ء) میں انتہائی منزل پر پہنچیں ؛ اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں سے علاقے چھین کر شام میں انطاکیہ اور الروحا[1] سے یروشلم اور ایلہ تک (جو خلیج عقبہ کے اوپر واقع ہے) مغربی مسیحیت کی ریاستوں کا سلسلہ قائم ہو گیا ۔

قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت کا یہ اقتدار انجام کار بحیرۂ روم میں درہم برہم ہو گیا ؛ ہمارے مشرق بعید کے مبصر کے لیے یہ صورت حال یقیناً حیرت انگیز ہوتی بشرطیکہ وہ پہلی صلیبی مہم کے بعد ڈیڑھ سو سال کے حالات پر ایک نظر ڈال لیتا ، اس وقت تک مغرب کے حملہ آور شام میں اپنی ان تمام چوکیوں کو چھوڑ چکے تھے جو ان لوگوں کی زد میں آ سکتی تھیں ۔ اس کے برعکس ہسپانیہ میں اسلامی حکومت گھٹتے گھٹتے صرف غرناطے کے اردگرد تک محدود رہ گئی تھی اور مغربیوں نے شام میں اپنے مقبوضات کے نقصانات کو مشرقی رومی سلطنت کے یورپی علاقوں پر قابض ہو کر پورا کر لیا تھا ۔ قسطنطنیہ میں ایک فرنگی شاہزادہ رومی شہنشاہ کا نام اور منصب غصب کر رہا تھا ؛ دور مشرق بعید میں تاتاریوں کی ایک بڑی سلطنت پیدا

۱- Edesso ، یہ انگریزی نام ہے ، عرب اسے الروحا کہتے ہیں ۔

ہو چکی تھی - مغربی مسیحیت کے خیال بندوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ان تاتاریوں کو مسیحیت کے حلقہ بگوش بنا کر مسلمانوں کے خلاف پیچھے سے حملہ کرانا چاہیے ؛ چنانچہ پوپ کے بھیجے ہوئے مسیحی مبلغوں نے قراقرم تک طویل سفر کیا ، پھر مارکوپولو قبلائی خان کے دربار میں پہنچا -

اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور ہم نے اپنے مفروضہ چینی مبصر کے لیے جو تاریخ تجویز کی ہے ، اس کے بہت جلد بعد قسطنطنیہ کی لاطینی سلطنت کا ڈھانچا پاش پاش ہو گیا (۱۲۶۱ء) ، اس کی جگہ یونان کی آرتھوڈکس مسیحی سلطنت نے لے لی اگرچہ یہاں مستقبل کے مالک یونانی نہیں بلکہ عثمانی ترک بننے والے تھے - اب مغربی مسیحیت نے اپنی جارحانہ سرگرمیوں کو شمالی ومغربی سرحدوں کی طرف منتقل کر لیا ، ٹیوٹانی جنگجو شام سے بستر بوریا اٹھا کر چلے گئے اور انھوں نے بے دین اہل کروشیا ، اہل لتھوانیا اور اہل استھونیا کے خلاف دریائے وسچولا پر قسمت آزمائی شروع کر دی ، صرف ہسپانیہ ، جنوبی اٹلی اور سسلی میں قرون وسطیٰ کے آغاز تک پیش قدمی جاری تھی اور اسے قرون وسطیٰ کے اختتام تک جاری رکھا گیا - قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت نے اپنی سرحدوں کو جنوب اور مشرق کی طرف بڑھانے کی کوشش کی اور ان کی خواہش تھی کہ یونانی مورث اعلیٰ کے قبضے میں جو کچھ تھا ، سب انھیں مل جائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی ؛ اگر قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت کے مادی وسائل کو دولت ، آبادی اور عقل و فہم کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کے سوا اَورکسی نتیجے کی امید بھی نہ ہو سکتی تھی -

(II) دورِ جدید کا مغرب اور سریانی دنیا : قرون وسطیٰ کے مغربی مسیحیوں نے گیارھویں صدی میں سریانی دنیا پر حملہ کیا تو ان پر واضح ہوا کہ اس دنیا کے باشندے مختلف حلقوں میں بٹے ہوئے ہیں ؛ ایک گروہ اسلام کی طرف مائل ہے اور ایک گروہ نے وہ مختلف مسیحی عقیدے اختیار کر رکھے ہیں جو اسلام سے پیشتر مختلف جماعتوں نے مسیحیت کو یونانیت سے پاک کر دینے کے لیے پیدا کیے یعنی یعقوبیت ، نسطوریت وغیرہ - عربوں کی فتوحات کے بعد جو دور شروع ہوا ، اس میں ان فاتح بربریوں کا امتیازی مذہب اسلام تھا جیسا کہ رومی سلطنت کے مختلف صوبوں کو فتح کرنے والے ٹیوٹانیوں کا مذہب

آریوسیت[1] ؛ آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے سریانی دنیا میں فتح و ظفر کے پھریرے اڑائے ، گیارھویں صدی میں پہلی صلیبی مہم کا آغاز ہوا ، درمیانی مدت میں رعایا کا رخ اسلام ہی کی طرف رہا ، اس کے وجوہ مختلف تھے لیکن اس دور کے آخر تک پوری رعایا نے اسلام قبول نہ کیا تھا ۔ صلیبی مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی حلقہ بگوشی وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی ، یوں سریانی دنیا سے دو نو مولود اسلامی معاشرے نمودار ہوئے یعنی عربی اور ایرانی ۔

مسلمان اور عیسائی کم از کم سرکاری حیثیت سے ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے تھے ، دونوں حد درجے تعصب کیش اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے والے مذہبوں کے محافظ ابتدا ہی سے باہم دگر اعلان جنگ کیے بیٹھے تھے ۔ اس صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ دیکھ کر یقیناً تعجب ہوگا کہ ان کے جنگ جو ایک دوسرے کو کس درجے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ، پھر اس سے بھی بڑھ کر تعجب انگیز امر یہ ہے کہ قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت نے سریانی دنیا کے وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ثقافتی نشو و ارتقا کی خاصی مقدار حاصل کی بلکہ فرانس کے جنوبی و مشرق صوبے پرونس کے غزل گویوں نے عربی شاعری کے طور طریقے بھی مسیحیت کے دائرے میں پہنچا دیے اور مسلم علماء نے یونانی فلسفے کا جو ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کیا تھا ، اس کے افکار و خیالات بھی مسیحیت میں جذب کر لیے ۔

شمشیر زنی کے دائرے میں دونوں محارب فریقوں کے جنگ جوؤں کے درمیان بالکل خلاف توقع یک جہتی اور قرب کا سراغ مل گیا ؛ اندلس کے جنگی میدانوں میں اندلسی مسلمانوں اور ان کے ہسپانوی بربریوں کے درمیان اتنا گہرا تعلق تھا جتنا ہسپانوی مسیحیوں اور ان کے ان ہم مذہبوں کے درمیان نہ تھا جو جبل برانس کے پار رہتے تھے ، بالکل یہی کیفیت اندلسی مسلمانوں اور شمالی افریقہ میں ان کے ہم مذہبوں کی تھی ۔ شام کے جنگی میدانوں میں جو ترک بربری ممالک محروسہ خلافت کی تسخیر کے سلسلے میں اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے ، وہ اپنے معاصر حریفوں یعنی مسیحی جنگ جوؤں کے

۱۔ حاشیہ پیشتر لکھا جا چکا ہے (مترجم) ۔

لیے زیادہ ہمدرد تھے جو درجۂ تہذیب میں اپنے اُن بربری آبا و اجداد سے زیادہ بلند نہ تھے اور جنھوں نے رومی سلطنت کی تسخیر کے سلسلے میں مسیحیت قبول کر لی تھی ۔ واقعہ یہ ہے کہ نارمن لوگ جو فرینکوں کے جارحانہ اقدامات کا ہراول بنے ، اُسی طرح ماضی قریب میں مسیحیت قبول کر چکے تھے جس طرح سلجوقیوں نے اسلام قبول کیا تھا ۔

شمشیر زنی کے دائرے کو چھوڑ کر قلم رانی کے دائرے میں آئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیوں نے شام میں عارضی طور پر جو فتوحات حاصل کی تھیں ، بعد ازاں سسلی اور اندلس میں اُنھیں جو مستقل فتوحات حاصل ہوئیں ، ان علاقوں کے تمام مقامِ جاں بہ لب سریانی دنیا کے روحانی خزینے قرونِ وسطیٰ کی مغربی مسیحیت تک پہنچانے کا ذریعہ بن گئے ؛ مذہبی روا داری اور ذہنی انجذاب کی خوشگوار فضا نے ان مغربی مسیحی فاتحوں کو عارضی طور پر مسحور کر لیا جنھوں نے پلرمو[1] اور ظلیطیلہ[2] کو مسخر کیا تھا ، یہ خوشگوار فضا ابتدائی دور کے اسلام کے نزدیک گھریلو فضا تھی ، اس کے برعکس مسیحی لوگ روایتی تعصب میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ اس مبارک ماحول میں مغربی اذہان و قلوب نے آئندہ دو سو سال تک مسلمانوں سے جو ثقافتی خزانے وصول کیے ، وہ اصلاً یا تو یونانی تھے یا سریانی ؛ ارسطو کی حقیقی یا الحاقی تصانیف جو سریانی معاشرے نے عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کر کے بارھویں صدی عیسوی میں مغربی دنیا کے متکلمین تک پہنچائیں ، وہ سریانی دنیا میں پیدا نہ ہوئی تھی البتہ اسی کے ذریعے سے منتقل ہوئی تھیں ۔

ریاضی ، ہیئت اور طب کی طرف آئیں تو سریانی زبان بولنے والے نسطوری مسیحیوں نے جو یونانیوں کے شاگرد تھے اور عربی بولنے والے مسلمانوں نے جو نسطوریوں کے شاگرد تھے ، نہ محض یونانی پیشرووں کے کارناموں کو محفوظ رکھا بلکہ اُن میں درجۂ کمال حاصل کیا ۔ انھوں نے ہندی مکتب سے بھی سبق لیے تھے : ان تحصیلات کے بعد ایسی تصانیف کیں جنھیں مستقل حیثیت حاصل تھی ۔ قرونِ وسطیٰ کے مغربی مسیحیوں نے اپنے معاصر مسلم اہل علم

۱۔ Palermo ، سسلی کا دارالحکومت (مترجم) ۔

۲۔ Toledo ، جس کا عربی نام طلیطیلہ ہے ، ہسپانیہ کا مشہور شہر جس نے اندلسی عربوں کے ماتحت بہت اونچی حیثیت اختیار کر لی تھی (مترجم) ۔

کی تحقیق و تفتیش کے نتائج سے پورا فائدہ اٹھایا بلکہ طریقۂ اعداد کے اس نظام سے بھی فائدہ اٹھایا جو عام طور پر عربی کہلاتا تھا اگرچہ یہ ہندوستان سے لیا گیا تھا ۔ ذہنی سطح سے ہم شعر کی سطح پر پہنچیں تو معلوم ہو گا کہ مرتی ہوئی سریانی ثقافت کے جو مسلمان نمائندے اندلس میں موجود تھے ، ان سے حاصل کیے ہوئے خزانے در اصل عربوں کے کارنامے تھے ؛ ان اشعار نے مغرب کی پوری دنیائے شعر کو مغربی تہذیب کے عہد حاضر تک متاثر رکھا بہ شرطیکہ ہم تسلیم کر لیں کہ محض افکار و خیالات ہی نہیں بلکہ طریق نظم و غزل بھی پرونس کے مغربی غزل گویوں نے اندلسی مسلمانوں سے حاصل کیا تھا ۔

مسلمانوں نے جو میراث سائنس کے دائرے میں چھوڑی تھی ، اس سے دور جدید کا مغرب بہت آگے نکل گیا لیکن قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت کے اثر پذیر افکار پر سریانی تہذیب کے اثرات نظر انداز نہیں کیے جا سکتے ؛ فن تعمیر میں جس طرز کو گاتھوں کی طرز قرار دیا جاتا ہے ، وہ در اصل ان کی نہ تھی بلکہ اس کے نمونے ہمیں آرمینیا کے برباد شدہ گرجائی کھنڈروں اور سلجوقیوں کی کارواں سراؤں میں ملتے ہیں ، اٹھارھویں صدی کے محققین نے عہد قدیم میں خواہ مخواہ اس طرز کو گاتھوں سے منسوب کر دیا ۔ بیسویں صدی میں بھی مغربی یورپ کے شہروں کے بہت سے گرجاؤں میں گاتھک طرز تعمیر نمایاں نظر آتا تھا جس نے رومی پیشرووں کی جگہ لے لی تھی ، قرون وسطیٰ کی مغربی طرز تعمیر میں یہ انقلاب سریانی دنیا کی طرز تعمیر ہی کا اثر تھا ۔

(**III**) <u>دور جدید کا مغرب اور یونانی آرتھوڈکس مسیحیت :</u> ان دو مسیحیتوں کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی البتہ یہ دونوں اپنے مسلمان ہمسایوں سے سمجھوتا کر لیتی رہیں ، ان میں اختلاف ایک تاریخی واقعے کا نتیجہ ہے ۔ یونانی تہذیب سے دو معاشروں کی دو جڑواں بیٹیاں پیدا ہوئیں ، پانسو سال کے بعد ان میں آخری تفرقہ ہو اجو دردناک واقعات کا نتیجہ تھا (۱۱۸۲ء—۱۲۰۴ء)[1] ۔ لیکن پانسو سال کی مدت میں بھی یہ

۱۔ ظلم و جبر کے تین واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے تفرقہ ناگزیر ہو گیا : اول مشرقی رومی سلطنت کے فرینک بادشاہوں کا قتل (۱۱۸۶ء) ، دوم سالونیکا میں نارمنوں کے ہاتھوں غارت گری (۱۱۸۵ء) ، سوم فرینکوں اور اہل وینس کی مشترکہ فوجی مہم کے ہاتھوں قسطنطنیہ میں لوٹ مار (۱۲۰۴ء) ۔

دونوں معاشرے اپنے اوصاف و خصوصیات کے اختلاف اور مفادات کی کشمکش کے باعث ایک دوسرے سے اجنبیت اختیار کر چکے تھے، مفادات کی کشمکش اُس نزاع میں آخری حد پر پہنچ گئی جب دونوں کے درمیان جنوبی اور مشرق یورپ نیز جنوبی اٹلی پر حصول اقتدار کا ہنگامہ بپا ہوا؛ اس ہنگامے میں حریفانہ دعووں کی وجہ سے تلخیاں بہت بڑھ گئیں، دونوں مسیحیتوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ تھا کہ میں عالم گیر مسیحی کلیسا رومی سلطنت اور یونانی تہذیب کی جائز وارث ہوں۔

سیاسی کشمکش نے کلیسائی نزاعات کا پردہ اختیار کر لیا مثلاً جب مشرق آرتھوڈکس مسیحیت میں مجسموں کی پرستش کا جھگڑا شروع ہوا تو آٹھویں صدی میں پوپ نے مشرقی سلطنت کی بت شکن پالیسی کی مخالفت شروع کر دی۔ یہ در اصل اس امر کا اعلان تھا کہ وسط ایشیا میں مشرقی رومی سلطنت کے جو اجزأ باقی رہ گئے تھے، ان میں بسنے والوں کو سیاسی فیصلے کے لیے الپس کے پار دیکھنا چاہیے اور شارلمین کے دادا، بعد ازاں اُس کے باپ سے فوجی امداد لے کر لمبارڈوں کا مقابلہ کرنا چاہیے، قسطنطنیہ سے ایسی مدد حاصل کرنے میں ناکامی کا سامنا ہو چکا تھا۔ گیارھویں صدی کے وسط میں دونوں مسیحیتوں نے یہ تحریک شروع کر دی تھی کہ عبادات اور دعاؤں میں یکسانی پیدا کر لینا ضروری ہے، اس پر رومہ اور قسطنطنیہ کے درمیان تصادم ہوا اور اُس نے ۱۰۵۴ء میں افتراق کی صورت اختیار کر لی۔ اس تنازع کا ایک پہلو سیاسی بھی تھا یعنی جنوبی اٹلی کے جو لوگ کلیسائی نقطۂ نگاہ سے پوپ کی رعایا تھے، وہ سیاسی اعتبار سے مشرق رومی سلطنت کی رعایا تھے؛ بہ ہر حال ان دو معاشروں کے درمیان تفرقہ آخری درجے پر پہنچ گیا۔

پہلی صلیبی مہم کے وقت یعنی دو کلیسائی اور سیاسی جھگڑوں میں سے آخری جھگڑے سے چالیس سال بعد الیکسیئس اول کومنینس[1] مشرق رومی سلطنت کا بادشاہ تھا؛ اُس کے سامنے یہ مرحلہ پیش آیا کہ صلیبیوں کو اس کی سلطنت میں سے گزرنا تھا، یہ امر ذاتی اطمینان و راحت کے لحاظ سے نیز سیاسی لحاظ سے حد درجے تشویش ناک تھا۔ شہنشاہ کی بیٹی اینا کومنینا[2] نے جو مورخ بھی تھی،

۱- Alexius I Comnenus -

۲- Anna Comnena -

بادل ناخواستہ یہ لکھا کہ شاہنشاہ نے اپنی فوجوں کو اپنے ہم مذہب مسیحیوں کا خون بہانے کا اختیار دیا۔ شہنشاہ نے اپنی فوج ان صلیبیوں کے ساتھ بھیج دی تھی تاکہ انھیں اناطولیہ سے پار کر آئے، اینا کے نزدیک اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مبادا اناطولیہ کے اندر ترک اچانک حملے کر کے ان کے ٹکڑے اڑا دیں۔ الیکسیئس (۱۰۸۱ء–۱۱۱۸ء) نے صلیبیوں کو محض بادل ناخواستہ برداشت کیا تھا مگر اُس کے پوتے مینول اول[1] (۱۱۳۵ء–۱۱۸۰ء) کے عہد میں اس چیز نے فرینک رفیقوں اور اُن کے طور طریقوں کے لیے زبردست جذبۂ الفت کی حیثیت اختیار کر لی، دونوں طرف ایسے مذہبی پیشوا اور سیاسی مدبر موجود تھے جو چاہتے تھے کہ دونوں مسیحی دنیاؤں کے درمیان تفرقے کو ختم کر دیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ۱۱۸۱ء - ۱۲۰۴ء میں تفرقہ آخری حد پر پہنچ گیا، پندرھویں صدی میں یہ اَور بھی وسیع ہوگیا یہاں تک کہ آرتھوڈکس مسیحیوں نے مغربی مسیحی پوپ کے کلیسائی اقتدار کو قبول کرنے کے بجائے ترکوں کی سیاسی اطاعت قبول کر لی۔ بلاشبہ اُس وقت رومیوں کی طرف سے جو شرطیں پیش ہوئی تھیں، وہ بڑی سخت تھیں لیکن اس مصیبت کا اصل سبب دریافت کرنا ہو تو وہ دو ثقافتوں کے روز افزوں اختلاف میں ملے گا جو سات سو یا ایک ہزار سال پیشتر نمایاں ہو چکا تھا۔ اختلاف میں افزائش کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ گیارھویں صدی میں دونوں مسیحی معاشروں کے احوال میں اچانک غیر متوقع اور حیرت انگیز انقلاب برپا ہو چکا تھا، اس کی طرف ہم اس باب کی سابقہ فصل میں توجہ دلا چکے ہیں۔ احوال کے اس سیاسی اور اقتصادی انقلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں معاشروں کی نظروں میں ایک دوسرا بُری طرح کھٹکنے لگا؛ مشرقی آرتھوڈکس مسیحی فرینکوں کو نو دولتیے سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ خوش نصیبی سے انھیں جو مادی قوت حاصل ہو گئی ہے، اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کے برعکس فرینکوں کی نگاہوں میں بزنطینی ایسے آدمی تھے جن کے دعویٔ برتری نہ حقیقتاً درست تھے نہ ان کی پشتیبانی کے لیے کوئی قوت موجود تھی۔ یونانی لاطینیوں کو بربری سمجھتے تھے اور لاطینیوں کی نظر میں یونانی اپنے

۱- Manuel I ۔

طور طریقے چھوڑ کر بحیرۂ روم کے مشرقی حصے میں بسنے والوں کے طور طریقے اختیار کر رہے تھے -

فرینکو اور بزنطینوں کے درمیان ایک دوسرے سے نفرت کا جو سلسلہ جاری تھا ، اس کی مثالوں سے یونانی اور لاطینی ادب لبریز ہے ، ہم چند روشن مثالیں فریقین کے ایک ایک ترجمان کی طرف سے پیش کریں گے - بزنطینوں کے خلاف فرینکوں کے تعصب کی شہادت میں لمبارڈ قوم کے ایک بشپ لیوٹ پرینڈ[1] ساکن کری مونا[2] کی رپورٹ پیش کی جا سکتی ہے جسے مشرقی رومی شاہنشاہی دربار میں سفارت پر بھیجا گیا تھا اور اس سفارت کے لیے اسے مغربی رومی شہنشاہ اوٹو دوم (۹۶۸ء–۹۶۹ء) نے بھیجا تھا ، اسی سال اس نے سفارت کے فرائض پورے کر دیے تھے - فرینکوں کے خلاف بزنطینیوں کے تعصب کی شہادت میں اینا کومنینا کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں جو یونانی شہزادی تھی اور جس نے تاریخ بھی لکھی ؛ اسے پہلی صلیبی مہم کے دوران میں نیز اس سے پیشتر فرینکوں کے طرز سلوک کا تجربہ ہو چکا تھا جو ہرگز خوشگوار نہ تھا - بشپ لیوٹ پرینڈ کے ذمے جو سفارتی کام لگایا گیا تھا ، اس میں قدم قدم پر تشویشات و مشکلات کا اضافہ اس وجہ سے ہوا کہ بشپ مذکور اپنے زمانے کے آرتھوڈکس مسیحیوں سے ذاتی طور پر متنفر تھا اور روزانہ زندگی کے واقعات میں اس تنفر کا اظہار کرتا رہتا تھا مثلاً وہ لکھتا ہے کہ جو محل میرے قیام کے لیے تجویز کیا گیا ، وہ بہت زیادہ گرم تھا یا بہت زیادہ سرد ، ہماری سفارت کے تمام افراد کو اسی محل میں بند کر دیا گیا تھا اور باہر پہرے لگ گئے تھے تاکہ ہم سب سے الگ تھلگ رہیں ، تاجر ہمارے ساتھ فریب کرتے تھے ؛ جو شراب ہمیں دی جاتی تھی ، وہ پینے کے قابل نہ تھی ، جو کھانا دیا جاتا تھا ، وہ کھانے کے قابل نہ تھا ، یونانی بشپ حد درجے غریب تھے اور وہ سب کے سب کسی مہمان کا خیرمقدم کرنے کے لیے تیار نہ تھے ، ہمارے بستر ایسے سخت تھے جیسے پتھر ہوں ، ان پر نہ توشکیں بچھائی جاتیں تھیں نہ تکیے ہوتے تھے - رخصت کے وقت بشپ نے سکول کے طالب علم کی طرح اپنے میزبانوں سے بدلہ لینے کی

۱- Liutprand -

۲- Cremona -

یہ تجویز سوچی کہ قیام گاہ کی دیواروں اور میزوں پر مسدس الارکان لاطینی میں گالیوں سے بھری ہوئی تحریر ثبت کر دی ؛ وہ لکھتا ہے کہ میں خوش ہوں ، اب اس شہر کو پھر نہ دیکھوں گا جو ایک زمانے میں بڑا دولت مند تھا اور اس میں ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی مگر اب وہ قحط زدہ ہے ، اس کے لوگ جھوٹا حلف اٹھاتے ہیں ، دروغ بافیاں کرتے ہیں ، لوگوں کو لوٹتے ہیں ، وہ لالچی ، بخیل اور قلاش محض ہیں ۔

لیوٹ پرینڈ نے شاہنشاہ نقفور[1] اور اس کے وزیروں سے جو گفتگو کی ، اس میں بھی دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف گالیوں کا سیلاب بہاتے رہے ؛ چنانچہ خود اس نے کہا کہ یونانیوں نے کفر و الحاد پھیلایا ، مغربیوں نے کفر و الحاد کا خاتمہ کیا ۔ بلاشبہ یہ قول درست ہے اس لیے کہ یونانیوں میں ابتدا سے اہل فکر و نظر چلے آتے تھے ، وہ صدیوں تک علم الٰہیات کے جزئیات و تفصیلات میں لگے رہتے جن کے نتائج تباہ کن ثابت ہوئے ؛ اس کے برعکس لاطینی لوگ قانونی لوگ تھے ، وہ خیال آرائیوں کی لغویات کو پسند نہ کر سکتے تھے ۔ ۷- جون ۹۶۸ء کو شاہی دعوت ہوئی ، لفظ ''رومی'' جس کا دعویٰ دونوں سلطنتوں نے کر رکھا تھا ، اشتعال انگیزی کا موجب بن گیا اور دونوں مسیحی دنیاؤں کے درمیان کشمکش کی آگ مشتعل ہو گئی ۔ لیوٹ پرینڈ لکھتا ہے :

> نقفور نے مجھے جواب کا موقع نہ دیا اور ذلت خیز انداز میں کہا : تم رومی نہیں ہو ، تم لمبارڈ ہو ۔ وہ چاہتا تھا کہ خود ہی بولتا جائے ۔ مجھے اس نے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا لیکن میں آپے سے باہر ہو چکا تھا اور زبردستی کھڑے ہو کر کہا : یہ تاریخی حقیقت ساری دنیا پر آشکارا ہے کہ رومیولس جس کی نسل سے ہونے کے مدعی رومی ہیں ، وہ شخص تھا جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا ، وہ ایک بدکار عورت کا لڑکا تھا ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی ماں نے اس کے باپ سے باقاعدہ شادی نہ کی تھی ، اس نے مجرموں کے لیے ایک پناہ گاہ بنا لی تھی جس میں نادھندے ،

۱- Nikiphoros -

مقروض ، مفرور غلام ، قاتل اور دوسرے بڑے بڑے جرموں کے مرتکب پہنچ جاتے تھے ، اس نے بہت سے مجرموں کو اپنے پاس جمع کر لیا تھا اور انھیں وہ رومی کہتا تھا ؛ یہ طبقۂ امراء تھا جس سے تمھارے قول کے مطابق تمھارے شاھنشاھوں کی نسل چلی ہے ۔ باقی رہے ھم جنھیں لمبارڈ ، سیکسن ، فرانسیسی ، لورینی ، بویریائی سوابین اور برگنڈین کہا جاتا ہے تو ھمیں رومیوں سے اتنی نفرت ہے کہ اگر ھمارے دشمن ھمارے لیے رومی کا لفظ استعمال کر دیں تو ھم آپے سے باھر ھو جاتے ھیں ؛ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس میں کمینگی ، بزدلی ، لالچ ، زوال جھوٹ اور تمام دوسری برائیاں شامل ھیں[1]۔

شاھنشاہ نے لیوٹ پرینڈ کو شدید غصہ دلایا اور وہ ٹیوٹانی زبان بولنے والے تمام طبقوں کو اپنے ساتھی قرار دے بیٹھا جو متحدہ حیثیت میں رومیوں کے خلاف تھے ۔ بعد میں ملاقات کا ایک موقع آیا جو زیادہ خوشگوار رھی ، اس میں نقفور نے فرینکوں کا لفظ استعمال کیا جس سے اس کی مراد لاطینی اور ٹیوٹانی دونوں تھے اور یہ استعمال اس لیے ضروری ھوا کہ لیوٹ پرینڈ نقفور کے پہلے قول سے مشتعل ھو گیا تھا ۔ لیوٹ پرینڈ اگرچہ ذھنی ثقافت کے اعتبار سے اونچے درجے کا لاطینی تھا ، کلاسیکی یونانی ادب کو لاطینی تعبیرات میں از اول تا آخر دیکھ چکا تھا اور اس میں مہارت حاصل کر لی تھی لیکن مشترک یونانی ثقافتی پس منظر کے باوجود وہ معاصر یونانیوں سے قرب کے کسی احساس کو دل میں جگہ نہ دے سکا اگرچہ وہ بھی اسی ثقافت کے حامل تھے ۔ دسویں صدی کے اطالوی اور دسویں صدی کے یونانیوں کے درمیان خلیج حائل ھو چکی تھی ، اس کے برعکس لیوٹ پرینڈ اور اس کے سیکسن آقاؤں کے درمیان ایسی کوئی خلیج موجود نہ تھی ۔

ھم نے جو کچھ اوپر پیش کیا ہے ، یہ لیوٹ پرینڈ کی شخصیت پر بھی اتنی ھی روشنی ڈالتا ہے جتنی کسی دوسرے اھم واقعے پر ڈال سکتا ہے ۔ اس نے اپنی رپورٹ میں شہنشاہ کے خط و خال کی جو تصویر کھینچی ، اگر اسے

۱۔ لیوٹ پرینڈ کی کتاب ، بارھواں باب ۔

پیش کر دیا جائے تو مزید روشنی پڑنے لگے گی۔ یہ لمبارڈ بشپ بھدے خط و خال کا آدمی تھا ، اگر بزنطین کے نقلی موتی بھی اس کے سامنے ڈال دیے جاتے تو انھیں نقلی ثابت کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو غیر مشتبہ طور پر اصلی سؤر قرار دینے سے کبھی دریغ نہ کرتا۔ بیزنطینی معاشرے کو معاصر فرنیکوں کے معاشروں پر جو فوقیت حاصل تھی ، وہ لیوٹ پرینڈ کی کتاب اور اینا کومنینا کی تحریرات آمنے سامنے رکھنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ اینا کومنینا نے نارمن طالع آزما بوھی منڈ[1] کی معروضی اور امتیازی تصویر لفظوں میں کھینچی ہے ؛ وہ کہتی ہے کہ سرخ بالوں والا ایک وحشی تھا جس کی جنگ جوئی ، غداری اور حد سے بڑھے ہوئے لالچ نے میرے والد شہنشاہ نقفور کو اتنی تکلیف دی جتنی لیوٹ پرینڈ اور اس کے سیکسن آقاؤں نے نہیں دی تھی۔ اس کی جسمانی ساخت کا مفصل ذکر کیا ہے اس لیے کہ وہ شمالی نسل کے آدمیوں کا ایک نہایت شاندار نمونہ تھا ؛ کہا جاتا ہے کہ اس کا ھاڈ پولی کلیٹس کے قانون کے مطابق تناسبات کا ایک اچھا نمونہ تھا۔ اینا نے اس تصویر کے آغاز میں فراخ دلی سے اس کی مدح سرائی کی ہے :

> اس جیسا کوئی آدمی رومی علاقوں میں نہ ملتا تھا ، بربریوں اور یونانیوں میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو اس کے پیمانے پر پہنچ سکے ، اسے دیکھتے ہی انسان متحیر ہو جاتا تھا ، وہ ایک افسانوی وضع و ہیئت کا مالک تھا جس کی تفصیل بیان کرنے والوں کا سانس رک جائے۔

اس عورت کی فصاحت و بلاغت کے سلسلے میں زہر آگے آتا ہے ، وہ کہتی ہے :

> ”قدرت نے اس کے دل کے اندر ابلنے والے جوش و خروش کے لیے نتھنوں کی شکل میں مخرج پیدا کر دیا تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس شخص کے چہرے مہرے میں ایک گونا کشش تھی لیکن وہ کشش پورے قد و قامت کو دیکھ کر بالکل زائل ہو جاتی تھی ؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کے ماتھے پر قدرت نے

۱- Bohemund -

لکھ رکھا تھا کہ یہ شکار پیشہ درندہ رحم سے یک قلم خالی ہے - - - - اس کی نگاہوں سے بھی یہی حقیقت آشکارا ہوتی تھی اور اس کی ہنسی سے بھی جو دوسرے لوگوں کے کانوں پر شیر کی دھاڑ کی طرح اثر ڈالتی تھی - اس کا روحانی اور جسمانی انداز ایسا تھا جس سے تندخوئی اور حرص ٹپکے پڑتی تھی اور یہ دونوں جذبے مسلسل اُسے جنگ آزمائی کے درپے رکھتے تھے"۔

اینا نے اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے فرینک کی یہ نہایت دلچسپ تصویر کھینچی ہے، ساتھ ہی وہ آرتھوڈکس مسیحیت پر پہلی صلیبی مہم کے نزول کی کیفیت بتاتے ہوئے فرینکوں کا نہایت واضح منظر پیش کرتی ہے، وہ لکھتی ہے:

"شاہنشاہ الکسیس کو بے شمار فرینکوں کی فوجوں کے پہنچنے کی خبر ملی تو بہت تشویش پیدا ہوئی - اسے فرینکوں کی بے صبری، بے لگامی، تلون مزاجی اور اس قسم کے دوسرے اوصاف سے آگاہی تھی جو مغربی بربریوں میں برابر موجود تھے؛ شاہنشاہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ بربری حد درجے حریص اور لالچی ہیں اور کوئی بھی بہانہ بنا کر معاہدے پھاڑ ڈالتے ہیں - فرینکوں کے متعلق اس شہرت کی پوری پوری تصدیق اُن کے اعمال نے کر دی - - - - بلکہ کہنا چاہیے معاملے نے اتنی ناخوشگوار اور خوفناک صورت اختیار کر لی جس کی اُمید نہ تھی؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغرب کے پورے بربری جو بحیرۂ اڈریاٹک کے مغربی ساحل اور آبنائے جبل طارق کے درمیان واقع تھے، اپنے گھروں سے نکل پڑے تھے اور بستر بوریے کے ساتھ ایشیا پہنچنے کے لیے یورپ کے درمیانی علاقوں سے گزر رہے تھے"۔

شہنشاہ الکسیس کو جس معاملے نے سب سے زیادہ دکھ پہنچایا، یہ تھا کہ پہلی صلیبی مہم کے انتظامات نے نظم و نسق سلطنت کے تمام ذمہ دار آدمیوں کا وقت گھیر لیا:

"طلوع سحر یا کم از کم سورج نکل آنے کے وقت سے الکسیس"

کا دستور یہ ہو گیا تھا کہ شاہی تخت پر بیٹھ جاتا اور اعلان کر دیتا کہ مغرب کا جو بربری اس کی پیش گاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہے ہر روز حاضر ہوتا رہے۔ شہنشاہ کی خواہش یہ تھی کہ سب پر واضح ہو جائے کہ انھیں درخواستیں دینے کا موقع دیا جا رہا ہے اور ہر گفتگو میں اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان پر اپنی پالیسی واضح کر دے۔ ان مغربی بربری امیروں کے بعض قومی طور طریقے نہایت عجیب تھے مثلاً وہ حد درجے گستاخ تھے، ہمیشہ بے لگام پائے جاتے تھے، اُن کی طبیعتوں میں لالچ بہت زیادہ تھا، جب کوئی بات اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتی، اُس کے لیے جائز و ناجائز حدود کا کوئی خیال نہ رکھتے؛ سب سے آخر میں یہ کہ وہ سخت جھگڑالو تھے اور اس باب میں دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی، شاہنشاہ کے دربار میں حاضری سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں انھیں کوئی باک نہ تھا۔

"جو امیر شہنشاہ کے دربار میں آتا، اپنے ساتھ جتنے ملازموں کو چاہتا، لے آتا اور سب ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے سیل کی شکل میں آتے۔ حد درجے افسوسناک امر یہ ہے کہ جب وہ بات چیت شروع کر دیتے تو اُن کے لیے وقت کی کوئی قید نہ تھی، جیسے ایٹیکا کے خطیب لمبی لمبی تقریریں کیا کرتے تھے، یہ بھی ویسے ہی تقریریں کیا کرتے، ہر عمرو، بکر، زید بادشاہ کے ساتھ گفتگو میں جتنا وقت چاہتا لے لیتا؛ پھر اُن کی زبانیں آداب سے نا آشنا تھیں، شاہنشاہ کے لیے اُن کے دل میں احترام کا کوئی جذبہ نہ تھا، وقت کا انھیں احساس نہ تھا، جو شاہی آدمی اس موقع پر موجود ہوتے، اُن کی خفگی کا بھی کوئی خیال نہ تھا، جو لوگ پیچھے کھڑے ہوتے تھے، اُن کی خاطر سے بھی اجازت لینے کا کوئی احساس پیدا نہ ہوتا تھا؛ وہ مسلسل باتیں کرتے جاتے اور لامتناہی مطالبوں کا سلسلہ قائم رکھتے۔

''جو لوگ قومی خصائص کی چھان بین میں لگے رہتے ہیں ، اُن کے لیے مغربی بربریوں کی بات چیت کی تیزی ، خودغرضی اور پیش پا افتادگی کسی تشریح کی محتاج نہیں لیکن براہ راست تجربے نے ان بربریوں کی اس خصوصیت کو ان لوگوں پر بدرجہا زیادہ واضح کر دیا جنھیں بدقسمتی سے ان گفتگوؤں میں شریک ہونا پڑا ۔ ان کاروائیوں میں رات ہو جاتی تو بدنصیب بادشاہ جسے دن بھر کچھ کھانے پینے کا موقع نہ ملتا ، تخت سے اُٹھ کر اپنے محلات کی طرف جانے کا ارادہ کر لیتا لیکن اس وقت بھی بربری اپنے مطالبے نہ چھوڑتے اور بادشاہ کے لیے مخلصی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی ۔ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر بادشاہ کے ساتھ چل پڑتے اور یہ طریقہ محض وہی لوگ اختیار نہ کرتے بلکہ ان لوگوں کا مشغلہ بھی یہی ہوتا جو دن بھر اُس سے باتیں کر چکے ہوتے ، پھر بھی کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کر کے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ۔ بیچارے بادشاہ کو کھڑا رہنا پڑتا ، بربریوں کا ھجوم اُسے گھیرے ہوئے رہتا اور اُن کی چڑ چڑ میں کوئی فرق نہ آتا ۔ بادشاہ غریب اس حالت میں بھی سوالات کی بھر مار کا جواب بڑی کشادہ پیشانی سے دیتا لیکن نامعقول چڑ چڑ کا سلسلہ لامتناھی رہتا اور جب کبھی شہنشاہ کا کوئی حاجب بربریوں پر دروازہ بند کرنا چاھتا تو اسے خود بند ہو جانا پڑتا اس لیے کہ شہنشاہ کو فرینکوں کی شعلہ مزاجی کا پورا اندازہ تھا اور اُسے اندیشہ تھا کہ اشتعال کا برائے نام بھی مظاھرہ ھوا تو وہ برھم ھو جائیں گے اور رومی سلطنت کو نقصان پہنچائیں گے''۔

دونوں فریقوں کے درمیان نفرت اس درجے پر پہنچی ہوئی تھی کہ ایک دوسرے سے ثقافتی اثرات قبول کرنے کا کوئی امکان ذھن میں آ ھی نہ سکتا تھا ؛ بااین ھمہ صلیبی مہموں کے ذریعے سے ایک طرف فرینکوں اور بزنطینوں کے درمیان دوسری طرف فرینکوں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی ساز و سامان کا مبادلہ ھوا ۔

مسلمانوں نے یونانی فلسفے اور سائنس کی جس متاع کو عربی زبان میں منتقل کر لیا تھا ، اسے قرون وسطیٰ کے مغربی مسیحیوں نے مسلمانوں سے حاصل کر چکنے کے بعد یونانی زبان میں وہ تمام ذخیرے فراہم کر لیے جو محفوظ تھے ؛ اس طرح یونانیات کے متعلق ان کا کتب خانہ مکمل ہو گیا ۔ مشرق نے مغرب کو جو ثقافتی قرضہ دیا ، وہ سراسر غیر متوقع تھا ، تیرھویں صدی میں جن فرینکوں نے قسطنطنیہ اور موریا کو فتح کیا ، انھوں نے بھی مفتوح یونانیوں کی ویسی ھی ادبی خدمت بلا ارادہ انجام دی جیسی چین کے تاتاری فاتح چینیوں کے لیے انجام دے چکے تھے ۔ چین میں کنفیوشیئس کے ہم عقیدہ علماء کا اقتدار عارضی طور پر زائل ہو چکا تھا ؛ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی زبانوں میں عوامی ادب کا جو ذخیرہ دب کر رہ گیا تھا ، وہ ابھر کر چین کی مجلسی زندگی کی سطح پر آ گیا جہاں اسے پہنچنے کی کبھی اجازت نہ ملی تھی اس لیے کہ کنفوشیئس کے عقیدت مند کار فرمایان حکومت قدیم چینی کلاسیکی ادب کے لیے وقف ہو چکے تھے اور اس کے سوا ہر شے کو بہ زور دباتے تھے ۔ آرتھوڈکس مسیحی دنیا میں بربریوں کی حکمرانی نے بھی ویسے ھی سبب سے وھی نتیجہ چھوٹے پیمانے پر پیدا کیا یعنی عام غنائی اور رزمیہ شاعری پھولنے پھلنے لگی ۔ موریا میں بسنے والے ایک فرینک مصنف نے اپنی کتاب سرگزشت موریا میں ایسے یونانی شعر کہے جو کلاسیکی پابندیوں سے بالکل آزاد تھے اور انھیں انیسویں صدی کے ابتدائی دور کی یونانی شاعری کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے ۔

قرون وسطیٰ کی مسیحیت اور معاصر آرتھوڈکس مسیحیت کے درمیان جن اہم تحائف کا مبادلہ ہوا ، وہ مطلق العنان حکومت کے سیاسی ادارے تھے ؛ یہ ادارے مشرقی رومی سلطنت میں موجود تھے اور وہاں سے مغرب کی طرف منتقل ہوئے ، انھوں نے ان مغربی ریاستوں میں ادارہ ہائے جاریہ کی حیثیت اختیار کر لی جو نارمن شمشیر زنوں نے اپولیا[1] اور سسلی میں قائم کی تھیں اور یہ علاقے ایک زمانے میں مشرقی رومی سلطنت کے اجزاء تھے ۔ بہ ہر حال یہ ادارے مغربیوں کی نگاہوں کا نقطۂ ماسکہ بنے رہے ، خواہ انھیں عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا یا نفرت و حقارت سے ؛ پھر یہ فریڈرک

۱- Apulia -

ثانی ہوہن سٹافن کی ذات میں متشکل ہوئے۔ اس شخص نے اپنی نارمن ماں سے سسلی کی بادشاہی میراث میں پائی تھی اور یہ مغربی رومی سلطنت کا شہنشاہ بھی تھا، نیز قدرت نے اسے خاص دل و دماغ عطا کیا تھا۔ اس دیو پیکر مطلق العنانی پر بعد میں جو کچھ گزری اور بیسویں صدی میں اس نے جو مظاہر اختیار کیے، ان کی تفصیل اس کتاب میں پہلے پیش کی جا چکی ہے۔

(ج) ابتدائی دو نسلوں کی تہذیبوں سے مقابلے

(I) سکندر اعظم سے بعد کی یونانی تہذیب سے مقابلہ: سکندر سے بعد کے یونانیوں کا نظریہ تاریخ یونان کے متعلق یہ تھا کہ سکندر کے عہد میں ماضی سے تعلق منقطع ہو گیا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا؛ دور جدید کی مغربی تاریخ کے متعلق جدید مغربیوں کا بھی نظریہ یہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرون وسطیٰ سے دور جدید کی طرف تبدیلی کے دور میں پندرھویں اور سولھویں صدی کے موڑ پر متعدد جدتیں شروع ہوئیں۔ تاریخ کی ان دونوں نئی فصلوں میں حال کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ماضی کی بے قدری کے لیے نہایت واضح بنیاد یہ ہے کہ اقتدار میں ناگہانی اضافے کا شعور پیدا ہوگیا، اس میں انسانوں پر بھی اقتدار شامل ہے جس نے فوجی فتوحات کی شکل اختیار کی اور طبیعیات پر بھی اقتدار شامل ہے جو جغرافیائی اکتشافات اور علمی دریافتوں کی صورت میں نمایاں ہوا؛ مقدونویوں نے ہخامنشیوں کا تخت آلٹ کر جو کارنامہ انجام دیا تھا، وہ اتنا ہی فرحت افروز تھا جتنا انکاؤں کا تختہ الٹنے میں ہسپانیوں کا کارنامہ۔ اگر تیسری صدی قبل مسیح کے کسی یونانی سے یا سولھویں صدی عیسوی کے کسی مغربی سے پوچھا جاتا کہ تم وہ احساسات بیان کرو جو نئے دور کے شعور سے تم میں پیدا ہوئے تو وہ لوگ جواب میں معاشرے کے اندر مادی قوت کے اضافے کو وہ اہمیت نہ دیتے جو اپنی ذہنی فضا کی توسیع کو دیتے۔ ہندوستان نے افسانوی حیثیت اختیار کر رکھی تھی، مقدونوی ایک براعظم میں سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچ گئے، پرتگیزوں نے اس سلسلے میں سمندر پر قابو حاصل کیا؛ اس اکتشاف نے دونوں صورتوں میں خاص احساسات پیدا کیے، قوت کے احساس کے ساتھ تعجب کا یہ احساس بھی شامل تھا کہ ایک غیر معمولی اجنبی دنیا کے چہرے سے پردہ اٹھا۔ یونانی دنیا میں ارسطو

اور اس کے جانشینوں کے علمی اکتشافات نے اور مغربی دنیا میں یونانی ثقافت کے احیاء نے بھی احساسات پیدا کیے ؛ یہاں نئے علم کے حصول سے قوت کا احساس ابھرا لیکن اس کے ساتھ بے چارگی کا بھی احساس پیدا ہوا جو انسان کو اس کی متناسب بے خبری یاد دلاتا تھا ، کائنات کے متعلق انسانی علم کے ہر اضافے سے اس احساس کا تازہ ہونا لازم تھا ۔

دونوں دوروں کے درمیان موازنہ آگے بڑھایا جا سکتا ھے ؛ ھم جانتے ھیں کہ دور جدید کے مغرب کا اثر عالم گیر ھے اور ھم بے خیالی کی حالت میں یہ فرض کر سکتے ھیں کہ اس لحاظ سے سکندر کے بعد کی یونانی تہذیب بہت ھی معمولی حیثیت کی مالک تھی لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ھے ، سکندر کے بعد کی تہذیب کو سریانی ، ھٹی ، بابلی ھندی اور چینی معاشروں سے مقابلہ پیش آیا ، بہ الفاظ دیگر اسے دنیائے قدیم کے ھر معاصر معاشرے سے سابقہ پڑا جو تہذیب کے راستے پر لگا چلا جا رھا تھا ۔

مگر اب ھمیں ایک اھم اختلافی نکتے پر غور کر لینا چاھیے ؛ دور جدید کے مغرب نے اپنے معاصروں پر جو اثر ڈالا اس کا مطالعہ کرتے ھوئے ھم ابتدائی حد کے دور جدید اور بعد کی حد کے دور جدید میں امتیاز کر چکے ھیں ۔ ابتدائی حد کے دور جدید میں مغرب کی طرف سے پوری ثقافت کی شعاعیں باھر جا رھی تھیں اور ان میں مذھب بھی شامل تھا ، بعد کے عہد کے دور جدید میں مغرب نے صرف دنیاوی ثقافت کی روشنی پھیلائی ، مذھب کا عنصر اس میں سے بالکل حذف ھو چکا تھا ۔ سکندر کے بعد کی تاریخ میں یونانیت کی ضیا افروزی ایسی کسی تقسیم کی مثال پیش نہیں کر سکتی اس لیے کہ مغرب کے مقابلے میں یونانیت صرف ذھنی اعتبار سے پیش آئی تھی ؛ یونانیت کا آغاز مذھب کے دائرے میں نہایت معمولی سرمایے سے ھوا تھا اور سکندر کا دور شروع ھونے سے پیشتر ایک صدی میں یونانیت اپنے مذھبی پیلے سے باھر نکل چکی تھی ۔

یونان میں روحانی آزادی کے اس نازک دور کے اندر اول اولمپس کے اس بربری دارالاصنام سے نفرت پیدا ھوئی جو بے تکلف بد اخلاقی کا مظہر تھا ؛ دوسرے روحانی اعتبار سے عمیق تر لیکن زندگی کی سطح پر تاریک تر صورت حال سے تکدر پیدا ھوا جس کے ذمہ دار بعض زمین دوز طُرق عبادت تھے لیکن اس کے بعد روحانی غذا کی تسکین نایافتہ بھوک ھر شے پر غالب آ گئی ۔ سکندر کے بعد کے یونانیوں کو جب عسکری اور ذھنی فتوحات ان زبردست مذاھب

کے دروازے پر لے آئیں جو اصلاً یونانی نہ تھے تو ان مذاہب نے یونانیوں کے قلوب میں جو جذبات پیدا کیے، اُن کی کیفیت یہ تھی گویا ایک بیش قیمت موتی کے مالک ہونے کی حیثیت میں اُن پر رشک کیا جائے نہ کہ فریب کار پروہتوں کے مسحور سمجھ کر اُنھیں حقارت سے دیکھا جائے، اُس وقت ایرانی دنیا کے اندر یہ اضطراب انگیز احساس بیدار ہوا کہ مذہبی لحاظ سے اُس کا خانہ خالی ہے۔ غرض سکندر کے بعد کے دور کے یونانی فوجی اور ذہنی اعتبار سے سب پر قابو پا چکے تھے مگر انھوں نے مذہب کے بارے میں قبولیت کی روش اختیار کر لی؛ چھ غیر یونانی معاشروں پر یونانیوں کے جارحانہ اثرات سے جو اہم مذہبی نتائج پیدا ہوئے، اُن کا ایک سبب یہ تھا۔ اگر ہم مذہبی نتائج کو اُن کے صحیح تاریخی پس منظر میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں سکندر کے بعد کے مد و جزر کا معائنہ کرنا چاہیے۔

مقدونیہ اور رومہ کے جن لوگوں نے فوجی مہموں کا انتظام کیا، اُن کا پہلا مقصد یہ تھا کہ اقتصادی لحاظ سے مفتوحین کو جی بھر کر لوٹیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یونانی ثقافت کی اشاعت کے جو لمبے چوڑے دعوے کر رہے تھے، ان میں اخلاص سے معرا تھے اس لیے کہ یہ دعوے محض الفاظ تک محدود نہ رہے بلکہ انھوں نے عملی شکل اختیار کر لی۔ یونانی فاتحوں کا دعویٰ یہ تھا کہ یونانی ثقافت کی روحانی دولت سے دنیا کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں؛ اس وعدے کے ایفا کے لیے انھوں نے جو موثر ترین ذریعہ اختیار کیا، یہ تھا کہ یونان سے باہر کی سرزمینوں پر جگہ جگہ ایسی شہری ریاستیں قائم کر دیں جن میں کی چھوٹی چھوٹی یونانی آبادیاں یونانیت کی روشنی ہر طرف پھیلاتی رہتی تھیں؛ اس مسلک کے مطابق عمل پیرائی کا انتظام سکندر نے اعلیٰ پیمانے پر کیا، پھر اُس کے مقدونوی نیز شہنشاہ ہیڈرین کے زمانے تک رومی جانشین کوئی ساڑھے چار سو سال اسی مسلک پر کاربند رہے۔

یونانی فاتحوں نے یونانی ثقافت کی کم و بیش فیاضانہ اشاعت کا جو انتظام کیا، وہ اتنا توجہ طلب نہیں جتنا یہ امر کہ غیر یونانیوں نے بہ طیب خاطر یونانیوں کی پیروی شروع کر دی؛ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکندر کے بعد کی یونانی ثقافت پُر امن طور پر اُن علاقوں کو بھی مسخر کرنے پر تیار ہو گئی جہاں یا تو یونانی فوجیں پہنچی نہ تھیں یا پہنچیں تو سکندر کی وفات کے بعد فتوحات کے سمندر میں جذر پیدا ہوتے ہی انھیں چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ سکندر کی فوجی

فتوحات کا اثر بالکل زائل ہو چکا تھا جب ہندو کش کے پار باختر کی یونانی سلطنت کے کوشان جانشینوں نے پہلی صدی قبل مسیح اور پہلی صدی عیسوی میں یونانی فنون کے نشو و ارتقا میں حصہ لیا ؛ اسی طرح سلیو کیوں کی یونانی سلطنت کے ساسانی اور عباسی جانشینوں نے یونانی فلسفے اورسائنس کو ترقی دی ، اسی طرح سریانی دنیا نے بھی اُس وقت تک یونانی سائنس اور فلسفے میں کوئی دلچسپی نہ لی جب تک انھوں نے یونانی اقتدار سے آزادی حاصل نہ کر لی اور اپنے لیے نسطوریت اور یعقوبیت کی شکل کی مسیحیت کا انتظام نہ کر لیا ، اور ساتھ ہی سریانی زبان کو اپنا ادبی ذریعہ نہ بنا لیا ۔

جس طرح یونان کی فوجی قوت کے زوال پر اس کی فنی اور ذہنی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا ، اُسی طرح یونانی ثقافت اُن علاقوں میں پُر امن طور پر داخل ہو گئی جہاں یونانی فاتح کبھی نہ پہنچے تھے ، یہ یونانی سبق معاصر تہذیبوں کے ساتھ مقابلوں کے عام مطالعے کے لیے نظر افروز ہے ۔ جس دور میں یہ کتاب لکھی جا رہی ہے اُس دور کے علمائے تاریخ کو یہ روشنی صاف دکھائی دے رہی ہے اس لیے کہ پوری داستان اُن کے سامنے آ گئی ہے ؛ دور جدید کے مغرب کو جو مقابلے اب پیش آ رہے ہیں ، اُن میں اگرچہ معلومات کی روشنی بہت زیادہ تھی اور اس کے برعکس یونانی تاریخ کے متعلق جو دستاویزیں مہیا ہو سکیں ، ان کی حیثیت بہت معمولی تھی لیکن مذکورہ بالا روشنی کا سلسلہ کہانی کے وسط ہی میں کٹ گیا اس لیے کہ مستقبل کے متعلق انسان کی بے خبری کا آہنی پردہ بیچ میں حائل ہو گیا ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاصرین کے درمیان ثقافتی تجارت کے سلسلے میں قوت کی بے چارگی دور جدید کی مغربی تاریخ سے بھی اُسی طرح واضح ہو کر سامنے آ جائے گی جس طرح سکندر کے بعد کی یونانی تاریخ میں واضح ہو گئی ؟ اس سوال کا کوئی جواب ۱۹۵۲ء تک نہیں مل سکا ، اس سے خوانندگان کتاب پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو تاریخی وقائع قریب تر ہیں اور جن کے لیے بہترین دستاویزیں موجود ہیں ، نیز ہمیں اُن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ شناسائی ہے ، وہی وقائع انسانی معاملات کی وضع و رفتار کے متعلق تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں کم واضح ثابت ہوتے ہیں ۔ ان کے برعکس جو وقائع بہت پہلے پیش آ چکے تھے اور اُن کی سرگزشتوں کے پورے ریکارڈ بھی موجود نہ تھے مثلاً یونانی معاشرے کے مقابلے تو اُن سے ہم زیادہ اچھے سبق

لے سکتے ہیں ، خصوصاً مذہبی سطح پر تہذیبوں کے مقابلے کے نتائج بخوبی ہمارے سامنے آشکارا ہیں ۔

بیسویں صدی کے مغربی مؤرخ پر یہ حقیقت واضح ہے کہ پانچویں صدی مسیحی کی چینی دنیا میں یونانی فنون کی قبولیت اور نویں صدی عیسوی کی سریانی دنیا میں ایرانی فلسفے اور سائنس دانوں کی قبولیت مقدونوی اور رومی فوجوں کے کارناموں کی طرح ناپید ہو چکی ہیں ۔ سکندر کے بعد کی یونانیت اور اس کے معاصروں کے درمیان فنی یا ذہنی ، فوجی یا سیاسی جو بھی معاملات پیش آئے تھے ، اب اُن کا حساب بند ہو چکا ہے ، اس کے برعکس ان مقابلوں کے نتائج سے جو مسلسل اثر انسانی زندگی پر پڑا ، اُس کی کیفیت یہ ہے کہ انسانوں کی موجودہ نسل کی بہت بڑی اکثریت اُن چار مذاہب میں سے کسی ایک کی حلقہ بہ گوش ہے جن کے تاریخی ظہور کی چھان بین کریں تو اُس یونانیت اور ان مشرق تہذیبوں کے باہم تعلق پر پہنچ جائیں گے جو اب معدوم ہو چکی ہیں ، چار مذاہب سے مقصود عیسایت ، اسلام ، مہایان بدھ مت اور ہندویت ہیں ۔ اگر انسانی معاملات کی آئندہ رفتار اس وجدان کی تصدیق کر سکے کہ ہمہ گیر مذہبی نظام جو اعلیٰ مذاہب کے حامل تھے ، تہذیبوں کے مقابلے میں عالم انسانیت کو اس کے نصب العین کی طرف لے جانے کا زیادہ بہتر ذریعہ تھے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سکندر کے بعد کی یونانیت کو جو مقابلے پیش آئے ، وہ ایسی روشنی کے حامل ہوں گے جو دور جدید کا مغرب عام مطالعۂ تاریخ کے موضوع پر اب تک نہیں ڈال سکا ۔

(II) سکندر سے پیشتر کی یونانی تہذیب کے ساتھ مقابلے : سکندر سے پیشتر کے یونانی معاشرے نے جس ڈرامے کا انتظام بحیرۂ روم کی تماشا گاہ میں کیا تھا ، وہیں آٹھ سو سال بعد ایک اور ڈرامہ ہونے والا تھا جس میں قرون وسطیٰ کی مسیحیت نے اہم کردار ادا کیا ۔ ان دونوں ڈراموں میں تین ایکٹر سٹیج پر آئے ، ان میں سے دو سکندر سے پیشتر کی یونانیت کے زبردست حریف تھے ؛ یہ دونوں ہم جنس تھے یعنی ایک سریانی معاشرہ اور دوسرا ھٹی ماشرہ جو قبل از وقت درہم برہم ہو گیا اور اس کے صرف متحجر آثار طارس کے گڑھ میں باقی رہ گئے ۔ ان تینوں فریقوں کے درمیان بحیرۂ روم کے طاس پر تسلط حاصل کرنے کے لیے مقابلہ ہوا ، مقابلے میں سریانی معاشرے کی نمائندگی فونیقی

کر رہے تھے اور ہٹی معاشرے کی نمائندگی ان بحر پیماؤں نے کی جنھوں نے سمندر کو عبور کرکے ایک خطے میں قدم جما لیے ، اُن کے یونانی حریف یونانی زبان میں انھیں ٹرھینی اور لاطینی میں اٹرسکن کہنے لگے ۔

اس سہ گونہ مقابلے میں جو اٹھارھویں صدی قبل مسیح میں شروع ہوا ، نزاع کے مرکز تین تھے : اول مغربی بحیرۂ روم کے سواحل جہاں کے مقامی باشندے ثقافتی لحاظ سے پس ماندہ تھے اور ان تین حریف حملہ آور معاشروں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے ؛ دوم بحیرۂ اسود کے سواحل ، یہاں سے یوریشیائی سطح مرتفع کی اس بڑی خلیج تک پہنچے تھے جہاں سے وہ قابل کاشت سیاہ خطۂ زمین سطح مرتفع کے شمالی و مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا ؛ مصر جہاں بڑی مدت سے کاشت کاری انتہائی پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی اور وہاں کی تہذیب پر دور انحطاط طاری تھا ، اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اپنے کسی ایک ہمسائے کی خدمات سے فائدہ اٹھائے بغیر کسی دوسرے ہمسائے کی روک تھام کا فرض انجام دے سکے ۔

ان منفعت بخش نعمتوں کے لیے جو کشمکش شروع ہوئی ، اس میں یونانیوں کو دوسرے حریفوں کے مقابلے میں مختلف وجوہ سے بہتر حیثیت حاصل تھی :

سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کی جغرافیائی حیثیت سب پر فائق تھی ، وہ بحیرۂ ایجہ کے جزیروں کو سرگرمیوں کا مرکز بنا کر مقابلے پر آئے تھے اور یہ جزیرے مغربی بحیرۂ روم بحیرۂ اسود دونوں سے قریب تر تھے ؛ اس کے برعکس اٹرسکنوں اور فونیقیوں کے مرکز بحیرۂ روم کے انتہائی مشرق گوشے میں واقع تھے ، ظاہر ہے کہ یہ مرکز منازل مقصود سے بہت دور تھے ۔ یونانیوں کو دوسرا فائدہ یہ حاصل تھا کہ ان کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی اور جگہ تنگ رہ گئی تھی اس لیے کہ اوپر کے پہاڑی علاقوں سے باشندوں کا سیل نشیبی علاقوں پر بڑھ آیا تھا اور یونانیوں کو جگہ چھوڑ کر چھوٹے سے علاقے میں جمع ہونا پڑا تھا ۔ آبادی کا دباؤ وسائل معاش پر پڑا تو یونانی پوری قوت سے توسیع میں لگ گئے اور انھوں نے سرگرمی سے اپنی تجارتی چوکیاں اس خیال سے قائم کرنی شروع کر دیں کہ مختلف خطوں میں یونانیوں کی زرعی نو آبادیوں سے یونان کبیر وجود پذیر ہو جائے ۔ ہمیں جو تھوڑی سی معلومات حاصل ہیں ، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے اٹرسکنوں یا فونیقیوں میں سے کسی کو کبھی آبادی کے دباؤ کا معاملہ پیش نہ آیا تھا اور کم از کم یہ حقیقت بالکل واضح ہے

کہ ان میں سے کسی نے بھی یونانیوں کی طرح آباد کاری کے ذریعے سے نئی دنیا بنانے کی کوشش نہ کی -

یونانیوں کو جو تیسرا فائدہ حاصل تھا ، وہ بھی ان کے جغرافیائی وضعیت ہی کا نتیجہ تھا ؛ بحیرۂ روم کے لیے ان تین حریفوں کے درمیان مقابلہ شروع ہوا تو اسی زمانے میں اشوری عسکریت نے اپنا آخری اور بد ترین حملہ شروع کیا ، فونیقی اور اٹرسکن دونوں ایشیا میں اس حملے کا نشانہ بن سکتے تھے ، یونانی اس سے بہت فاصلے پر مغرب میں رہتے تھے اور انہیں ایسا کوئی خطرہ پیش نہ آیا[۱] -

ان مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ امر واقعی حیرت انگیز ہے کہ فونیقیوں اور اٹرسکنوں نے بڑے اچھے کارنامے انجام دیے تاہم بحیرۂ اسود تک پہنچنے کی تگ و دو میں وہ بری طرح نا کام ہوئے اور نظر بہ ظاہر یہی امید تھی - بحیرۂ اسود یونانیوں کی خاص جھیل بن گیا ، سمیری اور ستھی خانہ بدوشوں کے ہجوم کے بعد سطح مرتفع میں امن قائم ہو گیا تو بحیرہ اسود کے یونانی مالکوں اور یوریشیائی سطح مرتفع کی بڑی مغربی خلیج کے ستھی مالکوں نے باہم مل کر بڑا نفع بخش تجارتی کاروبار شروع کیا جس میں ستھی کاشتکاروں کی پیدا کی ہوئی غذائی جنسیں زمین سیاہ سے بحیرۂ ایجہ کے طاس کی یونانی آبادی کے لیے بھیجی جاتی تھیں اور یونانی عیش و راحت کے جو سامان تیار کرتے تھے ، وہ ستھیوں کے شاہی خانوادوں کے لیے ارسال کیے جاتے تھے -

مغربی بحیرۂ روم میں کشمکش لمبی مدت تک جاری رہی اور اس میں کئی انقلابی دور آئے ، انجام کار یہاں بھی یونانیوں ہی کو فتح حاصل ہوئی ؛ مصر پہنچنے کے لیے بھی کشمکش جاری رہی اگرچہ اس کی مدت زیادہ لمبی نہ تھی - جن تین مقاصد کا ذکر ہم کر چکے ہیں ، ان میں سے یہ نصب العین ایسا

۱- اسی طرح سترھویں صدی عیسوی میں برطانیہ کے جزائری باشندوں کی حالت براعظم کے ولندیزی باشندوں سے زیادہ بہتر تھی اور وہ سمندر پار کی تجارت میں زیادہ سرگرمی دکھا سکتے تھے اس لیے کہ برطانیہ کے باشندوں کو خطرہ در پیش نہ تھا اور ولندیز ، ہیپس برگ اور بوربون بادشاہوں کے حملے کی زد میں تھے -

تھا جہاں قرب مکانی یونانیوں کو حاصل نہ تھا لیکن ساتویں صدی قبل مسیح میں یہ نعمت بھی انھیں کے قبضے میں چلی گئی ؛ انھوں نے آئی اولیا اور کاریا سے آدمی بھیجے جنھیں مصری سمندر سے آئے ہوئے ''برنجی آدمی'' کہتے تھے، ان کے ذریعے سے انھوں نے نجات دھندہ فرعون سمیٹی[1] کس اول کی مصری حکومت کو تقویت پہنچائی ؛ سمیٹی کس نے ان آدمیوں کی مدد سے ان اشوری فوجوں پر یورشیں کیں جو نیل زیریں کی وادی میں موجود تھیں اور ۶۵۸—۶۵۱ ق - م کے درمیانی مدت میں نکال باہر کیا -

چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط تک صاف نظر آ رہا تھا کہ یونانی لوگ بحیرۂ روم کے طاس کے لیے بحری مقابلے ہی میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ جنوبی مشرقی ایشیا میں اشوریوں کی سلطنت کے وارث بھی بننے والے ہیں ؛ سمیٹی کس سے قریباً نصف صدی پیشتر یونانیوں کی تنخواہ دار فوجیں اشوریوں کو مصر سے نکال چکی تھیں - جب اشوری سلطنت کے سلیشیا والے ساحل پر یونانیوں نے بغاوت کی تو سنحیرب[2] کو اس پر سخت غصہ آیا ؛ اشوری سلطنت کے بعد اس کے حدود میں نوبابلی سلطنت قائم ہوئی تھی ، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی مصر کی مثال پیش نظر رکھتے ہوئے یونانی تنخواہ دار فوجیں رکھ لیں اس لیے کہ نبوکد نذر (بخت نصر) کی شاہی گارد میں جزیرۂ لس باس کے ایک آدمی اینٹی منی ڈاس کے علاوہ یونانی طالع آزما بھی موجود تھے - اینٹی منی ڈاس[3] کا نام اور ریکارڈ گلدستۂ طاق نسیان بننے سے اس اتفاق کی بنا پر محفوظ رہ گئے کہ اس کا ایک بھائی الکائیوس[4] شاعر تھا - سکندر نے ہخامنشی سلطنت کو فتح کیا تو اس سے پیشتر یونانی تنخواہ دار اس سلطنت میں وسیع پیمانے پر موجود تھے ؛ اس صورت حال سے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ سکندر اپنے خاص وقت سے دو صدی پیشتر تاریخ کی سٹیج پر نمودار ہو گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سٹیج سکندر کے پیش رو ایک خیالی شبیہہ کے لیے نہیں بلکہ سائرس کے لیے آراستہ ہوئی تھی -

۵۴۷ ق - م میں سائرس نے لیڈیا کی سلطنت فتح کی اور ۵۲۵ ق - م میں اس کے جانشیں کمبوچہ نے مصر کو مسخر کر لیا ، بیس بائیس سال کے درمیانی

۱- Psammetichus -   ۲- Sennacherib -

۳- Antimenidas -   ۴- Alcaeus -

مدت میں یونانیوں کی اُمیدیں (چھٹی صدی قبل مسیح میں) مصر اور جنوبی و مغربی ایشیا سے مٹائی جا چکی تھیں؛ اناطولیہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ یونانیوں کی جو شہری ریاستیں قائم تھیں، وہ لیڈیا کی سلطنت کے زیر اثر تھیں۔ اس حقیقت سے یونانی پوری طرح آگاہ تھے، اس کے بعد اُن پر سائرس کی اجنبی سلطنت مسلط ہوئی اور سائرس کی ضرب زیادہ سخت اور شدید معلوم ہوتی تھی۔ کمبوچیہ نے مصر کو فتح کیا تو یونانیوں پر ایک اَور ضرب لگی، اس سے "برنجی آدمیوں" کا فوجی وقار ختم ہو گیا اور مصر میں یونان کے تجارتی فوائد ایرانی صواب دید کے رحم پر رہ گئے؛ یونانیوں کی ان شکستوں کے علاوہ ایرانی سلطنت کے بانیوں نے شامی فونیقیوں کے لیے زیادہ اہم اور ناگہانی فوائد کا انتظام کر دیا۔

ھخامنشی سلطنت کی جس پالیسی نے یہودیوں کو بابل کی اسیری سے نجات دلائی تھی اور اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے آبائی شہر یروشلم کے ارد گرد ایک ہیکلی ریاست[1] بنا لیں جو سیاسی لحاظ سے بالکل بے حقیقت تھی، اُسی پالیسی کے مطابق شامی فونیقیوں کے شہروں کو جو ساحل کے کنارے کنارے واقع تھے، نہ محض خود مختاری دے دی گئی بلکہ ھخامنشیوں کی سیادت میں دوسری شامی اقوام پر فوقیت بھی مل گئی یا کم از کم انہیں وہ درجہ حاصل ہو گیا جو یونانی دنیا کی نہایت طاقت ور شہری ریاستوں کو حاصل تھا۔ اقتصادی لحاظ سے اُن کے فوائد و منافع نہایت حیرت انگیز تھے، اُنھیں اُس دولت مشترکہ میں حصہ داری مل گئی جو بحیرۂ روم کے شامی ساحل سے شمال و مشرق کی حد درجے دور افتادہ چوکیوں تک پھیلی ہوئی تھیں، یہ چوکیاں یوریشیائی سطح مرتفع کے خشک سغدی کنارے پر واقع تھیں۔ اس اثناء میں مغرب کے اندر ایک فونیقی نو آبادی قائم ہو چکی تھی جو دولت اور طاقت میں شامی شہروں سے اتنی ھی بڑھ گئی تھی جتنی کہ عیسوی سنین میں دور جدید کی مغربی دنیا کی وہ بڑی نو آبادی یورپی ریاستوں سے آگے نکل گئی ھے جو اوقیانوس پار واقع ھے۔ اس فونیقی نو آبادی کی بنیاد اُسی طرح شامی شہروں کے باشندوں نے رکھی تھی جس طرح اوقیانوس پار کی آبادی کی بنیاد یورپی شہروں کی آبادی نے رکھی؛ فونیقیوں نے یونانیوں کے خلاف جو جوابی جارحانہ

۱۔ Temple-State۔ یعنی وہ ریاست جس کا مرکز ھیکل تھا (مترجم)۔

اقدام کیا ، اس میں قرطاجنہ نے سب سے بڑھ کر حصہ لیا ، اس جارحانہ اقدام کو یونانیوں کے نقطۂ نگاہ سے پہلی پیونک[1] جنگ قرار دیا جا سکتا تھا بہ شرط کہ یہ نام رزم و پیکار کے اس طویل ڈرامے میں بہت بعد کے ایکٹ کے لیے مخصوص نہ ہو جاتا ۔ یہ کشمکش کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ سکی لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے اختتام پر یونانی دنیا کی توسیع تمام اطراف میں رک گئی تھی اس لیے کہ مقابلہ کرنے والے معاشروں کے جن ارکان کو خطرہ در پیش تھا ، وہ متحد ہو گئے تھے ۔ امید کی جا سکتی تھی کہ اس کے بعد یونانی اور شامی دنیا کے درمیان مشرقی و مغربی حدیں انہیں خطوط کے ساتھ ساتھ مستقل ہو جائیں گی جو ہخامنشی اور قرطاجنی بانیان سلطنت نے کھینچ دیے تھے ۔

تاہم پانچویں صدی قبل مسیح میں یہ توازن بگڑنا شروع ہوا اور ہم تاریخ کی ایک نہایت مشہور جنگ کے سامنے پہنچ گئے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ مؤرخین اس حد درجے حیرت انگیز حد تک ناخوشگوار انجام کے لیے کون سے وجوہ پیش کرتے ہیں ؟ انسانی معاملات کے یونانی طالب علم کے نزدیک یہ مصیبت ہائی برس[2] کے ایک فعل کا نتیجہ تھی یعنی وہ کہ سکتا تھا کہ غرور زوال کا پیش خیمہ ہے اور دیوتا جب کسی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو اسے دیوانہ بنا دیتے ہیں ؛ دور جدید کا مغربی محقق یا مکتشف ان ماورائے طبعیت توجیہات سے احتراز کرے گا اور محض انسانی سطح پر اپنے تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری رکھے گا ۔

جو کشمکش از سر نو جاری ہوئی اس کا انسانی سبب یہ معلوم ہوتا ہے

---

۱ - Punic wars - قرطاجنہ اور رومہ کے درمیان جو تین لڑائیاں ہوئیں انہیں پیونک جنگیں کہا جاتا ہے ، یہ ۲۶۳ ق - م سے شروع ہوئیں اور ۱۴۶ ق - م میں قرطاجنہ کی بربادی پر ختم ہو گئیں ۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ پہلی پیونک جنگ تیسری صدی قبل مسیح میں نہیں بلکہ چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوئی اس لیے کہ رومیوں نے جو لڑائیاں کیں ، وہ در اصل قرطاجنہ کے خلاف یونانیوں ہی کی رقابت کی میراث تھیں (مترجم) ۔

۲ - Hybris - ایک یونانی دیوی جس کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتی رہتی تھی (مترجم) ۔

که ھخامنشیوں کے تدبر نے ٹھوکر کھائی ، یہ ٹھوکر غلط اندازے کا نتیجہ تھی اور بانیان سلطنت جب وسیع اور تیز فتوحات کر چکتے ھیں اور بڑی بڑی آبادیوں پر تسلط اُن کے لیے آسان کھیل بن جاتا ھے تو عموماً اندازے کی غلطی کر جاتے ھیں ؛ ان حالات میں وہ سمجھ لیتے ھیں کہ کامیابی صرف ان کی قوت بازو کا نتیجہ تھی اور اس حقیقت کو بھول جاتے ھیں کہ اُن کے پیش رووں نے جو کچھ کیا تھا ، اُس سے بھی اُنھیں فائدہ پہنچا یعنی بعض لوگ کسی خطے میں ھل چلا کر زمین کو زراعت کے قابل بنا دیتے ھیں اور فصل بوئی جاتی ھے ، بعد میں بانیان سلطنت آتے ھیں تو اُنھیں پکی پکائی سلطنت مل جاتی ھے ، اپنے ناقابل شکست ھونے کے غلط عقیدے کی آغوش میں اُن کے اندر ایسی خود اعتمادی پیدا ھو جاتی ھے جو زائد حدود سے آگے نکل جاتی ھے - یہی خود اعتمادی انھیں تباھی کی طرف کھینچ لے جاتی ھے اور وہ آنکھیں بند کرکے اُن غیر مفتوح قوموں پر حملے شروع کر دیتے ھیں جن کی قوت و صلاحیت مزاحمت اُن کے لیے حیرت کا سامان بن جاتی ھے - جن انگریز فاتحوں نے ھندوستان میں خستہ حال مغل راج کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا ، انھوں نے بے تکلفی سے یہ بھی سمجھ لیا کہ مشرق ایران کے پہاڑی لوگ اُسی آسانی سے اُن کے مطیع ھو جائیں گے جس آسانی سے پانچ صدی کی تباھی خیز اجنبی حکمرانی کا تجربہ کرنے والے ھندوستانی مطیع ھو گئے تھے جنھیں ایک صدی کے مصائب بد نظمی نے حد درجے بد حال بنا دیا تھا ؛ انگریزوں کو ۱۸۳۸ء–۱۸۴۲ء میں افغانستان کے اندر جس تباھی سے سابقہ پڑا اُس کی اصل حقیقت یہ ھے -

سائرس نے جب لیڈیا کے علاقے فتح کر لیے اور اُن ایشیائی یونانی آبادیوں کو مطیع بنا لیا جو پہلے لیڈیا کی سیادت قبول کیے بیٹھی تھیں تو شاید اُس نے سمجھ لیا کہ وہ ایسی سلطنت اپنے جانشینوں کے حوالے کر رھا ھے جن کی شمال مغربی سرحد قطعی طور پر طے ھو چکی ھے - اپولو نے لیڈیا کے بادشاہ کروئی سس کو متنبہ کیا تھا کہ اگر اُس نے دریائے ھالیس[1] کو عبور کیا تو وہ ایک بڑی قوت کو تباہ کرے گا ؛ یہ انتباہ در اصل کروئی سس کے فاتح سائرس کے لیے تھا جس نے دریا کے کنارۂ مقابل پر پہنچتے ھی توقف اختیار کیا اور بڑی دانش مندی سے صورت حال کا جائزہ لیا - لیڈیا کی

۱- Halys -

سلطنت فتح کر کے سائرس نے نا دانستہ اپنے جانشینوں کے لیے یونانی دنیا سے ایسی کشمکش کا بند و بست کر دیا جو انجام کار ھخامنشی سلطنت کی موت کا موجب بنی -

سائرس نے اپنے اور لیڈیا کے درمیان دریائے ھلیس کی حد کو اطمینان بخش نہ سمجھا اور اپنی فتوحات لیڈیا کی تسخیر سے اناطولیہ کے ساحل تک پہنچا دی ؛ دارا نے یہ خیال کیا کہ یونان کے آزاد باقیات کے ہوتے ہوئے بحری سرحد غیر تسلی بخش ھے لہٰذا پورے یونان کو مسخر کر لینا چاھیے - ۴۹۳ قبل مسیح میں یونانیوں نے ایشیا کے اندر جو بغاوت کی تھی ، اُس کے آخری شعلے بجھا چکنے کے بعد اُس نے یونان کے خلاف کاروائی شروع کر دی - اس سلسلے میں کئی تاریخی شکستوں سے ایران کو سابقہ پڑا جنھیں بیسویں صدی کے مغربی اخلاف یونان تاریخی فتوحات قرار دیتے ھیں مثلاً میراتھان[1] ، سلیمس[2] ، پلاٹائیا[3] اور مائکیل[4] - ایشیا کی یونانی رعایا نے جو بغاوت کی تھی ، اُس کے بدلے میں دارا نے یونانیوں اور اُن کے رفیقوں کی تسخیر کا عزم کر لیا ؛ اس طرح سات سال کی بغاوت (۴۹۹ - ۴۹۳ ق - م) نے ۵۱ سالہ جنگ (۴۹۹ - ۴۴۹ ق - م) کی صورت اختیار کر لی ، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ھخامنشیوں کو مغربی اناطولیہ کے ساحلی علاقے کا نقصان قبول کرنا پڑا - اسی دور میں اھل قرطاجنہ نے یونانیوں پر سسلی میں حملہ کر دیا تھا ، اُس کی وجہ سے حملہ آور کو بدرجہا زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا - یونانیوں کو مغربی سمت میں خشکی پر جو فتح حاصل ہوئی تھی ، اُس کے بعد ایک بحری فتح بھی حاصل ہوئی ، اس کی تفصیل یہ ھے کہ اٹرسکنوں نے یونانی دنیا کی اُس چوکی پر حملہ کر دیا تھا جو کمپانیا میں اٹلی کے مغربی ساحل پر واقع تھی یعنی کیومائی[5] پر جو نیپلز سے ذرا مغربی سمت پر ھے -

غرض ۴۳۱ ق - م میں یہ کیفیت تھی جب خود یونانیوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی ، یہ ایتھنز اور پلے پونیسیا کی جنگ تھی ؛ یہی جنگ جو یونانی معاشرے کے قلب میں شروع ہوئی تھی ، اُس کی شکست کا نشان بن گئی ،

۱- Marathon -
۲- Salamis -
۳- Plataea -
۴- Mycale -
۵- Cumee -

یہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ جاری رہی ، یہاں تک کہ ۳۳۸ ق - م میں فیلقوس شاہ مقدونیہ نے فریقین میں سمجھوتا کرا دیا - یونانی خانہ جنگی نے قرطاجنیوں اور ہخامنشیوں دونوں کے دل میں یہ ناقابل ضبط ترغیب پیدا کر دی کہ یونانی حریفوں کی اس دیوانگی سے جو بہ ظاہر خودکشی کے مترادف تھی ، فائدہ اٹھانا چاہیے - قرطاجنیوں کو اس کوشش میں کچھ زیادہ حصہ نہ ملا البتہ ایرانیوں کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی لیکن اُن کی کامیابی زیادہ دیر باقی نہ رہی - یونانیوں کی خانہ جنگی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فنون جنگ میں اعلیٰ درجے کے ماہر بن گئے ؛ جب مقدونوی اور رومی سپہ سالاروں نے یونان کے نئے ہتھیار یونانی دنیا کے موروثی دشمنوں کے خلاف استعمال کیے تو ہخامنشی اور قرطاجنی سلطنتیں صفحۂ ہستی سے محو ہو گئیں -

اس طرح یونانی معاشرے نے اپنے ہمسایوں کے خلاف جو فوجی اور سیاسی اقدامات شروع کیے تھے ، وہ ایک وسیع دائرے میں داخل ہو گئے جس کا جائزہ گزشتہ باب میں لیا جا چکا ہے لیکن اقدامات کی ایک سطح ثقافتی بھی تھی جس پر یونانی تہذیب نے سکندر اعظم کے دور سے پیشتر بھی اور بعد بھی فائدہ اٹھایا اور پُر امن طریق پر پائدار فتوحات حاصل کیں -

سسلی کے باشندوں نے یونان کی فوجی یورشوں کا پُر زور مقابلہ کیا تھا لیکن ساتھ ہی یونانی حملہ آوروں کی زبان ، مذہب اور فنون بہ طیب خاطر اختیار کر لیے ؛ قرطاجنیوں کے جنگلاتی پردے کے پیچھے ممنوع حلقے میں بھی جہاں کسی یونانی تاجر کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی ، وہی سامان خاص کشش کا باعث تھا جو قرطاجنی تاجر یونان سے لاتے تھے ، خود قرطاجنی صناع ویسی چیزیں نہ بنا سکتے تھے - نپولین کے دور میں فرانسیسی حکومت نے ایک فرمان برلن سے جاری کیا تھا جس کی رو سے برطانیہ کے تجارتی سامان کا داخلہ ممنوع قرار دیا تھا تاہم اس کے بعد بھی برطانیہ کے بنے ہوئے بُوٹ اور بڑے کوٹ خفیہ خفیہ خرید کر نپولین کے فوجیوں کے لیے مہیا کیے جاتے تھے -

ہخامنشی سلطنت کے مغربی صوبوں میں جو لوگ آباد تھے ، انھیں یونانی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کی تحریک اس زمانے میں شروع ہو چکی تھی جب یہ سلطنت وجود میں بھی نہ آئی تھی ؛ یونانیوں کے ایشیائی شہروں سے یونانی ثقافت کی جو کرنیں نکلتی تھیں ، وہ سلطنت لیڈیا کے ذریعے سے دور دور پہنچ جاتی

تھیں - ہیروڈوٹس کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کے کروئسس شاہ لیڈیا یونانیت کا سرگرم حامی تھا لیکن سکندر سے پیشتر کے یونانیوں نے جو سب سے بڑی ثقافتی فتح حاصل کی ، وہ اٹرسکنوں اور ان غیر ایرانی لوگوں میں تھی جو اٹلی کے مغربی ساحل پر آباد تھے - اٹرسکن رومی بانیان سلطنت کے زیر حکومت آنے سے پیشتر خود بہ خود یونانیت کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے ، خود رومیوں کو یونانیت انھیں اٹرسکن ہمسایوں سے ملی تھی -

یونانیت کی سب سے اہم ثقافتی فتح وہ تھی جب رومہ نے یونانیت اختیار کی ، اس سے بڑی فتح کی مثال تاریخ یونان میں ناپید ہے - رومیوں کی اصل خواہ کچھ ہو ، یونانیت اختیار کرتے ہی انھوں نے ایک ایسا فرض اپنے ذمے لے لیا جو اطالیہ کے مغربی ساحل پر آن سے ذرا شمال کی طرف بسنے والے اٹرسکنوں کی استطاعت سے باہر تھا ؛ مغربی اٹلی کے ساحل پر بسنے والے یونانی بھی یہ بوجھ اٹھا نہ سکتے تھے اور دریائے رون[1] کے ڈیلٹا کے پاس بسنے والے یونانیت کے علم بردار بھی اسے پورا نہ کر سکتے تھے - جب اطالوی یونانی اور اٹرسکن بربری حملوں کے سامنے سر بہ خم ہو گئے تو رومیوں نے یونانیت کی لاطینی تعبیر کو کوہ اپی نائن ، دریائے پو اور کوہستان الپس کے پار تک پہنچا دیا بلکہ وہ اسے دریائے ڈینیوب کے ڈیلٹا سے دریائے رائین کے دھانے تک ، اس کے بعد آبنائے ڈوور سے گزر کر برطانیہ میں بھی لے گئے -

(III) <u>موٹھ اور گیہوں :</u> معاصرین[2] کے درمیان مقابلوں کی جو کیفیت ہم نے پیش کی ہے ، اس سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان مقابلوں کے وہی نتائج خاطرخواہ کارآمد سمجھے جاتے ہیں جو حالت امن میں رونما ہوئے ؛ ساتھ ہی ہمیں انتہائی افسوس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کے پرامن تخلیقی مبادلے بہت تھوڑے ہیں اس لیے کہ جب دو یا دو سے زیادہ ثقافتیں ایک دوسری کے ساتھ متصادم ہوتی ہیں تو عام طور پر تباہی خیز کشمکشوں ہی کی صورتیں اختیار کر لیتی ہیں -

اگر ہم دائرے پر پھر ایک مرتبہ نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہندی

۱- Rhone -

۲- اس تلخیص میں وہ حصے نظر انداز کر دیے گئے ہیں جن میں سریانی معاشرے اور مصری معاشرے کا ذکر تھا -

اور چینی تہذیبوں کے درمیان ربط و ضبط کے سلسلے میں پُر امن مبادلے کی ایک ایسی مثال بھی ملتی ہے جو اتنی ہی نتیجہ خیز تھی جتنی کہ اول نظر میں تشدد کی جھلساہٹ سے پاک نظر آتی ہے - مہایان بدھ مت ہندی دنیا سے چینی دنیا میں اس طرح منتقل ہوا کہ دونوں معاشروں کے درمیان جنگ کی نوبت قطعاً نہ آئی اور جس پُر امن ربط ضبط نے یہ اہم تاریخی نتیجہ پیدا کیا ، وہ بہ دستور جاری رہا مثلاً ہندوستان سے بدھ مذہب کے مبلغ چین گئے اور چین سے بدھ مذہب کے جاتری ہندوستان آئے ، ان لوگوں نے آبنائے ملکا کا بحری راستہ بھی اختیار کیا اور خشکی سے راستے بھی دریائے طارم کے ساتھ ساتھ یہاں پہنچے ، یہ سلسلہ چوتھی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک جاری رہا - خشکی کا راستہ بہ کثرت استعمال ہوا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس راستے کا انتظام ہندوستان یا چین کے امن پسندوں نے نہ کیا تھا بلکہ باختری یونانیوں نے کیا تھا جن کا تعلق جارح یونانی معاشرے سے تھا ، پھر ان باختری یونانیوں کے جانشین کوشان بربری اس راستے کے محافظ رہے ، یہ لوگ جنگجو تھے اور جنگی اقدامات ہی کے لیے انھوں نے یہ راستہ بنایا تھا - یونانیوں کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موریہ سلطنت کے خلاف اقدامات جاری رکھ سکیں ، کوشانی چاہتے تھے کہ اُنھیں چین کی ھن سلطنت کے خلاف حملوں کا موقع ملتا رہے -

اگر ہم کسی ایسی مثال کی تلاش میں ہیں جس میں معاصرین کے درمیان مقابلے نے روحانی فیوض پیدا کیے اور فوجی کشمکش کی نوبت ہرگز نہ آئی تو ہمیں زمانۂ ماضی میں اَور پیچھے جانا چاہیے اور اُس عہد پر پہنچ جانا چاہیے جو دوسری نسل کی تہذیبوں سے پیشتر کا عہد ہے یعنی جب ھکسوس کے حملوں کی ضرب نے مصری تہذیب میں جوش اور حمیت کی نئی لہر دوڑا دی تھی اور وہ اپنی زندگی کی میعاد پوری کر چکنے کے بعد اُسے غیر طبعی طوالت دینے کی طرف مائل ہو گئی تھی - اُس دور میں بیسویں اور اکیسویں صدی ق - م کے موڑ سے اٹھارھویں ق - م اور سترھویں صدی ق - م کے موڑ تک دو ہمہ‌گیر سلطنتیں پہلو بہ پہلو موجود تھیں ، ایک مصر کی وسطانی سلطنت ، دوسری سمریوں اور اکادیوں کی سلطنت ؛ شام کو ان کے درمیان خشکی کے پل کی حیثیت حاصل تھی ، کبھی ایک سلطنت اُس پل پر قابض ہو جاتی تھی کبھی دوسری سلطنت لیکن کبھی ان دونوں کے درمیان مسلح تصادم

کی نوبت نہ آئی ۔ یہ تعلق بہ ظاہر پُر امن تھا لیکن ساتھ ہی بہ ظاہر بے نتیجہ بھی تھا اور ہم جس چیز کی تلاش میں ہیں ، اُس کے لیے مزید پیچھے ہٹ کر دیکھ بھال کرنی چاہیے ۔

تہذیبوں کی سرگزشتوں کے بالکل ابتدائی باب کے متعلق تفتیش و تحقیق سہل نہیں ؛ دور جدید کے مغربیوں نے آثار قدیمہ کی دریافت سے معلومات کا جو ذخیرہ فراہم کیا ہے ، اُس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے مورخ کے لیے شفق کی روشنی مہیا ہو گئی ہے ۔ با ایں ہمہ ہم پہلے جس نتیجے پر پہنچے تھے ، اسے پیش نظر لے آنا چاہیے یعنی اعی زیز اور اوسی رس کی جس پرستش نے مصر کی روحانی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کیا ، وہ انحلال پذیر سمیری دنیا کا تحفہ تھی جہاں سوگوار بیوی یا ماں اور مصیبت زدہ شوہر بیٹے کی دل گداز ، ساتھ ہی دل نواز شکلیں سب سے پہلے اشتر اور تموز کے ناموں سے ظہور پذیر ہوئیں ۔ پس اگر یہ حقیقت ہے کہ جو پرستش تمام اعلیٰ مذاہب کا پیش خیمہ تھی ، وہ ایک معاشرے سے جہاں یہ پیدا ہوئی تھی ، دوسری معاصر تہذیب کے فرزندوں کی طرف منتقل کر دی گئی اور اس سلسلے میں کسی جھگڑے یا خونریزی کی نوبت نہ آئی (حالانکہ بعد میں معاصرین کے درمیان جتنے مقابلے پیش آئے وہ جنگ و جدل اور خونریزی سے داغ دار ہوئے) ۔ تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ بادلوں میں قوس قزح کی ایک جھلک مل گئی ہے جو اُن تہذیبوں کے درمیان تعلقات کی سرگزشتوں پر روشنی ڈال رہی ہے جن میں فریقین کو جسمانی ربط ضبط اور مقابلے کی نوبت آئی ۔

بتیسواں باب

معاصرین کے درمیان مقابلوں کا ڈراما

۱- مقابلوں کی سلسلہ بندی

یہ اکتشاف سب سے پہلے ہیروڈوٹس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں کیا تھا کہ معاصر معاشروں کے درمیان جو مقابلے پیش آتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ الگ الگ سامنے آئیں بلکہ سلسلہ بندی[۱] کی شکل بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ یہ اکتشاف اس نے ہخامنشی سلطنت اور یونان کی آزاد سرحدی ریاستوں کے درمیان کشمکش کے حالات بیان کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ اس نے اپنے تاریخی بیانات کو قابل فہم بنانے کے لیے ضروری سمجھا تھا کہ انہیں صحیح تاریخی پس منظر میں آراستہ کر دے۔ اس وقت اس پر منکشف ہوا کہ یونان اور ایران کے درمیان جو نزاع ہوئی، وہ اس نوع کے دوسرے تصادمات کے سلسلے ہی کی ایک کڑی تھی۔ جارحانہ اقدامات کا ہدف محض اپنے دفاع پر قناعت نہیں کرتا، دفاع میں اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ جوابی اقدامات شروع کر دیتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے ڈرامے کا ابتدائی ایکٹ دور جدید کے ان قارئین کے لیے جن کی طبیعتیں سادگی سے معرا ہو چکی ہیں، نظر افروز ہونے سے کہیں زیادہ تفنن کا موجب ہے اس لیے کہ اس کا پلاٹ نہایت عجیب ہے یعنی چار حسین نوجوان عورتیں یکے بعد دیگرے اغوا کی جاتی ہیں؛ جھگڑا شروع کرنے کے ذمہ دار فونیقی تھے (کہانی کی یونانی

۱- یہ Concatenation کا ترجمہ ہے، لاطینی زبان میں Catena سلسلے یا زنجیر کو کہتے ہیں لٰہذا واقعات کی سلسلہ بندی کا مطلب یہ ہوا کہ ایک واقعے سے دوسرا واقعہ پیدا ہوتا گیا۔

تعبیر میں اس کے سوا کوئی امید بھی نہ ہو سکتی تھی)، انھوں نے یونان کی ایک عورت آئی آو[1] کو اغوا کر لیا، یونانی انتقام کے جوش میں ایک فونیقی عورت یوروپا[2] کو اغوا کر کے لے گئے، اس کے بعد یونانی شاہ کول چس[3] کی بیٹی میڈیا[4] کو اٹھا کر لے گئے، ٹرائے کا ایک شہزادہ اٹھا اور وہ یونان سے ہیلن[5] کو اغوا کر کے لے گیا۔ اسی واقعے کے جوش انتقام میں یونانیوں نے ٹرائے کا محاصرہ کیا، یہ محاصرہ سراسر لغو تھا اس لیے کہ اگر یہ عورتیں خود اغوا ہونا نہ چاہتیں تو کوئی انھیں زبردستی ساتھ نہ لے جا سکتا تھا۔ بہ ہر حال اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ پیرس[6] اپنی محبوبہ یعنی ہیلن کو اپنے گھر نہ لایا تھا اس لیے کہ اگر لے آتا تو اہل ٹرائے دس سال کا محاصرہ گوارا نہ کرتے اور ہیلن کو یونانیوں کے حوالے کر دیتے۔ بہ ہر حال ہیروڈوٹس نے عقلیت کی جو ٹھنڈی پچکاری تیار کر رکھی تھی، اس میں سے افسانے اسی طرح پیدا ہوتے رہے تھے اور یہ امر ہیروڈوٹس کی محبوب خصوصیات میں داخل ہے۔ جس زمانے یونانی ٹرائے کے خلاف جنگ کے لیے نکلے تھے، اس زمانے میں ایرس[7] کی جگہ افروڈائٹ[8] نے لے لی تھی اور وہی جنگی معاملات کی مختار دیوی بن گئی تھی۔ ہم اغوا کے سلسلۂ واقعات کو درست تسلیم کریں یا نہ کریں، اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جب ہیروڈوٹس نے ایرانیوں اور یونانیوں کے سلسلۂ کشمکش کی ابتدائی کڑی یونانیوں اور فونیقوں کے مقابلے کو قرار دیا تھا تو گہری بصیرت کا اظہار کیا تھا۔ ہمیں ایرانی جنگوں کے اختتام تک اس خاص سلسلۂ واقعات کے باب میں اپنی رائے کو دہرانا نہ چاہیے البتہ ہیروڈوٹس کے زمانے کے بعد حملوں اور جوابی حملوں کا جو سلسلہ جاری رہا، اس کا سراغ لگاتے ہوئے دیکھنا چاہیے کہ یہ ہمیں کہاں پہنچاتا ہے[9]۔

۱- Io -
۲- Europa -
۳- Colchis - یہ علاقہ قدیم ایشیائے کوچک میں شامل تھا (مترجم) -
۴- Medea -
۵- Helen -
۶- Paris ٹرائے کا وہ شہزادہ جو ہیلن کو یونان سے اغوا کر لایا تھا - (مترجم) -
۷- Ares -
۸- Aphrodite -
۹- ہیروڈوٹس کے نظریے پر مزید تبصرہ اس حصے کے اختتام میں ملاحظہ فرمائیے-

ایرانیوں نے یونان پر یورشوں کے سلسلے میں حیرت انگیز شکستیں کھائیں ، یہ جارحانہ اقدام کے سلسلے میں سزا کی پہلی قسط تھی جو اقدام کرنے والوں پر نازل ہوئی ، اس کا انجام یہ ہوا کہ مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس نے ہخامنشی سلطنت کو مسخر کر کے اس اصل مصیبت ہی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا - سکندر اعظم نے اس نئے ڈرامے کا پہلا ایکٹ شروع کیا ، اُس نے اپنے باپ کی سیاسی وصیت کو لباس عمل پہنانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ؛ اس کے برعکس زرکسیز[1] کو اپنے باپ دادا کی سیاسی وصیت پر عمل پیرائی میں حیرت انگیز ناکامی ہوئی - چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر نے ہخامنشی سلطنت تباہ کر ڈالی ، تیسری صدی قبل مسیح میں رومیوں نے قرطاجنہ کی سلطنت پر قبضہ کر لیا ، اس طرح یونانی معاشرے کو اپنے ہمسایوں پر ایسا وسیع اقتدار حاصل ہو گیا جو چھٹی صدی قبل مسیح کے کسی بڑے سے بڑے حوصلہ مند طالع آزما کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا جب یونانیوں نے تاجروں کی حیثیت میں ٹارٹی سوس[2] کا سفر آغاز کیا تھا یا تنخواہ دار فوجیوں کی حیثیت میں انہوں نے مصر یا بابل میں ملازمت اختیار کی تھی - سکندر کے بعد یونانیوں کے اس خوفناک جارحانہ اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے مشرقی مفتوحین میں ردعمل شروع ہو گیا ؛ یہ ردعمل انجام کار کامیاب ہوا اور وہ توازن پھر بحال ہو گیا جو اُس وقت ٹوٹا تھا جب ایک ہزار سال پیشتر سکندر نے در دانیال کو عبور کیا تھا - سکندر نے جو کچھ کیا تھا اُس کے شیرازے کی درھمی کو ابتدائی دور کے مسلمان عربوں نے اپنی برق رفتار مہموں کے ذریعے سے پورا کر دیا ؛ شام سے ہسپانیہ تک وہ پورے علاقے آزاد ہو گئے جو ایک زمانے میں سریانی معاشرے کے علاقے سمجھے جاتے تھے اور ساتویں صدی مسیحی کے آغاز تک وہ رومی سلطنت اور اس کے جانشیں مغربی گاتھوں کے زیر فرمان تھے -

جو سریائی ہمہ گیر سلطنت عربی خلافت کی شکل میں ازسر نو قائم ہوئی ،

۱- Xerxes -

۲- Tartessus ، جس مقام کا یہ قدیم نام ہے وہ آج کل غالباً قادس کہلاتا ہے یعنی وہ قادس جو ہسپانیہ کے جنوبی و مغربی ساحل پر واقع ہے (Cadiz) اور جو ہسپانیہ کے مغربی ساحل کا ایک مشہور مقام ہے (مترجم) -

اُس میں ھخامنشی اور قرطاجنی سلطنتوں کے تمام علاقے شامل تھے ؛ اُس وقت اُمید کی جا سکتی تھی کہ مقابلوں کا سلسلہ اب جاری نہ رہے گا۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ جو سریائی معاشرہ یونانیوں کے جارحانہ اقدامات کا شکار بنا رہا تھا ، اُس کا بدلہ لینے والے عرب اُٹھے تو اپنے علاقوں پر یورش کرنے والوں کو نکال دینے پر قانع نہ ھوئے ؛ انھوں نے اُسی غلطی کا ارتکاب شروع کر دیا جو دارا سے سرزد ھوئی تھی یعنی دفاع کے بجائے جوابی یورشوں کا سلسلہ شروع کر دیا حالانکہ اُن کے سامنے یہ عذر بھی موجود نہ تھا کہ جو سرحد بیچ میں قائم ھوئی ھے ، وہ مستحکم نہیں اور اگر اسے پیچھے ہٹانا منظور نہیں تو ھر حال میں آگے بڑھنا چاھیے - عربوں نے طارس کی طبعی سرحد کو عبور کر کے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا جو پہلی مرتبہ ۶۷۳ء—۶۷۸ء تک قائم رھا ، دوسرا محاصرہ ۷۱۷ء میں ھوا - اُدھر انھوں نے جبل برانس کی طبعی سرحد کو عبور کر کے ۷۳۲ء میں فرانس پر حملہ بول دیا ، آئندہ صدی میں وہ سمندر کی طبعی حد کو عبور کر کے کریٹ ، سسلی اور اپولیا پر قابض ھو گئے اور دریائے رون کے دھانے سے گری گلیانو تک انھوں نے مغربی مسیحی دنیا کے بحیرۂ روم والے ساحل پر قدم گاھیں پیدا کر لیں ؛ ان بے سبب جارحانہ اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں پاداش بھگتنی پڑی -

قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت میں مسلم یورشیوں کے اقدامات پر سخت اشتعال پیدا ھوا ، اُن کی سوئی ھوئی قوتیں جاگ اُٹھیں ؛ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے حملوں کا جواب صلیبی مہموں کی شکل میں دیا گیا ، آگے چل کر صلیبی مہموں کا ردعمل بھی شروع ھوا اور جن لوگوں کو ان مہموں میں نقصان پہنچا تھا انھوں نے انتقامی یورشیں کیں - صلاح الدین ایوبی اور اُس سے پہلے اور بعد کے مسلمان مجاھدوں نے فرنگی صلیبیوں کو شام سے نکال دیا اور عثمانیوں نے یونانی آرتھوڈکس مسیحیوں کا نامکمل کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا یعنی فرنگی مسیحیوں کو اُن علاقوں سے بھی خارج کر دیا جو رومیوں کے خاص علاقے مانے جاتے تھے - جب سلطان محمد فاتح نے (دور حکومت ۵۱—۱۴۸۱ء) انحلال پزیر یونانی آرتھوڈکس دنیا کے لیے ایک اسلامی ھمہ گیر سلطنت قائم کر دی تو اُس کی زندگی کا کام پورا ھوگیا تھا اور حالات توازن پر آ گئے تھے ، اب موقع آ گیا تھا کہ کشمکش کا سلسلہ ختم ھو جاتا لیکن اس موقع کو ٹھکرا دیا گیا - جس طرح آٹھویں اور نویں صدی میں عرب مسلمان مغربی مسیحیت کے

اُن علاقوں میں دخل انداز ہوئے تھے جہاں اُنھیں نہ جانا چاہیے تھا یعنی فرانس ، اٹلی اور بعض دوسرے مقامات میں اور اس وجہ سے اُن کے خلاف نہایت زبردست مگر انجام کار ناکام جوابی حملے صلیبی مہموں کی شکل میں شروع ہوئے ، اُسی طرح سولھویں اور سترھویں صدی میں ترک مسلمانوں نے ان علاقوں میں مداخلت شروع کی جہاں اُن کا کوئی کام نہ تھا ، وہ دریائے ڈینیوب کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اہل مغرب کے خاص وطنوں میں پہنچ گئے ؛ اب مغربی دنیا میں جو رد عمل شروع ہوا اُس نے ایک نئی اور نہایت خوفناک شکل اختیار کر لی ۔

عثمانی ھلال کی دونوں نوکوں نے مغربی مسیحی دنیا کو اپنی آغوش میں لینے کا جو کام شروع کیا تھا ، وہ کامیابی کے قریب پہنچ گیا لہٰذا مغربیوں کو بحیرۂ روم کی اندھی گلی میں اپنے نقصانات سے دست بردار ہو کر تمام قوتیں اوقیانوس کی تسخیر پر لگا دینی پڑیں جس نے اُنھیں دنیا کا مالک بنایا ۔ مغرب نے عثمانیوں کے جارحانہ اقدامات کا یہ حد درجے کامیاب جواب مہیا کیا ؛ بیسویں صدی مسیحی کے وسط میں کوئی مبصر حالات پر نظر ڈالے تو اُسے ایسا معلوم ہوگا کہ اس کامیاب جواب کا بھی نیا جواب (یا کہنا چاہیے متعدد جواب) معرض ارتقا میں ھے ۔ دیکھیے ہم آئی اور یوروپا کے واقعۂ اغوا سے بہت دور نکل آئے ھیں اور ابھی اس سے نکلنے والا سلسلہ اختتام کو نہیں پہنچا ۔

۲۔ جوابات کا تنوع

ہم نے مقابلوں کا جو اندازہ کیا یا کہنا چاہیے کہ مقابلوں کی سلسلہ بندی کا جو اندازہ کیا (اور اس کی تفصیل ہم پیش کر چکے ھیں) ، اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ ہر مقابلے میں ایک حملہ آور ہوتا ھے جسے ایک فریق ماننا چاہیے اور دوسرا حملے کا شکار ہوتا ھے جسے دوسرا فریق قرار دینا چاہیے ۔ چونکہ یہ اصطلاحات ایک اخلاقی فیصلے کا صدور پیش کرتی ھیں لہٰذا بہتر یہ ھے کہ ہم ایسی اصطلاحات استعمال کریں جو اخلاقی اعتبار سے بے رنگ ہوں مثلاً موثر و متاثر یا اثرانداز اور اثر پزیر کی اصطلاحات یا وہ اصطلاحات استعمال کریں جن سے ہم اس کتاب کے ابتدائی حصے میں آشنا ہو چکے تھے یعنی ایک فریق وہ جو چیلنج پیش کرتا ھے ، دوسرا فریق وہ جو چیلنج کا جواب دیتا ھے ۔ اب ہمارا مقصد یہ دیکھنا ھے کہ جن معاشروں کے سامنے چیلنج پیش

ہوئے اُن کے ردعمل یا جواب کیا تھے اور اُن کی درجہ بندی کیوں کر ہوگی ؟

یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ممکن ہے ابتدائی عامل یا اثرانداز کا حملہ اتنا بے پناہ ہو کہ معمول یا اثر پزیر محکوم بن کر رہ جائے یا بالکل تباہ ہو جائے اور موثر مزاحمت کا کوئی بندوبست نہ کر سکے۔ بہت سے ابتدائی معاشرے جنھیں بدقسمتی سے تہذیبوں کے ساتھ معاملہ پیش آیا، اسی انجام کو پہنچے ؛ وہ اُسی طرح ناپید ہوگئے جس طرح ماریشس میں دور جدید کے مغربی آدمیوں کے پہنچنے پر ڈوڈو[1] ناپید ہو گئے ؛ دوسرے ایک بے حیثیت سی زندگی بسر کر رہے ہیں، انسانی چڑیا گھروں یا حفاظت گاہوں کے اندر اُن میں صرف علم الانسان کے ماہر دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن ہمارا تعلق تہذیبوں سے ہے اور ہمیں اس میں شک ہے کہ کسی بھی تہذیب کو ایسے انجام سے سابقہ پڑا یہاں تک کہ وسطی اور جنوبی امریکہ کی تہذیبیں بھی مستثنیٰ نہیں جو حد درجے کمزور تھیں اور بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شکست کا زخم التیام پزیر نہیں ہوا۔ ممکن ہے مدت تک زندگی نما موت میں مبتلا رہنے کے بعد وہ پھر اُبھر آئیں جس طرح سریائی معاشرہ اُبھر آیا تھا اور ایک ہزار سال تک یونانی معاشرے کے نیچے دبے رہنے کے بعد اُس نے زندگی کا سلسلہ پھر اُستوار کر لیا تھا۔

جس تہذیب پر حملہ ہوا، اُس کے ردعمل کے متبادل نمونوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اُن مثالوں سے آغاز کریں گے جو اصل حملے کا ویسا ہی جواب تھیں اور جواب کی ممتاز ترین شکل یہ ہے کہ قوت کے مقابلے میں قوت استعمال کی جائے مثلاً ہندو اور آرتھوڈکس مسیحی، اسلامی عسکریت کے جارحانہ حملوں کا شکار بنے تھے، اُنھوں نے جواب میں خود عسکریت اختیار کر لی ؛ یہ جواب مغلوں کے لیے سکھوں اور مرہٹوں، عثمانیوں کے لیے یونانی اور سرحدی قوم پرستوں نے مہیا کیا۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں فوجی اعتبار سے کمزور فریق نے اپنے حملہ آور کی فوجی تکنیک میں کمال حاصل کر لیا ؛ روس کے زار پیٹر اعظم کی فوجوں نے چارلس دوازدھم شاہ سویڈن کے مقابلے میں ناروا[2] کے مقام پر ذلت خیز شکست کھائی تو عام

۱- ماریشس کا ایک پرندہ جو مدت ہوئی ناپید ہو چکا ہے (مترجم)۔

۲- Narva -

روایت کے مطابق یہ کہا تھا ”یہی شخص ہمیں سکھائے گا کہ اسے کیوں کر شکست دی جا سکتی ہے“ ۔ اصل سوال یہ نہیں کہ یہ الفاظ کہے گئے یا نہ کہے گئے اس لیے کہ حقائق روز روشن کی طرح آشکارا ہیں ؛ حقائق یہ ہیں کہ چارلس نے سبق سکھایا ، پیٹر نے سبق سیکھا اور انجام کار چارلس کو شکست ہوئی ۔

پیٹر کی حکومت کے کمیونسٹ جانشین پیٹر سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ۔ جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد کمیونسٹ روس کے دشمن مانے جاتے رہے ، کمیونسٹ روسیوں نے محض ان دشمنوں کی صنعتی اور عسکری تکنیک ہی میں کمال حاصل نہ کیا بلکہ جنگ کا ایک نیا طریقہ پیدا کیا یعنی مادی قوت سے جنگ کے فرسودہ طریقے کے بجائے روحانی قوت کا طریقہ استعمال کیا جس میں کلیدی ہتھیار کی حیثیت نظریاتی پروپیگنڈے نے لے لی ۔ پروپیگنڈے کے جس حربے سے کمیونزم نے دنیوی کشمکش اقتدار کے دائرے میں کام لیا ، وہ کمیونسٹوں نے عدم محض سے پیدا نہ کیا تھا ؛ یہ حربہ پہلے پہل اعلیٰ مذاہب کے مبلغوں نے تیار کیا ، پھر دور جدید کے مغربی معاشرے کے دوکان داروں نے اسے اپنا مال بیچنے کے لیے مناسب شکل دے لی ۔

بلاشبہ کمیونسٹوں کا پروپیگنڈا موجودہ دور کے مغربی تاجروں کی تجارتی اشتہار بازی پر فوقیت نہیں لے جا سکتا جو خوب پیسے صرف کرتے ہیں اور منڈیوں کا کھوج لگانے میں کوئی دقیقہ اور سعی اٹھا نہیں رکھتے ، لیکن یہ پروپیگنڈا جن مقاصد کے لیے شروع کیا گیا تھا اور جو کچھ اس نے حاصل کیا ، وہ بالکل مختلف اور حد درجے اہم تھا ۔ اس نے روحانی اعتبار سے بھوکے مغربیوں میں سوئے ہوئے جوش و خروش کو جگا دیا جو روٹی کی تلاش میں تھے اس لیے کہ روٹی کے بغیر کوئی انسان زندہ نہ رہ سکتا تھا ۔ وہ ان تمام الفاظ کو بے تکلف نگلتے گئے جو کمیونزم نے ان کے لیے فراہم کیے اور کبھی یہ سوال نہ کیا کہ آیا یہ خدا کا کلام ہے یا دجال کا ۔ کمیونزم نے مسیحیوں سے کہا کہ طفلانہ باتوں کو چھوڑو اور دوسری دنیا میں رہنے والے فرضی وجود کو اپنا نصب العین نہ بناؤ جس کا وقار واقعی چھن چکا ہے اور بے وجود خدا کی اطاعت کے بجائے اپنے دلوں کی عقیدت نسل انسانی کی طرف منتقل کرو جس کی خدمت کے لیے ہر قوت عمل وقف ہو جانی چاہیے

تاکہ یہاں ارضی بہشت پیدا ہو جائے؛ وہ شے جسے ہم ''سرد جنگ'' قرار دے رہے ہیں، دراصل مادی ساز و سامان جنگ کی سطح پر دئیے ہوئے چیلنج کا جواب تھا جو پروپیگنڈے کی سطح پر دیا گیا اور غیر عسکری سطح پر یہ پہلا جواب نہ تھا جو قدیم وضع کی عسکریت کے چیلنج پر پیش کیا گیا۔

باقی رہا کمیونسٹوں کا ''روحانی'' جواب تو وہ مغربیوں کے لیے روحانی اعتبار سے زیادہ موثر نہ تھا؛ وہ جانتے تھے کہ یہ نظریاتی پروپیگنڈا ایک سامراجی طاقت کے اسلحہ خانے کا معمولی ہتھیار ہے جو مادی ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو چکی تھی۔ اب ہم اُن مثالوں کی طرف آتے ہیں جہاں قوت کے جواب میں قوت کا استعمال بالکل نظرانداز کر دیا گیا لیکن اس معاملے کو اخلاقی برتری سے تعبیر کرنا درست نہ ہوگا؛ ایسے معاملات میں ہم دیکھیں گے کہ یا تو قوت کا موثر مظاہرہ خارج از بحث ہو چکا تھا یا قوت استعمال کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

عسکری چیلنج کے سلسلے میں امن پرورانہ جواب کی ایک ممتاز مثال یہ ہے کہ ہخامنشیوں کے عہد میں سریانی معاشرے نے بابلی دنیا کو گھیرے میں لے لیا؛ یہ اس امر کا نتیجہ تھا کہ جن ایرانی بربریوں نے ایک ہمہ‌گیر سلطنت کی حکمرانی سنبھال لی تھی، وہ سریانی ثقافت کے حلقہ بگوش بن گئے۔ سریانی ثقافت کے جو مبلغ بابلی فاتحوں کو شکست دے چکے تھے اور انھوں نے ایرانی روحوں کو مسحور کر لیا تھا، وہ نہ تو فوجی طالع آزما تھے اور نہ تاجر؛ وہ اپنے وطنوں سے نکالے جا چکے تھے، اشوری یا بابلی جنگجوؤں نے اُنھیں اس غرض سے نکالا تھا کہ اُن کے لیے اپنی محبوب اسرائیلی یا یہودانی فوجی و سیاسی قوت بحال کرنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے اور یہ اندازہ ایک خاص حد تک درست ثابت ہوا۔ بابلی عسکریوں کے سریانی شکار کا جو رد عمل آخرکار جابروں کے ہاتھ سے اختیار چھیننے کا موجب بنا، وہ جابروں کی نگاہوں سے بالکل مخفی تھا؛ یہ جابر ثقافتی سطح پر کسی جواب کے امکان کا اندازہ نہ کر سکے اور انھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے شکار کے لیے ثقافتی تبلیغ کا ایک ایسا میدان مہیا کر دیا جہاں یہ جلا وطن لوگ بہ طیب خاطر کبھی نہ آ سکتے تھے، اُن کی مرضی کے خلاف جابر انھیں لے آئے۔ یہ لوگ جنٹیلوں یعنی غیر یہودیوں میں جا بجا بٹھا دیے گئے تھے، وہاں انھوں نے اپنا ثقافتی اثر استعمال کیا، اس طرح اپنی فرقہ‌وار حیثیت محفوظ رکھی۔ یہودیوں اور ان کی

بیخ کنی کرنے والوں کی سرگزشتوں میں اس صورت حال نے سراسر مخالف مسلک کی صورت بھی اختیار کی یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے الگ کر لینا۔ اذیت رسانی کے جواب میں اپنے آپ کو الگ کر لینا رد عمل کی ایک اور قسم ہے جو اس عمل سے مختلف سطح پر کارفرما ہوتی ہے جس کا اسے جواب سمجھا جاتا ہے؛ علاحدگی کی پالیسی اس وقت زیادہ سادہ شکل میں سامنے آتی ہے جب اس پر کوئی ایسا معاشرہ عمل پیرا ہو جو اپنے آپ کو مادی گڑھ میں محصور کر لے۔ جزیرۂ جاپان کے معاشرے کو جب صنعت کار مغرب سے پہلے پہل سابقہ پڑا تو پرتگیز دخیل کاروں کے سلسلے میں اس کا رد عمل یہی تھا؛ جب اسی زمانے میں پرتگیز حبشے کے پہاڑی علاقوں میں پہنچے تو وہاں بھی ان کے متعلق اسی پالیسی پر عمل ہوا۔ تبت بھی ایک ایسی ہی سطح مرتفع ہے جہاں باہر سے کوئی شخص بہ آسانی نہیں پہنچ سکتا، اس حصار میں معدوم ہندی معاشرے کا مہایان متحجر صورت میں موجود رہا لیکن مادی علاحدگی کے یہ کارنامے موزوں جغرافیائی عوامل کی تائید کے باوجود تاریخی نقطۂ نگاہ سے اتنے دلچسپ نہیں ہو سکتے جتنی وہ نفسیاتی علاحدگی جو کسی خاص آبادی نے اپنی زندگی کے لیے خطرہ پیش آ جانے پر بہ طور جواب اختیار کی؛ محدود آبادی کو جغرافیائی حالات میں ایسے خطرے پیش آ سکتے ہیں جو اسے مدد دینے کے بجائے ہمسائے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اس قسم کی علاحدگی درحقیقت ایک سلبی کاروائی ہے اور جہاں کہیں اس نے کامیابی کا کوئی درجہ حاصل کیا تو چھان بین کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے ساتھ مثبت وضع کے بھی چند رد عمل موجود تھے۔ کسی محدود آبادی کی زندگی میں نفسیاتی علاحدگی اس وقت تک بالکل ناممکن ہوگی جب تک وہ آبادی اقتصادی سطح پر خاص صلاحیت کا درجہ حاصل نہ کر لے گی اور ان اقتصادی مواقع سے پورا فائدہ نہ اٹھا لے گی جو اس کے سامنے آئیں گے۔ اقتصادی تخصیص میں غیر معمولی درجۂ کمال اور روایتی قانون کی جزئیات پر حرف بہ حرف عمل یہودیوں کی ہر مخصوص آبادی کے دو حربے رہے ہیں جو ناقابل شکست سرحدات اور فوجی قوت و طاقت کے مصنوعی بدل بنے رہے۔

قوت کے جواب میں ثقافتی سطح پر سرگرمیوں کا سلسلہ دوسرے معاشروں نے بھی جاری رکھا جو کسی اجنبی طاقت کے دباؤ میں بری طرح پٹ گئے تھے البتہ انھیں ایک جداگانہ محدود آبادی کی صورت اختیار کرنی پڑی تھی؛

عثمانی سلاطین کی آرتھوڈکس مسیحی رعایا اور مغلوں کی ہندو رعایا دونوں نے ان شمشیر زنوں کے مقابلے میں قلم رانی سے کام لے کر ان کا تختہ اُلٹ دیا، ہندوستان اور آرتھوڈکس مسیحیت کے مسلم فاتح اپنی سابقہ فوجی فتوحات کے سراب میں اُلجھ کر تاریخ کے آئندہ باب کے حقائق سے آنکھیں بند کر بیٹھے، آئندہ باب میں اُن کی سلطنت تقسیم ہو کر فرینکوں کے حوالے ہو گئی، رعیتوں نے بھانپ لیا تھا کہ مغرب کامیاب ہونے والا ہے لہٰذا انھوں نے نئے نظام کے طور طریقے اختیار کر لیے۔

قوت کے چیلنج کے لیے یہ غیر متشدانہ جواب تھے، ہم اُن پر غور کر چکے ہیں؛ اُس سے واضح ہوتا ہے کہ اعلیٰ مذہب پیدا کرنے کے حد درجے مثبت اور حد درجے امن پرور جواب کے مقابلے میں اُن کی کچھ حیثیت نہیں۔ یونانی معاشرے نے مشرقی معاشروں پر جو اثر ڈالا اُس کے جواب میں سبیل کی پرستش، ایزیز کی پرستش، متھرائیت، مسیحیت اور مہایان ظہورپذیر ہوئے؛ بابلی معاشرے نے سریانی معاشرے پر جو فوجی اثر ڈالا، اُس کے جواب میں یہودیت اور زر تشتیت کا ظہور ہوا۔ مذہبی نمونے کے یہ جواباب ہمیں پیش نظر چھان بین کے حدود سے باہر لے جاتے ہیں اور ہم اس مبحث پر پہنچ جاتے ہیں کہ ایک تہذیب دوسری کے پیش کیے ہوئے چیلنج کے سلسلے میں کن کن طریقوں پر عمل پیرا ہو سکتی ہے اس لیے کہ جب دو تہذیبوں کے درمیان مقابلہ اعلیٰ مذہب کے ظہور کا باعث بنتا ہے تو اس نئے ایکٹر کا داخلہ اس امر کا نشان ہوتا ہے کہ نیا کھیل شروع ہونے والا ہے جس کے ایکٹر بھی مختلف ہوں گے اور جس کا پلاٹ بھی مختلف ہوگا۔

تینتیسواں باب

معاصرین کے درمیان مقابلوں کے نتائج

۱۔ ناکام حملوں کے بعد کی پیداوار

معاصر تہذیبوں کے درمیان مقابلے کے اثرات و نتائج نہایت سازگار حالات میں بھی فریقین کے لیے خلل انگیز ہو سکتے ہیں، ہر تہذیب نشو و ارتقا کی حالت میں ہر حملے کو کامیابی سے رد کرتی ہے؛ اس سلسلے کی نہایت اہم پرانی مثال وہ اثر پیش کر رہا ہے جو ہخامنشی سلطنت کے حملے کو ناکام بنانے کے بعد یونانی معاشرے پر پڑا۔

اس عسکری ظفرمندی کا پہلا محسوس و مشہود مجلسی اثر یہ ہوا کہ یونانیت کو عمل و حرکت کے ہر میدان میں پھول کی طرح کھل جانے کے لیے تحریک مل گئی لیکن اس مقابلے کا سیاسی اثر پچاس سال میں یہ ہوا کہ یونان پر وہ تباہی نازل ہوئی جس سے بچنے میں وہ پہلے ناکام رہا، پھر اس کی تلافی بھی نہ کر سکا۔ جنگ سلیمس کے بعد جو سیاسی تباہی نازل ہوئی اس کا اصل سرچشمہ ایتھنز کا اچانک اور شان دار عروج تھا؛ یہی واقعہ جنگ سلیمس کے بعد یونانی ثقافت کے دوسرے کارناموں کا مصدر تھا۔

ہم اس کتاب میں پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ایرانیوں کے ساتھ جنگ سے پیشتر کے دور میں یونان ایک اقتصادی انقلاب کو پایۂ تکمیل کو تک پہنچا چکا تھا، اس انقلاب کے ذریعے یونانی لوگ اپنی روز افزوں آبادی کے لیے ضرورت کی چیزیں مہیا کرنے کے قابل ہو گئے تھے؛ ان کے علاقوں میں توسیع کا کوئی امکان نہ رہا تھا لہٰذا انھوں نے بعض فنون میں تخصیص کا نیا اقتصادی پروگرام تیار کیا اور اپنے تمام اجزاء کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کا بندوبست کر لیا؛ اس طرح پرانے اقتصادی نظام کی جگہ نئے اقتصادی نظام نے لے لی جس میں یونان کی ہر شہری ریاست اقتصادی اعتبار سے خود

ایک یونٹ تھی - اس اقتصادی انقلاب میں ایتھنز کا حصہ بڑھا ہوا اور فیصلہ کن تھا لیکن اسی انداز کا نیا سیاسی ڈھانچہ تیار کیے بغیر اس اقتصادی نظام کو قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا - یوں چھٹی صدی ق - م کے اختتام سے پیشتر کسی نہ کسی نوع کا سیاسی اتحاد یونانی دنیا کی مجلسی اور اجتماعی ضرورت بن گیا تھا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ضرورت کی تکمیل ایتھنز کے سولن[1] اور پیسس ٹریٹس[2] کے ذریعے نہیں بلکہ سپارٹا کے چلون[3] اور کاومی نس[4] کے ذریعہ ہوگی -

بد قسمتی سے دارا نے یہ خوفناک فیصلہ کر لیا کہ وہ ایشیائی یونان ہی کو نہیں بلکہ یورپی یونان کو بھی ہخامنشی سلطنت کے ماتحت لے آئے گا؛ اس سے جو نازک صورت حال پیدا ہوئی، اس میں نمایاں کردار ادا کرنے کا معاملہ سپارٹا نے ایتھنز کے حوالے کر دیا؛ نتیجہ یہ نکلا کہ جس یونان کی نجات کا دار و مدار اتحاد پر تھا، وہ دو حریف نجات دھندوں کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا جن میں سے دونوں بلحاظ قوت و طاقت یکساں حیثیت کے مالک تھے - اسی صورت حال نے معاملے کو ایتھنز اور ہلے پونیسیا کی جنگ تک پہنچایا اور اس جنگ سے جو نتائج پیدا ہوئے، وہ بھی مذکورہ بالا صورت حال ہی کا نتیجہ تھے -

سیاسی اعتبار سے یک رخاپن اختیار کرنے کی اسی مصیبت سے یونانی دنیا کی جانشین آرتھوڈکس مسیحت کو سابقہ پڑا؛ اس نے بھی اپنے ظہور کے ساتھ ہی سریانی معاشرے پر حیرت انگیز فتح حاصل کی تھی لیکن انجام کار نتیجہ یہ نکلا کہ سریانی معاشرہ عربی خلافت کی شکل میں دوبارہ قائم ہو گیا - جب عرب قسطنطنیہ پر ۶۷۳ء—۶۷۷ء والی پیش قدمی کرنے والے تھے تو آرتھوڈکس مسیحیت کی اناطولی فوج اور ارمن فوج کے درمیان ایک دوسری پر برتری کے لیے خانہ جنگی شروع ہونے والی تھی، یہ صورت حال آرتھوڈکس مسیحیت

۱- Solon - یونان کا مشہور حکیم اور قانون ساز جو وہاں کے سات دانش مندوں میں شمار ہوتا ہے (۶۰۰ - ۵۳۹ ق - م) (مترجم) -

۲- Peisistratus -

۳- Chilon -

۴- Cleomenes - سپارٹا کا پہلا بادشاہ (۴۸۹ - ۵۱۹ ق - م) (مترجم) -

کے لیے خودکشی کے مترادف تھی۔ شاھنشاہ لیو سوم[1] اور اس کے بیٹے کانسٹنٹائن[2] پنجم کی عقل مندی اور دوراندیشی سے یہ مصیبت ختم ہوئی، انھوں نے دونوں حریف فوجوں سے کہا کہ اپنا جھگڑا ختم کرو اور مشرق رومی سلطنت میں شامل ہو جاؤ۔ ان کا جذبۂ وفاداری اس اپیل کے آگے بے اختیار جھک گیا کہ قسطنطنیہ ایک نیا روما ہے جس نے موت کے بعد نیا جنم لیا ہے لیکن کسی مردہ شے کو از سر نو دوسری شکل میں زندہ کر لینے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ پاداش سے بچاؤ کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے۔ جو آرتھوڈکس مسیحیت شیرخوارگی کی حالت میں تھی اسے مطلق العنان سلطنت کی ذمہ داریوں کا حامل بنا دیا گیا؛ اس طرح لیوسائرس نے معاشرے کی سیاسی نشو و ارتقا کو ایک ناخوش گوار رخ پر لگا دیا جو آگے چل کر مہلک ثابت ہوا۔

اگر ہم ان مثالوں کو سامنے لائیں جو ناکام حملوں کے بعد کی پیداوار پر مشتمل ہیں (ایسے حملے نہیں جن کا جواب دینے والے کامیاب ثابت ہوئے بلکہ ایسے حملے جن میں حملہ آوروں نے شکست کھائی) تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بعد میں جو چیلنج پیش آئے وہ لازماً زیادہ سخت و شدید ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر ھٹیوں نے چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصر کے ایشیائی علاقوں کو مسخر کر لینے کی ناکام کوشش کی، اس وجہ سے وہ حد درجے کمزور ہو گئے؛ نتیجہ یہ نکلا کہ منوی دور کے بعد مہاجرت کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس کے تموج میں یہ غرق ہو گئے، صرف کوہ طارس میں ایک مقام پر متحجر مجموعۂ انسانی کے طور پر وہ باقی رہے۔ جو یونانی سسلی میں مقیم تھے انھوں نے اپنے فونیقی اور اٹرسکن حریفوں کے خلاف بے نتیجہ جارحانہ اقدامات شروع کیے؛ نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر ھلکے درجے کا سیاسی فالج گر گیا جس سے ان کی فنی اور ذہنی سرگرمیاں ماؤف نہ ہو سکیں۔

۲۔ کامیاب حملوں کے بعد کی پیداوار

<u>(الف) معاشرے پر اثرات</u>: ہم اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں

۱۔ Leo III ۔

۲۔ Constantine ۔

دیکھ چکے ہیں کہ معاصروں کے درمیان مقابلے کے وقت اگر حملہ اور ثقافتی تنویر کے ذریعے سے ہدف حملہ کے دائرے میں پہنچ جائے تو اس مقابلے کے دونوں فریقوں کے متعلق عموماً ثابت ہوتا ہے کہ وہ دور انحلال میں داخل ہو چکے ہیں اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ انحلال کے مختلف معیاروں میں سے ایک معیار یہ بھی ہے کہ معاشرے کے اندر انشقاق پیدا ہو جائے اور اس کے دو ٹکڑے بن جائیں؛ ایک اقلیت جس کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہو لیکن اس میں تخلیق کا کوئی جوہر نہ رہا ہو، دوسرا ٹکڑا پرولتار کا ہو جو اخلاقی نقطۂ نگاہ کے مطابق اپنے سابقہ لیڈروں سے بے تعلق ہو چکا ہو اور وہ لوگ صرف ''آقا'' رہ گئے ہوں۔ یہ مجلسی انشقاق اس معاشرے کے جسم میں بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کی ثقافتی تنویر اس کے سایوں کے معاشرے میں کامیابی سے پہنچ رہی ہو؛ اس ناخوش‌گوار اور غیر مطلوب کامیابی کا نہایت واضح نتیجہ وہ مجلسی علامت ہوتی ہے جو داخلی پرولتار میں اجنبیت پیدا کر دیتی ہے اور مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

پرولتار اگر خالص ملکی پیداوار بھی ہو تو معاشرے کے لیے داخلی طور پر ایک ناخوش‌گوار عنصر ہوتا ہے لیکن اگر اس کی تعداد بڑھتی جائے تو ناخوش‌گواری بھی اسی رفتار سے بڑھ جاتی ہے اور اجنبی آبادی سے کچھ چیزیں لے لینے کے باعث ثقافتی نمونے میں رنگا رنگی اور بوقلمونی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاریخ ان سلطنتوں کی نہایت اہم مثالیں پیش کرتی ہے جو خارجی پرولتار کی تعداد بڑھا کر اپنے لیے الجھنیں پیدا کرنے پر رضامند نہ تھیں؛ رومی شہنشاہ آگسٹس نے اپنی فوجوں کو سلطنت کی سرحد دریائے فرات سے آگے لے جانے کی اجازت نہ دی، آسٹریا کی ہیپش برگ سلطنت نے اٹھارھویں صدی میں بھی اور اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے نصف اول میں بھی جرمن فتوحات کے وقت اپنی سرحد جنوب مشرق کی طرف بڑھانی پسند نہ کی اس لیے کہ اس طرح اس کی آبادی میں سلافی آبادی کا اضافہ ہو جاتا حالانکہ پہلے ہی اس کی آبادی میں گوناں‌گوں عناصر شامل ہو چکے تھے؛ جمہوریۂ امریکہ نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد یہ مقصد سراسر مختلف ذرائع سے حاصل کر لیا یعنی ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء میں ایسے قانون بنائے جن کے مطابق باہر سے آنے والے تارکان وطن کی تعداد حد درجے گھٹا دی گئی۔ انیسویں صدی میں جمہوریۂ امریکہ کی حکومت نے زیادہ کشادہ دلانہ طرز عمل اختیار کیا تھا جسے

یہودی ناول نگار اسرائیل زینگ ول نے طنزاً ''کایا پلٹ'' کا نام دیا تھا ؛ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ باہر سے جتنے بھی آدمی آئیں گے خصوصاً یورپ کے تارکان وطن ، انھیں جلد سے جلد سچے محبان وطن امریکی بنا لیا جائے گا اور چونکہ اس جمہوریت کے وسیع علاقے صنعتی لحاظ سے فرومایہ تھے اس لیے باہر سے آنے والوں کے لیے خیر مقدم کے اصول پر عمل ہو رہا تھا - پہلی جنگ عظیم کے بعد زیادہ محتاط اور دانش مندانہ نقطۂ نگاہ بروے کار آ گیا ؛ محسوس کر لیا گیا کہ ''کایا پلٹ'' کا نتیجہ بے احتیاطی کی حالت میں خطرناک بھی ہو سکتا ہے ، رہا یہ سوال کہ اجنبی پرولتار کو جسماً باہر رکھنے کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ اس کے افکار و خیالات بھی داخل نہ ہو سکیں گے جاپانی اصطلاح میں انھیں ''خطرناک خیالات'' قرار دیا جاتا ہے یہ ایک الگ سوال تھا جس کا جواب نفی میں نکلا -

جو تہذیب جارحانہ اقدام میں کامیاب ہوتی ہے ، اسے مجلسی لحاظ سے ایک خاص قیمت ادا کرنی پڑتی ہے یعنی جس اجنبی کے خلاف اقدام ہوتا ہے ، اس کی ثقافت آہستہ آہستہ جارحانہ اقدام کرنے والے معاشرے کے داخلی پرولتار کی جوئے حیات میں شامل ہوتی رہتی ہے اور اسی تناسب سے اس اخلاقی خلیج میں توسیع ہوتی جاتی ہے جو اس اجنبی پرولتار اور آئندہ بننے والی مقتدر اقلیت میں ابتدا ہی سے پیدا ہو جاتی ہے - رومی طناز جووینل[1] نے دوسری صدی مسیحی کے اوائل میں لکھتے ہوئے کہا تھا کہ شام کا دریا نہرالعاصی[2] دریائے ٹائبر میں شامل ہو گیا ہے ؛ دور جدید کے مغربی معاشرے نے اپنے اثر کی روشنی پورے ربع مسکون میں پہنچا دی ہے ، محض نہرالعاصی ہی نہیں جو بالکل چھوٹا سا دریا ہے بلکہ گنگا اور ینگٹسی[3] جیسے دریا ٹیمز[4] اور ہڈسن[5] میں شامل ہو گئے ہیں ؛ ڈینیوب نے اپنے بہاؤ کا رخ پلٹ لیا ہے اور اس میں

۱- Juvenal -

۲- جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہ Orontes کا عربی نام ہے (مترجم) -

۳- چین کا دریا (مترجم) -

۴- انگلستان کا مشہور دریا جس پر لندن واقع ہے (مترجم) -

۵- جمہوریہ امریکہ کا دریا ، مطلب یہ ہے کہ ہر تہذیب مغربی تہذیب سے متاثر ہے (مترجم) -

رومانیا ، سرویا ، بلغاریا اور یونان کے جو ثقافتی اجزاء موجود تھے ، انھیں واپس لے جا کر ویانا پہنچا دیا ہے جو پہلے ہی کایا پلٹ کے مختلف اثرات سے لبریز تھا ۔

جو فریق حملے کا نشانہ ہو ، اس کے مجلسی نظام پر کامیاب حملے کے اثرات زیادہ پیچ در پیچ ہوتے ہیں ؛ بایں ہمہ ان کی مضرت رسانی کم نہیں ہوتی ۔ ایک طرف ہم پر اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ ثقافت کا جو عنصر اپنے اصل معاشرے میں نہ محض بے ضرر بلکہ مفید ہوتا ہے ، اسے اگر باہر سے کسی اجنبی معاشرے میں داخل کیا جائے تو اس کے اثرات نئی قسم کے اور تباہی خیز ہوتے ہیں ؛ اس نتیجے کو ایک ضرب المثل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی کے کھانے کا گوشت دوسرے کے لیے زہر ثابت ہو سکتا ہے ۔ اس کے برعکس ہمیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب کوئی اکا دکا ثقافتی عنصر اس معاشرے کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے جو حملے کا ہدف ہو تو پھر یہ عنصر دوسرے عناصر کو بھی اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے ۔

اجنبی مجلسی ماحول پر کسی بیرونی ثقافتی عنصر کے تباہی خیز اثرات کی مثالیں ہم دیکھ چکے ہیں ، ان الم ناموں کا مطالعہ بھی کر چکے ہیں جو مغربی دنیا کے عجیب و غریب سیاسی اداروں کے اثرات نے مختلف غیر مغربی معاشروں میں پیدا کیے ۔ مغرب کے سیاسی نظریے کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ وہ جغرافیائی قرب کے اتفاقی مادی حادثے کو سیاسی اتحاد کا اصول بنانے پر مصر ہے ، مغربی مسیحی معاشرے کے پیدا ہونے کے وقت مغربی گاتھوں نے اسی اصول کے ماتحت مقامی یہودی آبادی کے لیے زندگی ناقابل برداشت بنا دی تھی ؛ اس طرح مغربی گاتھوں نے جو مصیبت پیدا کی تھی ، اس نے مغربی مسیحیت کے وطنوں سے باہر دنیا کے لیے اذیت کا سامان مہیا کر دیا ، جدید مغربی دنیا کے ثقافتی اثرات کی متحرک لہریں مغرب کے اس عجیب و غریب سیاسی نظریے کو دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں لے گئیں ۔ علاقائی اقتدار کا پرانا ادارہ جس پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں مشتمل تھیں ، اس کی جگہ جمہوریت کی نئی روح نے لے لی جس کے اثرات میں نئی تیزی اور تندی پیدا ہو چکی تھی ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو صدی ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی اس میں لسانی قومیت نے ڈینیوب کی ہیپس برگ شہنشاہی کا شیرازہ درہم برہم کر ڈالا ؛

ایک زمانے میں پولینڈ اور لتھوانیا نے مل کر بادشاہی قائم کر رکھی تھی ، اٹھارھویں صدی کے اختتام کے قریب ہیپس برگ ، ہوھنزولرن اور رومانوف (آسٹریا ، جرمنی ، روس) کی سلطنتوں نے پولینڈ کو باہم تقسیم کر لیا۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ کے نقشے میں جو انقلابی تبدیلیاں ہوئیں ان میں پولینڈ اور لتھوانیا کے باشندوں کو بھی عارضی طور پر سیاسی آزادی کی محل نظر برکت حاصل ہوگی ؛ ۱۹۱۸ء میں یہ تینوں سلطنتیں درھم برھم ہو گئیں یعنی روس ، جرمنی اور آسٹریا ۔ اب پولینڈ کے دل میں غیر معمولی برتری کے جذبات پیدا ہوئے ، اس نے ۱۷۷۲ء کے حدود از سر نو قائم کرائے تاکہ پولستانیوں کو آرام سے رہنے کی جگہ مل جائے ؛ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لتھوانیا اور یوکرین کے باشندوں میں مزاحمت کا زبردست جذبہ بیدار ہو گیا۔ پہلے وہ اس اعلیٰ قومی دولت مشترکہ میں پولستانیوں کے حصہ دار تھے جو ۱۵۶۹ء میں قائم ہوئی تھی ، پولستانیوں کی رعایا نہ تھے۔ بعد کے سنین میں ان کے درمیان جھگڑے مہلک صورت اختیار کرتے گئے ، یہ جھگڑے لسانی قومیت کی روح بد نے پیدا کیے تھے ؛ اس طرح ۱۹۳۹ء میں روس اور جرمنی کے درمیان ایک نئی تقسیم کے لیے راستہ ھموار ہو گیا ، آخر نہایت خوف ناک جان کاھیوں اور جان سوزیوں کے بعد روسی کمیونسٹوں کا استبداد ۱۹۴۵ء میں دوبارہ قائم ہوا۔

مغربی دنیا کے روایتی ادارے میں جدید مغرب نے جو اصلاحی موشگافیاں کیں اور اسے آگے بڑھایا، اس سے مشرقی یورپ کی سرحدوں پر ویسے درد انگیز اور الم ناک اثر نہ پڑے جیسے کہ اس زھر ھلاھل نے سلطنت عثمانیہ کی سیاسیات میں داخل ہو کر پیدا کیے۔ اٹھارھویں صدی کے پولینڈ اور لتھوانیا کی افسوس ناک بد نظمی یا آسٹریا کے ہیپس برگ خاندان کی وہ بادشاہی جس میں وقتاً فوقتاً اچھے دور بھی آتے رہے ، بہ لحاظ قدر و قیمت عثمانیوں کے نظام ملت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے ؛ اس نظام ملت کا مقصود و مدعا یہ تھا کہ جو قومیں جغرافیائی اعتبار سے مل جل گئی تھیں اور مغربی یورپ کی ان قوموں کی طرح انھیں الگ الگ نہ کیا جا سکتا تھا جو مختلف حلقوں میں محصور ہو گئی تھیں بلکہ ان میں پیشہ وری کے لحاظ سے زیادہ مشابہت تھی ، ان کی مشترکہ جمعیت کے لیے ایک ایسا سیاسی دستور تیار ہو جائے جو قابل عمل بھی ہو اور جداگانہ قومیتوں کے دستور کا مناسب بدل بن بھی سکے ؛ یہ ان سب کا مشترکہ

مسئلہ تھا جس کا حل نکالنا ضروری تھا ۔ ان عثمانی ملتوں کو جبر و تشدد کے ذریعے سے الگ الگ کرکے ،قتدر آزادقومی ریاستوں کی اجنبی شکل دے دینے کی جو کوششیں کی گئیں ، ان پر ہم ایک سابقہ حصے کے اوراق میں بحث کر چکے ہیں اور اسے یہاں دھرانا نہیں چاہتے البتہ یہ ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کی ہندوستانی سلطنت کو دو حریف قومی حکومتوں یعنی پاکستان اور ہندوستان کی شکل دے دینے سے جو لرزہ انگیز مظالم و مصائب پیدا ہوئے ، وہ قومیت کے مغربی نظریے کے مضر اثرات کی مثالیں ہیں ۔ بالکل یہی کیفیت فلسطین میں پیش آئی جہاں برطانیہ کا انتداب قائم تھا اور اس سے اسرائیل اور شرق اردن کی دو حریف حکومتیں رو نما ہوئیں[1] ۔ قومیت کا یہ مغربی نظریہ اس مجلسی ماحول میں داخل ہوتا رہا جہاں جغرافیائی لحاظ سے قومیں مل جل کر رہنے کی اہل بن گئی تھیں اور وہ ملتوں کی شکل میں منظم تھیں ۔

اگر ثقافتی عناصر کو ان کے اصل ڈھانچے سے الگ کر کے کسی اجنبی ماحول میں داخل کر دیا جائے تو اغلب ہے کہ وہ اپنے تباہی خیز ممکنات کو بروئے کار لے آئیں ؛ ہم اقتصادی سطح پر اس کی مثالیں پیش کر چکے ہیں ۔ باہر سے پہنچی ہوئی مغربی صنعت کاری کے اخلاق سوز اثرات جنوبی اور مشرق ایشیا میں خاص طور پر نمایاں ہوئے اس لیے کہ وہاں ایک اجنبی صنعتی انقلاب نے جس کی رفتار مغرب کی بے پناہ اقتصادی سرگرمیوں نے تیز تر کر دی تھی ، معاشرے کا ایک ایسا جغرافیائی ملغوبہ پیدا کر دیا تھا جس کی قومیں ابھی تاؤ پورا ہونے کے بعد ایک جنس نہ ہو سکی تھیں ، بلکہ اپنی اقتصادی بھٹی کے لیے انسانی ایندھن فراہم کرنے میں مصروف تھیں :

دور جدید کی دنیا میں اقتصادی قوتوں نے ہر جگہ سرمایہ اور محنت ، صنعت اور زراعت بلاد اور دیہات کے درمیان

۱۔ تعجب ہے مصنف نے شرق اردن کی ریاست کو فلسطین کی تقسیم میں اسرائیلی ریاست کا ہم سر قرار دیا ۔ شرق اردن کی ریاست پہلی جنگ یورپ کے بعد قائم ہوئی تھی ؛ البتہ تقسیم فلسطین میں عربوں کے بڑے حصے کو شرق اردن سے ملا دیا گیا تھا اور غزہ کا علاقہ جو مصری مقبوضات سے متصل تھا ، مصر کو دے دیا گیا (مترجم) ۔

تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی ہے ۔ دور جدید کے مشرق میں یہ کشیدگی بہت بڑھی ہوئی نظر آتی ہے اس لیے کہ وہاں نسلی خطوط کے مطابق بھی اختلاف موجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اجنبی مشرق ، یورپی اور دیسی باشندوں کے درمیان ایک پردۂ حائل ہی نہیں بلکہ دیسی باشندوں اور دور جدید کی دنیا کے درمیان ایک روک بھی بنا ہوا ہے ؛ ہم کہ سکتے ہیں کہ صلاحیت ایک عظیم الشان اور فلک بوس مغربی عمارت ہے جو مشرقی زمین پر تعمیر ہوئی اور دیسی باشندے اس کی پہلی منزل ہیں ؛ سب ایک ہی ملک میں رہتے تھے لیکن عمارت مختلف دنیا سے آئی تھی یعنی مغربی دنیا سے جہاں دیسی باشندوں کے لیے باریابی کا کوئی موقع نہ تھا ۔ اس مجموعی اقتصاد میں مقابلہ مغربی دنیا سے زیادہ تیز ہے : ''یہاں مادیت ، عقلیت ، انفرادیت اور اقتصادی مقاصد کا ارتکاز یک آہنگ مغربی ممالک کے بجائے زیادہ مکمل اور زیادہ واضح ہے ؛ اکسچینج (مبادلہ) اور مارکیٹ (منڈیاں) میں کامل انہماک ، ایک سرمایہ دار کی دنیا جس کا موضوع کاروبار ہو اور نام نہاد سرمایہ دار ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع پیمانے کی سرمایہ داری ؛ یہ چیزیں ماضی سے آہستہ آہستہ بڑھی اور پھلی پھولیں ، اب بھی سیکڑوں جڑوں کے ذریعے سے اس کے ساتھ وابستہ ہیں''[۱] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوں یہ مختلف مقبوضات اگرچہ بہ ظاہر مغربی خطوط کے مطابق از سر نو منظم ہو چکے ہیں لیکن در اصل انھیں اقتصادی نظاموں کے طور پر منظم کیا گیا ہے ؛ غرض یہ ہے کہ وہ خام جنسیں پیدا کریں ، یہ نہیں کہ مجلسی زندگی معرض وجود میں آ جائے ۔ قرون وسطیٰ میں حکومتوں کے جو نظام تھے ، انھیں اچانک بدل کر

۱۔ ڈاکٹر جے ۔ ایچ بوئیک (Boeke) کی کتاب ، صفحہ ۸۱ ۔

دورحاضر کے کارخانے بنا لیا گیا[1]۔

ثقافتی تنویر و پزیرائی کا دوسرا ''قانون'' یہ ہے کہ جس ثقافتی عنصر نے اپنے آپ کو کسی ایسے معاشرے میں قائم کر لیا ہے جس سے روشنی باہر نکل رہی ہو ، اُس میں یہ رجحان بھی ہوتا ہے کہ وہ پزیرائی والے معاشرے میں جگہ پیدا کر لے ؛ اس کے لیے وہ اپنے تمام ثقافتی اجزائے ترکیبی کو از سر نو جمع کرکے متحد کر لیتا ہے جو تنویر کے دوران میں الگ الگ ہوئے تھے ۔ اس رجحان کو ایک مزاحم رجحان سے سابقہ پڑتا ہے یعنی جو معاشرہ حملے کا ہدف ہوتا ہے ، وہ مقابلہ کرتا ہے لیکن اس مقابلے کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اصل کام کی رفتار کسی حد تک کم ہو جاتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تداخل کا یہ عمل آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کے مدیانیوں کا پورا لشکر اسرائیلیوں کے دفاعی استحکامات کا محاصرہ کر لیتا ہے[2] ؛ اس اذیت افزا معجزے میں حیرت انگیز پہلو سوئی کی مزاحمت نہیں بلکہ اونٹ کا اصرار و آبرام ہے ۔ ثقافتی عناصر کے مداخلت کنندوں کو اس آسانی سے الگ الگ نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جا سکتا ہے ، پھر ایک عمل سے دوسرا پیدا ہوتا جاتا ہے ۔

جن معاشروں پر حملے ہوئے وہ ہمیشہ اس حقیقت سے غافل نہیں رہے کہ اجنبی ثقافتی عنصر کے معمولی سے معمولی اور بے حقیقت سے بے حقیقت جزو کو بھی داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے تو اُس کے اثرات کیا ہوں گے ۔ ہم بعض تاریخی مقابلوں کا جائزہ لے چکے ہیں جن میں مظلوم معاشرے نے حملہ آوروں کے سیل کو روکنے میں کامیابی حاصل کی اور اسے عارضی طور پر بھی قیام کا موقع نہ دیا ؛ اپنے آپ کو الگ رکھنے کی نہایت درجے شدید غیر مصالحانہ پالیسی جو غیر معمولی فتوحات حاصل کرتی رہی ، دوسرے

۱- جے - ایس فرنیول (Furnivall) کی کتاب ''جنوبی و مغربی ایشیا میں ترقی و فلاح'' ، صفحہ ۳۲ - ۴۴ نیز صفحہ ۶۱ - ۶۳ -

۲- اس فقرے میں بائیبل کی ایک کہانی کی تلمیح ہے ۔ مدیانی عرب کا ایک قبیلہ تھا ؛ جب اسرائیلی مصر سے آئے تو مدیانیوں نے ان سے دوستی قائم رکھی ، پھر عمالیقیوں سے مل کر ان پر سخت حملے کیے ۔ تفصیل کے لیے بائیبل کی کتاب قضاۃ دیکھنی چاہیے ۔

معاملات میں بھی آزمائی جا چکی ہے لیکن ناکام ثابت ہوئی ۔ ہم اس پالیسی کو جنون اور تشدد سے تعبیر کر چکے ہیں ؛ یہ نام یہودیوں کے اس گروہ سے لیا گیا ہے جس کا نصب العین یہ تھا کہ ''ارض مقدس'' سے یونانی ثقافت کو سراسر نکال باہر کیا جائے اور اس کا نشان تک باقی نہ چھوڑا جائے ۔ مذہبی جنونیوں کا تصور سراسر جذباتی اور وجدانی ہوتا ہے لیکن اس پالیسی کو اطمینان کے ساتھ عقلی اصول پر بھی چلایا جا سکتا ہے ؛ اس کی ایک معیاری مثال یہ ہے کہ جاپان اور مغربی دنیا کے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے اور یہ پالیسی خوب غور و فکر کے بعد ہڈی اوشی اور اس کے ٹوکو گاوی جانشینوں نے اکاون سال کی اس مدت میں تدریجاً کامیاب بنائی جو ۱٦۳۸ء میں ختم ہوئی ۔ یہ امر کم حیرت انگیز نہیں کہ ایک پس ماندہ اور ہر طرف سے منقطع عرب ملک کے قدامت پسند حکمران کو بھی پورا اندازہ تھا کہ اجنبی ثقافت کے جو مختلف اثرات باہر سے داخل ہوتے ہیں ، ان میں ایک دوسرے کے ساتھ داخلی وابستگی ہوتی ہے ؛ اس سلسلے میں وہی طریق استدلال استعمال کیا گیا جس پر جاپانی کاربند ہوئے اور وہی نتیجہ برآمد ہوا ۔

قلب کی معقول متشدانہ حیثیت کی توضیح اس مکالمے سے ہو سکتی ہے جو ۱۹۲۲ء میں صنعاء کے زیدی امام یحییٰ اور برطانوی سفیر کے درمیان ہوئی جس کا مدعا یہ تھا کہ امام کو عدن کی برطانوی پروٹیکٹوریٹ کا وہ حصہ پُر امن طریق پر واپس کر دینے کے لیے راضی کر لیا جائے جس پر ۱۹۱۴ء–۱۹۱۸ء کی عالمگیر جنگ میں قبضہ کیا جا چکا تھا ۔ جب یہ امر واضح ہو چکا کہ سفارت کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوگی تو برطانوی سفیر نے اپنی گفتگو کا رخ بدل دیا اور امام نے نئے نمونے کی جو فوج تیار کی تھی ، اس کی سپاہیانہ شان و شوکت پر موصوف کو مبارک باد دی ، امام نے اس مبارک باد سے بڑا اچھا اثر قبول کیا تو اس بارے میں مزید گفتگو یوں ہوئی :

سفیر : میں سمجھتا ہوں کہ حضور والا دوسرے مغربی ادارے بھی ضرور جاری کر دیں گے ۔

امام : (مسکراتے ہوئے) میں سمجھتا ہوں ایسا ہرگز نہ ہوگا ۔

سفیر : اچھا ! یہ تو بڑی عجیب بات ہے ! کیا میں حضور والا سے اس کے وجوہ دریافت کر سکتا ہوں ؟

امام : ہاں ، میں کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے مغربی ادارے مجھے پسند نہ آئیں گے ۔

سفیر : فی الواقع ؟ مثال کے طور پر حضور والا کے پیش نظر کون سے ادارے ہیں ؟

امام : مثلاً پارلیمنٹ ؛ میں خود حکومت بنا رہنا چاہتا ہوں ، پارلیمنٹ میرے لیے ناقابل برداشت بن جائے گی ۔

سفیر : یہ کیوں ؟ میں حضور والا کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ذمہ دار پارلیمانی نمائندہ نظام حکومت مغربی تہذیب کا ناگزیر جزو نہیں ؛ اٹلی کی حالت ملاحظہ فرمائیے ، وہ مغربی دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے لیکن اس نے پارلیمنٹ ختم کر دی ہے ۔

امام : پھر شراب کو لیجیے میں اسے اپنے ملک میں جاری کرنے کا خواہاں نہیں ، خوش قسمتی سے اس وقت یہ قریباً ناپید ہے ۔

سفیر : یہ بالکل مناسب ہے ، لیکن میں حضوو والا کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ شراب بھی مغربی تہذیب کا ناگزیر حصہ نہیں ۔ امریکہ کی حالت ملاحظہ فرمائیے ، وہاں شراب کی ممانعت ہو چکی ہے اور امریکہ بھی بہت بڑی مغربی طاقتوں میں سے ہے ۔

امام : (پھر ایک مرتبہ مسکرائے جو اس امر کا اعلان تھا کہ گفتگو کو ختم سمجھنا چاہیے) بہ ہر حال میں پارلیمنٹوں ، شراب اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو پسند نہیں کرتا ۔

اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ امام یمن نے اگرچہ بڑی بصیرت اور ذہانت کا اظہار کیا مگر ساتھ ہی اپنے موقف کی کمزوری بھی نمایاں کر دی ، اپنی فوج کے لیے مغربی تکنیک کے مختلف اجزاء قبول کرتے وقت اس نے اصل مصیبت کا دروازہ کھول دیا تھا اور اس ثقافتی انقلاب کی ابتدا کر دی تھی جو انجام کار یمنیوں کو اس بات پر مجبور کر دے گا کہ اپنی برہنگی کو چھپانے کے لیے بنا بنایا مغربی لباس کاملاً اختیار کر لیں ۔

اگر امام یمن اپنے ہندو معاصر مہاتما گاندھی سے ملے ہوتے تو وہ درویش ہندو مدبر ان پر یہ حقیقت بہ خوبی واضح کر دیتا ۔ مہاتما گاندھی نے اپنے ہندو ہم وطنوں کو تلقین کی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے کاتا اور بُنا ہوا سوتی پارچہ استعمال کریں ، مہاتما کے نزدیک یہی راستہ تھا جس پر چل کر وہ

مغربی اقتصادیات کی مکڑی کے جال سے اپنے آپ کو آزاد کرا سکتے تھے لیکن یہ پالیسی دو مفروضوں پر مبنی تھی اور اصل پالیسی کی کامیابی کے لیے ان مفروضوں پر عمل پیرا ہونا ضروری تھا: پہلا مفروضہ یہ تھا کہ ہندو ان اقتصادی قربانیوں کے لیے تیار ہو جائیں گے جو اس پالیسی کے سلسلے میں لازماً پیش آنے والی تھی، واقعہ یہ ہے کہ وہ اس قربانی کے لیے تیار نہ تھے لیکن اگر مہاتما گاندھی اپنی توقعات کے سلسلے میں اہل وطن کی اقتصادی بے توجہی سے مایوس نہ بھی ہوتے تو ان کی پالیسی دوسرے مفروضے کی بے بنیادی کے باعث ناکام ہو جاتی ہے۔ دوسرا مفروضہ مداخلت کنندہ ثقافت کی روحانی حیثیت کے بارے میں غلط فہمی کا معاملہ تھا، مہاتما گاندھی نے مغربی تہذیب کے دور آخر کی سرگرمیوں کے متعلق صرف یہ تصور قائم کیا کہ ان کا مجلسی ڈھانچا سراسر دنیا دارانہ ہے اور ان میں مذہب کی جگہ فن کاری کو دے دی گئی ہے، انھیں یہ بدیہی حقیقت محسوس نہ ہوئی کہ سیاسی تنظیم، نشرو اشاعت اور پروپیگنڈے کے معاصرانہ طور طریقوں کا استعمال بھی تو ویسا ہی مغربی تھا جیسے سوتی کپڑے کے کارخانے جن کے خلاف وہ حملے کرتے رہتے تھے لیکن ہمیں اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ خود گاندھی جی بھی تو مغرب کی ثقافتی تنویر ہی کی پیداوار تھے؛ جس روحانی حادثے نے گاندھی جی کی روحانی قوت کو آزاد کیا تھا، وہ ہندویت کی روح اور مسیحی انجیل کی روح کے درمیان مقابلہ تھا؛ بہ ہر حال درویش مہاتما اور جنگجو امام دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔

تہذیبوں کے درمیان مقابلوں کی عام حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جس فریق پر یورش ہو، اگر وہ حملہ آور کی ثقافت کے ایک بھی جزو کو اپنے مجلسی ڈھانچے میں جگہ حاصل کرنے سے روک نہیں سکتا تو اس کے لیے زندہ رہنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ نفسیاتی انقلاب بپا کرے؛ وہ اسی صورت میں اپنے آپ کو بچا سکتا ہے کہ مذہبی جنونیوں کی روش کو ترک کرکے ہیرودیسی طور طریقے اختیار کر لے یعنی حملہ آور کو اسی کے ہتھیاروں میں مہارت پیدا کر کے شکست دے۔ اس کی ایک مثال سلاطین عثمانیہ کی تاریخ سے پیش کی جا سکتی ہے۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے مغرب سے مقابلے کے دوران میں مغربیت کی پالیسی پر انتہائی احتیاط سے عمل کیا یعنی کم سے کم مغربی طریقے اختیار کیے؛ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ

ناکام ہو گیا ۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کا دور آیا تو اُس نے پوری مغربیت کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا ؛ اس طرح نجات کا عملی راستہ ہموار ہو گیا ۔ یہ فرض کر لینا سراسر فضول ہے کہ کوئی معاشرہ فوج کے لیے تو مغربی طریقے اختیار کر لے گا لیکن باقی معاملات میں سابقہ طریقوں پر عمل پیرا رہے گا ؛ اس طریقے کی بے حقیقتی پیٹر کے زمانے کے روس ، انیسویں صدی کی ترکی اور محمد علی کے مصر میں بہ خوبی واضح ہو چکی تھی ۔ یہ سمجھ لینا درست نہیں کہ صرف فوج کے لیے مغربی زمانے کی سائنس ، تعلیم اور طبابت کے سہارے مہیا کر دینا کافی ہے ؛ فوجی افسر بہ ذات خود وہ تمام مغربی طریقے اختیار کر لیں گے جن کا فوجی ہنرمندی سے بہ ظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا ؛ خصوصاً اُس حالت میں کہ انھیں حربی تربیت کے لیے ملک سے باہر بھیجا جائے گا ۔ مذکورہ بالا تینوں ملکوں (روس ، ترکی اور مصر) کی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوجی افسروں کے گروہوں نے حریت پسندانہ انقلابات کی سرکردگی کا فرض ادا کیا مثلاً ۱۸۲۵ء میں روسی دسمبریوں نے انقلابات کا انتظام کیا لیکن وہ بے نتیجہ رہا ، عرابی پاشا نے ۱۸۸۱ء میں مصر کے اندر انقلاب کی صدا لگائی ، وہ بھی ناکام رہا ؛ ''انجمن اتحاد و ترقی'' نے ۱۹۰۸ء میں ترکی کے اندر انقلاب کا بندوبست کیا ، وہ ناکام تو نہ رہا لیکن دس سال کے اندر تباہی میں مبتلا ہو گیا ۔

(ب) روح کے جوابات

(I) انسانی خصائص سے محرومی : معاصروں کے درمیان مقابلوں کے مجلسی نتائج سے توجہ ہٹا کر نفسیاتی نتائج کی طرف آئیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہاں بھی فریق عامل و معمول اور ضارب و مضروب کے متضاد کردار ادا کرتے ہیں اور اُن پر جو اثرات پڑتے ہیں ، اُن پر الگ الگ غور کرنے میں سہولت رہے گی ؛ بہتر یہ ہوگا کہ سب سے پہلے عامل کے اثرات کا جائزہ لیں اس لیے کہ مقابلے میں سبقت اُسی کی طرف سے ہوتی ہے ۔

جارحانہ اقدام کرنے والی تہذیب کے نمائندے کسی اجنبی مجلسی ڈھانچے میں مداخلت کا دروازہ کامیابی سے کھول لیتے ہیں تو اُن کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ فریسی کے غصب حقوق کے شکار ہو جائیں گے جو کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے میں عام انسانوں جیسا نہیں ۔ ایک مقتدر اقلیت اُن لوگوں

کو یقیناً نفرت کی نگاہ سے دیکھے گی جنھیں مفتوح اجنبی معاشرے میں سے لے کر داخلی پرولتار بنا لیا گیا لیکن ان کی حیثیت انسانیت سے نیچے نیچے مفتوح کی سی رکھی گئی ؛ اس طرز عمل کی پاداش خاص طور پر عبرت ناک ہے ۔ انسانوں میں سے جو مفتوح عارضی حیثیت میں فاتح کے روبرو بے بس ہو جاتا ہے ، اُس کے ساتھ ذلت خیز سلوک در اصل اُس حقیقت کی تصدیق ہوتا ہے جسے فاتح بہ زعم خود غلط ثابت کرنا چاہتا ہے ؛ حقیقت یہ ہے کہ تمام روحیں خالق کی نظروں میں برابر ہیں اور جو انسان اپنے ہم جنسوں کو انسانیت کے خصائص سے محروم کر دینا چاہتا ہے ، وہ در اصل اپنے آپ کو اُن خصائص سے معرا کر لیتا ہے لیکن غیر انسانی وحشیانہ افعال کے تمام مظاہر یکساں وحشیانہ نہیں ہوتے ۔

غیر انسانی وحشیانہ افعال میں سے کم سے کم وحشیانہ فعل کا صدور اُن کامیاب حملہ آور تہذیبوں کے نمائندوں سے ہوتا ہے جن کی ثقافت میں مذہب کو اعلیٰ اور محرک عنصر کی حیثیت حاصل ہو ؛ ایسے معاشرے میں مفتوح کی انسانی حیثیت سے انکار اُس کے مذہب کو کالعدم قرار دینے کی شکل اختیار کرے گا ۔ اگر اقتدار مسیحیوں کے ہاتھ میں ہو تو وہ کہیں گے کہ یہ شخص کافر ہے جسے بپتسما نہیں دیا گیا ، اگر اقتدار مسلمان کے ہاتھ میں ہو تو اسے غیر مختون غیر مومن قرار دیا جائے گا ؛ ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا جائے گا کہ مفتوح کو جو پست حیثیت حاصل ہے ، یہ مذہب بدل لینے سے دور ہو جائے گی اور بہت سے معاملات میں فاتحوں نے اسی طریق علاج پر عمل کرایا اگرچہ یہ عمل خود ان کے مفاد کے خلاف تھا ۔

کلیسا کی بالقوہ آفاقیت کا نشان قرون وسطیٰ کی مسیحیت کے مرئی فنون تھے یعنی اس مجلس میں جس کے تین مغ[1] شرکاء میں سے ایک کو حبشی کی شکل میں پیش کیا گیا تھا ؛ پھر دور جدید کی مغربی مسیحیت نے ابتدائی دور میں اسی آفاقیت کو اپنے عمل کی بنیاد قرار دیا ، وہ بحر پیمائی میں کمال مہارت حاصل کر چکنے کے بعد عالم انسانیت کے تمام زندہ معاشروں تک پہنچ گئی ؛ ہسپانیہ اور پرتگال کے فاتحین بھی کلیسا کی آفاقیت ہی کے داعی تھے ، انھوں نے

۱۔ Magi جس کا ترجمہ موبد بھی کیا جاتا ہے اور مجوسی بھی ۔

ٹرینٹ[1] کی مجلس میں تصدیق شدہ کیتھولک مسیحیت کے حلقہ بگوشوں کے ساتھ هر قسم کے مجلسی تعلقات پیدا کیے یہاں تک کہ ان سے شادیاں بھی کر لیں اور اختلاف رنگ کا قطعاً لحاظ نہ کیا ۔ جن هسپانوی فاتحوں نے پیرو اور فلپینز کو مسخر کیا تھا ، وہ اپنے مذهب کی اشاعت کے اس درجے شیدائی تھے کہ اپنی زبان کو ترقی دینے کے بجائے انھوں نے دیسی باشندوں کی زبانوں کو ترقی دی اور کیتھولک مذهب کی عبادات دعاؤں اور دوسری چیزوں کو انھیں زبانوں میں منتقل کر دیا ۔

هسپانیہ اور پرتگال کے بانیان سلطنت نے اپنے مذهبی عقائد کے متعلق جس خلوص کا اظہار کیا ، اس سے بہت پہلے مسلمان یہی کر چکے تھے ؛ وہ ابتدا هی سے ان تمام لوگوں کے ساتھ تعلقات ترویج قائم کرتے رہے جو ان کا مذهب اختیار کر لیتے تھے اور نسلی اختلاف کا کبھی خیال نہیں کیا لیکن مسلمان اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ اسلامی معاشرے کو قرآن مجید میں سے ایک اصول ملا تھا اور وہ یہ کہ بعض غیر اسلامی مذاهب اگرچہ نا مکمل هیں تاهم ان میں آسمانی حقائق کا جزوی اظہار موجود ھے ؛ پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے تعلق میں یہ اعتراف کر لیا گیا ، پھر اسے زرتشتیوں اور هندوؤں تک توسیع دے دی گئی لیکن جب خود ان کی جماعت میں سنی اور شیعہ کا اختلاف پیدا هوا تو ان فرقہ وار اختلافات کے لیے وہ نسبتاً واضح سطح قائم نہ رکھی گئی جس پر غیر مذاهب کے سلسلے میں عمل هوا تھا ؛ فرقہ وار اختلاف کے متعلق مسلمان مسیحیوں سے بہتر ثابت نہ هوئے ، خواہ ابتدائی دور کے مسیحیوں کو لے لیا جائے خواہ اصلاح مذهب کے زمانے کے مسیحیوں کو ۔

مفتوح کی انسانیت سے انکار کی ایک اَور کم سے کم مضر شکل یہ ھے کہ مفتوح کی ثقافتی حیثیت کو اس معاشرے میں کالعدم قرار دے دیا گیا جو روایتی مذهب کے پیالے سے الگ هو اور اس نے اپنی قدروں کو لا دینی

۱- (Tridentine Catholic) مسیحیت - ٹرینٹ (Trent) شمالی اٹلی میں ایک مشہور مقام ھے، یہاں ۱۵۴۳ء سے ۱۵۶۳ء تک رومن کیتھولک پادریوں کی ایک مجلس منعقد هوئی جس میں اس مذهب کے تمام اصول اور دینیات کو از سر نو مرتب کیا گیا ، انھیں دینیات کو بعد میں رواج حاصل هوا (مترجم) ۔

اصطلاحات میں منتقل کر لیا ؛ دوسری نسل کی تہذیبوں کے جارحانہ ثقافتی اقدامات کی تاریخ میں یونانیوں اور بربریوں کے درمیان تعبیر کا خط امتیاز یہی تھا - دور جدید کی مغربی دنیا کے عہد قریب میں انسانی ثقافت کی دو قسموں نے مختلف مظاہر اختیار کیے مثلاً اٹھارھویں صدی میں فرانسیسیوں اور شمالی امریکہ کے دیسی باشندوں کے تعلقات میں ، انیسویں صدی میں مغربیوں اور ویٹنامیوں کے تعلقات میں اور بیسویں صدی میں اُن افریقی حبشیوں کے ساتھ تعلقات میں جو صحرائے اعظم کے جنوبی حصے میں رہتے تھے - یہی روش ولندیزوں نے انڈونیشیا کے ملائی لوگوں کے ساتھ تعلقات میں اختیار کی ؛ سیسل روڈس[1] نے جب یہ نعرہ وضع کیا تھا کہ دریائے زمبزی[2] کے جنوب میں جتنے مہذب لوگ رہتے ہیں ، اُن سب کے حقوق یکساں ہیں تو وہ جنوبی افریقہ کے ولندیزی زبان اور انگریزی زبان بولنے والوں کے دلوں میں اسی ثقافتی نصب العین کا چراغ روشن کرنا چاہتا تھا -

۱۹۱۰ء میں جنوبی افریقہ کے اندر یونین قائم ہوئی تو یہ نظریاتی شعلہ دبا دیا گیا اور اُس کی جگہ افریقی ولندیزوں کی متشدد اور تنگ نظرانہ قومیت کی آگ بھڑک اٹھی - یہ لوگ اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ جنوبی افریقہ میں بنتو ، انڈونیشی اور ہندوستانی نسل کے جتنے افراد موجود ہیں ان پر اپنی برتری بہرحال ظاہر کی جائے ، یہ برتری نہ تو ثقافتی تھی اور نہ مذہبی بلکہ صرف نسل پر مبنی تھی ؛ ان کے برعکس فرانسیسیوں نے اپنے ثقافتی معتقدات کو سیاسی شکل دینے میں خاصی وسیع کوششیں کیں مثلاً ۱۸۶۵ء سے تمام مسلمان الجزائریوں کے لیے فرانسیسی شہریت کے پورے حقوق کا دروازہ کھلا ہوا ہے ، شرط صرف یہ رکھی ہے کہ وہ لوگ فرانسیسیوں کے سول قانون کو قبول کرلیں اور اُن میں شخصی قانون بھی شامل ہے ، اس کے بغیر پوری فرانسیسی

۱- Cecil Rhodes (۱۸۵۳ء—۱۹۰۲ء) - ۱۸۹۰ء میں جنوبی افریقہ کا وزیر اعظم بن گیا ، اُس نے اپنی پوری جائداد آکسفورڈ یونیورسٹی کے حوالے کر دی تھی اور اُس سے لکچروں کا ایک سلسلہ جاری ہوا جو اب تک جاری ہے (مترجم) -

۲- Zambesi ، جنوبی افریقہ کا ایک دریا جو روڈیشیا سے ہوتا ہوا موزمبیق پہنچتا ہے اور وہیں سمندر میں گرتا ہے (مترجم) -

شہریت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا ۔

فرانسیسیوں نے اُن لوگوں کے لیے جو دورِ جدید کی مغربی ثقافت کی فرانسیسی تعبیر کو کامیابی سے قبول کر چکے تھے ، سیاسی اور مجلسی حقوق دے دینے میں اخلاص سے کام لیا ۔ یہ حقیقت ایک واقعے سے ظاہر ہو سکتی ہے جس سے فرانسیسیوں کی نیک نیتی کا ثبوت مل گیا اور اس نے دوسری جنگ عظیم کے نتیجے پر بھی خاصا اثر ڈالا ۔ فرانس جون ۱۹۴۰ء میں شکست کھا چکا تھا ، اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ فرانسیسی سلطنت کے جو علاقے افریقہ میں واقع ہیں وہ ویشی[1] کی حکومت کا ساتھ دیں گے یا ان فرانسیسیوں کی اعانت کریں گے جو ملکی آزادی کے لیے بہ دستور لڑ رہے تھے ۔ اس موقع پر استوائی فرانسیسی افریقہ کے صوبۂ چاڈ[2] کا گورنر ایک فرانسیسی شہری تھا جو افریقی حبشیوں کی نسل سے تھا ؛ اس حبشی نے جو ثقافتی لحاظ سے فرانسیسی بن گیا تھا ، اپنی سرکاری ذمہ داری پر آزادی فرانس کے مجاہدوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ؛ اس طرح جہاد آزادی کی تحریک کو خود فرانسیسی سلطنت میں ایک قدم گاہ مل گئی حالانکہ اس سے پیشتر اس کا دائرۂ عمل صرف لندن تک محدود تھا ۔

فاتح اور مفتوح کے درمیان مذہبی معیار کی بنیاد پر حد فاصل کی طرح ثقافتی بنیاد پر بھی جو حد قائم کی جائے گی اُس پر اعتراض کی گنجائش باقی رہتی ہے لیکن اسے ناقابل عبور خلیج قرار نہیں دیا جا سکتا جو انسانی گھرانے کے دو حصوں کو ہمیشہ کے لیے الگ رکھے ؛ کافر تبدیل مذہب سے اس خلیج کو عبور کر سکتا ہے ، بربری ایک امتحان میں کامیابی حاصل کرکے اس خلیج سے گزر سکتا ہے ۔ مفتوح کے پستی کی طرف نزول کی فیصلہ کن شکل وہ ہے کہ اسے ''کافر'' اور ''بربری'' دیسی قرار دیا جائے ، اجنبی معاشرے کے باشندوں کو اس کے وطن میں دیسی قرار دیا جائے تو اس کا

۱- Vichy، یہ اس حکومت کا نام ہے جو ۱۹۴۰ء میں فرانس کی شکست کے بعد مارشل پتیاں نے قائم کی تھی اور اس کا صدر مقام پیرس کے بجائے ویشی تھا ؛ اس کے خلاف ڈی گال نے جنگ جاری رکھنے کی تحریک چلائی تھی ۔

۲- Chad ، فرانس کے استوائی افریقی مقبوضات میں سے ایک علاقہ جس کا رقبہ ساڑھے چار لاکھ مربع میل ہے اور آبادی بیس لاکھ ہوگی ۔

مطلب یہ ہوگا کہ مفتوح کی انسانیت سے انکار کیا جائے اور اس کی سیاسی اور اقتصادی حیثیت کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔ اس تعبیر کی بنا پر انسانوں کو ویسے ہی غیر انسانی گروہ قرار دیا جاتا ہے جیسے عام حیوانات و نباتات ہیں اور یہ عمل اس نئی دنیا میں ہوا جو مدت سے اس بات کی منتظر تھی کہ انسان اسے دریافت کریں، اس میں آئیں اور اس پر قابض ہو جائیں؛ اس مفروضے کی بنا پر حیوانات و نباتات کو خس و خاشاک سمجھ لینا چاہیے جسے نکال باہر پھینکا جاتا ہے یا ایسے طبعی وسائل مان لینا چاہیے جنھیں محفوظ رکھا جانا چاہیے تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس مکروہ فلسفے پر عمل کرنے والوں کا معیاری گروہ وہ تھا جو یوریشیا کے خانہ بہ‌دوشوں پر مشتمل تھا؛ وہ وقتاً فوقتاً حضری آبادیوں کو فتح کرکے وقتاً فوقتاً اپنی حکومتیں قائم کرتے رہے، وہ اپنے ہم جنس انسانوں سے ویسا ہی سلوک روا رکھتے تھے جیسا شکاری اپنے شکار یا عام جانوروں سے؛ عثمانی سلطنت کے بانی بھی ویسے ہی بے رحم اور اعلیٰ درجے کے منطقی تھے جیسے فرانس کے بانیان سلطنت جنھوں نے اپنی رعایا کے ساتھ بربریوں کا سا سلوک کیا۔ یہ درست ہے کہ فرانسیسی رعایا کے جو افراد حقوق سے محروم تھے، ان کی حالت عثمانی رعایا کے افراد سے بہت اچھی تھی لیکن یہ بھی درست ہے کہ جس پالتو انسانی جانور کو انسانوں کے عثمان گڈریے نے تربیت دے کر ایک محافظ کتے کے درجے پر پہنچایا، اسے بدرجہا بہتر اور شان دار تر کردار کے مواقع مل گئے، جیسے مواقع تربیت یافتہ افریقیوں کو فرانسیسی کارکن یا صاحب علم و فضل بننے کی بنا پر نہیں مل سکتے تھے۔

دور جدید میں مغربی معاشرے نے سمندر پار کے علاقوں میں توسیع اختیار کرلی، وہاں مغربی یورپ کے جو انگریزی بولنے والے پروٹسٹنٹ اول اول پہنچے انھوں نے خانہ بہ دوش بانیان سلطنت کے گناہ کا ارتکاب زیادہ برے طریقے پر کیا اور انسانوں کو دیسی باشندے بنا دیا۔ اس پرانے گناہ کے اعادے میں بد ترین پہلو یہ تھا کہ یہ لوگ پستی کی اس منزل پر پہنچ گئے جہاں عثمانیوں کا قدم کبھی نہیں پڑا تھا؛ اس نے دیسیوں کو گھٹیا درجے کی نسل قرار دے دیا، اس طرح ان کے سیاسی اور اقتصادی حقوق کالعدم ہو گئے۔

مفتوحین کی پیشانی پر فاتحین نے جو چار داغ لگائے، ان میں سے نسلی کمتری کا داغ بغض و کینہ کا سب سے بڑا ثبوت تھا؛ اس کی تین وجہیں

ھیں : اول مفتوح کی انسانیت کو بلا تعین حد کالعدم قرار دیا گیا ، کافر ، بربری اور دیسی کے القاب سخت نقصان رساں تھے تاھم ان کے ذریعے سے کسی نہ کسی انسانی وصف سے انکار کیا گیا تھا یا ان کا مطلب یہ تھا کہ خاص قسم کے انسانی حقوق انھیں نہیں مل سکتے ؛ دوم عالم انسانیت کو نسلی اعتبار سے دوگونہ قرار دینے کا مطلب مذھبی و ثقافتی اور سیاسی و اقتصادی حد بندیوں سے بالکل مختلف تھا ، اس کا مطلب یہ تھا کہ مختلف گروھوں کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے کبھی عبور ھی نہیں کیا جا سکتا تھا ؛ سوم نسلی داغ مذھبی اور ثقافتی داغوں سے (نہ کہ سیاسی اور اقتصادی داغوں سے) اس لیے مختلف تھا کہ اس طرح انسانی فطرت کے نہایت ھی بے حقیقت اور حقیر پہلوؤں کو معیار بنا لیا گیا یعنی جلد کے رنگ یا ناک کی وضع کو۔

(II) مذھبی جنون اور ھیرودیسیت : جب ھم مضروب فریق کے جواب کا جائزہ لیتے ھیں تو معلوم ھوتا ھے کہ اسے عمل کے دو مختلف راستوں میں سے کسی ایک کے اختیار کر لینے کا موقع حاصل ھوتا ھے ؛ ان دونوں راستوں کے نام عہد نامۂ جدید کی کہانیوں سے لیے گئے ھیں اور اس کتاب کے مختلف حصوں میں یہ استعمال ھو چکے ھیں۔

اس زمانے میں یونانیت یہودیت کو مجلسی سرگرمیوں کی ھر سطح پر دباتی جا رھی تھی ، کوئی یہودی نہ اس سے بچ سکتا تھا اور نہ اسے نظرانداز کر سکتا تھا ، وہ کہیں بھی چلا جاتا ، یونانی بننے یا نہ بننے کا سوال اس کے پیش نظر رھتا۔ مذھبی جنونیوں کے طبقے میں وہ لوگ شامل ھوئے جن کا جذبہ یہ تھا کہ جارحانہ اقدام کرنے والوں کی مزاحمت میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھیں اور اپنی یہودی میراث کے روحانی حصار میں پناہ لیں ؛ وہ اس عقیدے کی روح سے سرشار تھے کہ اگر اپنی آبائی روایات پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا اور اس کے ایک ایک جزو کو اپنائے رکھا تو کچھ اور نہ بھی کرنے کے باوجود ان کی روحانی زندگی کے حد درجے محفوظ سرچشمے میں سے وہ مافوق الفطرت قوت حاصل ھو جائے گی جو انھیں جابر کے اخراج میں کامیاب بنا دے گی۔ ان کے برعکس ھیرودیسیوں کا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو ایک موقع شناس مدبر کے حامی تھے ؛ ھیرودیس شخص ادومی الاصل تھا ، اسے عقل و ھوش سے خاصا حصہ ملا تھا اور مکابی سلطنت کے اس غیر یہودی صوبے کا رھنے والا تھا جسے ماضی قریب ھی میں مکابی سلطنت کا جزو

بتایا گیا تھا ۔ ان لوگوں نے مسئلے پر جس انداز میں غور کیا ، اس میں تعصب کا شائبہ زیادہ نہ تھا ؛ هیرودیس اعظم کی پالیسی یہ تھی کہ یونانیت سے وہ سب کچھ سیکھ لینا چاهیے جو یہودیوں کو تدبر اور عملیات میں مدد دینے کے لیے ضروری ہو تاکہ وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں اور اس یونانیت مآب دنیا میں کم و بیش آرام کی زندگی بسر کر سکیں جس کے مجلسی ماحول سے بچ نکلنا ان کے بس میں نہ تھا ۔

هیرودیس سے پیشتر بھی اس خیال کے یہودی گزر چکے تھے مثلاً همیں سکندریہ میں تارک وطن یہودیوں کی ایک جماعت کا سراغ ملتا ہے جس نے رضامندانہ یونانیت اختیار کر لی تھی ؛ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب سکندریہ ابتدائی دور میں تھا اور اُس کے بانی کی وفات ہوئی ہی تھی ۔ یہودیہ کے کوهستانی علاقے میں یوشوا جیسن نام اعلیٰ مذهبی پیشوا هیرودیسی هی دبستان تدبر کا ایک عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے ۔ یہ شخص ۱۶۰ ق ۔ م میں ایسے کام پر لگا ہوا تھا جو مذهبی جنونیوں کی نگاهوں میں سراسر جنونی کام تھا ، یہ شخص یہودی نوجوانوں کو یونانی ورزش گاہ میں لے جاتا اور وهاں اُنھیں نا شائستہ حد تک برهنگی کی تعلیم دیتا[1] ، نیز اُنھیں یونانی وضع کی وہ ٹوپیاں پہناتا جن کے اطراف بہت چوڑے تھے ؛ اس طرز عمل کے خلاف اُس عہد کے مذهبی جنونیوں میں زبردست رد عمل پیدا ہوا جس کا ذکر مکابیوں کی دو کتابوں میں آیا ہے ۔ سترهویں عیسوی میں رومیوں نے یروشلم کو بری طرح لوٹا اور تباہ کیا لیکن یہ حادثہ یہودیوں کی مذهبی جنونیوں کی تحریک کو ختم نہ کر سکا ؛ ۱۳۵ء میں یروشلم پر ترکتاز کا اعادہ ہوا ، مذهبی جنونی اس کے بعد بھی قائم رہے ۔ ربی یوحنا بن ذکائی نے اس چیلنج کے جواب میں یہودیوں کے لیے ادارات کا ایک نیا ڈھانچا تیار کر دیا اور وہ نفسیاتی کیفیت پیدا کر دی گئی جس کی روح اصرار و مزاحمت تھی ؛ اس طرح اُن یہودیوں کی ممتاز فرقہ وار زندگی محفوظ ہو گئی جو سیاسی اعتبار سے بالکل بے دست و پا ہو چکے تھے ۔

۱- فقرے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ مذهبی پیشوا لوگوں کو یونانیوں کے طریق کے مطابق ورزش کی رغبت دلاتا تھا اور ورزش میں لباس کا ایک حصہ اُتارنا پڑتا ہے ، مذهبی جنونی اس پر بھی بگڑتے تھے (مترجم) ۔

تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یونانیت کے چیلنج نے سریانی اقوام میں سے صرف یہودیوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا تھا یا مشرقی تہذیبوں میں سے سریانی معاشرہ ہی تھا جو اس تقسیم کا شکار ہوا۔ شام سے جن غلاموں کو کھیتوں میں کام کرنے کے لیے سسلی پہنچایا گیا تھا، انھوں نے دوسری صدی قبل مسیح میں مذہبی جنونیوں کی طرح بغاوتیں کیں؛ رومہ میں شاہنشاہی دور شروع ہو گیا تو شام کے جو آزاد شدہ غلام یونانیت کے معتقد ہو چکے تھے، ان کا سیل وہاں پہنچتا رہا؛ اس کے برعکس سریانی معاشرے کے زیادہ خوش حال اور پڑھے لکھے طبقے نے ہیرودیسیت کا طریقہ اختیار کر لیا۔ یونان کی مقتدر اقلیت اس طبقے کو مجلسی لحاظ سے اپنا شریک کار بنا لینے پر آمادہ تھی لیکن اس اثنا میں یہودیت کے علاوہ سریانی معاشرے کے دوسرے مذاہب اعلیٰ کو جبری فوجی خدمت کے لیے لے لیا گیا تاکہ انھیں لا دینی ثقافتی جنگ میں بہ طور آلۂ کار استعمال کیا جا سکے۔

زرتشتیت، نسطوریت، یعقوبیت اور اسلام سب نے یہودیت کی اس مثال پر عمل کیا اور وہ مذہب کے راہ حق سے ہٹے؛ یہ طرز عمل روحانی اعتبار سے تباہ کن تھا لیکن ان میں سے آخری تین مذہبی تحریکوں نے مذہبی جنون کے انحراف کی تلافی یوں کی کہ ہیرودیس کے طور طریقوں پر عمل کرتے ہوئے یونانی فلسفے اور سائنس کی معیاری کتابوں کو اپنی مذہبی زبانوں میں منتقل کر دیا۔

اگر اب ہم قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت کے ساتھ معاشروں کے مقابلے کے نفسیاتی رد عمل پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہیرودیسیت پر جن لوگوں نے بدرجۂ کمال عمل کیا وہ سکنڈے نیویا کے لا مذہب بربری حملہ آور تھے، وہ مغرب کی بالکل ابتدائی اور اعلیٰ ثقافتی فتوحات کی بنا پر مغربی مسیحیت کے طور طریقوں کے سب سے بڑے داعی اور ناشر بن گئے؛ یہ نارمن تھے، اس آبادی کا محض مذہب ہی نہیں بلکہ زبان اور شعر و ادب کو بھی انھوں نے اختیار کر لیا، جہاں انھوں نے کارولنجی سلطنت کے فرانسیسی قلب میں اپنے لیے حکمرانی کا نقشہ استوار کیا تھا۔ جب فرانسیسی نام والے نارمن مطرب تائی لیفر[1] نے جنگ ہسٹینگز کے لیے جاتے وقت اپنے ساتھیوں میں جنگی جذبات کو بیدار کرنے کے لیے الاپ شروع کی تو

۱- Taillefer -

اس نے وہ گیت نہ گایا جو سکنڈے نیویا کے باشندوں میں مروج تھا بلکہ فرانسیسی زبان میں رولاں کا گیت گایا ۔ ولیم فاتح نے انگلستان پر جبراً قبضہ کرکے نومولود مغربی مسیحی تہذیب کو ایک پس ماندہ اور منقطع صوبے میں بہ زور شمشیر تقویت پہنچانے کا انتظام کیا تھا لیکن اس سے پیشتر نارمن طالع آزما مغربی مسیحی دنیا کی توسیع کا کام شروع کر چکے تھے ؛ چنانچہ انھوں نے جنوبی سمت میں آرتھوڈکس مسیحیت اور دارالاسلام سے اپولیا ، کالیبریا اور سسلی کے علاقے فتح کر لیے ؛ ان سے بھی بڑھ کر قابل توجہ امر یہ ہے کہ سکنڈے نیویا کے ان باشندوں نے بھی جو اپنے گھروں سے باہر نہ نکلے تھے ، ہیرودیسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے مغربی مسیحی ثقافت قبول کر لی ۔

اجنبی ثقافتوں کے متعلق شمالی علاقوں کے باشندوں کا یہ انداز پزیرائی صرف مغربی مسیحیت تک محدود نہ تھا ؛ سسلی کے نارمنوں پر بزنطینی اور اسلامی فنون و ادارات نے بھی یہی اثر ڈالا ، مغرب اقصیٰ کے مسیحی سیلٹوں[1] کی ثقافت آئرلینڈ کے قدیم باشندوں اور مغربی جزائر کے اُن آباد کاروں نے حاصل کی جو شمالی علاقوں کے رہنے والے تھے ؛ دریائے نیپر اور دریائے نیوا کے طاسوں میں جو سلافی بربری رہتے تھے ، اُن کے روسی سکنڈے نیویائی فاتحوں نے آرتھوڈکس مسیحیت کی ثقافت قبول کر لی ۔

قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحیت کو اُور جن معاشروں سے سابقہ پڑا ، اُن میں ہیرودیسیت اور مذہبی جنون کے درمیان بڑا اچھا توازن نظر آتا ہے مثلاً صلیبی مہموں کے خلاف رد عمل کے طور پر مسلمانوں میں جو جوش و خروش پیدا ہوا تھا ، اُس میں ایک حد تک توازن سلیشیا کے ان ارمنی یعقوبیوں کی نارمنی ہیرودیسیت نے پیدا کر دیا جو مذہبی مسیحیت کے طریق زندگی کے معتقد بن چکے تھے ۔

دوگونہ متضاد نفسیاتی رد عمل کی مثالیں آرتھوڈکس مسیحیت اور ہندو دنیا کی تاریخوں سے بھی مل سکتی ہیں جنھیں جارحانہ اقدام کرنے والی ایرانی مسلم تہذیب سے سابقہ پڑا ۔ آرتھوڈکس مسیحیت کا بڑا حصہ سلطنت عثمانیہ کے ماتحت چلا گیا تھا ، اُن کی اکثریت آبائی مذہب سے چمٹی رہی جس کی

۱- Celts ۔

کلیسیائی خود مختاری اجنبی سیاسی حکومت کے روبرو سر جھکا دینے کی بنا پر محفوظ رکھی گئی لیکن اس مذہبی جنون کی تلافی مذہبی سطح پر ایک اقلیت نے کر دی جو مجلسی اور سیاسی اغراض کی بنا پر اسلام کے حلقہ بہ گوش بن گئے؛ بہت بڑی اکثریت نے معمولی باتوں میں ہیرودیسیت کے طریقے اختیار کر لیے یعنی انھوں نے اپنے آقاؤں کی زبان سیکھ لی اور انھیں کے سے لباس پہننے لگے۔ مغل راج کے تعلق میں ہندوؤں کا رد عمل بھی انھیں خطوط پر ہوا لیکن ہندوستان میں فاتحوں کا مذہب قبول کر لینے والے لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے خصوصاً وہ لوگ جو مجلسی لحاظ سے پستی میں گرے ہوئے تھے اور جنھیں کچھ ہی مدت پیشتر لامذہبیت سے ہندویت کے دائرے میں لایا گیا تھا؛ یہی لوگ تھے جن کے اخلاف پر بیسویں صدی میں مشرقی پاکستان کا صوبہ مشتمل ہے۔

معاصر تہذیبوں اور معاشروں کو دور جدید سے جو مقابلے پیش آئے، اُن کا نقشہ اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں پیش کیا جا چکا ہے؛ اگر ہم اپنے موجودہ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ان ریکارڈوں کا پھر ایک مرتبہ جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یا تو ان میں مذہبی جنون اور ہیرودیسیت کے متخالف جذبات کے درمیان تبادل کا سلسلہ قائم رہا یا اُن میں کشمکش ہوتی رہی۔ مشرق بعید کا جو معاشرہ جاپان میں تھا، اُسے ایک واضح مثال کے طور پر منتخب کیا جا سکتا ہے؛ جاپانیوں نے پہلے ہیرودیسیت پر عمل کیا، پھر وہ سختی سے مذہبی جنون کے دائرے میں داخل ہو گئے اور اس پر کامیابی سے عمل کیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ٹوکو گاوا شوگینٹ نے جاپان اور مغرب کے درمیان تعلقات بالکل ختم کر دیے تھے تاہم ایک چھوٹی سی اقلیت جو پوشیدہ طور پر مسیحی تھی، ہیرودیسیت پر قائم رہی اور اُس نے دو سو سال تک ممنوع اجنبی مذہب کے ساتھ اپنی خفیہ وفاداری قائم رکھی، ۱۸۶۸ء میں میجی انقلاب ہوا تو پھر اس اقلیت کے لیے کھلم کھلا اپنے عقیدے کا اظہار ممکن ہو گیا۔ اس سے کچھ دیر پیشتر جاپان میں ہیرودیست کی ایک دوسری تحریک جاری ہوئی جو پہلی سے بالکل مختلف تھی؛ اس کے محرک وہ لوگ تھے جنھوں نے خفیہ خفیہ ولندیزی زبان کی وساطت سے اپنی چھان بین جاری رکھی اور اُنھیں دور جدید کے مغرب کی نئی سائنس یعنی لادینیت کا حال معلوم ہو گیا۔ میجی انقلاب کے بعد ہیرودیسیت کے ان

لئے کارفرماؤں نے جاپان کی پالیسی کا کنٹرول سنبھال لیا اور اس کے نتائج دنیا بھر کے لیے حیرت انگیز تھے ۔

سوال یہ ہے کہ آیا یہ آخری دور سراسر ہیرودیسیت کا دور تھا ؟ یہاں ہمارے سامنے اپنی انتخاب کردہ اصطلاحوں کے درمیان مقابلے کی صورت آجاتی ہے یا سمجھنا چاہیے کہ کسی ایک اصطلاح نے ہر چیز کو اپنے دائرے میں لے لیا تھا ۔ مذہبی جنون کا نصب العین بالکل واضح ہے ، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر اجنبی[1] تحفے کو خطرناک سمجھ کر ٹھکرا دیا جائے لیکن ذرائع مختلف رہے ہیں ؛ بعض اوقات مکابیوں کی طرح کھلم کھلا جنگ کا مثبت طریقہ اختیار کیا گیا ، بعض اوقات اپنے آپ کو اجنبیوں سے منقطع کرکے منفی طریقہ اختیار کیا گیا ۔ اس سلسلے میں حکومت کی کارفرمائی بھی ہوئی جیسے کہ جاپان نے اپنی سرحدیں اجنبیوں کے لیے بالکل بند کر دیں اور بعض اوقات انفرادی عمل کے ذریعے سے یہ مقصد پورا کیا گیا یعنی مختلف افراد اپنی مخصوص حیثیت کو نجی ذرائع سے محفوظ کرتے رہے جیسا یہودیوں نے مختلف ملکوں سے کیا ۔ اس کے برعکس ہیرودیسیت کے طریقے بالکل واضح ہیں ، اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اجنبیوں کے تحائف کو قبول کر لیا جائے خواہ وہ تحائف مذہبی ہوں یا اَور کسی قسم کے اور کھلے بندوں ان کا خیر مقدم کیا جائے لیکن اصل سوال انجام کا ہے ۔ جن گروہوں نے ہیرودیسیت پر بدرجۂ کمال عمل کیا یعنی سکنڈے نیویا کے باشندے یا شمالی علاقے کے گروہ ، وہ نادانستہ یا دانستہ جس انجام کو پہنچے ، یہ تھا کہ تہذیب مقابل میں کاملاً مدغم ہو گئے ۔

قرون وسطیٰ کی مغربی تاریخ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ شمالی علاقے کے باشندوں نے حیرت انگیز تیزی سے غیروں کے عقیدے اور علوم اختیار کر لیے ، اس طرح وہ قیادت کے منصب پر پہنچے ، پھر ناپید ہو گئے ۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات پر ہم نے اپولیا کے ولیم کا ایک شعر نقل کیا تھا ، وہ شخص ایک

۱۔ مصنف نے یہاں گریک (Greek) یعنی یونانی کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے کہ اس نے بحث یونانیت ہی کے خلاف رد عمل سے شروع کی تھی ۔ میں نے خوانندگان کرام کی سہولت کے خیال سے یونانی کے بجائے اجنبی کا لفظ استعمال کیا ہے اور مصنف کا اصل مطلب اسی طرح واضح ہوتا ہے (مترجم) ۔

معاصر مبصر کی حیثیت رکھتا تھا ، اس نے کہا تھا :

جو لوگ اُن کے زیر تحکم آتے ہیں ، اُنھیں وہ اپنے عادات و رسوم اور زبان کا حلقہ بہ گوش بنا لیتے ہیں ؛ اس کا نتیجہ نسلی ادغام کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہیرودیسیت کا نصب العین ہمیشہ یہی ہوتا ہے ؟ اگر ہم ہیرودیس اعظم کی پالیسی کی صحیح تعبیر کر چکے ہیں ——— وہی ہیرودیس جس سے یہ عقیدہ منسوب ہوا ——— تو اس کا مطلب یہی ہے کہ علاج بالمثل کے اصول پر یونانیت کا اختیار کر لینا یہودیوں کی بقا کو متیقن بنا لینے کا بہترین ذریعہ تھا اور جاپان میں ہیرودیسیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ، وہ بلا شبہ اُس پالیسی سے قریب تر تھا جو ہیرودیس سے منسوب کی جا رہی ہے ، نارسنوں کے عمل سے اُسے کوئی مناسبت نہ تھی ۔ دور جدید کے جاپانی مدبروں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ فنی انقلاب ہی جاپان کو مغربی نمونے کی زبردست قوت بنائے گا اور اس کے بغیر جاپانی معاشرہ اپنی جداگانہ ہستی محفوظ نہ رکھ سکے گا ۔ یہ مذہبی جنونیوں کا مقصد تھا جس کے حصول کے لیے ہیرودیسی طریقے اختیار کیے گئے ، اس تشخیص کی تصدیق ۱۸۸۲ء کے فرمان سے ہوتی ہے جس کے ذریعے سے مغربی فن کاری کے طور طریقے اختیار کرنے والی جاپانی حکومت کے لیے ایک سرکاری ڈھانچا مہیا کیا گیا ؛ اس میں بدھ مت سے پیشتر کے بعض لا دینی طور طریقے بھی از سر نو زندہ کیے گئے اور اس طرح جاپانی قوم ، ملک اور حکومت کے لیے احترام کے خاص طریقے مقرر ہو گئے ۔ اسی ذریعے سے شاہی خاندان کو ایک نشان بنا کر اُس میں زندگی کی نئی روح پیدا کی گئی ؛ اس خاندان کے متعلق عقیدہ یہ چلا آتا تھا کہ یہ سورج دیوتا کی نسل سے ہے ، یوں قدامت پرستی سے بھی اس سلسلے میں کام لیا گیا ؛ مدعا یہ تھا کہ حکمران شہنشاہ کی ذات کو خدا کا اوتار مانا جائے اور سب لوگ اُسی کی پوجا کریں ۔

ہم نے جو متبادل اصطلاحات اختیار کیں ، شروع میں وہ بہت صاف اور واضح معلوم ہوتی تھیں لیکن ان کے اطلاق میں جو مشکلات مضمر تھیں ، وہ اب ہماری ہر توجہ پر واضح نظر آتی ہیں مثلاً ہم صیہونی طریق کو کس سلسلے میں لائیں گے ؟ جو مذہبی دیوانے سختی سے روایات کے پابند رہے ، وہ اس تحریک کو درست ماننے کے لیے تیار نہیں ؛ اُن کی رائے ہے کہ

صیہونیوں نے بدی کا ارتکاب کیا اور وہ خود زور و قوت سے کام لے کر ''ارض موعود'' میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگے حالانکہ یہ کام خدا کا تھا اور اسے اُسی کی مشیت اور رضا کے مطابق انجام پانا چاہیے تھا؛ علاوہ بریں وہ لوگ بھی اس پر سختی سے نا رضامندی کا اظہار کرتے رہے جو ہیرودیسیت کے طریقوں پر عمل کرتے ہوئے دوسری قوموں میں جذب ہو چکے تھے؛ اُن کے نزدیک یہ عقیدہ ہی ماتم کا مستحق تھا کہ یہودی دنیا بھر سے نرالی قوم ہے، اُنھوں نے موجودہ دور کے آزادی پسندانہ خیالات کو دلوں میں بٹھا لیا اور کہنے لگے کہ یہودی مذہب بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک ''پیلہ'' تھا جو اپنی غرض پوری کر چکا۔

بیسویں صدی کی دو نہایت عظیم الشان شخصیتیں ——— لینن اور گاندھی ——— ہمارے سامنے ایک حیران کن معمے کی شکل میں پیش ہوتی ہیں، اس لیے کہ دونوں رومی دیوتا جینس[1] کی طرح بہ یک وقت دو رخے چل رہے ہیں۔ اگر ان کی تحریرات پر نظر ڈالی جائے تو ہم اُن میں سے مغرب اور اُس کے تمام کاموں کے بارے میں گالیوں کا ایک لا متناہی طومار فراہم کر لیں گے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اُن کی تعلیمات مغربی روایات کے عناصر سے سراسر متاثر ہیں۔ لینن اُن مادہ پرستانہ روایات کا معلم ہے جن کا ماخذ مارکس ہے، گاندھی مسیحی روایات کو جارج فاکس[2] کے پیرووں کے انداز میں پیش کرتا ہے؛ جب وہ ہندوؤں کے طریقۂ ذات بندی کی مذمت کرتا ہے تو در اصل ایک مغربی اصول کی دعوت دیتا ہے اور ہندوؤں میں اس دعوت کے قبول کی فضا ہرگز سازگار نہیں۔

جن معاشروں پر باہر سے یورش ہو، ہم کہ چکے ہیں کہ اُن کے ارکان کے سامنے دو متبادل راستے ہوتے ہیں، یعنی مذہبی جنون اور ہیرودیسیت؛ ان کے بارے میں ہم نے اس مبحث کے آغاز میں جو مثالیں پیش کی تھیں وہ اب تضاد کے کہر میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے

---

۱ Janus -

۲- George Fox (۱۶۲۴ء - ۱۶۹۱ء)، یہ شخص ''انجمن احباب'' کا بانی تھا، اس نے اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے عمر بھر سفر جاری رکھا۔ اس کے ''جرنل'' دنیا کی عظیم الشان کتابوں میں شمار ہوتے ہیں (مترجم)۔

کہ ہم نے انھیں اجتماعی طرقِ عمل سمجھتے ہوئے گفتگو نہیں کی تھی، ہمارا کہنا یہ تھا کہ انفرادی روحیں ان شکلوں پر عمل پیرا ہوتی ہیں؛ اب ہم انھیں متبادل رد عمل کی مثالیں قرار دے سکتے ہیں جنھیں ابتدائی دور میں ہم نے قدامت پرستی اور مستقبلیت قرار دیا تھا اور کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں ہم اُن کا جائزہ لے چکے ہیں جب انسانی روح کے اندر انشقاق کا معاملہ ہمارے زیر غور تھا۔ یہ انشقاق اُن تہذیبوں میں نمایاں ہوتا ہے جو شکستہ ہو کر دورِ انحلال میں داخل ہو جاتی ہیں؛ اس ضمن میں ہم نے قدامت پسندی کی تعریف یہ کی تھی کہ یہ خوش گوار تر حالات کی طرف لوٹ جانے کی ایک کوشش ہوتی ہے جو مشکلات کے دور میں بہت زیادہ یاد آتے ہیں اور جیسے جیسے ہم اُن سے دور ہوتے جاتے ہیں اُن کی قدر و منزلت بڑھتی جاتی ہے حالانکہ یہ کوشش تاریخی نقطۂ نگاہ سے درست نہیں ہوتی۔ یہ تعریف مذہبی جنون پر بھی صادق آتی ہے، ہم نے قدامت پسندی کے متعلق لکھا تھا:

> قدامت پسندی کی جتنی مثالیں ہمارے سامنے آئی ہیں اور ہم نے اُن کا جائزہ لیا ہے، اُن میں ناکامی کی ایک لہر ——— اگر مثبت ناکامی نہیں تو کم از کم مہملیت ——— صاف نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ تلاش کر لینا مشکل نہیں؛ قدامت پسند اپنے نصب العین کی فطرت و طبعیت کے اعتبار سے اس مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ماضی و حال میں کسی نہ کسی طرح مطابقت پیدا ہو جائے۔۔۔۔ اگر وہ حال کو پیش نظر رکھے بغیر ماضی کی بحالی کے لیے کوشاں رہے تو زندگی کا وہ جذبہ جو ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا ہے، اُس کے بے لوچ خیالی قلعے کو ریزہ ریزہ کر ڈالے گا؛ اس کے برعکس اگر وہ اس بات کے لیے تیار ہو جائے گا کہ ماضی کے احیاء کو حال کے عملی تقاضوں کے تابع رکھے تو اُس کی قدامت پسندی سراسر ایک دھوکا اور فریب رہ جائے گی۔

مستقبلیت کی تعریف یوں کی گئی تھی کہ انسان ناخوش گوار حال سے بچ نکلنے کی کوشش میں نامعلوم اور غیر ممکن الادراک مستقبل میں ایک جست

لگاتا ہے، اس حرکت کا نتیجہ بھی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا؛ باقی رہی ہیرودیسیت تو یہ در اصل دوسرے معاشرے کے ادارات و خصائص کی ایک فرسودہ نقل ہے۔ ہم اس کے متعلق بہتر سے بہتر رائے بھی قائم کریں تو یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ایسی چیز کا چربہ ہے جو غالباً اصل میں بھی قابل پسند نہ تھی؛ اس کے برعکس حالت کو بے آہنگ اور بے میل عناصر کا ایک ناسازگار اجتماع قرار دینا چاہیے۔

(III) تبلیغ انجیل: ہم دیکھ چکے ہیں کہ مذہبی جنون اور ہیرودیسیت دونوں نے یکساں طور پر اپنی شکست کا خود انتظام کر لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مقابلوں کے روحانی نتائج کی نسبت ہمیں روشنی کی تلاش ہو تو کیا تاریخ کے دارالاستخارہ سے ہمیں مذکورہ بالا جواب کے سوا کچھ نہیں ملتا؟ اگر واقعی اور کوئی جواب نہیں مل سکتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ عالم انسانیت کا منظر ہرگز دیدنی نہیں رہ سکتا اور ہمارے لیے صرف ایک نتیجہ باقی رہ جائے گا اور وہ یہ کہ تہذیب کے نام سے اب تک جو کوششیں کی گئیں، وہ در اصل ایک ایسی اوج گاہ پر پہنچنے کی مختلف کوششیں تھیں جس پر چڑھنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔

یاد ہوگا کہ اس نئی عظیم الشان سعی و کوشش کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب انسانی فطرت کی قوت فکر، مردانگی و استقامت اور ذوفنونی ان تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار ہو گئی تھی جو تغیر کی راہ میں حائل تھیں اور عالم انسانیت نے اپنی تاریخ کے اس نازک مرحلے پر قدم آگے بڑھایا تھا۔ ابتدائی دور کا انسان مدت سے ایک مقام پر ٹھہرا ہوا تھا، اس کے لیے مصیبت یہ تھی کہ وہ ہر پھر کر اپنے ان اکابر اور آبا و اجداد کی تقلید کے لیے پیچھے کی طرف لوٹ پڑتا تھا جو دلدل میں پھنسے کھڑے تھے؛ اس مصیبت سے نجات حاصل کرکے انسان نے اس مجلسی خصلت و خصوصیت یعنی تقلید کا رخ ان شخصیتوں کی طرف پھیر دیا جن میں تخلیقی جوہر موجود تھے۔ ان شخصیتوں نے آگے بڑھ کر عالم انسانیت کے لیے نہ محض نئی راہ کی تلاش ہی کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں بلکہ وہ اس راہ پر سب سے آگے چلنے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ بعد کے محققین کی زبان پر یہ سوال آنا لازم تھا کہ ثقافت کے ان ابتدائی علم داروں کے اخلاف اس نئی تحریک سے کس حد تک آگے جا سکیں گے، نیز جب پیش قدمی کا جوش و خروش مدھم پڑ جائے گا تو

کیا تخلیقی عمل کے اعادے سے نفسی قوت کا کوئی ایسا چھپا ہوا خزانہ اُنھیں مل جائے گا جو پھر ویسے ہی جوش و خروش سے مزید آگے بڑھائے؟ اگر اس آخری سوال کا جواب نفی میں ہو تو ہمیں اس نیم خام کا مستقبل یقیناً خوش گوار نظر نہ آئے گا جو تہذیب کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔

مذہبی جنونی کا رخ پیچھے کی طرف تھا، ہیرودیسی طریقے کا عامل سمجھتا تھا کہ اُس کا رخ آگے کی طرف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا تاکہ اپنے ہمسایوں کی پیروی کر سکے؛ پھر کیا ہم سمجھ لیں کہ اس پر قصہ ختم ہو گیا؟

اگر ہم پورے قصے کو تاریخ تہذیب کا سرمایہ سمجھ لیں تو مذکورہ بالا سوال کا صحیح جواب شاید یہی ہو کہ اسے اس قصے کا آخری دور سمجھ لینا چاہیے لیکن اگر تہذیب کے لیے انسان کی کوشش خدا اور انسان کے درمیان دائمی سابقے کا صرف ایک باب ہے تو انجام یہ نہیں ہو سکتا۔ کتاب پیدائش میں طوفان کی جو کہانی بیان کی گئی ہے، اُس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خالق کائنات غضب کی حالت میں آدم کی پوری اولاد کو ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن اُس نے حضرت نوحؑ سے وعدہ فرما لیا کہ جو لوگ حضرت کے ساتھ طوفان سے بچ رہیں گے، اُنھیں آئندہ پانی کا طوفان کوئی گزند نہ پہنچا سکے گا؛ ہم قدامت پسندی اور مستقبلیت کی ناکامی پر بحث کرتے ہوئے کہہ چکے ہیں کہ تیسرا امکان بھی موجود ہے۔

جب زندگی کو کسی نئی متحرک قوت کے اُبھرنے سے سابقہ پڑتا ہے یا اندر سے کوئی نئی تخلیقی تحریک شروع ہو جاتی ہے تو زندہ فرد یا معاشرے کے سامنے دو ہی راستے باقی نہیں رہ جاتے ہیں: اول اُس صورت حال کو باقی رکھنا جسے سنگین جرم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، دوم وہ طریقہ اختیار کرنا جو انقلاب پر پہنچائے؛ نجات کا ایک درمیانی راستہ بھی ہے جس میں پرانے نظام اور نئی راہ عمل کے درمیان موافقت پیدا کر کے اعلیٰ سطح پر یک آہنگی کا سر و سامان کیا جا سکتا ہے، یہی عمل ہے جس کا تجزیہ ہم نے کتاب کے اُس حصے میں کیا تھا جس میں تہذیبوں کے نشو و ارتقا پر بحث کی تھی۔

اسی طرح جب زندگی کو شکست سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ امر حقیقت ثابتہ

بن جاتا ہے تو جو فرد یا معاشرہ اپنی بقا کی خاطر جد و جہد کی آزادی تقدیر سے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اُس کے سامنے صرف دو ہی راہیں رہ جاتی ہیں ؛ ایک یہ کہ حال سے جست لگا کر ماضی میں پہنچ جائے ، دوسری یہ کہ جست لگا کر اُس مستقبل میں چلا جائے جو ابھی سامنے نہیں آیا - یہاں بھی ایک درمیانی راستہ موجود ہے اور وہ یہ کہ مشکلات کی جو فضا پیدا ہو چکی ہے اُس سے کنارہ کش ہو جائے اور اپنی وضع و ہیئت بدل کر بازگشت کا بندوبست کرے - اگر ہم پہلی صدی مسیحی کی طرف متوجہ ہو جائیں تو ہم ان خیالی اور مجرد اصطلاحات کو ایک حد تک حقیقت کا جامہ پہنا سکیں گے ؛ اس غرض سے ہمیں رومی سلطنت کے ایک غیر معروف گوشے کے حالات پر غور کرنا چاہیے جہاں مذہبی دیوانے اور ہیرودیسی طریقے پر عمل کے خواہش مند اپنے لیے راستے تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے - اب ہمیں اپنی توجہ ان گروہوں میں سے کسی پر مرتکز نہ کرنی چاہیے بلکہ اُن کے معاصروں میں سے ایک کے حالات کا جائزہ لینا چاہیے -

پولوس رسول نے فریسی کی حیثیت میں طرسوس کے غیر یہودی ماحول کے اندر پرورش پائی تھی ؛ گویا وہ ثقافتی لحاظ سے تفریط پر عمل پیرا تھا ؛ ساتھ ہی اُس نے یونانی زبان میں تعلیم حاصل کی اور اپنے آپ کو رومی شہری بنا ہوا پایا - مذہبی دیوانوں اور ہیرودیسیوں دونوں کے راستے اُس کے لیے کھلے ہوئے تھے اور ابتدا سے شباب میں اُس نے مذہبی دیوانگی کا راستہ اختیار کر لیا تھا ، لیکن جب دمشق جاتے ہوئے راستے میں اس پر خدائی نور کا ظہور ہوا اور وہ مذہبی دیوانگی کے راستے سے ہٹ گیا تو اُس نے ہیرودیسیوں کا طریقہ اختیار نہ کیا بلکہ اُسے ایک تخلیقی راستہ دکھا دیا گیا جو پہلے دونوں راستوں سے بہت بالا تھا ؛ چناں چہ پولوس رسول نے رومی سلطنت میں تبلیغ و اشاعت کے لیے دورہ شروع کر دیا لیکن نہ یونانیت کے خلاف یہودیت کی تبلیغ کی اور نہ یہودیت کے خلاف یونانیت کی اشاعت فرمائی بلکہ زندگی کے لیے ایک نیا راستہ سکھایا جس میں دونوں متصادم ثقافتوں کی روحانی دولت کے بہترین حصے بلا تعصب شامل کر لیے گئے تھے - اس انجیل کی اشاعت میں کوئی ثقافتی حد حائل نہ ہو سکتی تھی اس لیے کہ مسیحی کلیسا اُن تہذیبوں کی قسم کا کوئی نیا معاشرہ نہ تھا جن کے مقابلوں کا جائزہ

ہم لیتے رہے ہیں بلکہ یہ بالکل نئی قسم کا معاشرہ تھا۔

ایشیا اور یورپ : حقائق و اوہام

ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ کی تمہید میں لکھا ہے کہ میں یونانیوں کے خلاف ہخامنشیوں کے جارحانہ اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے اُن محرکات کا انکشاف کروں گا جن کی تشریح خود ایرانیوں نے کی۔ قدیم زمانے کے اس مؤرخ کے بیان کے متعلق ایرانیوں کی رائے یہ تھی کہ اُنھیں ایک خونی انتقام میراث میں ملا ہے؛ گویا یونانیوں نے ٹرائے کے محاصرے اور تباہی کی شکل میں جو اقدام کیا تھا، ایرانیوں کا قومی فرض ہو گیا تھا کہ اُس کا بدلا لیں۔ یوں ٹرائے کی جنگ اور ایرانیوں کے حملے یورپ اور ایشیا کے درمیان مسلسل تاریخ منازعات کے واقعات تھے۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ جس حد تک تاریخی حقائق کا تعلق ہے، ایرانی اس قسم کے فرض سے بالکل بے خبر تھے۔ اُنھوں نے ہومر کی کتاب کبھی نہ پڑھی تھی لٰہذا اغلب یہی ہے کہ اُنھیں ٹرائے کی جنگ کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا ـــــــ بشرطیکہ اسے مستند تاریخی واقعہ مانا جائے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ہیروڈوٹس نے جو تصویر پیش کی ہے تاریخی اعتبار سے وہ بالکل خیالی ہے، اس لیے کہ اُس میں فرض کر لیا گیا ہے کہ اہل ٹرائے اور ایرانیوں کے درمیان براعظم ایشیا کے باشندے ہونے کے اعتبار سے یک جہتی کا کوئی احساس موجود تھا۔ ہم اس دعوے کی لغویت ثابت کرنے کے لیے یورپ اور امریکہ کے منازعات کو ایسی ہی شکل دے سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ واشنگٹن کی حیثیت دارا کی سی تھی، اور کارٹیز[1] نے میکسیکو کے خلاف جو جارحانہ اقدامات کیے تھے اُن کی بنا پر اُسے ایگ ممنان سمجھ لینا چاہیے؛ گویا واشنگٹن نے یورپ کے سابقہ اقدامات کا بدلا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جنگ آزادی کی شکل میں لیا۔

بہ ہر حال ہیروڈوٹس کے اس افسانے میں دل چسپی اور اہمیت کا یہ پہلو ضرور موجود ہے کہ اس ذریعے سے یورپ اور ایشیا کو دو حریف اور جنگ جو فریقوں کی حیثیت میں پیش کیا گیا اور حریفی کا یہ سکہ جاری ہو گیا۔ یہ

۱- Cortez -

دونوں فریق اب تک ایک دوسرے کے مقابلے پر کھڑے ہیں؛ خشکی میں اُن کے درمیان ایک غیرمعروف پہاڑی سلسلہ سرحد کی حیثیت میں موجود ہے جسے ہم کوہستان یورال کہتے ہیں۔ ایشیا کا تصور ایجاد کرنے کا ذمہ دار ہیروڈوٹس نہ تھا اس لیے کہ اُس سے پیشتر اسچی لس[1] اپنے ایک ڈرامے میں ایرانی سلطنت کو ایشیا قرار دے چکا تھا اور یہ ڈرامہ ۴۷۲ ق۔م میں لکھا گیا تھا؛ البتہ خود ہیروڈوٹس کی کتاب کا نمایاں پہلو ایشیا اور یورپ کے درمیان منازعت کے سوا کچھ نہیں اور اُسی کی فن کاری کا کمال پانچویں صدی کے اس یونانی کے واہمے کو بڑی حد تک جاری کرنے اور رواج دینے کا ذمہ دار ہے۔

یہ واہمہ اُس وقت پیدا ہوا جب کسی تیز دماغ یونانی نے یونان کے دو روایتی جغرافیائی ناموں یعنی ''یورپ'' اور ''ایشیا'' کی معنویت میں انقلابی تغیر پیدا کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نام ملاحوں کے نقشے پر پہلے بھی موجود تھے لیکن اُنھیں سیاسی نقشے پر اس غرض سے جگہ دے دی گئی کہ یہ پروپیگنڈے کا ذریعہ بن سکیں اور اجتماعی خاکے میں انھیں مختلف ثقافتوں کی جاہائے قیام تسلیم کر لیا گیا۔ فکر و خیال کا یہ کارنامہ یقیناً بد قسمتی کا باعث تھا۔ ملاحوں نے جو امتیاز پیدا کیا تھا، وہ بالکل طبعی تھا؛ اُن کے نزدیک بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے درمیان آبی راستے حد فاصل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کے مقاصد کے لیے یہ امتیاز سود مند بھی تھا؛ لیکن ان آبی راستوں کو انسانی تاریخ کے آغاز سے پیش نظر کتاب کی ترتیب تک سیاسی سرحد کی حیثیت کبھی نہ دی گئی؛ صرف دو مختصر سے دور مستثنیٰ سمجھے جا سکتے ہیں۔ اول ۵۴۷ ق۔م سے ۵۱۳ ق۔م کا دور، دوم ۳۸۶ ق۔م سے ۳۳۴ ق۔م کا دور۔ ملاحوں کے تصور میں بر اعظموں کا جو نقشہ تھا اُسے مختلف ثقافتوں کا حل قرار دینا بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ مؤرخ کسی بھی دور کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایشیائیوں اور یورپیوں کے درمیان ثقافتی لحاظ سے کوئی واضح اختلاف موجود تھا؛ البتہ باسفورس اور ہیلس پانٹ کے کناروں کو مستثنیٰ رکھا جا سکتا ہے اور واضح رہے کہ یہ آبنائیں دریائے ہڈسن سے زیادہ چوڑی نہیں اور اتنی چوڑی بھی نہیں جتنا دریائے ایمیزن ہے۔

۱۔ Aeschylus۔

اب یہ دیکھیے کہ یونانی ملاح نے ایشیا کی اصطلاح کہاں سے لی اور کیوں اُس برِ اعظم کے لیے استعمال کی جو مشرقی جانب بحیرۂ ایجہ میں اُس کی آزادانہ نقل و حرکت کی حد تھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح دریائے کایسٹر[1] کی وادی میں مقامی طور پر ایک دلدل کے لیے استعمال ہوتی تھی اور آثار قدیمہ کے تازہ اکتشافات سے واضح ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی قبل مسیح میں یہ مغربی اناطولیہ کی ایک ریاست کا نام تھا جیسا کہ ھٹیوں کے دفتری ریکارڈوں سے پتا چلتا ہے۔

غالباً ''ایشیا'' تنہا ھی نام نہیں جو یونانیوں کے مجموعۂ الفاظ میں داخل ہوا؛ خیال ہے کہ بیسی لیوس[2] بھی بہ ظاہر بادشاہ کے لیے ایک ایسا یونانی لفظ ہے جو اصلاً غیر قانونی ہے۔ یہ نام بیاسی لس[3] سے لیا گیا جو چودھویں صدی قبل مسیح میں دریائے فرات کے ایک علاقے کرشمش کا ھی بادشاہ تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اکائی بحری قزاق ساحل پمفیلیا[4] پر پہنچنے لگے تھے۔ اگر یہ اشتقاق درست ہے تو بیسی لیوس کو وھی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جو کرال[5] کو حاصل ہے۔ یہ لفظ مختلف سلافی زبانوں میں بادشاہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ کاروکس اعظم[6] یعنی شارلیمن سے اخذ کیا گیا۔ لفظ یورپ کی اصل کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہے؛ ہو سکتا ہے کہ یہ فونیقی لفظ (جس کے معنی عربی لفظ غرب کے ہیں) عرب[7] کا یونانی بگاڑ ہو اور اس کا مطلب مغرب کا وہ تاریک خطہ ہو جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ اگر یہ کوئی ٹکنیکل اصطلاح نہیں، جو

۱- Cayster -

۲- Basileus - جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے، یونانی زبان میں اس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔

۳- Biyassilis -

۴- Pamphylia - زمانۂ قدیم میں یہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کا ایک علاقہ تھا۔

۵- Kral - یہ چارلس کی ایک شکل ہے۔

۶- Karolus Magnus -

۷- Ereb -

فونیقی ملاحوں سے مستعار لی گئی بلکہ یہ یونانی لفظ ہے تو ممکن ہے اس کے معنی جزیروں کے مقابلے میں وسیع زمین کے ہوں ؛ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی دیوی کا نام ہو -

حقیقت خواہ کچھ ہو لیکن یہ دو نام ملاحوں نے جزیروں اور بر اعظم کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لیے تجویز کیے تھے - ملاح ایشیائی یا یورپی ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف روانہ ہوئے تو وہ تین آبناؤں میں سے گزرے جو یکے بعد دیگرے انھیں ملیں : اول درِ دانیال ، دوم باسفورس ، سوم کرچ[1] - آخری آبنائے سے گزر کر بحیرۂ ایزوو کو عبور کیا گیا ؛ پھر دریائے ڈان کے دھانے سے اس میں داخل ہو گئے اور دریائی کشتی رانی کا سلسلہ شروع ہو گیا - یہاں پہنچ کر دونوں بر اعظموں کے درمیان مستقل حد فاصل گم ہو گئی اس لیے کہ بحیرۂ اسود کے شمال میں جو لوگ رہتے تھے ، خواہ وہ یوریشیائی سطح مرتفع کے خانہ بہ دوش تھے یا اس زمین سیاہ کے یوریشیائی کاشت کار تھے ، جو کوہ کارپتھین کے مشرقی ڈھلانوں سے الطائی تک پھیلی ہوئی ہے ، تو ایشیا اور یورپ کے درمیان امتیاز بالکل بے معنی رہ جاتا ہے -

یورپ اور ایشیا کی دو گونگی دور جدید کی مغربی دنیا نے یونانی دنیا سے قبول کی - یہ میراث سب میں کم سے کم مفید تھی - درس گاہوں میں یورپی روس اور ایشیائی روس کے درمیان جو امتیاز سکھایا جاتا ہے ، وہ سراسر لغو ہے لیکن اس سے غالباً کسی کو نقصان نہیں پہنچا ؛ اسی قسم کا امتیاز یورپی ترکی اور ایشیائی ترکی کے درمیان بھی قائم کیا گیا اور یہ خاصی پریشان خیالی کا ذریعہ ہے - تہذیبوں کی زاد بوموں کے درمیان حقیقی سرحدوں کو ان دقیانوسی افسانہ آرائیوں سے کوئی تعلق نہیں - جس شے کو ہم یوریشیا کہتے ہیں وہ ایک غیر مشتبہ جغرافیائی حقیقت ہے ؛ یہ اتنی وسیع ہے اور اس کی وضع قطع اس درجہ بے قاعدہ ہے کہ ہم اپنی سہولت کے لیے اس میں سے متعدد خطے الگ کر سکتے ہیں جنھیں بر صغیر کہنا موزوں ہوگا - ان میں سب سے بڑھ کر

۱- Kerch - یہ آبنائے بحیرۂ اسود کے شمال میں واقع ہے اور اس سمندر کو بحیرۂ ایزوو (Azov) سے ملاتی ہے جسے ترکی اقتدار کے زمانے میں بحیرۂ کریمیا کہتے تھے -

معین حدود ہندوستان کے ہیں اور اس کے لیے ہمیں ہمالیہ پہاڑ کا ممنون ہونا چاہیے اس لیے کہ اس پہاڑ نے خشکی کی جانب معین حد قائم کر دی ۔ یورپ بھی اسی کا ایک حصہ ہے لیکن یورپ کی بری سرحد ہندوستان کے برعکس کبھی معین نہیں ہوئی اور یقیناً یہ سرحد کوہستان یورال سے مغرب میں خاصے فاصلے پر واقع ہے ۔

دسواں حصہ

تہذیبوں کے درمیان زمانی تعلقات

چونتیسواں باب

مختلف دوائر میں احیاء کا جائزہ

۱- تمہید - احیاء سے کیا مراد ہے؟

فرانس کے ایک اهل قلم ، ای - جے - ڈیلے کلوز[۱] (۱۷۸۱ء — ۱۸۶۳ء) غالباً پہلا شخص ہے جس نے احیاء[۲] کا لفظ استعمال کیا - اُس کا مدعا یہ تھا کہ اس لفظ سے مغربی مسیحیت پر مردہ یونانی تہذیب کے اُس اثر کو ظاهر کیا جائے جو ایک خاص وقت میں ایک خاص مقام پر ظہور پزیر ہوا - مقام سے مراد شمالی و مشرقی اٹلی ہے اور وقت سے مراد قرون وسطیٰ کا آخری دور - زندہ پر مردہ کے اس خاص اثر کی یہی ایک مثال نہیں جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے - بہ هرحال هم اس اصطلاح کو ایسے مظاهر کا عام نام دے لیتے هیں اور ان کا جائزہ شروع کرتے هیں - اس سلسلے میں همیں یہ احتیاط ضرور برتنی چاهیے کہ جو کچھ هم چاهتے هیں اُس سے زیادہ معنی اس میں شامل نہ کیے جائیں - یہ اصطلاح صرف فنون و ادب کے دائرے میں یونانی ثقافت کے لیے استعمال هوتی ہے - یہ سلسلہ بیزنطینی اهل علم کے ذریعے سے اٹلی تک پہنچا لیکن اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بہ لحاظ وقت ایک مردہ تہذیب سے سابقہ تھا ، بلکہ مقامی لحاظ سے یہ ایک زندہ تہذیب کے ساتھ مقابلہ تھا ، لہٰذا یہ معاملہ اُس موضوع سے متعلق ہے جس پر هم کتاب کے ایک سابقہ حصے میں بحث کر چکے هیں - پھر جب یونانی ثقافت نے الپس کو

۱- Delecluze -

۲- Renaissance : انگریزی زبان میں یہ اصطلاح پہلے پہل ۱۸۴۵ء میں رائج هوئی - میتھیو آرنلڈ نے اسے فرانسیسی تلفظ کے بجائے انگریزی تلفظ اور انداز میں لکھنا شروع کیا -

عبور کیا اور اطالوی احیائے علوم و فنون نے فرانس اور الپس پار کے دوسرے مغربی ملکوں کے فنون و ادب پر اثر ڈالا تو ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ہم عصر اٹلی کے ذریعے سے عمل میں آیا تھا اور قدیم یونان سے براہ راست تعلق پیدا نہ ہوا تھا۔ لٰہذا ہم اُسے احیاء قرار نہیں دے سکتے؛ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک معاشرے کے علم دار حصے نے جو کچھ حاصل کیا تھا، اُسے اُسی معاشرے کے دوسرے حصوں کی طرف منتقل کردیا۔ چناں چہ یہ معاملہ بھی نشو و ارتقا کے معاملے سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر ہم کتاب کے تیسرے حصے میں بحث کر چکے ہیں۔ ایک طرف خالص اور غیر ممزوج احیاء ہے جس میں مردہ معاشرے کے ساتھ براہ راست مقابلہ در پیش ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ احیاء ہے جو محوّلہ بالا مختلف انواع میں سے کسی ایک کی آمیزش سے پیدا ہوا۔ ان دونوں قسموں کے درمیان کوئی حدّ فاصل قائم کرنا عملاً مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔

احیاء کی چھان بین شروع کرنے سے پیش تر ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ان مظاہر کو ماضی اور حال کے درمیان مقابلوں کے دوسرے دو نمونوں سے ممتاز کیوں کر رکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے اول ابویت و ابنیت کا تعلق ہے جو قریب الموت یا مردہ تہذیب اور اُس کے جنین یا نومولود جانشین کے درمیان ہوتا ہے؛ اس موضوع پر ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اسے ایک طبعی اور ضروری مظہر سمجھ لینا چاہیے، جیسا کہ ابوت و ابنیت کی اصطلاح میں مضمر ہے۔ اس کے برعکس احیاء کا مطلب یہ ہے کہ ایک پروان چڑھی ہوئی تہذیب اور اس کے مدتوں پہلے مرے ہوئے پیش رو کی روح کے درمیان مقابلہ ہو۔ یہ شے اگرچہ عام ہے، تاہم اسے غیر طبعی سمجھنا چاہیے، اور ہم چھان بین کریں گے تو اکثر اسے ناخوش گوار پائیں گے۔ حال و ماضی کے درمیان مقابلوں کا دوسرا نمونہ وہ مظہر ہے جسے ہم نے قدامت پسندی سے تعبیر کیا اور اس کی تعریف یوں کی کہ یہ معاشرے کو نشو و ارتقا کے کسی ابتدائی دور کی طرف لوٹا لے جانے کی کوشش ہے اور قدامت پسندوں کا تعلق خود اسی معاشرے سے ہوتا ہے۔ ماضی و حال کے درمیان مقابلوں کے تین نمونوں کے سلسلے میں ایک اور نقطۂ امتیاز بھی قابل توجہ ہے۔ ابوت و ابنیت کے تعلق میں یہ بالکل واضح ہے کہ دونوں معاشرے نشو و ارتقا کے مختلف بلکہ متضاد مراحل میں ہوتے ہیں جسے ہم نے پیش رو کہا۔ وہ معاشرہ بڑھاپے کی حد کو پہنچ کر

دور انحلال میں داخل ہو جاتا ہے ؛ اس کے برعکس نوسولود میں آچھل کود کی قوت ہوتی ہے ۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ قدامت پسند جماعت ایسی صورت حال کی شیدائی بن جاتی ہے جو اُس جماعت کی حالت سے بالکل مختلف تھی ورنہ اُسے قدامت پسندی کیوں قرار دیا جائے ۔ اس کے برعکس جو معاشرہ دور احیاء میں داخل ہوتا ہے اُس کے بارے میں سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے پیش رو کی روح کو سامنے رکھ لیتا ہے اور اسی دور پر توجہ جماتا ہے جو پیش رو پر اس حالت میں طاری تھی جب وہ خود دور احیاء میں داخل تھا ۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ ہیملٹ اپنے باپ کی ایسی روح تجویز کر لے جس سے مقابلہ در پیش تھا ، یعنی روپہلی ڈاڑھی والا باپ یا ایسا باپ جو خود بیٹے کی عمر کا ہو ۔

۲۔ سیاسی افکار و ادارات کا احیاء

یونانیت کا جو احیاء قرون وسطیٰ کے اٹلی کے آخری دور میں ہوا اُس نے ادبی یا فنی سطح کے بجائے مغربی زندگی کی سیاسی سطح پر زیادہ پائدار اثر ڈالا ۔ نیز یہ سیاسی مظاہر فنون کے مقابلے میں نہ محض زیادہ دیر تک زندہ رہے بلکہ اُن سے پہلے آئے تھے ۔ ان کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب لمبارڈی کے شہر بشپوں کے ہاتھ سے نکلے اور ان کا نظم و نسق عوام کے ہاتھ میں آیا ۔ اس نظم و نسق کے ذمہ دار مجسٹریٹوں کے وہ بورڈ تھے جو شہریوں کے روبرو جواب دہ مانے جاتے تھے ۔ گیارھویں صدی کے اٹلی میں شہری ریاستوں کے یونانی اداروں کا احیاء اطالوی ثقافت کی روشنی کے ساتھ ساتھ مغربی مسیحیت کے الپس پار کے صوبوں میں پہنچ گیا اور اُس نے مغرب کی جاگیردارانہ بادشاہیوں کے باشندوں پر متناسب اثر ڈالا ۔ یونان کی اس روح کا اثر ابتدائی دور اور آخری دور میں یکساں تھا ؛ البتہ ابتدائی دور میں اس کا میدان مقابلۃً تنگ رہا ، آخری دور میں خاصا وسیع ہو گیا ۔ اس کا ایک سطحی اثر یہ ہوا کہ دستوری حکومت کے عقیدے کی نشر و اشاعت شروع ہو گئی جس کے لیے انجام کار یونان ہی کی اصطلاح جمہوریت استعمال ہوئی ۔ دستوریت میں مشکلات بھی پیش آئیں اور ناکامیوں سے بھی سابقہ پڑا ؛ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی جگہ یونان ہی کی ایک دوسری شخصیت کے لیے راستہ صاف ہو گیا جسے ''مستبد'' کہتے تھے ۔ ''مستبد'' پہلے پہل اٹلی کی سنہری ریاستوں میں نمودار ہوئے ،

بعد ازاں ان کو بدرجہا وسیع دائرے مل گئے اور اُن کی تباہ کاریوں کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔

یونان کی ایک اور رسم نے قرون وسطیٰ میں رواج اختیار کیا؛ جب لیو سوم پاپائے روم نے شارلمین کو ۸۰۰ء کے یوم کرسمس پر سینٹ پیٹر کے گرجے میں رومی شہنشاہی کا تاج پہنایا، اس ادارے کی بھی سابقہ تاریخ بہت پھیلی ہوئی ہے۔ نمائشی طور پر یونانیت کا سب سے بڑا معتقد اوٹو سوم (عہد حکومت ۹۸۳–۱۰۰۲ء) تھا، جس نے اپنا دارالحکومت رومہ میں تبدیل کر لیا۔ یہ شہر اُس زمانے میں ایک ایسی جگہ واقع تھا جو دونوں مسیحی دنیاؤں کے درمیان وجہ نزاع تھی۔ اس قدیم شہنشاہی شہر میں قدم جما لینے سے اوٹو سوم کو اُمید تھی کہ وہ رومی شہنشاہی کے نقلی بت کو مستحکم بنا لے گا۔ جیسا کہ ہم دوسرے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں اوٹو سوم کا یہ تجربہ اُس کی وفات کے بعد بے نتیجہ رہا۔ دو صدی کے اندر اندر اس تجربے کو بدرجہا سازگار تر حالات میں دھرایا گیا۔ اگرچہ دھرانے والا بڑا صاحب عقل و ہوش تھا، یعنی فریڈرک ثانی ہوھن سٹافن لیکن نتیجہ پہلے سے بدرجہا زیادہ اضطراب انگیز نکلا۔ کئی صدیاں بعد روسو نے یونانیت کی اُس تدبیر کو ہر دل عزیز بنایا جسے پیلو ٹارک نے پیش کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس کے انقلابی سوان اور لائی کرگس کے حوالے دیتے ہوئے کبھی نہ تھکتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی عورتوں اور ڈائرکٹروں کے لیے کلاسیکی لباس تجویز کیے۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات کیا ہو سکتی ہے کہ نپولین اول نے جب اپنے آپ کو کونسل کے اوپر کے درجے میں پہنچانا چاہا تو شہنشاہ کا لقب تجویز کیا۔ اپنے بیٹے اور جانشین کو شاہ رومہ قرار دیا۔ یہ آخری لقب قرون وسطیٰ کی مغربی دنیا میں مقدس رومی شہنشاہی کے اُمیدوار اختیار کرتے تھے، یہاں تک کے پوپ اُنھیں رومہ میں تاج پہناتے تھے (اکثر بادشاہ یہ تقدیس حاصل کرنے میں ناکام رہے)۔ باقی رہا نپولین سوم تو اُس نے جولیئس سیزر کے سوانح حیات خود لکھے یا کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کیے۔ سب سے آخر میں ہٹلر نے بھی رو در رو خراج عقیدت ادا کیا اور اپنی مفصلاتی قیام گاہ اُس ٹیلے پر بنائی جس کے نیچے بار بروسا کا مقدس غار موجود تھا، یعنی برخس گارڈن میں، اور اُس نے شارلیمن کا وہ شاہی لباس قبول کیا جو ہیپس برگ کے عجائب خانے سے چرایا گیا تھا۔

مغرب مسیحی بادشاهی کے ادارے کے ارد گرد بھی ایک زیادہ فیاض روح منڈلا رهی هے - ۸۰۰ء میں کرسمس کا دن تھا جب رومی سلطنت کے رسمی احیاء پر مذهبی تصدیق کی مہر لگائی گئی تھی ، یعنی فرینکوں کے بادشاہ کو پوپ نے رومی شہنشاهی کا تاج پہنایا تھا ، اس کے لیے یونانی تاریخ میں کوئی مثال موجود نہ تھی - جو رسم اس دن رومہ میں ادا کی گئی ، اس کی ایک موزوں مثال وہ رسم هے ، جو ''سائے سان[1]'' کے مقام پر ۷۵۱ء میں ادا کی گئی تھی ، یعنی آسٹریا کے ایک میرسامان پے پن[2] کو اس لیے فرینکوں کا بادشاہ بنا دیا گیا کہ اسے پوپ زکریاس[3] کے نمایندے سان بونی فیس[4] نے تاج پہنایا تھا اور بپتسما دیا تھا ، کلیسائی تصدیق کی یہ مذهبی رسم ——— جو هسپانیہ کے مغربی گاتھوں میں عام هو چکی تھی ——— در اصل ایک اسرائیلی ادارے کا احیاء تھی ، جس کا ذکر سیموئیل اور سلاطین[5] میں آیا هے - سیموئیل نبی نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بادشاہ بنایا - صدوق[6] کاهن اور ناتھن[7] نبی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاهی کی تقدیس منائی - مغربی مسیحیت کے بادشاهوں اور ملکاؤں کے لیے یہ بڑی اچھی مثالیں هیں -

۳- قانونی نظاموں کا احیاء

رومی قانون پر ایک هزار سال کی مدت اس وقت تمام هوئی جب جسٹینین نے اسے ازسرنو مرتب کیا - اس مدت میں یہ قانون تدریجاً پہلے رومی باشندوں اور بعد ازاں پورے یونانی معاشرے کی ضروریات کے مطابق توسیع پاتا رها لیکن جس طریق زندگی میں باقاعدگی اور تنظیم پیدا کرنے کے لیے یہ قانون بنا تھا ، وهی باقی نہ رها تو یہ بھی سہارے سے محروم هو گیا ، اور یہ صورت حال یونانی دنیا کے محض مغربی حصے هی میں پیش نہ آئی بلکہ مشرقی حصے میں بھی اسی سے

۱- Soissons - فرانس کا ایک مشہور مقام -

۲- Pepin -

۳- Zacharias -

۴- Saint Boniface -

۵- سیموئیل سلاطین بائبل کی کتابیں هیں -

۶- Zadok -

۷- Nathan -

سابقہ پڑا - بعد ازاں زوال کی علامتیں نمودار ہونے پر قانونی اور سیاسی دونوں سطحوں پر نئی زندگی کے آثار آشکارا ہوئے - زندہ معاشرے کے لیے زندہ نظام قانونی مہیا کر دینے کے جذبے نے یہ صورت اختیار نہ کی کہ رومی قانون کو از سر نو زندہ کر لیا جاتا جو آٹھویں صدی مسیحی میں تمام معاصر قانونی نظاموں سے اسی طرح اونچے مقام پر بیٹھا تھا جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی معدوم یونانی ثقافت کے کسی عظیم الشان مقبرے کی چھت پر رکھی ہوئی ہو - مشرق و جنوبی دونوں نئے مسیحی معاشروں نے مسیحیت پر اپنے عقیدے کے اخلاص کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے یہ کوشش کی کہ مسیحیت اختیار کرنے والوں کے لیے مسیحی قانون مرتب کیا جائے - اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مسیحی دنیاؤں میں پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قانون کا احیاء ہوا جو مذہبی صحیفوں میں موجود تھا اور جسے مسیحیت نے یہودیوں سے میراث میں پایا تھا ، پھر اس رومی قانون کا احیاء عمل میں آیا جو جسٹینین کے ضوابط کی شکل میں مرتب تھا -

آرتھوڈکس مسیحی دنیا میں نئے اقدام کا اعلان مشرقی رومی سلطنت کے دو شامی بانیوں کے مشترکہ عہد حکومت میں ہوا ، یعنی لیو سوم اور اس کا بیٹا کانسٹنٹائن پنجم - انھوں نے ۷۴۰ء میں ایک قانونی کتاب پر مہر تنفیذ لگائی - مسیحی اصول کے مطابق سلطنت کے نظام قانونی کو تبدیل کرنے کی یہ پہلی مستقل کوشش تھی[1]-

نئے مسیحی قانون کے معرض وجود میں آنے کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ یہودی قانون از سر نو زندہ ہو جاتا جسے مسیحی کلیسا نے غالباً حماقت سے یا کم از کم با دل ناخواستہ اپنے مذہبی صحیفوں کے قانون میں شامل کرنے پر اصرار کیا تھا - اسے موسوی قانون کہیے یا عیسوی لیکن شامی بادشاہوں نے جو نظام قانون بنایا تھا، آگے چل کر ثابت ہوتا رہا کہ وہ بیزنطینی معاشرے کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سراسر ناکافی تھا - چناں چہ ۸۷۰ء کے بعد مقدونوی خاندان کے بانی باسل نیز اس کے بیٹوں اور جانشینوں نے اعلان کر دیا کہ جو قانون اساریوں یعنی سابق شامی شہنشاہوں نے جاری

۱- ملاحظہ ہو گبن کی کتاب ''زوال و سقوط سلطنت رومہ'' جلد پنجم ضمیمہ ۶ - وہ اڈیشن جو جے - بی - بری (Bury) نے مرتب کیا -

کیا تھا اُس کی حماقتوں کو ہم نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُسے ٹھکراتے ہیں۔ اپنے پیش روؤں کے قانون سے اس قلبی بیزاری کے بعد مقدونوی شہنشاہوں نے جسٹینین کے ضوابط کو از سر نو زندہ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ یہ کام انجام دیتے ہوئے اُن کا خیال یہ تھا کہ ہم خالص رومی ہونے کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔ انیسویں صدی میں جن لوگوں نے تعمیرات کے دائرے میں گاتھوں کی طرز کو زندہ کیا تھا، وہ اسی طرح اپنے آپ کو سچے گاتھ سمجھ رہے تھے۔ مشکل یہ ہے کہ جتنے لوگ احیاء کے داعی ہوتے ہیں اُنھیں در اصل جنس خالص نہ سمجھنا چاہیے اور یقیناً وہ جنس خالص ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ اصل شے سے مختلف ہوتے ہیں، جس طرح مادام تساؤ[1] کی مومی کارگاہ کے مجسمے اصل شخصیتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

اس قانونی ڈرامے میں مسیحوں نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بعد ازاں جسٹینین کے قوانین کو زندہ کیا؛ اسی قسم کا ڈرامہ مغربی سٹیج پر بھی دکھایا گیا جس میں لیو شامی کا کردار شارلمین نے ادا کیا۔

> کارولنجی شاہی خاندان نے جو قانون بنائے تھے، وہ مغربی مسیحیت میں نئی مجلسی بیداری کے ظہور کا نشان تھے۔ اب تک جو قانون مغربی بادشاہوں میں رائج تھا، اُس کی کیفیت یہ تھی کہ پرانے بربری قبائلی ضابطوں کے ساتھ مسیحیت کا ضمیمہ لگا دیا گیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ ماضی سے رشتہ صاف صاف توڑا گیا اور مسیحیت نے اپنے قانون بنانے شروع کیے جو کلیسا اور حکومت کی مجلسی سرگرمیوں کے پورے دائرے پر حاوی تھے اور تمام معاملات کو مسیحی خصائص کے معیار پر پرکھا جاتا تھا؛ اس کے لیے نہ جرمن نمونہ پیش نظر رکھا گیا اور نہ رومی نمونہ[2]۔

۱۔ Madame Tussaud۔ یہ ایک فرانسیسی خاتون تھی جو انقلاب فرانس کے زمانے میں لندن پہنچی۔ وہاں اس نے مومی مورتیوں کا عجائب خانہ قائم کیا۔ یہ آج بھی قائم ہے اور زیارت گاہ عام ہے۔ اس میں موم سے ایسی شکلیں تیار کی جاتی ہیں جو اصل کے بالکل مشابہ ہوں۔

۲۔ Dawson کی کتاب "مذہب اور ظہور ثقافت مذہبی" صفحہ ۹۰۔

آرتھوڈکس مسیحیت اور جدید مغربی مسیحیت دونوں صورتوں میں حضرت موسیٰ کا سایہ برابر بیلفین اناجیل اور اوصیا پر چھایا رہا :

کارولنجی شاھنشاھوں نے تمام مسیحی باشندوں کو اسی انداز میں نیا قانون دیا ، جس انداز میں عہد نامۂ قدیم کے بادشاہ اور قاضی دیا کرتے تھے ۔ انھوں نے خدائی قانون بندگان خدا میں جاری کر دیا ۔ کیتھالف نے چارلس کی حکومت کے آغاز پر اسے جو خط لکھا تھا ، اس میں بادشاہ کو زمین پر خدا کا نمایندہ قرار دیا تھا ، اس نے چارلس کو مشورہ دیا تھا کہ الٰہی قانون کی کتاب کو اپنی حکومت کا دستور بنائے اس لیے کہ توریت کی کتاب استثنا کے سترھویں باب کی آیات ۱۸ - ۲۰ میں یہی حکم دیا گیا ہے ۔ آیات مظہر ھیں کہ بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھتے ھی کتاب شریعت کاھنوں سے لے کر اس کی ایک نقل اپنے لیے اتار لے ، اسے اپنے پاس رکھے اور عمر بھر پڑھتا رہے تاکہ وہ بادشاہ اپنے خدا کا خوف مانے اور اس شریعت و آئین کی سب بات سیکھے ۔ اس سے اس کے دل میں غرور نہ آنے پائے کہ وہ اپنے بھائیوں کو حقیر جانے اور ان احکام سے دھنے یا بائیں ھرگز نہ مڑے[1] ۔

لیکن آرتھوڈکس مسیحیت کی طرح مغربی مسیحیت میں بھی موسوی قانون کے احیاء کے پیچھے پیچھے جسٹینین کا قانون پہنچ گیا ۔

۱۰۴۵ء میں قسطنطنیہ کے اندر ایک درس گاہ قانون قائم ھوئی اور اسی صدی کے اندر مغربی مسیحی دنیا میں بہ مقام بولونا[2] ویسی ھی درس گاہ قائم کر دی گئی ؛ پھر خودبخود ایک یونیورسٹی قائم ھوگئی جس میں جسٹینین کے قانون کا مطالعہ کیا جاتا تھا ۔ اگرچہ مغربی مسیحیت میں رومی قانون کا احیاء رومی

۱- Dawson کی کتاب ”مذھب اور ظہور ثقافت مذھبی“ صفحہ ۹۰ - ۹۱ ۔

۲- Bologna ۔ اس کا عام انگریزی تلفظ بولون ھے ، میں نے اطالوی تلفظ کو مقدم رکھا ھے ۔

سلطنت کے احیاء کا مقصد پورا نہ کر سکا ، لیکن اُس نے ایک اور مقصد پورا کر دیا ، یعنی چھوٹے پیمانے کی خود مختار و آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں ؛ یہ اصل میں یونانیوں کا ایک سیاسی ادارہ تھیں ۔ بولونا اور اُس سے متعلقہ یونیورسٹیوں میں جن لوگوں نے قانون کی تعلیم پائی وہ ایک بے وجود مقدس رومی سلطنت کے نہیں بلکہ مغرب کی با اقتدار خود مختار ریاستوں کے ناظم بن گئے اور اُنھوں نے انتہائی قابلیت سے اپنے فرائض ادا کیے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد و خود مختار ریاستوں کے ادارے کو اُن تمام سیاسی تنظیمات پر روز افزوں کامیابی حاصل ہوتی رہی جو مغربی مسیحی دنیا کی ابتدائی مجلسی ترکیب میں مضمر تھے ۔

بولونا میں پڑھے ہوئے قانون دان شمالی اور وسطی اٹلی کے شہروں کے لیے ایسے ناظم مہیا کر رہے تھے جن کی قابلیت کے بل پر عوام نے بشپوں کو اختیارات سے نکال باہر کیا اور خود مختار شہری حکومت کا راستہ اختیار کرلیا ۔ قانون دانوں نے بولونا کے مکتب قانون کے ساتھ کلیسائی قانون کا ایک شعبہ بھی قائم کر دیا ۔ اُن کے ذریعے سے لا دینی ریاستوں کے نشو و ارتقا کو بھی مدد ملی ، اگرچہ اُن کا مقصد یہ نہ تھا لیکن اُن کا اصل کارنامہ وہ ہے جسے تاریخ کی نہایت گہری ستم ظریفیوں میں شمار کرنا چاہیے ۔

کہا جا سکتا ہے کہ پوپ نے اُن قانون دانوں کو اُس لفظی نزاع میں اپنا آلۂ کار بنایا جو پاپاؤں کو اپنے دنیا دار حریفوں یعنی مقدس رومی بادشاہوں سے پیدا ہو چکی تھی، لیکن حالات کی زیادہ صحیح تصویر یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ قانون دانوں نے پوپ کو اپنے قبضے میں لے لیا ۔ الیگزنڈر سوم (۱۱۵۹ء — ۱۱۸۱ء) سے جس نے فریڈرک بار بروسا کے خلاف کلیسائی قلعے کو محفوظ رکھا ، بونی فیس ہشتم (۱۲۹۴ء — ۱۳۰۳ء) تک تمام بڑے اور چھوٹے پوپ در اصل عالمانِ دین نہ تھے بلکہ محض قانون دان تھے ؛ مثلاً انوسنٹ سوم (۱۱۹۸ء — ۱۲۱۶ء) جس نے سب سے پہلے دنیا پر یہ واضح کیا کہ سیاسی دائرے میں مطلق العنانی کا مطلب کیا ہے ۔ انوسنٹ چہارم (۱۲۴۳ء — ۱۲۵۴ء) سے بونی فیس ہشتم تک جنھوں نے فرانس اور انگلستان کی طاقت ور بادشاہیوں سے جھگڑا مول لیا اور نقصان اُٹھایا ۔ اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت معرض سقوط میں چلی گئی اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپائیت تباہ ہو گئی اور اُسے پھر وہ اخلاق و مذہبی اعزاز حاصل نہ ہوا جو پہلے حاصل تھا ؛ البتہ

پروٹسٹنٹوں کی علیحدگی کا حادثہ پیش آ جانے کے بعد پاپائیت میں نئی روح پھونکی گئی ۔ بہ ہر حال اس مصیبت کا اصل سر چشمہ قانون دانی اور قانون پروری تھی ۔ سلطنت اور پاپائیت دونوں کے سقوط سے مغرب کی قومی ریاستوں کو بڑا فائدہ پہنچا اور وہ بہت ترقی کر گئیں ۔

۴- فلسفوں کا احیاء

اس دائرے پر نظر ڈالی جائے تو یوریشیائی براعظم کے دونوں سروں پر تقریباً موثر احیاء ہمارے سامنے آتے ہیں ، یعنی مشرقی ایشیائی تہذیب کے مولود مشرق بعید کے معاشرے میں چینی دنیا کے اندر فلسفۂ کنفیوشس کا احیاء اور مغربی مسیحیت میں یونانی دنیا کے فلسفۂ ارسطو کا احیاء ۔

پہلی مثال کو ہمیں اس لیے خارج از بحث قرار دینا چاہیے کہ کنفیوشس کا فلسفہ اس معاشرے کے ساتھ موت کی آغوش میں نہ پہنچا تھا جس میں وہ پیدا ہوا تھا ؛ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موسم بدلنے پر یہ اپنی جگہ سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو گیا تھا ، اور جو چیز موت کی آغوش میں نہ پہنچے اس کے بارے میں قانوناً یہ کہنا درست نہیں مانا جا سکتا کہ اس کی روح از سر نو نمودار ہوئی ۔ اس اعتراض کی قوت کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے لیکن ساتھ ہی عرض کر دینا چاہیے کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے ، اس لیے کہ تنگ[1] خاندان کے شہنشاہ تائی سنگ[2] نے جب ۶۲۲ء میں کنفیوشس کی کتابوں کو سول سروس کے امتحان کے لیے مقرر کیا تھا ، اور انہیں امتحانوں کی بناء پر سول سروس کے امیدوار منتخب کیے جاتے تھے تو اس واقعے میں احیاء کے تمام بنیادی اوصاف موجود تھے ۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تاؤ ازم اور بدھ مت نے سیاسی دائرے سے کنفیوشس کو نکال باہر نہ کرنے کا ایک اچھا موقع کھو دیا ، حالانکہ چینی معاشرے کے انحلال پر جو دور شروع ہوا اس میں وہ کنفیوشس کو بہ آسانی ختم کر سکتے تھے اس لیے کہ وہ ہمہ گیر سلطنت برباد ہو چکی تھی جس نے اپنے آپ کو کنفیوشس کا پیرو بنایا تھا اور اس کے ساتھ کنفیوشس کے وقار کو بھی خاصا صدمہ پہنچ چکا تھا ۔

۱- Tang -

۲- Tai Tsung -

ایک طرف بدھ مت کے مہایان فرقے کی سیاسی ناکامی ہے، دوسری طرف مسیحی کلیسا پر نظر ڈالیے۔ اُس نے مغربی یورپ میں تمام سیاسی مواقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسیحیت کے مقابلے میں مہایان، سیاسی لحاظ سے بہت کم زور مذہب تھا۔ بلاشبہ شمالی چین کی مستقل بادشاہتوں کے فرماں روا تین سو سال کے لگ بھگ مہایان کے سرپرست بنے رہے یعنی متحدہ سن سلطنت کی بربادی کے بعد، لیکن اس سے مہایان اُسی طرح کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا جس طرح وہ اس سے پیشتر کوشانی شہنشاہ کنشک کی زیادہ طاقت ور سرپرستی سے فائدہ نہ اُٹھا سکا تھا۔ مشرق بعید میں مہایان اور کنفوشیت کے درمیان کش مکش کا سلسلہ سیاسی دائرے سے نکل کر روحانی دائرے میں پہنچا تو اس جنگ میں جو خوں ریزی سے تقریباً بالکل پاک تھی، دونوں فریقوں کا پانسا بالکل پلٹ گیا تھا۔ موجودہ دور کے ایک چینی صاحب قلم نے اس موضوع پر لکھتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ کنفوشیس ازم نے جو نئی شکل اختیار کی تھی اُس میں وہ تاؤازم اور بودھ مت کے بنیادی خیالات کا زیادہ پابند ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود تاؤازم اور بودھ مت بھی اُس کی ویسی پابندی نہ کرتے تھے[1]۔

جب ہم مشرق بعید کی تاریخ میں چینی فلسفہ' کنفوشیس کے احیاء سے مغربی مسیحی دنیا کے اندر یونانی فلسفہ ارسطو کے احیاء پر آتے ہیں تو یہاں صورت حال مختلف شکل اختیار کر لیتی ہے، کنفوشیس ازم اپنی نئی تعبیر میں روحانی اعتبار سے مہایان کے روبرو سر بہ خم ہو گیا۔ اس کے برعکس ارسطو کی نئی مسیحی تعبیر کلیسا کی دینیات پر حاوی ہوگئی، حالاں کہ اس کا نظریہ یہی ہو سکتا تھا کہ ارسطو لامذہب تھا۔ دونوں صورتوں میں بر سراقتدار گروہ نے اس لیے شکست کھائی کہ مخالف کے پاس اپنی ذاتی قدر و قیمت کے سوا اور کوئی سفارش نہ تھی۔ مشرق بعید میں ایک فلسفیانہ سول سروس اجنبی روح کے آگے جھک گئی اور مغرب میں ایک قائم شدہ نظام مذہبی اجنبی فلسفے کی روح کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو گیا۔

مغربی مسیحیت میں ارسطو کی روح نے حیرت انگیز دماغی قوت کا ویسا

۱۔ فنگ یولان (Fung Yu-Lan) کی کتاب ''چینی فلسفے کی مختصر تاریخ''، صفحہ ۳۱۸۔

ہی مظاہرہ کیا جیسا زندہ مہایان نے مشرق بعید کی دنیا میں کیا تھا :

"مغربی یورپ نے علمی اکتشافات کے لیے جو بے چین روح اور نقاد عقل پائی تو یہ چیزیں اسے رومی روایات سے نہ ملی تھیں۔ یہ علمی اکتشافات ہی تھے جنھوں نے مغربی تہذیب کو یونانیوں کی جانشیں اور میراث خود بنایا۔ عام طریقہ یہ ہے کہ اس نئے عنصر کی آمد کو اطالوی احیاء اور پندرھویں صدی کے آغاز میں یونانی کتابوں کے مطالعے سے وابستہ کیا جاتا ہے، لیکن اصل انقلابی دور کا آغاز تین صدیوں پہلے رکھنا چاہیے۔ ابیلارڈ (۱۰۷۹ء — ۱۱۴۲ء) نیز سالس بری کے جان (۱۱۱۵ء—۱۱۸۰ء) جدلیات اور فلسفیانہ فکر آرائیوں کی روح کا ظہور پیرس میں ہو چکا تھا اور ان چیزوں نے مغربی مسیحیت کی ذہنی فضا کو بدلنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے علوم عالیہ کے سلسلے میں منطقی مباحث کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی، یہاں تک کے عام مناظرے قرون وسطیٰ کے مغربی فلسفے کا خاصا جزو بن گئے تھے۔ ساربون کا رابرٹ کہتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق اس وقت تک پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اسے بحث مباحثے کے دانتوں سے خوب چبایا نہ جائے اور تمام مسائل کو خواہ وہ بالکل بدیہی ہوں یا حد درجہ دقیق اور عسیر الفہم ان پر چبانے کا عمل ضرور جاری ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر ذہن میں مستعدی اور فکر میں استواری نہیں آتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جرح و نقد اور منظم شک کی وہ روح نشو و نما نہیں پاتی جس سے مغربی ثقافت اور موجودہ زمانے کی سائنس نے اس قدر فائدہ اٹھایا[1]۔"

ارسطو کی روح نے مغربیوں کی فکر کی صورت و معنویت پر یکساں اثر ڈالا لیکن تھوڑا سا اثر اس کے مواد پر بھی پڑا، اگرچہ یہ اثر پائدار نہ تھا البتہ اتنا گہرا ضرور تھا کہ اسے انجام کار محو کرنے کے لیے ذہنی جد و جہد کی ایک

۱- Dawson کی کتاب "مذہب اور ظہور ثقافت مذہبی" ۲۳۰-۲۲۹۔

طویل اور کٹھن مہم جاری کرنی پڑی :

''قرون وسطیٰ کی مغربی نگاہوں کے سامنے کائنات کی جو پوری تصویر تھی اُس میں مسیحیت کے بجائے ارسطو کو دخل زیادہ تھا ۔ ارسطو اور اُس کے جانشینوں ھی کی سند اُن تعلیمات کے لیے بھی ذمہ دار تھی جس میں ھمیں تھوڑا بہت کلیسائی رنگ نظر آتا ھے —— یعنی آسمانوں کے طبقے ، گھومنے والے دائرے، ستاروں کو حرکت میں لانے والی عقل کل ، شرافت کے درجات کے مطابق عناصر کی ترتیب ، اجرام سماوی کے متعلق یہ رائے کہ وہ پانچویں جوھر سے بنے ھیں ، جن میں خرابی کا کوئی عنصر نہیں ۔ ھم کہہ سکتے ھیں کہ سولھویں صدی میں جس شخصیت کو اُٹھا پھینکنے کی کوشش ھو رھی تھی وہ بطلیموس[1] نہ تھا ، ارسطو تھا اور کوپرنیکس[2] کے نظریے کی سب سے بڑی مخالفت کا سامان بھی ارسطو ھی نے بہم پہنچایا تھا[3] ۔''

سترھویں صدی عیسوی میں جب مغرب کی اپنی طبعی ذکاوت نے بیکن کے مقرر کیے ھوے خطوط پر دنیاے فطرت کی چھان بین شروع کی تو کلیسا کی دینیات ارسطو کے فلسفے سے اس درجہ مختلف ھو چکی تھیں کہ برونو[4] کو اپنی زندگی قربان کرنی پڑی ۔ گلیلیو اپنے علمی الحادات کے لیے کلیسا کے عتاب کا ھدف بنا ، حالاں کہ ان چیزوں کو اُس مسیحی مذھب سے قطعاً کوئی علاقہ نہ تھا ، جو عہدنامۂ جدید میں پیش ھوا ھے ۔

۱- Ptolemy مصر کا مشہور ھیئت دان جس کی تمام تصانیف تیرہ جلدوں میں مرتب ھوئیں ۔

۲- Copernicus مشہور پولستانی ھیئت دان ، جس نے اپنا نظام کائنات تیار کیا ، اس میں زمین ، سورج اور ستاروں کا تعلق دکھایا ۔

۳- بٹرفیلڈ (Butterfield) کی کتاب ''موجودہ دور کی سائنس کی اصل'' (۱۳۰۰ء–۱۸۰۰ء) صفحات ۲۲ - ۲۱ -

۴- Bruno سولھویں صدی کا مشہور اطالوی فلسفی جسے پادریوں نے جلائے جانے کی سزا دی ۔

سترھویں صدی سے پیشتر الپس پار کے مغربی سائنس دان اور فلسفی مسیحیت کے کلامیوں کو یہ طعنے دیتے تھے کہ وہ ارسطو کے غلام بن گئے ھیں۔ بیکن ارسطو کو کلامیوں کا ڈکٹیٹر قرار دیتا تھا۔ پندرھویں صدی میں کلاسیکی تحریک کے حامی اطالوی، اُن پر یہ الزام لگا رھے تھے کہ انھوں نے لاطینی زبان کا پورا علم حاصل نہیں کیا، لیکن ارسطو کی دینیات کلاسیکی طرز تحریر کے ناقدوں کی طعنہ آرائیوں کا مقابلہ کرتی رھی۔ ارسطو کے فلسفے کا ایک بڑا عالم ڈنس سکوٹس[1] تھا، نقادوں نے اُس کا نام بگاڑ کر "ڈنس[2]" لفظ پیدا کر لیا۔ اس کا مفہوم یہ نہ تھا کہ اصل شخص ناواقف یا جاھل ھے۔ حقیقی معنی یہ تھے کہ وہ علم کے ایک ایسے نظام سے عقیدت کا اظہار کر رھا ھے جو منسوخ ھو چکا ھے، لیکن اس کتاب کی تحریر کے وقت تک کلاسیکی علوم کے دعوے داروں کی باری بھی آ گئی۔ بیسویں صدی مسیحی میں طبعی علوم و فنون کا سیل ھر چیز اپنے ساتھ بہائے لیے جاتا معلوم ھوتا تھا اور اس موقع پر "ڈنسوں" کی تلاش کرنی ھو تو اُن کے باقیات کلاسیکی دائرے ھی میں ملیں گے۔

۵۔ السنہ و ادبیات کا احیاء

زندہ زبان در اصل بول چال کی ایک شکل ھوتی ھے جیسا کہ خود لفظ سے واضح ھے۔ لفظ کا انگریزی مرادف "ورڈ" اُس لاطینی لفظ سے نکلا ھے، جس کے معنی زبان کے ھیں۔ ادب اس کی ایک ذیلی پیداوار ھے۔ لیکن جب کسی زبان یا ادب کی روح کو موت کے بعد ازسرنو اُٹھانے کی کوشش کی جائے تو دونوں کے درمیان تعلق معکوس شکل اختیار لیتا ھے۔ زبان کے سیکھنے میں اس لیے مشقتیں اُٹھائی جاتی ھیں کہ ادب کا مطالعہ کیا جا سکے۔ جب ھم یہ سیکھتے ھیں کہ میز کو لاطینی زبان میں "میسا[3]" کہتے ھیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ھمارے علم الفاظ میں کوئی ایسا نیا اضافہ ھوا،

۱- Duns scotus -

۲- Dunce جس کے معنی کند ذھن اور بے وقوف کے ھیں لیکن صحیح معنی مصنف نے متن میں بیان کر دیے۔

۳- Mesa -

جس سے ہمارے احساسات کا بہتر اظہار ہو سکے گا۔ یہ سب کچھ ہم اس لیے سیکھتے ہیں کہ ورجل، ہوریس اور دوسرے مشہور لاطینی مصنفین کی کتابیں پڑھ سکیں۔ ہم زبان بولنے کی کوشش نہیں کرتے اور جب لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو مشاہیر قلم دور قدیم میں گزر چکے ہیں، اُن کی تصانیف کو بہتر طریقے پر سمجھ سکیں۔

جو ادبی سلطنت مدت سے لاوارث چلی آتی ہے اسے از سر نو قبضے میں لینے کے لیے پہلا قدم بھی اٹھایا جائے تو اس کے لیے ایک زندہ سیاسی سلطنت کے تمام وسائل سے کام لینا لازم ہوگا۔ ادبی احیاء کا ایک عام نمونہ ابتدائی دور میں یہ ہوتا ہے کہ علماء کی کوئی جماعت کسی حکم ران کی سرپرستی میں اشعار کے جو گل دستے، تحریرات کے مجموعے یا قاموس، فرہنگ اور انسائیکلوپیڈیا مرتب کرتی ہے۔ اس قسم کی تصانیف کے لیے جو حکم ران سرپرستی قبول کرتے ہیں وہ بہ ذات خود کسی ایسی ہمہ گیر سلطنت کے فرماں روا ہوتے ہیں جو سیاسی سطح پر کسی گزری ہوئی سلطنت کی نمایندگی کرتی ہے، اس قسم کے پانچ نمایندہ حکم رانوں —— اشور بنی بال[1]، کانسٹنٹائن[2]، پور فیرو جینی ٹس[3]، ینگ لو[4]، کیانگ ھسی[5]، چئن لنگ[6] —— میں سے چار آخرالذکر اس شمار میں آتے ہیں، مردہ کلاسیکی ادب کی بچی کھچی کتابوں کو فراہم کرنا، ایڈٹ کرنا، اُن پر حواشی لکھنا اور انھیں شائع کرنا، ان کاموں میں احیاء پائی ہوئی چینی ہمہ گیر سلطنت کے شاہنشاہان مشرق بعید اپنے ہم سروں سے بہت آگے نکل گئے۔

یہ بالکل درست ہے کہ اشور بنی پال نے سمیری اور اکادی کلاسیکی ادب کے جو دو کتب خانے مٹی کی تختیوں پر تیار کیے تھے، وہ موجودہ زمانے کے ماہران آثار قدیمہ کے علم میں نہ آئے تھے۔ اُنھیں صرف یہ معلوم ہو سکا تھا کہ اشوریوں نے دو بڑے مجموعے فراہم کیے تھے پھر وہ بکھر گئے۔ نینوی میں کھدائی کرتے وقت ان میں سے صرف چند تختیاں مل سکیں۔ اشور بنی پال

۱- Asshurbanipal -
۲- Constantine -
۳- Porphygroenitus -
۴- Yung Lo -
۵- Kang Hsi -
۶- Chien Lung -

کی وفات سے صرف سولہ سال بعد اس کے دونوں کتب خانے اُس مکروہ شہر کے کھنڈروں میں منتشر ہو چکے تھے جس پر ۶۱۲ ق - م میں حملہ ہوا اور اسے برباد کر دیا گیا - کنفوشیس کے قانون کا جو مجموعہ چینی کلاسیکی میں شامل ہے ، اشور بنی پال کا مجموعہ یقیناً اُس سے زیادہ بڑا ہوگا - کنفوشیس کا قانون مٹی کی تختیوں پر مکتوب نہ تھا بلکہ اسے بڑے اہتمام سے پتھر پر کندہ کیا گیا تھا - یہ کام ''سی گان۱'' کے مقام پر انجام پایا تھا جو ۸۳۴ء—۱۳۸۱ء میں تنگ خاندان کا دارالحکومت تھا - ایک صدی بعد اُسے شرح کے ساتھ چھاپ دیا گیا اور پورا مجموعہ ایک سو تیس جلدوں میں آیا - ہم پورے وثوق سے قیاس کر سکتے ہیں کہ اشور بنی پال نے یکانی رسم الخط میں جو مجموعہ تیار کیا تھا وہ اُس چینی مجموعے سے کم تھا جسے فراہم کرنے کا ذمہ‌دار منگ خاندان کا دوسرا شہنشاہ ینگ لو تھا - اس نے یہ کام ۱۴۰۳ء — ۱۴۰۷ء کے درمیان انجام دیا - یہ کل ۲۲۸۷۷ کتابیں تھیں ، جو ۱۱۹۵ جلدوں میں آئیں مندرجات کی فہرستیں ان کے علاوہ تھیں - اس کے مقابلے میں مشرق رومی سلطنت کے شہنشاہ کانسٹنٹائن پرفیرو جینی ٹن (۹۵۹ء —۹۱۲ء) نے یونانی علوم کا جو ذخیرہ فراہم کیا وہ بالکل بے حقیقت معلوم ہوتا ہے ، اگرچہ مغربی علوم کے لیے وہ بھی حیرت انگیز ہے -

جب ہم ان ابتدائی کاموں سے ہٹ کر اُن اہل علم کے کاموں پر نظر ڈالتے ہیں ، جن کی زندگیاں کلاسیکی ادب کی پیروی میں کتابیں لکھتے لکھتے گزر گئیں تو ہمیں حساب کتاب کا معاملہ حساب کتاب کرنے والوں پر چھوڑ دینا چاہیے - مثلاً کون کہہ سکتا ہے کہ ۶۲۲ء سے ۱۹۰۵ء تک ایک ہزار دو سو تراسی سال میں چین کی امپریل سول سروس کے امیدواروں نے اپنے امتحانوں میں کلاسیکی چینی ادب کے کتنے مضمون لکھے ؟ آیا وہ جواب مضمون تعداد میں لاطینی اور یونانی نظم و نثر کی اُن کتابوں اور مشقوں سے زیادہ تھے یا کم جو مغربی دنیا کے اہل علم اور طلبہ نے پندرھویں صدی عیسوی سے موجودہ کتاب کی ترتیب تک تیار کیں - لیکن احیاء شدہ کلاسیکی زبانوں کو سنجیدہ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں مغرب یا مشرق بعید کی کوئی شخصیت بیزنطینی مورخوں کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی جن

۱- Si Ngan -

میں دسویں صدی کا لیو ڈیاکونس[1] اور بارھویں صدی کی اینا کومنینا شامل ھیں ۔ انھوں نے اپنے ادبی مقاصد کے لیے جو زبان استعمال کی ، وہ یونان کے علاقے ایٹیکا کی زبان تھی ۔

خوانندۂ کتاب کو غالباً یہ احساس ھو گیا ھوگا کہ ادبی احیاء کے متعلق اب تک ھم نے جو کچھ لکھا ھے اس کا اطلاق ادبی احیاء پر ھو ھی نہیں سکتا ، یعنی اُس احیاء پر جسے اُس کے قلب میں سب سے نمایاں حیثیت حاصل ھے ۔ یقیناً یونانی ادب کا جو احیاء قرون وسطیٰ کے آخری دور میں اٹلی میں ھوا ۔ اگرچہ سیاسی اکابر اُس کے سرپرست بن گئے تھے جیسے لورنز و ڈی میڈی چی[2] ، لیکن وہ بنیادی نقطۂ نگاہ سے غیر منظم طلب علم کی ایک ایسی تحریک تھی ، جو خود بہ خود اُٹھی ۔ ممکن ھے یہ درست ھو ، لیکن پندرھویں صدی میں پاپاؤں نے خصوصاً پوپ نکولس پنجم (۱۴۴۷ء — ۱۴۵۵ء) نے اس کی سرپرستی کے لیے جو کچھ کیا ، اُسے کم وقیع قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اس پوپ نے تمام قدیم مخطوطات کو پڑھنے اور نقل کرنے کے لیے سیکڑوں آدمی ملازم رکھے اور اُس نے ھومر کا ترجمہ لاطینی نظم میں کرنے کے لیے دس ھزار گلڈن دیے ۔ غرض نو ھزار جلدوں کا ایک کتب خانہ فراھم کر لیا ۔ تا ھم اگر ھم اپنے فکر و خیال کو مغربی تاریخ کے ابتدائی دور کی طرف لے جائیں اور احیاء کے عہد سے کئی صدیاں پیچھے نکل جائیں تو ھمیں ایسی چیز مل جائے گی جس کی مثالیں اس وقت تک زیر غور رھیں ۔ ھمیں معلوم ھوگا کہ شارلمین نے جو ایک مردہ تہذیب کی ھمہ گیر سلطنت کو زندہ کرنے والا تھا ، عارضی طور پر اشور بنی پال ، ینگ لو کانسٹنٹائن پورفیرو جینی ٹس کی صف میں شامل رھا ۔

مغربی مسیحیت میں یونانیت کے ادبی احیاء کی پہلی ناکام کوشش اُسی زمانے میں ھوئی جب مغربی مسیحی تہذیب کی ولادت ھوئی تھی ۔ انگریزی کلیسا نے ساتویں صدی عیسوی کے اختتام پر اپنے لیے جو نظام تجویز کیا وہ مشرق آرتھوڈکس مسیحیت کے علاقے کے ایک یونانی پناہ گیر کا بنایا ھوا تھا ، جسے اسلام نے فتح کر لیا تھا ، یعنی طرسوس کا آرچ بشپ تھیوڈور اور جس شخص

۱- Leo Diaconus

۲- Lorenzo dei Medici -

نے مغرب میں یونانیت کا احیاء کیا وہ نارتھمبریا کا باشندہ بزرگ بیڈ[1] (۶۷۳ء-۷۳۵ء) تھا، نارتھمبریا کے ایک اور باشندے السوئن[2] (۷۳۵ء-۸۰۴ء) نے یہ بیج شارلمین کے دربار میں پہنچایا، لیکن بہت جلد سکنڈے نیویا کے بربریوں کی یورش ہوئی اور یہ تحریک ابتدائی دور ہی میں ختم کر دی گئی لیکن اس واقعے سے پیشتر اس کے حامیوں نے نہ محض یونان کی ادبی ثقافت کو اس کی لاطینی شکل میں زندہ کر لیا تھا، بلکہ براہ راست یونانی زبان میں بھی شد بد حاصل کر لی تھی، السوئن نے یہ خواب دیکھا تھا کہ شارلمین کی سرپرستی کے بل پر وہ فرینکوں کی سر زمین میں ایتھنز کی روح دوبارہ زندہ کرنے میں کام یاب ہو جائے گا، لیکن یہ خواب تیزی سے پریشان ہوگیا اور جب مغربی مسیحیت نے اس دور سے نکلنا شروع کیا جسے نویں صدی کی تاریکی کا دور کہا جاتا ہے تو جس روح کا ظہور ہوا، وہ یونان کا کلاسیکی ادب نہ تھا بلکہ ارسطو اور اس کا فلسفہ تھا۔ علم الکلام کے شغف میں صدیاں گزرنے والی تھیں، اس کے بعد السوئن کے خواب کی تعبیر پوری ہو سکتی تھی۔

اگر ہم یہاں توقف کر کے اس امر پر غور کریں کہ السوئن اور اس کے دوستوں نے جو امیدیں قائم کی تھیں وہ کیوں اتنی صدیوں تک بر نہ آ سکیں تو ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ تہذیبوں اور معاشروں کے درمیان مکانی مقابلوں (جن پر اس کتاب کے سابقہ حصے میں بحث ہو چکی ہے) اور زمانی مقابلوں میں جو اب زیرغور ہیں، فرق ہے۔ مکانی مقابلے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دو تہذیبوں کے درمیان مکانی تصادم ہو اور یہ عموماً ایک حادثے کی حیثیت رکھتا ہے۔ فوجی قوت یا ملاحی میں لئے کمالات یا کسی علاقے کی خشک سالی، اُن اسباب میں سے ہیں جو ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے پر جا گراتے ہیں۔ ثقافتی نقطۂ نگاہ سے انھیں بے تعلق قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ان کے ثقافتی نتائج پر ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اس کے برعکس زمانی مقابلہ یعنی احیاء بھان متی کا فعل ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کسی

۱۔ بیڈ (Bede) انگلستان کی مشہور مذہبی شخصیت، جس نے عہد نامۂ جدید اور عہد نامۂ قدیم کی شرح لکھی اور سب سے زیادہ شہرت اس کی کتاب ''انگریزی قوم کی مذہبی تاریخ'' نے پائی۔

۲۔ Alcuin اس کے مختصر حالات مصنف نے متن میں بیان کر دیے ہیں۔

گزری ہوئی چیز کی روح کو از سر نو واپس لاتا ہے اور وہ جب تک اس عمل کے ہتھکنڈے سیکھ نہ لے ، یہ کام انجام نہیں دے سکتا ۔ بہ الفاظ دیگر مغربی مسیحیت اُس وقت تک یونانی روح یا یونانی مہمان کے استقبال پر آمادہ نہ ہوسکی ، جب تک اُس کا اپنا گھر استقبال کے لیے پوری طرح آراستہ نہ ہوگیا ۔ یونانی کتب خانے مادی اعتبار سے بہ دستور موجود تھے ، لیکن ان کے دروازے اُس وقت تک نہ کھلے جب تک مغربی یورپ کے لوگ اُن کے مطالب سے استفادے کے لیے پوری صلاحیت پیدا نہ کر سکے ۔

مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی یورپ کے قرون مظلمہ میں کوئی تاریک سے تاریک دور بھی ایسا نہیں آیا جب مغربی مسیحیوں کے سامنے ورجل کی کتابیں موجود نہ تھیں یا انہیں لاطینی زبان کا ایسا علم نہ تھا جو ورجل کے مطالب سمجھنے کے لیے ضروری تھا ، لیکن ساتویں صدی سے چودھویں کے آخر تک کم از کم آٹھ سو سال گزر گئے جن میں ورجل[1] کی شاعری اعلیٰ درجے کے مغربی فضلاء کے لیے بھی قابل فہم نہ تھی ، یعنی اُن معنوں میں قابل فہم جو ورجل کا مقصود تھے یا جس طرح ورجل کے معاصرین نے انہیں سمجھا اور یہ صورت حال سینٹ آگسٹائن کے عہد تک قائم رہی ۔ دانتے[2] نے بھی جس کی روح پر یونانیت کے اطالوی احیاء کی روشنی پڑنے لگی تھی ، ورجل کو ایسے انداز میں دیکھا ، جیسے غالباً خود ورجل بھی اپنی صحیح تصویر نہ سمجھتا بلکہ آرفیس کی طرح ایک خیالی یا افسانوی وجود قرار دیتا ۔

اسی طرح کبھی ایسا وقت نہیں آیا جب مغربی معاشرے کے پاس ارسطو کی فلسفیانہ تصانیف موجود نہ تھیں اور آخری دور کے مشہور یونانی فاضل بوئی تھیس[3] (۴۸۰ء—۵۲۴ء) ۔ انہیں نہایت اچھے انداز میں لاطینی کا لباس پہنا دیا تھا ، لیکن بوئی تھیس کی موت کے بعد چھ صدیاں گزر گئیں اور مغربی دنیا کے بلند پایہ مسیحی مفکر اس ترجمے کو بھی سمجھنے کے اہل نہ ہوئے ۔

---

۱ - لاطینی زبان کا مشہور شاعر (۷۰ ق - م—۱۹ ق-م) اینیڈ اور جارجکس اُس کی مشہور نظمیں ہیں ۔

۲ - Dante (۱۲۶۵ء — ۱۳۲۱ء) ڈیوائن کمیڈی طربیۂ آسانی کا مشہور مصنف ۔

۳ - Boethius ۔

جب اُن میں ارسطو کی پزیرائی کے لیے فضا سازگار ہوگئی تو اُنھوں نے چکر کاٹ کر عربی تراجم کے ذریعے سے اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا ۔ چھٹی صدی مسیحی کی مغربی دنیا کے لیے ارسطو کے لاطینی ترجمے کی حیثیت وہی تھی جیسے بوئی تھیئس اپنی کم فہمی کے باعث بھتیجے کو تیرھویں یوم ولادت پر ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کی نظمیں بہ طور تحفہ پیش کرتا اور بھتیجا ان نظموں پر سرسری نظریں ڈال کر اپنے چھوٹے سے کتب خانے کے تاریک گوشے میں رکھ دیتا ۔ پھر وہ آکسفورڈ کے کسی کالج میں پڑھنے کے لیے آتا ، اسے یہ نسخہ میسرز بی ۔ ایچ ۔ بلیک ول کے ہاں سے مل جاتا اور اُسے خرید لیتا ۔ پھر تعطیلات میں گھر آتا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ یہ کتاب تو پہلے سے موجود تھی ۔

جو کچھ ورجل اور ارسطو کے ساتھ پیش آیا ، وہی یونانی ادب کے ان شاہ کاروں کے لیے بھی مقدر تھا جو بیزنطینی کتب خانوں میں فراہم تھے اور جو یونانیت کے اطالوی احیاء کے بعد ادب کی حیثیت میں خاص مقامی خوراک بننے والے تھے ۔ مغربی مسیحیت کو بیزنطینی دنیا کے ساتھ گہرا تعلق پیدا ہوچکا تھا ۔ تیرھویں صدی کے نصف اول میں فرینک فاتحین قسطنطنیہ اور یونان کو مسخر کر چکے ۔ ثقافتی لحاظ سے اس کا نتیجہ اُس وقت کچھ نہ نکلا ۔ اس لیے کہ مغربی یورپ میں کلاسیکی ادب کو اُس اعلیٰ درجے کی چیز کی حیثیت حاصل تھی جسے عوام پسند نہ کریں ۔ اس کی توضیح میں کہا جا سکتا ہے کہ مغربیوں نے حریفانہ حیثیت میں تعلق پیدا کیا تھا اور اس وجہ سے اُن کی نگاہوں میں بیزنطینی کتب خانوں کا یونانی ادب اچھی رائے کا مرجع نہ بن سکتا تھا ، لیکن ہم اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ جب پندرھویں صدی میں احیاء کا پھول پوری طرح کھل چکا تھا تو اُس وقت جو سیاسی اور مذہبی تعلقات پیدا ہوئے وہ کم حریفانہ نہ تھے ۔ ثقافتی نتائج کے اختلاف کا سبب بالکل واضح ہے ۔ کسی مردہ ثقافت کا احیاء اسی وقت ہو سکتا ہے جب متعلقہ معاشرہ اس ثقافتی سطح پر پہنچ جائے جس پر پیش رو معاشرہ اس وقت کھڑا تھا اور وہ کارنامے انجام دے رہا تھا جو اب نئے سرے سے زندگی کے امیدوار بن گئے ۔

جب ہم مغربی مسیحی دنیا اور چین میں ادبی احیاء کی تحریکوں کے مرجانے پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحریکیں اس وقت تک

کوس انا ولا غیری بجاتی رهیں ، جب تک دور جدید کی مغربی تہذیب کی شکل میں ایک هنرمند اجنبی دخیل کار نے آنهیں باهر نه نکال پھینکا ۔ اس تہذیب نے مغربی مسیحیت کو سترهویں صدی میں اور چین کی روح کو انیسویں صدی میں مسحور کر لیا تھا ۔ مغربی معاشرے کو یونانیت کی روح سے قوت آزمائی کرنی پڑی اور باهر سے کوئی مداخلت نه هوئی ۔ البته سترهویں اور اٹھارهویں صدی کے موڑ پر پمفلٹ بازی کا سلسله شروع هوا ، جسے سوفٹ نے "کار زار کتب" کا لقب دیا ۔ اس جنگ میں جو فریق تھے ، ان کے درمیان یه بحث جاری تھی که قدیم زمانے کے علماء اور جدید دور کے فضلاء کے متناسب محسن کیا هیں ۔ اس سے هوا کے رخ کا صاف پتا چلتا تھا ، اصل مسئله یه تھا که آیا مغربی ثقافت کو پاؤں جما کر ٹھہرے رهنا چاهیے اور قدماء کی نقالی یا ان کے احترام کی وجه سے اپنے آپ کو فالج زده بنا لینا چاهیے یا قدماء کو پیچھے چھوڑتے هوئے غیر معلوم کی جانب قدم آگے بڑھانا چاهیے ؟ اس صورت میں سوال کا معقول جواب ایک هی هو سکتا تھا ، لیکن اس سوال کا مطلب یه هے که هم نے ایک سابقه دعوے کو به منزلۂ ثبوت قرار دے لیا یعنی آیا قدماء کی نقالی یا ان کا احترام — جسے هم زیاده سے زیاده وسیع معنی میں دور جدید کی کلاسیکی تعلیم قرار دے سکتے هیں — واقعی همارے نشو و ارتقا کو روکنے کا باعث بنی ؟

اس سوال کا جواب قدماء کے لیے نظر به ظاهر سازگار تھا اور یه عمل قابل توجه هے که جن لوگوں نے یونانی ادبیات کے مطالعے میں علم‌داری کا منصب اختیار کیا یعنی پٹرارچ[1] اور بوکشیو[2] وه ملکی اطالوی ادب کے نشو و ارتقا میں بھی مشعلچیوں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ یونانی ادبیات کے احیاء نے ملکی ادبیات کے طریقے کو روکا نه تھا بلکه اس میں نئی حرکت پیدا کر دی تھی ۔ ایرس مس[3] نے سسرو کے عہد کی لاطینی زبان میں درجۂ کمال حاصل کر لیا ، لیکن اس وجه سے اس کے مغربی هم‌سروں کے دل میں یه خیال پیدا نه هوا که اپنی مادری زبانوں کی ادبی تربیت سے دست بردار هو جائیں ۔ اگر هم سولهویں صدی میں یونانی کتب کے مطالعے کا ذوق و شوق پیش نظر رکھیں ، پھر یه

---

۱ - Petrarch اطالوی شاعر (۱۳۰۱ء — ۱۳۷۴ء) ۔
۲ - Boccaccio اطالوی ادیب (۱۳۱۳ء — ۱۳۷۵ء) ۔
۳ - Erasmus مشهور ولندیزی فاضل (۱۴۶۶ء — ۱۵۳۶ء) ۔

دیکھیں کہ اس صدی کے آخری دور میں انگریزی شاعری نے کیسی بے مثال درخشانی حاصل کرلی تھی تو اس صدی میں یقیناً ہمارے لیے علت و معلول کے درمیان ثقافتی کڑیوں کا صحیح جائزہ لینا ممکن نہ ہوگا۔ شیکسپیئر کو لاطینی زبان سے بہت کم واقفیت تھی، یونانی اس سے بھی کم جانتا تھا، لیکن کیا یونانی اور لاطینی کا اتنا علم ڈرامہ نگاری میں اُس کے لیے معاون ثابت ہؤا؟ ایسا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ معلوم ہے کہ ملٹن لاطینی اور یونانی زبانوں کا اجل فاضل تھا لیکن اگر وہ ان میں سے کوئی زبان بھی نہ جانتا تو یقیناً ہمیں ”پراڈائز لاسٹ“ (فردوس گم شدہ) اور سیمسن اگونیسٹس[1] جیسی نظمیں کبھی نہ مل سکتیں۔

۶۔ مرئی فنون کا احیاء

مردہ تہذیبوں کے کسی ایک فن کو جانشین تہذیب کی تاریخ میں زندہ کرنا ایک عام چیز ہے۔ مثال میں ہم مصری تاریخ کا ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی قدیم بادشاہی کے زمانے میں بت تراشی اور مصوری کے جو نمونے عام تھے، اُنھیں دو ہزار سال کے بعد ساتویں اور چھٹی قبل مسیح میں مصری دنیا کے اندر از سر نو زندہ کر لیا گیا۔ اسی طرح بابلی دنیا کے اندر نویں آٹھویں اور ساتویں صدی قبل مسیح میں عمارتوں پر بیل بوٹے کندہ کرنے کا سمیری طریقہ از سر نو جاری کر لیا گیا۔ یہی صورت حال چھوٹے پیمانے پر یونانی طرز کے متعلق پیش آئی۔ اس طرز کے بہترین نمونے پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں ایٹیکا نے پیش کیے ان کا احیاء بیزنطین کے اندر ہاتھی دانت کی تختیوں پر دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی مسیحی میں ہوا۔ مرئی فنون کے زندہ کرنے کے یہ تین نمونے اس وقت پسماندہ معلوم ہوتے ہیں جب ہم مغربی دنیا میں یونان کے مرئی فنون کا احیاء سامنے لاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اس سے پیشتر جو چیزیں رائج تھیں وہ کس بے دردی سے خارج کی گئیں۔ اس احیاء کی ابتدا قرون وسطیٰ کے آخری دور میں اٹلی سے ہوئی۔ پھر یہ پوری مغربی دنیا میں پھیل گیا۔ یونان کے مرئی فنون کی روح کو زندہ کرنے کا عمل تین دائروں

۱۔ Samson Agonistes، ملٹن کی یہ مشہور نظم شاعر کی وفات سے صرف تین ماہ پیشتر مکمل ہوئی۔

میں جاری ہوا - یعنی تعمیرات ، بت تراشی اور مصوری اور تینوں میں نئی طرز اس تیزی سے پھیلی کہ جب اس کا زور کم ہوا تو جمالی نقطۂ نگاہ سے ایک طرح کا خلا پیدا ہوگیا - اس خلا میں مغربی فن کاروں کو سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ اپنی اس طبعی ذکاوت کا اظہار کس صورت میں کریں جو مدت سے دبی چلی آتی تھی -

مغربی مرئی فنون کے ان تین دائروں میں یکساں طور پر یہی صورت پیش آئی - کہ قدیم روح کا احیاء ہوا - اس نے بے دردی سے گھر کے تمام سابقہ سامان باہر نکال پھینکے - اس سلسلے کی سب سے زیادہ تعجب انگیز کہانی یہ ہے کہ یونانیت نے بت تراشی کے دائرے میں مغرب کی مقامی ذکاوت کو مسخر کر لیا - اس دائرے میں تیرھویں صدی کے شمالی فرانس کے فن کاروں نے اپنی خاص مغربی طرز کے ایسے شاہ کار پیش کیے تھے ، جو یونانی ، مصری اور مہایان بدھ مت کی بہترین فن کاریوں کا مقابلہ کر سکتے تھے ، لیکن مصوری کے دائرے میں مغربی فن کار اپنے ہم سر آرتھوڈکس مسیحی معاشرے کے زیادہ ترقی پزیر فن اور تعمیرات کے دائرے میں رومی طرز کی غلامی سے نجات نہ پا سکے تھے - رومی طرز در اصل پیش رو یونانی تہذیب کے آخری دور ہی کی میراث تھی ، جس میں تھوڑی سی ترمیم کر لی گئی - پھر اس طرز پر گاتھوں کی طرز کا غلبہ ہو گیا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ گاتھوں کی طرز عباسی اور اندلسی خلافتوں کے عہد کی سریائی دنیا میں پیدا ہوئی تھی -

جو لوگ بیسویں صدی کے لندن میں رہتے ہیں ان کی رہ نمائی کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مغربی دنیا کے مقامی مرئی فنون دو مرتبہ شکست کھا چکے - ان فنون اور سریائی و یونانی حملہ آوروں کے درمیان موت و حیات کی جو کش مکش جاری ہوئی تھی، اس کے فریق اب تک پتھروں کی شکل میں تبدیل ہو کر سامنے کھڑے ہیں اور انھیں اس کلیسا کی تعمیر اور بت تراشی میں دیکھا جا سکتا ہے جو شاہ ہنری ہفتم کے زیر سر پرستی ویسٹ منسٹر ایبی کے ساتھ بنوایا گیا اس کی محراب دار چھت، اس گاتھی طرز کی ایک شان دار فتح تھی جو آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی - اس پر پتھر کے بتوں کی ایک وسیع قطار سیدھی کھڑی ہے ، اس کی نگاہیں اطالوی اور یونانی تثلیث کے ان برنجی مجسموں پر جمی ہوئی ہیں جو نیچے کے مقبروں پر لیٹے ہوئے ہیں اور ملکی مغربی مسیحیت کا جو دلبستان فن الپس کے پار سے آیا تھا اس کے بتوں

کے منجمد لبوں پر راج ہنس کا آخری نغمہ خاموشی سے جاری ہے ، اس سٹیج کے مرکز پر توری گیانی[1] ۱۴۷۲ء—۱۵۲۲ء کے یونانی شاہ کاروں کا قبضہ ہے۔ اس نے نفرت سے اس پورے ناسازگار ماحول کو نظر انداز کر کے اپنی فن کاری کی نمائش اعلیٰ پیمانے پر کی۔ اب وہ گرد و پیش نظر دوڑا رہا ہے اور اسے موثق امید ہے کہ الپس پار سے جو سیاح آئیں گے اور وہ فلارنس کے ایک جلا وطن فن کار کے کارنامے دیکھیں گے تو ان کی نظریں انہیں کارناموں پر جمی رہ جائیں گی۔ توری گیانی سخت ضدی طبیعت کا آدمی تھا اور اس نے اپنی زبردست فن کاریوں کو وحشی انگریزوں کے درمیان اس غرض سے چھوڑ دیا کہ اپنی عظمت کے لیے خراج تحسین وصول کرتا رہے[2]۔

گاتھوں کی طرز تعمیر سولھویں صدی کے ربع اول تک لندن میں اور سترھویں صدی کے نصف اول تک آکسفورڈ میں رائج رہی ، لیکن اسے شمالی اور وسطی اٹلی کے دائرے سے بہت پہلے نکالا جا چکا تھا۔ اٹلی میں اسے کبھی وہ کامیابی حاصل نہ ہوئی جو الپس پار کے یورپ میں حاصل ہوئی۔ اٹلی کے لاطینی طرز تعمیر کو گاتھوں کی طرز تعمیر کبھی خارج نہ کر سکی۔

تعمیرات کے دائرے میں یونانیت کے احیاء سے مغربی دل و دماغ پر بانجھ پن کی جو حالت طاری ہو چکی تھی ، اس کا ایک اور ثبوت اس وقت ملا جب صنعتی انقلاب معرض وجود میں آ رہا تھا۔ صنعتی ٹکنیک کے ذریعے سے لوہے کے گرڈر تیار کر لیے گئے اور مغربی معماروں کو نئی تعمیرات کا ایک ایسا سامان مل گیا جسے وہ اپنی ضرورت کے مطابق جس طرح چاہتے استعمال کر سکتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یونان کی تعمیری روایات کا زور ختم ہو رہا تھا لیکن جن معماروں کو لوہاروں نے یا آہنگ گروں نے لوہے کے گرڈر دے دیے تھے اور خدا نے از سر نو کام کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا تھا وہ اس کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ جو طرز یونانی احیاء کے دور میں عام ہو چکی تھی اس کے ساتھ گاتھوں کے طرز تعمیر کے احیاء کا پیوند لگا دیں۔

جس مغربی فن کار نے سب سے پہلے لوہے کے گرڈر سے پورا فائدہ اٹھانے

۱- Torri Giani -

۲- سلینی (Cellini) خود نوشتہ سوانح عمری انگریزی ترجمہ کتاب اول باب ۱۲ ، صفحہ ۱۸ -

کی کوشش کی اور عامیانہ سی شے سمجھ کر اس پر گاتھوں کے طرز تعمیر کا پردہ چڑھانا پسند نہ کیا، وہ کوئی پیشہ ور معمار نہ تھا، بلکہ ایک غیر پیشہ ور آدمی تھا۔ البتہ اس کے دل و دماغ روشن تھے۔ اگرچہ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا باشندہ تھا، لیکن اس نے جو تاریخی عمارت بنائی وہ دریائے ہڈسن کے کنارے پر نہ تھی بلکہ آبنائے باسفورس کے کناروں پر تھی، یہ سائرس ہیملن[1] تھا جس نے ۱۸۶۹ء - ۱۸۷۱ء میں رابرٹ کالج کا وہ ہال تعمیر کیا جسے ہیملن ہال کا نام دیا گیا اور جو محمد فاتح کے یورپی حصار پر چھایا ہوا ہے[2]۔ بہ ایں ہمہ ہیملن نے جو بیج بویا تھا وہ شمالی امریکہ اور مغربی یورپ میں آئندہ صدی کے اندر پھول پھل لانے والا تھا۔

مصوری اور بت تراشی کے دائروں میں بھی مغرب کی فنی ذکاوت کا بانجھ پن کم نمایاں نہ تھا، دانتے کے معاصر جی‌اوٹو[3] (وفات ۱۳۳۷ء) کے عہد سے شروع کیا جائے تو پانچ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک ایک عجیب و غریب صورت حال جاری رہی۔ دور جدید کی مغربی دنیا کے دبستان مصوری نے یونان کے مرئی فنون کو بے چون و چرا اپنا طبعی نصب‌العین بنا لیا تھا، حالاں کہ وہ فنون اپنی اصل حیثیت کھو چکے تھے۔ اس کے بعد اس دبستان نے ان تمام مرئی اثرات کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جو روشنی اور سائے سے پیدا ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ فوٹو گرافی کی ایجاد عمل میں آ گئی۔ موجودہ زمانے کی مغربی سائنس نے اپنے کارنامے کے ذریعے سے مغربی مصوروں کے پاؤں کے نیچے سے زمین کاٹ دی۔ اس پر وہ تحریک جاری ہوئی جو رفائل[4] سے پہلے جاری تھی۔ انھوں نے نفسیات کی نئی دنیا کی چھان بین کا کوئی خیال نہ کیا جو سائنس نے ان کے حوالے کی تھی، بلکہ وہ ان بیزنطینی استادان فن کی طرف مائل ہو گئے جنھیں مدتوں پہلے چھوڑ چکے تھے۔ اس طرح مغربی مصوری کا وہ غیر موثق

۱- Cyrus Hamlin۔

۲- باسفورس پر ترکوں کے دو حصار ہیں، ایک ایشیا کی جانب، دوسرا یورپ کی جانب۔ ایک کا نام ایشیائی حصار اور دوسرے کا یورپی حصار۔ یہاں اشارہ آخری حصار کی طرف ہے۔

۳- Giotto دانتے کا ہم عصر۔

۴- Raphael اٹلی کا مشہور مصور (۱۴۸۳-۱۵۲۰ء)۔

دبستان شروع ہوا ، جس نے بالکل نیا طریقہ اختیار کیا اور رنگ روغن سے نگاہوں پر اثر ڈالنے کے بجائے روحانی تجرباب کے اظہار کا کام لیا - مغرب کے بت تراش اپنے دائرے کے اندر محدود رہے تھے ، لیکن انھوں نے بھی یہی ولولہ انگیز تلاش شروع کر دی -

۷- مذہبی مقاصد و ادارات کا احیاء

مسیحیت کو یہودیت سے جو تعلق تھا ، وہ یہودیوں کی نگاہوں پر پوری طرح آشکارا تھا - البتہ مسیحیوں کے ضمیر ایک پریشان کن ابہام میں الجھے ہوئے تھے - یہودیوں کی رائے تھی کہ مسیحیت یہودیت ہی کا ایک مرتد فرقہ ہے - اس نے مذہبی قانون کے ساتھ ایک غیر مستند ضمیمہ لگایا اور اس ضمیمے کی بنا پر بھی اس غلط اندیش اور کم نصیب جلیلی فریس[1] کی تعلیمات سے انحراف کیا - جس کا نام یہ فریسیت کے غدار دیدہ دلیری سے لیتے رہے - مسیحیت نے یونانی معاشرے کو معجز نما طریق پر مسحور کر لیا تھا لیکن یہودیوں کی نگاہوں میں خدا کا فعل قرار نہ دیا جا سکتا تھا - جس یہودی ربی نے اپنی وفات کے بعد کامیابی حاصل کی اور اس کے پیرو اسے غیر یہودی انداز میں سلام کرتے تھے ، کہتے تھے کہ یہ خدا کا بیٹا ہے جو انسانی ماں سے پیدا ہوا ، یہودیوں کے نزدیک یہ ویسا ہی ایک لادینی حربہ تھا جیسے اس سے پیشتر استعمال ہو چکے تھے ، مثلاً افسانوی دیوتا جن میں سے دینوسوس اور ہر قل کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں - یہودیت کے پیرو اپنے دل میں کہہ رہے تھے کہ اگر ہم بھی مسیحیت کی پست سطح پر پہنچ جاتے تو ویسی ہی کامیابی حاصل کر سکتے تھے جیسی مسیحیوں نے حاصل کی - مسیحیت نے یہودیوں کے مذہبی قانون کی برتری سے کبھی انکار نہ کیا تھا بلکہ اسے اپنے قانون سے وابستہ کر لیا تھا - اس نے جو نمائشی فتوحات حاصل کیں وہ یہودیت کے دو ابتدائی اصول ترک کرکے حاصل کیں - یہ اصول احکام عشرہ میں سے پہلے اور دوسرے حکم میں بیان ہوئے ہیں ، یعنی اول خدا کو ایک ماننا ، دوم کوئی مورتی نہ تراشنا - اب صاف ظاہر تھا کہ یونانی

۱- یعنی وہ فریسی جو فلسطین کے علاقہ جلیل کا رہنے والا تھا - اسے گلیل بھی کہتے ہیں -

لادینیت اپنی اصل حیثیت میں قائم تھی اور اس نے اپنے طرزعمل سے توبہ نہ کی تھی ؛ اس طرح یہودیت کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ خدا کے ہمیشہ زندہ رہنے والے کلام کی سچائی پر شہادت دیتے رہیں اور اپنے طرز عمل میں کوئی فرق نہ آنے دیں -

حد درجہ تعجب انگیز کام یابی حاصل کرنے والی مسیحیت سے یہودیت کی یہ گہری نفرت مسیحیوں کے لیے ایسی پریشان کن نہ ہوتی اگر مسیحیت خدا کو ایک ماننے اور مورتی نہ تراشنے سے اعتقادی وابستگی کا اعلان نہ کرتی ، ساتھ ہی یونانی معاشرے کے جن لوگوں نے مسیحیت قبول کر لی تھی ان کی بت پرستی اور شرک کے لیے عملی مواد مہیا نہ کر دیتی - خدا کو ایک ماننا اور مورتی نہ بنانا یہودیوں کی خاص میراث تھی ، اسی کی بنا پر یہودی مسیحیوں کے طریق عمل پر شدید نکتہ چینی کرتے تھے - مسیحی کلیسا نے یہودیوں کے مذہبی صحیفوں کو مسیحی مذہب کا عہد نامۂ قدیم قرار دے دیا تھا ؛ اس طرح ان صحیفوں کو از سر نو تقدس کے درجے پر پہنچا دیا تھا - مسیحیت کے زرہ بکتر میں یہ حصہ بہت کم زور تھا اور اسی میں سے یہودی انتقاد کے تیر نکل نکل کر مسیحیوں کے ضمیروں کو چھیدتے رہتے - عہد نامۂ قدیم ہی کی بنیاد پر مسیحیت کی عمارت قائم تھی لیکن ساتھ ہی مسیحیت نے تثلیث کا نظریہ بھی اختیار کر لیا تھا اور وہ اولیاء کو بھی ماننے لگے تھے ؛ اولیاء ہی نہیں بلکہ اقانیم ثلاثہ کے بت بھی انھوں نے ابعاد ثلاثہ (لمبائی ، چوڑائی اور گہرائی) نیز دو بعدوں (لمبائی اور چوڑائی) میں تیار کر لیے تھے - مسیحیوں کی طرف سے معذرت پیش کرنے والے لوگ یہودیوں کے اس اعتراض کا جواب کیا دے سکتے تھے کہ مسیحی کلیسا نے یونانیت کا جو طریق عمل اختیار کر لیا ہے ، اسے یہودی نظریات سے کوئی مطابقت نہیں - کوئی نہ کوئی جواب ملنا چاہیے تھا جس سے مسیحی قلوب کو اطمینان ہو جاتا کہ یہودیوں کا یہ اعتراض در اصل بے بنیاد ہے ، اس کی قاطعیت نے مسیحی روحوں میں گناہ کا جوابی عقیدہ پیدا کر دیا تھا -

یونان کی غیر یہودی دنیا چوتھی صدی مسیحی میں من حیث الکل مسیحیت کی حلقہ بہ گوش بن گئی تو خود کلیسا کے اندر جھگڑا شروع ہوگیا جس کے سامنے مسیحیوں اور یہودیوں کا جھگڑا بھی ماند پڑ گیا - چھٹی اور ساتویں صدی میں اس پرانی مذہبی جنگ کے شعلے پھر بھڑک اٹھے اس لیے کہ یہودیت نے

اپنے گھر کو تمام غیر صالح باتوں سے پاک کر لیا تھا اور اس عمل کا سلسلہ پانچویں صدی مسیحی کے آخر میں شروع ہوا تھا ۔ خود یہودیوں کے اندر بھی ایک کش مکش جاری ہو گئی تھی کہ آیا انہیں بھی عیسائیوں کی طرح اپنی مذہبی عبادت گاہوں کو بیل بوٹوں سے آراستہ کر لینا چاہیے ؟ اس جھگڑے نے یہودیت اور مسیحیت کے محاذ جنگ پر اثر ڈالا ۔ جب ہم اپنی توجہ مسیحی کلیسا کے متوازی جھگڑے کی طرف منعطف کرتے ہیں جو بت پرستی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان جاری تھا تو اس کے تواتر اور ہمہ گیری پر سخت متعجب ہوتے ہیں ۔ یہ جھگڑا مسیحیت کے تقریباً ہر خطے میں جاری ہوا اور تقریباً ہر صدی میں اس کے شعلے بھڑکتے رہے ؛ یہاں مثالوں کی طویل فہرست پیش کرنے کی ضرورت نہیں جن کا آغاز الویرا کی کونسل (۳۰۰ء–۳۱۱ء) کے چھتیسویں قانون سے ہوا ، اس کی رو سے گرجاؤں میں تصویریں دکھانا بالکل ممنوع قرار دیا گیا ۔

ساتویں صدی مسیحی میں ایک نیا عامل تاریخی سٹیج پر نمودار ہوا اور اس کی نمود حد درجہ شان دار تھی یعنی مسیحیت کی طرح ایک نیا مذہب معرض وجود میں آیا جو یہودیت ہی سے نکلا تھا لیکن حد بلوغت کو پہنچ کر نکلا ۔ اسلام توحید کا حد درجہ پابند اور بت پرستی کا حد درجہ مخالف تھا ، کوئی یہودی توحید کی حمایت اور بت پرستی کی مخالفت میں اس سے آگے نہ جا سکتا تھا ؛ اس مذہب کے پیروؤں نے عسکریت کے بل پر حیرت انگیز فتوحات حاصل کیں ، ساتھ ہی تبلیغ کے دائرے میں اس نے وہ کارنامے انجام دیے کہ خود مسیحیت کے لیے بھی سوچ بچار کا موقع پیدا ہو گیا ۔ جس طرح کمیونزم کے پیروؤں نے عسکری یا تبلیغی فتوحات کے ذریعے سے دور جدید کی مغربی روحوں میں سوچ بچار پیدا کر دیا اور انھوں نے مغربی دنیا کے روایتی ، مجلسی اور اقتصادی انتظامات پر از سر نو غور و فکر شروع کیا اسی طرح ابتدائی دور کے عرب فاتحوں نے ان جھگڑوں کی آگ میں نیا ایندھن ڈال دیا جس کے شعلے مسیحی بت پرستی کے مسئلے کے ارد گرد مدت سے بھڑک رہے تھے ۔

۷۲۶ء میں ایک نیا واقعہ رونما ہوا ۔ یہودیوں کو بت پرستی سے جو نفرت تھی ، اس کی روح سٹیج کے عین وسط میں آ کھڑی ہوئی ؛ اس کا ذمہ دار مشرقی رومی شاہنشاہ لیوسائرس تھا جس نے بت پرستی کا فرمان جاری کیا ۔ اس

کوشش کا مطلب یہ تھا کہ سیاسی اقتدار سے کام لے کر مذہبی دائرے میں احیاء کا وظیفہ بہ زور انجام دیا جائے لیکن یہ کوشش ناکام ہی رہی ۔ پاپاؤں نے انتہائی جوش و خروش سے اس بت پرستی کی حمایت کی جو ہر دل عزیز ہو چکی تھی ، اس طرح وہ لوگ بیزنطینی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے میں بہت آگے نکل گئے ۔ بعد ازاں مغرب میں شارلمین نے لیوسائرس کی پالیسی کو جاری کرنے کی جو نیم دلانہ کوشش کی تھی ، اسے پوپ ہیڈرین اول نے ابتدا ہی میں روک دیا ؛ چناں چہ مغرب کو یہودی عقیدے کی توحید کے احیاء کے لیے تقریباً آٹھ سو سال اور انتظار کرنا پڑا ؛ اس کا وقت آیا تو تحریک نیچے سے اوپر کی طرف جاری ہوئی ، اس تحریک کا بانی مارٹن لوتھر[1] تھا ۔

مغربی مسیحی دنیا میں پروٹسٹنٹوں کی مذہبی اصلاح میں اپنی کونزم تنہا یہودی چیز نہ تھی جو از سر نو قیام میں کام یاب ہوئی بلکہ ''سبت پرستی'' نے بھی رومن کیتھولک کلیسا سے الگ ہونے والوں کو مسحور کر لیا تھا اور اس دوسرے عنصر کے احیاء کی تشریح آسان نہیں اس لیے کہ اپنے وطن سے خارج ہونے کے بعد یہودیوں نے جس اہتمام سے سبت منانے کا کام جاری رکھا ، وہ ایک عجیب و غریب چیلنج کا ایک عجیب و غریب جواب تھا جو اس قوم نے مہیا کیا ۔ یہودیوں کی بکھری ہوئی آبادی کے لیے یہ سبت پرستی اپنے اجتماع کو برقرار رکھنے کی ایک کوشش تھی ؛ پروٹسٹنٹ اپنا نصب العین یہ بیان کرتے تھے کہ ہم کلیسائے قدیم کے ابتدائی طرز عمل کی طرف لوٹ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ابتدائی مسیحیت اور یہودیت کے درمیان اس اختلاف کو مٹا رہے تھے جس کے قائم رکھنے پر دور قدیم کے کلیسا کو اصرار تھا ۔ کیا بائیبل کی پیروی کرنے والے یہ مسیحی انجیلوں کی ان بے شمار آیات سے بے خبر تھے جن میں مسیح نے ''سبت پرستی'' کی مخالفت کی تھی ؟ کیا انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ پولوس رسول نے جس کی یہ لوگ انتہائی عزت کرتے تھے ، موسوی قانون کی تنسیخ سے شہرت حاصل کی تھی ؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ جوشیلے مذہب پرست جو جرمنی ، انگلستان ، سکاٹ لینڈ ، نیو انگلینڈ اور دوسرے خطوں میں آباد تھے ، ایک حد درجہ قوی احیاء کی گرفت میں تھے اور یہ اپنے آپ کو اسی طرح نقلی یہودی بنانے پر تلے بیٹھے تھے جس طرح

۱- Martin Luther -

اٹلی کے جوشیلے فن‌کار اور ادیب اپنے آپ کو نقلی ایتھنی بنانے کے عازم تھے۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو بپتسمے دیتے تھے تو عہد نامۂ قدیم کے وہ نام استعمال کرتے تھے جنھیں ٹیوٹانی تلفظ و صوت سے کوئی مناسبت نہ تھی، یہ مردہ دنیا کو از سر نو زندہ کرنے کے جنون کی ایک روشن علامت تھی۔

مغربی پروٹسٹنٹوں نے یہودیت کے احیاء میں ایک تیسرا عنصر بھی شامل کر لیا جسے ہم نے ضمناً پیش کر دیا یعنی بائیبل پرستی یا مقدس بتوں کی پرستش کے بجائے کسی مقدس کتاب کے متن کی پرستش شروع کر دینا۔ بلا شبہ بائیبل کو ملکی زبانوں میں ترجمہ کر دینے کی وجہ سے نہ صرف پروٹسٹنٹوں اور پیوریٹنوں بلکہ مغرب کے عام لوگوں کو حد درجہ ثقافتی فائدہ پہنچا؛ جو سادہ لوح لوگ عام طور پر بائیبل کا بہت کم مطالعہ کرتے تھے، وہ اسے مسلسل پڑھنے لگے، اس طرح مختلف ملکوں کے ادب کو غیر معمولی فوائد حاصل ہوئے اور عام تعلیم کے جذبے نے فروغ پایا۔ بائیبل میں جو کہانیاں بیان ہوئی ہیں، ان کی مذہبی قدر و قیمت خواہ کچھ ہو لیکن وہ لوک کہانیاں بن گئیں اور ان میں ایسی دل چسپی پیدا ہو گئی کہ اہل مغرب نے مختلف مقامی ماخذ سے جو کچھ حاصل کیا تھا، وہ اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ ایک علم دوست اقلیت کے لیے اس مقدس کتاب کے ناقدانہ مطالعے نے انتقاد عالیہ کو تقویت پہنچائی جسے علم و فضل کے دوسرے دائروں میں استعمال کیا گیا۔ مقدس مذہبی صحیفوں کی تقدیس کا اخلاقی اور ذہنی انتقام پروٹسٹنٹوں کی حلقہ بہ‌گوشی تھی جس سے ٹریسٹ کی کونسل والا کیتھولک مذہب آزاد رہا حالاں‌کہ اس میں بھی پادری ہی با اختیار تھے۔ عہد نامۂ قدیم کو خدا کا سچا کلام ماننے پر اصرار ایک حماقت کو مذہبی لباس پہنانا ہے حالاں‌کہ پے در پے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ صحیفے انسانوں نے تیار کیے تھے، ان میں مختلف درجوں کی مذہبی اور تاریخی خوبیاں موجود ہیں، ان صحیفوں کو جمع کر دیا گیا یا باہم امتزاج دے دیا گیا؛ اسی وجہ سے میتھو آرنلڈ عہد وکٹوریہ کے خیر دوست طبقۂ متوسط کے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہوا تھا کہ یہ لوگ ایسی عبرانی کھاڑی میں رہتے ہیں جو ہر طرف سے بند ہے۔

گیارھواں حصہ

تاریخ میں قانون اور آزادی

پینتیسواں باب

صورت مسئلہ

۱۔ قانون کا مفہوم

جو سو سال ۱۹۱۴ء پر ختم ہوئے، اُن میں اہل مغرب کو اُس مسئلے کے بارے میں کبھی کوئی زحمت اُٹھانی نہیں پڑی جس سے ہم اب دوچار ہو رہے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ اُس کا کوئی بھی حل تلاش کر لیا جاتا وہ یکساں اطمینان بخش ہوتا۔ اگر انسانی تقدیر ایک مافوق الانسان قانون کے ماتحت ہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہی ترقی کا قانون تھا اور اُسے ہر اعتبار سے حد درجہ اطمینان بخش سمجھنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس کوئی ایسا قانون موجود نہ تھا تو بڑے یقین و وثوق سے سمجھا جا سکتا تھا کہ آزاد اور دانش مند انسانوں کی سرگرمیاں حسب مراد نتائج پیدا کر لیں گی۔ بیسویں صدی کے وسط میں صورت حال بہ ظاہر بدل گئی؛ یہ معلوم ہوچکا تھا کہ دور ماضی میں تہذیبیں معرض شکست میں آ چکی تھیں، دور جدید کے اہل مغرب نے جو فلک بوس عمارت کھڑی کر لی تھی، اُس میں بھی جا بہ جا خوف ناک شگاف پڑ چکے تھے۔ سوال یہ تھا کہ کیا واقعی کوئی ایسا قانون تھا جیسا کہ آسوالڈ شپینگلر[۱] نے اپنی کتاب ''زوال مغرب'' میں (شائع کردہ ۱۹۱۹ء) پیش کیا تھا جس کے مطابق اس تہذیب کے لیے بھی پیش رووں کے نقش قدم پر چلنا ضروری تھا یا ایسا امکان موجود تھا کہ ہم اپنی غلطیوں کی تلافی کر سکیں اور اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے حسب مرضی بنا لیں؟

تحقیق کے سلسلے میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس سلسلے میں قانون کا مفہوم ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لیں۔ یہ واضح ہے کہ اس سے

۱۔ Oswald Spengler۔

انسان کا بنایا ہوا قانون مقصود نہیں ؛ جس قانون پر ہم اب غور کر رہے ہیں ، انسانی اداروں کے بنائے ہوئے قانون سے بدیں وجہ مشابہ ہے کہ یہ ضابطوں کا ایک مجموعہ ہے جو انسانی اعمال پر حاوی ہے لیکن اس میں ایک بنیادی اختلاف ہے اور وہ یہ کہ اسے انسان نے نہیں بنایا اور انسان اس میں رد و بدل نہیں کر سکتا ۔ ہم اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں دیکھ چکے ہیں کہ قانون کے متعلق اس خیال کو مابعدالطبیعیاتی سطح پر لے جائیں تو یہ دو بہ‌ظاہر متضاد تصوروں میں منقسم ہو سکے گا ؛ جن افراد کے ذہنی تصور میں قانون کے بجائے قانون ساز کو خاص اہمیت حاصل ہے ، وہ اُس مابعدالطبیعیاتی قانون کو جو پوری کائنات پر حاوی ہے ، قادر مطلق خدا کا قانون سمجھتے ہیں لیکن جن افراد کے تصورات میں قانون کو قانون ساز کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہے ، اُن کے نظریے کے مطابق یہ قانون فطرت کا یکساں اور غیر متبدل لا شخصی قانون ہے ۔

قانون کے متعلق ان دونوں تصوروں میں ایک پہلو اطمینان کا ہے ؛ دوسرا خوف کا ۔ قوانین فطرت میں خوف کا پہلو یہ ہے کہ وہ بے پناہ ہیں اور ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا لیکن اس میں فائدے کا بھی ایک پہلو موجود ہے یعنی چوں‌کہ یہ قوانین غیر متبدل ہیں اس لیے انسانی عقل اُن کا ادراک کر سکتی ہے ۔کائنات قدرت کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کر لینا انسان کی دسترس میں ہے اور یہ معلومات قوت کا سامان ہیں ۔ انسان قوانین قدرت کے متعلق علم حاصل کرکے اُنھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے ؛ اس سلسلے میں انسان نے جو کام یابی حاصل کی ، وہ بہت حیرت انگیز ہے یعنی جزولایتجزیٰ (ایٹم) کو توڑنے میں کام یاب ہو گیا اور کون کہ سکتا ہے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے ۔

جو انسانی روح گناہ کا ارتکاب کر چکی ہے اور اُسے یقین ہو چکا ہے کہ رحمت ایزدی کی مدد کے بغیر وہ اپنی اصلاح نہیں کر سکتی ، وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح خدا ہی کی پناہ میں چلی جائے گی ؛ انسان کا گناہ ضرور ظاہر ہوگا اور اُسے لازماً سزا ملے گی ، قوانین قدرت کا فیصلہ یہی ہے ۔ اس صورت حال سے باہر نکلنے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ خدائی قانون کی حکم رانی قبول کر لی جائے ۔ روحانی اطاعت کا مرکز یوں منتقل کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس پختہ اور قطعی ذہنی علم سے دست برداری اختیار کر لی

جائے جو قوانین قدرت کو جاننے کا بدیہی مادی فائدہ ہے؛ ساتھ ہی انسانی روحوں پر ایک بوجھ بھی پڑا رہے گا اور قدرت پر قابو پا لینے کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس کی غلامی قبول کر لی جائے۔ اپنے آپ کو زندہ خدا کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا روح ہے تو انسانی روحوں کے متعلق اُس کے کاروبار کے باب میں نہ قبل از وقت کوئی پیش گوئی کی جا سکے گی اور نہ اُس کے متعلق دریافت کر لینا ممکن ہوگا۔ جب کوئی انسانی روح خدا کے قانون کی طرف جاتی ہے تو وہ یقین کی منزل کو چھوڑ کر بیم و رجا کی منزل میں پہنچ جاتی ہے اور جو قانون کسی ادارے کا مظہر ہے، اُس میں روحانی آزادی کا جوہر بھی ہوتا ہے جو کائنات قدرت کی یکسانی کی ضد ہے۔ مطلق العنان قانون یا تو محبت کا نتیجہ ہو سکتا ہے یا نفرت کا؛ انسانی روح اگر اپنے آپ کو خدائی قانون کے حوالے کر دے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، خدا کے متعلق انسان کے تصورات کی مختلف حیثیتیں اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں۔ دیکھیے شفیق باپ سے مطلق العنان جابر تک مختلف تصورات خدا کے متعلق انسان نے پیدا کیے اور یہ مختلف تصورات اُس صورت میں ذات باری کے لیے ناسازگار نہیں جب تک اُسے تجسیم و تشبیہ کے لباس میں دیکھا جاتا ہے اور انسانی خیال اس سے آگے جانے کا اہل نہیں۔

۲۔ دور حاضر کے مغربی مؤرخوں کا انکار قانون اخلاق

اسرائیلیوں اور ایرانیوں کو بابلی اور سریانی تاریخ میں دعوت ہائے مقابلہ سے سابقہ پڑا، اُن کے انبیاء نے تکلیفیں اور مشقتیں اُٹھا کر جوابات مہیا کیے؛ انہیں جوابات سے خدائی قانون کا تصور پیدا ہوا۔ اس کے برعکس قوانین قدرت کا تصور ہندی اور یونانی دنیاؤں کے انحلال کے وقت فلسفیوں نے آراستہ کیا لیکن یہ دونوں دبستان فکر منطقی لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ لازماً ناموافق نہیں بلکہ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ یہ دونوں قانون پہلو بہ پہلو جاری رہ سکتے ہیں۔ خدائی قانون اُس ایک مقصد و نصب العین کو پیش کرتا ہے جو کسی شخصیت کے عقل و ارادہ کا مرجع بنا رہتا ہے؛ قوانین قدرت سے بار بار پیش آنے والی حرکت کی باقاعدگی نمایاں ہوتی ہے، ٹھیک اُسی طرح جس طرح پہیا اپنے محور کے گرد گھومتا ہے۔ اگر ہم ایک ایسے پہیے کا

تصور کریں جسے بنانے والا کوئی نہ ہو اور وہ کسی مقصد کے بغیر ہمیشہ گھومتا رہے تو یہ حرکت بے سود اور بے نتیجہ ہوگی ۔ ہندی اور یونانی فلسفی اسی یاس انگیز نتیجے پر پہنچے ؛ اُن کا خیال یہ تھا کہ زندگی کا رنج افزا پہیا بے سود چکر لگا رہا ہے ۔ ہم عام زندگی میں پہیے بنانے والوں کے بغیر پہیوں کا تصور نہیں کر سکتے اور کسی پہیے بنانے والے کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس سے کوئی گاڑی والا پہیا بنانے اور گاڑی میں لگانے کی فرمائش نہ کر دے ۔ اُسی صورت میں پہیوں کی دوری گردش گاڑی کو اُس منزل پر پہنچائے گی جو گاڑی والوں کے پیش نظر ہے ؛ قوانین قدرت میں اُسی وقت معقولیت کا جوہر پیدا ہوتا ہے جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ خدا نے اُنھیں اپنی گاڑی کے لیے پہیوں کی حیثیت دے رکھی ہے ۔

یہ عقیدہ یہودیت کی میراث ہے کہ کائنات کی پوری زندگی خدائی قانون کے تابع ہے ، مسیحی اور اسلامی معاشرے بھی اسی عقیدے میں شریک ہیں ۔ اس کا اظہار دو حد درجہ مشابہ ، مگر کاملاً مختلف انسانی شاہ‌کاروں میں پیش کیا گیا ہے ؛ اول سینٹ آگسٹائن کی کتاب ، دوم ابن خلدون کا ''مقدمہ''۔ مغربی دنیا کے مفکر ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک تاریخ کے اُس یہودی تصور کو صحیح سمجھتے رہے جو سینٹ آگسٹائن کے ذریعے سے پیش ہوا اور اس کا آخری مستند اظہار بوسوے[1] کی کتاب میں ہوا جس کا نام ہے ''تاریخ عالم کے متعلق مکالمات'' ، یہ ۱۶۸۱ ء میں شائع ہوئی تھی ۔ عہد حاضر کے مغربیوں نے اُس فلسفۂ تاریخ کو رد کر دیا ، جس میں خدا کو مرکزی حیثیت دی گئی تھی ۔ اس رد کی توجیہہ بھی پیش کی جا سکتی ہے اور اسے قابل معافی بھی سمجھا جا سکتا ہے اس لیے کہ بوسوے نے جو تصویر پیش کی ، وہ تجزیے کے وقت نہ تو مسیحیت کے موافق ثابت ہوئی نہ عقل سلیم کو مطمئن کر سکی ؛ بیسویں صدی کے ایک مصنف آر ۔ جی ۔ کالنگ وڈ[2] نے اس کے نقائص پوری طرح واضح کر دیے ہیں ، اس نے فلسفی اور مؤرخ دونوں حیثیتوں میں درجۂ امتیاز حاصل کیا ، وہ کہتا ہے :

''جو تاریخ مسیحی اصول کے مطابق مرتب ہوگی وہ لازماً

۱- Bossuet ایک فرانسیسی عالم دین و خطیب (۱۶۲۷ء—۱۷۰۴ء) ۔

۲- R.G. Colling wood ۔

عالم گیر ہوگی ، اُسے منجانب اللہ سمجھنا چاہیے ، وہ غیر مؤثر ہوگی اور اُسے مختلف دوروں میں بانٹا جائے گا - - - - - قرون وسطیٰ کے مؤرخ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ تمھیں تاریخ میں کسی معروضی نقشے کا علم کیوں کر ہوا تو وہ جواب دے گا کہ یہ علم الہام کے ذریعے سے ہوا ؛ حضرت مسیح علیہ السلام نے خدا کے متعلق انسانوں کو جو کچھ بتایا ، یہ چیز بھی اُسی میں شامل تھی - یہ الہام محض انھیں افعال کی کلید نہیں جو خدا نے زمانۂ ماضی میں انجام دیے بلکہ جو کچھ زمانۂ مستقبل میں پیش آئے گا ، اُس کی کلید بھی یہی ہے - یوں مسیحی الہام نے ہمیں ابتدائے تخلیق سے مستقبل میں اس کے اختتام تک پوری دنیا کی تاریخ کا خاکہ پیش کر دیا جس طرح یہ خدا کے ابدی تصور میں تھا جہاں وقت کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا - یوں قرون وسطیٰ کی تاریخ نگاری کا تصور نصب العین تاریخ کے متعلق یہ تھا کہ خدا نے پہلے سے اُس کا فیصلہ کر دیا اور الہام کے ذریعے سے قبل از وقت انسان کو معلوم ہو گیا گویا تاریخ مادیات کی کتاب بن گئی -

''قرون وسطیٰ کے فکروخیال کے مطابق خدا کے معروضی مقصد اور انسان کے موضوعی مقصد میں صریح تضاد تھا ، سمجھا یہ گیا تھا کہ خدا نے اپنی معروضی تجاویز کو تاریخ پر عائد کر دیا اور انسان کے موضوعی مقاصد کا قطعاً خیال نہ رکھا - اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سمجھا جاتا انسان کا ارادہ تاریخ کی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا اور جس قوت کے بل پر سب کچھ ہو رہا ہے ، وہ خدا کی مرضی ہے[۱]''-

دور حاضر کے ابتدائی دور کے وہ انگریزی مؤرخ جن کے دل و دماغ قرون وسطیٰ کی سطح پر بیٹھے تھے ، انھوں نے مسیحی الہام کو یوں غلط

۱- کالنگ وڈ کی کتاب ''تاریخ کا تصور'' صفحات ۴۹ ، ۵۴ ، ۵۵ -

رنگ میں پیش کرکے اپنے آپ کو دوگونہ یورش کا ہدف بنا لیا؛ ایک یورش ادعایت دوست سائنس دانوں کی طرف سے ہوئی جن کا تعلق دور جدید کے آخری عہد سے تھا اور دوسری یورش لا ادریانہ تشکک پسندوں کی طرف سے ہوئی - کالنگ وڈ کے قول کے مطابق ان مؤرخوں نے یہ غلطی کی کہ سمجھ لیا، وہ مستقبل کے متعلق پیش گوئی کر سکیں گے - تاریخ کے عام خاکے کو سمجھنے کا انھیں اشتیاق تھا اور عقیدہ یہ تھا کہ یہ خاکہ انسان نے نہیں خدا نے بنایا ہے؛ اس طرح وہ تاریخ کے جوہر کو تاریخ سے باہر تلاش کرنے لگے، انھوں نے انسانی اعمال سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور خدائی خاکے کی دریافت میں منہمک ہو گئے:

''اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نگاہوں میں انسانی اعمال کی حقیقی تفصیلات نسبۃً غیر اہم ہوگئیں - مؤرخ کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پیش آیا، اُسے معلوم کرنے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھے لیکن ان مؤرخوں نے اپنا یہ اولین فرض پس پشت ڈال دیا - قرون وسطیٰ کی تاریخ نگاری انتقادی وسائل میں حد درجہ فرومایہ ہے؛ یہ فرومایگی کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھی، اس امر کا نتیجہ نہ تھی کہ فضلائے تاریخ کے پاس معلومات کے وسائل و مواد محدود تھے - یہ فرومایگی ایک حد بندی پر موقوف تھی؛ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں، نہ کریں مقصد یہ تھا کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہ کیا جائے - وہ حقیقی تاریخی واقعات کے صحیح اور سائنٹفک مطالعے کے خواہاں نہ تھے؛ دراصل خدائی صفات کے صحیح اور سائنٹفک مطالعے کے خواہاں تھے یعنی اُن کے پیش نظر دینیات تھی، وہ قیاس کی بنا پر یہ طے کر رہے تھے کہ کیا کچھ ہونا چاہیے تھا اور عمل تاریخی میں آئندہ کیا کچھ ہونا چاہیے''۔

''نتیجہ یہ نکلا کہ قرون وسطیٰ کی تاریخ نگاری کو محض عالم مؤرخ کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے یعنی ایسے نقطۂ نگاہ سے جس میں مؤرخ واقعات کی صحت کے سوا کسی چیز پر نظر

نہیں رکھتا تو یہ تاریخیں نہ محض غیر تسلی بخش ثابت ہوتی ہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے انہیں دانستہ غلط راستے پر چلایا گیا اور اس معاملے کو نفرت انگیز حد پر پہنچا دیا گیا۔ انیسویں صدی کے جن مغربی مؤرخوں نے تاریخ کی حقیقی حیثیت کے متعلق محض معلوماتی نقطۂ نگاہ پیش نظر رکھا، وہ بھی ان کے بارے میں ہم دردی سے حد درجہ معرا ظاہر ہوئے۔''[1]

قرون وسطیٰ کے تصور کی یہ مخالفت آخری دور کے مؤرخوں کی اس نسل سے مختص نہیں جن کی زندگیوں کا خوش گوار سکون اُن کی خوش دلانہ لا ادریت میں منعکس ہوتا تھا، ان کے پیش رو اور جانشین بھی اس حرارت سے بہ درجۂ اعلیٰ متاثر ہوئے۔ پہلے جانشینوں کو لیجیے؛ بیسویں صدی میں انسانی ڈکٹیٹروں نے لوگوں کو نہایت ناخوش گوار تجربات کا مرجع بنا دیا تھا اور اُن سے پنج سالہ منصوبے پورے کرانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں تو کیا وہ اس خیال پر انقلاب بپا کر دیتے کہ مطلق العنان خدا اُن پر چھ ہزار سال کا منصوبہ زبردستی عائد کر رہا ہے؟ باقی رہے اٹھارہویں صدی کے اہل مغرب تو اُن کے پیش رو قرون وسطیٰ کے تصورات پر کاربند چلے آتے تھے؛ اس کار بندی کے سلسلے میں انھوں نے اپنے اوپر مذہبی جنگوں کی ہول ناک تکالیف عائد کر لیں، اُن سے یہ اُمید نہ ہو سکتی تھی کہ بوسوے کے نظریے کو مضحکہ خیز اوہام پرستی یا بے وقت کی راگنی قرار دیں گے۔ اُسی عہد کے آدمی ایسی باتوں کو مذہب دشمنی سے تعبیر کرتے تھے اور وقت کا عام نعرہ یہ تھا کہ جہاں کوئی ذلیل و رسوا نظر آئے، اُسے کچل دیا جائے۔ یہاں خدا پرستوں میں اور دہریوں میں کوئی بنیادی فرق نہ تھا؛ خدا پرست خدا کے وجود کو مانتے تھے لیکن اس طرح جس طرح ہینوور کا رہنے والا بادشاہ برطانیہ پر حکم ران تھا، وہ حکم ران تو تھا لیکن حکومت کی باگ دوڑ کاملاً اُس کے ہاتھ میں نہ تھی، دہریوں نے خدا کے انکار کو نظام کائنات کی آزادی کی تمہید بنا لیا تھا۔ اُس وقت سے قوانین قدرت کو غیر متبدل تو مان لیا گیا لیکن انسانوں نے انھیں سمجھنا شروع کر دیا؛

۱- کالنگ وڈ کی کتاب ''تاریخ کا تصور'' صفحات ۵۵، ۵۶۔

یہی زمانہ ہے جس میں نیوٹن کے اصول کے مطابق کائنات کو سمجھا گیا یا پیلی کے اصول کے مطابق مان لیا گیا کہ یہ سب کچھ ایک ایسے گھڑی ساز نے بنایا ہے جس نے گھڑی کو بھی کوکا اور اپنا کاروبار بھی تہ کر لیا۔

یوں خدائی قانون کو یہ کہ کر نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ اُس تاریک زمانے کا ایک وہم ہے جس سے زمانۂ حاضرہ کے دور آخر کے اہل مغرب باہر نکل رہے تھے لیکن جب سائنس دانوں نے اُس جاگیر کو سنبھالا جس سے خدا خارج ہو چکا تھا تو اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ایک دائرہ ایسا بھی ہے جس میں قوانین قدرت کام نہیں دے سکتے۔ سائنس غیر انسانی اشیاء کے متعلق ہر قسم کی توجیہات کر سکتی تھی، انسانی جسم کے وظائف اور کاروبار کا معاملہ بھی اُس کی شرح کی دسترس سے باہر نہ تھا اور انسانی جسم دوسرے دودھیل جانوروں سے مختلف نہ تھا لیکن جب یہ سوال سامنے آیا کہ ایک حیوان کی طرح نہیں بلکہ اُس انسان کی طرح جو تہذیب کی راہ پر لگا ہوا ہو، انسانی سرگرمیوں کی کیفیت بتائی جائے تو سائنس جھجھک کر پیچھے ہٹ گئی، یہاں ایک ایسی افرا تفری پیدا ہوئی جو اُس کے قوانین کے تابع نہ تھی۔ پھر کیا یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ سب کچھ واقعات کا ایک بے معنی تواتر ہے یا بیسویں صدی کے ایک انگریز ناول نگار کے الفاظ میں جو ملک الشعراء بھی تھا، یہ کیا ہے کہ ایک ملعون چیز کے بعد دوسری ملعون چیز آ رہی ہے۔ سائنس اس سلسلے میں کوئی جمتی ہوئی بات نہ کہ سکی لہٰذا یہ کام اُس برادری کے سپرد ہوا جو بڑے بڑے دعووں کی عادی نہ تھی۔

اٹھارھویں صدی کے ما بعد الطبیعیات کے نقشے تیار کرنے والوں نے کائنات کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا تھا: خط تقسیم کے ایک جانب غیر انسانی معاملات کا منظم دائرہ تھا جس میں قوانین قدرت جاری تھے اور انسان اپنی روز افزوں ذہنی سرگرمیوں کی برکت سے اُن کی کیفیت کے متعلق معلومات بڑھا سکتا تھا؛ دوسری طرف انسانی تاریخ کا دائرہ تھا جس میں افرا تفری پھیلی ہوئی تھی، وہاں سے بعض دل چسپ کہانیوں کے سوا کچھ حاصل نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ کہانیاں انتہائی صحت سے مرتب کی جا سکتی تھیں لیکن ان سے ثابت کچھ نہ ہوتا تھا، نتیجہ کچھ نہ نکلتا تھا۔ جس

کسی نے (بیان کیا جاتا ہے کہ یہ امریکہ کا مشہور موٹرساز ہنری فورڈ تھا) کہا کہ تاریخ ایک ''بنک[۱]'' ہے، اس کا مطلب یہی تھا ۔ بعد کے دور میں موجودہ کتاب کی ترتیب کے وقت تک جو پہلو نمایاں رہا ، یہ تھا کہ سائنس نے اُن مختلف دائروں کو بھی کام یابی کے مختلف درجوں میں اپنے لیے مخصوص کر لیا جو ابتدا میں مؤرخین کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے مثلاً بشریات ، اقتصادیات ، اجتماعیات اور نفسیات کے دائرے ۔ ہر لحظہ کم ہونے والے علاقوں میں سے جن پر مسلسل پیش قدمی کرنے والی سائنس کے قدم نہ پڑے تھے ، اُن میں مؤرخوں نے دریافت حقائق کی سرگرمیاں بلا اختلال جاری رکھیں ۔

تاہم اہل مغرب کا بنیادی عقیدہ ہمیشہ یہ رہا کہ کائنات ایک قانون کے تابع ہے اور اُسے بے نظمی کے حوالے نہیں کیا گیا ؛ خدا پرستوں اور دھریوں دونوں کی طرف سے اس عقیدے کی آخری تعبیر یہ تھی کہ قوانین کائنات قوانین قدرت ہی کا ایک نظام ہیں ، ان قوانین کا دائرہ برابر پھیلتا رہا ۔ سائنس کی تاریخ میں جن ناموں کو عظیم الشان حیثیت حاصل ہوئی ، وہی تھے جو افراتفری کی نمایشی حیثیت سے گزرتے ہوئے داخلی نظم کو واضح کرتے رہے ؛ مثال کے طور پر جن کارناموں کے لیے نیوٹن ، ڈارون یا آئن سٹائن کو شہرت حاصل ہوئی ، اُن کی غرض یہی تھی کہ نظم کا معاملہ زیادہ واضح ہو جائے اور کون ایسا خط کھینچنے کی جرأت کر سکتا ہے جس کے آگے یہ دماغی فاتحین اپنا عمل جاری نہیں کر سکتے ؟ یہ کہنا کہ کائنات کا ایک حصہ ــــ وہ حصہ جس میں انسان تہذیب کی راہ پر لگے چلے جا رہے ہیں ــــ کسی بالا دست ہستی نے افراتفری اور بد نظمی کے لیے مخصوص کر رکھا ہے ، ان مؤرخوں کے نزدیک ممکن ہے اطمینان کا باعث ہو جو اخلاقی قوانین کے منکر ہیں لیکن سائنس کے سلیم العقل فدائی اسے کفر کے مترادف قرار دیں گے ۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور کے مغربی مؤرخین اخلاقی قانون کے اتنے منکر نہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں اور اس حقیقت کا اعتراف بیسویں صدی کے وسط کے ایک ممتاز شخص نے کیا ہے جو تاریخ نگاری کر رہا ہے :

۱- Bunk -

"ایک خاص نسل کے آدمی عموماً اُس درجے سے آگاہ نہیں ہوتے جس میں ایک مفروضہ ڈھانچے کے اندر وہ معاصرانہ تاریخ کا تصور کرتے ہیں۔ وہ واقعات کو خاص شکلوں میں ترتیب دیتے ہیں یا انہیں خاص سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں جو بعض اوقات تقریباً شیخ چلی کے منصوبے کی طرح اختیار کر لیے جاتے ہیں۔ جس طریقے پر کہانی عموماً ترتیب دی جاتی ہے، بہت ممکن ہے اُن کے قلوب اس سے بالکل بے خبر ہوں؛ جب دنیا بدلتی ہے اور نئی نسل سامنے آتی ہے جو پیدائش ہی سے مسلمہ ڈھانچے کی پابند نہیں تو اس ڈھانچے کی تنگی ہر شخص پر آشکارا ہوجاتی ہے۔۔۔ تاریخ نگاروں اور دوسرے معلموں کا یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ اگر وہ مسیحی نہیں تو اپنے آپ کو کسی خاص راہ عمل کے پابند ماننے سے گریزاں ہیں یا وہ کسی نظریے کے بغیر کام کر رہے ہیں اور تاریخ پر بغیر کسی سابقہ مفروضات کے بحث کی جا رہی ہے۔ محض تاریخ نگاروں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے دائرے کے کارکنوں میں بھی حد درجہ اندھا وہ ہے جو اپنے مفروضات کا جائزہ نہیں لے سکتا اور سمجھتا ہے کہ دوسروں کے سامنے بھی کوئی مفروضہ نہیں۔"[۱]

یہ ایک ایسے قیدی کی تصویر ہے جو اپنی زنجیروں سے آگاہ نہیں اور اس سلسلے میں ہم ایک اقتباس کو دوبارہ پیش کرنے سے احتراز نہیں کر سکتے۔ یہ اس کتاب کی تمہید میں آیا ہے جو حسن و خوبی کے اعتبار سے اخلاقیات سے منکر بے عقیدگی کے لیے ایک کلاسیکی اعتراف کی حیثیت رکھتی ہے:

"مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میں ایک ذہنی ہیجان سے محروم ہوں۔ جو لوگ مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں اور مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں، انہیں تاریخ میں ایک خاکہ، ایک آہنگ اور پہلے سے طے شدہ ایک نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ ہم آہنگیاں میری نگاہوں سے مخفی ہیں، مجھے صرف یہ نظر

۱- ہربرٹ بٹرفیلڈ "مسیحیت اور تاریخ"، صفحہ ۱۴۰ و ۱۴۶۔

آتا ھے کہ ایک واقعے کے بعد دوسرا واقعہ اسی طرح پیش آ رھا ھے جس طرح ایک لہر کے پیچھے دوسری لہر رقصاں ھوتی ھے ، صرف ایک بڑا واقعہ جس کی یگانگی کی بناء پر کوئی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا ؛ مؤرخین کے لیے محفوظ طریقہ صرف ایک ھے کہ انسانی تقدیروں کے نشو و ارتقا میں ناگہانی اور نادیدہ واقعات کے عمل کا اندازہ کریں۔''[۱]

لیکن جس مورخ نے تاریخ کے اس نظریے کو درست مانا کہ یہ دراصل ایک ملعون چیز کے بعد دوسری ملعون چیز کا سلسلہ ھے ، یہ کتنی عجیب بات ھے کہ اس نے اپنی کتاب کا نام ''تاریخ یورپ'' رکھا اور اس طرح ایک ھی سانس میں اس نے پہلے سے طے‌شدہ نمونہ بھی تسلیم کر لیا اور ایک ناقابل امتیاز براعظم کی تاریخ کو پوری انسانیت کی تاریخ بھی سمجھ لیا ۔ وہ مغرب کی مروجہ مذھبی تاریخ کے اصول سے نادانستہ اتفاق کرتا ھوا دور آخر کے مغربی تاریخ نگاروں کے معمول پر پہنچ گیا ؛ یورپ کے وجود کو ماننے کے لیے جو نادانستہ ذھنی عمل درکار تھا ، وہ اتنا سخت اور مشقت خیز تھا کہ تسلیم کردہ دفعات کی تعداد کم از کم انتالیس تک جا پہنچی ھوگی ۔

۱۔ فشر کی کتاب ''یورپ کی ایک تاریخ'' ، جلد اول ، تمہید ، صفحہ ۷ ۔

چھتیسواں باب

قوانین قدرت کے روبرو انسانی معاملات کی جواب دہی

۱- شہادت کا جائزہ

(الف) افراد کے نجی معاملات: ہمیں مقاصد تحقیق کے پیش نظر یہ مسئلہ فی الحال زیر غور رکھنا چاہیے کہ انسانی تہذیب کی تاریخ میں قوانین قدرت کو کوئی حیثیت حاصل ہے یا نہیں ؛ پھر ہمیں انسانی معاملات کے مختلف شعبوں کا جائزہ لینا چاہیے، اس وقت اندازہ ہو سکے گا کہ یہ مسئلہ تحقیق میں دقیقہ سنی کی بنا پر ویسا غیر معین ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے فرض کیا ہے یا نہیں ؛ سہولت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے افراد کے عام معاملات میں چھان بین کریں گے - اس موضوع کے متعلق عہد حاضر کے مورخوں نے نہایت شان دار معلومات فراہم کی ہیں، اسے مجلسی یا اجتماعی تاریخ کا نام دیا جاتا ہے؛ یہاں ہمیں وہ مشکل بالکل ناپید نظر آتی ہے جو تہذیبوں کی تاریخ کے سلسلے میں اہم قوانین کی تلاش کرتے ہوئے پیش آتی تھی - جن تہذیبوں کے ریکارڈز ہمارے سامنے موجود ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے یعنی دو درجن سے بھی نیچے ، نیز ان میں سے بعض کے متعلق ہماری معلومات حد درجہ جزوی ہیں ؛ ان کے برعکس افراد کی تعداد لاکھوں کروڑوں تک پہنچتی ہے اور دور حاضر کے اہل مغرب کو جن حالات سے سابقہ پڑا ہوا ہے ، اُن کے ماتحت ہر شعبے کے متعلق مفصل اعداد فراہم کر لیے گئے ہیں - ان اعداد کو سامنے رکھ کر عملی نقطۂ نگاہ رکھنے والے آدمیوں نے پیش گوئیاں کی ہیں جن کے پورا ہونے پر نہ صرف اُن کی نیک نامی بلکہ مالی منفعت بھی موقوف ہے - جن لوگوں کے ہاتھ میں صنعت و حرفت اور تجارت کے کنٹرول کا کاروبار ہے ، وہ پورے وثوق سے کہتے رہے کہ فلاں منڈی میں فلاں قسم کے سامان کی ضرورت پیش

آئے گی ؛ ممکن ہے بعض اوقات اندازے میں اُن سے غلطی سرزد ہوئی ہو لیکن اکثر ایسا نہیں ہوا ورنہ انہیں کار و بار کے دائرے سے باہر نکل جانا پڑتا۔ کاروبار کے جس شعبے میں قانون اوسط کا اطلاق سب سے زیادہ واضح طریق پر ہوتا رہا ، وہ انشیورنس (بیمے) کا کاروبار تھا۔ ہمیں جلد بازی سے کام لیتے ہوئے ہر قسم کے انشیورنس کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ انسانی معاملات کو ہم جن معنوں میں استعمال کر رہے ہیں ، ان معنوں میں ان پر قوانین قدرت کے اطلاق کو تقویت پہنچتی ہے۔ لائف انشیورنس کا تعلق انسانی جسم کے ساتھ تھا اور علم الاجسام سائنس کا ایک حلقہ تھا؛ ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس معاملے میں روح کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا ، مادی زندگی حزم و احتیاط سے بڑھائی جا سکتی تھی اور مختلف قسم کی بے احتیاطیوں سے اسے کم کیا جا سکتا تھا ، اس میں اعلیٰ درجے کی جواں مردی بھی شامل ہے اور انتہائی حماقت و وحشت بھی۔ سمندر میں جہازوں یا بحری سامان تجارت کی انشیورنس کے سلسلے میں موسمیات کا مطالعہ ضروری تھا ؛ یہ معاملہ بھی سائنس سے تعلق رکھتا تھا لیکن جب ہم نقب زنی یا آتش زدگی کے انشیورنس پر آتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انشیورنس کمپنیاں قوانین اوسط کی بنا پر جؤا کھیلتی رہی ہیں ، یعنی جرائم کاری اور بے احتیاطی کے واضح انسانی خصائص پر ان قوانین کا اطلاق یقیناً نہیں ہو سکتا۔

(ب) موجودہ مغربی معاشرے کے صنعتی معاملات : صناعوں اور گاہکوں کے باہمی معاملات میں طلب و رسد کے نشیب و فراز پیش آتے رہے ہیں ؛ ان کے متعلق جو اعداد و شمار مدون ہوئے ، اُن کی بنا پر کاروبار کی گرم بازاری یا سرد بازاری کا فیصلہ ہوتا رہا لیکن تادم تحریر ان مختلف ادوار کے متعلق پورے یقین و وثوق سے کچھ کہنے کا طریقہ معلوم کیا نہیں جا سکا۔ انشیورنس کمپنیوں نے قدم آگے بڑھایا اور اپنے کاروبار کی ایک نئی شاخ کھول دی جس میں اہم خطرات کے لیے انشیورنس کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو لوگ سائنس کے اصول پر کام انجام دے رہے تھے ، اُنھوں نے بھی اب اس موضوع پر خاصی معلومات فراہم کر لی ہیں۔

صنعت کار مغربی معاشرے کی ذہنی تاریخ میں تجربات کی بنا پر تجارتی ادوار دریافت کر لیے گئے تھے اور یہ سب کچھ براہ راست اجتماعی مشاہدات کا نتیجہ تھا ،

اس وقت تک اعداد و شمار کے ذریعے سے اس کی توثیق نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ بیان پہلے پہل ۱۸۳۷ء میں ایک انگریز مبصر ایس - جے۔ لائڈ[1] نے پیش کیا جسے آگے چل کر لارڈ اوورسٹون[2] کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۷ء میں ایک کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی ، اس میں امریکہ کے ایک مفتش ادوار ڈبلیو - سی - مچل[3] نے اپنے اس عقیدے کا اعلان کیا کہ کاروبار میں نشیب و فراز کے جو دور آتے ہیں ، ان کے خصائص اقتصادی تنظیم کی نشو و ارتقا کے ساتھ بدلتے جائیں گے - کاروبار کے وقائع کا جو مجموعہ امریکہ کے ایک فاضل ڈبلیو - ایل - تھارپ[4] نے غیر اعدادی شہادت کی بنا پر مرتب کیا ، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے امریکہ کے ایک تیسرے فاضل ایف - سی - ملز[5] نے اندازہ کر لیا تھا کہ تجارتی دور کی کم سے کم مدت صنعت کاری کے ابتدائی مراحل میں ۵،۸۶ سال ہے ، پھر تیز تبدیلی کا دور آتا ہے جو ۴،۰۹ سال رہتا ہے - آخر میں وہ دور شروع ہوتا ہے جسے مقابلةً استقلال کا دور کہنا چاہیے ، یہ دور ۶،۳۹ سال کا ہوتا ہے -

دوسرے ماہرین اقتصادیات نے اپنے طور پر ادوار کی مدت تجویز کی ہے جن میں سے بعض نے اسے بہت بڑھا دیا ہے ، دوسرے لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ تغیرات آہستہ آہستہ ختم ہو کر توازن کی حیثیت پیدا کر سکتے ہیں - ابھی تک عمومی حیثیت میں اتفاق رائے نہیں ہوا اور سچی بات یہ ہے کہ چھان بین کا یہ شعبہ ہنوز ابتدائی حالت میں ہے اور ہمیں اس پر زیادہ بات چیت نہیں کرنی چاہیے - جو نکتہ ہم واضح کرنا چاہتے ہیں ، یہ ہے کہ برطانیہ کلاں میں صنعتی انقلاب بپا ہونے کے وقت سے دو سو سال کے اندر اندر مغربی اقتصادیات کے پیشوا اقتصادی تاریخ کے فراہم شدہ مواد سے ایسے قوانین اخذ کرنے کے لیے کوشاں تھے جو انسانی سرگرمیوں کے اقتصادی دائرے پر حاوی ہوں اور ان میں انسان کے واضح اوصاف و خصائص کار فرما ہوں -

(ج) علاقائی حکومتوں کی رقابتیں — توازن قوت : ہم یہ تو دیکھ چکے

۱- S. J. Loyd -
۲- Overstone -
۳- W. C. Mitchell -
۴- W. L. Thorp -
۵- F. C. Mills -

ہیں کہ ماہرین اقتصادیات اپنی تحقیقات کے نتائج سامنے رکھتے ہوئے اُن قوانین کی کار فرمائی معلوم کرنے کے درپے ہیں جن کا اطلاق اقتصادی تاریخ پر ہوتا ہے؛ اب ہماری توجہ طبعاً سرگرمیوں کے سیاسی دائرے کی طرف منعطف ہوتی ہے تاکہ معلوم ہو سکے آیا اس دائرے میں بھی ایسی کوئی چیز ملتی ہے؟ سیاسی دائرے میں عملیات کے جائزے کے لیے ہم اُن رقابتوں اور لڑائیوں کو انتخاب کرتے ہیں جو موجودہ مغربی دنیا کی علاقائی حکومتوں کے درمیان پیش آتی رہیں؛ مغربی تاریخ کا دور جدید پندرھویں صدی کے اختتام پر شروع ہوا جب الپس پار کے یورپ کا نظام حکومت اطالوی اصول کے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا، گویا ہمیں اپنی چھان بین کے لیے چار سو سال کے واقعات مل گئے۔

میکالے کے رجائی اندازے کے مطابق ''ہر طالب علم پر آشکارا ہے'' کہ چار ایسے مواقع پیش آئے جن میں انگریزوں یا برطانویوں نے اپنی جزائری وضعیت کی مقابلۃً محفوظ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے براعظم کی ایک بڑی طاقت کے حملوں کو روکا، پھر اسے تباہ کرنے میں امداد دی جو مغربی مسیحیت کے لیے ایک ہمہ گیر ریاست بہم پہنچانے کی پیش کش کر رہی تھی یا بالجبر ایسی ریاست قائم کر دینا چاہتی تھی یا ہم روایتی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ توازن قوت کو درہم برہم کر دینا چاہتی تھی۔ ان مواقع کے درمیان ایک سو سال سے اوپر کی مدت حائل ہے: پہلے موقع پر جارحانہ اقدام کا ذمہ دار ہسپانیہ تھا، ہسپانیہ کے بحری بیڑے کا حملہ ۱۵۸۸ء میں ہوا۔ دوسرے موقع پر لوئی چار دہم شاہ فرانس اقدام کا ذمہ دار تھا، اسے ۱۷۰۴ء میں بلینیئم[1] کے مقام پر شکست ہوئی؛ تیسرے موقع پر انقلابی فرانس اور نپولین نے یہ خطرہ پیدا کیا تھا، ۱۸۱۵ء میں واٹرلو کے مقام پر اس خطرے کا انسداد ہوا۔ چوتھا موقع جرمنی کے شہنشاہ ولہلم ثانی نے پیدا کیا، ۱۹۱۸ء میں یوم متارکہ پر یہ قصہ ختم ہوا؛ بعد ازاں ولہلم والے خطرے ہی نے ہٹلر کی شکل میں عود کیا، اس کا فیصلہ ۱۹۴۴ء میں

۱۔ Blenheim ۔ یہ مقام بویریا (جرمنی) میں ہے جہاں انگلستان کے مشہور سپہ سالار جان چرچل ڈیوک اف مارلبرو نے شان دار فتح حاصل کی تھی، اسی شخص کی اولاد میں وہ ونسٹن چرچل ہے۔ (مترجم)

نارمنڈی کے اندر ہوا - یہاں واضح طور پر ایک دوری نمونہ موجود ہے؛ اگر ہم جزیرے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو یہ چار بڑی جنگیں معلوم ہوں گی جو بہ لحاظ زمان حیرت انگیز باقاعدگی سے پیش آئیں ، ان میں سے ہر جنگ رزم و پیکار کی شدت اور دائرۂ رزم و پیکار کی وسعت کے اعتبار سے پہلی جنگ کے مقابلے میں زیادہ بڑی تھی - پہلی جنگ کا تعلق اُن حکومتوں سے تھا جو اوقیانوس سے تعلق رکھتی تھیں یعنی ہسپانیہ ، فرانس ، ہالینڈ اور انگلستان ؛ دوسری میں وسط یورپ کی حکومتیں شامل ہوئیں ، اس میں روس کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم روس اور سویڈن کی جنگ کو تاج و تخت ہسپانیہ کی جنگ کا ضمیمہ قرار دے دیں ؛ تیسری جنگ (جنگ نپولین) میں روس ایک ممتاز محارب کے طور پر شامل ہوا ، اس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم ۱۸۱۲ء کی جنگ کو محاربات نپولین کا ضمیمہ قرار دے لیں - چوتھی جنگ میں امریکہ ایک ممتاز محارب کے طور پر شامل ہوا اور اس کش مکش کی عمومی حیثیت صرف اسی حقیقت سے واضح ہو سکتی ہے کہ اس میں پے در پے جو ہنگامے پیش آئے ، انھیں پہلی عالم گیر جنگ اور دوسری عالم گیر جنگ قرار دیا گیا ہے -

دور جدید کے مغرب میں ہمہ گیر سلطنت کے قیام کو روکنے کے لیے جو چار جنگیں پیش آئیں ، اُن میں ہر پہلی جنگ اور اُس کے پیش رو کے درمیان تقریباً ایک صدی کا فصل ہے ؛ ان کے درمیان جو تین صدیاں ہیں ، اگر اُن کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بھی درمیانی یا اضافی جنگ یا جنگیں پیش آتی رہیں ، یہ تمام جنگیں بحیثیت مجموعی مغربی یورپ میں نہیں بلکہ اُس کے صرف مرکزی حصے یعنی جرمنی میں اقتدار کے لیے پیش آئیں - چوں کہ ان جنگوں کا تعلق واضح طور پر مغربی یورپ سے تھا لہٰذا برطانیہ نے یا تو اُن میں پورا حصہ نہ لیا یا بعض میں سرے سے دخل ہی نہ دیا - وہ یقینی طور پر اُن معلومات میں شامل نہیں ہیں جو ہر طالب علم پر آشکارا ہیں اور طالب علم سے مراد برطانوی طالب علم ہے - ان درمیانی جنگوں میں سے پہلی سی سالہ جنگ تھی (۱۶۱۸ء — ۱۶۴۸ء) ، دوسری میں زیادہ تر وہ لڑائیاں شامل تھیں جو پروشیا کے فریڈرک سے پیش آئیں (۱۷۴۰ء–۱۷۶۳ء)، تیسری قسم کی لڑائیاں وہ ہیں جنھیں بسمارک سے منسوب کیا گیا اگرچہ اُن کا دائرہ محدود تھا ، یہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۷۱ء تک جاری رہیں -

جنگ و صلح کے مختلف دوروں کا نقشہ

دور جدید اور متاخر دور جدید کی مغربی تاریخ میں جنگ و صلح کے جو دور پے در پے آتے رہے ، ان کا نقشہ ذیل میں درج ہے -

پہلو	ابتدا ۱۴۹۴ء—۱۵۶۸ء	پہلا باقاعدہ دور ۱۵۶۸ء—۱۶۷۲ء	دوسرا باقاعدہ دور ۱۶۷۲ء—۱۷۹۲ء	تیسرا باقاعدہ دور ۱۷۹۲ء—۱۹۱۴ء	چوتھا دور ۱۹۱۴ء
۱- تمہیدی (پیش آگاہی کی لڑائیاں)	...	...	۱۶۶۷ء—۱۶۶۸ء[۱]	...	۱۹۱۱ء—۱۹۱۲ء[۲]
۲- جنگ عام	۱۴۹۴ء—۱۵۲۵ء[۳]	۱۵۶۸ء—۱۶۰۹ء[۴]	۱۶۷۲ء—۱۷۱۳ء[۵]	۱۷۹۲ء—۱۸۱۵ء[۶]	۱۹۴۴—۱۹۴۵ء[۱۰]
۳- سستانے کا دور	۱۵۲۵ء—۱۵۳۶ء	۱۶۰۹ء—۱۶۱۸ء	۱۷۱۳ء—۱۷۳۳ء	۱۸۱۵ء—۱۸۴۸ء	...
۴- ضمنی جنگیں (خاتمہ)	۱۵۳۶ء—۱۵۵۹ء[۷]	۱۶۱۸ء—۱۶۴۸ء	۱۷۳۳ء—۱۷۶۳ء[۸]	۱۸۴۸ء—۱۸۷۱ء[۹]	...
۵- امن عام	۱۵۵۹ء—۱۵۶۸ء	۱۶۴۸ء—۱۶۷۲ء	۱۷۶۳ء—۱۷۹۲ء	۱۸۷۱ء—۱۹۱۴ء	...

۱- لوئی چہار دہم نے ہسپانوی نیدر لینڈز پر حملہ کیا -

۲- ترکی اور اٹلی کی جنگ ۱۹۱۱ء—۱۹۱۲ء ، ترکی اور بلقانی ریاستوں کی جنگ ۱۹۱۲ء—۱۹۱۳ء -

۳- ۱۴۹۴ء—۱۵۰۳ء ، ۱۵۱۰ء—۱۵۱۶ء اور ۱۵۲۱ء—۱۵۲۵ء -

۴- ۱۵۶۸ء—۱۶۰۹ء ، ہسپانیہ کی ہیپس برگ بادشاہی میں ، ۱۵۶۲ء—۱۵۹۸ء فرانس میں -

۵- ۱۶۷۲ء—۱۶۷۸ء ، ۱۶۸۸ء—۱۶۹۷ء ، ۱۷۰۲ء—۱۷۱۳ء -

۶- ۱۷۹۲ء—۱۸۰۲ء ، ۱۸۰۳ء—۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۵ء -

۷- ۱۵۳۶ء—۱۵۳۸ء ، ۱۵۴۲ء—۱۵۴۴ء (۱۵۴۴ء—۱۵۴۶ء اور ۱۵۴۹ء—۱۵۵۰ء انگلستان اور فرانس کا مقابلہ) ، (۱۵۴۶ء—۱۵۵۲ء مقدس رومی سلطنت میں پروٹسٹنٹ بادشاہوں کی جمعیت اور چارلس پنجم) ، ۱۵۵۲ء—۱۵۵۹ء -

۸- ۱۷۳۳ء—۱۷۳۵ء ، ۱۷۴۰ء—۱۷۴۸ء اور ۱۷۵۶ء—۱۷۶۳ء -

۹- ۱۸۴۸ء—۱۸۴۹ء ، ۱۸۵۳ء—۱۸۵۶ء ، ۱۸۵۹ء (۱۸۶۱ء—۱۸۶۵ء ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خانہ جنگی ۱۸۶۲ء—۱۸۶۷ء ، میکسیکو پر فرانسیسیوں کا قبضہ) ، ۱۸۶۴ء—۱۸۶۶ء ، ۱۸۷۰ء—۱۸۷۱ء -

۱۰- ۱۹۳۹ء—۱۹۴۵ء کی جنگ عظیم دراصل پہلی جنگ عظیم کا اعادہ ہی تھی، اس سے پیشتر کئی تمہیدی جنگیں ہوئیں مثلاً جاپان کا حملہ چین پر جس کا آغاز منچوریا سے ۱۹۳۱ء میں ہوا تھا ، اٹلی اور حبشہ کی جنگ ۱۹۳۵ء—۱۹۳۶ء جنگ ہسپانیہ ۱۹۳۶ء—۱۹۳۹ء - رھائن لینڈ میں ایک دن کی مہم ۷- مارچ ۱۹۳۶ء جس میں کوئی خون ریزی نہ ہوئی لیکن اس کا بدلہ سود در سود خون ریزی کے ساتھ ۱۹۳۹ء—۱۹۴۵ء کے قتل عام میں دینا پڑا -

آخر میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چار ایکٹ کے اس ڈرامے کی ایک تمہید بھی تھی جو ہسپانیہ کے بادشاہ فلپ ثانی سے شروع نہ ہوئی بلکہ دو نسل پیشتر ہیپس برگ ویلائیس کی اطالوی جنگوں سے اس کا آغاز ہوا۔ ابتدا کی کیفیت یہ ہے کہ چارلس ہشتم شاہ فرانس نے اٹلی پر حملہ کر دیا، یہ حملہ حد درجہ بے سود اور بے نتیجہ تھا لیکن خطرناک بھی تھا، یہ ۱۴۹۴ء میں ہوا۔ تعلیمی کام انجام دینے والے اکابر کہتے ہیں کہ اسی تاریخ پر قرون وسطیٰ کا آخری دور ختم ہوا اور یہیں سے عہد جدید کے ابتدائی دور کا آغاز سمجھنا چاہیے؛ اس سے دو سال پیشتر ہسپانیہ میں مسیحیوں نے مسلمانوں کے آخری علاقے فتح کر لیے تھے اور کولمبس جزائر غرب الہند میں پہلی مرتبہ لنگر انداز ہو چکا تھا۔

ان حالات کو ہم ایک نقشے کی صورت میں ترتیب دے سکتے ہیں؛ صلح و جنگ کے دوروں کا جائزہ لیا جائے تو سکندر کے بعد کی یونانی تاریخ اور کنفیوشیس کے بعد کی چینی تاریخ میں بھی یہی تاریخی نمونے ملتے ہیں، اُن کی وضع و ترتیب ہی یکساں نہیں بلکہ زمانی فصل بھی ویسے ہی ہیں، جیسے دور جدید کی مغربی تاریخ کے سلسلے میں بیان کیے گئے۔

(د) تہذیبوں کا انحلال: اگر ہم دور جدید کے مغربی معاشرے کی جنگوں کے دوری نمونے پر تھوڑی دیر کے لیے نگاہ باز گشت ڈالیں تو ہمیں یہ حیرت انگیز حقیقت معلوم ہوگی کہ یہ خلا میں پہیے کے چار مرتبہ گھومنے کا معاملہ نہیں کہ وہ گھومتا اور ہر مرتبہ پہلی وضع پر آتا رہا۔ پہیے کا یہ گھومنا دراصل ایک سڑک پر تھا اور اُس کی ایک خاص طور پر خوف انگیز سمت تھی۔ ایک طرف وہ حکومتیں ہیں جنھیں چار مرتبہ ایک طاقت ور اور بے باک و متکبر ہم سایے کے مقابلے میں دفاع کے لیے اکٹھے ہونا پڑا اور انجام کار اُس پر ثابت کر دیا کہ غرور ہی اُس کے زوال کا باعث بنا؛ دوسری طرف ایک نقطہ ہے جسے دوری نمونہ واضح نہیں کر سکا لیکن تاریخ کا سرسری علم بھی اُسے نمایاں کر سکتا ہے۔ ان میں سے ہر جنگ پہلی کے مقابلے میں زیادہ وسیع، زیادہ شدید، اخلاق اور مادی لحاظ سے زیادہ تباہ کن تھی۔ دوسرے معاشروں کی تاریخوں میں بھی اس قسم کے معاملات پیش آئے لیکن اُن کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگوں میں تمام محارب فریق صفحۂ ہستی سے محو ہو گئے، صرف ایک باقی رہ گیا جس نے ہمہ گیر سلطنت قائم کر لی؛ یونانی اور چینی

تاریخ کو اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

دوری آہنگ کا اپنے آپ کو فنا کر دینا پہلے بھی ہمارے پیش نظر آ چکا ہے جب ہم تہذیبوں کے انحلال پر غور کر رہے تھے، علاقائی حکومتوں کے درمیان تنازع للبقا کے لیے یہ عام رجحان ثابت ہوتا ہے؛ اس پر ہمیں حیران نہ ہونا چاہیے کہ عمل کے دو طریقوں کی آہنگ کے درمیان اتنا قرب ہے کہ یہ دو ایک دوسرے سے وابستہ معلوم ہوتی ہیں۔ ہم تہذیبوں کی شکستوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں سے انحلال کا آغاز ہوتا ہے، معلوم کر چکے ہیں کہ اکثر حالتوں میں ان علاقائی ریاستوں میں حد درجہ شدید لڑائیاں پھوٹ پڑتی ہیں جن سے معاشرہ مرتب ہوتا ہے اور یہی لڑائیاں معاشرے کی شکست کی علامت یا سبب بن جاتی ہیں۔ جب محارب علاقائی ریاستوں کی جگہ ایک زبردست سلطنت معرض وجود میں آ جاتی ہے تو تشدد کا انفجار کاملاً رک نہیں جاتا بلکہ نئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے مثلاً خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے یا مجلسی اعتبار سے کوئی بھونچال آ جاتا ہے اس طرح عمل انحلال جاری رہتا ہے اگرچہ عارضی طور پر کبھی کبھی رک بھی جاتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ علاقائی حکومتوں کی جنگوں کی طرح انحلالات زیر و بم کے مختلف سلسلوں میں سے گزرتی ہیں اور ہم مختلف مثالوں کے جائزوں سے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ پس پائی اور از سر نو اجتماع کا دوری زیر و بم جس میں انحلال کی طرف نمایاں رجحان مزاحمت کو توڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے، ساڑھے تین ضربوں کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ——— پس پائی از سر نو اجتماع، پس پائی از سر نو اجتماع، پس پائی از سر نو اجتماع، پس پائی ——— یوں تہذیب شکست سے آخری انتشار تک اپنا تاریخی سفر پورا کر لیتی ہے۔ پہلی شکست شکست یافتہ معاشرے کو دور مصائب کے حوالے کر دیتی ہے، یہ دور مصائب پہلی مرتبہ قوت مجتمع کر لینے سے ختم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد دوسرا اور زیادہ شدید دور پس پائی شروع ہو جاتا ہے؛ اس پس پائی کے بعد بحالی اور اجتماع قوت کا دوسرا دور آتا ہے جو نسبۃً پائدار ہوتا ہے۔ اسی میں ہمہ گیر سلطنت قائم ہوتی ہے۔ پھر آسے بھی پس پائی سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ایک مرتبہ قوت بحال کر لینے کے بعد شیرازۂ حیات آخری مرتبہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوگا کہ مجلسی انحلال کا ڈراما ——— اب تک کی نمائشوں کے

جائزے کی بنا پر ـــــــ توازن قوت کے ڈرامے کے مقابلے میں زیادہ معین اور زیادہ باقاعدہ پلاٹ کا حامل ہے۔ اگر ہمہ گیر سلطنتوں کے نقشے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا ـــــــ بشرطیکہ حالات و واقعات کی رفتار کسی اجنبی مجلسی اثر سے متاثر نہ ہو ـــــــ پس پائی از سر نو اجتماع، پس پائی اور زیادہ موثر بحالی میں کم و بیش چار سو سال کی مدت صرف ہوگی یعنی معاشرے کی ابتدائی شکست سے ہمہ گیر سلطنت کے قیام تک اتنا وقت لگے گا اور تقریباً اتنا ہی وقت ہمہ گیر سلطنت سے آخری انتشار تک مختلف مراحل اجتماع و پس پائی میں صرف ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ ہمہ گیر سلطنت آسانی سے خاتمہ قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ رومی سلطنت کی مثال ہمارے سامنے ہے؛ یہ ایڈریا نوپل کے حادثے کے وقت (۳۷۵ء) ان مغربی صوبوں کے اندر پارہ پارہ ہو چکی تھی جو مجلسی اعتبار سے پس‌ماندہ تھے (اور یہ واقعہ آگسٹس کے قیام سلطنت سے چار سو سال بعد پیش آیا) لیکن مشرق اور مرکزی صوبوں میں یہ سلطنت جسٹینین کی (وفات ۵۶۵ء) کے بعد معرض زوال میں آئی۔ اسی طرح مشرق بعید کی ھن سلطنت پر دوسری ضرب ۱۸۴ء میں لگی، پھر وہ تین سلطنتوں میں بٹ گئی لیکن انتشار سے پیشتر تھوڑی دیر کے لیے تینوں سلطنتیں متحد ہوگئی تھیں (۲۸۰ء—۳۱۷ء)۔

(۵) تہذیبوں کا نشو و ارتقا: جب ہم اجتماعی نشو و ارتقا کی طرف توجہ منعطف کرتے ہیں تو ہمیں ان نتائج کی یاد تازہ کر لینی چاہیے جو اس کتاب کے ایک ابتدائی حصے میں ہمارے سامنے آ چکے تھے یعنی انحلال کی طرح نشو و ارتقا میں بھی دوری زیر و بم ہی کی کیفیت نمایاں ہے۔ نشو و ارتقا کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب کوئی دعوت مقابلہ کام یاب جواب کا باعث بن جاتی ہے لیکن اس سے پھر ایک مختلف قسم کی دعوت مقابلہ پیش آ جاتی ہے۔ ہم اب تک کوئی ایسی داخلی وجہ دریافت نہیں کر سکے کہ کیوں یہ‌سلسلۂ عمل لا متناہی مدت تک جاری نہیں رہنا چاہیے؛ بے شک ہم جانتے ہیں کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت تک جو تہذیبیں معرض وجود میں آ چکیں، ان میں سے اکثریت نشو و ارتقا کو قائم رکھنے میں ناکام ہو چکی ہے اس لیے کہ بہت کم تہذیبیں چند مواقع کے سوا بہم ایسے جواب مہیا نہ کر سکیں جو پہلی دعوت مقابلہ کا بھی شافی جواب ہوتے اور اس سے پیدا ہونے والی نئی دعوت مقابلہ سے عہدہ برآ ہونے میں بھی مدد دیتے، اس آخری دعوت مقابلہ

کے لیے پہلے سے مختلف جواب کی ضرورت تھی ۔ یہ جو کچھ ہم کہ رہے ہیں ایک تاریخی حقیقت ہے ۔

مثلاً ہم دیکھ چکے ہیں کہ یونانی تہذیب کی تاریخ میں بربریوں کی طرف سے ایک دعوت مقابلہ پیش آئی جو انتظامات کا شیرازہ درہم برہم کر دینے والی تھی ؛ اس کے لیے ایک نئے سیاسی ادارے کی شکل میں موثر جواب سامنے آگیا ، اس سے مراد شہری ریاستوں کا ادارہ ہے ۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس جواب سے ایک نئی دعوت مقابلہ پیش ہوئی ، اس نے روز افزوں آبادی کی شکل اختیار کی اور اس کا تعلق اقتصادی سطح سے تھا ۔ اس دوسری دعوت مقابلہ نے متعدد متبادل جواب مہیا کیے جو موثریت میں یکساں نہ تھے مثلاً سپارٹا نے یہ تباہ کن جواب مہیا کیا کہ اپنے یونانی ہم سایوں کے اُن تمام علاقوں کو اپنے قبضے میں لے لیا جہاں غذائی جنسیں پیدا ہوتی تھیں ؛ اس کے برعکس کارنتھ اور کاسیڈیا نے آبادکاری کا جواب مہیا کیا جو صرف عارضی طور پر موثر تھا یعنی وہ لوگ وطنوں سے باہر نکل پڑے بحیرۂ روم کے مغربی طاس میں پس ماندہ لوگوں کی زمینیں چھین کر اپنی آبادیاں قائم کیں اور اُن میں کھیتی باڑی کرنے لگے ۔ ایتھنز نے وہ جواب مہیا کیا جو مستقل طور پر موثر تھا یعنی جب فونیقی اور ٹرھینی حریفوں کی مزاحمت نے جغرافیائی توسیع روک دی تو ایتھنز نے پھیلی ہوئی یونانی دنیا کی مجموعی پیداوار میں اضافہ شروع کر دیا ؛ اس غرض سے ایک اقتصادی انقلاب بپا کیا گیا ، کھیتی باڑی صرف ضرورت کے مطابق غذا مہیا کرنے تک موجود نہ رہی بلکہ ایسی فصلیں بوئی جانے لگیں جن سے فوراً رقمیں وصول ہو سکتی تھیں ۔ نیز مصنوعات کو ترقی دے کر ایسا بندوبست کر لیا گیا کہ انھیں باہر بھیجا جائے اور ان کے بدلے میں غذائی اور خام جنسیں درآمد کی جائیں ۔

اقتصادی دعوت مقابلہ کے اس کام یاب جواب نے سیاسی سطح پر ایک اور دعوت مقابلہ کا بندوبست کر دیا جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں ۔ اب یونانی دنیا کے مختلف حصے اقتصادی لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ گہری وابستگی پیدا کر چکے تھے اور اُن کے لیے قانون و نظم کے ایک ایسے سیاسی ڈھانچے کی ضرورت تھی جس کا پیمانہ ہمہ گیر ہوتا ، شہری ریاستوں کا وہ علاقائی نظام اُس یونانی معاشرے کے لیے بہ قدر ضرورت کفایت نہ کر سکتا

تھا جس نے مختلف منقطع میدانی خطوں میں زرعی اقتصادیات کے ایسے نظام کو جنم دیا تھا جو ان علاقوں کی عام ضرورتوں پر مبنی تھا کیوں کہ اب یونانی معاشرے کا اقتصادی نظام وحدانی صورت اختیار کر چکا تھا ۔ اس تیسری دعوت مقابلہ کے لیے بر وقت مناسب جواب مہیا نہ کیا گیا لہٰذا یونانی تہذیب کے نشو و ارتقا کا سلسلہ شکست سے محفوظ نہ رہ سکا ۔

مغربی تہذیب کے نشو و ارتقا میں بھی ہمیں پیہم ایسی دعوت ہائے مقابلہ کا سراغ ملتا ہے ، جن کے لیے کام یاب جواب مہیا کیے گئے تھے ۔ یہ سلسلہ یونانی سلسلے سے زیادہ لمبا ہے اس لیے کہ یہاں پہلی اور دوسری ہی نہیں بلکہ تیسری دعوت مقابلہ کا بھی کام یاب جواب مہیا کر دیا گیا ۔ پہلی دعوت مقابلہ اُسی نظم برانداز بربریت کی طرف سے پیش آئی جس سے یونانیوں کو سابقہ پڑا تھا ۔ اس کے لیے مغربی تہذیب نے جو جواب مہیا کیا ، وہ یونانیوں سے مختلف تھا ؛ مغربی تہذیب نے ایک ہمہ گیر کلیسائی نظام ہلڈی برنڈ کی قائم کردہ پاپائی کی شکل میں پیدا کر لیا ۔ اس پر دوسری دعوت مقابلہ پیش آئی ؛ مغربی مسیحیت کا دائرہ روز افزوں پھیل رہا تھا ، اُس نے اپنے اندر کلیسائی وحدت پیدا کرلی تھی ، لیکن علاقائی حکومتوں کا ایک ایسا نظام تیار کرنے کی ضرورت تھی جو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اصلح ہوتا چناں چہ اٹلی اور فلینڈرز میں یونانی شہری ریاستوں کے ادارے کو زندہ کرکے جواب مہیا کر دیاگیا ۔ یہ حل بعض خاص علاقوں میں تو اچھی خدمت انجام دے سکا لیکن جاگیردارانہ بادشاہیوں کے وسیع علاقوں کی ضرورتیں پوری نہ کر سکا ؛ سوال یہ تھا کہ اٹلی اور فلینڈرز نے شہری ریاستوں کے نظام کی بناء پر مغرب کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کے لیے جو اصلح علاقائی وسائل مہیا کر لیے تھے اور یوں مسئلے کا حل نکال لیا تھا ، آیا اٹلی اور فرانس کی اس صلاحیت کو وسیع قومی حدوں تک ترقی دے کر مغربی دنیا کے باقی حصوں کے لیے بھی ویسے ہی وسائل مہیا کیے جا سکتے تھے ؟

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انگلستان نے یہ مسئلہ حل کر دیا ؛ پہلے اس کا بندوبست سیاسی سطح پر کیا یعنی قرون وسطیٰ میں الپس پار کا جو ادارہ پارلیمنٹ کی شکل میں موجود تھا ، اُس میں صلاحیت کی روح پیدا کرلی ، پھر اقتصادی سطح پر آ کر صنعتی انقلاب کا بندوبست کر دیا ۔ مغرب کے اس صنعتی انقلاب نے تاریخ یونان میں ایتھنز کے اقتصادی انقلاب کی طرح علاقائی

اقتصادی خود مختاری کی جگہ مختلف علاقوں کے درمیان ہمہ گیر اقتصادی وابستگی پیدا کردی ؛ یوں مغربی تہذیب تیسری دعوت مقابلہ کا کام یاب جواب مہیا کر چکنے کے بعد ویسی ہی نئی دعوت مقابلہ سے دو چار ہو گئی جس سے دوسری دعوت مقابلہ کے کام یاب جواب کے بعد یونانی تہذیب کو سابقہ پڑا تھا ۔ یہ کتاب بیسویں صدی کے وسط میں لکھی جا رہی ہے ، اہل مغرب اب تک اس سیاسی دعوت مقابلہ کا کام یاب جواب مہیا نہ کر سکے لیکن انھیں اس خطرے کا پورا احساس ہو چکا ہے ۔

دو تہذیبوں کے نشو و ارتقا کے ان سرسری مناظر کا مشاہدہ یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ جس حد تک ان کی اجتماعی نشو و ارتقا کا تعلق ہے ، دعوت ہائے مقابلہ اور جوابات کی سلسلہ بندی میں دونوں کی کڑیاں یکساں نہیں لہٰذا اُن کی تاریخوں میں یکسانی نہیں پائی جاتی ۔ جن دوسری تہذیبوں کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ مہیا ہو چکا ہے ، اُن کی تاریخوں کا جائزہ لیا جائے تو مذکورہ بالا دعوے کی مزید توثیق ہوگی ؛ گویا ہماری موجودہ چھان بین کا نتیجہ یہ نکلا کہ تہذیبوں کی تاریخ ہائے نشو و ارتقا میں قوانین فطرت کا عمل بالکل غیر واضح ہوتا ہے ، اس کے برعکس انحلالات کی تاریخوں میں یہ بالکل واضح نظر آتا ہے ۔ آیندہ ایک باب میں ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ نشو و ارتقا کے عمل اور انحلال کے عمل کے درمیان بنیادی فرق کا طبعی نتیجہ ہے ۔

<u>(و) تقدیر کے خلاف کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا :</u> تہذیبوں کی تاریخوں میں قوانین فطرت کے عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ قوانین جس زیر و بم کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں ، وہ غیر مساوی قوت کے دو رجحانات کے درمیان کش مکش سے رو نما ہو سکتے ہیں : ایک رجحان بہت موثر ہوتا ہے اور بہ حیثیت عمومی اسی کو کام یابی حاصل ہوتی ہے ؛ دوسرا رجحان اس سے ذرا کم زور ہوتا ہے لیکن وہ متواتر مزاحمانہ حرکتوں میں نمایاں ہوتا رہتا ہے ۔ یوں کش مکش شروع ہو جاتی ہے ، کم زور رجحان ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور مزاحمت جاری رکھتا ہے ۔ یہی امر پے در پے دوری سلسلے کے اعادے کا باعث بنتا ہے ۔ قوی تر رجحان کی قوت سلسلے کو زود یا بہ دیر اختتام پر پہنچا دیتی ہے ۔

ہم علاقائی حکومتوں کے تنازع للبقا پر غور کرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں

کہ جنگوں کے تین یا چار دور آئے جن میں ایک فریق کی کوشش یہ تھی کہ توازن قوت درہم برہم ہو جائے ، دوسرے کی یہ تھی کہ توازن قوت قائم رہے ؛ نتیجہ بہ ہرحال یہ نکلا کہ توازن قوت درہم برہم ہو گیا - ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جو معاشرہ معرض شکست میں آ جائے اس کا رجحان انحلال کی طرف ہوتا ہے ، اس کے برعکس یہ کوشش بھی جاری رہتی ہے کہ اس کی زائل شدہ صحت بحال ہو جائے ؛ اس کا نتیجہ بھی بہ ہر حال انتشار ہوتا ہے - صنعت کار مغربی معاشرے کے اقتصادی معاملات میں قوانین فطرت کے عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ہم معلوم کر چکے ہیں کہ تجارتی ادوار کے ماہر محققوں نے مختلف پیش گوئیاں کیں ، ان سے واضح ہوتا تھا کہ ان دوری حرکتوں کو ان لہروں سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے جو پانی کی سطح پر پیدا ہوتی ہیں لیکن ایک مخصوص زیر و بم کے نشیب و فراز میں سے گزرتی ہوئی انجام کار بالکل ختم ہو جاتی ہیں - اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی یاد کر لینا چاہیے کہ انحلال پذیر تہذیب اور اس کے حاشیے سے باہر کے منحرف بربری جتھوں کے درمیان جہاں کہیں متحرک جنگ نے ایک ہمہ گیر سلطنت کے حواشی پر ساکن جنگ کی صورت اختیار کی وہاں وقت مدافعین کے خلاف عمل کرتا ہے اور بربری حملہ آوروں کو فائدہ پہنچاتا ہے یہاں تک کہ آخرکار بند ٹوٹ جاتا ہے اور بربری یورش کا سیلاب سابقہ اجتماعی نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے -

ان تمام مثالوں سے ہماری عمومی دریافت کی توضیح ہوتی ہے کہ انسانی تاریخ میں دوری حرکات گاڑی کے پہیوں کی مادی حرکات کی طرح اپنے مسلسل اور غیر دل چسپ دور سے ایک اور حرکت پیدا کرتی ہیں جس کا زیر و بم مقابلۃً زیادہ طویل ہوتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی ایک سمت میں قدم آگے بڑھاتا ہے یہاں تک کہ انجام کار منزل مقصود سامنے آ جاتی ہے اور منزل پر پہنچتے ہی حرکت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی سند نہیں جس کی بنا پر ایک رجحان کی دوسرے پر کامیابیوں کو ہم قوانین فطرت کی توضیح کا ذریعہ سمجھ لیں - تجربیاتی مشاہدے کی بناء پر حقائق لازماً غیر متبدل تقدیر کا نتیجہ نہیں ہوتے ؛ اس کا ثبوت مہیا کرنا لا ادری کے ذمے نہیں بلکہ جبری کے ذمے ہے ، شپینگلر اپنی ادعائی اور غیر موثق جبریت کے باوجود اس حقیقت کا اندازہ نہ کر سکا -

بہ ہرحال تاریخ میں قانون اور آزادی کے درمیان کوئی فیصلہ کیے بغیر ہم چاہتے ہیں کہ بہت سے دوسرے واقعات پیش نظر لے آئیں جن میں کسی نہ کسی رجحان نے اس کے خلاف مسلسل بغاوتوں کے سلسلے میں مزاحمت کا بندوبست کیا۔ اس کے بعد ہم اپنے استدلال کو آگے بڑھائیں گے؛ متصادم قوتوں کے درمیان اس قسم کی مفاھمتوں میں شپینگلر کو تقدیر کا ھاتھ نظر آیا لیکن سوال یہ ھے کہ ناگزیری کا یہ ادعا صحیح تھا یا غلط، حق تھا یا باطل؟ شپینگلر نے اس پہلو کے اثبات کی کوئی کوشش نہیں کی، ہم اسے اس صورت حال پر غور و خوض سے شروع کریں گے جو جنوبی اور مغربی ایشیا میں یونانیوں کے فوجی اقتدار کے ذریعے سے پیدا ھوئی تھی۔

ایسی یونانی اقتدار پر ابھی پورے ایک ہزار سال بھی نہ گزرے تھے کہ ساتویں صدی مسیحی میں مسلمان عربوں کے جنگی گروھوں نے اس کا تختہ آلٹ دیا؛ کوہ طارس کے جنوب میں یونانیت ایک اجنبی ثقافت کے سوا کوئی حیثیت حاصل نہ کر سکی، جگہ جگہ یونانی شہروں کی جو چوکیاں قائم ھو چکی تھیں اور جو غیر یونانی شہر یونانیت کے زیر اثرات آ چکے تھے، ان سے اثرات کی کم زور کرنیں ان سریانی اور مصری مفصلات میں پہنچ رہی تھیں جو باھر کے کسی اثر کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ دوسروں کو ھمہ گیر انداز میں اپنا حلقہ بہ‌گوش بنا لینے کے سلسلے میں یونانیت کی صلاحیت کا اس وقت تجربہ ھو چکا تھا جب یونانیت کے سب سے بڑے داعی سلیوکی بادشاہ اینٹیاکس اپی فینز[1] (عہد حکومت ۱۷۵ء—۱۶۳ ق—م) نے یروشلم کو انطاکیہ کی مانند یونانیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی تھی۔ اس ثقافتی فوجی اقدام کی زبردست شکست سے صاف واضح ھو گیا کہ باھر سے آئی ھوئی یہ ثقافت انجام کار کاملاً محو ھو جائے گی؛ یہ بیمار کی حیثیت میں اس وجہ سے صدیوں تک قائم رہی کہ سلیوکی اور بطلیموسی خاندانوں میں ضعف کے آثار نمودار ھوئے تو معاملات کی باگ دوڑ رومیوں نے سنبھال لی۔

یونانیوں نے سریانی اور مصری معاشروں پر اپنا اقتدار فوجی قوت کے بل پر عائد کیا تھا، اسی بل پر قائم رکھا جب تک مفتوح معاشروں نے فوجی قوت کا جواب مہیا نہ کر لیا، وہ متواتر شکستیں کھاتے رہے۔ اس کہانی

۱- Antiochus Epipbanes -

کا اگلا باب یہ ہے کہ تیسری صدی مسیحی میں مشرق صوبوں کی پوری آبادیاں مسیحیت کی حلقہ بہ گوش بن گئیں ؛ اس طرح ضمناً یونانیت کے لیے وہ کام انجام پا گیا جو اینٹیاکس نے انجام دینا چاہا تھا مگر ناکام رہا۔ انھیں صوبوں میں کیتھولک کلیسا نے دھقانی رعایا کو اپنی جانب کھینچ لیا، ساتھ ہی اُن پر یونانی برتری قائم کر دی ۔ چوں کہ مسیحیت یونانی لباس میں فاتحانہ اقدامات کر رہی تھی لہٰذا بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ مشرق لوگ پہلے جس ثقافت کو سختی سے ٹھکراتے رہے تھے اس لیے کہ وہ ان کے سامنے خالص اور غیر مستور حیثیت میں پیش کی گئی تھی، اب انھوں نے اسے نادانستہ مسیحیت کے بھیس میں قبول کر لیا ہے لیکن یہ اندازہ غلط تھا ۔ بے شک اُن لوگوں نے مسیحیت کو یونانیت کے لباس میں قبول کر لیا تھا لیکن بعد ازاں اسے یونانیت کے لباس سے عاری کرنے لگے ؛ چناں چہ انھوں نے کئی ملحدانہ طریقے قبول کر لیے جن میں سے پہلا نسطوریت تھا ۔ یوں ان مشرقی لوگوں نے مذھبی مباحث کی غیر عسکری شکل میں یونانیت کی مزاحمت شروع کر دی اور ثقافتی جنگ کی نئی ٹکنیک دریافت کر لی جس کی بناء پر وہ آگے چل کر کام‌یاب ہوئے۔

یونانی ثقافت کے خلاف یہ جارحانہ اقدامات صدیوں تک دوری شکل میں جاری رہے اور ہم اُن سے بہ خوبی آشنا ھیں ۔ پہلے نسطوریوں کو عروج حاصل ہوا، وہ کم زور ہوئے تو یعقوبیوں نے اُن کی جگہ لے لی، پھر اسلام کا سیل آ گیا جو اپنے آگے کی ہر چیز کو بہا لے گیا ۔ اسلامی فتوحات کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ عسکری فتوحات کا بھونڈا طریقہ اختیار کر لینے کا نتیجہ تھیں ؛ یہ سچ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان عربوں کے جو عسکری گروہ باھر نکلے تھے، وہ گاندھی اور ٹالسٹائے کے تشدد سے پاک غیر مزاحمانہ طریقوں کے داعی نہ تھے ۔ انھوں نے ۶۳۲ء—۶۴۰ء کے درمیان شام، فلسطین اور مصر کو مسخر کر لیا لیکن یہ ایسی ہی فتح تھی جیسی گری بالڈی نے ۱۸۶۰ء میں حاصل کی تھی ۔ وہ ایک ھزار سرخ پوش رضا کاروں کو ساتھ لے کر نکلا جن کے پاس دو توپیں تھیں، یہ توپیں بھی محض نمائش کے طور پر لے لی گئی تھیں اور اُن میں ڈالنے کے لیے گولہ بارود موجود نہ تھا ؛ بہ ایں ھمہ اس نے سسلی اور نیپلز کو مسخر کر لیا ۔ اٹلی کی وحدت کا فوجی مبلغ اس وجہ سے سسلی اور نیپلز کی سلطنت کو مسخر کر سکا کہ یہ دونوں

علاقے مسخر ہونے کے لیے تیار بیٹھے تھے ؛ رومی سلطنت کے مشرقی صوبوں میں جو لوگ آباد تھے ، اُن کے احساسات عرب کے عسکری گروہوں کے متعلق اُن احساسات سے کاملاً مختلف نہ تھے جو گری بالڈی کے متعلق سسلی اور نیپلز کے لوگوں میں محفوظ تھے[۱]۔

جو مثال ہم اوپر پیش کر چکے ہیں اُس سے واضح ہے کہ غیر مطلوب یکسانی کے خلاف ملحدانہ احتجاجات یکے بعد دیگرے ہوئے لیکن تیسرا احتجاج کام‌یاب ہوا ۔ بارھویں صدی مسیحی کی تاریخ فرانس بھی یہی نمونہ پیش کرتی ہے لیکن اُس کا سیاق مختلف ہے ۔ بارھویں صدی سے فرانس کا کیتھولک کلیسا مسلسل اس کوشش میں لگا رہا کہ فرانس کے اندر ایک کیتھولک ملک کی حیثیت میں کلیسائی وحدت قائم کر دے ، اس کوشش میں تھوڑی دیر کے لیے صرف عارضی کام یابیاں حاصل ہو سکیں ؛ اس کے برعکس علاحدگی کی لہریں کوئی نہ کوئی نئی شکل اختیار کر کے بار بار اُٹھتی رہیں ۔ بارھویں صدی میں جنوبی فرانس کے اندر کیتھولک مذہب کے خلاف پہلی بغاوت ہوئی جس نے کیتھر ازم[۲] کی شکل اختیار کی ۔ اسے تیرھویں صدی میں دبا دیا گیا لیکن سولھویں صدی میں اس نے اُسی خطے کے اندر کیلون ازم[۳] کی حیثیت اختیار کرلی؛ کیلون ازم کو ممنوع قرار دے دیا گیا تو اس نے جنسین ازم[۴] کا لباس پہن کر

۱۔ جو تاریخی حالات ہمارے سامنے ہیں ، اُن کی بنا پر مصنف کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے ۔ مسلمانوں کو ابتدائی دور میں مسیحی اور یہودی عوام سے بھی کسی قسم کی اعانت یا ہم دردی نہ ملی البتہ خدمت خلق کے ۔ مثالی مظاہرے دیکھ چکنے کے بعد نہ محض عیسائیوں اور یہودیوں بلکہ زرتشتوں نے بھی مسلمانوں کا زیادہ سے زیادہ خیر مقدم کیا ۔ (مترجم)

۲۔ Catharism ۔ یہ مسیحی مذہب کو اُن عناصر سے پاک کرنے کی ایک تحریک تھی جو باہر سے اُس میں شامل ہو چکے تھے ۔ (مترجم)

۳۔ Calvianism ۔ کیلون ایک فرانسیسی عالم دین تھا، اُس کی تحریک بھی یہی تھی کہ عیسائیت کو غیر مسیحی عناصر سے پاک کیا جائے اور اُس کی تحریک کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ (مترجم)

۴۔ Jansenism ۔ جین سن ہالینڈ کا ایک عالم دین تھا ، اُس نے سینٹ اگسٹائن کی دینیات کا از سر نو احیاء کیا تھا اور ایک گروہ اُس کی تعلیمات کی اشاعت پر لگ گیا ۔ (مترجم)

از سر نو ظہور کیا ۔ کیتھولک مذہب کے اندر کیلون ازم سے قریب تر ہونے کی یہی ایک صورت تھی ؛ جب جنسین ازم کی بھی ممانعت ہو گئی تو اُس نے کئی شکلیں اختیار کر لیں مثلاً ڈی ازم[1] (عقیدۂ دین فطرت) ، ریشنل ازم (عقلیت) ، لا ادریت اور دہریت ۔

ہم دوسرے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں کہ یہودیوں کی توحید کے خلاف بھی مسلسل شرک کی لہریں اُٹھتی رہیں اور یہودیوں میں ایک سچے خدا کا جو تصور پیدا ہوا تھا ، اُس نے بھی کئی مرتبہ خدا کو مجسم دیکھنے کی آرزو کا لباس پہنا ۔ توحید نے بعل اور اشتر کی پوجا روک دی تھی لیکن اُس خدائے غیور کے ممنوع رقیبوں نے چھپ چھپا کر آرتھوڈکس یہودیوں کے حلقے میں باز حاصل کر لیا اور وہ ''خدا کے کلام'' ، ''عقل کل'' اور ''ملائکہ'' کی شکل اختیار کرکے اندر پہنچ گئے ؛ آگے چل کر انھوں نے مقدس تثلیث میں خدا کے جسم ، خون ، خدا کی ماں ، اولیاء وغیرہ کے لباس اختیار کر لیے ۔ شرک کے ان تصرفات کے خلاف اسلامی توحید درجۂ کمال پر پہنچ گئی ۔ پروٹسٹنٹوں نے بھی ایک حد تک اسی کی پیروی کی ؛ مذہب کو تمام غیر مناسب اثرات سے پاک کر دینے کی ان دو تحریکوں کے بعد روح کے اندر خداؤں کے تعدد کے لیے ایک ناقابل برداشت بھوک پیدا ہوگئی ۔ یہ دراصل کائنات کی طبعی قوتوں کے نمائشی تعدد کا عکس تھا ۔

۲۔ تاریخ میں قوانین فطرت کے رواج کی ممکن توجیہات

ہم نے اس کتاب میں اعادوں اور یکسانیوں کے جو سلسلے دیکھے ، اگر انھیں حقیقت مان لیا جائے تو اُن کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں ؛ جو قانون اس سلسلے میں کارفرما ہیں، وہ یا تو انسان کے غیر انسانی ماحول میں جاری و ساری ہیں اور باہر سے تاریخ کی رفتار پر اثر انداز ہوتے ہیں یا وہ قوانین انسانی فطرت کی نفسیاتی ترکیب اور عمل میں مضمر ہیں ۔ ہم سب سے پہلے اولین حصے پر غور کریں گے ۔

مثال کے طور پر روز و شب کا دور عام لوگوں کی روزانہ زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن پیش نظر موضوع کے سلسلے میں ہم اسے خارج از بحث قرار

۱۔ Deism ۔ خدا کا اقرار لیکن وحی سے انکار ۔ (مترجم)

نہیں دے سکے ، انسان نے ابتدائی حالت سے جتنی ترقی کی اتنا ہی وہ رات کو ضرورت کے مطابق دن بنانے کے قابل ہوگیا ۔ ہیئت کا ایک اور چکر جس کا حلقہ بہ گوش ایک زمانے میں انسان بنا ہوا تھا ، موسموں کا سالانہ دور تھا ۔ لینٹ[1] عیسائیوں کے لیے مجاہدۂ نفس کی تقریب بن گیا ، اس کی وجہ کیا ہے ؟ ہزاروں سال گزرے جب مسیحیت کا ظہور بھی نہ ہوا تھا موسم سرما کے اواخر میں انسان کے ذخیرہ ہائے خوراک ختم ہو جاتے تھے اور اس کے سامنے یہ سوال آ جاتا تھا کہ یہ صورت حال روحانی اعتبار سے اس کے لیے اچھی ہے یا نہیں ؟ لیکن اہل مغرب اور ان کے طور طریقے اختیار کرنے والوں نے فطرت کے اس قانون سے بھی آزادی حاصل کرلی ، انھوں نے ایسے مال گدام ایجاد کیے جن میں چیزیں کبھی خراب نہ ہو سکتی تھیں اور حمل و نقل کے وسیلوں کے ذریعے سے زمین کی پوری سطح کے ہر حصے کو دوسرے سے ملا دیا ؛ چناں‌چہ اب ہر انسان دنیا کے ہر حصے میں ہر موسم کے اندر گوشت ، سبزی ، میوہ یا پھل خرید سکتا ہے بشرطیکہ اس کی جیب میں پیسے ہوں ۔

یہ سالانہ دور جس سے ہم آگاہ ہیں ، تنہا ہیئتی کا چکر نہ تھا جس کے تابع زمین کی پوری پیداوار تھی اور اس وجہ سے انسان کو بھی بالواسطہ اس کا غلام بننا پڑا کیوں کہ غذا کے لیے اس کا انحصار کھیتی باڑی پر تھا ۔ دور حاضر کے موسم شناسوں نے موسموں کے ایسے دور دریافت کیے ہیں جن کی میعاد بہت لمبی ہے ۔ ہم چھان بین کے دوران میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ خانہ بہ‌دوش لوگ صحرائی علاقوں میں سے اُبل کر زرخیز علاقوں میں پہنچتے ہیں تو یہ کام بھی ایک خاص موسمی دور میں انجام پاتا ہے جس کی معیار چھ سو سال سے کم نہیں ۔ ان دوروں میں نمی اور خشکی کے کئی تبادل چکر آئے ، یہ مفروضہ چکر کتاب کی ترتیب کے وقت اتنا واضح اور معین معلوم نہیں ہوتا جتنے کہ اس قسم کے دوسرے چکر ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ موسموں اور فصلوں کے ان چکروں اور بعض ماہرین اقتصادیات کے تجویز کردہ اقتصادی صنعتی چکروں کے درمیان ہم آہنگی ہے لیکن ماہرین فن کی بہت بڑی اکثریت کی رائے اس کے خلاف ہے ۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں اسٹینلے جیونس[2] چھان بین کے

۱- Lent ۔ ایسٹر سے پیشتر کے چالیس دن کا زمانہ جس میں عیسائی مجاہدۂ نفس پر خاص زور دیتے ہیں ۔ (مترجم)

۲- Stanley Jevons ۔

علم داروں میں سے تھا ؛ اس نے یہ رائے پیش کی ہے کہ تجارتی دوروں میں جو نشیب و فراز آتے ہیں ، وہ سورج کی شعاعوں کا اثر ہوتے ہیں ، آج کل اس رائے کو حقیقت نہیں دی جاتی - جیونس نے خود بعد میں مان لیا تھا کہ تجارت میں وقتاً فوقتاً جو اختلا لات پیدا ہوتے ہیں ، وہ اصلاً ذہنی ہوتے ہیں یعنی وہ یاس و اُمید ، جوش و افسردگی اور ہراس کے ادل بدل پر موقوف ہیں[1] -

اے - سی - پگو[2] کیمرج کا ایک ماہر اقتصادیات ہے ، اُس نے ۱۹۲۹ء میں یہ رائے پیش کی تھی کہ صنعتی سرگرمیوں میں جو نشیب و فراز آتے ہیں ، اُن میں فیصلہ کن عامل کے لحاظ سے فصلوں کے نشیب و فراز کو حقیقتاً کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن جس وقت وہ لکھ رہا تھا اُس وقت یہ اہمیت پچاس یا سو سال پیشتر سے بہت کم رہ گئی تھی - جی - ہبلر[3] نے پگو سے بارہ سال بعد لکھتے ہوئے یہی رائے پیش کی تھی ، اُس کا اقتباس یہاں اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ مستند اقتصادی رائے کا نمونہ ہے :

''خوش حالی کی ترقی و نشو و نما کی طرح اُس کا زوال بھی - - - - باہر کے اختلاط انگیز اسباب کا نتیجہ نہیں بلکہ اُن سرگرمیوں کا نتیجہ ہے جو کاروبار کی دنیا کے اندر باقاعدگی سے جاری ہیں''۔

''ان نشیب و فراز کے متعلق پُر اسرار امر یہ ہے کہ اُن کی توجیہ ایسے خارجی اسباب کی بنا پر نہیں کی جا سکتی جیسے یہ کہ موسمی حالات نے فصلوں کو نقصان پہنچایا یا وبائیں پھیل گئیں یا عام ہڑتالیں ہوئیں یا مزدوروں کو کارخانوں میں آنے نہ دیا یا بھونچال آ گئے یا بین الاقوامی تجارت کے راستوں میں اچانک رکاوٹ پیدا ہوگی یا ایسے ہی دوسری چیزیں''۔

''فصلوں کی خرابی یا لڑائیوں ، بھونچالوں یا پیداوار کے

۱- جیونس کی کتاب ''مالیات اور سکوں کے متعلق تحقیق''، صفحہ ۱۸۴ -

۲- Pigou -

۳- Haberler -

عمل میں خلل ڈالنے والے ایسے ھی دوسرے مادی اسباب کی بنا پر مقدار پیداوار یا آمدنی یا دائرہ ملازمت میں جو شدید تخفیف ہوتی ھے ، اُس سے اقتصادی نظام پر بہ حیثیت مجموعی شاذ ھی اثر پڑتا ھے اور کار و بار کے دوری نظریے کی فنی اصطلاح میں اسے کساد بازاری کا سبب نہیں مانا جا سکتا ؛ فنی اصطلاح کے مطابق کساد بازاری کے معنی یہ ھیں کہ پیداوار کی مقدار ، آمدنی یا ملازمتوں میں طویل مدت تک نمایاں کمی ہوتی رھے - اس کی توجیہ اُن عوامل کے عمل کی بنا پر کی جا سکتی ھے جو اقتصادی نظام کے اندر پیدا ہوتے ھیں ؛ اس سلسلے میں اولین سبب یہ ھے کہ مالی طلب ناکافی ہو یا کسی چیز کی ساخت اور قیمت میں شرح منافع مناسب نہ ہو ''۔

'' مختلف وجوہ کی بنا پر مطلوب یہ ھے کہ کاروباری دوروں کی توجیہ کے سلسلے میں بیرونی اختلاط کے اثر کو کم سے کم اھمیت دی جائے - - - - کاروباری دوروں کی تشکیل میں خود کار و باری نظام کے جوابات کو بداھةً بیرونی ملکوں کی ضربوں کے مقابلے میں زیادہ اھمیت حاصل ھے ، ثانیاً تاریخی تجربات سے یہ ظاھر ہوتا ھے کہ دوری تحریک میں استقلال کا زبردست رجحان موجود ھے اور یہ رجحان وھاں بھی پایا جاتا ھے جہاں خارجی اثرات کا خفیف سا شائبہ تک موجود نہیں کہ ان پر ذمہ داری ڈالی جا سکے - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ خود ھمارے اقتصادی نظام میں عدم استحکام مضمر ھے یعنی ایک سمت یا دوسری سمت حرکت کا رجحان موجود ھے''[۱]-

ایک اور بہت مختلف طبعی دور ھے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یعنی انسانوں کی پیدائش ، نشو و ارتقا ، نسل کشی ، بڑھاپا اور موت کے دور ھیں - تاریخ کے ایک مخصوص میدان میں اس کی اھمیت اُس گفتگو سے واضح

۱- ھبلر کی کتاب خوش حال اور کساد بازی صفحہ نمبر ۱۰ -

ہو سکتی ہے جو راقم کتاب کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں ہوئی تھی جب ریاست نیویارک کے شہر ٹرائے میں مجھے ایک لنچ دیا گیا تھا۔ میرے لیے نشست کی جو جگہ تجویز ہوئی تھی وہ مقامی محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر کے ساتھ تھی، میں نے پوچھا کہ آپ پر عہدے کی جوگوناگوں ذمہ داریاں ہیں، اُن میں سے کون سی چیز ہے جسے آپ سب سے زیادہ دل چسپ سمجھتے ہیں؟ اُس نے جواب دیا: جب میں آبا و اجداد کے لیے انگریزی کے اسباق کا بندوبست کرتا ہوں۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر سوال کر دیا کہ اس ملک کی بولی انگریزی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزی زبان پر عبور حاصل کیے بغیر کوئی شخص دادا جان کی عمر کو کیوں کر پہنچ سکتا ہے؟ ڈائرکٹر نے جواب دیا ''ریاستہاے متحدہ امریکہ میں کلر بنانے کا سب سے بڑا مرکز ٹرائے ہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء میں جو قانون بنے اُن کی بنا پر باہر سے آنے والوں کے لیے پابندیاں عائد ہوگئیں۔ اس سے پہلے جن لوگوں سے کام لیا جاتا تھا وہ زیادہ تر اجنبی تارکین وطن اور ان کے خاندانوں میں سے لیے جاتے تھے۔ اب جو لوگ باہر کے ملکوں سے یہاں آتے ہیں، وہ اپنے ہم جنسوں سے جس حد تک ممکن ہو، وابستگی پیدا کر لیتے ہیں۔ چناں چہ ایک ہی نسل کے تارکین وطن ایک ہی قسم کے کارخانوں میں پہلو بہ پہلو کام شروع کر دیتے ہیں اور وہ مزدوروں کے مختلف بلاکوں میں ایک دوسرے کے پاس رہتے ہیں۔ یوں جب اُن کی ملازمت کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے تو انگریزی زبان میں اُنھیں بہت کم مہارت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اس زبان سے اسی قدر شناسا ہوتے ہیں جتنے کہ امریکہ پہنچنے کے وقت تھے۔ خود امریکہ کے اندر زندگی بسر کرنے کے دوران میں اُنھیں اس امر کے زیادہ جاننے کا موقع نہیں مل سکتا کہ وہ اپنے ترجمانوں کے ذریعے سے بات چیت کرتے رہتے ہیں، اُن کے بچے ابتدائی عمر ہی میں امریکہ آ گئے تھے اور اُنھیں کارخانوں میں داخل ہونے سے پیشتر سکولوں میں داخل ہونا پڑا؛ یوں مثال کے طور پر انھوں نے اطالوی بچوں کے ساتھ امریکی تعلیم پائی تو اُنھیں دو زبانوں میں مہارت حاصل ہو گئی، وہ کارخانوں، بازاروں اور سٹوروں میں انگریزی بولتے لیکن اپنے گھروں میں جاتے تو آبا و اجداد سے اطالوی میں بات چیت کرتے۔ اس طرح نا دانستہ مگر متواتر ایک زبان کے بعد دوسری زبان استعمال کرتے رہے، کسی سعی و کوشش کے بغیر دو زبانوں میں بات چیت کر لینا اُن کے آبا کے لیے خاص

سہولت کا باعث ثابت ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اُن کے آبا انگریزی کی وہ شد بد بھی بھول گئے جو انھوں نے کارخانے میں کام کرنے کے وقت حاصل کی تھی لیکن معاملہ یہاں پر ختم نہیں ہوتا۔ جو لوگ ترک وطن کرکے آئے تھے، اُنھوں نے اپنے ہم قوموں میں شادیاں کیں اور بچے پیدا کیے، اس تیسری نسل کے لیے انگریزی گھروں اور سکولوں دونوں کی زبان بن گئی۔ چونکہ اُن کے والدین نے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تعلیم پا کر شادیاں کی تھیں اس لیے ان میں سے بعض اوقات کوئی ایک غیر اطالوی النسل ہوتا، وہ آپس کی بات چیت میں انگریزی زبان ہی استعمال کرتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو زبانیں بولنے والے والدین کے جو بچے امریکہ میں پیدا ہوئے، وہ اجداد کی مادری اطالوی زبان نہ جانتے تھے اور اُنھیں استعمال کرنے کی کبھی ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اُنھیں کوئی ایسی اجنبی زبان بولنے کی ضرورت نہ تھی جو اُنھیں اصل کے اعتبار سے غیر امریکی بنا دیتی حالاں کہ وہ اپنی غیر امریکی نسل کو بالکل بھلا دینا چاہتے تھے؛ اس طرح اجداد پر واضح ہوا کہ ان کے پوتے پوتیاں اُس زبان میں بات چیت کے لیے آمادہ نہیں ہوسکتے جس سے وہ خود واقف تھے۔ غرض ان حالات میں اُنھیں بڑھاپے کے وقت خود اپنے اخلاف کے ساتھ بات چیت کے لیے انگریزی زبان سیکھنے کی مصیبت برداشت کرنی پڑی؛ اطالویوں اور براعظم یورپ کے دوسرے لوگوں کے لیے جو انگریزی زبان نہیں بولتے تھے اور اُن کے درمیان کنبہ داری کے رشتے بڑے ہی مستحکم تھے، یہ صورت حال ناقابل برداشت ہوگئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُنھیں ایک ایسی غیر جاذب زبان پر عبور حاصل کرنے کی تحریک ہوئی جو اُن کے اختیار کردہ وطن کی زبان تھی؛ چناں چہ گذشتہ سال اُنھوں نے امداد کی درخواست کی اور میں نے اُن کے لیے خاص اسباق کا انتظام کر دیا۔ اگرچہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں غیر زبان سیکھنا بہت مشکل ہے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ اجداد کے لیے انگریزی کے یہ اسباق حد درجہ کام یاب ہوئے اور ہمارے محکمے نے اب تک جتنے کام اپنے ہاتھ میں لیے، ان سب سے زیادہ دل خوش کن کام یہ تھا''۔

ٹرانے کی اس داستان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح تین نسلوں نے دو متواتر اوقاف شعری کے بعد ایک مجلسی قلب ماہیت کا بندوبست ہوا؛ یہ بندوبست ایک نسل کے نمائندے اپنی زندگی میں پایۂ اتمام تک نہ پہنچا سکتے

تھے - جس عمل سے اطالوی خاندان نے امریکی خاندان کی شکل اختیار کرلی، اُسے ایک زندگی کی اصطلاحات میں نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے ، تین نسلوں کے تعامل کے بغیر یہ چیز پوری نہ ہو سکتی تھی - جب ہم اپنی توجہ قومیت کے تغیرات سے ہٹا کر مذہب اور طبقے کے تغیرات پر جاتے ہیں تو یہاں بھی ہم پر واضح ہوتا ہے کہ فرد نہیں بلکہ خاندان ہی اس تغیر کا قابل فہم یونٹ ہے - موجودہ دور کے انگلستان میں طبقاتی احساسات بڑے تیز تھے ، ۱۹۵۲ء میں راقم الحروف کی نظروں کے سامنے یہ احساسات تیزی سے محو ہونے لگے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ نچلے درجے کے طبقۂ وسطیٰ کے کسی خاندان یا مزدوروں کے خاندان کو درجۂ ''شرافت'' حاصل کرنے میں عموماً تین نسلیں گزارنی پڑتیں - مذہب کے دائرے میں بھی یہی معیار درست معلوم ہوتا ہے ، رومی دنیا میں لامذہبی کے استیصال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہنشاہ تھیوڈوسئس اول مسیحی پیدا ہؤا ، وہ ناقابل برداشت حد تک مسیحیت کا شیدائی تھا ، اُس نے دوسری نسل میں کانسٹنٹائن اول کی پیروی نہ کی تھی جو لامذہبی کو چھوڑ کر مسیحی بن گیا تھا بلکہ تیسری نسل میں پیروی کی - تیرھویں صدی کے فرانس میں پروٹسٹنٹ مذہب کے استیصال کی تاریخ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے ، وہاں بھی ناقابل برداشت حد تک مسیحیت کے شیدائی لوئی چہار دھم اور اُس کے دادا ہنری چہارم کے درمیان اتنا ہی وقفہ ہے - لوئی کیتھولک پیدا ہوا - ہنری ایک زمانے میں کیلون کا پیرو رہ چکا تھا ، فرانس میں انیسویں اور بیسویں صدی کے موڑ پر بھی ان لا ادریوں یا دھریوں کے پوتے پوتیوں کو سچے اور مخلص کیتھولک بنانے میں اتنا ہی وقت لگا جنھوں نے از سر نو کیتھولک مذہب قبول کرلیا تھا اور کلیسا نے اُن نگاھوں میں نئی ایک قدر و قیمت پیدا کرلی تھی - وہ سمجھتے تھے کہ یہی ایک روایتی ادارہ ہے جو اشتراکیت اور اس قسم کے دوسرے نظریات سے بچاؤ کے لیے حد فاصل کا کام دے سکتا ہے ، اگر یہ نظریات کامیاب ہو گئے تو سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان اقتصادی عدم مساوات ختم ہو جائے گی - سریائی دنیا پر نظر ڈالیں تو اموی خلافت کے ماتحت بھی یہی صورت حال پیش آئی ؛ جن زرتشتیوں اور مسیحیوں نے اس وجہ سے اسلام قبول کیا تھا کہ ابتدائی دور کے مسلمان عرب حاکموں کی نظر میں درجۂ اعتبار حاصل کرنے کی یہ ایک اچھی صورت تھی، اُن کے اخلاف کو سچے اور

مخلص مسلمان بننے میں بھی تین ھی نسلیں لگیں ۔ اموی حکومت کا نصب العین یہ تھا کہ فاتح کی برتری تسلیم کی جائے ؛ یہ حکومت تین نسلوں تک قائم رھی، جو لوگ اس کے ابتدائی دور میں مسلمان ھوئے تھے اُن کی تیسری نسل تاریخ کی سطح پر پہنچ گئی ۔ عربوں کے اقتدار کے اموی کارندوں کو عباسی داعیوں نے ختم کر دیا جو کہتے تھے کہ اسلام کے مذھبی اصول کے مطابق تمام مسلمان برابر ھیں ۔ جن لوگوں نے اس وجہ سے اسلام قبول کیا تھا کہ ایسی ضرورت پیش آ گئی تھی اُن کی تیسری نسل نے مسلم عرب فاتحین کے اختلاف سے پنجہ آزمائی کی ۔

اگر مذھب، طبقے اور قومیت کے تین دائروں میں تین نسلوں کی سلسلہ بندی ھی مجلسی تغیرات کا باقاعدہ نفسیاتی ذریعہ ثابت ھوتی ھے تو تعجب نہ ھونا چاھیے اگر ھمارے سامنے یہ حقیقت نمودار ھو کہ بین الاقوامی سیاسیات کے دائرے میں ویسا ھی کردار ادا کرنے کے لیے چار نسلوں کی سلسلہ بندی درکار ھے ۔ ھم تہذیبوں کے مقابلوں کا مسئلہ سامنے رکھتے ھوئے دیکھ چکے ھیں کہ اھل علم کا طبقہ پیدا کرنے اور اُس طبقے کے لیے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ھو جانے میں بہ طور اوسط ایک سو سینتیس سال کی مدت لگتی ھے ، اس کی تین یا چار مثالیں بھی پیش کی جا چکی ھیں ۔ یہ معلوم کر لینا مشکل نہیں کہ چار نسلوں کی سلسلہ بندی ھی سے جنگ اور صلح کے چکر کی درمیانی مدت کا اندازہ ھو سکے گا بشرطیکہ ھم فرض کر لیں کہ ھمہ گیر جنگ کے علائم و شدائد نفس پر زیادہ گہرا اثر ڈالتے ھیں اور ھلکے درجے کی ضمنی جنگیں ویسا اثر نہیں ڈالتیں ۔ اگر ھم اس اصل کو دور حاضر کے یورپ میں جنگ و صلح کے چکر پر استعمال کریں تو ھمارے سامنے ایک بہت بڑی رکاوٹ کھڑی ھو جائے گی ؛ ھم پر واضح ھوتا ھے کہ ایک ضمنی جنگ نے مثلاً (سی سالہ جنگ جو اگرچہ صرف مرکزی یورپ تک محدود تھی) اپنے محدود جغرافیائی حلقے میں جو تباھی پھیلائی ، اُس کا مقابلہ پیشتر یا بعد کی عام جنگیں بھی نہیں کر سکتیں ۔

جنگ و صلح کا یہ چکر اُن قاعدوں یا تواترات میں سے نہ آخری ھے اور نہ طویل ترین جن کی کیفیت معلوم کرنے کے ھم در پے ھیں ۔

سو سال یا اس سے لگ بھگ مدت کے چکروں یا دوروں میں سے ہر ایک ایک لمبے سلسلے کی کڑی ہے جسے بہ‌حیثیت مجموعی ہم نے دور مصائب قرار دیا اور یہ دور تہذیب کے معرض شکست میں آنے سے شروع ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر یونانی اور چینی تاریخ میں اس دور نے سلطنت عام کی حیثیت اختیار کر لی ، اس میں بھی وہی زیر و بم نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے ؛ یہ پورا عمل آغاز سے انجام تک بہ حیثیت عمومی آٹھ سو یا ایک ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے ۔ کیا انسانی معاملات میں قواعد و ضوابط کی یہ نفسیاتی تشریح جو اب تک ہمیں کام دیتی رہی یہاں بھی سود مند ہوگی ؟ ہمارا جواب لازماً نفی میں ہونا چاہیے اگر ہماری نگاہوں میں نفس کی صرف ذہنی اور ارادی سطح ہو اور نفس بہ حیثیت مجموعی نہ ہو ۔

راقم الحروف کے عہد میں مغربی دنیا کے اندر نفسیات کی مغربی سائنس ابھی ابتدائی حالت میں ہے لیکن اس علم کے علم دار اپنی چھان بین کو خاصا آگے لے جا چکے ہیں ۔ اس چھان بین کی بنا پر سی ۔ جی ۔ جنگ[1] کو یہ کہنے کے لیے مواد مل گئے کہ تحت الشعور کی خلیج جس کی سطح پر ہر انفرادی انسانی شخصیت کی شعوری ذہنیت اور ارادہ تیرتے ہیں ، غیر معین افراتفری کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ بجائے خود ایک منظم کائنات ہے جس میں نفسیاتی سرگرمی کی ہر تہ کو نیچے کی تہ سے الگ کیا جا سکتا ہے ۔ سطح کے قریب تر جو تہ ہے ، وہ شخصی تحت الشعور معلوم ہوتا ہے جو ہر انفرادی شخصیت نے اپنے تجربات کی بنا پر اپنی زندگی کے دوران میں حاصل کیا اور عمیق ترین تہ جس تک چھان بین کرنے والے پہنچ سکے ہیں ، ایک نسلی تحت الشعور معلوم ہوتا ہے جو کسی انسان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ مشترک ہے اس لیے کہ جو ابتدائی تصورات وہاں موجود ہیں ، وہ عالم انسانیت کے مشترک تجربات کا عکس ہیں جو نوع بشر نے ابتدائی دور میں فراہم کیے اگرچہ ان کا تعلق اُس دور سے نہ ہو جب بشر انسانیت کا مکمل درجہ حاصل کر چکا تھا ۔ اس بنا پر یہ کہنا شاید غیر معقول نہ سمجھا جائے کہ تحت الشعور کی سب سے اوپر کی اور سب سے نیچے کی تہوں کے درمیان جنہیں مغربی سائنس دان اب تک بروئے کار لا چکے ہیں اور بھی تہیں ہوں گی جو نہ

۱- C. G. Jung ۔

نسلی تجربات نے فراہم کیں اور نہ شخصی تجربات نے بلکہ فرد کے اوپر کے اور نسل کے نیچے کے اجتماعی تجربات سے پیدا ہوئیں مثلاً تجربات کی ایسی تہیں ہوسکتی ہیں جو ایک خاندان یا ایک قوم یا ایک معاشرے کے مشترکہ تجربات پر مبنی ہوں اور اگر اُن ابتدائی تصورات کی سطح کے بعد جو پورے عالم انسانیت میں مشترک ہیں، ایسے تصورات مل جائیں جو کسی خاص معاشرے کے مخصوص اوصاف کے مظہر ہوں تو نفس پر ان کے اثرات کو دیکھ کر ہم اُن میعادوں کی طوالت کا اندازہ کرسکتے ہیں جو بعض مجلسی اور اجتماعی اعمال کی تکمیل میں صرف ہوئیں۔

مثلاً ایک اجتماعی تصور جو کسی ارتقاپذیر تہذیب کے انسانوں کی تحت الشعور نفسیاتی زندگی میں واضح طور پر موجود ہونا چاہیے، وہ علاقائی حکومتوں کا بت ہے۔ ہم پورے وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ اس بت نے اپنے پجاریوں سے ویسی ہی خوفناک قربانیاں وصول کر لینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جیسی قرطاجنہ والے بعل کے سامنے یا بنگالی جگرناتھ کے سامنے پیش کرتے تھے، یہ لوگ اُس شیطان کے شکار بنے جسے انہوں نے خود پیدا کیا تھا۔ اس تلخ تجربے کے لیے ایک زندگی نہیں تین نسلوں کے چکر کی سلسلہ بندی نہیں بلکہ کم از کم چار سو سال کی مدت درکار ہے، اُس وقت ان لوگوں کو احساس ہوگا کہ اس ملعون بت پرستی کو اپنے دلوں سے نکال کر باہر پھینک دینا چاہیے۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اس کام میں چار سو سال نہیں آٹھ سو سال یا ایک ہزار سال لگ جائیں؛ اُس وقت وہ تہذیب کے اس ڈھانچے سے پوری طرح۔ تعلق ہو سکیں گے جس کے شکست و انحلال کو دور مصائب نے نمایاں کیا۔ پھر وہ اُسی نوع کے ایک دوسرے معاشرے یا مختلف نوع کے معاشرے کا اثر قبول کرنے کے قابل ہو جائیں گے جس کی نمائندگی اعلیٰ مذاہب کر رہے ہیں۔ نظر بہ ظاہر تہذیب کا تصور تحت الشعور کے لیے علاقائی حکومتوں کے تصور سے زیادہ قوی ہوتا ہے جو علاقائی حکومتوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے بشرطیکہ کوئی ہمہ گیر سلطنت پیدا نہ ہو۔ اسی ذہنی نقطۂ نگاہ کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ جب ایک ہمہ گیر سلطنت قائم ہو جاتی ہے تو بعض اوقات اپنی سابقہ رعایا کے قلوب کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے کامیاب ہو سکتی ہے بلکہ اپنے آپ کو تباہ کرنے والوں کے قلوب پر بھی نسلوں یا صدیوں تک قابض رکھ سکتی ہے اگرچہ اس کی افادی

حیثیت اور قوت اتنی ہی تکلیف دہ ہو گئی ہو جتنی کہ اس کی ختم کی ہوئی علاقائی ریاستوں کی تھی :

> ایک بالغ نسل کے نمائندوں کو جو بیرونی تشویشات محسوس ہوتی ہیں ، یہ تشویشات ان لوگوں کی مجلسی وضعیت کا براہ راست نتیجہ ہوتی ہیں جو انہیں محسوس کرتے ہیں اور نئی نسل میں ان لوگوں کے اخلاف کی تشویشات کے درمیان تعلق وسیع پیمانے پر ایک خاص اہمیت کا مالک ہے - یکے بعد دیگرے آنے والی نسلیں فرد کے نفسیاتی نشو و ارتقا یا تاریخی تغیرات پر جو چھاپ لگا جاتی ہیں ، وہ ایسی چیز ہے جسے ہم ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے اسی وقت اہل بنیں گے جب موجودہ دور کے مقابلے میں اپنے مشاہدات کے اخذ سے زیادہ قابلیت پیدا کر لیں گے اور جب ہمارے اندر نسلوں کے لمبے سلسلے کے آغاز میں تاریخی غور و فکر کی صلاحیت رونما ہوگی[1] -

تہذیبوں کی تاریخوں میں جو اجتماعی قوانین مروج ہیں ، وہ دراصل آن نفسیاتی قوانین کا عکس ہیں جو تحت الشعور کی ذات سے نیچے کی سطح پر حاوی ہیں - اس سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ یہ قوانین شکست یافتہ تہذیب کے دور انحلال میں کیوں اتنے واضح اور معین طور پر باقاعدہ نظر آتے ہیں ، اس کے دور نشو و ارتقا میں ان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی -

اگرچہ نشو و ارتقا اور انحلال دونوں کا تجزیہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دعوت مقابلہ اور جوابات کے ہنگاموں کا سلسلہ سامنے رکھ لیا جائے لیکن ہمارے لیے کوئی ایسی مدت دریافت کر لینا ممکن نہیں جو پے در پے کشاکشوں کے سلسلوں میں معیاری حیثیت اختیار کر سکے جن سے معاشرے کو دور ارتقا میں گزرنا پڑتا ہے ؛ خواہ ہم مختلف دعوت ہائے مقابلہ کی میعاد ناپ لیں یا موثر جوابات کے وقفوں کو سامنے رکھ لیں - ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ دور نشو و ارتقا میں یہ یکے بعد دیگرے پیش آنے والی دعوت ہائے مقابلہ اور یکے بعد دیگرے پیش کیے جانے والے جوابات حد درجہ مختلف ہوتے ہیں ، ہم یہ بھی دیکھ چکے

۱- این - الیاس (N. Elias) کی جرمن کتاب -

ہیں کہ انحلال کے مختلف مراحل پر ایک ہی قسم کی دعوت ہائے مقابلہ پے در پے پیش آتی ہیں اس لیے کہ انحلال پذیر معاشرہ آن سے عہدہ برآ ہونے کا کوئی بند و بست نہیں کر سکتا - یہ بھی واضح ہے کہ مجلسی انحلال کی تمام مثالوں میں جو ہم اب تک فراہم کرسکے ہیں ، وہی مراحل اُسی ترتیب سے لازماً پیش آتے ہیں ؛ ہر مرحلے کی میعاد تقریباً یکساں ہوتی ہے یہاں تک کہ دور انحلال بہ حیثیت مجموعی ایک مسلسل عمل کی تصویر پیش کرتا ہے اور ہر سلسلے میں اُس کی میعاد بھی یکساں ہوتی ہے - جب مجلسی شکست واقع ہوتی ہے تو امتیاز و تنوع کا وہ رجحان جو نشو و ارتقا کے دوز میں نمایاں ہوتا ہے ، ختم ہو جاتا ہے اور اُس کی جگہ یکسانی لے لیتی ہے ؛ یہ یکسانی زود یا بہ دیر بیرونی مداخلت پر بھی قابو پا لیتی ہے اور اندر کے داخلی انحرافات پر بھی -

مثال کے طور پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب پہلے ایک سریائی ہمہ گیر سلطنت ، پھر ایک ہندی ہمہ گیر سلطنت یونانی تہذیب کی قبل از وقت مداخلت کے باعث تباہ ہو گئی (حالاں کہ وہ اپنی طبعی معیاد پوری نہ کر سکی تھی) تو ضرب خوردہ اور غرق شدہ معاشرہ اُس وقت تک جاں بحق نہ ہوا (اور نہ ہو سکتا تھا) جب تک اُس نے اپنا وہ دور پورا نہ کرلیا جو شکست یافتہ معاشرے کے انحلال کے لیے لازم ہے - بیرونی مجلس قوت کے اختلال انگیز اثر کے با وجودیہ سلطنت پھر اُس دور میں پہنچی جہاں اس کا سفر ختم ہوا تھا اور ایک نئی ہمہ گیر سلطنت کی شکل میں نمایاں ہوئی ، اس طرح اُس نے اپنی میعاد پوری کر لی -

مجلسی انحلال سے مظاہر کی باقاعدگی اور یکسانی نیز دور نشو و ارتقا کے مظاہر کا تنوع سامنے رکھ لیجیے ؛ ان کے درمیان جو نمایاں فرق ہے وہ اس کتاب میں تاریخی حقیقت کے طور پر بارہا بیان کیا جا چکا ہے لیکن اب تک اُس کے اسباب و عوامل بیان کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی - کتاب کے زیر غور حصے میں انسانی معاملات کے اندر قانون اور آزادی کا درمیانی تعلق زیر غور ہے لٰہذا ہمارے لیے لازم ہے کہ مسئلے کے اس پہلو کی طرف بھی توجہ کریں - اس کے حل کی کلید اُس فرق میں ملے گی جو ذی شعور شخصیت کی نفس کی سطح پر اور اس کے نیچے کی نفسی زندگی کے تحت الشعور کی سطح پر دونوں کی فطرتوں میں پایا جاتا ہے -

شعور کے عطیے سے جو امتیازی قوت حاصل ہوتی ہے، وہ انتخاب کی آزادی

ہے - اگر ہم سمجھ لیں کہ دور نشو و ارتقا کی ایک خصوصیت اضافی آزادی بھی ہے تو امید رکھنی چاہیے کہ ان حالات میں جس حد تک انسان اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں، وہ وہی راستہ اختیار کریں گے جو ٹیڑھا ہوگا یعنی قوانین قدرت کے قاعدوں سے انحراف کی طرف مائل ہوں گے - آزادی کی یہ حکم‌رانی جو قوانین قدرت کو معطل رکھتی ہے، اس لحاظ سے غیر مستقل ہے کہ اس کا انحصار دو کڑی شرطوں کے ایفأ پر ہے: پہلی شرط یہ ہے کہ ذی شعور شخصیت نفس کی تحت الشعور دنیا کو ارادے اور عقل کے کنٹرول میں رکھے؛ دوسری شرط یہ ہے کہ اسے دوسری ذی شعور شخصیتوں کے ساتھ اتحاد و اتفاق سے رہنا چاہیے جن کے درمیان یہ زندگی بسر کرتی ہے اور اس غرض سے یہاں کی فانی زندگی میں فیصلے کی کوئی صورت نکال لینی چاہیے- انسان انسان بننے سے پہلے مجلسی حیوان تھا اور مجلسی حیوان بننے سے پہلے اس کے اندر جنسی قویٰ موجود تھے - آزادی کے استعمال کے لیے یہ دو ضروری شرطیں ایک دوسری سے لازم و ملزوم ہیں - اگر یہ درست ہے کہ بدمعاش آپس میں لڑ پڑیں گے اور دیانت دار آدمیوں کو آگے آ جانے کا موقع مل جائے گا تو یہ بھی سچ ہے کہ جب افراد آپس میں لڑنے لگیں گے تو تحت الشعوری نفس سب کے قابو سے باہر نکل جائے گا -

عطیہ شعور کا وظیفہ یہ ہے کہ قوانین قدرت کو نفس کی تحت الشعور خلیج پر حکم رانی کا جو منصب حاصل ہے، اس سے انسانی روحوں کو نجات دلائے لیکن اگر اس حربے کو مختلف شخصیتوں کے درمیان برادر کشی کے لیے استعمال کیا جائے تو اس غلط استعمال سے اصل مقصد فوت ہو جا سکتا ہے - انسانی نفس کی ترکیب و عمل سے ان درد انگیز انحرافات کی حقیقی علت واضح ہو جاتی ہے اور اس کے لیے بوسوے کے اس نظریے کی طرف جانے کی ضرورت نہیں جو حسن عقیدت سے سراسر خالی ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ قادر مطلق لیکن غیور خدا کی طرف سے خاص مداخلت کا متقاضی ہے تاکہ انسانی ارادے ایک دوسرے سے لڑ بھڑ کر نحیف و کمزور ہوتے جائیں اور ایک دوسرے کو محو کر ڈالیں -

۳- قوانین قدرت اور تاریخ

اگر مذکورہ بالا جائزے کی بناء پر ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ انسانی معاملات

بھی قانون قدرت کی تابع ھیں اور اس دائرے میں ان قوانین کے رواج کی تشریح و توضیح بھی کم از کم ایک حد تک ضرور کی جا سکتی ھے تو اب ھم یہ نکتہ زیر غور لاسکتے ھیں کہ جو قوانین قدرت تاریخ میں جاری و ساری ھیں، آیا وہ اٹل اور ناقابل تبدیل ھیں یا آیا انھیں ضبط و نظم میں لایا جا سکتا ھے؟ اگر ھم اپنے پہلے طریق تحقیق پر قائم رھیں یعنی انسانی فطرت کے قوانین کو زیر غور لانے سے پیشتر غیر انسانی قوانین قدرت پر غور کریں تو معلوم ھوگا کہ جس حد تک آخرالذکر قوانین کا تعلق ھے، ھم سابقہ باب میں اس سوال کا شافی جواب دے چکے ھیں۔

مختصر جواب یہ ھے؛ اگرچہ انسان کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ غیر انسانی قوانین قدرت کے ایک جزئے میں بھی رد و بدل کر سکے اور نہ وہ ان کے عمل کو روک سکتا ھے لیکن وہ ان قوانین کے اثرات کو متاثر کر سکتا ھے بشرطیکہ وہ اپنی طرز و روش ان خطوط کے مطابق رکھے جن کے مطابق یہ قوانین اس کے مقاصد کے لیے مفید ھوں۔ جس ''شاعر'' کا اقتباس پہلے دیا جا چکا ھے، اس کا مدعا یہی تھا جب اس نے کہا تھا:

> جب سائنس دان کچھ اور چیزیں دریافت کرلیں گے تو ھم
> پہلے سے زیادہ خوش ھوں گے۔

اھل مغرب نے انسانی معاملات پر غیرانسانی قوانین قدرت کے اثرات کو گھٹانے میں اس حد تک کام یابی حاصل کر لی کہ اس کی بناء پر بیمے کی شرح میں کمی ھوگئی۔ پہلے سفر کے نقشوں میں اصلاح ھوئی، پھر جہازوں پر لاسلکی اور راڈر لگا دیے گئے؛ اس وجہ سے جہازوں کی تباھی کے خطرات میں تخفیف ھوگئی۔ جنوبی کیلی فورنیا میں کیڑوں مکوڑوں کو بھگانے کے لیے آگ جلانے کا بندوبست کیا گیا، وادی کنکٹی کٹ میں باریک اور مہین پردوں کا انتظام کر لیا گیا، اس طرح فصلوں کے لیے پالے وغیرہ کے خطرات میں کمی آ گئی۔ فصلوں، درختوں اور ریوڑوں کے جراثیم کا خطرہ تھا، اس کی روک تھام کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے مثلاً ٹیکہ کرنا، دوائیں چھڑکنا، ایسے سیالات سے مختلف چیزوں کو غسل دینا جو جراثیم کو ھلاک کر ڈالیں۔ خود انسانوں کے لیے بھی بہت سی تدبیریں اختیار کی گئیں جن کی وجہ سے بیماریوں کا خطرہ گھٹ گیا اور زندگی طویل تر ھو جانے کی امید پیدا ھوگئی۔

جب ھم انسانی فطرت کے قوانین کی دنیا میں آتے ھیں تو معلوم ھوتا ھے

کہ کہانی تو وہی ہے البتہ اسے پیش کرنے کے انداز میں ھچکچاھٹ آ گئی ہے۔ تعلیم اور ڈسپلن میں اصلاحات کی بنا پر مختلف اقسام کے حوادث کا خطرہ یقیناً کم کر لیا گیا ہے، نقب زنی کی وارداتیں بھی ان مجلسی احوال و خصائص کی کیفیت بدلنے سے کم سے کم ہوگئی ہے جن میں نقب زن پرورش پاتے تھے یعنی یہ چیز بھی مجلسی بہبود کے وسائل کے تابع ہے۔

جب اہل مغرب کی اقتصادی سرگرمیوں کے متبادل مد و جزر کو زیر غور لاتے ہیں جنھیں تجارتی دور کہا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے سے خاص تعلق رکھنے والے لوگ قابل ضبط و نظم عوامل اور ناقابل ضبط و نظم عوامل میں فرق کرتے ہیں۔ ایک طبقہ تو اس حد تک چلا گیا ہے کہ دور سرمایہ دار بینکروں کے ارادی عمل کا نتیجہ تھے، اکثریت کی رائے یہ ہے کہ بینکروں کے شعوری عمل کا حصہ ان میں کم ہے اور زیادہ حصہ خیال و احساس کی ناقابل ضبط سرگرمی کا ہے جو نفس کی نچلی سطحوں سے ابھرتے ہیں لہٰذا "بینکروں پر نظر رکھو" کے بجائے "عورت پر نظر رکھو"[1] کے عام جملے سے واضح ہو سکتا ہے کہ اس دائرے کے بلند پایہ محققین کا رجحان کس طرف ہے:

> روپیہ پیدا کرنے کے بجائے، روپیہ خرچ کرنے کو پس ماندہ ھنر قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ روپیہ خرچ کرنے کے سلسلے میں کنبہ سب سے بڑا یونٹ ہے اور روپیہ پیدا کرنے کے سلسلے میں کنبے پر ایک اعلیٰ درجے کا منظم یونٹ فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ گھر کے انتظام کی ذمہ دار خاتون جو چیزوں کا بڑا حصہ خریدا کرتی ہے، انتظامی صلاحیت کی بنا پر منتخب نہیں کی جاتی اور نہ عدم صلاحیت کی بنا پر اسے الگ کیا جاتا ہے اور اگر وہ اپنے کام میں پوری قابلیت کا ثبوت فراہم بھی کر دے تو اس کے انتظامی دائرے میں ہرگز توسیع نہ ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ اس امر پر حیرت نہ ہونی چاہیے کہ دنیا نے "صرف" کے بارے میں جو کچھ سیکھا ہے،

۱۔ یہ ایک فرانسیسی مثل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو فتنہ پیدا ہو، اس کی تہ میں عورت ہوتی ہے۔ (مترجم)

اس میں صارفین کا حصہ بہت کم ہے اور صانعین کا حصہ
زیادہ ہے جو اپنے سامان کے لیے نئی منڈی کے دروازے
کھولنا چاہتے تھے[۱]۔

ان امور کو پیش نظر رکھ لینے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کاروباری سرگرمیوں میں نشیب و فراز کا سلسلہ اس وقت تک ضبط و نظم کی گرفت میں نہ آسکے گا جب تک صرف کے یونٹ کنبے رہیں گے اور پیداوار کے یونٹ حریف افراد یا فرمیں یا حکومتیں جن کے متصادم ارادوں کے باعث اقتصادی دائرہ تحت الشعور نفسی قوتوں کی جولانیوں کے لیے کھلا رہے گا۔ عبرانی پیغمبر حضرت یوسف علیہ‌السلام نے ھکسوس بادشاھوں کے آخری دور میں مصری دنیا کے اندر اقتصادی ناظم کی حیثیت میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی یعنی جب غلہ شاداب سنین میں کثرت سے پیدا ہوا تو اس کا زائد حصہ سنین قحط کے لیے روک رکھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ جو دنیا اقتصادی لحاظ سے مغربیت اختیار کر چکی تھی، وہ عالم‌گیر ہونے پر مذکورہ بالا مثال کی پیروی نہ کرتی حالاں‌کہ اس کا دائرۂ عمل روے زمین پر پھیل چکا تھا؛ کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ کیوں کل کوئی تاریخی روسی یوسف عالم انسانیت کی تمام اقتصادی ضروریات کو ایک مرکز کے ضبط و نظم میں نہ لے آئے، یہ ضبط و نظم خیر اندیشی پر مبنی ہو یا بد اندیشی پر لیکن اس کا تذکرہ حضرت موسیٰ[۲] یا مارکس کے فکر و خیال کی توسیع ترین پرواز سے بہت آگے نکل جائے گا۔

اب ہم کاروبار کے دور کو چھوڑتے ھیں جس کی میعاد چند سال سے زیادہ نہیں اور نسلی دور پر آتے ھیں جس کا طول موج ربع صدی اور ایک تہائی صدی کے درمیان ہے۔ یہاں ھمیں معلوم ہوتا ہے کہ ثقافتی میراث میں ضیاع کا جو اندیشہ ہوتا ہے، اسے مادی سطح پر چھاپے، تصویروں اور اس قسم کی دوسری تدبیروں کے ذریعے سے اور روحانی سطح پر نشر و اشاعت تعلیم کے ذریعے گھٹایا جا رہا ہے۔

ھماری موجودہ چھان بین اور تحقیق کے نتائج تاحال بہت حوصلہ افزا معلوم

۱- ڈبلیو، سی مچل (Mitchell) کی کتاب، ''کاروبار کے دور، مسئلہ اور اس کا پس منظر''۔ (نیویارک ۱۹۲۷ء) صفحہ ۱۶۲—۱۶۶۔

ہوتے ہیں۔ لیکن جب مجلسی طرق عمل پر پہنچتے ہیں جن کا طول موج بہت وسیع اور دور رس ہوتا ہے (مثلاً وہ رنج افزا پہیا جو شکست و انحلال کی دس صدیوں میں گھومتا چلا جاتا ہے) تو ہم ایک سوال سے دو چار ہوتے ہیں۔ مغربی دنیا کے اندر ایک نسل میں دوسری مرتبہ جنگ عظیم چھڑ جانے کے وقت یہ سوال اکثر اہل مغرب کے سامنے پیش ہوتا رہا کہ جب کوئی تہذیب معرض شکست میں آ جاتی ہے تو آیا غلط راستے پر لگ جانے کے بعد رکے بغیر بڑھی چلی جاتی ہے تا آنکہ انجام کو پہنچ جاتی ہے یا غلطی سے متنبہ ہو کر لوٹ بھی جاتی ہے؟ محض تہذیب میں انسانی تاریخ کے مطالعے سے راقم الحروف کے مغربی معاصروں کو جو گہری دل چسپی ہے، اس کا سب سے بڑا عمل محرک بلاشبہ یہی ہے کہ وہ ان تاریخی نتائج سے اپنی تہذیب کی سرگزشت میں کام لے سکیں جب کہ وہ تہذیب ایک خطرناک موڑ پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس نازک ساعت میں مغربی اقوام اور ان سے کہیں بڑھ کر اہل امریکہ رہ نما ذمہ داری کے بوجھ سے پوری طرح آگاہ تھے اور ماضی کے تجربات سے اپنی روشنی حاصل کرنے کے اشتیاق میں وہ عقل کے واحد انسانی سرچشمے کی طرف متوجہ ہو رہے تھے، جو عالم انسانیت کو نصیب ہوا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا کریں؟ لیکن اس سلسلے میں روشنی کے لیے تاریخ کی جانب متوجہ ہونے سے پیشتر انہیں اس سوال کا جواب مل جانا چاہیے تھا کہ آیا تاریخ انہیں حقیقتاً آزاد کارندے تسلیم کرتی ہے؟ ممکن ہے تاریخ سے انہیں یہ سبق نہ مل سکے کہ ایک طریق عمل دوسرے طریق عمل سے بہتر ہے؛ یہ سبق ملے کہ راہ عمل کا انتخاب ہی سراسر فریب نظر اور التباس حواس ہے، اگر کسی وقت میں کسی ایک راستے کا انتخاب مفید و موثر ہو سکتا تھا تو وہ وقت گزر چکا اور ان کی نسل اس دور کو پیچھے چھوڑ آئی، جسے ایچ، اے، ایل فشر کا دور کہنا چاہیے، جس میں ہر شے عمر خیام کے قول کے مطابق دوسری کے پیچھے چلی جا رہی ہے:

> متحرک انگلی لکھ رہی ہے اور لکھنے کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ تیرا تقویٰ اور تقدس، تیری نکتہ سنجی اور لطیفہ گوئی اس نوشتے کو مٹانے کے لیے انگلی کو واپس لانے میں کام یاب نہیں ہو سکتے، نہ تیرے آنسو اس میں سے ایک حرف محو

کر سکتے ہیں[1]۔

تہذیبوں کی سرگزشتوں نے اب تک جو شہادتیں مہیا کی ہیں ، اگر ہم ان کی روشنی میں پیش نظر مسئلے کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ تہذیبوں کی شکست کے چودہ واقعات میں سے ایک بھی نہیں جس میں باھمی رزم و پیکار کی بیماری محارب حکومتوں میں سے ایک کے سوا سب کی زندگی پر خط نسخ کھینچے بغیر ختم ہو سکی لیکن اس خوفناک انکشاف کو قبول کر لینے کے بعد ہمیں مایوس نہ ہو جانا چاھیے کیوں کہ استدلال کا استقرائی طریقہ قضیۂ سالبہ کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے مسلمہ طور پر ناقص ذریعہ سمجھا گیا ہے اور زیر غور معاملے میں مثالیں جتنی کم ہوں گی ، اصل قضیہ اتنا ہی کمزور و ضعیف متصور ہوگا۔ چودہ تہذیبوں کے چھ ہزار سال کے تجربات کا مرقع ہمارے سامنے ہے، ان سے اس امکان کے خلاف قیاس کا چنداں محکم ثبوت بہم نہیں پہنچتا کہ جن دعوت ہائے مقابلہ نے ان ابتدائی تہذیبوں کو شکست سے دو چار کیا ، اس کا کامیاب جواب مہیا کرنے میں معاشرے کا مقابلتاً کوئی نادر نمائندہ کسی وقت کامیاب ہوجائے ، بے مثال روحانی ترقی کا کوئی نیا راستہ کھول لے اور باہم رزم و پیکار کی مجلسی بیماری کے علاج کی غرض سے جبر و قوت سے کام لے کر ایک ہمہ گیر سلطنت قائم کرنے کے بجائے کوئی ایسا طریقہ دریافت کر لے جس میں حد درجہ گران قدر نقصان آٹھانا نہ پڑے۔

اس امکان کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم ان تہذیبوں کی سرگزشت پر ایک

۱۔ عمر خیام کی یہ رباعی نول کشور والے نسخۂ رباعیات میں موجود ہے اور ذیل میں درج ہے :

بر لوح نشانِ بودنیہا بودہ است — پیوستہ قلم زنیک و بد آلودہ است
اندر تقدیر آنچہ بالیست بہ دور — غم خوردن و کوشیدن ما بیہودہ است

پہلا مصرعہ بعض نسخوں میں یوں ہے :

زیں پیش کشائی بودنیہا بودہ است

ظاہر ہے کہ انگریزی ترجمے کو اصل رباعی سے محض برائے نام ہی تعلق ہے (مترجم)۔

نظر بازگشت ڈالیں جو شکست سے آخری انحلال تک راہ رنج و غم[1] طے کر چکی ہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ کم از کم بعض کو بچاؤ کا متبادل حل نظر آ گیا اگرچہ اس تک پہنچنے میں کوئی بھی کامیاب نہ ہوسکی - مثال کے طور پر یونان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایتھینز اور پیلوپونیسیا کی جنگ (۴۳۱ ق م—۴۰۴ ق م) شروع ہو جانے پر جس دور و مصائب کا آغاز ہوا، اس میں روحانی دباؤ کے ماتحت بعض نادر یونانی روحوں پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ اتحاد و یک آہنگی سے جو کچھ ممکن ہے، وہ قوت و طاقت کے ذریعے سے ہر گز ممکن نہیں - دور جدید کی مغربی دنیا کے آخری دور میں اتحاد و آہنگی کے اس نظریے نے ۱۹۱۴ء—۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد جمعیت اقوام کی اور ۱۹۳۹ء — ۱۹۴۵ء کی جنگ کے بعد انجمن اقوام متحدہ کی شکل اختیار کی - چین کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیے؛ جب چینی معاشرے نے شکست کی پہلی ضرب کے بعد بحالی کے لیے کوشش شروع کی تو کنفیو شئیس نے یہ کوشش کی تھی کہ ہر رسم و اعمال کے روایتی ضابطے کو از سر نو زندہ کیا جائے - لاؤسی[2] نے کہا تھا کہ ووائی[3] کی تحت الشعور قوتوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے؛ دونوں کی خواہش یہ تھی کہ احساسات کے ان سرچشموں سے کام لیا جائے جو ممکن ہے روحانی یک آہنگی کی محافظ قوت پیدا کر دیں اور ان مقاصد و نظریات کو عامل اداروں میں جاری کرنے کے لیے ایک سے زیادہ کوششیں کی جا چکی ہیں -

---

۱- Via Dolorosa - یہ یروشلم کی ایک تنگ سی گلی ہے جو شہر کی مشرقی سمت سے شروع ہو کر مغربی سمت کی طرف جاتی ہے - عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مشرقی سمت میں گورنر کا محل تھا اور پاس ہی اس کی عدالت تھی جہاں حضرت مسیح[4] کے خلاف فیصلہ ہوا اور انہیں صلیب دینے کے لیے شہر سے باہر مغربی حصے میں لے گئے؛ اس راستے سے حضرت مسیح[4] صلیب اٹھائے ہوئے گزر رہے تھے، جگہ جگہ ان کے ٹھہرنے اور سستانے کے مقامات متعین کے گئے ہیں - عیسائی اس راستے کو بڑی عقیدت سے دیکھتے ہیں لیکن محققین کے نزدیک چودھویں صدی عیسوی سے پیشتر اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا (مترجم) -

۲- Lao-Tse - چین کا فلسفی جو چھٹی صدی قبل میں گزرا ہے، وہ تاؤ ازم کا بانی تھا (مترجم) -

۳- Wu Wei -

سیاسی سطح پر ہماری غرض یہ تھی کہ دونو انتہائیں تباہی خیز ہیں؛ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی باہمی رزم و پیکار بھی جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا اور ختم کر دینے والی ضرب لگا کر زور و قوت سے امن قائم کر دینا بھی وہی حیثیت رکھتا ہے، ان دونوں کے بیچ میں کوئی وسطانی راستہ تلاش کرنا چاہیے - بلاشبہ سمپلی گیڈ[1] کی چٹانیں ہر اس شے کو اپنے جبڑوں میں پیس ڈالتی تھیں جو ان کے پاس سے ہو کر گزرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن ممکن ہے جواں مردی و جاں بازی کے اس کارنامے میں کامیابی حاصل کرنے کا معاوضہ آرگوناٹوں[2] کے افسانوی تجربے کی طرح یہ ہو کہ سفینۂ تقدیر انسانی اس کھلے سمندر میں پہنچ جائے جہاں عالم انسانیت نے کبھی ملاحی نہیں کی - یہ حقیت روز روشن کی طرح آشکارا رہے کہ ایک طلسمی وفاقی دستور اس مسئلے کا یقینی حل نہیں سمجھا جا سکتا، معاشرے کی تعمیر میں انتہائی شاطرانہ سیاسی مہندسی کا استعمال انسانوں کی روحانی نجات کا بدل نہیں ہوسکتا، حکومتوں کی جنگ یا طبقوں کی کشمکش میں شکست کا قریبی سبب دراصل روحانی بیماری کی علامت کے سوا کچھ نہ تھا؛ لامتناہی تجربات ثابت کر چکے ہیں کہ ادارے ان پیش قدمی کرنے والی روحوں کو تباہی کی طرف بڑھنے سے روکنے میں کچھ مفید نہیں ہوسکتے- انسان ایک ڈھلوان چٹان پر انتہائی محنت و مشقت سے چڑھتا ہوا اس جگہ پہنچنا چاہتا ہے جہاں پہلے اس کا قدم کبھی نہیں گیا اور وہ نظر بھی نہیں آ رہی؛ اگر تہذیب کی راہ پر لگے ہوئے انسان کے لیے اس سلسلے میں امید کا واحد سہارا یہ ہے کہ اس بلندی پر پہنچنے کے لیے جس گرفت کا

۱- Symplegades - یونانی افسانوں میں یہ دو چٹانیں تھیں جو ہر وقت حرکت میں رہتی تھیں؛ جو میں ان کے پاس سے گزرنے کی کوشش کرتا تھا، اسے پیس ڈالتی تھیں (مترجم) -

۲- Argonauts - یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں آرگو (Argo) جہاز کے ملاح - یہ لوگ سنہری اون کی تلاش میں نکلے تھے، سمندر میں پھرتے رہے اور انھیں بڑے خطرات پیش آئے، جس طرح رستم کو ہفت خواں سے سابقہ پڑا تھا؛ یہ سب میں کامیاب ہوئے - سمپلی گیڈ سے بہ خیر و عافیت گزرنے کی تدبیر انھیں تھریس کے ایک نابینا بادشاہ نے بتائی تھی، جیسن (Jason) ان کا سردار تھا (مترجم) -

ہونا ضروری ہے، اسے حاصل کر لے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ پیش نظر مسئلے کا حل انسان کے اپنے اور ہم جنسوں کے تعلقات پر نہیں بلکہ اپنے نجات دہندہ خدا کے ساتھ تعلقات کی بنا پر بروئے کار آئے گا۔

سینتیسواں باب

قوانین قدرت سے انسانی فطرت کا انحراف

اپنے معاملات کو ضبط و نظم رکھنے کے متعلق انسان کی صلاحیت کے ثبوت ہمارے سامنے آ چکے ہیں، وہ کبھی قوانین قدرت سے پہلو بچاتا ہوا نکل جاتا ہے، کبھی ان پر قابو پا کر اپنی خدمت میں لگا لیتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں جس میں انسانی معاملات قوانین قدرت کی تابعیت میں آ ہی نہ سکیں؟ ہم اس سلسے میں چھان بین کا آغاز مجلسی تبدیلی کی رفتار کے متعلق تفتیش سے کر سکتے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ رفتار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے تو ہم کہ سکیں گے کہ کم از کم بعد مکانی میں انسانی معاملات قوانین قدرت سے منحرف ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ معلوم ہو کہ تاریخ کی رفتار تمام حالات میں مستقل اور یکساں رہتی ہے یعنی ہر دس سال یا ہر صدی میں نفسیاتی اور مجلسی تغیر کی مقدار قطعی اور یکساں ہوتی ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ ہمیں نفسیاتی و مجلسی سلسلے میں مقدار یا زمانی سلسلے میں میعاد کی حقیقی کیفیت و کمیت معلوم کر لینی چاہیے؛ اس کی بنا پر ہم دوسرے سلسلوں میں، متعلقہ غیر معلوم مقدار کی جسامت اور حجم کا اندازہ کر سکیں گے۔ مصری تاریخ کا ایک ممتاز عالم کم از کم یہ حقیقت واضح کر چکا ہے، اس نے علم ہیئت کی بنا پر مقرر کیے ہوئے سلسلۂ تاریخ کو رد کر دیا؛ دلیل یہ دی کہ اگر اسے مان لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ مصری دنیا میں مجلسی تبدیلی کی رفتار دو سو سال کی مدت میں زیادہ تیز رہی اور اس سے بیشتر کی دو صد سالہ مدت میں ویسی تیز نہ رہی حالانکہ یہ قابل تسلیم نہیں لیکن بہت سی

متعارف مثالیں پیش کر کے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جس قضیے سے یہ ممتاز ماہر مصریات جھینپا ، وہ ایک بدیہی تاریخی حقیقت ہے ۔

مثلاً : ہم جانتے ہیں کہ ایتھنز کا پارتھی نان پانچویں صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا ، ہیڈرین کا اولمپئم دوسری صدی مسیحی میں اور قسطنطنیہ میں سینٹ سوفیہ کا گرجا چھٹی صدی مسیحی میں بنا تھا ۔ جس اصول کو ہمارے ماہر مصریات نے اپنا موقف بنایا ، اس کے رو سے مندرجہ بالا عمارتوں میں سے پہلی اور دوسری کے درمیان کم فصل ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ دونوں کی طرز تعمیر تقریباً ایک جیسی ہے ۔ اس کے برعکس دوسری اور تیسری کے درمیان زیادہ فصل ہونا چاہیے اس لیے کہ دونوں کی طرز تعمیر بالکل مختلف ہے ؛ ان عمارتوں کی تاریخوں میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں اورکم سے کم زمانی فصل ان عمارتوں میں ہے جو ایک دوسری سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں ۔

اگر ہم اس قیاسی اصل کو تسلیم کریں اور اس کی بنا پر کام شروع کردیں تو رومی سلطنت کے آخری دور میں رومی سپاہی کے ساز و سامان ، آٹو اول کی مقدس رومی سلطنت کے سیکسن سپاہی کے ساز و سامان اور بیو[1] کے مشجروں کے مطابق نارمن بہادر کے ساز و سامان کے متناسب زمانی فصل کے اندازے میں غلطی کے مرتکب ہوں گے ۔ آٹو نے اپنے سپاہیوں کو گول ڈھالیں دی تھیں اور ان کے کلنی والے خودوں کے مربع کنارے گلیڈیٹروں جیسے تھے لیکن یہ سامان آخری دور کے رومی شاہنشاہ میجورین[2] کے سپاہیوں کے ساز و سامان سے صرف جزوی حیثیت ہی میں مختلف تھا ؛ اس کے بر عکس ولیم فاتح[3] نے اپنے سپاہیوں کو سرمیشیا کے مخروطی خود اور زرہیں پہنائی تھیں اور ان کی ڈھالیں پتنگ کی وضع کی تھیں ۔ رفتار تغیر میں یکسانی کا مفروضہ ہمیں ایسی جگہ پہنچا دے گا جہاں حقائق پرے باندھے ہمارے سامنے

۱- Bayeu ۔ فرانس کا ایک مقام جہاں کا عجائب خانہ خاص طور پر قابل ذکر ہے ، اس عجائب خانے کے مشجروں کا مصنف نے ذکر کیا ہے (مترجم) ۔

۲- Majorian ۔

۳- ولیم نارمنوں کا سردار تھا ، اسے فاتح کا لقب اس لیے ملا کہ اس نے نارمنڈی سے اٹھ کر انگلستان کو فتح کیا تھا (مترجم) ۔

کھڑے ہوں گے اور ہم ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکیں گے - اس مفروضے کی بنا پر آٹو اول (عہد حکمرانی ۹۳۶ء - ۹۷۳ء) اور ولیم فاتح (نارمنڈی کا عہد حکومت ۱۰۳۵ء - ۱۰۸۷ء) کے درمیان بعد زمانی میجورین (عہد حکومت ۴۵۷ء - ۴۶۱ء) اور آٹو کے درمیان بعد زمانی سے زیادہ ہونا چاہیے حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے -

مزید برآں اگر کوئی شخص اس امر کا جائزہ لے کہ اہل مغرب کا معیاری سویلئن مردانہ لباس ۱۷۰۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان کیا رہا تو اس پر واضح ہوگا کہ ۱۹۵۰ء کا کوٹ ، واسکٹ ، پتلون اور چھاتا ، ۱۷۰۰ء کے کوٹ ، واسکٹ ، برجس اور تلوار ہی کی ترمیم ہیں اور ان دونوں دوروں کے لباس ۱۶۰۰ء کی چست صدری اور گھٹنوں تک پتلون اور لمبے موزوں سے بالکل مختلف ہیں - یہ مثال سابقہ دو مثالوں کی ضد ہے یعنی اس میں ابتدائی دور بہت مختصر ہے اور اسی میں زیادہ تغیرات ہوئے - یہ کہانیاں انتباہ ہیں کہ رفتار تغیر کو غیر متبدل اور یکساں مان کر مرور زماں کے اندازے کی بنیاد بنانا خطرناک ہے اور ہم اس مفروضے کو ان مقامات کی تاریخ کے لیے استعمال نہیں کر سکتے ، جہاں ماہرین آثار قدیمہ کا کلند زمین کھود کھود کر انسانی پیشوں کا درجہ بہ درجہ ملبہ فراہم کر رہا ہے اور جہاں کی تاریخ انھیں مادی شہادتوں کی بنا پر مرتب ہو سکتی ہے کیوں کہ اس کے لیے تحریری ریکارڈ نہیں ملتا -

ثقافتی تغیر کی رفتار کے یکساں ہونے کے نظریے پر حملے کے سلسلے میں مزید مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ؛ ایسی بھی جن میں رفتار تیز رہی ، ایسی بھی جن میں رفتار بہت کم ہو گئی اور ایسی بھی جن میں کمی بیشی کے درمیان تبادل جاری رہا -

ایک متعارف مثال انقلاب کی ہے ؛ ہم اس کتاب کے سابقہ بحث میں معلوم کر چکے ہیں کہ انقلاب ایک مجلسی حرکت ہوتا ہے جو دو گروہوں کے درمیان مقابلے سے پیدا ہوتا ہے ، ان میں ایک گروہ انسانی سرگرمیوں کے مختلف دوائر میں سے کسی ایک میں دوسرے سے آگے نکل جاتا ہے ؛ مثال کے طور پر ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب کی حیثیت ابتدائی دور میں تشنجی کوشش کی سی تھی ، اس کا مدعا یہ تھا کہ دستور ترقی میں ہمسایہ جزیرے یعنی برطانیہ کی ہم سری اختیار کر لی جائے جو سابقہ دو صدیوں سے آہستہ آہستہ دستوری حقوق حاصل کرتا چلا آ رہا تھا - یہ حقیقت ہے کہ براعظم یورپ

میں مغربی لبرل ازم کی جو رو چلی تھی اور جو انیسویں صدی کے اکثر انقلابات کی محرک بنی (حالاں کہ ان میں سے اکثر بے نتیجہ رہے)، اسے بعض یورپی مورخوں نے انگریز پرستی کے جنوں سے تعبیر کیا ھے۔

تیز رفتاری کا ایک عام نمونہ ان سرحدی گروھوں کی روش میں ملتا ھے جو تہذیب کے دور افتادہ حواشی پر رھتے ھیں یا ان بربریوں میں ملتا ھے جو ان سرحدوں سے باھر ھوتے ھیں؛ ان میں اچانک یہ جوش پیدا ھو جاتا ھے کہ اپنے زیادہ ترقی یافتہ ھم سایوں کے دوش بہ دوش جا کھڑے ھوں۔ راقم الحروف کو خوب یاد ھے کہ ۱۹۱۰ء میں اس نے سٹاک ھالم[1] کے عجائب خانے نارڈسکا مسیٹ[2] کو دیکھا تھا، میں مختلف کمروں میں سے گزر گیا جن میں سکنڈے نیویا کے عہد حجری قدیم، عہد حجری جدید، عہد برنجی اور مسیحیت سے پیش تر کے فولادی دور کی ثقافتوں کے نمونے سجائے گئے تھے؛ پھر میں ایک ایسے کمرے میں پہنچا جہاں سکنڈے نیویا کی فن کاری کے ایسے نمونے رکھے گئے تھے جو اٹلی کے عہد احیاء علوم کے نمونوں سے مشابہ تھے۔ مجھے بڑی حیرت ھوئی کہ قرون وسطیٰ کے نمونے میری نگاھوں سے کیوں اوجھل رھے؛ چناں چہ میں لوٹا اور مجھے قرون وسطیٰ کا کمرہ مل گیا لیکن اس میں جو کچھ رکھا گیا تھا، وہ کسی لحاظ سے بھی توجہ کا مستحق نہ تھا۔ پھر مجھے احساس ھونے لگا کہ عہد فولادی کے آخری دور سے سکنڈے نیویا محض ایک جھلک دکھا کر آگے بڑھ گیا؛ یہی زمانہ ھے جس میں اس نے اپنی مستقل تہذیب پیدا کرنے کی کوشش کی، پھر وہ دور جدید کے ابتدائی عہد میں داخل ھو گیا اور اس نے مسیحی ثقافت کی معیاری اطالوی وضع و ھیئت میں ایک غیر ممتاز شریک و سہیم کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس تیز رفتاری کی قیمت ثقافتی افلاس کی شکل میں ادا کرنی پڑی اور نارڈسکامسیٹ کا عجائب خانہ اس افلاس کی شہادت پیش کر رھا تھا۔

جو حالات پندرھویں صدی مسیحی کے سکنڈے نیویا کو پیش آئے، انھیں حالات سے راقم الحروف کے عہد کی غیر مغربی دنیا کو سابقہ پڑا جو تیزی سے مغربیت کا رنگ اختیار کر رھی ھے۔ یہ عام قول ھے کہ

۱- Stockholm، سویڈن کا دار الحکومت (مترجم)۔

۲- Nordiska Musset -

اہل افریقہ ایک یا دو نسلوں میں وہ تمام سیاسی، مجلسی اور ثقافتی ترقیات حاصل کر لینے کے در پے ہیں جن کے حصول میں مغربی یورپ کی اقوام کو ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت لگ گئی اور اہل افریقہ ایک طرف اہل یورپ کی تقلید کر رہے ہیں، دوسری طرف ان کی مزاحمت میں لگے ہوئے ہیں - افریقہ نے تیز رفتاری سے جو کچھ حاصل کیا ہے، اس کے بیان میں مغربی یورپ کی اقوام افراط سے کام لے رہی ہیں اور مغربی ناظر تفریط پر کاربند ہے -

اگر انقلابات تیز رفتاری کا ڈرامائی مظاہرہ ہوتے ہیں تو پس ماندگی کا نظارہ اس پس ماندہ شخص کی روش میں دیکھا جا سکتا ہے جو معاشرے کی اکثریت کو ساتھ چلنے سے انکاری ہو ؛ اس کی مثال ہمیں شمالی امریکہ کی یونین کی جنوبی ریاستوں سے مل سکتی ہے وہ غلامی کو بحال و برقرار رکھنے پر پوری ایک نسل تک تلی بیٹھی رہیں حالاں کہ یہ برطانوی سلطنت کے جزائر غرب الہند میں منسوخ ہو چکی تھی - دوسری مثالیں آبادکاروں کے ان گروہوں کی سرگزشتوں سے مل سکتی ہیں جو نئے ممالک میں چلے گئے لیکن انہوں نے وہ معیار قائم رکھے جو وطن سے نکلتے وقت رواج پذیر تھے اگرچہ خود ان کے ہم وطنوں نے وہ معیار ترک کر کے قدم آگے بڑھا لیے تھے - اس سلسلے میں صرف بیسوں صدی مسیحی کے کوئبک[1]، اپپالیشیائی سطح مرتفع[2] اور ٹرانسوال، ان کے مقابلے میں فرانس، السٹر اور نیدرلینڈز کا ذکر کفایت کرتا ہے - اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں تیز رفتاری اور پس ماندگی کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں - خوانندۂ کتاب خود ان مثالوں کی یاد تازہ کر سکتا ہے - یہ بھی ظاہر ہے کہ مثلاً جس شے کو ہم نے "ہیرو دیسیت" کہا تھا، وہ تیز رفتاری سے قریب تر ہے اور جسے زیلٹ ازم (مذہبی جنون) قرار دیا تھا، وہ پس ماندگی سے ملتی جلتی ہے ؛ یہ بھی ظاہر ہے کہ تغیر برا بھی ہو سکتا ہے اور اچھا بھی، لہٰذا یہ

۱- Quebec، کینیڈا کا دارالحکومت (مترجم) -

۲- Appalachian Highlands، دریائے مسس سپی اور اٹلانٹک کے درمیان (مترجم) -

سمجھ لینا مناسب نہیں کہ تیز رفتاری لازماً اچھی اور پس ماندگی لازماً بری ہے -

رفتار میں متبادل تغیرات کی سلسلہ بندی جس کے درجے دو نہیں بلکہ یقینی طور پر تین ہوتے ہیں اور ممکن ہے چار ہوں ، دور جدید کے مغرب کی تاریخ فنون میں سے جہاز سازی اور ملاحی و بحر پیمائی میں بخوبی واضح ہو سکتی ہے - کہانی کا آغاز اچانک تیز رفتاری سے ہوتا ہے جس نے ۱۴۴۰ء سے ۱۴۹۰ء کے درمیانی پچاس سال میں ان فنون کے اندر انقلاب برپا کر دیا - اس کے بعد سستی آ گئی جو سولھویں ، سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں قائم رہی ، اس کے بعد پھر یکایک تیز رفتاری کا دور آ گیا ، یہ بھی پچاس ہی سال کا تھا (۱۸۴۰ء—۱۸۹۰ء) - ۱۹۵۲ء میں جو نیا دور شروع ہوا ، اس کی بابت فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے اس لیے کہ یہ ابھی پایۂ اتمام پر نہیں پہنچا لیکن ایک غیر فنی آدمی پر واضح ہے کہ اگرچہ اس دور کی فنی ترقیاں بہت نمایاں ہوں گی لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ آخری دور ان انقلابی کارناموں کا مقابلہ نہ کر سکے جو عہد وکٹوریہ کی نصف صدی میں انجام پائے :

> پندرھویں صدی میں - - - جہاز سازی کے فن میں - حد تیز اور اہم تبدیلیاں ہوئیں - - - پچاس سال کے دوران میں سمندروں کے اندر سفر کرنے والے جہازوں پر ایک مستول کی جگہ تین مستول استعمال ہونے لگے اور ان میں پانچ یا چھ بادبان ہوتے تھے -

اس فنی انقلاب نے بانیان انقلاب کو کرۂ ارض کے اطراف اربعہ ہی میں نہ پہنچایا بلکہ ان تمام غیر مغربی ملاحوں اور بحر پیماؤں پر برتری بھی دے دی جو ان کے مقابلے پر آ سکتے تھے - نئے جہازوں کی ممتاز ترین خوبی یہ تھی کہ یہ کسی بندرگاہ میں ٹھہرے بغیر قریباً لامتناہی مدت تک سمندر میں رہ سکتے تھے اور اس لحاظ سے انھیں پیش رووں اور جانشینوں دونوں پر فوقیت حاصل تھی - ان کی تیاری میں ان تمام مختلف طریقوں اور ساز و سامان کو منتخب کر لیا تھا جو بہترین مانے جاتے تھے لیکن آگے چل کر ثابت ہوا کہ ان میں نقائص بھی تھے- ۱۴۴۰ء اور ۱۴۹۰ء کے درمیان اہل مغرب نے جو جہاز تیار کیے ، ان میں بحیرۂ روم کے اس لمبے جہاز کی خوبیاں بھی

شامل تھیں جو چپوؤں سے چلتا تھا اور جسے گیلی[۱] کہتے تھے ، نیز بحیرۂ مذکورہ کے اس مربع بادبانوں والے جہاز کی جسے مدور جہاز کہتے تھے اور اس کا نام کراک[۲] تھا ؛ ان دو کے علاوہ اس میں بحر ھند کے مثلث بادبانوں والے جہاز کرول[۳] کی بھی خوبیاں شامل تھیں ۔ اس کا پیش رو وہ جہاز تھا جس کی تصویر ملکہ ھت شپ ست[۴] (۱۴۸۶ ق م–۱۴۶۸ ق م) کے عہد میں مشرقی افریقہ کی سر زمین پنٹ[۵] کے خلاف مصر کی بحری مہم کے ذکر میں ملتی ھے ؛ اس بھاری جہاز کی خوبیاں بھی شامل تھیں جو اوقیانوس میں سفر کے لیے تیار ھوا تھا اور جولیئس سیزر نے ۵۶ ق م میں اسے دیکھا تھا ۔ یہ اس زمانے کی بات ھے جب سیزر نے وہ علاقہ مسخر کیا جسے بعد میں برٹنی[۶] کہنے لگے ۔ غرض نئے جہاز میں ان چار مختلف نمونوں کی خوبیاں شامل تھیں ، یہ پندرھویں صدی میں تیار ھوا اور نیلسن کے عہد کے بہترین جہازوں سے یہ بنیادی طور پر مختلف تھا ۔

ساڑھے تین صدیاں گزر گئیں تو مغربی فنون جہاز سازی میں تیز رفتاری کے ایک نئے ھیجان کا دور آیا ۔ اس مرتبہ تخلیقی کام نے انتہائی سرعت سے دو متوازی لائنوں پر ترقی کی : ایک طرف بادبانوں کی جگہ دخانی انجن لگایا گیا ، دوسری طرف طویل خواب کے بعد آنکھیں کھلیں ، جہاز سازی میں اصلاح پر توجہ ھوئی اور پرانے نمونے کو تکمیل کے ناشنیدہ درجے پر پہنچا دیا گیا لیکن ۱۸۴۰ء سے ۱۸۹۰ء تک کے پچاس سال میں بادبانی جہاز دخانی جہاز کا مقابلہ کرتے رھے ۔

یہ تیز رفتاری اور رکاوٹ دونوں چیزیں یکسانی حرکت سے انحراف ھیں حالاں کہ جو معاشرے قانون قدرت کے تابع ھوں ، ھمیں ان سے یکسانی ھی

۱- Galley ، ایک نوع کا پرانا جہاز (مترجم) ۔

۲- Carrack ، یہ جہاز بار برداروں کے لیے ھوتا تھا ، جنگوں میں بھی اس سے کام لیتے تھے (مترجم) ۔

۳- Caravell ۔

۴- Hatshepsut ۔

۵- Punt ۔

۶- Brittany ، فرانس کا شمالی و مغربی گوشہ (مترجم) ۔

کی امید رکھنی چاہیے - اس صورت حال کی توضیح کے لیے ہمیں دعوت مقابلہ اور جواب کے فارمولے پر پہنچنا چاہیے جس پر کتاب کے ابتدائی حصے میں تفصیلاً غور و بحث کر چکے ہیں - آئیے ہم آخری مثال ہی کا ازسرنو جائزہ لے لیں یعنی مغربی جہاز سازی اور بحر پیمائی میں تیز رفتاری کے دو دور آئے اور ان کے بیچ میں رکاؤ کی طویل مدت حائل تھی -

جس دعوت مقابلہ نے ۱۴۴۰ء-۱۴۹۰ء کے درمیان پچاس سال کی مدت میں دور جدید کے مغربی جہاز کی تخلیق پر آمادہ کیا ، اس کی حیثیت سیاسی تھی - قرون وسطیٰ کے اختتام پر مغربی مسیحی دنیا "دارالاسلام" کے جنوبی و مشرقی حصے میں گھس جانے کی کوشش کر کے ناکام رہ چکی تھی (صلیبی مہمیں) اور ترکوں کے جوابی حملوں نے ایک طرف ڈینیوب کے بالائی حصے میں اور دوسری طرف بحیرۂ روم کے ساتھ ساتھ مسیحی دنیا کے لیے شدید خطرہ پیدا کر دیا تھا ؛ اس موقع پر مغربیوں کے موقف کی نزاکت بدیں وجہ بہ طور خاص بڑھ گئی تھی کہ مغربی مسیحی معاشرہ یوریشیائی براعظم کے مختلف جزیرہ نماؤں میں سے صرف ایک کا آخری حصہ سنبھالے بیٹھا تھا - اگر یہ معاشرہ اپنے بچاؤ کی تدبیروں میں نہ لگ جاتا ، اندھی گلی سے نکل وسیع تر دائرے میں نہ آ جاتا اور اسی حالت میں پرانی دنیا کی قلب سے زیادہ طاقت ور عساکر اٹھ کر اس پر حملہ کر دیتے تو ظاہر ہے کہ اس کے دباؤ سے معاشرے کا زود یا بہ دیر سمندر میں دھکیل دیا جانا یقینی تھا ؛ یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو خود اس معاشرے نے کئی صدیاں پیش تر مغرب اقصیٰ میں سیلٹوں کے حاشیے کی ناکام مسیحی دنیا سے روا رکھا تھا - صلیبی مہموں میں لاطینی مسیحیوں نے بحیرۂ روم کو جنگی راستے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ، وہ انھیں جہازوں میں سوار ہوئے جو عام طور پر بحیرۂ روم میں سفر کے لیے بنائے جاتے تھے ؛ اس طرح چاہا مسیحیت کی ولادت گاہ پر قابض ہوں ، اس کوشش میں وہ ناکام رہے - اب مسلمانوں کے خوف ناک پیش قدمی نے ان شکست خوردہ مسیحی حریفوں کو دوگونہ مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا : ایک طرف ان کا دشمن تھا اور دوسری طرف گہرا سمندر ، انھوں نے گہرے سمندر میں اتر جانے کا فیصلہ کیا اور نئی قسم کے جہاز بنائے جن کے نتائج پرتگیزی بادشاہ ہنری بحر پیما کے شاگردوں کی خوش‌گوار ترین امیدوں سے بھی منزلوں

آگے بڑھے ہوئے تھے ۔

اسلام کی دعوت مقابلہ نے مغربی جہاز سازوں کو پندرھویں صدی میں جس بے پناہ کامیابی پر پہنچایا تھا ، وہی رکاؤ کے طویل سلسلے کی علت بن گئی جس میں جہاز سازی کی صنعت مبتلا رہی ۔ اس کے بعد تیز رفتاری اور جوش کا دوسرا دور بالکل مختلف سبب کی بنا پر شروع ہوا ؛ اس وقت اقتصادی انقلاب بپا ہو چکا تھا جو اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مغربی دنیا کے مختلف حصوں کو متاثر کرنے لگا تھا ۔ اس انقلاب کے دو ممتاز پہلو تھے: اول آبادی میں حیرت انگیز تیزی سے اضافہ ، دوم تجارت اور صنعت و حرفت کو زراعت پر زبردست فوقیت و برتری ۔ ہمیں انیسویں صدی کی مغربی صنائع کی توسیع کی متعارف اور پر پیچ داستان کی تفصیل میں یہاں نہ پڑنا چاہیے اور نہ آبادی کی متوازی افزائش کو پیش نظر لانا چاہیے جس نے صرف مغربی یورپ کی ”پرانی دنیا“ ہی کے باشندوں میں مختلف المدارج اضافے نہ کیے بلکہ ان نئی زمینوں کی وسعتیں بھی ان سے لبریز ہونے لگیں جو اہل مغرب نے سمندر پار حاصل کی تھیں ۔ اگر جہاز ساز اس نئی دعوت مقابلہ کے جواب مہیا کرنے کے لیے اسی مستعدی سے تیار نہ ہوتے جس مستعدی سے چار سو سال پیش تر تیار ہوئے تھے تو مذکورہ بالا حالات سمندر میں آمد و رفت کے مسئلے کو معرض اختلال میں ڈال دیتے ۔

ہم نے یہ مثال انسانی معاملات کے مادی دائرے میں منتخب کی یعنی دو دعوت ہائے مقابلہ کے جواب میں ایک مخصوص پیشے کے اندر پے در پے فنی اصلاحات ہوئیں: پہلی دعوت مقابلہ سیاسی اور عسکری تھی ، دوسری اقتصادی اور مجلسی لیکن دعوت مقابلہ اور جواب کا اصول وہی رہا خواہ بھوکے پیٹ روٹی کے طلب گار تھے یا بھوکی روحیں خدا کی آرزو مند تھی ؛ کچھ بھی ہو دعوت مقابلہ ہمیشہ خدا کی طرف سے انسانی روحوں کے لیے آزادیٔ انتخاب کی ایک پیش کش ہوتی ہے ۔

اڑتیسواں باب

قانون الٰہی

کتاب کے پیش نظر حصے میں ہماری کوشش یہ ہے کہ تاریخ میں قانون اور آزادی کے تعلقات کی نسبت کچھ آگاہی حاصل ہو جائے ، اب اگر ہم اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوں تو معلوم ہوگا کہ ہم جواب پر پہنچ چکے ہیں ۔ آزادی کا مختاری کو قانون سے کیا تعلق ہے ؟ شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان ایک قانون کے ماتحت زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ اس پر دو قانون مسلط ہیں ، ان میں سے ایک قانون خدا ہے جو حقیقةً بجائے خود آزادی ، خود مختاری کا ایک نہایت نور افگن نام ہے ۔

یعقوب[۴] رسول اپنے مکتوب میں کہتا ہے کہ آزادی کا مکمل قانون ، قانون محبت بھی ہے ۔ انسان کو حقیقی آزادی اور مختاری خدا ہی دے سکتا تھا جو سراپا محبت و رحمت ہے ؛ اس آسمانی عطیے کو انسان زندگی اور خیر کے لیے استعمال کر سکتا ہے ، موت اور شر کے لیے نہیں ۔ اگر انسان کے دل میں خدا کی سچی محبت موج زن ہو تو وہ اس محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے ، اس کی رضا کو اپنی رضا بنا سکتا ہے :

ہمارے ارادے ہمارے ہیں ، کچھ معلوم نہیں کس طرح ؛
ہمارے ارادے ہمارے ہیں تا کہ انہیں تیرے بنا دیں[۱]

تاریخ ـ ـ ـ ـ سب سے بڑھ کر ایک دعوت ، ایک طلب اور ایک دستور ہے ، آزاد انسانوں کا فرض ہے کہ اسے سنیں اور اس کا جواب دیں ـــــــ

۱- ٹینی سن (Tennyson) کی نظم ان میموریم (In Memoriam) ۔

مختصر یہ کہ یہ خدا اور انسان کے درمیان تعامل ہے[1] - تاریخ میں قانون اور آزادی و مختاری ہم معنی ثابت ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح انسان کی آزادی و مختاری خدا کا قانون ثابت ہوتی ہے اور خدا و رحمت ہم معنی ہیں لیکن اس طرح اصل مسئلہ ختم نہیں ہوتا اس لیے کہ ابتدائی سوال کا جواب دیتے ہوئے ہم نے ایک اور مسئلہ پیدا کر لیا تھا - یہ درست ہے کہ آزادی و مختاری دو قانونوں میں سے ایک کے ساتھ ہم معنی ہے لیکن ہم نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ ان دونوں قانونوں میں باہم کیا تعلق ہے؟ بادی النظر میں اس سوال کا جواب یہ ہوگا کہ رحمت و محبت کا قانون اور انسانی فطرت کے تحت الشعور کا قانون بہ ظاہر دونوں انسانی معاملات پر حاوی ہیں لیکن یہ محض مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد بھی ہیں اور کبھی آپس میں ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اس لیے کہ نفس کے تحت الشعور کا قانون روحوں کو غلامی میں رکھتا ہے اور خدا نے روحوں کو دعوت دی ہے کہ آزادی میں اس کی رضا کے مطابق کام کریں - ہم جتنی گہری نظر سے ان دونوں قانونوں کا مقابلہ کرتے ہیں، دونوں کے درمیان اخلاقی خلیج زیادہ وسعت اختیار کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے - اگر ہم قانون محبت و رحمت کے معیار سے قانون قدرت کا جائزہ لیں اور محبت و رحمت کی نگاہوں سے ان تمام چیزوں کو دیکھیں جو قدرت نے بنائی ہیں تو یہ دیکھو یہ بہت برا ہوگا:

آہ دیکھو! بلند آسمان اور زمین ابتدائی بنیاد ہی سے دکھ
بھرے ہیں؛ تمام افکار دل کو نوچنے کے لیے یہاں موجود ہیں
اور سب بے کار ہیں[2] -

کائنات کے اخلاقی شر کے ناظر انسان جس نتیجے پر پہنچے، یہ ہے کہ شدائد و مہالک کا یہ ایوان خدا کا ساختہ نہیں ہو سکتا؛ لذتیوں[3] کا عقیدہ یہ تھا کہ کائنات اجزائے لایتجزیٰ کے ہنگامی و اتفاقی اجتماع کی ایک

۱- ای لیمپرٹ (Lampert) کی کتاب "تاریخ کا الہام" -

۲- ہاؤس مین (Housman) "شروپ شاگر کا ایک لڑکا"-

۳- Epicureans ، فلسفیوں کا وہ گروہ جس کا عقیدہ ہے کہ دنیا فانی ہے، کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ اس لیے کہ بہ ہر حال سب کو مر جانا ہے (مترجم) -

غیر مجوزہ اور بے منصوبہ پیداوار ہے ۔ اس کے برعکس مسیحی دو دوسرے متبادل عقیدوں میں سے کسی ایک کو چن لینے پر مجبور ہے اور دونوں اس کے لیے جانگزا حد تک حوصلہ شکن ہیں ۔ دو عقیدے یہ ہیں : یا تو خدا جو سراپا محبت و رحمت ہے ، بہ ظاہر اس دکھ بھری کائنات کا خالق ہے یا یہ کائنات کسی دوسرے خدا نے بنائی ہوگی جو محبت و رحمت کا خدا نہیں ۔

بے دین مارسیئن[1] نے دوسری صدی کے آغاز میں اور شاعر بلیک[2] نے انیسویں صدی کے آغاز میں مذکورہ بالا دو عقیدوں میں سے آخری اختیار کر لیا ؛ انھوں نے اخلاقی معمے کا حل یہ سوچا کہ کائنات اس وجود کی تخلیق ہے جو نہ دوسروں سے محبت کر سکتا ہے اور نہ محبت کے قابل ہے ۔ نجات دھندہ خدا محبت سے روحوں کو جیتتا ہے ؛ جس خدا نے دنیا خلق کی ، اس کا کام تو یہ ہے کہ قانون عائد کر دیتا ہے اور اس کی جہاں خلاف ورزی ہوتی ہے ، وحشت ناک سزائیں دیتا ہے ۔ اس زود رنج سخت گیر وجود کو مارسیئن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہوواہ قرار دیا ، بلیک نے اس کا نام اوری زن[3] بتایا اور بہ طور تفنن اسے ''نوبوڈیڈی''[4] کہا ۔ دونوں کہتے ہیں کہ اگر اس وجود نے اپنی محدود روشنی کے مطابق فرائض ٹھیک ٹھیک انجام دیے تو نتیجہ بہت برا ہوگا لیکن وہ اس میں ناکام رہا اور یہ ناکامی یا تو نالائقی کا نتیجہ یا بغض و کینہ توزی کا ؛ ان کے نزدیک دنیا کے گناہوں اور دنیا کی مصیبتوں میں بہ ظاہر کوئی تعلق نہیں ۔

مارسیئن کا یہ دعویٰ تو محکم معلوم ہوتا ہے کہ خلق کائنات میں برائی مضمر ہے لیکن اس کا یہ دعویٰ بہت کمزور ہے کہ اسے اچھائی اور محبت سے کوئی تعلق نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی محبت انسان کی مختاری و آزادی کا سرچشمہ ہے اور جس آزادی و مختاری کا دروازہ کائنات کے لیے کھولا گیا ہے ، اس کے ساتھ گناہ کا دروازہ بھی کھل گیا ہے ۔ ہر دعوت مقابلہ کو خدا کی طرف سے پیغام عمل بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور شیطان

۱- Marcion -

۲- Blake -

۳- Urizen -

۴- Nobodaddy -

کی طرف سے پیغام ترغیب بھی - مارسیئن نے خدا کو محبت قرار دیا تو اس کی وحدت سے وہ منکر ہو گیا لہٰذا یہ دعویٰ حقیقت سے بہت دور چلا گیا - آئری نائی اوس نے خالق کائنات اور نجات دھندہ کو ایک مانا لیکن دونوں کو خدا کے دو مظہر مانا ؛ انسانی نقطہ نگاہ سے اخلاقاً اسے درست ثابت نہیں کیا جا سکتا - ایک منطقی اور اخلاقی تضاد کی سچائی ثابت کرنے کے لیے مسیحیوں نے تجربے کی شہادت پیش کی ، دور حاضر کی مغربی سائنس نے اسے ہر لحاظ سے درست ثابت کر دیا - خدا کے دو متبائن مظہروں کو غیر متبائن ثابت کرنے کی مصیبت علماء و صلحا کے دلوں کو دکھ دیتی رہی ؛ مغرب کے ماہرین نفسیات میں سے آخری دور کے ایک دبستان نے یہ اعلان کر دیا کہ یہ نفس کے تحت الشعور کو اذیت دیتی رہی ہے ، ایک ایسی کشمکش کی صورت میں جس میں سے علماء و صلحائے آئندہ کی اخلاقی شخصیت ابتدائی بچپن کے مرحلے پر ہی صورت پذیر ہو جاتی ہے ؛ اس سلسلے میں روح کی کائنات کے اندر خدا کا آئندہ مقام بچے کی ماں کو حاصل ہوتا ہے :

> جب بچہ پیدائش کے بعد کی زندگی کے دوسرے سال کے آغاز میں اپنے اور بیرونی حقائق کے درمیان امتیاز کرنے لگتا ہے تو اس کے لیے ماں بیرونی دنیا کی زندگی کی نمائندہ بن جاتی ہے اور اس کا اثر بچے پر کارگر ہوتا ہے لیکن یہ اثر بچے کے نشو و نما پاتے ہوئے شعور پر دو متضاد حیثیتیں اختیار کرتا ہے ؛ وہی بچے کی محبت کا خصوصی مرکز بن جاتی ہے ، وہی اس کے لیے تسلی و تشفی ، حفاظت اور امن و سلامتی کا سرچشمہ ہوتی ہے لیکن آمر بھی وہی ہوتی ہے یعنی اس پر اسرار اختیار کا سب سے بڑا سرچشمہ - بچہ بیرونی دنیا میں زندگی کے نئے حقائق کی تلاش میں اپنے اندر ہیجان پاتا ہے اور ماں ان میں سے بعض ہیجانات کی راہ میں مزاحم ہوتی ہے - بچے کے ایسے ہیجانات کی روک تھام سے اس میں غصہ اور نفرت پیدا ہوتی ہے ، تباہ کن خواہشات ابھرتی ہیں ——— ماہرین نفسیات انھیں خواہشات کو جارحانہ اقدامات قرار دیتے ہیں ——— یہ خواہشات مزاحم قوت کے خلاف کارفرما ہوتی ہیں لیکن عجیب بات

یہ ہے کہ یہی قابل نفرت مختار ہستی محبوب اور پیاری ماں ہوتی ہے ۔ اس طرح بچہ ابتدا ہی میں تضاد سے دو چار ہوتا ہے ، ہیجان کے دو متبائن مظہر ایک نصب العین کی طرف بڑھتے ہیں اور وہی نصب العین بچے کے گرد و پیش کی دنیا کا مرکز ہوتا ہے[1] ۔

یوں ایک نفسیاتی نظریے کے مطابق قد بلوغ پر پہنچ کر انسان میں جو شعوری اخلاقی کش مکش پیدا ہوتی ہے ، وہ حالت طفلی کی ابتدا ہی میں تحت الشعور کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور بالغ کی کش مکش کی طرح بچے کی کش مکش بھی روحانی فتح روحانی قیمت وصول کرتی ہے ؛ ابتدائی محبت ابتدائی نفرت کو مسخر کر لیتی ہے اس لیے کہ نفرت پر ابتدائی گناہ کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے[2] ۔ یوں علم النفس آئری نائی اوس کے اس مسیحی اکتشاف کی تصدیق کرتا ہے جو مارسیئن کے نظریے کے خلاف ہے یعنی محبت اور نفرت ، راستبازی اور گناہ گاری سلسلۂ تخلیق کے ذریعے سے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ الگ الگ ہو ہی نہیں سکتے :

> ماں کے بغیر کسی وجود پر زبردست محبت مرتکز نہیں ہو سکتی ، ایسی محبت کے بغیر متبائن اثرات میں کش مکش پیدا نہیں ہو سکتی اور کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا ، جرم کے بغیر موثر اخلاقی حس پیدا نہیں ہو سکتی[3] ۔

۱- جے - ہکسلے (Huxley) : ''ارتقائی اخلاقیات'' جسے ٹی - ایچ - ہکسلے اور جے - ہکسلے نے ''ارتقا اور اخلاقیات'' کے نام سے دوبارہ چھاپا -

۲- ایضاً ایضاً -

۳- ایضاً ایضاً -

بارھواں حصہ

مغربی تہذیب کے متعلق امیدوں کا نقشہ

انتالیسواں باب

زیر غور تحقیق کی ضرورت

راقم الحروف نے کتاب کے پیش نظر حصے کی ترتیب کے لیے قلم اٹھایا تھا تو اس کام سے جو میں نے خود اپنے ذمے لے لیا تھا ، طبیعت میں کراھت و نا پسندیدگی موجود تھی اور وہ اس طبعی گریز سے کسی قدر زیادہ ھی تھی جو کسی نظری موضوع کے خطرات کے سلسلے میں عام طور پر پایا جاتا ھے - یہ بھی ظاھر تھا کہ ۱۹۵۰ء میں جو پیش گوئی کی جائے گی ، ممکن ھے واقعات اس مسودے کے چھپنے اور شائع ھونے سے پیش تر ھی اسے غلط ثابت کر دیں لیکن اگر راقم الحروف کے دل میں غالب مصلحت یہی ھوتی کہ اپنے آپ کو مستوجب تمسخر بننے کے خطرات سے بچائے رکھے تو یہ مصلحت اسے پیش نظر کتاب کے ھر حصے کی ترتیب سے یقیناً باز رکھتی - گیارہ یرغمالوں کو تقدیر کے حوالے کر چکنے کے بعد بارھویں کی ترتیب شروع کرتے ھوئے اس کے لیے یہ خیال خاص حوصلہ افزا ھو سکتا تھا کہ ۱۹۲۹ء کے اوائل میں اس حصے کے نوٹ مرتب ھوئے تھے تو اس وقت کے مقابلے میں اب مغربی تہذیب کے متعلق امیدوں کے امکانات زیادہ واضح ھیں اور وہ نوٹ اب بھی میرے پاس پڑے ھیں - اس زمانے میں زبردست کساد بازاری مع اپنے تمام نتائج کے جن میں دوسری جنگ عظیم بھی شامل تھی ، شروع ھونے والی تھی ؛ یہ کساد بازاری ۱۹۵۰ء سے بہت پہلے اس التباس کو کاملاً محو کر چکی تھی جو ۱۹۲۹ء میں عام طور پر رائج تھا کہ حالات و معاملات عموماً ان سے زیادہ مختلف نہیں جیسے کہ ۱۹۱۴ء میں تھے -

پس اگر معاملہ پیش گوئی کے خطرات سے گریز ھی تک محدود تھا تو

تاریخ کے جو دو روشنی افزا دھے گزر چکے ھیں ، وہ پیش نظر موضوع کے متعلق راقم الحروف کی ناپسندیدگی میں بڑی حد تک تخفیف کر دیتے - غرض مغربی تہذیب کے متعلق آئندہ امیدوں کا جائزہ لینے کی مشکلات سے میری بے رغبتی کو یا تو بالکل کوئی تعلق نہ تھا یا تھا تو بہت تھوڑا تھا ، میرے تامل کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ میں اس اصول کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا جو اس کتاب میں مسلسل فائق رہا - میرا دل اس خوف سے متاثر تھا کہ ممکن ھے اس طرح وہ نقطۂ نگاہ ترک ہو جائے جس کے مطابق میرے نزدیک معاشروں کی تمام انواع کی پوری تاریخ کو صحیح رنگ میں دیکھنا ممکن ھے اور مغربی تہذیب ان انواع کی صرف ایک نمائندہ ھے - میں سمجھتا ھوں کہ اس غیر مغربی نقطۂ نگاہ کے درست ھونے کی تصدیق ان دو دھوں کے نتائج سے ھو گئی ھے جو غیر مغربی نقطۂ نگاہ سے تاریخ کے نقشے کو پڑھنے میں صرف ھوئے -

اس کتاب کی ترتیب پر جن محرکات نے مجھے ابھارا ، ان میں سے ایک یہ تھا کہ دور جدید کے آخری دور میں جو رسم قرار پا گئی تھی ، مغربی معاشرے کی تاریخ کے بارے میں سمجھا جائے یہ بجائے خود تاریخ ھے جسے جلی حروف میں لکھ دیا گیا ھے - اس رسم کے خلاف بغاوت ھوئی ؛ میرے خیال کے مطابق یہ رسم خود پرستی اور ''انا'' کو مرکز بنا لینے سے پیدا ھوئی ، مغربی تہذیب کے افراد بھی اسی طرح اس بیماری کے شکار ھوئے جس طرح دوسری تہذیبوں اور ابتدائی معاشروں کے افراد شکار ہو چکے تھے[1]-

---

۱- مرتب تلخیص ۱۹۳۵ء میں کوہ کلی مانجارو (Kilimanjaro ، ٹانگا نیکا کا پہاڑ) کے ڈھلوانوں پر ٹھہرا ھوا تھا ، اس پہاڑ کی جنوبی سمت میں چگا (Chagga) نام ایک قبیلہ رھتا ھے - اس قبیلے نے پہلی جنگ عظیم کا جو سبب بتایا ، وہ سننے کے قابل ھے : اس پہاڑ پر پہلے پہل ایک جرمن ڈاکٹر ھنس میئر (Hans Meyer) ۱۸۸۹ء میں چڑھا تھا ، چوٹی پر اسے دیوتا کا ایک بت ملا جو بہت خوش ھوا کہ اس پر توجہ ھوئی - چناں چہ اس نے خوش ھو کر چگا کا پورا علاقہ جرمنوں اور اس کے ھم وطنوں کے حوالے کر دیا لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ ڈاکٹر کے ھم وطنوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۴۸۵ پر)

خود پرستی کے نظریے سے ہٹ کر غور و فکر شروع کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کے برعکس نظریہ اختیار کر لیا جائے یعنی معاشرے کی تمام انواع کے نمائندے فلسفیانہ لحاظ سے ایک سطح پر ہیں اور سب میں مساوات ہے۔ راقم الحروف نے یہی مقابل کا نظریہ اختیار کیا اور کتاب کے ابتدائی چھ حصوں میں اس نظریے پر میرا اعتماد حق بہ جانب ثابت ہوا۔ ساتویں حصے میں تہذیبوں کی قدر و قیمت اس پرکھ اور امتحان کی شہادت کے برابر نہ آسکی جس میں کسوٹی یہ تھی کہ مذہبوں کی تاریخ میں ان کی (تہذیبوں کی) شکستوں اور انحلالات نے کیا کردار ادا کیا؛ اس کے برعکس یہ حقیقت سامنے آئی کہ اعلیٰ ترین حیثیت و اہمیت کی تہذیبیں وہ تھیں جنھیں دوسری نسل کی تہذیبیں کہا گیا ـــــ سریاتی، ہندی، یونانی اور چینی ـــــ کیوں کہ ان تہذیبوں نے اس دنیا سے گزرنے کے دوران میں انسانی روحوں کے لیے روحانی مواقع زیادہ مقدار میں مہیا کیے اور یہی چیز تاریخ میں رہنمائی کا خط بن گئی۔

راقم الحروف نے یہ نقطۂ نگاہ اخیار کر لیا تو مغربی تہذیب کو خاص تفصیلی جائزے کے لیے منتخب کرنے میں میری نا رضامندی اور تامل کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں سے کم از کم ایک سال میں (یا کہا کہ پانچ سال میں) ایک مرتبہ ضرور پہاڑ پر چڑھا کرے۔ چناں چہ حالات سازگار رہے، جرمنوں نے مشرق افریقہ پر قبضہ کر لیا اور ۱۹۱۴ء تک محنت کش جرمنوں کی کوئی نہ کوئی پارٹی پہاڑ پر ضرور چڑھتی رہی۔ بعد ازاں اس شرط کے ایفاء پر توجہ نہ ہوئی، خدا نے ناراض ہو کر اپنا عطیہ منسوخ کر دیا اور ملک جرمنوں کے دشمن کو دے دیا؛ انھوں نے اعلان جنگ کیا اور جرمنوں کو باہر نکال دیا۔ انگریزوں اور جرمنوں کی جنگ نے مشرق افریقہ میں شاخ سانے پیدا کیے؛ چناں چہ نسبۃً غیر اہم اور اُفتادہ علاقوں میں بھی لڑائیاں ہوگئیں۔

پہلی جنگ عظیم کے متعلق چگا قبیلے کا بیان اس قسم کے دوسرے بیانوں سے برا نہیں بلکہ اس سے بہتر ہے اس لیے کہ اس کے مطابق تاریخ میں مذہب کے کردار کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔

تقویت پہنچی - تاہم ۱۹۵۰ء میں اپنے اس نقشۂ عمل کا ——— جو ۱۹۲۷ء —— ۱۹۲۹ء میں تیار کیا گیا تھا ——— پابند رہنے کا فیصلہ تین منطقی حقائق کی بناء پر ہوا جن کی قوت و دل نشینی درمیانی سنین میں قطعاً کم نہ ہوئی :

اول یہ کہ بیسویں صدی مسیحی کے ربع ثانی میں صرف مغربی تہذیب اپنی انواع کی واحد نمائندہ تھی جس میں انحلال کے غیر متنازعہ فیہ نشان ظاہر نہ ہوئے تھے ؛ باقی سات میں سے پانچ ——— آرتھوڈکس مسیحی دنیا کا معاشرہ اور اس کی روسی شاخ ، مشرق بعید کی تہذیب اور اس کی کوریائی اور جاپانی شاخ اور ہندو تہذیب ——— ہمہ گیر سلطنت کے دور میں محض داخل ہی نہ ہوئیں تھیں بلکہ اس دور میں سے گزر چکی تھیں - ایرانی اور عربی مسلم تہذیبوں کی چھان بین سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں معاشرے بھی شکست کے قوی شواہد پیش کر رہے تھے ؛ صرف مغربی معاشرے کے متعلق یہ دعویٰ ممکن تھا کہ وہ ابھی تک نشو و ارتقا کے دور میں ہے -

دوسری حقیقت یہ تھی کہ مغربی معاشرے کی توسیع اور مغربی ثقافت کی تنویر تمام موجود تہذیبوں اور تمام موجود قدیم معاشروں کو مغربیت کے عالم‌گیر دائرے میں لے آئی تھیں -

تیسری حقیقت جس نے اس چھان بین کو حد درجہ ضروری بنایا ، اضطراب افزا تھی یعنی یہ کہ عالم انسانیت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نسل انسانی کے تمام انڈے ایک قیمتی مگر غیر یقینی ٹوکری میں رکھے گئے ہیں :

> وہ دن رخصت ہو گئے جب سمندروں یا پہاڑوں کی وجہ سے جنون و دیوانگی کی اشاعت پورے عالم انسانیت میں نہ ہو سکتی تھی ، جب نیرو اپنے بربط کے تاروں کی حماقتیں کرتا تھا مگر پیکن میں عقل کو پر سکون حکمرانی کا موقع حاصل تھا اور خدا بدھ کے چہرے پر خوش‌گوار انداز میں مسکراتا تھا ، کیلون جینوا میں خدا کی رحمت کے وعظ کہتا تھا - اب وسائل حمل و نقل سے مربوط کرۂ ارض سمٹ کر بہت چھوٹا رہ گیا ہے ، اب ایک ہٹلر کو پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سب کے ایام حیات

دیوانگی کی نذر ہو جائیں اور پوری دنیا میں اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے - آئی پوہ[1] بھی جنگ سے لرزتا ہے اور اپسڈن[2] بھی لرزتا ہے[3] -

تیسری عالم گیر جنگ کا موقع آیا تو وہ ایٹم اور جراثیم کے اسلحہ سے لڑی جائے گی ، یہ غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ موت انسان کی ارضی قیام گاہ کے ان گوشوں اور کونوں کو نظر انداز کر دے گا جن میں اب تک کوئی کشش نہ پائی جاتی تھی یا وہاں پہنچنا ممکن نہ تھا یا دونوں صورتیں موجود تھیں اور جہاں کے غریب ، کمزور اور پس ماندہ باشندے اپنے آپ کو "مہذب" عسکریوں کی ناخوشگوار توجہات سے محفوظ سمجھتے تھے - ٹرومین نے جب روس کے دباؤ کے خلاف یونان اور ترکی کو امریکہ کی طرف سے امداد دینے کا اعلان کیا تھا ، اس سے تین ہفتے پیش تر (۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو) راقم الحروف نے پرنسٹن میں ایک تقریر کی تھی ، اس میں فکر و خیال کو پرواز کی کھلی اجازت دے دی تھی - چناں چہ یہ بھی کہا کہ اگر مغربی دنیا نے تیسری عالمی جنگ کی آگ میں کودنا منظور کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ افلاطون کے خیالی نقشوں میں سے ایک نقشہ حقیقت ثابتہ کی حیثیت اختیار کر لے گا - ایتھنز کا فلسفی (افلاطون) کہتا ہے "پہاڑی گلہ بان وقتاً فوقتاً اپنی خلوت گاہوں سے باہر نکلیں گے تا کہ پرانی تہذیب کی خالی کیے ہوئے مقام میں نئی تہذیب کی داغ بیل ڈال دیں یعنی اس تہذیب کے مقام میں جو وقتی حوادث کے آخری ظہور میں تباہ ہو گئی" - نفس کے اجتماعی تحت الشعور کے نگار خانۂ تصورات میں گلہ بانوں سے مراد تخلیق باری تعالیٰ کی وہ خرچ ناشدہ ممکنات انسانیت ہیں ، جو ابھی تک مد محفوظ میں پڑی ہیں اس لیے کہ انسانیت کی بہت بڑی اکثریت انھیں ترغیبات کا شکار ہو گئی جس طرح کھیتی باڑی کرنے والا قابیل ، شہر بنانے والا حنوک[4] اور اسلحہ ساز

۱- Ipoh ، ملایا کا ایک مقام (مترجم) -
۲- Ipsden ، یہ بھی کوئی مقام ہی ہے ، میں اس کا پتا نہ لگا سکا (مترجم) -
۳- مارٹن سکز : "ملایا سے خطوط" (مترجم) -
۴- Enoch ، عبرانی تلفظ حنوک ہے عربی میں اسے "عنق" بھی کہتے ہیں (مترجم) -

توبل قائن[1] شکاری ہوئے۔ تہذیب کی راہ پر لگے ہوئے انسان کو جب مصائب سے سابقہ پڑا تو وہ محفوظ قوت کے اس ذخیرے پر پہنچتا رہا ہے جو اس کے قدیم وضع کے بھائیوں کے پاس موجود ہے؛ وہی بھائی جنھیں "مہذب" انسان نے روئے ارض کے بہتر خطوں سے نکال کر ان خطوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اور وہ بچارے بھیڑوں بکریوں کی کھالیں پہن کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرنے لگے۔ "مہذب" انسان کے قریبی اور حد درجہ خطرناک اقدام پر غور کرتے ہوئے بھی یہی صورت حال پیش نظر آتی ہے: زمانہ ماضی میں آل ہابیل کے یہ نسبۃً معصوم باقیات آل قابیل کے سروں پر دھکتے ہوئے کوئلے ڈالتے رہے، وہ ان قاتلوں کو بچانے کے لیے سرگرم عمل ہوتے رہے؛ یونانی تاریخ کے المیے کی تمہید اسکرہ کے ایک گلہ بان نے پیش کی تھی اور اسکرہ کوہ ہیلی کون[2] کے دامن میں ہے؛ نجب کے گلہ بان جو صحرائے عرب کے حواشی میں رہتے تھے، بیت اللحم میں مسیحیت کے گہوارے کے پاس ٹھہرے تھے۔ راقم الحروف نے افلاطونی انداز اختیار کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں بتایا تھا کہ اگر مغربی تہذیب نے جن میں خود میں اور میرے سامعین شامل تھے، کوئی ایسا قدم اٹھایا جس سے ربع مسکون کسی بہت بڑے حادثے کا شکار ہو گیا تو جو ثقافت پانچ چھ ہزار سال سے ہمارے سامنے نشو و نما پا رہی ہے، اسے ازسر نو شروع کرنے کا کار اہم غالباً اہل تبت کے حوالے ہو جو اپنی سطح مرتفع کے بلند حصار میں محفوظ بیٹھے ہیں یا یہ کام اسکیموؤں کے سپرد ہو جو بے رحم برفستانوں میں محصوریت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور برفستان ان کے لیے اس انسان کے مقابلے میں کم مصیبت خیز ہیں جو انسانوں کے لیے بھیڑیا بنا ہوا ہے۔ اس تقریر پر ساڑھے تین سال کی مدت گزر چکی ہے اور اسی یونیورسٹی (پرنسٹن) کے شہر میں ایک پر امن چاردیواری میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہے۔ حالات کی رفتار نے انھیں خیالات کو جا لیا ہے اور ان کے پیچھے گھوڑے دوڑائے چلی آرہی ہے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں یہ سطریں سپرد قلم ہو رہی ہیں؛ حملہ آور چینی کیمونسٹوں کی ایک فوج کے بارے میں اطلاع ملی ہے، وہ

۱- Tubal-Cain -

۲- Mount Helion -

لہاسا جا رہی ہے ۔ اس کے مقابلے میں اسکیموؤں کی حالت پر نظر ڈالیے ؛ وہ بے چارے خوش تھے کہ ایک خوف ناک قدرتی فضا کے سوا نہ کوئی ان کا دشمن ہے اور نہ دوست لیکن اب انھیں یہ مصیبت پیش آئی ہے کہ مسس سپی اور والگا کے درمیان بم باری کا راستہ تجویز ہو رہا ہے جو قطب شمالی میں سے گزرے گا (گویا اسکیمو اس کی زد میں آ جائیں گے) ؛ اسی طرح ایک راستہ آبنائے بیرنگ کے آس پاس کے برفستانوں سے گزرے گا ، یہ ایشیائی روس کے انتہائی شمالی گوشے سے جہاں زمانۂ قدیم کے لوگ رہتے ہیں ، ایلاسکا جائے گا جو جمہوریۂ امریکہ سے بالکل منقطع تھا البتہ کینیڈا میں سے ہو کر وہاں جاتے تھے ۔

غرض ظاہر ہے کہ رجائی مغربی معاشرے کے ہاتھ میں فی الحال پورے عالم انسانیت کی تقدیر آ گئی ہے اور خود مغرب کی اپنی تقدیر ماسکو کے ایک آدمی اور واشنگٹن کے ایک آدمی کی انگلیوں کی نوک پر ہے ، وہ ایک بٹن دبا کر ایک ایٹم بم چھوڑ سکتے ہیں ۔

ان حقائق نے راقم الحروف کو ۱۹۵۰ء میں با دل ناخواستہ اس نتیجے کی تصدیق و توثیق پر آمادہ کیا جس پر وہ با دل ناخواستہ ۱۹۲۹ء میں پہنچا تھا کہ مغربی تہذیب کے بارے میں امیدوں کے ممکنات کی چھان بین بیسویں صدی کے مطالعۂ تاریخ کا ایک ضروری جزو ہے ۔

چالیسواں باب

قیاسی جوابات کی غیر فیصلہ کن حیثیت

پہلا سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء میں مغربی تہذیب کی زندگی کے متعلق کیا امید رکھی جا سکتی تھی؟ تاریخ کا طالب علم ابتدا میں اس امر کی طرف راغب ہوگا کہ اس تہذیب کے بارے میں امیدیں ہرگز خوش گوار نہیں ہو سکتیں اس لیے کہ قدرت کا اسراف سب پر آشکارا ہے۔ بہ ہر حال مغربی تہذیب اپنی نوع کے اکیس افراد میں سے صرف ایک ہے، پر کیا اسے معقول سمجھا جا سکتا ہے کہ اکیس میں سے صرف ایک کے متعلق یہ امید رکھی جائے کہ وہ اس ناکامی سے پہلو بچاتی ہوئی نکل جائے گی جو دوسری تہذیب کے مقدر میں مرقوم تھی؟ زمین پر زندگی کے ارتقا کی تاریخ ماضی پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ناکامیوں کی ایک خاصی تعداد میں قربانیاں کرتے کرتے بڑی مشکل سے کامیابی حاصل ہوئی۔ تہذیبیں بہت بعد کی پیداوار ہیں اور اس نوع کو بہ لحاظ عمر حدیث العہد قرار دینا چاہیے۔ یہ غیر اغلب ہے کہ اس نوع کی تیسری نسل کا کوئی نمایندہ برابر زندہ رہنے کا کوئی ایسا راستہ اور ایسا طریقہ دریافت کر لینے کے لیے وضع ہوا ہے جہاں پہلے کسی کے قدم نہیں پہنچے تھے اور وہ نمایندہ بہ دستور لا متناہی مدت تک نشو و ارتقا پاتا جائے گا یا وہ یکایک کایا پلٹ کر دوسری صورت اختیار کر لے گا اور اس طرح معاشرے کی ایک نئی نوع معرض وجود میں آ جائے گی۔

تاہم انسانی سطح پر نہیں تو انسان سے پیش تر کی سطح پر زندگی کے تجربات سے ایسا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ جب قدرت ابتدائی اجسام کے ارتقا میں مصروف تھی تو اس نے لاکھوں کروڑوں نمونے تیار کر لیے، غرض یہ تھی کہ ممکن ہے کوئی ایسا نمونہ معرض وجود میں

آ جائے جس سے کوئی نادر اور اعلیٰ خاکہ تیار کیا جا سکے - پودوں، کیڑوں مکوڑوں، مچھلیوں وغیرہ کے ارتقا میں قدرت کی کار فرمائی کے لیے بیس نمونے مضحکہ خیز حد تک کم تھے لیکن یہ فرض کر لینا بھی بالکل مناسب نہ ہوگا کہ ارتقا کے جو قاعدے اور ضابطے حیوانی اور نباتی اجسام کے لیے ناگریز تھے، ان کا اطلاق لازماً سراسر مختلف نوع پر ہوگا جیسے وہ انسانی معاشرے جو راہ تہذیب پر لگے ہوئے ہوں - واقعہ یہ ہے کہ قدرت کے اسراف سے استدلال پیش نظر معاملے میں استدلال کہلانے کا مستحق ہی نہیں؛ بلاشبہ ہم نے یہ سوال اٹھایا مگر صرف اس لیے کہ اسے رد کر دیں -

ہمارے سوال کے سلسلے میں جذباتی قیاسی جوابات کا ایک جوڑا باقی ہے؛ تہذیبوں کی مہیا کردہ شہادتوں پر غور و خوض سے پیشتر ہمیں ان جوابات کو بھی پیش نظر لے آنا چاہیے، یہ دونوں جذباتی جوابات باہم متضاد ہیں - زیر غور کتاب کا مصنف ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا تھا، میں نے اپنی زندگی میں دیکھا کہ اہل مغرب ان دونوں احساسات میں سے ایک کی جانب سے دوسرے کی جانب منتقل ہو گئے -

انیسویں صدی کے اواخر میں برطانیہ کلاں کے طبقۂ وسطیٰ میں جو نقطۂ نگاہ رواج پذیر تھا، اس کی کیفیت ایک طنزیہ میں سے اقتباس پیش کر کے بخوبی واضح کی جا سکتی ہے؛ یہ سکول کے دو استادوں نے لکھا تھا اور اس میں تاریخ کے متعلق طلبہ کا وہ تصور بتایا گیا تھا جو امتحانوں میں ان کے سامنے ہوتا ہے، اس کا نام تھا "۱۰۶۶ء اور اس کے متعلقات":

تاریخ ختم ہو گئی ہے لہٰذا تاریخ کو آخری چیز سمجھنا چاہیے -

انگریزوں کے اس طبقۂ وسطیٰ کا نظریہ جو حد درجہ جدت پسند تھا، ان جرمنوں اور شمالی امریکہ کے باشندوں کی اولاد میں بھی رائج تھا جو دور حاضر کی مغربی جنگوں میں کامیابی حاصل کر چکے تھے - جنگ عمومی (۱۷۹۲ء - ۱۸۱۵ء) کی پچھیتی لڑائیوں سے فائدہ اٹھانے والوں کو اس وقت یہ شبہ نہ ہوا تھا کہ تاریخ مغرب کا دور جدید ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ دور جدید کے بعد کا عہد شروع ہو چکا ہے جو الم ناک تجربات سے لبریز ہے - بالکل یہی حالت ان کے انگریز ہم سروں کی تھی، وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے فائدے کے لیے دور جدید کی ایک معقول، محفوظ اور اطمینان بخش زندگی معجز نما طریق پر وجود میں آ گئی ہے، یہ اس لا متناہی حال میں

برابر قائم رہے گا جو اچانک شروع ہو گیا؛ حال کے لا متناہی ہونے کا یہ احساس ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں ساٹھ سال تک قائم رہا۔ ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر ایک کتاب مرتب کی گئی تھی جس کا نام تھا ''ساٹھ سال ملکہ''۔ اگر اس کی تصویروں پر ایک نظر بھی ڈال لی جاتی تو صاف ظاہر ہو جاتا کہ تیزی سے حرکت کرنے والا یہ پر شکوہ منظر بدل رہا ہے، صنعت و حرفت اور دستکاریوں سے لے کر لباس تک زندگی کے ہر دائرے میں تبدیلی ہو رہی ہے۔

اس وقت انگریزی طبقۂ وسطیٰ کے کنسرویٹو (قدامت پسند) سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے لیے عہد سعادت و عروج آ چکا ہے اور طبقۂ وسطیٰ کے لبرلوں (آزاد خیالوں) کی رائے تھی کہ دائمی خوش حالی کے دور پر پہنچنے کے لیے صرف موڑ مڑنے کی ضرورت ہے؛ ساتھ ہی دونوں کو علم تھا کہ طبقۂ وسطیٰ کی خوش حالی میں انگریز قوم کے مزدوروں کا حصہ حد درجہ کم ہے، دونوں آگاہ تھے کہ سلطنت برطانیہ کی بہت سی نو آبادیوں اور محکوم خطوں کی برطانوی رعایا اس حق خود مختاری سے محروم ہے جس سے خود برطانیہ کے لوگ مستفید ہیں لیکن عدم مساوات کے ان حقائق کو لبرلوں نے یہ کہ کر نظر انداز کر دیا کہ ان کی اصلاح ہو سکتی ہے اور قدامت پسندوں نے انھیں ناگریز قرار دیا۔ ٹھیک اسی طرح جمہوریۂ امریکہ کی شمالی ریاستوں کے معاصر شہریوں کو علم تھا کہ انھیں جو اقتصادی خوش حالی نصیب ہوئی ہے، اس سے جنوبی ریاستوں کے باشندے محروم ہیں؛ محض یہی نہیں، سلطنت جرمنی کے باشندوں کو بھی آگاہی تھی کہ فرانس سے جو علاقے الگ کر کے جرمنی میں شامل کیے گئے ہیں، ان کے باشندے دل سے بہ دستور فرانسیسی ہیں اور فرانسیسی قوم ان علاقوں کے کاٹ لینے پر راضی نہیں ہوئی[1]، فرانسیسیوں کے دل میں انتقام کی آگ بہ دستور بھڑک رہی تھی اور السّاس و لورین کی آبادیاں یہ خواب دیکھ رہی تھیں کہ انجام کار

۱- اشارہ ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و جرمنی کی طرف ہے جس میں جرمنی نے انتہائی تیزی سے فرانس کی بہت بڑی فوج کو نرغے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا اور نپولین سوم کو تاج و تخت چھوڑنا پڑا تھا، اس میں فرانس کے دو صوبوں السّاس اور لورین پر جرمن قابض ہو گئے تھے۔

ان کے لیے بھی آزادی کا دور آئے گا جس طرح دوسرے محکوموں یعنی سلسوک، پولینڈ، مقدونیا اور آئرلینڈ کے باشندوں کے لیے آیا۔ یہ لوگ اس راحت افزا عقیدے کو قبول نہ کر سکے کہ تاریخ آخری منزل پر پہنچ چکی ہے، بلا شبہ ان لوگوں کا پختہ عقیدہ تھا کہ جو ناقابل برداشت نظام ان پر مسلط کیا گیا ہے، اسے وقت کی ہمیشہ جوش و خروش سے بہنے والی ندی زود یا بہ دیر اپنے ساتھ بہا لے جائے گی، لیکن جو طاقتیں اس وقت برسر اقتدار تھیں، ان کے نمایندوں کے اونگھتے ہوئے خیالات و افکار پر اس عقیدے کا کچھ اثر نہ تھا۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۷ء میں قومی یا مجلسی انقلاب کے حد درجہ مخلص پیش گوؤں میں سے مرد ہو یا عورت، ایک بھی نہ تھا جس کے خیال میں یہ بات آئی ہو کہ قومی خود مختاری کا مطالبہ آیندہ پچیس سال میں ہیپس برگ (آسٹریا)، ہوہنزولرن (جرمنی) اور رومانوف (روس) سلطنتوں کو پارہ پارہ کر ڈالے گا اور سلطنت متحدہ برطانیہ سے آئرلینڈ کو الگ کر دے گا یا اشتراکی جمہوریت مغربی دنیا کے چند غیر معمولی صنعت کار علاقوں کے شہری مزدوروں سے نکل کر چین اور میکسیکو کے کسانوں تک میں پھیل جائے گی؛ گاندھی (پیدائش ۱۸۶۹ء) اور لینن (پیدائش ۱۸۷۰ء) اس زمانے میں سراسر غیر معروف تھے، لفظ کمیونزم نہایت بھیانک مگر مختصر اور بہ ظاہر بے تعلق ماضی کے واقعے کی یادگار تھا جس کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ تاریخ کے آتش فشاں پہاڑ کا آخری اشتعال تھا، پھر وہ پہاڑ ہمیشہ کے لیے افسردہ ہو گیا۔ اس خوف ناک وحشت کا انفجار پیرس کے ادنیٰ طبقے کے اندر ۱۸۷۱ء میں ہوا تھا اور اسے حیرت انگیز فوجی تباہی کے صدمے کا رد عمل سمجھا جاتا تھا، ساتھ ہی خیال تھا کہ وہ پشتنی روگ کا ایک اعادہ تھا اور اس پر ہرگز توجہ نہ کرنی چاہیے، اس وحشت کے دوبارہ مشتعل ہونے کا کوئی واضح خطرہ موجود نہ تھا؛ چناں چہ یہ انگارہ ربع صدی تک سرمایہ دار تیسری جمہوریت[1] کے نم آلود کمل کے نیچے سلگتا رہا۔

۱- تھرڈ ری پبلک۔ فرانس میں یہ جمہوریت نپولین سوم کی بادشاہی کے خاتمے پر قائم ہوئی، پہلی جمہوریت انقلاب کے بعد قائم ہوئی تھی، پھر نپولین اعظم بادشاہ بن گیا؛ دوسری جمہوریت بوربون کے خاندان کو ختم کر کے قائم کی گئی، اسے نپولین سوم نے ختم کیا؛ تیسری جمہوریت ۱۹۴۰ء تک رہی، دوسری جنگ عظیم کے بعد چوتھی جمہوریت قائم ہوئی۔ (مترجم)

ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر مطمئن و خوش حال طبقہ وسطیٰ کی خوش امیدی کوئی نئی چیز نہ تھی ؛ ایک سو سال پیش تر بھی یہی کیفیت تھی جب گبن اور ٹرگو[1] کا دور موجود تھا اور ٹرگو نے ۱۷۵۰ء میں سوربون[2] میں دوسرا خطبہ دیا تھا جس کا عنوان تھا " مسیحیت کے قیام نے انسانیت کے لیے کیا کیا فائدے بہم پہنچائے "۔ ایک سو سال اور پیچھے چلے جائیں تو ہمیں پیپیز[3] کے سرسری اتفاقی تبصرے ملتے ہیں ؛ اس تیز نظر روزنامچہ نگار نے سیاسی اور اقتصادی " مقیاس الھوا " (بیرو میٹر) میں پارے کا درجہ بلند ہونے کا اندازہ کر لیا تھا ۔ ۱۶۴۹ء اور اس کے متعلقات جن میں سینٹ بارتھو لومیو کا قتل اور ہسپانیہ کا نظام تعذیب شامل تھے ، زمانہ ماضی کا افسانہ بن چکے تھے ۔ پیپیز کا زمانہ وہی تھا جس میں دور جدید کے متاخر عہد (۱۶۷۵ء - ۱۸۷۵ء) کا آغاز قرار پایا ؛ یہ دور یقین کے عظیم الشان زمانوں میں سے ایک ہے یعنی ترقی پر یقین اور انسان کی کاملیت پر یقین ؛ پیپیز سے دو نسل پیش تر اس یقین کا بلند آہنگ داعی فرانسس بیکن[4] مل جائے گا ۔

جو یقین تین سو سال زندہ رہا ، وہ آسانی سے نہیں مر سکتا ؛ اس پر ۱۹۱۴ء میں نہایت سخت ضرب لگی لیکن دس سال بعد اس کا از سر نو اظہار اس شخص کے ایک خطبے میں ہوا جو ممتاز مورخ بھی تھا اور "طوفان" سے پیش تر کی نسل میں سرکاری ملازم بھی یعنی سر جیمس ہیڈلم مارلے[5] :

> اس ثقافت کا (مغربی ثقافت) سب سے پہلا نقطہ جو ہمارے سامنے آتا ہے ، یہ ہے کہ اگرچہ پورے مغربی یورپ کی تاریخ

۱- Turgot - فرانس کا مشہور مدبر (۱۷۲۷ء - ۱۷۸۱ء) ، اس نے اصلاح احوال کی بڑی کوشش کی لیکن بر سر اقتدار لوگوں نے اسے بے بس کیے رکھا (مترجم) ۔

۲- Sorbonne - طرگوکی ولادت گاہ اور وطن (مترجم) ۔

۳- Pepys - مشہور روزنامچہ نگار انگریز (۱۶۳۳ء - ۱۷۰۳ء) ، اس کا روزنامچہ جنوری ۱۶۵۹ء سے مئی ۱۶۶۹ء تک ہے ، ۱۸۲۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا اور یہ بڑا قیمتی ہے (مترجم) ۔

۴- Francis Bacon - انگریز مدبر (۱۵۶۱ء - ۱۶۲۶ء) ، بڑے اونچے عہدوں پر فائز رہا ، اس کی تصنیفات نے بھی بڑی شہرت پائی - (مترجم)

۵- James Headlam Morley -

مشترک ہے لیکن وہاں کے مختلف ملکوں کے باشندے باقاعدہ کسی سیاسی اتحاد میں منسلک نہ ہوئے اور نہ تمام ملکوں میں کبھی ایک حکومت قائم ہوئی - کچھ مدت تک یہ معلوم ہوتا رہا کہ شارلمین پورے رقبے پر اپنا اقتدار جما لے گا لیکن یہ امید جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ، پوری نہ ہوئی - اس نے نئی سلطنت قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی ، وہ ناکام ہوئی ؛ بعد ازاں بھی تمام کوششیں ناکام ہوتی رہیں - ہسپانیہ اور فرانس کے حکم رانوں اور بعد کی سلطنتوں نے بار بار پورے مغربی یورپ کو متحد کرنے کی کوشش کی تاکہ ایک بڑی سلطنت وجود میں آ جائے مگر ہمیشہ ایک ہی نتیجہ نکلا - مقامی وطنیت اور شخصی آزادی کے جذبات سے اپیلیں کی گئیں ، مزاحمت کی روح پیدا ہوئی اور اس نے ہر فاتح کی کوششوں کو ناکام بنا دیا ؛ یہ یورپ کی عام خصوصیت ہے جسے نقاد لوگ انارکی سے تعبیر کرتے ہیں - مشترک حاکم کے فقدان کا مطلب یہ ہے کہ باہم کشمکش ، رزم و پیکار اور جنگ ہو ، حکومت کے حریف عناصر کے درمیان علاقے اور اقتدار و برتری کے لیے مسلسل افراتفری جاری رہے -

یہ ایسی صورت حال ہے جو بہت سے لوگوں کے لیے بڑی پریشان کن ہے ؛ یقیناً اس میں قوت زیادہ خرچ ہوگی ، دولت بڑی حد تک تباہ ہوگی ، وقتاً فوقتاً زبردست جانی نقصان بھی اٹھانا پڑے گا لہٰذا بہت سے آدمی ہیں جو چاہتے رہے ہیں کہ آہستہ آہستہ ایک مشترک حکومت قائم کر دی جائے اور اس کے نہ ہونے کی وجہ سے یورپ کی تاریخ کا مقابلہ رومی شاہنشاہی کی تاریخ سے یا —— یہی موجودہ زمانے کی تاریخوں میں سے —— جمہوریۂ امریکہ کی تاریخ سے کرتے ہیں - دانتے کے بعد بہت سے آدمی پیدا ہوئے جن کی آرزو تھی کہ ایسی منظم حکومت قائم ہو جائے جو خدائے بزرگ کا آلہ کار اور سایہ

معلوم ہو ۔ ہم بارہا سنتے ہیں کہ اگر امریکہ کی سر زمین پر انگریزی ، اطالوی ، پولستانی ، روتھینی ، جرمن ، سکنڈے نیویائی وغیرہ سب پہلو بہ پہلو امن سے رہ سکتے ہیں اور قانع ہیں تو یہ لوگ اپنے اصلی وطنوں میں کیوں اسی طریقے پر عمل پیرا نہیں ہوتے ؟

میں آج مستقبل کے مقاصد زیر بحث نہ لاؤں گا ؛ ہمیں صرف ماضی سے سروکار ہے ، ہمیں صرف یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ انارکی ، یہ رزم و پیکار اور یہ رقابت اس وقت بھی موجود تھی جب اس بر اعظم کی سر گرمیاں درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھیں ؛ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بحیرۂ روم کی دنیا کی سر گرمیاں ——— قوت حیات ، روح فن اور ذہنی جدت ——— بہ ظاہر تدریجاً مگر مستقل طور پر زوال پذیر ہیں ۔ اس زوال کا آغاز اور مشترکہ حکومت کا قیام ایک وقت میں پیش آیا ، کیا اس کی یہ تو وجہ نہیں کہ تصادم اور بدنظمی میں قوت تباہ ہی نہیں ہوئی بلکہ یہی تصادم قوت پیدا کرنے کا بھی ذمہ دار ہے ؟[1]

گبن کی اطمینان دلانے والی آواز سننا بڑا عجیب ہے ، یہ اب تک اس انگلستان میں گونج رہی ہے جو اب الہامی بگل کی خوف ناک آواز سے گونجنے لگا ہے ۔ جس متضاد احساس نے یونانی تہذیب کے زوال و انحطاط کی اہمیت کو مختلف رنگ میں پیش کیا تھا ، وہ ۱۹۲۳ء تک تباہ حال مغربی دنیا میں بڑے عروج پر تھا ۔

ہیڈلم مارلے کے لکچر دینے سے پانچ سال پیش تر پال ولیری[2] بڑے

۱- ہیڈلم مارلے کی کتاب : ''مغربی یورپ کی ثقافتی وحدت'' یہ ایک مضمون تھا جو کارٹر کے مرتب کردہ مجموعہ میں چھپا ، اس کا نام ہے

The New Past and other essays on the Development of Civilization.

۲- Paul Valery -

پر فصیح انداز میں اعلان کر چکا تھا کہ تمام تہذیبیں فانی ھیں ، شپنگلر بھی اس وقت یہی راگ الاپ رہا تھا ؛ ہم اب دیکھ سکتے ھیں کہ نظریۂ ترقی متعدد غلط قضایا پر مبنی تھا لیکن کیا اس اعتراف کے بعد ھمیں نظریۂ ھلاکت قبول کر لینا چاھیے ؟ یہ بڑا ھی سرسری طریق استدلال ھوگا ، اس بنا پر ایک شخص کہ سکتا ھے کہ فلاں شخص چوں کہ جوھڑ میں گر چکا ھے لہٰذا اس جوھڑ کو عبور کرنے کا کوئی راستہ ھے ھی نہیں ؛ ولیری کی قنوطیت اور گبن کی رجائیت دونوں جذبات کی عقلی تنظیم کی صورتیں ھیں جو ان دونوں شخصوں کے مختصر سے دور زندگی کے لیے سطحی طور پر موزوں ثابت ھوئیں ۔

اکتالیسواں باب

تہذیبوں کی سرگزشتوں کی شہادت

۱- غیر مغربی مثالوں کے ساتھ مغربی تجربات

اس کتاب کے ابتداعی حصے میں ہم متعلقہ تاریخی حقائق کا جائزہ لیتے ہوئے تہذیبوں کی شکست کے اسباب اور عمل انحلال میں ایک حد تک بصیرت حاصل کر چکے ہیں اور شکست کے احوال کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ شکست کا اصل سبب ہر معاملے میں خود مختاری کا فقدان ثابت ہوا؛ جو معاشرہ معرض شکست میں آتا ہے، وہ کسی خود ساختہ بت کی غلامی کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال کر آزادی انتخاب کا خوش گوار حق کھو بیٹھتا ہے۔ بیسویں صدی مسیحی کے وسط میں مغربی معاشرے نے بہ ظاہر کئی بتوں کی پرستش شروع کر رکھی تھی اور سب میں ممتاز ترین درجہ علاقائی حکومتوں کو حاصل تھا۔ متاخر دور جدید کی مغربی زندگی کا اس پہلو کو دو وجہ سے حد درجہ خوف ناک علامت سمجھنا چاہیے؛ اول اس لیے کہ بت پرستی کو مغربیت کیش دنیا کی بہت بڑی اکثریت کے نزدیک مذہب کی حیثیت حاصل ہے اگرچہ اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا؛ دوم اس لیے کہ یہ جھوٹا مذہب اکیس تہذیبوں میں سے چودہ یا شاید سولہ کی موت کا باعث بن چکا ہے۔

تینوں نسلوں کی تہذیبوں میں موت کا عام ترین سبب باہمی رزم و پیکار کے سوا کچھ نہ تھا جس کی شدت میں برابر اضافہ ہوتا رہا: پہلی نسل کی تہذیبوں میں سے سمیری اور آنڈی تہذیبیں اور شاید منوی تہذیب بھی اسی وجہ سے موت کے گھاٹ اتریں؛ دوسری نسل کی تہذیبوں میں سے بابلی، ہندی، سریانی،

یونانی ، چینی ، میکسیکی اور یوکاٹائی کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا ؛ تیسری نسل کی تہذیبوں میں سے اس سلسلے میں آرتھوڈکس مسیحی تہذیب ——— اصل بھی اور اس کی روسی شاخ بھی ——— مشرق بعید کی تہذیب کی جاپانی شاخ ، نیز ہندو اور ایرانی تہذیبوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے سوا باقی پانچ تہذیبوں کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے : ہمارے لیے یہ شبہ کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ہٹی تہذیب باہمی رزم و پیکار کے باعث گھر میں تباہ ہو چکی تھی ، اس کے بعد اس کے لیے متحجر مصری دنیا سے قوت آزمائی کا موقع آیا ، بعد ازاں بربریوں کی مہاجرت کے سامنے وہ سرنگوں ہو گئی ؛ مایائی تہذیب میں تا حال باہمی رزم و پیکار کی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہو سکی ؛ مصری اور مشرق بعید کی چینی تہذیبوں نے اپنی زندگیاں ایک مختلف النوع بت کی بھینٹ چڑھا دیں یعنی انھوں نے عالم گیر سیاست کے خواب دیکھے اور اس غرض سے ایک ایسا دفتری نظام تیار کر لیا جس کی لیمو نچوڑ خصلت لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہو رہی تھی۔ بس ایک عربی معاشرہ رہ گیا ، ممکن ہے اسے حضری دنیا میں ایک طفیلی خانہ بہ دوش ادارے نے تباہ کیا ہو ——— مصر کے مملوکوں کا غلامی سے اٹھ کر اقتدار حاصل کر لینا ——— البتہ اگر معاشرہ اپنی تباہی کو کسی اجنبی حملہ آور کی یورش کا نتیجہ قرار دے تو یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال ہوگی۔

نیز تاریخ مغرب کے اس باب میں جو متاخر دور جدید سے متعلق ہے ، مقتدر علاقائی حکومتوں کی پرستاری کے تباہ کن اثرات میں جمہوریت کی گرم روی نے بہت اضافہ کر دیا ہے ، ہمہ گیر مذہبی نظام ایک حد تک باز داشت کا کام دے سکتا تھا لیکن اس کا اثر ہی باقی نہ رہا۔ جمہوریت کے فشار نے قومیت کا لباس پہنا اور بعض دوسرے نئے نظریات کے ساتھ مل کر جنگ کو حد درجہ تلخ بنا دیا ؛ صنعت اور فن کاری کی ترقیات کے محاربوں کے لیے حد درجہ تباہ کن ہتھیار مہیا کر دیے۔

جو صنعتی انقلاب مغربی دنیا پر اٹھارھویں صدی مسیحی میں اثر انداز ہوا ، وہ اس اقتصادی انقلاب کا مثنیٰ تھا جو چھٹی صدی قبل مسیح میں یونانی دنیا کے اندر بپا ہوا تھا۔ ان انقلابات سے پیش تر دونوں جگہ مختلف طبقے علاحدگی کی حالت میں ضرورت کے مطابق کھیتی باڑی کر کے روزی پیدا کر لیتے تھے ؛ انقلابات کے بعد انھوں نے اقتصادی لحاظ سے اشتراک قبول

کر لیا تاکہ ان کی پیداوار اور آمدنی میں اضافہ ہو جائے اور اس غرض سے انھوں نے خاص جنسیں بونی شروع کیں اور انھیں مبادلے کا ذریعہ بنایا ، اس طرح وہ کفایت بالذات کی نعمت سے محروم ہو گئے اور چاہتے بھی تو پھر پہلی حالت پر نہ آ سکتے تھے - نتیجہ یہ نکلا کہ اقتصادی سطح پر معاشرے کو ایک نئی تعمیر کا بندوبست کرنا پڑا اور اسے سیاسی سطح کی تعمیر سے کوئی مناسبت و مطابقت نہ تھی ؛ یونانی معاشرے کے مجلسی نظام میں اس طرح جو فتور پیدا ہوا ، اس کے مہلک اثرات بارہا ہمارے سامنے آ چکے ہیں -

دور جدید کی مغربی تاریخ کا ایک حوصلہ فرسا پہلو یہ ہے کہ پہلے پروشیا میں پھر جرمنی کی وسیع تر فضا میں عسکریت کا ظہور ہوا جو دوسری تہذیبوں کی تاریخ میں اس درجہ مہلک ثابت ہوتی رہی - یہ عسکریت پہلے پہل پروشیا کے بادشاہوں فریڈرک ولیم اول اور فریڈرک اعظم (۱۷۱۳ء - ۱۷۸۶ء) کے عہد میں نمایاں ہوئی اور یہ وہ زمانہ تھا جب تاریخ مغرب میں لڑائیاں محض رسمی حیثیت میں کی جاتی تھیں اور ان کے نقصانات کم سے کم رہ گئے تھے - عسکریت کا آخری نمونہ وہ تھا جو نیشنل سوشلیسٹ جرمنی نے (ہٹلر کی قیادت میں) پیش کیا اور جسے عسکریت کا دیوانہ کتا کہنا موزوں ہوگا ؛ اسے ایشوریوں کے اس طوفان سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کا درجہ حرارت تغلت پلسر سوم (عہد حکومت ۷۴۶ ق م — ۷۲۷ ق م) نے تیسرے درجے پر پہنچا دیا تھا - نیشنل سوشیلسٹ پارٹی کی جنگی مشین نے خوف ناک تباہ کاریاں کیں جن کی مثال پہلے نہیں ملتی ؛ رہا یہ سوال کہ آیا ان تباہ کاریوں نے مغربیت کیش دنیا کے تمام حصوں کے عسکریت پسندی کے ارادوں سے ہٹا دیا ہے تو تا دم تحریر اس سوال کا جواب مشتبہ ہے -

ان بڑی علامتوں کے مقابلے پر چند اچھی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں : ایک قدیم ادارہ ایسا بھی تھا جو جنگ سے کم برا نہ تھا ، مغربی تہذیب اسے ختم کر چکی ہے ؛ جو معاشرہ غلامی کو ختم کرنے میں کام یاب ہو چکا ہے ، وہ ایک مسیحی نظریے کی بے مثال کام یابی سے حوصلہ پا کر اس کے ہم سر جنگی ادارے کو بھی ختم کرنے میں مصروف ہو سکتا ہے - جنگ اور غلامی اس وقت سے تہذیب کے لیے دو سرطان چلے آتے ہیں جب سے معاشرے کی یہ نوع وجود پذیر ہوئی ، ایک کی تسخیر میں کامیابی دوسرے کے خلاف اجرائے مہم کے سلسلے میں امید افزائی کی فال نیک بن سکتی ہے -

مزید برآں جو مغربی معاشرہ ابھی تک جنگ کی تباہ کاریوں سے متاثر ہے ، روحانی میدان ہائے جنگ میں اپنے کارناموں سے حوصلہ افزائی کا سامان فراہم کر سکتا ہے - جب صنعت کاری نے نجی جائداد و املاک کے ادارے پر اثر ڈالا اور دعوت مقابلہ کی صورت پیش آ گئی تو اس کے جواب میں مغربی معاشرے کے بہت سے ملکوں نے غیر محدود اقتصادی انفرادیت کے سلا[1] اور حکومت کے ذریعے سے اقتصادی سرگرمیوں کے مطلق العنانہ ضبط و نظم کی چیربدس[2] کے درمیان راستہ نکالا ؛ تعلیم پر جمہوریت کے فشار کے سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ کام ہو چکا ہے ، تہذیب کے آغاز طلوع سے جو علمی خزانے ایک مختصر سی اقلیت کے قبضے میں تھے اور وہی اقلیت ان سے مرضی کے مطابق فائدہ اٹھاتی تھی ، ان کے دروازے عوام کے لیے کھول دیے گئے ہیں ؛ اس طرح دور جدید کے مغرب کی روح جمہوریت نے انسانیت کے لیے امید کا ایک نیا چراغ جلا دیا ، ساتھ ہی اسے ایک نئے خطرے سے بھی دو چار کر دیا - خطرہ یہ تھا کہ سرسری تعلیم نے پروپیگنڈے کے لیے دروازہ کھول دیا تھا ؛ چناں چہ اشتہار باز بیوپاریوں ، خبر رساں ایجنسیوں ، سیاسی پارٹیوں اور مطلق العنان حکومتوں نے جس ہنرمندی اور ہر قسم کے اخلاقی ضوابط سے بے پروائی کے ساتھ اسے استعمال کیا ، وہ محتاج بیان نہیں - امید کا پہلو یہ ہے کہ ممکن ہے نیم تعلیم یافتہ عوام کو اپنے ناجائز فوائد کے لیے استعمال کرنے والے لوگ اس حد تک نہ جا سکیں کہ لوگوں کو تعلیم جاری رکھنے سے روکیں ؛ تعلیم کا قدم آگے بڑھے گا تو لوگ خود بہ خود اس منزل پر پہنچ جائیں گے کہ مذکورہ بالا برے اثرات سے بالکل محفوظ ہو جائیں -

---

۱- Scylla - آبنائے مسینا (جو اٹلی اور سسلی کے درمیان ہے) کا ایک ٹیلا (مترجم) -

۲- Charybdis - یہ بھی اسی آبنائے کا ٹیلا ہے جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں ایک عفریت رہتا ہے جس نے سمندر کے اندر گرداب پیدا کر رکھی ہے ؛ جو کشتی اس کے پاس آتی ہے اسے تباہ کر دیتا ہے ، اس سے بچ کر نکل جائے تو سلّا کے ساتھ ٹکرا کر تباہ ہو جاتی ہے - انگریزی زبان میں سلّا اور چیربدس کے درمیان سے گزرنا ایک محاورہ بن گیا ہے جس کا مطلب ہے ''دو بالمقابل خطروں سے بچتے ہوئے نکل جانا'' (مترجم) -

لیکن جس سطح پر فیصلہ کن روحانی جنگ لڑی جا سکتی ہے ، وہ نہ عسکری ہے نہ مجلسی و اجتماعی ، نہ اقتصادی اور نہ ذہنی اس لیے کہ ۱۹۵۵ء میں مغربی آدمی جس اہم اور نازک مسئلے سے دو چار ہے ، وہ مذہبی ہے ۔

کیا یہودیائی مذاہب کا احترام ناروا داری کے اس ریکارڈ کے باعث ناقابل تلافی حد تک زائل ہو چکا ہے جو ان کے دعاوی کی تردید کر رہا ہے ؟ کیا اس رواداری میں خوبی کا کوئی پہلو موجود ہے جسے مسحوریت سے آزاد مغربی دنیا سے سترھویں صدی کے اواخر میں اختیار کیا تھا ؟ مغربی روحیں کب تک مذہب کے بغیر زندگی بسر کرنے کو قابل برداشت سمجھتی رہیں گی ؟ اب صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ روحانی خلا نے قومیت ، فاشزم اور کمیونزم کے شیاطین کے لیے دروازے کھول دیے ، رواداری کا جو عقیدہ انھوں نے آخری دور میں اختیار کیا ، یہ کب تک آزمائش کا مقابلہ کر سکے گا ؟ رواداری اس شیر گرم عہد میں سہل تھی جب مغربی مسیحیت کے مختلف اقسام کے لیے اہل مغرب کے دلوں اور روحوں پر گرفت کا کوئی موقع باقی نہ رہا تھا اور انھیں اپنی خستہ و گستہ عقیدت و انقیاد کے لیے کوئی دوسری متبادل چیز میسر نہ آئی تھی ، اب وہ ایک ایک دیوتا کی چاپلوسی کرتے پھرتے ہیں ؛ کیا اٹھارھویں صدی کی رواداری بیسویں صدی کے جنوں کا مقابلہ کر سکے گی ؟

مغربی صحرا کے بادیہ گرد اپنے آبا و اجداد کے ایک سچے خدا سے منحرف ہو چکے ہیں ؛ ان آبا نے اوہام کو دور کر دینے والے تجربے کے بعد یہ درس دیا تھا کہ فرقہ وار مذہبی نظاموں کی طرح علاقائی حکومتوں کے بتوں کی پرستش بھی امن نہیں بلکہ تلوار ہی لاتی ہے ، کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ عالم انسانیت کو اپنی پرستاری کا متبادل موضوع بنا لیں ؟ مذہب انسانیت کامت[۱] کے فلسفۂ ثبوتیت کے منجمد سانچے میں آگ سے محفوظ رہا لیکن جب مارکس کے کمیونزم نے توپ کے دہانے سے آگ برسائی تو ساری دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتش زار بن گئی ۔ مسیحیت نے روحوں کی نجات کے لیے اس وقت موت و حیات کی جنگ کی تھی جب یونانی دنیا میں

۱- Comte ۔ فرانس کا مشہور فلسفی ، فلسفہ ثبوتیت (Positivism) کا بانی ہے ، سوشیل فلسفے کا آغاز اسی سے ہوا ۔

رومہ اور سیزر کی پرستش کو عالم انسانیت کی پرستش قرار دیا جا رہا تھا اور اس میں کامیابی حاصل کی تھی - کیا دو ہزار سال کے بعد وہ جنگ دور حاضر کے ایک لیویاتان کے خلاف دوبارہ لڑی جائے گی ؟ یونانیت کی مثال نے سوال پیدا کر دیا اور جواب کے چہرے سے پردہ نہ اٹھایا -

اب اگر ہم مغربی دنیا میں شکست کی علامتوں سے ہٹ کر انحلال کی علامتوں پر متوجہ ہوں تو ہمیں یاد کر لینا چاہیے کہ معاشرے میں انشقاق کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں دور آخر کی مغربی دنیا میں سہ گانہ خصوصیات کے غیر مشتبہ آثار ملے تھے جو معاشرے میں انحلال کی دلیل ہیں یعنی اس کا مقتدر اقلیت داخلی پرولتار اور خارجی پرولتار میں تقسیم ہو جانا -

مغربی دنیا کے خارجی پرولتار کی بحث پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں اس لیے کہ زمانہ قدیم کے بربری باقی نہیں رہے ، ان کا استیصال نہیں ہوا بلکہ وہ مغربی دنیا کے داخلی پرولتار بن گئے جو موجودہ عالم انسانیت کے بڑے حصے پر حاوی ہو گئی ہے - جن بربریوں کو بہ زور حضری بنایا جا چکا ہے ، وہ اس وسیع اکثریت کا محض ایک مختصر سا جزو ہیں جس پر بیسویں صدی کی مغربی دنیا کا داخلی پرولتار مشتمل ہے ؛ اس کا بہت بڑا حصہ ان غیر مغربی تہذیبوں کے افراد سے مرکب ہے جو مغرب کے عالمگیر جال میں پھنس گئے - تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو سب سے زیادہ ناخوش اور نا رضامند ہیں یعنی وہ لوگ مغربی اور غیر مغربی مختلف اصلوں کے تھے مگر وہاں سے مستاصل ہو کر مغربی تہذیب میں شامل ہو گئے اور انہیں مختلف درجوں کے جبر سے سابقہ پڑا مثلاً افریقہ کے ان حبشی غلاموں کے اخلاف جنہیں جبراً اٹھا کر اوقیانوس کے پار پہنچا دیا گیا تھا ، ان ہندوستانی اور چینی مزدوروں کے اخلاف جنہیں افریقی غلاموں کی طرح خلاف رضامندی مزدوروں کے لیے تجویز کر لیا گیا تھا - ایسے لوگ بھی ہیں جو سمندر کا سفر اختیار کیے بغیر جگہوں سے اٹھا دیے گئے ؛ ایک نہایت سنگین مثال ان لوگوں کے پرولتار بنائے جانے کی ہے جو جمہوریۂ امریکہ ''جنوب قدیم'' کے ''غریب سفید فام'' باشندے ہیں

یا جو جنوبی افریقہ میں رہتے ہیں، وہ اسی مجلسی سطح پر پہنچ چکے ہیں جو ان کے کام یاب معاصر آبادکاروں کے باہر سے لائے ہوئے یا ملکی افریقی غلاموں کی سطح ہے۔ ان سب کے بعد وہ کم نصیب گروہ آتے ہیں جو شہری ہوں یا دیہاتی مگر محسوس کرتے ہیں کہ مغرب کے اجتماعی مجلسی نظام نے انہیں وہ سب کچھ نہیں دیا جس کے وہ حق‌دار تھے؛ چناں چہ وہ بھی داخلی پرولتار میں شامل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ہماری کتاب میں پرولتار کا لفظ نفسیاتی حیثیت میں استعمال کیا گیا ہے اور اس کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوتا ہے جو محسوس کرتے ہیں کہ روحانی لحاظ سے وہ اس معاشرے کے ساتھ متعلق نہیں جس میں انہیں جسماً شامل کر لیا گیا ہے۔

مقتدر اقلیت کے خلاف پرولتار کا رد عمل مختلف اوقات میں اور مختلف مقامات پر انتہائی شدت سے نمایاں ہوا۔ قرون وسطٰی کے محاربات مزارعین سے لے کر انقلاب فرانس کے انتہا پسندوں تک کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں؛ بیسویں صدی کے وسط میں بھی یہ رد عمل زیادہ شدت کے ساتھ دو منفذوں میں نمایاں ہو رہا تھا؛ جہاں شکایات زیادہ تر اقتصادی تھیں، وہاں کمیونزم کی شکل میں اور جہاں شکایات سیاسی یا نسلی تھیں، وہاں قومیت کا لباس پہن کر سامراج کے خلاف بغاوت میں نمایاں ہو رہا تھا۔

۱۹۵۵ء میں مغربی تہذیب کو روسی و چینی کمیونزم کے بلاک سے بالکل نمایاں اور شدید خطرہ لاحق تھا؛ حساب کے دوسرے کھاتے میں متعدد اندراجات تھے جو اگرچہ چنداں سنسنی پیدا کرنے والے نہ تھے تاہم انہیں کم وزن دار نہ سمجھا جا سکتا تھا۔

پہلا نکتہ جو اس مغربی تہذیب کے حق میں جاتا ہے جسے خطرہ لاحق ہے، یہ ہے کہ عالم‌گیر کمیونزم میں روسی قومیت کی آمیزش نمایاں ہے، جو پولوس رسول کے جوش و ولولہ کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ یہودی اور یونانی کے امتیاز سے بالا ہو چکا ہے۔ عدم اخلاص کی یہ لہر کمیونزم کے اخلاق اسلحہ خانہ میں نقص اور خامی کی دلیل ہے، مشرق ایشیا میں مغربیوں کے مقاصد پر پے در پے ضربیں لگ رہی ہیں؛ عین اس موقع پر اگر کوئی ماہر اشراقیات کریملن کے لب بستہ مدبرین کے دلوں کا موازنہ کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنے چینی حلیفوں کی شان دار کام یابیوں کا معائنہ ملے جلے جذبات سے کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منچوریا، منگولیا اور

سنکیانگ کا مستقبل چین اور روس دونوں کے لیے حد درجہ اہم ہے، ہند چینی، ھانگ کانگ اور فارموسا کے مستقبل کو وہ اہمیت حاصل نہیں۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مالن کوف یا اس کا جانشین خروشیف یا خروشیف کا ممکن جانشین جو ابھی تک افق پر نمایاں نہیں ہوا، کل ٹیٹو بن جائے گا۔ کار فرمایان مغرب جرمنی اور جاپان کو مسلح کر دیں گے، روس چین کے لیے آلات و اسلحہ کا انتظام کر دے گا اس وقت خوف‌زدہ مغرب روس ہی کو سفید فام اقوام کی آخری امید گاہ قرار دے لے گا۔ جس قیصر ولیم ثانی کا وقار مدت ہوئی زائل ہو چکا ہے، اس نے زرد خطرے کی طرف توجہ دلائی تھی اور اس محنت و مشقت کے لیے اسے احمق قرار دیا گیا تھا لیکن بعض اہل قلم بار بار کہتے رہے کہ قیصر محض نیک نیت ہی نہیں بلکہ بڑا ہوشیار اور دور اندیش بھی تھا، خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ اس مسئلے پر ہٹلر نے بھی قیصر کے فیصلے کی تحسین کی تھی۔

یہ پیش‌گوئی جو بادی‌النظر میں ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے، وہ غیرمتنازعہ فیہ حقیقتوں کی محکم بنیاد پر قائم ہے۔ روس بہ ہر حال سفید فام نسل کے املاک کا ایک صوبہ تھا، اس کی آبادی بیسویں صدی میں اسی شرح سے بڑھنی شروع ہوئی جس شرح سے انیسویں صدی میں مغربی یورپ اور شمالی افریقہ کی آبادی بڑھی تھی؛ نیز روس سفید فام اقوام کا ایک ایسا صوبہ تھا جس کی حدیں چین اور ہندوستان سے ملتی تھیں۔ اگر یہ دونوں برہائے صغیر (ہندوستان اور چین) یا ان میں سے کوئی ایک——اور ان میں سے ہر ایک کے اندر کائنات انسانیت کا ایک چوتھائی حصہ آباد ہے—— فن کاری اور تنظیمات کی سطح مغربیت کے عمل کو ایسے درجے پر پہنچا دے جہاں پہنچ کر ہندوستان یا چین کے باشندے دنیا کی فوجی اور سیاسی قرطاس حساب میں اپنی حقیقی تعداد کے متناسب درجہ اختیار کر لیں گے تو یہ ازسرنو قوت پایا ہوا عظیم الجثہ سمسون[1] علاقوں اور طبعی وسائل کی حد درجہ غیر منصفانہ تقسیم پر وسیع حد تک نظر ثانی کے لیے اصرار کرے گا۔ ایسی حالت پیش آ جانے پر ممکن ہے روس اپنی ہستی محفوظ رکھنے کی جد و جہد میں بے ارادہ مغربی دنیا کو اپنے پہلو میں آرام سے بٹھائے رکھے

۱- Samson -

اور کسی معاوضے یا اعتراف کے بغیر دولت حائل[1] کا فرض انجام دے دے ، ٹھیک اسی طرح جس طرح آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے ایک مرتبہ پہلے مغربی دنیا کو بچایا تھا ؛ اس وقت خطرے کے شعلے چین یا ہندوستان سے نہیں بلکہ جنوبی و مغربی ایشیا سے بلند ہو رہے تھے جو ابتدائی دور کے مسلم عربوں کی پرجوش قیادت میں متحد ہو چکا تھا ۔

یہ ایسے مستقبل کے متعلق جو ابھی سامنے نہیں آیا ، حد درجہ قیاسی پیش گوئیاں ہیں ۔ یہ واقعہ حوصلہ افزائی کے لیے ایک محکم بنیاد مہیا کرتا ہے کہ جو مغربی گروہ کوریا میں چین سے اندھا دھند جا بھڑا تھا اور ہند چینی میں بری طرح شکست کھا چکا تھا ، اس نے اہل انڈونیشیا کے ساتھ صلح کی شرطیں طے کر لیں جب کہ وہ جاپانیوں سے آزادی حاصل کر رہے تھے اور اس نے فلپنیز ، سیلون ، برما ، ہندوستان اور پاکستان میں اپنے تسلط سے دست برداری اختیار کرلی ۔ دور آخر کے مغربی سامراج کے ڈرامے میں ایشیا کی ان مختلف اقوام ـــــــ جو پہلے برطانوی راج کے ماتحت تھیں ـــــــ اور برطانوی حامیوں کے درمیان مصالحت نے ایسا راستہ کھول دیا ہے کہ وسیع ایشیائی علاقے کے کم از کم ایک حصے کے لیے ـــــــ جو عالم گیر مغربی معاشرے کا داخلی پرولتار تھا اور مقتدر اقلیت سے علاحدگی پر تلا بیٹھا تھا ـــــــ اپنا مسلک تبدیل کرکے سابقہ مغربی آقاؤں کے ساتھ مساوات کی بنا پر اشتراک قبول کر لے ۔

اسلامی دنیا کے ایشیائی اور افریقی صوبوں میں نیز صحرا کے جنوب میں افریقہ کے اکثر علاقوں کے اندر ایسی ہی صورت حال کی امید رکھی جا سکتی ہے البتہ جن حصوں کی آب و ہوا نے اہل مغرب کو محض حکمرانی ہی پر نہیں بلکہ گھر بنا لینے پر آمادہ کیا ، ان کا مسئلہ قابو سے باہر نظر آتا ہے ۔ یہ مسئلہ ان علاقوں میں بھی اٹھا ـــــــ اگرچہ اس نے ویسی خوف ناک حالت اختیار نہ کی ـــــــ جہاں سفید فام اقوام کے لیے ناخوش گوار ابتدائی کام انجام دینے کے لیے غیر سفید فام لوگوں کو بلایا گیا ۔ سفید فام باشندوں کے نقطۂ نگاہ سے خطرے کے درجے کا اختلاف مقامی آبادیوں کے نسلی اعداد سے واضح ہو سکتا ہے ؛ جہاں غیر سفید فام آبادی

۱- Buffer State ، وہ دولت جو اپنے اطراف کی دو قوتوں کو لڑنے سے روک ٹوک کا کام دے سکے (مترجم)۔

مقامی تھی ، وہاں اس کی تعداد مقتدر سفید فام نسل کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے مثلاً جنوبی افریقہ میں؛ جہاں غیر سفید فام لوگ باہر سے جبراً لائے گئے جیسا کہ جمہوریۂ امریکہ میں ، وہاں ان کا تناسب کم ہے۔

یہ سطریں لکھتے وقت جمہوریۂ امریکہ میں امتیاز رنگ کا رجحان شدت اختیار کر کے ہندوستان میں جات پات کے انداز پر پہنچ رہا تھا ، اسے مسیحیت کی روح کے ردعمل سے نرم کیا جا رہا ہے۔ ابھی تک یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مسیحی جوابی حملہ محض امید کا ایک ٹمٹماتا سا دیا ہے یا اسے مستقبل کی لہر سمجھنا چاہیے؛ تاہم یہ امر ایک فال نیک ہے کہ امریکہ اور ہندوستان میں صحیح اصول پر تلافی کا کام شروع ہے۔ جس مقتدر سفید فام اکثریت کے مسیحی ضمیر نے حبشیوں کی غلامی کو منسوخ کر دینے پر آمادہ کیا تھا ، انہیں اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ محض قانونی آزادی کافی نہیں؛ ساتھ ہی سفید فام پرولتاری اقلیت میں بھی اس انداز پر جواب دینے کی علامتیں نمایاں ہوئی ہیں۔

کسی تہذیب کے داخلی پرولتار کی اجنبیت اصل تہذیب کے انحلال کی نمایاں ترین علامت ہے جیسا کہ ہم اس کتاب کے ابتدائی حصے میں دیکھ چکے ہیں؛ اسے پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس پر غور کرتے رہے ہیں کہ بیسویں صدی مسیحی کے وسط میں مغربی معاشرے کے اندر اجنبیت یا مصالحت کی کیا کیا شہادتیں مل سکتی ہیں۔ اب تک وہی پرولتار عناصر ہمارے زیر غور رہے جو غیر مغربی تھے مگر مغرب کی عالم‌گیر توسیع کے سلسلے میں وہ اس کے دائرے کے اندر آ گئے۔ اب یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ وہی پرولتاری عناصر باقی رہ گئے جنھیں مقتدر اقلیت سے نسلاً کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں یعنی مرد و زن کی وہ عظیم الشان اکثریت جسے انیسویں صدی کی بلند مرتبہ اقلیت کے بلند مرتبہ افراد ، ''کارگر طبقات'' یا نچلے طبقات یا عام آبادی یا عوام وغیر قرار دیتے رہے۔ یہاں موضوع وسعت حوصلہ شکن ہے؛ محض یہ کہ دینا کافی ہے کہ تقریباً تمام مغربی ملکوں میں خصوصاً ان ملکوں میں جو صنعت کاری کے اعلیٰ پیمانے پر پہنچ چکے اور دور جدید کے تمام اوصاف سے متصف ہیں ، گزشتہ نصف صدی میں ہر شعبے کے اندر مجلسی انصاف کے لیے عظیم الشان کام ہوا ہے۔ جس سیاسی انقلاب کے ذریعے سے ہندوستان کو برطانوی راج سے آزادی

ملی ، اس سے خود برطانیہ عظمیٰ کا مجلسی انقلاب کم اہم نہیں اور یہ اس مغربی ملک کی حالت ہے جس میں اختیارات ، دولت اور مواقع نفرت انگیز ، مختصر اور شرم ناک حد تک اختیار دوست اقلیت کے لیے مخصوص سمجھے جاتے تھے لیکن اس کی کایا پلٹ گئی اور کسی کے دل میں چنداں برا احساس پیدا نہ ہوا ، نیز پوری قوم کے لیے مجلسی انصاف کا بندوبست ہو گیا اور انفرادی آزادی پر کم سے کم ضرب لگنے کی نوبت آئی ۔

حقائق کے اس جائزے سے جس میں سازگار حقائق بھی ہیں اور ناسازگار بھی ، نیز اس امکان سے کہ داخلی پرولتار کی علٰحدگی کے باعث مغربی تہذیب مبتلائے مصائب ہو جائے گی ، دو نتیجے سامنے آتے ہیں : اول یہ کہ مصالحت کی قوتیں زیادہ زبردست معلوم ہوتی ہیں ، یونانی معاشرے کی تاریخ کے اس مرحلے پر ویسی قوتیں کارفرما نہ تھیں ؛ دوم مغربی دنیا کی تائید میں جو عامل جا رہا ہے ، وہ یہ ہے کہ مسیحی روح کا عمل جاری ہے جس کی گرفت مغربی مرد و زن کے قلوب سے چھٹی نہ تھی اگرچہ ان کے دماغ اس مجموعۂ عقائد کو رد کر چکے ہوں جو مستقل مسیحی حقائق کو لا دین یونانی فلسفے کی عارضی زبان میں منتقل کر کے تیار کیا گیا تھا ۔

ایک اعلیٰ مذہب کی زبردست روح حیات جو مغربی معاشرے کے ابتدائی دور اور حالت پیلکی میں کار فرما رہی ، ایک ایسا عنصر ہے جس سے یونانی تہذیب ایسے موقع پر بداہۃً خالی تھی ۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ مسیحیت کے روحانی جوہر کے ناقابل شکست ہونے اور نئے مذاہب کی قلت و حقارت میں جو اس موقع پر مغربی دنیا کے اندر جا بجا رونما ہو رہے ہیں ، کوئی نہ کوئی تعلق ہے ۔

لٰہذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غیر مغربی مثالوں کی شہادت مغربی تہذیب کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کن نہیں ۔

۲۔ غیر معمولی مغربی تجربات

یہاں تک ہم متاخر دورجدید کی مغربی موقف کے ان عناصر کا جائزہ لیتے رہے جن کا مقابلہ دوسری تہذیبوں کے عناصر سے کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں ایسے عناصر بھی ہیں جن کی کوئی مثال دوسری تہذیبوں کی سرگزشتوں میں نہیں ملتی ۔ مثال کے طور پر دو عنصر ایک دم سامنے آتے ہیں : اول مغربی آدمی نے غیر انسانی قدرت پر نہایت وسیع اقتدار حاصل کر لیا ہے ،

دوم اس اقتدار کی به دولت مجلسی تغیر میں روز افزوں تیزی نظر آ رہی ہے ۔

جب سے انسان قدیم حجری دور کی نچلی سطح کو چھوڑ کر اوپر کی سطح پر پہنچا ، انسانی نسل روئے ارض پر اشرف المخلوقات بنی چلی آ رہی ہے ؛ قدرت کے غیر جان دار وجودوں میں سے کسی کے لیے ممکن نہیں رہا کہ انسانیت کا استیصال کر دے یا اس کی ترقی کو روک لے ۔ اس وقت سے روئے زمین پر ایک استثنا کے ساتھ کوئی شے نہ انسان کے راستے میں کھڑی ہو سکی اور نہ اسے تباہی کے گھاٹ اتار سکی لیکن استثنا کم اہم نہیں اور وہ خود انسان ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ۔ انسان خود چودہ یا پندرہ تہذیبوں کے سلسلے میں اپنے لیے مصیبت کا سامان بن چکا ہے - ۱۹۴۵ء میں ایٹم بم کی ایجاد سے واضح ہو چکا تھا کہ انسان کو غیر انسانی کائنات پر ضبط و نظم کا اونچا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور اب اس کے لیے ممکن نہیں که وہ دو برائیوں کے چیلنج کو روک سکے جو اس نے معاشروں کی نئی قسم کے لیے سعی و کوشش کے سلسلے میں پیدا کیں یعنی ایسا معاشرہ جو تہذیب کی راہ پر لگا ہوا ہو ۔ یہ دو برائیاں ایک ہی برائی یعنی جنگ کے دو مختلف مظہر ہیں اگرچہ انہیں دو ناموں کے پکارنا سہولت کا باعث ہے ——— ایک عام جنگ ، دوسری طبقاتی جنگ ——— به الفاظ دیگر ایک اُفقی جنگ اور دوسری عمودی جنگ ۔

یہ ایسی صورت حالات ہے جس سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے نسل انسانی کے پاس کافی سامان نہیں ؛ اس بارے میں امکانات پر غور کرتے وقت اپنے کام میں یوں سہولت پیدا کر سکتے ہیں کہ پہلے فن کاری ، جنگ اور حکومت پر بحث کریں ، پھر فن کاری ، طبقاتی کش مکش اور روزگار پر ۔

بیالیسواں باب

صنعت کاری، جنگ اور حکومت

۱- کیا تیسری عالمی جنگ ہوگی ؟

دو عالم‌گیر جنگوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی طاقتوں کی جو تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی —— اور ان میں بعض محض برائے نام شامل کر لی گئیں تھیں مثلاً اٹلی جس کے متعلق سب کو معلوم تھا کہ وہ اس بڑائی کے قیام کا ثبوت بہم نہیں پہنچا سکتی —— گھٹ کر صرف دو بڑی طاقتوں میں محصور رہ گئی : اول جمہوریۂ امریکہ ، دوم سویٹ یونین - سویٹ یونین نے اپنا اقتدار مشرقی جرمنی کے علاوہ ہیپس برگ خاندان کی سلطنت اور سلطنت عثمانیہ کی جانشین حکومتوں میں سے اکثر پر قائم کر لیا ہے ، انہیں نیشنل سوشیلسٹ جرمنوں کی حکومت تیسری رایش[1] نے دوسری عالم‌گیر جنگ کے دوران میں پامال کر ڈالا تھا - رہا یہ سوال کہ مغربی جرمنی اور دونوں جنگوں کے درمیان کی آسٹروی جمہوریت کیوں اپنے ہمسایوں کی پیروی کرتی ہوئی ۱۹۵۶ء تک روس کے معدے میں نہ پہنچیں ؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریۂ امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں کے زیر حمایت جا چکی تھیں - اس وقت تک یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ جس آزادی کو تنہا محفوظ نہیں رکھا جا سکتا ، اسے جمہوریۂ امریکہ کی حفاظت کے بغیر روسی (یا چینی) اقتدار سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا اور یہ حفاظت آگے چل کر دنیا کی ہر حکومت پر موثر ہوتی ہوئی نظر آتی تھی -

---

۱- Third Reich ، یعنی جرمنی کی وہ حکومت جو ہٹلر کی پارٹی نے بنائی - (مترجم)

جمہوریۂ امریکہ کے اس کردار سے نئی دنیا تو بہت پہلے متعارف ہو چکی تھی لیکن پرانی دنیا کے متعلق یہ کردار بالکل نیا تھا ۔ مقدس اتحاد[1] سے تیسری رایش تک منرو کے اصول[2] نے ہسپانوی اور پرتگیزی سلطنتوں کی جانشین امریکی ریاستوں کو یورپی طاقتوں کے قبضے میں جانے سے بچایا تھا ، انھوں نے ہسپانیہ اور پرتگال کے استعماری نظام کی جگہ جمہوریۂ امریکہ کی سرپرستی قبول کر لی تھی ۔ محسنوں کو عموماً قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور اگر ان کی فیض رسانی ہر قسم کی اغراض سے پاک نہ ہو تو وہ محسن کہلانے کے مستحق ہی نہیں ٹھہرتے مثلاً ہم کہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۵ء سے جمہوریۂ امریکہ کے متعلق فرانسیسیوں کے جذبات اہل برازیل کے گزشتہ صد سالہ جذبات سے زیادہ مختلف نہ تھے ۔

غرض ۱۹۵۶ء میں صرف سویٹ یونین اور جمہوریۂ امریکہ ہی دو بڑی قوتوں کی حیثیت سے روئے زمین پر ایک دوسری کے بالمقابل رہ گئیں اور کسی بین الاقوامی توازن قویٰ میں دو کا عدد بہترین حالات میں بھی چنداں خوش گوار نہیں سمجھا جا سکتا ۔ یہ درست ہے کہ بیس سال پیش تر کے جاپان اور جرمنی کے برعکس یہ دونوں ملک اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بھرپور تھے اور ان کی پوری آبادیاں بہت سے دھوں تک اپنے اپنے ہاں کی زمینیں کاشت کرنے میں لگی رہیں گی لیکن تاریخ کی سرگزشت ماضی سے واضح ہوتا ہے کہ اقتصادی ضرورت و احتیاج کی طرح ایک دوسرے

۱- Holy Alliance ، ۱۸۱۵ء میں ایک معاہدہ روس ، آسٹریا اور پروشیا کے بادشاہوں کے درمیان ہوا تھا ۔ اس میں انھوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ جن علاقوں پر حکمران ہیں ، ان میں مسیحی اصول نافذ کریں ؛ بعد ازاں دوسرے یورپی ملک اس معاہدے میں شامل ہوئے اور اس کی وجہ سے کچھ مدت تک جنگ رکی رہی (مترجم) ۔

۲- Monroe Doctrine ، منرو ۱۸۱۶ء میں امریکہ کا پریذیڈنٹ بنا اور دو مرتبہ اس عہدے پر فائز ہوا ۔ اس نے جنوبی امریکہ کی تمام جمہوریتوں کی آزادی تسلیم کرتے ہوئے اعلان کر دیا تھا کہ آئندہ کوئی یورپی طاقت ان میں استعمار کی حق‌دار نہ ہوگی (مترجم) ۔

کا خوف بھی جارحانہ جنگی اقدامات کا ایک قوی محرک بنا رہا ہے۔ روس اور امریکہ کے باشندے مفاہمت کے سامانوں کے لحاظ سے بہت فرومایہ ہیں ؛ روسیوں کی فطرت و طبیعت یہ ہے کہ جیسے بھی حالات پیش آ جائیں ، انھیں چپ چاپ قبول کر لیں ، اس کے برعکس امریکہ کے باشندوں کی خصلت ہی شور و شغب اور بے صبری ہے ۔ طبیعتوں کا یہ اختلاف مطلق العنان حکومت کے متعلق دونوں کی روش میں منعکس ہو رہا ہے ؛ روسیوں نے ناگریز سمجھ کر اس کے روبرو سر جھکا دیا ، امریکیوں نے اپنی تاریخ سے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ یہ ادارہ برا ہے اور عوام جب چاہیں اس کا تختہ الٹ سکتے ہیں ۔ امریکیوں کے نزدیک شخصی آزادی کا خلاصہ یہی ہے لیکن عجیب امر یہ ہے کہ انھوں نے اسے مساوات کا مترادف تسلیم کر لیا ؛ اس کے برعکس روس کی کیمونسٹ مقتدر اقلیت کے لیے نظری مساوات ہی سب کچھ ہے اور حد درجہ عجیب تر امر یہ ہے کہ انھیں نے اسے آزادی کا مترادف قرار دے لیا ۔

مزاج و نظریات کے اس اختلاف نے دونوں قوموں کے درمیان مفاہمت و اعتماد کو سخت مشکل بنا دیا ہے ، یہی باهمی بے اعتمادی خوف پیدا کرتی ہے ۔ جس میدان میں وہ ایک دوسرے کو خوف زدہ کر رہے ہیں ، اسے صنعت کاری کی ترقی نے بے مثال تیز رفتاری سے اس درجہ بدل دیا ہے کہ پہلی صورت حال کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا ؛ جس شے کو پہلے وسعت عالم سے تعبیر کیا جا رہا تھا ، اس کی حدیں سمٹ کر اتنی تنگ ہو گئی کہ حریف اس میدان میں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہوں تو اتنے قریب ہوں گے کہ افقی نشانہ لگا سکیں ۔

جس دنیا کو فن کاری اور صنعت و حرفت کے کمالات نے یوں متحد کر دیا ہے ، اس میں سویٹ یونین اور جمہوریۂ امریکہ کے درمیان عالم گیر اقتدار کے لیے مقابلے کا فیصلہ انسانیت کا وہ تین چوتھائی حصہ کرے گا جو ابھی زندگی کی مادی سطح پر جدید حجری دور کے حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے ۔ اگرچہ اس کائنات پر تہذیب کے طلوع کو پانچ چھ ہزار سال گزر چکے ہیں لیکن عالم انسانیّت کا وہ حصہ حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہے کہ زندگی کا بلند تر درجہ حاصل کر لینا حیز امکان میں ہے ؛ انسانوں کی جو اکثریت اب تک بے خبری میں ڈوبی ہوئی تھی ، اس کے روبرو

اب امریکی اور روسی طریق حیات میں سے کسی ایک کو چن لینے کا معاملہ آ گیا ہے ، ان میں سے اسی کے انتخاب کی امید رکھی جا سکتی ہے جو اس جاگتی ہوئی اکثریت کی انقلابی آرزوؤں اور ارادوں کے لیے زیادہ باعث تشفی ہوگا۔ حرف آخر کہنے کی حق دار وہی اکثریت ہے جو زیادہ تر غیر مغربی ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ اس روسی و امریکی ترازو کے پلڑوں میں اصل وزن تین چوتھائی اکثریت کا نہیں بلکہ ایک چوتھائی اقلیت کا ہوگا جو مغربی یورپ میں آباد ہے اور جس کے قبضے میں ساز و سامان جنگ کی صنعت ہے۔ کرۂ ارض کی اصطلاح میں ہم کہ سکتے ہیں کہ اب دنیا ایک بر اعظم پر مشتمل ہے جسے یوفریشیا[1] کہنا چاہیے اور اس کے کناروں سے ہٹے ہوئے دو بڑے جزیرے واقع ہیں : ایک شمالی امریکہ ، دوسرا جنوبی امریکہ۔ کرۂ ارض کی اس تصویر میں روس بر اعظم کی طاقت اور جمہوریۂ امریکہ کی جزائری طاقت نظر آتی ہے ——— ٹھیک اسی طرح جیسے مغربی تاریخ کے دور جدید میں یورپ کے اندر مختلف حکومتوں کے درمیان جو جنگیں ہوئی تھیں ، ان میں برطانیہ نے جزائری طاقت ، ہسپانیہ، فرانس اور جرمنی نے یکے بعد دیگرے برطانیہ کے بر اعظمی دشمنوں کا کردار ادا کیا تھا۔ متاخر دور جدید کے ارضی اکھاڑے میں یورپ کے مغربی حصے کو حد درجہ اہم حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ وہ بر اعظم کے اندر پہنچنے کے لیے جزائری طاقت کا پل ہے ؛ دور گزشتہ میں فلینڈرز مغربی یورپ کا اکھاڑہ بنا رہا ہے ، اس میں حد درجہ ضدی محارب علاقائی حکومتیں لڑائیاں لڑتی رہی ہیں۔ اب اگر ایک اور عالم گیر جنگ ہوئی تو اس میں پورا مغربی یورپ مغربیت مآب دنیا کے لیے جنگی اکھاڑے کا کام دیتا ہوا نظر آتا ہے ؛ جنگی نقشے کی اس تبدیل ہیئت میں ایک شاعرانہ تجویز کا پہلو موجود ہے لیکن اس سے مغربی یورپ کے جنگی اکھاڑے میں بسنے والوں کی مصیبتیں ۱۹۴۶ء سے کم ناخوش گوار نہ بنیں گی جس طرح پندرھویں صدی کے خاتمے تک فلیمنگ میں بسنے والوں کی مصیبتیں کم ناخوش گوار نہ تھیں۔

صنعت کاری کی ترقیات انسانی معاملات پر انسانی احساسات کی حکمرانی میں

۱۔ یوفریشیا سے مراد ہے یورپ ، افریقہ اور ایشیا۔

تخفیف کی قوت سے بے بہرہ ہیں ، عسکریت صنعت کاری کا نہیں نفسیات کا مسئلہ ہے یعنی یہ جنگ کے عزم و ارادہ کا معاملہ ہے ۔ جنگیں اسی وقت جوش انگیز ہوتی ہیں جب دوسرے مقامات پر دوسرے لوگ لڑیں اور وہ غالباً زیادہ جوش انگیزاس وقت ہوتی ہیں جب ختم ہو جاتی ہیں اور تمام تہذیبوں کے مؤرخ انہیں روایتی لحاظ سے اپنے دائرے کا حد درجہ دل چسپ موضوع سمجھتے رہے ہیں ۔ دورگزشتہ میں بیشتر فوجوں کی تعداد بہت کم رہی ہے اور وہ فوجیں ان افراد پر مشتمل ہوتی تھیں جو لڑنے کو دوسرے پیشوں پر ترجیح دیتے تھے ۔ جب سے انقلابی فرانس نے ۱۷۹۲ء میں عام بھرتی کا فیصلہ کیا ، جنگ بڑی خطرناک چیز بن گئی اور مستقبل کی جنگ کے متعلق اندیشے پیدا ہو گئے کہ وہ اور بھی خطرناک ہوگی ۔ جنگ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جو قومیں اس کا تجربہ کر لیں ، ان کی عسکریت کے جذبے کو کچل کر رکھ دے گی اور قوموں کا عزم ایک ایسی قوت ہے جس کے روبرو بڑی بڑی مطلق العنان حکومت کو بھی انجام کار جھکنا پڑتا ہے ۔ جن ملکوں کو پہلی جنگ یورپ میں حد درجہ نقصان پہنچا ، ان میں سے فرانس نے دوسری جنگ کو برداشت کرنے سے عملاً انکار کر دیا ؛ ہٹلر جرمنوں کو عسکریت کی دوسری ہنگامہ آرائی کے لیے ابھارنے اور اکسانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ۱۹۵۶ء میں یہ امر مشتبہ نظر آتا تھا کہ کوئی دوسرا ہٹلر —— اگر دوسرا ہٹلر وجود پذیر ہوسکا —— یہ کارنامہ دوسری مرتبہ انجام دینے میں کامیاب ہو سکے گا ۔ کیمونسٹ ڈکٹیٹروں کا دل پسند رسمی قول یہ ہے کہ ہم امن پسند ہیں ؛ نپولین نے سینٹ ہلینا میں بھی جنگ کو ایک مہذب پیشہ قرار دیا تھا لیکن اگر وہ ایٹمی جنگ کے آغاز تک زندہ رہتا تو یہ امر مشتبہ ہے کہ جنگ کے لیے پھر بھی یہی رائے ظاہر کرتا ۔

ان افکار کا اطلاق اصلاً تہذیب میں ان ترقی یافتہ قوموں پر ہوتا ہے جنہیں بیسویں صدی کے جنگ کا تجربہ براہ راست ہو چکا ہے ؛ اس کے برعکس ایشیا کی قومیں لا متناہی ماضی سے مطلق العنان حکومتوں کے روبرو چپ چاپ جھک جانے کی سیاسی وضع پر کاربند چلی آتی ہیں ۔ مغربی عسکریت کی تربیت کا ابتدائی انتظام کر دینا کافی نہیں بلکہ مغربی ثقافت کے عمل کے لیے بہت بڑا کام ہے ، پیشتر اس کے کہ ایشیا کے دھقانی سپاہی سوچنے ،

پوچھنے اور انکار کرنے لگیں گے کہ وہ کیوں ایک جارحانہ جنگ میں اپنی جانیں دیں جس میں ان کا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ بیسویں صدی کے عین وسط کی ایشیائی حکومتیں اپنی رعایا کی طبعی حوالگی اور اطاعت گزاری کو کب تک عسکری مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہیں گے؟ اہل مغرب کو یہ نظر آ رہا ہے گویا چینی اور روسی دھقانوں نے اپنی حکومتوں کو اپنی جانوں کے متعلق سادہ کاغذ پر دستخط کر کے دے دیے ہیں لیکن تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ ایک خاص حد سے تجاوز کی جرأت چینی اور روسی حکومتیں بھی نہیں کر سکتیں؛ سُن سے کومن تانگ تک ہر چینی حکومت کا یہ حال رہا ہے کہ جس نے پیچ کو ذرا کسنے کی کوشش کی، اسے حکمرانی سے محروم ہونے کی سزا بھگتنی پڑی، روسی تاریخ بھی ہمیں یہی بتا رہی ہے۔

روس کے باشندوں کو جنگ کریمیا میں خوف ناک تکلیفوں سے سابقہ پڑا تھا، وقت کے زار نے عقل مندی اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کی غرض سے ۱۸۶۰ء کی اصلاحات دے دیں مگر بعد میں جو شکستیں پیش آئیں ــــــ اول ۱۹۰۴ء - ۱۹۰۵ء کی جنگ روس و جاپان میں، بعد ازاں پہلی عالم‌گیر جنگ میں ــــــ ان کا فدیہ ادا کرنے میں سختی سے انکار کیا گیا تو جان دینی پڑی اور ۱۹۱۷ء کا دوہرا انقلاب ہوا۔ اس وقت صاف نظر آ رہا تھا کہ خاص حدیں ہیں جن پر پہنچتے ہی روس جیسے دھقانی ملک کی ہمت اور حوصلہ جواب دے دیں گے۔ تاہم قرین قیاس یہی ہے کہ سویٹ یونین کی حکومت جمہوریۂ امریکہ کے ساتھ جنگ کے زیادہ سے زیادہ خطرے قبول کر لے گی لیکن ایسی سیاسی مراعات پر راضی نہ ہوگی جنہیں روسیوں کی نگاہوں میں امریکی اقتدار کے آگے جھک جانے سے تعبیر کیا جا سکے۔

اگر قرین قیاس یہی ہے کہ سویٹ یونین اپنے جیسی قوت کے مالک طاقت سے نبرد ازمائی میں تامل نہ کرے گی تو کیا جمہوریۂ امریکہ کے متعلق بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کی جا سکتی ہے؟ ۱۹۵۶ء میں اس سوال کا جواب اثبات میں معلوم ہوتا ہے۔ جب سے تیرہ نو آبادیوں میں سے قدیم ترین کی آبادکاری شروع ہوئی، امریکہ کے باشندے حد درجہ غیر عسکری رہے، ساتھ ہی مغربی دنیا کی قوموں میں ان سے زیادہ بہادر آپ کو نہ ملیں گے۔

وہ اس نقطۂ لگاہ سے غیر عسکری ہیں کہ عسکری ڈسپلن پر کبھی راضی نہ ہوئے، نیز ان کے دلوں میں فوجی کارنامے انجام دینے کا بھی کوئی جوش و خروش نہیں جیسا کہ گالوں میں تھا؛ بہادر ان معنوں میں ہیں کہ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ جب تک بندش سرحد کا اعلان نہ ہوا تھا، ان میں ایک سرحدی جیش ضرور موجود رہا ہے جو نہ محض ہتیار پہنتے تھے بلکہ اپنے صواب دید کے مطابق انہیں ذاتی کارناموں کے لیے استعمال بھی کرتے تھے ——— یہ ایسی صورت حالات تھی جو مغربی یورپ کے بڑے حصے میں بہت مدت پیش تر ختم ہو چکی تھی - امریکہ کے سرحدیوں نے دس پشتوں میں جس مردانگی اور جنگی سپرٹ کا اظہار کیا، اس کا اعتراف شمالی امریکہ کے وہ دیسی باشندے بھی سفید فام اقوام کے امریکہ میں لنگر انداز ہونے کے وقت سے کرتے رہے؛ یہ اعتراف اٹھارھویں صدی میں انگریز آبادکاروں کے فرانسیسی حریفوں نے بھی کیا اور انیسویں صدی میں ان کے میکسیکی شکاروں نے بھی کیا - انگریز امریکی سرحدیوں اور ان کے حریفوں میں جو مقابلے شمالی امریکہ پر تصرف کے سلسلے میں ہوئے، وہ اس امر کی بھی شہادت ہیں کہ نہ صرف سرحدی امریکی بلکہ تمام امریکی باشندے عارضی طور پر عسکری ڈسپلن کے لیے بھی آمادہ ہو سکتے ہیں؛ اس کے بغیر سرحدی امریکیوں کی جواں مردی اور قوت ان حریفوں کے مقابلے میں کام یاب نہ ہو سکتی تھی جو از روئے ثقافت انہیں کی سطح پر تھے -

امریکیوں میں جو سپاہیانہ صلاحیتیں مضمر ہیں، وہ ان کے جرمن حریفوں پر ۱۹۱۷ء - ۱۹۱۸ء اور ۱۹۴۱ء - ۱۹۴۵ء کی جنگوں میں بخوبی واضح ہو چکی ہیں لیکن امریکی بہادری، ضبط و نظم، سپہ گری اور استقامت کا سب سے زیادہ موثر مظاہرہ اس جنگ میں ہوا جس میں امریکیوں کے مقابلے پر امریکی صف آرا تھے - یونین اور کنفیڈریسی[1] کے درمیان ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک جو جنگ جاری رہی، وہ امریکہ کی جنگوں میں سب سے لمبی تھی، بڑی سختی سے لڑی گئی اور اس میں مقتولین اور مجروحین کی تعداد

۱- یہ امریکہ کی خانہ جنگی کا ذکر ہے جو شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان غلامی کے مسئلے پر ہوئی تھی، شمالی ریاستیں یونین یا فیڈرل کہلاتی تھیں اور جنوبی ریاستیں کنفیڈریسی کے نام سے مشہور تھیں -

بہت زیادہ تھی - لیز نپولین کے زوال سے پہلی عالمی جنگ تک جتنی لڑائیاں لڑی گئیں، ان میں سے کسی میں صنعت کاری نے ویسے کمالات کا مظاہرہ نہ کیا جتنا کہ امریکہ کی مذکورہ بالا جنگ میں ہوا؛ نیز دو عالم گیر جنگوں نے جرمنی کو نیز جرمنی کے روسی اور مغربی یورپ کے شکاروں کو جتنا برباد کیا تھا، امریکی خانہ جنگی میں جنوبی ریاستیں بھی اتنی ہی برباد ہوئی تھیں لیکن ریاست ہائے متحدہ ان سے عملاً صحیح سالم بچ نکلی - دو عالمی جنگوں نے مغربیوں کے حوصلے اور ہمت پر جو اثر ڈالا، وہ اوقیانوس کی امریکی سمت میں بالکل محسوس نہ ہوا لہٰذا ۱۹۵۶ء میں یہ امر مشتبہ نہیں کہ امریکہ کے باشندے سویٹ یونین کے ساتھ لڑائی کے تمام خطرات قبول کر لیں گے مگر ایسی مراعات پر ہرگز راضی نہ ہوں گے جن سے امریکی نظروں میں روس کی برتری ثابت ہو -

اس تاریخی شہادت کی بنا پر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص حالات میں روسی اور امریکی جنگ کے لیے تیار ہوں گے لیکن اس عزم جنگ کو ایٹمی جنگ کے نشو و ارتقا میں دیکھنا چاہیے؛ نیز اس کے نفسیاتی اثرات پر نظر رکھنی چاہیے اور یہ اثر بیسویں صدی کے وسط میں فن کاری کے نشو و ارتقا سے زیادہ پیچھے نہ رہے گا - ایک ملک یا ایک مقصد کے لیے جان دے دینے پر آمادہ ہو جانا بہادری کا ایک بےمعنی اور فضول کارنامہ رہ جائے گا جب روز روشن کی طرح آشکارا ہو جائے کہ ایک ہی ہمہ گیر حادثۂ عظیمہ میں محب وطن کے ساتھ ملک اور صاحب مقصد کے ساتھ مقصد بھی تباہ ہو جائے گا -

۲- مستقبل کا عالمی نظام

۱۹۵۵ء تک جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا ایک اہم ضرورت بن گیا تھا لیکن یہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی تھی جب تک ایٹمی قوت کا ضبط و نظم ایک سیاسی طاقت کے حوالے نہ کر دیا جاتا؛ اس طرح وقت کے سب سے بڑے سیاسی حربے کا اجارہ اس طاقت کو اس قابل بنا دیتا کہ وہ دنیا بھر پر حکمرانی کا کار منصبی سنبھال لے - ۱۹۵۵ء کے حالات کے پیش نظر ایسی حکومت کا مرکز یا تو واشنگٹن ہوتا یا ماسکو مگر مصیبت یہ پیش آئی کہ جمہوریۂ امریکہ یا سویٹ یونین میں

سے کوئی بھی اپنے آپ کو دوسرے کے رحم پر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس ناگوار صورت حال میں کم سے کم نفسیاتی مزاحمت کا روایتی طریق عمل بلاشبہ یہ ہوتا کہ جنگ کے ذریعے سے فیصلہ کر لینے کا پرانا طریقہ اختیار کر لیا جاتا؛ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک فیصلہ کن ضرب ہی وہ وحشیانہ ذریعہ تھی جو شکستہ تہذیب کو دور مصائب سے ہمہ گیر سلطنت کی منزل میں پہنچاتی رہی مگر اس موقع پر فیصلہ کن ضرب محض حریف ہی کو نہیں بلکہ فاتح، ریفری، گھونسہ بازی (باکسنگ) کے اکھاڑے اور تماشائیوں کو بھی محو کر ڈالتی۔

ان حالات انسانیت کے مستقبل کی بہترین امید کا تقاضا یہ تھا کہ جمہوریۂ امریکہ اور سویٹ یونین کی حکومتیں اور باشندے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اس پالیسی پر کاربند ہوتے جسے پہلو بہ پہلو پر امن زندگی بسر کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نوع بشر کی بہبود بلکہ اس کی ہستی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ایٹمی اسلحہ کی ایجاد نہیں بلکہ انسانی روحوں میں اس مزاج کا پیدا ہونا ہے جو ایک مرتبہ مغربی دنیا کے دور جدید کے آغاز میں ایک سو سال تک متداول رہا، یہ مغربی دنیا میں مذہبی جنگوں کے پھوٹنے پر ۱۵۶۰ء کے قریب شروع ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کے افتتاح پر ایسے سرمایہ دار بھی تھے اور یہ کمیونسٹ بھی جو اپنے کیتھولک اور پراٹسٹنٹ پیش رووں کی طرح اس امر کو ناقابل عمل اور ناقابل برداشت سمجھ رہے تھے کہ معاشرے کے ساتھ وفاداری کا سلسلہ لامتناہی مدت تک منقسم رہے؛ ایک طرف سچے ایمان والے ہوں (خود) اور دوسری طرف ملعون ملحد ہوں (حریف)۔ تاہم مغربی دنیا کے مذہبی محاربات سے واضح ہو گیا کہ روحانی امور کا فیصلہ آلات و اسلحہ کے بل پر نہیں ہو سکتا اور ایٹمی قوت کی دریافت اور ایٹمی اسلحہ کے حصول نے نوع بشر کو متنبّہ کر دیا ہے کہ سرمایہ داروں اور کمیونسٹوں کے لیے مذہبی جنگوں کے بے نتیجہ ہونے کا فیصلہ تجربات کی بنا پر کرنے کا کوئی موقع نہیں جس طرح کیتھولکوں اور پروٹسٹنوں نے ایک ایسے دور میں طویل مدت تک لڑ بھڑ کر دیکھ لیا تھا جب تلواروں برچھیوں اور توڑے والی بندوقوں کے سوا انسان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔

ایسے غیر متیقن اور غیر واضح حالات میں قیاسی رجائیت کی طرح قیاسی قنوطیت بھی بالکل بے دلیل ہوگی اور نوع بشر کے لیے یہ سمجھ لینے کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ایسے مسائل سے دو چار ہے جن کی وجہ سے اس کی ہستی معرض خطر میں ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ نتیجہ کیا نکلے گا - ۱۹۵۵ء میں یہ دوامی لاوارث کشتی' نوح میں سوار ہو کر اس جگہ پہنچے ہوئے تھے جہاں تھور هیرڈهل[۱] اور اس کے پانچ وائی کنگ رفیق ۷- اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو ایک ماہی گیر کشتی پر ملے تھے ؛ اس صبح کو مغرب کی طرف بہنے والی لہریں کون ٹیکی[۲] نام کشتی کو چار ہزار تین سو بحری میل کے فاصلے پر بحر الکاهل میں لے گئی تھیں اور اب کشتی اس سنگ ستانی ساحل کے قریب پہنچ رہی تھی جس کا نام راروئیا[۳] تھا - اس چٹان پر لہروں کے ٹکڑانے سے جو جھاگ پیدا ہو رہی تھی ، اس کے اوپر بحر پیماؤں کو تاڑ کے درختوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں اور وہ جانتے تھے کہ یہ تاڑ ساکن کھاری پانی کے ایک خطے کے اندر جزیروں میں اُگے ہوئے ہیں لیکن اس بہشت زار کے اور ان کے درمیان سنگ ستانی ساحل کے ساتھ لہروں سے ٹکرانے سے زبردست شور و شغب بھی اٹھ رہا تھا اور جھاگ بھی پیدا ہو رہی تھی، جھاگ افق سے افق تک ایک خط بنا رہی تھی[۴]- لہروں کا زور و جوش اور ہوا ان ملاحوں کو موقع نہ دیتے تھے کہ اس کے اوپر سے کشتی کو بچاتے ہوئے نکل جائیں ، وہ بہ حالت مجبوری ناگزیر امتحان گاہ کی طرف جا رہے تھے ؛ ممکن ہے وہ جانتے ہوں کہ جو ملاح ایسے حالات سے دو چار ہو جائیں ، ان کے لیے بچاؤ کے کون کون سے متبادل راستے ہیں لیکن سمجھ نہ سکتے ہوں کہ ان میں سے کون متبادل راستہ خود ان کے مجاہدانہ سفر کو انجام پر پہنچائے گا -

اگر کشتی ساحل سے ٹکرانے والی موجوں سے ٹوٹ جاتی تو چٹانوں کے

۱- Thor Heyerdahl -

۲- Kon-Tiki -

۳- Raoia Reef -

۴- ائیرڈھل ، تھور : ''کون ٹیکی'' (شکاگو ۱۹۵۰ء رینڈ میک نیلی ، (Rand Mcnaliy) (صفحہ ۲۴۲) -

وہ کنارے جو چھری کی مانند تیز تھے ، ملاحوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ؛ دوسرا راستہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ جلد ڈوب جاتے اور ایک دردناک موت سے انھیں رہائی مل جاتی ۔ اگر کشتی محفوظ رہتی تو ملاح اس سے چمٹے رہتے اور جن چٹانوں سے موجیں ٹکرا رہی تھیں ، وہ اپنے غصے کو شکست دیتی ہوئی کشتی کو اوپر خشکی پر پہنچا دیتیں ، یہ لوگ وہاں سے آگے بڑھ کر ساکن پانی کے خطے کو تیر کر عبور کر لیتے اور تاڑ کے درختوں سے مزین جزیرے میں زندہ پہنچ جاتے ۔ اگر کشتی ساحلی چٹانوں پر اس وقت پہنچتی جب کوئی بھاری لہر اٹھ کر پانی کی سطح کو عارضی طور پر چٹانوں سے بہت اوپر اٹھا دیتی ہے اور اس وجہ سے لہروں کا ٹکرانا بھی ختم ہو جاتا ہے تو کون ٹیکی موت کی آغوش سے نکل کر ساکن پانی میں پہنچ سکتی تھی یعنی اس صورت میں اسے کسی بھی صدمے سے دو چار نہ ہونا پڑتا ۔ کوئی ایسی لہر بھی اٹھ سکتی تھی جو کشتی کے تباہ حال ڈھانچے کو مونگے کی چٹان سے اٹھا کر ساکن سمندر میں پہنچا دیتی لیکن ۷ اگست ، ۱۹۴۷ء کو ''کون ٹیکی'' کا کوئی سوار یہ نہ بتا سکتا تھا کہ ان متبادل تقدیروں میں سے کون سی ان کی کشتی کے حصے میں آئے گی ۔

ان چھ بحر پیما سکنڈے نیویائی نوجوانوں کا تجربہ ایک نہایت عمدہ تمثیل اس صورت حال کی ہے جس سے عالم انسانیت بیسویں صدی کے نصف آخر کے افتتاح پر دو چار ہے ، تہذیب کی کشتی تاریخ کے سمندر میں پانچ یا چھ ہزار میل کا فاصلہ طے کر آئی ہے ، اب وہ ان چٹانوں کی طرف بڑھ رہی ہے جن سے چکر کھا کر نکل جانا کشتی چلانے والوں کے بس میں نہیں ۔ یہ خطرہ جس سے بچنا ممکن نہیں کیا ہے ؟ یہ کہ دنیا دو دائروں میں بٹ گئی ہے ، ایک روسی دائرہ اثر ہے اور دوسرا امریکی دائرہ اثر ۔ اس صورت حال کو بدل کر دنیا کو ایک سیاسی اقتدار کے ماتحت متحد ہونا چاہیے ، ایٹمی قوت کے اس دور میں یہ اتحاد کسی نہ کسی طریقے پر زود یا بہ دیر ضرور ہونا چاہیے ۔ کیا یہ اتحاد پر امن طریق پر انجام پا جائے گا یا کوئی بہت بڑا حادثہ پیش آئے گا ؟ حادثہ پیش آئے گا تو کیا وہ کامل بربادی کر دے گا اور اس کی تلافی نہ ہو سکے گی یا اس کی حیثیت جزوی ہوگی اور وہ اپنے پیچھے ایسے عناصر چھوڑ جائے گا جنھیں لے کر آہستہ آہستہ اور محنت و مشقت سے بحالی کا انتظام کیا جا سکے گا ؟ جس وقت یہ سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں ، کوئی نہیں

بتا سکتا کہ دنیا جس امتحان گاہ کی طرف تیزی سے بڑھی چلی جا رہی ہے ، اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟

حادثہ پیش آ چکنے کے بعد عقل‌مندی کا اظہار چنداں مشکل نہیں ہوتا ، اس کا انتظار کیے بغیر ایک مبصر پیش آنے والے حالات کے متعلق قیاس کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے بہ شرطیکہ وہ اپنے غور و فکر کو مستقبل کے اس عالمی نظام کے عناصر تک محدود رکھے جو ان دو نظاموں میں مشترک ہیں جن کے ارد گرد دنیا جمع ہو رہی ہے یعنی جمہوریۂ امریکہ اور روس ۔

جس حد تک فن کاری کا تعلق ہے، حمل و نقل کے وسائل اس پیمانے پر پہنچ چکے ہیں کہ عالمی حکومت کے قیام کو ایک عملی قضیے کی حیثیت حاصل ہے اور جب ہم فن‌کاری کی سطح سے اوپر اٹھ کر یا نیچے اتر کر انسانی فطرت کی سطح پر آئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس ارض بہشت زار کو صناعوں نے نہایت ہنرمندی سے آپس میں جوڑ دیا تھا ، اسے سیاست دانوں کی خودسری اور کج رائی نے احمقوں کی بہشت بنا دیا ہے ۔ ٹینی‌سن کا اندازہ یہ تھا کہ ہوائی جہازوں کی ایجاد کے ساتھ ہی عالم انسانیت کی پارلیمنٹ کا افتتاح ہو جائے گا اور اسے آج انجمن اقوام متحدہ کے دقیا نوسی نام سے پکارا جا رہا ہے اور یہ بھی کہ دینا چاہیے کہ یہ انجمن اتنی بے اثر ثابت نہیں ہوئی جتنی کہ اس کے نکتہ چین کبھی کبھی اسے بتاتے ہیں ۔ ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ انجمن اقوام متحدہ عالم‌گیر حکومت کا بدل نہیں بن سکتی ؛ قوت و طاقت کی تقسیم کے حقائق اس دستور کے بھدے پن میں منعکس نہیں ہوئے جس میں یہ حقیقت سے خالی اصول شامل ہے کہ ہر حکومت کو ایک ووٹ حاصل ہونا چاہیے اور مختلف حکومتوں کی افسانوی مساوات پورا کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہ سمجھا گیا کہ پانچ طاقتوں کو ویٹو کی خاص رعایت دے دی گئی جو ان کے دوسرے ہم‌سروں کو حاصل نہیں اور ان پانچ طاقتوں میں سے ایک چین کی بجائے فارموسا پہنچ چکی ہے ۔ انجمن اقوام متحدہ کے لیے بہترین امید گاہ یہ تھی کہ وہ بحث و نظر کی اجتماع گاہ ہونے کی بجائے کنفیڈریسی کی شکل اختیار کرتی ؛ یہ بھی کہ دینا چاہیے کہ آزاد دولتوں کی ایک کنفیڈریسی میں اور اقوام کی کنفیڈریشن میں جس کی ایک مرکزی حکومت ہو ، بڑی خلیج حائل ہے ۔ یہ مرکزی حکومت ایسی ہونی چاہیے کہ یونین کے ہر شہری کی شخصی اطاعت کا مرجع ہو اور معلوم ہے کہ سیاسی اداروں کی

تاریخ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کرتی جس میں یہ خلیج انقلابی جست کیے بغیر عبور کی گئی ہو۔

اس توضیح کی بناء پر انجمن اقوام متحدہ کوئی ایسا جوہر ادارہ نہیں بن سکتی جس کے نشو و ارتقا سے عالمی حکومت کا ادارہ وجود پذیر ہو جائے؛ اغلب یہ ہے کہ یہ ادارہ انجمن اقوام متحدہ کے سے نہیں بلکہ ان دو پرانے جاری اداروں سے نشو و نما پا کر نکلے گا جو پہلے سے موجود ہیں اور زیادہ محکم ہیں یعنی جمہوریۂ امریکہ کی حکومت اور روس کی حکومت۔

اگر موجودہ نسل انسانی کو انتخاب کی آزادی حاصل ہو تو کسی مغربی مبصر کے دل میں شبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ زندہ مردوں اور عورتوں کی فیصلہ کن اکثریت جو اس بارے میں رائے دینے کی اہل ہے، سویٹ یونین کی بجائے جمہوریۂ امریکہ کی رعایا بننا منظور کرے گی؛ جن خوبیوں کی بناء پر جمہوریۂ امریکہ کو روس پر نمایاں ترجیح حاصل ہے، ان کی کیفیت بھی ملاحظہ فرما لینی چاہیے۔

اس کی موجودہ رعایا یا بننے والی رعایا کی نظروں میں امریکہ کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس کار منصبی کو اپنے لیے قبول کرنے پر راضی نہیں اور اس بارے میں اس کا اخلاص کسی سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ امریکی شہریوں کی موجودہ نسل کا بڑا حصہ نیز ان تمام امریکی شہریوں کے آبا و اجداد جو خود ترک وطن کر کے نہ آئے، پرانی دنیا سے اپنی جڑیں اکھاڑ کر نئی دنیا میں لے گئے اور وہاں از سر نو اس انداز میں زندگی شروع کی کہ اس بر اعظم کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے جس کی گرد وہ اپنے پاؤں سے جھاڑ چکے تھے؛ انھوں نے بڑی خوش گوار امیدوں کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کی تھی اور موجودہ دور کے امریکی بڑی رنج افزا پشیمانی کے ساتھ واپسی پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مجبوری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بُعد مکانی کے فاتح نے نئی دنیا اور پرانی دنیا کو ایک اور ناقابل تقسیم کرہ بنا دیا ہے لیکن اس مجبوری کے بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ ساتھ اس نارضامندی میں کوئی کمی نہیں آئی جس کی بناء پر اسے قبول کیا جاتا ہے۔

اہل امریکہ کی دوسری نمایاں خوبی ان کی کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی ہے۔ جمہوریۂ امریکہ اور روس دونوں وسائل کی فراوانی سے مالا مال ہیں، ان کے اقتصادی اور اجتماعی مواقع میں صرف اسی قدر موافقت ہے کہ

بہ لحاظ عمومی امریکہ کی طرح روس کے پاس بھی ایسے وسائل ہیں جن سے ابھی کام نہیں لیا گیا مگر امریکہ کے برعکس روس نے ابھی تک اپنے بالقوہ وسائل سے فائدہ اٹھانا شروع نہیں کیا اور جس نشو و ارتقا کا انتظام حکومت روس نے ۱۹۴۱ء میں جرمن حملے سے بارہ سال پیش‌تر کی مدت میں انتہائی انسانی محنت و مشقت سے کیا تھا، اسے جرمن حملہ بڑی حد تک تباہ کر چکا تھا۔ اس کے بعد روسیوں نے فاتح ہونے کی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا، انھوں نے جرمنوں کے ہاتھوں روسی کارگاہوں کی تباہی کا بدلہ یوں لیا کہ مجرم جرمنی سے مشینیں اٹھا کر لے گئے بلکہ مشرقی و وسطٰی یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی نہ چھوڑا جن کے بارے میں روسیوں کا دعوٰی تھا کہ انہیں نازیوں سے رہائی دلائی گئی ہے، ان کی مشینیں اور کارخانے بھی اٹھا کر لے گئے؛ چینی منچوریا پر بھی یہی آفت ڈھائی گئی جسے جاپانیوں کے قبضے سے آزاد کرایا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں امریکہ کی بعد از جنگ تعمیری پالیسی پر نظر ڈالیے جو مارشل کے منصوبے اور دوسری تدابیر میں نمایاں ہوئی؛ متعدد ملک تھے جن کی زندگی کا شیرازہ جنگ نے درہم برہم کر ڈالا تھا، امریکہ نے مالی امداد سے انہیں پھر پاؤں پر کھڑا کر دیا، یہ مالی امداد واشنگٹن کی کانگرس نے منظور کی، اس میں امریکہ کے ٹیکس دھندوں کی خیر سگالی شامل تھی جن کی جیبوں سے یہ روپیہ نکلا۔ زمانہ ماضی میں فاتح طاقتوں کا دستور یہ رہا تھا کہ وہ لیتے تھے اور دیتے نہ تھے، سویٹ یونین کے تعلق میں یہ بری رسم نہیں بدلی؛ مارشل کے منصوبے نے ایک نیا معیار قائم کیا جس کا کوئی نمونہ تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہا جائے کہ کشادہ دلی کی اس پالیسی میں خود امریکہ کا فائدہ تھا، اس نے (فوری فوائد کے بجائے) دور کے فوائد پر نظر رکھی اور اس بارے میں متنورانہ نقطۂ نگاہ اختیار کیا لیکن نیک اعمال کی خوبیوں میں اس وجہ سے کوئی کمی نہیں آ سکتی کہ وہ دانش‌مندی اور دور اندیشی پر مبنی تھے۔

مغربی یورپی ممالک کے شہری اس وقت امریکہ کے فیصلوں سے خوف‌زدہ ہیں جس میں مغربی یورپ کی اقوام سے غالباً رائے نہ لی جائے گی۔ ہو سکتا ہے کل یکایک ان پر روس کے ایٹم بم برسنے لگیں اس لیے برسنے لگیں کہ جذباتی امریکیوں نے روس کی کسی اشتعال انگیزی کا جواب دے دیا

اگرچہ امریکہ سے وابستہ حکومتوں کو قابل رشک آزادیٔ عمل حاصل ہے جو سویٹ یونین سے وابستہ حکومتوں کو حاصل نہیں لیکن موت و حیات کے معاملات میں وہ بھی بے چارے اسی طرح بے دست و پا ہیں جس طرح دوسرے بے دست و پا ہو سکتے ہیں۔

۱۸۹۵ء میں وینزیولا اور برطانوی گائنا کی سرحد کے متعلق انگریزوں اور امریکیوں میں اختلاف ہوگیا تھا، اس وقت امریکہ کے سکرٹری آف سٹیٹ رچرڈ اولنے[1] نے ایک گونج پیدا کرنے والا مراسلہ بھیجا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام آج تک زندہ ہے:

> آج ریاست ہائے متحدہ کو عملاً پورے براعظم پر برتری حاصل ہے اور اس کا ہر حکم رعایا کے لیے ایک قانون ہے۔ کیوں؟ کس وجہ سے؟ اس لیے کہ اس کا تعلق خاص دوستی کا ہے اور اس کے لیے خیر سگالی محسوس کی جا رہی ہے؛ اس کی وجہ تنہا یہ نہیں کہ وہ اعلیٰ درجے کی مہذب ریاست ہے اور نہ اس لیے کہ اس کے کار و بار میں عقل، انصاف اور حق کو بہ ہر حال پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ دوسرے اسباب کے علاوہ اصل وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے لا متناہی وسائل اور اس کی الگ تھلگ حیثیت اسے موقع کا مختار بناتے ہیں اور کسی طاقت یا تمام طاقتوں کی یورش اسے شکست نہیں دے سکتی۔

اس استدلال کی قوت میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی اور اسے لاطینی (جنوبی) امریکہ سے وسیع تر دائرے میں استعمال کیا جا سکتا ہے اگرچہ غیر امریکی کہہ سکتا ہے کہ میں روسی بچھڑوں کی بجائے امریکی تازیانوں کے حوالے ہونے کو ترجیح دیتا ہوں لیکن ایک فلسفی (گبن کے انداز کا) اپنے نظریات کو وسعت دیتا ہوا کہہ سکتا ہے کہ جس بڑی طاقت کو فیصلے کرنے اور ان پر عمل پیدا ہونے کا مختار بنایا جائے گا در آں حالیکہ اس کے فیصلوں پر وابستہ قوموں کی زندگیوں اور تقدیروں کا انحصار ہو، مناسب نہیں بلکہ اس کے لیے کسی نہ کسی شکل کی وفاقی یونین کا انتظام

۱- Richard Olney -

ہونا چاہیے۔ قومیتوں پر فائق نظام کی ضرورت نے جو مسئلے پیدا کر دیے ہیں، انھیں آسانی سے اور تیزی سے حل نہیں کیا جا سکتا لیکن کم از کم یہ امر فال نیک ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی تاریخ کی بناء پر وفاق اصول کو پختہ طور پر تسلیم کر چکی ہے۔

تینتالیسواں باب

صنعت کاری ، طبقاتی کشمکش اور مسئلہ روزگار

۱- نوعیت مسئلہ

اگر مسئلہ روزگار کے معنی کو پھیلا لیا جائے اور اس میں کام اور فرصت کی صرف مقدار و تقسیم ہی پیش نظر نہ رکھی جائے بلکہ کام کے سر انجام کی روح اور اوقات فرصت کے استعمال کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ عالمگیر مغربی معاشرے پر غیر معمولی حیثیت میں قوی مغربی تکنیک کے فشار نے مغربی تہذیب کے وارثوں کو روزگار کے ایک مسئلے سے دو چار کر دیا ہے اور یہ مسئلہ حکومت کے اس مسئلے کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے جس پر گزشتہ باب میں بحث ہو چکی ہے ؛ خاص طور پر قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہ معاشرہ ابھی بہت سے جداگانہ طبقات میں منقسم ہے جن کے معیار معیشت بھی ایک دوسرے سے حد درجہ مختلف ہیں -

حکومت کے مسئلے کی طرح روزگار کا مسئلہ بجائے خود کوئی نئی چیز نہیں - اگر دوسری تہذیبوں کے شکست و انحلال کا اولین سبب یہ تھا کہ وہ علاقائی حکومتوں کو بہ طیب خاطر اور بر وقت ہمہ گیر حکومتوں کے درجے پر پہنچا کر جنگ کو ختم کرنے میں ناکام رہیں تو ثانوی سبب یہ بھی تھا کہ وہ کارکردگی کی پیداوار اور دباؤ نیز اوقات فرصت سے استراحت و استفادہ میں رضاکارانہ اور بر وقت تبدیلیاں کر کے طبقاتی کشمکش

کو روکنے میں ناکام رہیں مگر حکومت کے دائرے کی طرح زیر غور دائرے میں بھی متاخر دور جدید کی فن کاری اور پیش تر کی فن کاری یا غیر انسانی قدرت پر مختاری کے درمیان درجے کا اختلاف اختلاف نوع کے مترادف ہے۔ اقتصادی پیداوار میں بے مثال اور زبردست سرگرمی پیدا کر کے مغربی فن کاری نے معتاد مجلسی اور اجتماعی بے انصافی کو قابل علاج بنا دیا، اس وجہ سے وہ ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی۔ جب مشینری کے ذریعے سے صنعت و حرفت ہونے لگی اور جدید افراط نے ان مغربی اجارہ داروں کے لیے بے اندازہ دولت فراہم کر کے رکھ دی جنھوں نے صنعتی انقلاب کی تخم ریزی کی تھی اور پکی ہوئی فصل کاٹی تو یہ سوال سامنے آگیا کہ کس وجہ دولت اور فرصت صرف ایک مخصوص اقلیت کے لیے وقف رہے؟ کیوں ثروت کے یہ نئے انبار مغربی سرمایہ داروں اور مغربی صنعتوں کے کارکنوں، ایشیائی، افریقی اور امریکی انڈین دھقانوں کے درمیان تقسیم نہ ہوں جنھیں گلوں کی شکل میں ھانک کر دنیا بھر پر چھا جانے والے مغربی معاشرے کے داخلی پرولتار بنا لیا گیا۔

پورے عالم انسانیت کے لیے کثرت و افراط کے امکان کا یہی نیا خواب تھا جس سے غیر معمولی طور پر مصرانہ اور بے صبرانہ مطالبہ پیدا ہوا کہ سب کے لیے احتیاج سے آزادی کا بندوبست کیا جائے۔ یہ مطالبہ ہر جگہ پیش ہوا اور اس نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ آیا پیداوار کی افراط و کثرت حقیقةً ویسی ہی لازوال و بے نہایت ہے جیسا کہ اسے سمجھا جاتا ہے؟ اس سوال کا حل ایک ایسی ''مساوات'' کے حل پر موقوف ہے جس میں کم از کم تین مقداریں غیر معلوم ہیں۔

ان غیر معلوم مقداروں میں سے پہلی یہ ہے کہ فن کاری کی بالقوہ صلاحیت کس حد تک نسل انسانی کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کر سکتی ہے جو مقدار میں بھی رو بہ اضافہ ہے اور فرصت کے مطالبات بھی پیش کر رہی ہے یعنی کرہ ارض کے بے بدل مادی وسائل کی کیفیت معدنیات اور آبی قوت کی شکل میں، نیز فصلوں، مویشی، آدمیوں اور انسانی ہنرمندی کی کیفیت کیا ہے؟ جن وسائل پر اب تک دسترس حاصل ہو چکی ہے، ان کی پیداوار میں کس حد تک اضافہ کیا جا سکتا ہے اور راس المال کے خرچ ہوتا جانے کے ساتھ ساتھ ان متبادل وسائل کے

بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جن کو ابھی تک چھؤا نہیں گیا ؟

مغربی سائنس کے مروجہ اکتشافات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صنعت فن کاری کی صلاحیت بے اندازہ ہے ؛ ساتھ ہی فطرت انسانی کے معاصرانہ رد عمل کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس بارے میں انسانی سطح پر عملاً ایک حد ہے جس سے آگے قدم نہیں رکھا جا سکتا اگرچہ ذہنی اور خیالی اعتبار سے فن کاری کے امکانات لامتناہی نظر آئیں۔ ہو سکتا ہے ایک شے کا بنا لینا فنی نقطۂ نگاہ سے ممکن نظر آئے لیکن یہ امکان اس وقت تک حقیقت کا لباس نہ پہن سکے گا جب تک انسانی ہاتھ مشین کا لیور دبانے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ غیر انسانی اشیا پر قدرت کے بالقوہ بے اندازہ حد تک بڑھ جانے کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی یعنی اسی تناسب سے کارکنوں اور مزدوروں کی جمعیت بندی کا یہ پیچ کسا جاتا رہا ؛ انھوں نے اپنی شخصی آزادی پر تصرف کی ناگزیر زحمت شروع کر دی ، یوں فن کاری کے ذریعے سے جو کچھ ممکن العمل تھا ، وہ پورا نہ ہو سکا۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کارکن اور مزدور اس کیک کے حجم میں اضافہ کرنے کے لیے اپنی شخصی آزادی کو کس حد تک قربان کر دینے پر آمادہ تھے جس میں سے وہ بڑے سے بڑے ٹکڑے کا مطالبہ کر رہے تھے ؟ شہری صنعتی مزدور سائنٹفک انتظام کے پابند بننے پر آمادہ تھے ؟ عالم انسانیت کی بہت بڑی اکثریت ان کسانوں پر مشتمل ہے جو ابھی تک زمانہ قدیم کے طور طریقوں پر کاربند ہیں ، وہ زراعت میں مغربیوں کے سائنٹفک طریقے اختیار کرنے پر کس حد تک آمادہ ہیں اور وہ تولید و نسل کشی کے روایۃً مقدس حق اور فرض پر پابندیاں قبول کرنے پر رضا مند ہیں یا نہیں ؟ اس مرحلے پر صورت حالات کا نقشہ یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ پیداوار بڑھانے کے لیے فن کاری کی بالقوہ صلاحیت کو کسانوں اور صنعتی مزدوروں کی سرکشی سے مقابلہ و مسابقہ در پیش ہے ، دنیا کے لاتعداد کسان غذائی وسائل میں ہر اضافے کے ساتھ اسی شرح سے آبادی بڑھا رہے ہیں ، اس وجہ سے فن کاری کی ترقی کے فوائد معرض خطر میں پڑ رہے ہیں ؛ اسی مصنوعات کی ممکنات میں ہر اضافے کے ساتھ صنعتی مزدور ٹریڈ یونینوں کے تحدیدی عمل کے ذریعے سے

اسی شرح کے مطابق پابندیاں عائد کرتے چلے جا رہے ہیں، گویا یہاں بھی فن کاری کی ترقی کے فوائد کو خطرہ در پیش ہے -

۲- مشین آرائی اور نجی ہمت و مستعدی

اقتصادی و مجلسی سطح کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ کلدار صنعت و حرفت کی بناء پر جو تنظیم لازمی و ناگزیر بن گئی ، اس میں اور تنظیم سے ہٹیلے انسانوں کی گریز کے درمیان زبردست کھینچ تان شروع ہو گئی تھی؛ اصل مشکل یہ تھی کہ بد قسمتی سے مشین آرائی اور پولیس ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے - مبصر و شاہد اپنے تاثرات کو اس نقطۂ نگاہ سے متاثر پائے گا جس سے وہ پورے منظر کو دیکھے گا - فن دان کے نقطۂ نگاہ سے ضدی صنعتی مزدور کی روش طفلانہ حد تک غیر معقول معلوم ہو سکتی ہے، وہ یوں سوچے گا کہ کیا ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ہر مطلوب شے کی ایک قیمت ہوتی ہے؛ کیا وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ ان ضروریات کے روبرو سر جھکائے بغیر احتیاج سے فارغ ہو جائیں گے جنھیں پورا کیے بغیر ان کے مطالبات پورے نہیں ہو سکتے؟ مؤرخ کا نقطۂ نگاہ بالکل دوسرا ہوگا ، اُسے یاد آجائے گا کہ برطانیہ کے اندر صنعتی انقلاب اٹھارھویں صدی میں رونما ہوا تھا ، یہ انقلاب ایسے وقت ہی اور ایسے مقام پر بپا ہوا تھا، جہاں ایک اقلیت تنظیم سے بڑی حد تک آزاد تھی اور اسی اقلیت کے افراد نے کل دار مصنوعات کا نظام پیدا کیا تھا ؛ اس سے بیش تر صنعت و حرفت کے ان علم داروں کو نجی و انفرادی ہمت و مستعدی سابقہ اجتماعی نظام سے ورثے میں ملی تھی اور یہی چیز اس نئے نظام کی روح اور خون حیات بن گئی جو ان لوگوں کی سرگرمی سے معرض وجود میں آیا -

مزید براں ہمت ور صنعت کار کو پہلے سے جو آزادی حاصل تھی اور جو صنعتی انقلاب کا اصل سرچشمہ تھی ، اس داستان کے آئندہ باب میں سرگرمی عمل کا سب سے بڑا منبع رہی - صنعت کاری و رؤسا و ناظمین ایک خاص وقت تک اس سٹیم رولر کے نیچے کچلے جانے سے بچے رہے جو خود انھوں نے تیار کر لیا تھا لیکن یہی خوش نصیبی شہری صنعتی مزدوروں کی پیدائش کا نشان بن گئی جو ابتدا ہی سے محسوس کر رہے تھے کہ

غیر انسانی اشیا پر ضبط و نظم میں درجہ کمال حاصل کرنے میں فن کاری کو جو کامیابی ہوئی ، اس کے اثرات انسانی زندگی پر تباہ کن ہیں - ہم ایک اور سلسلے میں دیکھ چکے ہیں کہ فن کاری نے انسانوں کو رات دن کے چکر اور موسموں کے چکر کی سختیوں سے بچا لیا مگر غلامی کی ان پرانی زنجیروں کو توڑنے کے ساتھ اس نے ایک نئی زنجیر کا بندوبست کر دیا -

ٹریڈ یونینوں (پیشہ ور انجمنوں) کی تنظیم وہ خاص چیز ہے جو نئی صنعتوں میں کام کرنے والے لوگوں نے معاشرے کو دی لیکن یہ بھی صنعتی انقلاب سے پیش تر کے اس دور کی میراث میں سے ہے جب کاروبار نجی ہمت و مستعدی پر موقوف تھا اور صنعت و حرفت کے رؤسا فائدہ اٹھا رہے تھے - اگر ٹریڈ یونینوں پر اس لحاظ سے نظر ڈالی جائے کہ یہ کارکنوں کو آقاؤں اور سرمایہ داروں کے خلاف جد و جہد کے قابل بنانے کا ایک ذریعہ ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی مجلسی نظام کی مخلوق ہیں جس کی مخلوق ان کے سرمایہ دار حریف ہیں - خصوصیات کے اس اشتراک کی شہادت مطلوب ہو تو وہ یوں مل سکتی ہے کہ کمیونسٹ روس میں پرائیویٹ ملازمت کا سلسلہ ختم ہوا اور ٹریڈ یونینوں کی تنظیم عمل میں آ گئی ؛ نیشنل سوشیلسٹ جرمنی میں ٹریڈ یونینیں ختم ہوئی تو پرائیویٹ طریق پر ملازم رکھنے والوں کی تنظیم شروع ہو گئی - برطانیہ کلاں میں ۱۹۴۵ء کے انتخابات کے بعد حکومت کی باگ ڈور لیبر پارٹی کے ہاتھ میں آئی تو اس نے شخصی آزادی میں خلل ڈالے بغیر صنعتی کارخانوں کو پرائیویٹ مالکوں کے قبضے سے نکال لیا ؛ جو صنعتیں قومی بن چکی تھیں ، ان کے کارکنوں اور مزدوروں نے نہ ٹریڈ یونینیں توڑیں ، نہ اپنے ممبروں کے مفاد کی حفاظت کے حق سے دست برداری اختیار کی بلکہ وہ ان تمام تدبیروں سے بدستور کام لیتے رہے جن سے اس زمانے میں لیتے تھے جب کاروبار پرائیویٹ نفع خوروں کے ہاتھ میں تھا اور اس طرز عمل کو کبھی غیر منطقی قرار دے کر ختم کرنے کی کوشش نہ کی گئی ؛ ٹریڈ یونینوں کا مقصد یہ تھا کہ اقتدار کی مزاحمت کریں خواہ وہ اقتدار پرائیویٹ سرمایہ داروں کا ہوتا یا نیشنل بورڈ کا -

مصیبت یہ پیش آئی کہ کارکنوں نے ملازم رکھنے والے آقاؤں کی تنظیم کی مخالفت کی تھی ، اس طرح وہ خود تنظیم کی منزل میں پہنچ گئے ؛ انہوں نے اس تقدیر کے خلاف جنگ شروع کی تھی کہ کارخانوں میں کم

کرتے کرتے کہیں بے جان بت نہ رہ جائیں مگر ٹریڈ یونینوں میں کام کرتے کرتے وہ خود ان کے نظام میں بے جان بت رہ گئے اور اس تقدیر سے بہ ظاہر کوئی مفر نہ تھا اور انھیں اس واقعے سے بھی کوئی تسکین نہ ہو سکتی تھی کہ ان کا پرانا دشمن پرائیویٹ سرمایہ دار اب خود زیر اقتدار آ کر بے جان ڈھانچا بن رہا تھا ۔ اب حریف کوئی جابر سرمایہ دار انسان نہ تھا جس پر غصے اور جوش کی حالت میں لعنت بھیجی جا سکتی تھی اور اس کی کھڑکیاں توڑی جا سکتی تھیں ؛ اب حریف کی جگہ ایک ایسی غیر مشخص اجتماعی قوت نے لے لی تھی جو بہت زیادہ بے پناہ تھی ، ساتھ ھی نظر نہ آ سکتی تھی ، قابل نفرت اور مشخص انسان کی حالت پر نہ تھی ۔

اگر صنعتی کارکنوں کا اپنے اوپر اقتدار قائم کر لینا ایک تاریک منظر پیش کر رہا ھے تو یہ امر خوف انگیز ھے کہ مغربی دنیا کا درمیانہ طبقہ بھی اسی راہ پر لگ رہا ھے جس پر مغربی کارکن اور مزدور مدت سے چلے جا رہے ھیں ۔ جو صدی ۱۹۱۴ء پر ختم ہوئی ، مغرب کے درمیانہ طبقے کے لیے عہد زرین کی حیثیت رکھتی تھی مگر نئی صدی کے آغاز ھی سے اس طبقے کا زوال شروع ھو گیا اور وہ بھی اسی مفلسی کا شکار ھو گئے جو صنعتی انقلاب صنعتی مزدوروں پر بلائے بے درماں کی طرح لایا تھا ۔ سویٹ روس میں سرمایہ دار طبقے کا حذف ھو جانا سنسنی پیدا کرنے والا واقعہ معلوم ھوتا تھا لیکن جو کچھ پیش آ رہا تھا ، اس کی صحیح کیفیت برطانیہ اور انگریزی بولنے والے دوسرے ممالک کی مجلسی تاریخ سے معلوم ہو سکتی ھے جہاں کوئی سیاسی انقلاب رو نما نہ ھوا تھا ۔

صنعتی انقلاب اور پہلی عالمی جنگ کے درمیانی دور میں مغرب کے درمیانہ طبقے اور ”کارکن“ طبقے میں (خواہ وہ لوگ عام محنت مزدوری کرنے والے تھے یا محرر تھے) نمایاں فرق یہ تھا کہ درمیانہ طبقے کو ھر وقت کام کی لو لگی رہتی تھی ۔ جزیرۂ مین ھٹن[1] نے جو سرمایہ داری کا گڑھ ھے ، ۱۹۴۹ء میں روش کے اس اختلاف کی ایک حقیر مگر نہایت نمایاں مثال پیش کی ؛

---

۱ - Manhattan Island - دریائے ھڈسن کے دھانے کا مشہور جزیرہ جو نیویارک شہر کا ایک ضلع ھے (مترجم) ۔

اس سال وال سٹریٹ[1] کے بڑے بڑے مال دار اپنے شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کے ملازموں کو وقت سے زائد کام کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ دینے کی کوشش کرتے رہے تاکہ وہ کسی طرح ہفتے کی صبح کو تھوڑی دیر کے لیے کام پر راضی ہو جائیں مگر انھوں نے اجتماعی طور پر فیصلہ کر لیا کہ اس روز دفتر ہرگز نہ جائیں گے ۔ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ والوں کو ملازم رکھنے والے لوگ چاہتے تھے کہ اپنی ہفتے کی صبح کام کے لیے وقف رکھیں تاکہ ان کے نفع پر کوئی اثر نہ پڑے ؛ اگر وہ اپنی کارکردگی کے ہفتے میں تخفیف گوارا کر لیتے تو ساتھ ہی نفع بھی جاتا رہتا ۔ وہ ٹائپ شارٹ ہینڈ والوں کی امداد کے بغیر اپنا کام نہ کر سکتے تھے مگر انھیں اس پر راضی نہ کر سکے ۔ شارٹ ہینڈ ٹائپ والوں کا موقف یہ تھا کہ وہ اپنی مزید فرصت کے اوقات میں ایک دن یا نصف دن کی تخفیف پر بھی راضی نہ ہوئے اور یہ فرصت ان کے نزدیک اس مالی ترغیب سے بدرجہا زیادہ تھی ۔ جو ان کے روبرو پیش ہو رہی تھی ؛ وہ زائد روپیہ ان کے لیے کسی کام کا نہ تھا ، اگر وہ روپیہ فرصت کے زائد اوقات دے کر ہاتھ آ سکتا تھا ۔ روپے اور زندگی کے انتخاب میں انھوں نے زندگی کو ترجیح دی اور روپیہ چھوڑ دیا اور انھیں ملازم رکھنے والے اس رائے کے بدلنے پر قادر نہ ہو سکے ۔ ۱۹۵۶ء میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وال سٹریٹ کے شارٹ ہینڈ ٹائپ والے تو سرمایہ داروں کے نقطۂ نگاہ پر کیا آتے البتہ خود سرمایہ دار شاید اقتصادی بدحالی سے مجبور ہو کر انجام کار شارٹ ہینڈ ٹائپ والوں کے نقطۂ نگاہ پر آ جائیں ؛ اس وقت تک وال سٹریٹ میں بھی وہ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی جو لمبارڈ سٹریٹ کی گرم جوشیوں کو افسردہ کر چکی تھی ۔

بیسویں صدی میں مغربی دنیا کے درمیانہ طبقے کے لیے نفع بخش کاروبار کے مواقع سرمایہ داری کے مرکزوں میں یکے بعد دیگرے گھٹ رہے تھے اور اقتصادی بدحالیاں درمیانہ طبقے کی خصوصیات پر افسردگی افزا اثر ڈال رہی تھیں ۔ اس طبقے میں کام کے لیے جو روایتی جوش و سرگرمی

۱- Wall Strest ۔ نیویارک میں سرمایہ داروں کا مرکز جہاں سٹاک اکسچینج واقع ہے ۔ (مترجم)

پائی جاتی تھی ، وہ انفرادی کاروبار کے دائرے میں پابندیوں کے باعث نم آلود ہو رہی ہے ، روپیہ پیدا کرنے میں محنت و مشقت اور روپیہ بچانے میں کفایت شعاری کی خوبیاں افراط زر اور ٹیکسیوں کی وجہ سے بے معنی بن رہی ہیں ، مصارف معیشت میں اضافہ ہو رہا ہے ، ساتھ ہی معیار معیشت کی بلندی کنبوں کے افراد کی تعداد گھٹا رہی ہے ، خانہ داری کے لیے ملازم نہیں ملتے اور اس پیشے کی صلاحیت برباد ہو رہی ہے ، فرصت کی بربادی ثقافت پر اثر انداز ہو رہی ہے ۔ مزید برآں درمیانے درجے کی عورت پر درمیانہ درجے کے مرد کے مقابلے میں زیادہ سخت زد پڑی ہے حالاں کہ یہی عورت ہے جس پر درمیانہ طبقے کے اعلیٰ معیار کے قیام کا انحصار تھا جیسا کہ بیسیوں سوانح حیات میں بتایا گیا ہے ۔

غرض درمیانے طبقے کے افراد پرائیویٹ کاروبار چھوڑ کر سرکاری ملازمتوں یا ان کے نفسیاتی مثنٰی بڑی بڑی غیر سرکاری کمپنیوں کی ملازمتوں میں جا رہے ہیں اور ان کی تعداد روز افزوں ہے ۔ اس سے مغربی معاشرے کو نفع بھی پہنچ رہا ہے اور نقصان بھی ؛ سب سے بڑا نفع یہ ہے کہ ذاتی منفعت خدمت عامہ کے تابع آ گئی ہے ۔ اس تغیر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ہو تو دوسری تہذیبوں میں اس قسم کے تغیر کے اثرات کا اندازہ کر لو مثلاً چینی ، یونانی اور ہندی تہذیبوں میں ہمہ گیر سلطنتوں کے قیام سے جو سنبھالا لیا گیا تھا ، اس میں ایک حصہ ان لٹیروں کا بھی تھا جن کی سرگرمیوں کو خدمت عامہ کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا ۔ آگسٹس اور اس کے جانشینوں نے کاروبار میں مال لوٹنے والے رومیوں سے اعلیٰ درجے کا انتظامی ڈھانچا تیار کر لیا تھا ، ہن لیو پینگ نے یہ کام جاگیرداروں سے لیا ، کارنوالس اور اس کے جانشینوں نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں اور کارندوں کو اٹھا کر سول سروس میں بھرتی کر لیا اور اعلیٰ ڈھانچا بنا لیا حالاں کہ پیش تر وہ تجارت کے ذریعے سے روپیہ لوٹتے تھے ؛ تاہم ہر معاملے میں نتیجے نے ایک کم زوری کی صورت واضح کی اگرچہ ہر جگہ اسباب مختلف تھے ۔ کم زوری یہ تھی کہ سول سروس کی خصوصیات انجام کار عجیب صورت اختیار کر گئیں ؛ اس میں دیانت داری کی اعلیٰ خوبی موجود تھی لیکن ساتھ ہی دل میں گرمی اور جوش باقی نہ رہا ، نیز نئے سلسلے شروع کرنے کو خطرات مول لینے سے تعبیر کیا جانے لگا ۔ یہ

خصوصیات مغرب کے درمیانہ طبقے کے سرکاری ملازمین بیسویں صدی میں ظاہر کر رہے ہیں؛ جو اہم کام در پیش ہے اور آج یا کل اس سے سابقہ پڑے گا ، اس سے کام دائی کے ساتھ عہد بر آ ہونے کے لیے یہ نیک فال نہیں ، کام یہ ہے کہ عالم گیر حکومت منظم کی جائے اور اسے قائم رکھا جائے۔

سول سروس کی ان خصوصیات کے اسباب پر ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دباؤ کے چیلنج کا جواب تھا جو ایک خاص مشین کی وجہ سے پڑا تھا اور وہ مشین معدنی سامان کے بجائے نفسیاتی سامان سے تیار ہوئی تھی۔ ایک اعلٰی درجے کی منظم سلطنت کی مشینری کی نگرانی اور رعایا] کے کروڑوں افراد کا انتظام بھی ویسا ہی روحیت کش کام تھا جیسا کہ کسی کارخانے کی مشینوں کا انتظام۔ سرخ فیتا لوہے سے زیادہ انقباض انگیز ہے اور اب سرخ فیتا سول سروس والوں کی روح میں داخل ہو چکا ہے؛ منتخب قانون ساز مجالس کا کام جماعت بندی کے منظم اور سخت ڈھانچے کے باعث بہت بڑھ گیا ہے ، سول سروس والے بھی رسمیات اور روٹین کے عادی ہو چکے ہیں۔

ان تمام رجحانات کی اہمیت کی روشنی میں مروجہ سرمایہ دارانہ نظام کے مستقبل کا اندازہ کر لینا مشکل نہیں۔ مغرب کے درمیانہ طبقے نے صنعتی انقلاب سے پیش‌تر نفسیاتی سرگرمی کا جو ذخیرہ فراہم کر رکھا تھا ، وہ سرمایہ داری کو آگے بڑھانے والی قوت کی حیثیت رکھتا تھا؛ اگر اس سرگرمی کی قوت گھٹائی جا رہی ہے اور اسے پرائیویٹ کاروبار کی جگہ غیر سرکاری ملازمت کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے تو اس عمل سے سرمایہ داری پر یقیناً کاری ضرب لگے گی :

> سرمایہ داری اساساً اقتصادی تغیر کا عمل ہے ---- جب تک نئی ایجادیں نہ ہوں گی اور نئے طریقے استعمال نہ کیے جائیں گے ، نئے کاروباری آدمی پیدا نہ ہوں گے۔ نئے کاروباری کمالات کے بغیر نہ کوئی سرمایہ نفع لائے گا اور نہ اس میں جوش و حرکت پیدا ہوں گے۔ سرمایہ داری صرف صنعتی انقلابات ——— ترقیات ——— کی فضا میں زندہ رہ سکتی ہے --- محکم و ہوجا سرمایہ داری صریح تناقض ہے۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ صنعتی فن کاری نجی کاروبار کی اس روح کو کچل کر رکھ دے جو صنعتی انقلاب سے پیشتر موجود تھی - اس نے ایک اور سوال پیدا کر دیا ، کیا مشینی صنعت کاری کا ٹکنیکل نظام نجی کاروبار کے مجلسی نظام سے بعد بھی زندہ رہے گا ؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو کیا مغربی تہذیب مشینی صنعت کاری کے مر جانے کے بعد بھی زندہ رہ سکے گی ؟ اس صنعت کاری کے لیے اس نے یرغمال دے رکھے ہیں ، مشینوں کے عہد میں آبادی بڑھتے بڑھتے اس درجے پر پہنچ گئی ہے کہ غیر صنعتی اقتصادی نظام اسے سنبھال ہی نہیں سکتا -

یہ امر غیر متنازعہ فی ہے کہ صنعتی نظام اسی صورت میں جاری رہ سکتا ہے کہ اسے چلانے کے لیے خلّاق نفسیاتی قوت کا کوئی ذخیرہ موجود ہو - اب تک یہ ذخیرہ درمیانہ طبقہ فراہم کرتا رہا لہٰذا سوال نے بالآخر یہ صورت اختیار کر لی کہ آیا اس نفسیاتی قوت کا کوئی متبادل سرچشمہ موجود ہے جس سے انہیں مقاصد کے لیے کام لیا جائے اور اگر درمیانہ طبقے کی قوت و سرگرمی کمزور ہو جائے یا دوسری طرف منتقل کر دی جائے تو مغربی دنیا اس متبادل سرچشمے سے فائدہ اٹھا سکے ؟ اگر کوئی عملی متبادل ذریعہ دسترس میں ہو تو دنیا سرمایہ داری کے نظام کی موت پر مطمئن رہ سکتی ہے لیکن اگر متبادل ذریعہ موجود نہیں تو منظر سخت حوصلہ فرسا ہے - اگر مشینوں نے گروہ بندی کا سلسلہ شروع کیا اور اگر گروہ بندی نے پہلے صنعتی کارکنوں پھر درمیانہ طبقے کی روح یکے بعد دیگرے کچل ڈالی تو کیا کسی انسانی ہاتھ کے لیے ممکن ہے کہ اس زبردست مشین کو بے تکلف چلا سکے ؟

۳- مجلسی موافقت کے متبادل طریقے

عام انسانیت جس مجلسی مسئلے سے دو چار ہے ، اس کے حل کے لیے مختلف ملکوں میں مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے کوشش کی جا رہی ہے ؛ شمالی امریکہ ایک طریقے پر کاربند ہے ، سوویٹ روس دوسرے طریقے پر اور مغربی ملک تیسرے طریقے پر -

شمالی امریکہ نے نئی دنیا میں ایک ارضی بہشت بنانے کا نصب العین سامنے رکھ لیا اور یہ ارضی بہشت انفرادی ہمت و سرگرمی کے نظام پر

مبنی ہے اور شمالی امریکہ کے باشندوں (ان میں انگریزی زبان بولنے اہل کینیڈا بھی شامل ہیں اور ریاست‌ہائے متحدہ کے باشندے بھی) کو یقین ہے کہ وہ اسے بہترین صورت میں قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مزدوروں اور کارکنوں کے اقتصادی اور مجلسی درجوں کو ترقی دیتے دیتے درمیانہ طبقے کے درجے پر پہنچا دیں گے اور اس طرح وہ اس صورت حال کو ختم کر سکیں گے جسے ہم نے سابقہ حصے میں مشینوں کے ذریعے سے صنعت کاری کے طبعی نفسیاتی اثرات قرار دیا تھا۔ یہ بڑا ولولہ انگیز یقین ہے اور متعدد اوہام پر مبنی ہے؛ ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سب علٰحدگی کے بنیادی وہم سے پیدا ہوئے۔ نئی دنیا اتنی نئی نہیں جتنی کہ اس کے پرستار اسے ظاہر کرنے کے خواہاں ہیں؛ انسانی فطرت جس میں پہلا گناہ بھی شامل تھا، ابتدائی تارکین وطن اور ان کے جانشینوں کے ساتھ ہی اوقیانوس پار پہنچ گئی تھی۔ انیسویں صدی میں بھی جب علٰحدگی سیاسی سطح پر قابل عمل نظر آتی تھی، اس ارضی بہشت میں بہت سے سانپ موجود تھے؛ بیسویں صدی کا قدم آگے بڑھا، فضا تاریک‌تر ہونے لگی تو یہ نمایاں طور پر ظاہر ہو گیا کہ دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرنا یعنی ایک حصے کو نئی دنیا اور دوسری کو پرانی دنیا قرار دینا ایک ایسا نظریہ ہے جو حقائق سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا؛ پوری نسل انسانی اب ایک کشتی میں سوار ہے اور جو فلسفہ اس پوری نسل کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا، وہ انجام کار اس کے کسی ایک حصے کے لیے بھی کار آمد نہ رہے گا۔

طبقاتی کشمکش کے مسئلے کو حل کرنے کی روسی تدبیر بھی امریکیوں کی طرح یہی ہے کہ ایک ارضی بہشت بنانے کا نصب‌العین سامنے رکھ لیا جائے؛ اس نے ایک ایسی پالیسی کی شکل اختیار کی جس کا مدعا یہ تھا کہ طبقاتی تقسیم کو ختم کر دیا جائے تاکہ کشمکش پیدا ہی نہ ہو لیکن یہاں پہنچ کر امریکیوں اور روسیوں کے طریقوں کی مشابہت و یک سانی ختم ہو گئی۔ آگے بڑھ کر امریکی تو یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مزدوروں اور کارکنوں کو اپنے اندر جذب کر کے ایک درمیانہ طبقہ بنا دیا جائے؛ روسیوں نے درمیانہ طبقہ بالکل حذف کر دیا ہے، نجی ہمت و مستعدی کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ سرمایہ داری کے ساتھ ٹریڈ یونینوں کو بھی ختم کر دیا ہے۔

کمیونسٹ روس کی پالیسی کے بعض پہلو بڑے محکم ہیں جن کی قدر و قیمت میں تخفیف ان کے حریفوں کے لیے ہرگز مناسب نہ ہوگی ، ان میں سب سے اہم پہلو خود کمیونزم کی خصوصیات کا ہے ۔ ممکن ہے انجام کار یہ نظریہ مذہب کے لیے غیر تسلی بخش بدل ثابت ہو لیکن فی الحال وہ ہر اس روح کے لیے مذہبی آدمی کی گہری ضروریات کے مطابق تسلی بخش ہے جس کا گھر خالی ، صاف کیا ہوا اور آراستہ ہو ۔ دنیا کو کمیونزم کا معتقد بنانے کا مشن زیادہ جوش انگیز ہے ، دنیا کو نفع خوروں کے لیے یا ہڑتال کا حق استعمال کرنے کے لیے باقی رکھنا اتنا جوش انگیز نہیں ہو سکتا ہے ؛ ''خوش حال امریکہ کی بجائے مقدس روس'' کا نعرہ زیادہ جنگی جذبہ پیدا کرتا ہے ۔

روسی تدبیر کا دوسرا مستحکم پہلو یہ ہے کہ روس کی موقعیت اسے علٰحدگی کے وہم میں مبتلا نہیں کر سکتی ؛ روس کی کوئی طبعی سرحد نہیں ، نیز مارکس کا جو فلسفہ کریملن سے نشر کیا جا رہا ہے ، وہ چین سے پیرو تک کسانوں کی دنیا کے لیے پر جوش دعوت ہے ۔ روس کا مجلسی اور اقتصادی موقع ایسا ہے کہ جمہوریۂ امریکہ کے مقابلے میں اسے نسل انسانی کے تین چوتھائی خستہ حال حصے سے زیادہ قرب ہے اور دولو طاقتوں (روس اور امریکہ) کے درمیان اسی حصے کی وفاداری کے لیے معرکۂ مسابقت بپا ہے ۔ روس پورے وثوق سے دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے اپنی محنت و مشقت سے اپنے آپ کو بچا لیا ہے اور اپنی مثال سے دنیا بھر کے پرولتار کو بچائے گا ، اس پرولتار کا ایک حصہ جمہوریۂ امریکہ میں بھی آباد ہے ۔ امریکہ کے جو طبقے کمیونزم کے خلاف ہیں ، ان میں بعض کو مارکس کی اس دعوت کی قوت کا پورا احساس ہے اور وہ اسے چھپانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ بعض تو اس کے اظہار میں دیوانگی کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ۔

مغربی یورپ کے ممالک اس مسئلے کو جس طریق پر حل کر رہے ہیں ——— اس کی شہادتیں برطانیہ کلاں اور سکنڈے نیویائی ملکوں میں ملتی ہیں ——— وہ امریکہ اور روس دونوں سے مختلف ہے ، اس میں ان دونوں ملکوں کی سی اصول پرستی نمایاں نہیں ۔ جن ملکوں میں طاقت اور دولت چھن کر مغربی دنیا کے حواشی پر بیٹھے ہوئے دو عفریتوں کی طرف منتقل ہو رہی ہے ، ساتھ ہی صنعتی کارکن نئے مطالبات

پیش کر رہے ہیں، ان کے درمیانہ طبقے کے لیے بداہۃً ممکن ہی نہیں کہ وہ شمالی امریکہ کی مثال کو سامنے رکھے یعنی کار کنوں کو دونوں سہولتیں دے دے؛ اول درمیانہ طبقے کا درجۂ معیشت، دوم ذاتی اغراض کی تسکین کے بے اندازہ مواقع - مغربی یورپ کے کارکن طبقے کو مطلق العنان نظام تنگ واسکٹ دے دینا اور بھی غیر ممکن ہوتا؛ چناں چہ انگریزوں اور اہل سکنڈے نیویا نے بیچ کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی — یعنی نجی ہمت و سرگرمی اور مجلسی انصاف کے سلسلے میں حکومت کے اقتدار کو ملانے کا تجربہ کیا، یہ وہ پالیسی ہے جسے عموماً ''اشتراکیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے - یہ اصطلاح انگریز مداحوں کی زبان پر قابل تعریف تھی لیکن امریکی نقادوں کی زبان پر پہنچی تو مستوجب مذمت بن گئی - جس حد تک برطانیہ میں بہبود و فلاح کا نظام پیدا کرنے کا تعلق ہے، یہ جزواً جزواً پیدا کیا گیا، اس کے لیے دعوے ضروری نہ سمجھے گئے اور تمام سیاسی جماعتوں نے قانون کے ذریعے سے اسے پورا کیا -

۴- مجلسی انصاف کے ممکن مصارف

جب انسان اپنے لیے کسی نہ کسی نوع کی شخصی آزادی اور کسی نہ کسی نوع کے مجلسی انصاف کا انتظام نہ کر لے، اس کے لیے اجتماعی زندگی بسر کرنا بالکل غیر ممکن ہے - شخصی آزادی ہر انسانی کارنامے کی ایک ناگزیر شرط ہے، خواہ اس کی حقیقت اچھی ہو یا بری اور مجلسی انصاف انسانی میل کے کھیل کا سب سے فائق قاعدہ ہے - اگر شخصی آزادی پر کوئی پابندی باقی نہ رہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ کمزور تباہ ہو جائیں گے اور اگر مجلسی انصاف کو انتہائی پیمانے پر جاری کرنے کی کوشش کی گئی تو اس آزادی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی جس کے بغیر انسانی فطرت تخلیق کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتی - تمام معلوم مجلسی دستور ان دونوں فطری سرحدوں کے بیچ بیچ میں رہے ہیں؛ مثال کے طور پر سویٹ روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عملی دساتیر میں شخصی آزادی اور مجلسی انصاف کو مختلف تناسبات سے اکٹھا کر دیا گیا ہے اور بیسوی صدی کے وسط کی مغربی دنیا میں

ان کی آمیزش کو خواہ اس کی حیثیت کچھ تھی ، ''جمہوریت'' کے نام سے پکارا گیا - یہ اصطلاح یونانیوں کے سیاسی ذخیرہ الفاظ سے لی گئی ، وہاں یہ عموماً تحقیر آمیز انداز میں استعمال کی جاتی تھی لیکن یہاں پہنچ کر ہر خود دار سیاسی کیمیا گر کے لیے امتیازی لقب بن گئی -

اصطلاح جمہوریت کو یوں استعمال کرنے کا مدعا یہ نکلا کہ حریت و مساوات کے مقاصد میں جو کشمکش ہے ، اس پر پردہ پڑا رہے ؛ ان دو متصادم مقصدوں کے درمیان حقیقی مصالحت کے لیے اخوت کی اصطلاح تجویز ہوئی تھی - اگر انسان کی نجات اس امر پر موقوف تھی کہ وہ اس اعلیٰ نصب العین کے مطابق عمل پیرا ہو جاتا تو یہ کہنا چاہیے کہ سیاست دانوں کی تدبیر گزاری نے انھیں ہرگز زیادہ دور نہیں پہنچایا اس لیے کہ انسان اس وقت تک اخوت کو حقیقی عملی شکل نہیں دے سکتا جب تک وہ صرف اپنی قوتوں پر انحصار رکھے ؛ انسان کی اخوت خدا کی ابوت سے پھوٹتی ہے -

شخصی آزادی اور مجلسی انصاف کو دو پلڑوں میں رکھ کر تولا جا رہا ہے اور توازن معرض تزلزل میں ہے ، صنعت کاری کا سپرز شخصی آزادی کے مخالف پلڑے میں رکھ دیا گیا ، اس دریافت کی توضیح و توثیق کے لیے ہمیں معاشرے کی آئندہ حالت پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے جو صاف نظر آنے لگی ہے اگرچہ ہم اس پر ابھی پہنچے نہیں - آئیے ! ہم بحث و نظر کی غرض سے فرض کر لیں کہ ہمہ گیر قوت و طاقت والی صنعت کاری اپنے ایجنڈے کا دوسرا بڑا کام پورا کر چکی ہے ، اس نے ایٹم بم انسان کے ہاتھ میں دے دیا اور اسے مجبور کیا کہ جنگ کو ختم کر دے ، ساتھ ہی اس نے شرح اموات کو انتہائی حد تک کم کر دیا اس لیے کہ تمام طبقوں اور تمام نسلوں کے لیے ایسی دوائیں مہیا کر دیں جو انسداد امراض کے لیے ضروری ہیں ؛ آؤ ! یہ بھی فرض کر لیں —— اور یہ اغلب ہے —— کہ زندگی کے مادی احوال میں یہ تمام عظیم الشان اصلاحات انتہائی تیزی سے معرض نفاذ میں آگئیں اور ثقافتی تغیرات اس تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکے ، ان مفروضات کے ساتھ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ انسانوں کا تین چوتھائی حصہ جو کسانوں پر مشتمل ہے ، اپنے وسائل معیشت کا آخری حد تک بچے پیدا کرنے کی عادت

نہ چھوڑے گا ، گویا نئے نظام عالم کے قیام سے ان کی دسترس میں معیشت کے جو زائد ذرائع دے دیے جائیں گے ، انہیں آبادی کے اضافے میں خرچ کرتا جائے گا اور اس نظام کے جلو میں امن ، حفاظت ، حفظان صحت اور غذائی پیداوار میں سائنس سے کام لینے کے جو فوائد آئیں گے ، وہ بھی اکارت جائیں گے ۔

اس قسم کی پیش‌گوئیوں کو شیخ چلی کے منصوبے قرار نہ دینا چاہیے ؛ جو رجحانات مدت سے مروج چلے آتے ہیں ، یہ مستقبل میں ان کے سایے ہیں ؛ مثال کے طور پر چین میں غذائی وسائل اس وجہ سے خاصے بڑھ گئے کہ سولھویں صدی میں امریکہ سے ایسی غذائی فصلیں آ گئیں تھیں جن کے بارے میں پہلے کوئی علم نہ تھا لیکن یہ اضافے روز افزوں آبادی کی نذر ہوتے گئے ، سترھویں صدی میں مانچو خاندان نے جو امن قائم کر دیا تھا ، اس سے بھی آبادی میں اضافہ ہوا ۔ چین میں مکئی ۱۵۵۰ء کے آس پاس ، آلو ۱۵۹۰ء کے آس پاس اور مونگ پھلی چند سال بعد پہنچی : آبادی ۱۵۷۸ء کے اندازے کے مطابق ۶۳۵۹۹۵۴۱ تھی لیکن ۱۶۶۱ء میں دس کروڑ تراسی لاکھ پر پہنچ گئی تھی ۔ بعد ازاں ۱۷۴۱ء میں چودہ کروڑ چونتیس لاکھ گیارہ ہزار پانسو انسٹھ ، انیسویں صدی کے وسط میں تیس کروڑ اور بیسویں صدی کے وسط میں ساٹھ کروڑ ہو گئی تھی ۔ ان اعداد سے صرف اضافہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلسلۂ ہندسیہ میں پیش آتا رہا اگرچہ اس اثنا میں طاعون ، وبا ، قحط ، جنگ ، قتل اور ناگہانی اموات کے دور بھی آتے رہے ؛ ہندوستان ، انڈونیشیا اور دوسرے مقامات میں آبادی کی معاصرانہ افزائش کے اعداد یہی داستان سناتے ہیں ۔

اگر یہ سب کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے تو مستقبل میں کیا امید رکھی جا سکتی ہے ؟ سائنس غذائی وسائل اس کثرت و افراط سے مہیا کر چکی ہے کہ تا حال مالتھوسی قنوطیت کی تغلیط ہوتی رہی ہے لیکن سطح ارض کے رقبے کی محدودیت میں رد و بدل نہیں ہو سکتا اور بڑھتی ہوئی انسانیت کے لیے غذا مہیا کرنے کے سلسلے کی بھی ایک حد ہے اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری حد آ جائے گی اور کسانوں کے وسیع طبقات اس وقت تک بچے پیدا کرنے کی عادت پر قابو

نہ پا سکیں گے۔

ان پیش گوئیوں سے واضح ہے کہ مالتھوس کی امیدیں اس کی موت کے بعد پوری ہو جائیں گی لیکن ہم یہ پیش گوئی بھی کر سکتے ہیں کہ اس ''زبردست قحط'' سے پیش تر کوئی عالم گیر مرکزی اقتدار قائم ہو جائے گا جو روئے ارض کی پوری آبادی کی ابتدائی مادی ضروریات کا نگران بن جائے گا۔ اس صورت حال میں بچے پیدا کرنا مردوں اور عورتوں کی نجی خواہش پر موقوف نہ رہے گا بلکہ ایک ایسی قوت منتظمہ کا انتظامی مسئلہ بن جائے گا جو ہر جگہ موجود ہوگی۔ مختلف حکومتیں اب تک نجی زندگی کی اندرونی تقدس گاہ میں جس حد تک مداخلت کر سکتی ہیں یہ ہے کہ ارباب اختیار غیر معمولی طور پر بڑے کنبوں والے والدین کو منفی یا مثبت معاوضے دیتے رہے تا کہ مزدوری کے لیے یا توپوں کا ایندھن بننے کے لیے ضرورت کے مطابق آدمی مل جائیں لیکن وہ نہ اپنی رعایا کو بچوں کی تعداد محدود رکھنے کی ہدایت کر سکیں اور نہ زیادہ بچے پیدا کرنے پر مجبور کر سکیں۔ بچے پیدا کرنے یا نہ پیدا کرنے کی آزادی کو ۱۹۴۱ء تک بے فکری سے ایک مسلمہ حق سمجھا جاتا رہا۔ پریذیڈنٹ روز ویلٹ نے جب منشور اوقیانوس تیار کیا تھا، وہ انسان کی بدیہی آزادیوں کا عدد چار سے پانچ نہ کر سکا؛ پانچویں آزادی کے ماتحت صاف صاف لکھ دیتا کہ والدین خود اپنے بچوں کی تعداد متعین کرنے کے مجاز ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روز ویلٹ نے اس بارے میں سادگی سے سکوت اختیار کرکے بلا ارادہ منطق کی پیروی کی، کیوں کہ ظاہر ہے کہ انجام کار احتیاج سے آزادی کی ذمہ داری اس وقت تک اٹھائی نہ جا سکے گی جب تک بچّے پیدا کرنے کی آزادی چھین نہ لی جائے؛ رہا یہ معاملہ کہ اس مقصد کو کیوں کر پورا کیا جائے گا تو اس سلسلے میں بعض نازک سوال سامنے آ جاتے ہیں۔

اگر ایسا وقت آنے والا ہے کہ بچے پیدا کرنے کا معاملہ ایک خارجی نظام کے ضبط و نظم میں آ جائے گا تو سوال یہ ہے کہ شخصی آزادی پر اس پابندی کی پذیرائی کس طریق پر ہوگی یعنی اول کسانوں کی رائے اس بارے میں کیا ہوگی جو عالم انسانیت کی بہت بڑی اکثریت پر مشتمل ہیں، دوم اس اقلیت کا احساس کا کیا ہوگا جو کسانوں والی زنجیروں

سے آزاد ہو چکی ہے؟ انسانی نسل کے ان دو طبقوں کے درمیان کشمکش بہ ظاہر بڑی تلخ ہوگی اس لیے کہ ہر طبقے کو دوسرے کے خلاف شکایات ہوں گی۔ صنعت کاری کے کارکن اس بات پر خفا ہوں گے کہ کسانوں کی تعداد میں لا محدود اضافے کے لیے غذا مہیا کرنا ان پر لازم قرار دے دیا گیا ہے؛ اس کے برعکس کسان اس بات پر رنجیدہ ہوں گے کہ بچے پیدا کرنے کی طبعی آزادی چھین لی گئی ہے اور عذر یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ بھوک سے بچنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ یہ قربانی کسانوں سے اس وقت طلب کی جائے گی جب ان کے قلاشانہ درجۂ معیشت اور مغربی ممالک یا مغربیت مآب ممالک کے صنعتی کارکنوں کے درجۂ معیشت میں تفاوت اس قدر زیادہ ہو جائے گا جس کی کوئی مثال پہلے نہیں مل سکے گی۔

جب دنیا کی غذائی پیداوار انتہائی حد پر پہنچ جائے گی (بہ شرطیکہ ہماری پیش‌گوئی درست ہو) تو دونوں طبقوں کے درمیان اس خلیج کی تدریجی توسیع ایک ایسا نتیجہ ہوگی جس کی پہلے سے امید تھی اس لیے کہ کسان غذائی پیداوار کے زائد ذخائر کو اپنی تعداد بڑھانے میں صرف کرتے جائیں گے اور صنعت کاری کے کارکن اپنے وسائل کو درجۂ معیشت بلند کرنے میں لگائیں گے۔ اس وقت کسانوں میں لازماً یہ احساس پیدا ہوگا کہ ان سے ایک مقدس انسانی حق چھیننے کی بجائے اس متمول اقلیت سے کیوں نہ کہا جائے کہ اپنی دولت ثروت کی فالتو چیزوں کے بڑے حصے سے دست‌بردار ہو جاؤ جو دائمی اشتعال انگیز ہیں۔ مغربی دنیا کے سلجھے ہوئے چیدہ آدمیوں کو یہ مطالبہ حد درجہ غیر معقول معلوم ہوگا، وہ سوچے گا کہ مغرب کے کسی آدمی یا چیدہ آدمی نے جو خوش حالی اپنی عقلمندی اور دور اندیشی سے حاصل کی، اسے کسانوں کی کوتاہ اندیشانہ نفس پرستی کی قیمت ادا کرنے کے لیے کیوں تعزیراً چھینا جاتا ہے؟ یہ مطالبہ اس وجہ سے اور بھی غیر معقول نظر آئے گا کہ مغرب کے درجات معیشت کی قربانی سے عالم‌گیر قحط کا کابوس ختم نہ ہوگا البتہ ایک خاص وقت کے لیے اسے روکے رکھا جا سکتا ہے اور اس اثنا میں نہایت ترقی یافتہ انسان پھسڈیوں کی سطح پر پہنچ جائیں گے۔

اس قسم کا سخت رد عمل اصل مسئلے کو حل نہ کر سکے گا اور ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کبھی ایسا قحط رونما ہوا جس کے بارے میں ہم نے

پیش گوئی کی ہے تو مغربیوں کا عام رد عمل ان غیر ہمدردانہ خطوط کے مطابق نہ ہوگا؛ وہ لوگ روشن خیالی سے خود اپنے مفاد پر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کریں گے، دوسروں کی تکلیفوں کو کم کرنے کا انسانی جذبہ اُن میں بیدار ہوگا، اخلاقی واجبات کی حس ان میں تازہ ہو جائے گی جو اس مسیحیت کی روحانی میراث ہوگی جسے بہ طور ادعا نظر انداز کر دیا گیا —— مختلف محرکات کا اجتماع جس کی بنا پر ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک میں درجات معیشت بلند کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں —— یہ سب چیزیں مغربیوں کو اس امر پر آمادہ کریں گی کہ وہ کاہن یا لاوی کے بجائے نیک دل سامری کا کردار اختیار کرلیں۔

جب یہ تنازع شروع ہوگا تو اغلب یہ ہے کہ اقتصادی اور سیاسی سطح کے بجائے مذہب کی سطح پر پہنچ جائے گا۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں: اول کسانوں کا اس امر پر اصرار کہ وہ اپنے غذائی وسائل کی آخری حد تک بچے پیدا کرتے جائیں گے، ایک مذہبی سبب کا مجلسی اثر ہے جس میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی جب تک کسانوں کا مذہبی چلن اور نقطۂ نگاہ بدل نہ جائے۔ جس مذہبی نقطۂ نگاہ نے کسانوں کو بچے پیدا کرنے میں ہر دلیل و مصلحت کے مخالف بنا دیا، وہ ابتدا میں یقیناً غیر معقول نہ ہوگا اس لیے کہ وہ لوگ ابتدائی دور کے معاشرے سے باہر نکلے تھے جس میں کنبہ مجلسیت کا سازگار ترین مرکز اور زرعی پیداوار کا اقتصادی یونٹ تھا؛ اب مشینی صنعت و حرفت نے اس مجلسی اور اقتصادی ماحول کو ختم کر دیا ہے جس میں عائلی بارآوری کی پرستاری اقتصادی اور مجلسی اعتبار سے معقول نظر آتی تھی لیکن اس عقیدے پر جمے رہنا جب اس کے کوئی معنی ہی نہیں، اس امر کا نتیجہ ہے کہ عقل اور ارادے کی سطح کے مقابلے میں تحت الشعور کی سطح پر نفس کی رفتار بہت سست رہی۔

جب تک کسانوں کی روحوں میں کوئی مذہبی انقلاب بپا نہ ہوگا، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت تک دنیا کے مالتھوسی مسئلے یعنی کثرت آبادی کا حل کیوں کر پیدا ہوگا لیکن اگر عالم انسانیت ایک ہیبت ناک حادثے سے بچتا ہوا خوش گوار انجام پر پہنچنا چاہتا ہے تو تنہا کسانوں ہی کی اکثریت نہیں جس کے لیے دل کی تبدیلی ضروری ہے۔ پس اگر یہ درست ہے کہ انسان

صرف روٹی کی بنا پر زندہ نہیں رہتا تو خوش حال مغربی اقلیت کو چاہیے کہ کسانوں کی خصوصیات میں غیر دنیوی جزو سے کوئی سبق حاصل کرے۔

مغربیوں نے مادی خوش حالی کو بڑھانے کی حد درجہ کام یاب کوششوں پر توجہ جمائے رکھی، اس طرح وہ روح کو گم کر دینے کے خطرے میں مبتلا ہو گئے۔ اگر وہ لوگ نجات کے طلب گار ہیں تو انھیں چاہیے کہ اپنے مادی کارناموں کے ثمرات میں عالم انسانیت کی اس بڑی اکثریت کو بھی شریک کرے جو مادی اعتبار سے اتنی کام یاب نہ ہو سکی۔ ضبط تولید کے لاادری مہندس کو نفس پرست اور اوہام پرست کسان سے بھی بہت کچھ سیکھنا ہے جس طرح کہ کسان کو مہندس سے سیکھنا ہے۔ رہا یہ سوال کہ دونوں فریقوں کے دماغوں میں فہم و بصیرت کی روشنی پیدا کرنے اور ان کے درمیان مفاہمت کرا دینے کے سلسلے میں اعلیٰ مذاہب کے لیے کیا کردار مقدر ہے تو اس کا جواب ابھی نہیں دیا جا سکتا۔

۵۔ کیا بعد ازاں ہمیشہ خوشی کی زندگی بسر ہو گی؟

اگر ہم کسی ایسے عالم‌گیر معاشرے کا تصور کر سکیں جس میں انسانیت جنگ اور طبقاتی کشمکش کو بالکل ختم کر دے گی اور آبادی کا مسئلہ حل کر لیا جائے گا تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مشینوں سے کام لینے والے معاشرے کی زندگی میں انسانوں کے لیے فرصت و اطمینان کا موقع مل جائے گا۔

اطمینان تاریخ میں انتہائی اہمیت کا کردار ادا کر چکا ہے، اگر ضرورت ایجاد کی ماں تھی تو اطمینان اس کا مربی رہا۔ تہذیب کا ممتاز پہلو یہ ہے کہ زندگی کے نئے طریقوں کے ممکنات میں نشو و ارتقا کس تیزرفتاری سے ہوا، تہذیب کو یہ ایک چھوٹی سی اقلیت سے ملا ——— مخصوص حقوق کی مالک جماعت کے چند مقاصد دوست آدمیوں کی طرف سے جو اطمینان سے مستفید ہو رہے تھے؛ انسان نے فنون اور سائنس کے دائروں میں جو عظیم‌الشان کارنامے انجام دیے، وہ اس خلاق اقلیت کے اوقات فرصت و اطمینان کو مفید مشاغل میں لگا دینے کا ثمرہ تھے البتہ صنعتی انقلاب نے مختلف طریقوں پر فرصت و اطمینان اور زندگی کے سابقہ تعلقات کو درہم برہم کر ڈالا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم تغیر نفسیاتی سطح پر ہوا، مشینوں کے

جاری ہو جانے سے صنعتی کارکن کے دل میں اپنے کام اور احساسات فرصت کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ کسانوں کی اکثریت یا خاص حقوق کی مالک اقلیت کو صنعتی انقلاب سے پیش‌تر ایسی کسی صورت حالات سے سابقہ نہ پڑا تھا، زرعی معاشرے میں موسموں کے تداول کی بنا پر کام ہوتا تھا، اس کی بنا پر کام اور فرصت کے اوقات مقرر ہوتے تھے، فرصت یافتہ اقلیت اپنا وقت مقدمات کا فیصلہ کرنے یا جنگ کے لیے نکلنے یا پارلیمنٹ میں بیٹھنے یا شکار کھیلنے اور مچھلیاں پکڑنے میں صرف کرتی تھی، کسان اور ان کے حکم‌راں دونوں کام بھی کرتے تھے، فرصت سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے؛ گویا ان کے لیے رات اور دن، سرما اور گرما کی صورت میں ''ین'' (حالت سکون) اور ''ینگ'' (حالت حرکت) کا تبادل جاری رہتا تھا، ہر دور پہلے دور کی تلافی کا کام دیتا تھا لیکن صنعتی انقلاب سے پیش‌تر کا یہ ایک دوسرے پر انحصار، کام اور فرصت میں مساوات کا سلسلہ اس وقت بگڑ گیا جب کارکن کی ہیئت بدلی اور وہ مشین کا ایک جزو بن گیا جو رات دن مسلسل کام میں لگی رہتی۔ کارکن جس مزمن صنعتی جنگ کے آغاز پر مجبور ہوا، یہ تھی کہ مشینوں اور ان کے مالکوں کو روکے تاکہ وہ خود اسے تباہ نہ کر ڈالیں؛ اس جنگ نے اس کے دل پر محنت و مشقت کی زندگی کے خلاف دشمنی اور عداوت کی چھاپ لگا دی، کسان اور اس کے آبا و اجداد محنت و مشقت کے عادی چلے آتے تھے۔ کام اور محنت کے متعلق اس نئی روش نے فرصت کے متعلق بھی نئی روش کو جنم دیا؛ سمجھا یہ گیا کہ اگر کام اور محنت و مشقت میں داخلی برائی کا کوئی پہلو ہے تو فرصت کو لازماً مطلق نیکی اور خیر ہونا چاہیے۔

کارخانوں اور دفتروں کے روزانہ کاروبار کے خلاف فطرت انسانی کا رد عمل بیسویں صدی کے وسط تک بہت آگے جا چکا تھا اور کام کے بے پناہ دباؤ سے آزادی کی قیمت اس مالی معاوضے سے زیادہ سمجھی جاتی تھی جو کارکن مسلسل کام کرکے حاصل کرتا؛ ساتھ ہی مشینی صنعت کاری کی بے روک ٹوک ترقی اپنے انسانی شکاروں سے ایک جھوٹا عملی مذاق کر رہی تھی، جب وہ ان سے کام لے کر موت کے کنارے نہ پہنچا رہی تھی تو ان کے لیے بے روزگاری کا خطرہ پیدا کر رہی تھی۔ اس طرح ٹریڈ یونین کی تحدیدی سرگرمیاں کارکن کے اس مزید مقصد کی حمایت کے لیے وقف ہو گئیں

کہ روزگار کا جو موقع باقی ہے اس سے بھی فائدہ اٹھا لیا جائے ۔ بہ ظاہر یہ موقع انسان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا[1] اور ٹریڈ یونین ایک منظم ذلائتی کی شکل میں وضع ہوئی تھی تاکہ مشینوں کی قاتل تیز رفتاری میں رکاوٹ ڈالے اور پابندی لگائے ؛ بہ ہر حال ایسا ارضی بہشت دوبارہ حاصل کر لینا ممکن نظر نہ آتا تھا جس میں سب کے لیے روزگار کا پورا بندوبست ہو ، ساتھ ہی کام اتنا تھوڑا دیا جائے جو ان کے ایک مختصر سے حصے میں پورا ہو جائے ، باقی وقت کارکن اسی طرح گزار دے جس طرح کاہل دولت مند طبقہ گزارتا تھا اور کارکن کے آباواجداد کو اس طبقے کے طور طریقے ناپسند کرنے کی تعلیم دی گئی تھی ۔ ایسے حالات میں اوقات فرصت سے استفادے کا مسئلہ یقیناً پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو جانا چاہیے تھا ۔

اس متوقع عالم گیر فرصت کو انسانیت کیوں کر استعمال کرے گی ؟ یہ سوال خاص اضطراب انگیز ہے اور یہ سر ایلفرڈ یوئنگ[2] نے برٹش ایسوسی ایشن کے خطبۂ صدارت میں اٹھایا تھا جو ۳۱ اگست ، ۱۹۳۲ء کو دیا گیا تھا :

> بعض لوگ دور افتادہ مستقبل میں کسی ایسے یوٹوپیا کا تصور کر سکتے ہیں جس میں محنت اور ثمرات محنت کے درمیان کامل مناسبت پیدا ہو جائے گی ، روزگار خاصا ہوگا ، تنخواہیں خاصی ہوں گی ، مشینیں جو کچھ چیزیں تیار کرتی ہیں ، وہ دور دور تک پہنچیں گی ۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ سوال باقی رہے گا کہ انسان اپنی اس فرصت کو کیوں کر استعمال کریں گے جب وہ اپنے کام کا تقریباً پورا بوجھ اپنے ان تھک میکانیکی غلام کے حوالے کر دیں گے ؟ کیا ہم اس روحانی فلاح کی امید رکھ سکتے ہیں جس کی بنا پر انسان اس فرصت کو بہتر طریق پر استعمال کرنے کا

۱۔ یہ خیال سیموئیل بٹلر نے اپنی کتاب ''ارھون'' (Erewhon) میں تفصیل سے پیش کیا تھا کہ مشینیں اتنی ترقی کر سکتی ہیں جس کے بعد انسانی امداد کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے ۔

۲۔ Alfred Ewing ۔

اهل بن جائے گا؟ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کے لیے جد و جہد کی توفیق دے اور منزل مقصود پر پہنچائے۔ تلاش ہی کو ہر مقصد ملتا ہے؛ میرے خیال میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ انسان کی قسمت میں محض گوشت پوست کا ڈھانچہ بن جانا ہے اور وہ اس جوہر کے نشو و ارتقا کو ختم کر دے گا جو خدا کے عطا کردہ جوہروں میں سے بہترین ہے ——— مہندس کی تخلیقی ہنر مندی۔

رومی سلطنت نے انسانی بقا کے لیے بڑی سہولتیں پیدا کی تھیں لیکن وہ اس مستقبل سے بہت پیچھے رہ گئی تھی جو اب ہمارے سامنے ہے۔ تاہم ایک مصنف نے جو رومی سلطنت کے دور عروج میں تھا، لکھا کہ یونانی دنیا کی ہمہ گیر سلطنت کے قیام سے جو سہولت اور آسائش پیدا ہوئی، اس میں انسانی جوہروں کی چمک ماند پڑ گئی:

روحانی زندگی کے سرطانوں میں سے جو موجودہ نسل کی روحوں کے اندر پیدا ہوئے، ایک یہ ہے کہ وہ روحانی کشمکش بہت پست ہو گئی جس میں عام لوگ اپنے دن گزار رہے ہیں، صرف چند اس سے مستثنٰی ہیں۔ کام اور تفریح میں ہمارا مقصد ہردلعزیزی اور عیش جوئی کے سوا کچھ نہیں، ہم حقیقی روحانی خزانے کے حصول کے لیے اپنے اندر کوئی جذبہ محسوس نہیں کرتے؛ یہ اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے کہ انسان کا دل اس کے کام میں لگا ہو اور اس کا اعتراف کیا جائے، یہ اعتراف یقیناً از خود حصول ہے۔

یونانی دنیا کے نقاد کے ان اقوال کی تصدیق دور جدید کی مغربی تاریخ کے آغاز پر دور جدید کی سائنٹفک روح کے ایک علم دار نے کی۔ مندرجہ ذیل اقتباس ”ترقی علم“ سے لیا گیا ہے جو فرانسس بیکن نے ۱۶۰۵ء میں شائع کی تھی:

یہ خوب بات کہی گئی ہے کہ جب فضائل اخلاق دور ارتقا میں ہوں تو جو فنون رواج پاتے ہیں، وہ عسکری ہوتے ہیں؛ جب فضائل اخلاق ایک جگہ ٹھہرے ہوئے ہوں

تو آزاد خیالی کو فروغ ہوتا ہے اور جب فضائل اخلاق پر انحطاط طاری ہو، نفس پرستی ترقی کرتی ہے ۔ مجھے شبہ ہے کہ اس وقت دنیا پہیے کے نیچے آنے والے حصے میں ہے، فنون میں نفس پرستی غالب ہے اور عمل میں خوش طبعی و تمسخر؛ حواس کو فریب دینا حواس کی شادمانیوں میں سے ہے ۔

عمل میں خوش طبعی اور تمسخر اچھا جملہ ہے جو ریڈیو اور ٹیلی‌وبژن کے عہد میں اوقات فرصت صرف کرنے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے ۔ کارکن اور مزدور طبقے کو اٹھا کر درمیانہ طبقے کے مادی معیاروں پر پہنچا دینے کے ساتھ ساتھ درمیانہ طبقے کے بڑے حصے کو روحانی سطح کا پرولتار بنا دینے کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا ۔

سرس[1] کی دعوت میں جو مہمان شریک ہوئے تھے، وہ بہت جلد اس باڑے میں بند ہوگئے جو سرس نے سؤروں کے لیے بنا رکھا تھا ۔ سوال یہ تھا کہ آیا وہ لا متناہی مدت کے لیے وہیں بند رہیں گے ؟ کیا نسل انسانی کے لیے مناسب ہے کہ اپنے آپ کو اس تقدیر کے حوالے کر دے ؟ کیا نسل انسانی اس اعلیٰ نئی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوش رہنے پر واقعی قناعت کرلے گی جہاں بے کیف فرصت کی یک سانی اور عدم تنوع میں اگر کوئی تبدیلی ہوگی تو صرف یہ کہ اس کی جگہ میکانیکی کام کی یک سانی لے لے گی ؟ یقیناً اس قسم کی پیش گوئی میں اس خلاق اقلیت کو پیش نظر نہیں رکھا گیا جو تاریخ کے ہر دور میں زمین کا نمک رہی ہے[2]۔ یونانیت کی تاریخ کے آخری دور کی کتاب کے مصنف نے جو حوصلہ فرسا تشخیص کی تھی، اس میں وہ ایک اہم عنصر تو نظر انداز کر گیا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھا،

۱- Circe - یونانی افسانوں کی ایک ساحرہ جس نے پولی سس کے ساتھیوں کی شکل بدل کر انہیں سؤر بنا دیا تھا لیکن خود پولی سس ایک خاص بوٹی کا شربت پی چکنے کے باعث اس کے سحر سے محفوظ رہا اور اسی نے اپنے ساتھیوں کو از سر نو انسان بنایا (مترجم) ۔

۲- زمین کے نمک والا جملہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک وعظ میں استعمال کیا تھا (ملاحظہ ہو، متی کہ انجیل باب ۵، آیت ۱۳) (مترجم) ۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسیحی شہدا سے بالکل بے خبر تھا۔

ممکن ہے کہا جائے —— اور یہ حقیقت ہے —— کہ مشینی صنعت کاری میں بے روزگاری سے پنت کست[1] کے نئے یوم کی آمد تک بہت فاصلہ ہے؛ خوانندہ کتاب کے دل میں متشکک کے سوال کی رغبت پیدا ہو سکتی ہے یعنی یہ سب کچھ کیوں کر ہوگا؟ بیسویں صدی مسیحی کے وسط میں یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ سب کچھ کیوں کر ہوگا لیکن کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے تاکہ یہ امید محض خوش خیالی اور خوش فکری نہ سمجھی جائے۔

زندگی جن تدبیروں سے کام لے کر اپنی بقا کا انتظام کرتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شعبے میں قوت کی کمی یا زیادتی کی تلافی وہ دوسرے شعبے میں اسی طرح کی کمی یا زیادتی سے کر لیتی ہے لہٰذا ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ جس اجتماعی ماحول میں اقتصادی اور سیاسی سطح پر آزادی کی کمی اور اقتدار کی زیادتی ہے، اس میں مذکورہ بالا قدرتی قانون کا اثر یہ ہوگا کہ آزادی کو تحریک ملے گی اور مذہب کے دائرے میں اقتدار کا جبر ڈھیلا پڑ جائے گا، لاریب روسی سلطنت کے دور میں واقعات کی رفتار یہی تھی۔

یونانی دنیا کی اس داستان سے ہمیں ایک سبق یہ ملتا ہے کہ زندگی میں نفسیاتی قوت کی ایک اقل مقدار ایسی بھی ہے جس میں مزید تخفیف ممکن نہیں، وہ کسی نہ کسی ذریعے اور واسطے سے نکلنے کی کوشش جاری رکھے گی؛ یہ بھی درست ہے کہ نفسیاتی قوت کی مقدار کا ایک انتہائی درجہ بھی ہے جو زندگی کے زیر فرمان رہتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی عملی سرگرمی میں زیادہ زور پیدا کرنے کے لیے مزید قوت درکار ہو تو وہ دوسرے دائروں میں قوت کی کفایت شعاری سے حاصل کی جائے گی۔ مشینیں قوت کی کفایت شعاری کے سلسلے میں زندگی کی تدبیریں ہیں مثلاً دل میں دھڑکن پیدا کی،

۱- Pentecost - یہودیوں میں یہ ایک جشن تھا جس کا ذکر جا بجا آیا ہے مثلاً رسولوں کے اعمال (باب ۲ آیت ۱ اور باب ۲۰ آیت ۱۶) کتاب خروج، گنتی وغیرہ میں بھی اس کی طرف اشارے ہیں۔ رسولوں کے اعمال میں اسے عید قرار دیا گیا ہے، اس کا طریقہ یہ تھا کہ نئی فصل آتی تو دو برے ذبح کرتے، دو روٹیاں پکاتے اور فصل کے شکرانے میں خدا کی نذر کر دیتے۔

پھیپھڑوں کو خود بخود سکڑنے اور پھیلنے پر لگا دیا؛ اس طرح زندگی نے دل اور ارادے کو دوسرے کاموں کے لیے آزاد کر دیا ورنہ وہ مسلسل اور لمحہ بہ لمحہ جسمانی زندگی ہی کے بچاؤ کی فکر میں لگے رہتے۔ اگر خیال اور ارادہ ایک ایک سانس اور دل کی ایک ایک ضرب ہی کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تو انسان کے لیے ذہنی اور ارادی سرگرمیوں کے لیے کون سی گنجائش باقی رہتی؟ وہ تو محض زندہ رہنے کی کوشش میں پورا وقت گزار دیتا یا اس حقیقت کو زیادہ واضح انداز میں پیش کرنے کے لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ کوئی تحت البشر وجود انسان نہ بن سکتا۔ انسانی جسم میں قوت کی کفایت شعاری کے تخلیقی اثر کی مثال سامنے رکھتے ہوئے ہم کہ سکتے ہیں کہ جب تک توجہ اقتصادیات پر مرتکز رہے گی (جیسا کہ مغرب میں صنعتی انقلاب کے آغاز سے ہوا) یا سیاسیات کو سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے گا (جیسا کہ مغرب میں یونانی وضع کی حکومت کے مغربی احیاء سے ہوا) اس وقت معاشرے کا شکم مذہب کی غذا سے خالی رہے گا۔ اس کے برعکس ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مغربی معاشرے کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اقتدار کا جو دور دورہ اب نظر آ رہا ہے، اس سے روحیں اپنے اصلی اور حقیقی نصب العین کو پورا کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں گی؛ وہ نصب العین یہ ہے کہ خدا کی عظمت و برتری کا اقرار کریں اور اس کے فضل و رحمت سے روحوں کے لیے شادکامی کا سامان بہم پہنچائیں۔

یہ خوش گوار تر منظر کم از کم دائرۂ امکان میں نظر آتا ہے، شاید مغربی مردوں اور عورتوں کی مایوس نسل کو اس سے نور رحمت کی کوئی کرن میسر آ جائے۔

تیرھواں حصہ

خاتمۂ سخن

چوالیسواں باب

کتاب کیوں کر تصنیف ہوئی؟

سوال یہ ہے کہ لوگ تاریخ کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟ راقم‌الحروف کا ذاتی جواب یہ ہے کہ مؤرخ کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح جنھیں زندگی میں کسی نہ کسی نصب‌العین کی شادمانی حاصل ہے، ایک پیشہ میسر آگیا اور اسے خدا کی طرف سے دعوت مل گئی کہ "اسے محسوس کرے اور اس کی تلاش میں رہے"۔ بے شمار نقطہ ہائے نگاہ میں سے مؤرخ کا ایک نقطۂ نگاہ ہے، اس کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ ہمیں خدا کی تخلیقی قوت کا منظر دکھائے؛ یہ تخلیقی قوت ایک ایسے ڈھانچے میں سرگرم عمل ہے جو ہمارے انسانی تجربے کے مطابق شش ابعادی ہے۔ تاریخی نقطۂ نگاہ ہمیں بتاتا ہے کہ مادی کائنات زمان و مکان چار ابعادی ڈھانچے میں مرکز گریز حرکت کر رہی ہے، یہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی روئے زمین پر زمان و مکان اور زندگی کے پنج ابعادی ڈھانچے میں ارتقائی حرکت کر رہی ہے؛ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی روحیں ایک خاص روحانی تحفے کی بنا پر چھٹی بعد اختیار کر لیتی ہیں اور وہ اپنی روحانی آزادی کی تقدیر ساز جد و جہد میں سے گزرتی ہوئی یا تو اپنے خالق کی طرف جاتی ہیں یا اس سے گریزاں رہتی ہیں اور دور ہٹتی جاتی ہیں۔

اگر ہماری یہ رائے درست ہے کہ تاریخ میں ہمیں خدا کی تخلیق کا ایک منظر متحرک دکھائی دیتا ہے تو ہمیں یہ دیکھ کر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ جن انسانی قلوب میں تاریخ سے تاثر قبول کرنے کی طبعی صلاحیت بہ طور اوسط یکساں ہے، ان کے تاثر کی حقیقی قوت قبول کرنے والے کے تاریخی حالات کے مطابق ہوتی ہے۔ قبول و پذیرائی کو شوق تجسس

سے تقویت پہنچنی چاہیے؛ شوق تجسس میں صرف اس وقت حرکت پیدا ہوتی ہے جب اجتماعی تغیر کا عمل واضح اور متشددانہ صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ دور قدیم کے کسانوں کے دلوں میں تاریخ کا کوئی شوق نہ تھا اس لیے کہ ان کا مجلسی ماحول ہمیشہ سے تاریخ کے متعلق نہیں بلکہ قدرت کے متعلق بات چیت کرتا تھا، ان کے قومی تہوار کیا تھے؟ ۴ جولائی نہیں، گائی فاکس[1] کا یوم نہیں، یوم متارکہ[2] نہیں بلکہ زرعی سال کے ہر سال آنے والے غیر تاریخی یوم ہائے جشن یا یوم ہائے ماتم[3]۔

جس اقلیت کے مجلسی ماحول میں تاریخ کے متعلق بات چیت ہوتی ہے، وہاں بھی تاریخی و مجلسی گرد و پیش کی روشنی مؤرخ کے دل میں عمل کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتی؛ شوق تجسس کی خلاق تحریک کے بغیر تاریخ کے نہایت متعارف اور موثر کارنامے بھی اپنی بے زبان فصاحت کی نمائش سے کوئی اثر پیدا نہ کر سکیں گے اس لیے کہ ان کی مخاطب وہ آنکھیں ہوں گی جو دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خلاق شعلہ دعوت مقابلہ اور جواب کے بغیر پیدا نہیں ہوتا؛ دور جدید کے مغربی فلسفی اور سیاح وولنے[4] پر یہ حقیقت اس وقت آشکارا ہوئی تھی جب اس نے ۱۷۸۳ء—۱۷۸۵ء میں اسلامی دنیا کی سیاحت کی تھی۔ وولنے اس ملک سے آیا تھا جو محاربات ہینی بال

۱- Guy Fawkes، اس نے ایوان پارلیمنٹ کو بارود سے اڑانے کی سازش ۱۶۰۵ء میں کی تھی مگر سازش کا قبل از وقت انکشاف ہو گیا، گائی فاکس اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا ملی۔ انگلستان میں اس کا یوم اب تک منایا جاتا ہے (مترجم)۔

۲- Armistice Day، پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کا دن یعنی ۱۲ نومبر (مترجم)۔

۳- Red-letter day یوم عید، Black-letter day یوم ماتم (مترجم)

۴- Constantine Volney، ایک فرانسیسی امیر اور اہل قلم، اس نے انقلاب میں حصہ لیا۔ پہلے اس نے نپولین کی نظروں میں اعتبار پیدا کر لیا تھا، پھر مخالف ہو گیا۔ ۱۸۲۰ء میں وفات پائی، اس نے مصر اور شام کی سیاحت کی تھی (مترجم)۔

کے زمانے میں تہذیبوں کی سرگزشتوں کے دھارے میں پہنچا ہوا تھا اور محاربات جن علاقوں کی سیاحت وولنے کر رہا تھا ، وہ گال کے مقابلے میں چار ہزار سال سے بھی پیش تر تاریخی کارناموں کا اکھاڑا بنے ہوئے تھے اور وہاں اسی تناسب سے عہد ماضی کے باقیات موجود تھے ۔ لیکن اٹھارھویں صدی مسیحی کے ربع آخر میں مشرق اوسط کے باشندے معدوم تہذیبوں کے حیرت انگیز باقیات کے درمیان آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور انھیں آثار قدیمہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کا خیال تک نہ تھا حالاں کہ اسی شوق نے وولنے کو فرانس سے مصر کھینچ لیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے فرانس کے اہل علم پہنچ گئے جنھیں پندرہ سال بعد نپولین بونا پارٹ کی مہم[1] نے موقع بہم پہنچایا تھا ۔ نپولین نے امبابہ[2] کے میدان میں جنگ شروع ہونے سے پیش تر اپنے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اہرام کی چوٹیوں سے تاریخ کی چالیس صدیاں تمھیں دیکھ رہی ہیں ؛ اسے علم تھا کہ جس تار پر وہ مضراب لگا رہا ہے ، اس کی لَے سے فوج کے ان پڑھ عوام بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے ، ہمیں یقین ہے کہ مخالف مملوک فوج کے سپہ سالار مراد بے کو اپنے غیر متعجب ساتھیوں کے روبرو ایسا کوئی خطبہ دینے کا خیال تک نہ آیا ۔

جو فرانسیسی اہل علم نپولین کے ساتھ مصر پہنچے ، انھوں نے دور جدید کے مغربی معاشرے کے لیے تاریخ کی ایک نئی بُعد دریافت کر لی اور وہ معاشرہ تسخیر کے تسکین نایاب تعجب کا پیکر بنا ہوا تھا اور اس وقت سے کم از کم گیارہ گم شدہ اور فراموش شدہ تہذیبوں کو از سر نو زندگی کی سطح پر لے آئے یعنی مصری تہذیب ، بابلی تہذیب ، سمیری تہذیب ، منوی تہذیب، ھٹی تہذیب ، ان کے ساتھ وادی سندھ کی ثقافت نیز شنگ ثقافت ،

۱- اشارہ ہے نپولین بونا پارٹ کے حملۂ مصر کی طرف جو ۱۷۹۸ء میں ہوا تھا (مترجم) ۔

۲- Imbabah ، بہ ظاہر یہ جنگ اہرام کی طرف اشارہ ہے ۔ نپولین نے اسی جنگ میں چالیس صدیوں والا خطبہ دیا تھا لیکن مجھے امبابہ نام مقام کا کوئی سراغ نہ مل سکا (مترجم) ۔

ان سب کا تعلق پرانی دنیا سے تھا ؛ نئی دنیا میں مایائی ، یوکاٹائی ، میکسیکی اور آنڈی تہذیبیں۔

جذبہ شوق تجسس کے بغیر کوئی شخص مؤرخ نہیں بن سکتا لیکن یہ چیز بجائے خود کافی نہیں اس لیے کہ اگر شوق تجسس کو صحیح اصول پر نہ چلایا جائے تو یہ ایک بے مقصد علم کل کے تعاقب میں ختم ہو جائے گا ۔ ہر بڑے مؤرخ کے شوق تجسس کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ ان بعض سوالوں کا جواب مہیا کرے جو اس کے عہد اور اس کی معاصر نسل کے لیے عملی اہمیت کے حامل ہیں ؛ ان سوالوں کو عمومی حیثیت میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ فلاں چیز سے فلاں چیز کیوں پیدا ہوئی ؟ اگر ہم بڑے بڑے مؤرخوں کی ذہنی سرگزشتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اکثر کو کوئی اہم اور حد درجہ دہشت انگیز واقعہ دعوت مقابلہ کی شکل اختیار کر کے پیش آیا جس نے تاریخی تشخیص کی شکل اختیار کی اور وہ دعوت مقابلہ کا جواب بن گئی۔ ہو سکتا ہے مؤرخ نے خود یہ واقعہ دیکھا ہو یا اس میں سرگرم حصہ لیا ہو جیسے تھیوسی ڈائڈس[1] نے ایتھنز اور پیلوپونیسیا کی جنگ میں یا کلارینڈن[2] نے انگلستان کی بغاوت کلاں میں ؛ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واقعہ بہت پہلے پیش آچکا ہو مگر اس کے بالواسطہ اثرات و عواقب ایک حساس تاریخی قلب میں جواب کا جذبہ پیدا کر دیں جیسے رومی سلطنت کے زوال و انحطاط کی ذہنی اور جذباتی دعوت مقابلہ نے گبن کے قلب میں جوش و ہیجان پیدا کیا جب وہ بہت سی صدیاں گزر جانے کے بعد کیپی ٹول[3] کے کھنڈروں میں چکر لگا رہا تھا ۔ خلاق محرک ایک اہم واقعہ بھی ہو سکتا ہے جو تسلی اور اطمینان کی علت مہیا

۱- Thucy-dides ، ایتھنز کا مشہور مؤرخ - (مترجم)

۲- ایڈورڈ ہائڈ (Hyde) لارڈ کلارینڈن (Clarendon) ، مشہور انگریز مدبر (۱۶۰۸ء–۱۶۷۴ء) - اس نے جلا وطنی کے زمانے میں بغاوت کلاں کی تاریخ لکھی یعنی اس بغاوت کی جس میں چارلس اول کو موت کی سزا ملی اور کرام ویل کامیاب ہوا (مترجم) -

۳- Capitol ، رومہ میں ایک پہاڑی کا نام کیپی ٹولین (Capitoline)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرتا ہوا نظر آتا ہے ، ہیروڈوٹس[1] نے محاربات ایران سے ذہنی دعوت قبول کی تھی ؛ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بعض بڑے بڑے تاریخی حوادث انسان کی طبعی رجائیت کے لیے دعوت مقابلہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ، مؤرخ کی بہترین کوششوں کی محرک ایسی ہی دعوت ہائے مقابلہ ہوتی ہیں ۔

جو مؤرخ راقم الحروف کی طرح ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۵ء تک زندہ ہے ، وہ مؤرخ کے اس بنیادی اور بسیط سوال پر تغیرات کے طویل گجر بجتے ہوئے سن چکا ہے کہ فلاں چیز سے فلاں چیز کیوں پیدا ہوئی ۔ اس کے لیے سب سے پہلا اور حد درجہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ زندہ ہے اور بیش تر کے دور کی بہ ظاہر معقول امیدیں بہت بری طرح ٹوٹ چکی ہیں ، مغرب کے جمہوری ملکوں میں آزاد درمیانے طبقے کی جو نسل ۱۸۶۰ء کے آس پاس پیدا ہوئی تھی ، اسے انیسویں صدی کے اختتام پر صاف نظر آ رہا تھا کہ مغربی تہذیب کی کام یاب پیش قدمی عالم انسانیت کی ترقیات کو ایسی منزل پر لے گئی ہے جس کے بعد موڑ گھومتے ہی ارضی بہشت کے خواب کی تعبیر مجسم شکل میں سامنے آ جائے گی ، آخر کیا وجہ ہوئی کہ اس نسل کو مایوسی کا شکار ہونا پڑا ؟ خرابی کہاں رو نما ہوئی ؟ کیا سبب ہوا کہ نئی صدی اپنے ساتھ جنگ اور شر انگیزی کی جو افراتفری لائی ، اس نے سیاسی نقشے اس طرح بدل ڈالے کہ اب اسے پہچاننا مشکل ہے ؟ پہلے آٹھ بڑی طاقتوں کی ایک اچھی برادری موجود تھی ، اب صرف دو باقی رہ گئی ہیں اور دونوں مغربی یورپ سے باہر واقع ہیں ؟

ایسے سوالات کی لمبی فہرست تیار کی جا سکتی ہے اور یہ سب ایسے موضوع مہیا کرتے ہیں جن کی تاریخی تحقیقات بھی اتنی ہی لمبی ہونی چاہیے۔ پیشہ وری کے نقطۂ نگاہ سے راقم الحروف خوش نصیب ہے کہ وہ دور مصائب میں پیدا ہوا جو مؤرخ کے لیے بہشت ہے ، معاصر واقعات و حوادث نے جو

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

ہے جس پر جوپیٹر کا مندر بنا ہوا تھا ، یہ شہر کا نہایت اہم حصہ تھا ۔ رومہ میں کیپی ٹول کے کھنڈر اب بھی بڑے ہی پُر تاثیر ہیں ۔ (مترجم)

۱۔ Herodotus ، قدیم زمانے کا مشہور مؤرخ ۔ (مترجم)

تاریخی معمے اچھال کر میرے سامنے پیش کیے تھے ، میں نے ان میں دل چسپی لینی شروع کی لیکن میری خوش نصیبی یہاں پر ختم نہ ہوئی ۔ میں ایسے وقت میں پیدا ہوا تھا کہ یونانیت کی وہ تعلیم غیر ممزوج حالت میں پانے کا مجھے موقع مل گیا جس کا تعلق دور جدید کے مغرب میں احیائے علوم سے ہے ۔ ۱۹۱۱ء کے موسم گرما تک مجھے لاطینی کا مطالعہ کرتے ہوئے پندرہ سال اور یونانی کا مطالعہ کرتے ہوئے گیارہ سال گزر چکے تھے ؛ یہ تعلیم اپنے طالبوں پر ایسا خوش گوار اثر ڈالتی تھی کہ وہ شاونیت[1] اور جارحیت کے مرض سے محفوظ ہو جاتے تھے ۔ یونانیت کے انداز میں تعلیم یافتہ کوئی مغربی فرد کسی ایسی غلطی کا بہ آسانی شکار نہ ہو سکتا تھا کہ مغربی مسیحی دنیا ہی کو بہترین ممکن دنیا سمجھ لیتا ؛ نہ یہ ممکن تھا ، کہ مغرب کا معاصر مجلسی ماحول جو تاریخی سوال اس کے سامنے پیش کر رہا تھا ، اس کا جواب یونان کے دارالاستخارہ سے معلوم کیے بغیر دے دیتا جو اس کا روحانی وطن تھا ۔

مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ میرے آزاد خیال بزرگوں کی امیدوں پر یکا یک جو اوس پڑ گئی ، اسے دیکھتے ہی ممکن نہ تھا کہ مجھے پریکلیز کی ایٹک جمہوریت کے بارے میں افلاطون کی مایوسی یاد نہ آ جاتی ۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میرے سامنے ہوئی ، ممکن نہ تھا کہ وہ مجھے ۴۳۱ ق م کی جنگ یاد نہ دلا دیتی جو تھیوسی ڈائیڈس کے لیے ویسے ہی تجربے کا موجب بنی تھی ۔ مجھ پر جنگ کا تجربہ گزر چکا ہے ، تھیوسی ڈائیڈس کے جو الفاظ و تراکیب پہلے میرے نزدیک چنداں اہم نہ تھے ، ان کی معنویت تجربہ جنگ کے بعد مجھ پر ٹھیک ٹھیک آشکارا ہوئی ؛ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ جو کتاب دو ہزار تین سو سال پیش تر لکھی گئی تھی ، وہ ایسے تجربات کا ذخیرہ ہے جن سے خوانندۂ کتاب کی دنیا میں خوانندۂ کتاب کی نسل کو ابھی سابقہ پڑا ہے ، گویا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کے مطابق ۱۹۱۴ء اور ۴۳۱ ق م کے سنین کو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے معاصر قرار دے سکتے ہیں ۔

آپ دیکھیں گے کہ میرے مجلسی ماحول میں دو عامل ایسے ہیں جنھوں نے مطالعۂ تاریخ تک میرے طریق رسائی پر فیصلہ کن اثر ڈالا حالاں کہ ان

۱- Chauvinism - یہ لفظ جارحانہ وطن پرستی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اسے شاونیت بھی کہتے ہیں ۔

میں سے کوئی بھی میرے لیے ذاتی و شخصی نہیں؛ پہلا عامل مغربی دنیا کی مروجہ تاریخ ہے اور یہ میری دنیا ہے، دوسرا عامل یونانی تعلیم ہے، ان دونوں عاملوں کے درمیان تعامل کا سلسلہ جاری رہا، اس وجہ سے تاریخ کے متعلق میرا نقطۂ نگاہ دو چشمی دوربین بن گیا۔ جب بعض معاصرانہ حوادث نے میرے سامنے بھی مؤرخ کا یہ بنیادی سوال پیش کیا کہ فلاں چیز سے فلاں چیز کیوں کر پیدا ہوئی تو اس سوال نے میرے دل میں یہ صورت اختیار کر لی کہ فلاں چیز مغربی تاریخ میں نیز یونانی تاریخ میں فلاں چیز سے کیوں کر پیدا ہوئی، اس طرح میرا نقطۂ نگاہ یہ ہو گیا کہ تاریخ دو مختلف دوروں کے درمیان مقابلے کا مرقع ہے۔

ممکن ہے تاریخ کے متعلق اس دوگونہ نقطۂ نگاہ کی حقیقی حیثیت کی تحسین مشرق بعید کے معاصرین کر سکیں اور اس کی تائید بھی کریں جن کی روایتی تعلیم میں پیش رو تہذیب کے کلاسیکی ادب اور کلاسیکی زبان نے کچھ کم اہم کردار ادا نہیں کیا۔ راقم الحروف کی طرح فلسفہ کنفوشیئس کے کسی عالم کے لیے بھی ممکن نہیں کہ حال کے کسی واقعے سے اسے سابقہ پڑے اور اس کے دل میں دورگزشتہ کے کسی متوازی واقعے کی یاد تازہ نہ ہو جائے بلکہ اس کے نزدیک قدر و قیمت کے اعتبار سے یہ متوازی واقعہ زیادہ اہم ہوگا اور اس کے لیے زیادہ روشن حقیقت کا مرقع بن جائے گا۔ کنفوشیئس کے رنگ میں رنگا ہوا چینی عالم اور وکٹوریا کے آخری دور کا انگریز معاصر جس نے یونانیت کا رنگ اختیار کیا، یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسانی معاملات کا چینی محقق تو اپنے تاریخی مقابلوں کو صرف دو دوروں تک محدود رکھنے پر قانع ہو جائے گا مگر وکٹوریا کے عہد مؤخر کا انگریز جب دو دوروں کے درمیان مقابلے سے تاریخی واقعات پر غور و خوض شروع کرے گا تو اسے اپنے ثقافتی سرگم کا حلقۂ اثر وسیع کیے بغیر چارہ نظر نہ آئے گا۔

جو چینی طالب انیسویں صدی مسیحی کے اختتام پر روایتی کلاسیکی تعلیم پا چکا تھا، اس کے نزدیک یہ بات واقعی انوکھی ہوتی کہ چین یا مشرق بعید میں اس کی جانشین تہذیب کے سوا بھی کوئی تہذیب سنجیدہ غور و فکر کی مستحق تھی لیکن اس نسل کے مغربی عالم سے ایسے اندھیارے پن کا ظہور ممکن نہ تھا، اس وجہ سے ممکن نہ تھا کہ پیش تر کے چار سو سال کے اندر اندر مغربی معاشرہ ——— جس سے خود اس کا

تعلق تھا ــــــــ نئی اور پرانی دنیا میں اپنی نوعیت کے کم از کم آٹھ نمائندوں سے تعلق پیدا کر چکا تھا ۔ اس وقت سے یہ معاملہ مغربیوں کے لیے اپنی تہذیب اور یونانی تہذیب کے سوا دوسری تہذیبوں کے وجود یا ان کی اہمیت کو نظر انداز کرنا بدیں وجہ اور بھی غیر ممکن ہوگیا تھا کہ گزشتہ صدی کے اندر یہ تسکین نا آشنا مغربی محقق ــــــــ جنھوں نے کولمبس اور ڈی گاما کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس سمندر کو مسخر کر لیا تھا جس کے سینے پر پہلے کسی کے جہاز نہ چلے تھے ــــــــ ان تہذیبوں کو زمین کھود کر نکال چکے تھے جو پہلے دفن ہو چکی تھیں ۔ ایک ایسے دور میں جس کا تاریخی افق اتنا وسیع ہو چکا تھا ، ایک مغربی مؤرخ جو اپنی یونانی تعلیم کی روشنی میں دو دوروں کے مقابلے سے تاریخی چھان بین کا آغاز کرتا ، اس وقت تک کبھی قانع نہ ہوتا جب تک تقابلی مطالعے کے لیے معاشرے کی اس نوع کے زیادہ سے زیادہ نمونے جمع نہ کر لیتا ، یونانی اور مغربی معاشرے اس نوع کے صرف دو نمائندے تھے ۔

اس طرح مقابلے کے دائرے میں دوگونہ سے زیادہ اضافہ ہو جانا یقینی تھا ، پھر وہ اس اہم سوال کو کیوں کر نظر انداز کر سکتا تھا جو دو دوروں کے درمیان ابتدائی مقابلے سے سامنے آیا تھا ؟ یونانی تہذیب کی سرگزشت میں سب سے بڑھ کر اہم واحد واقعہ یہ تھا کہ ۴۳۱ ق ۔ م میں ایتھنز اور پیلوپونیسا کے درمیان جنگ عظیم شروع ہونے سے اس دور کا آغاز ہوا جس نے انجام کار انحلال کی شکل اختیار کی ۔ اگر یونانی اور مغربی تاریخ میں اس تقابلی طریق عمل کے لیے کوئی وجہ جواز موجود ہے جو راقم الحروف نے اختیار کیا تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مغربی معاشرہ بھی ویسی تقدیر کے امکان سے بہرحال محفوظ نہیں اور جب راقم الحروف اپنے وسیع مطالعے کے درمیان میں اس حقیقت پر پہنچا کہ تہذیبوں کی جمعیتوں میں سے اکثریت مر چکی ہے تو یہی نتیجہ نکال سکتا تھا کہ ہر تہذیب موت کے امکان سے دو چار ہے اور اس سے خود اس کی تہذیب مستثنیٰ نہیں ۔

سوال یہ ہے کہ موت کا وہ کون سا دروازہ ہے جس سے گزر کر وہ تمام تہذیبیں ناپید ہوئیں جو ایک وقت میں فروغ پذیر تھیں ؟ اس سوال نے راقم الحروف کو تہذیبوں کی شکست اور انحلال کے مطالعے پر متوجہ کیا ،

پھر اسے دوسرے پہلو کا جائزہ لینے کی غرض سے تہذیبوں کی تکوین اور نشو و ارتقا کی چھان بین کرنی پڑی ؛ اس طرح یہ کتاب جس نے مطالعہ تاریخ کا نام پایا ، معرض نگارش و تحریر میں آئی -

خلاصهٔ مطالب

پہلا حصہ

تمہید

۱۔ تاریخی مطالعے کی اکائی

تاریخی مطالعے کا قابل فہم یونٹ (اکائی) نہ قومیں ہیں اور نہ دور بلکہ معاشرے ہیں۔ انگریزی تاریخ کا دور بہ دور جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود قابل فہم نہیں اور اسے بڑے کل کا ایک حصہ، ایک جزو سمجھنا چاہیے۔ کل کے کئی اجزا ہیں (مثلاً انگلستان، فرانس، نیدرلینڈز یعنی ہالینڈ و بلجیئم) جنھیں یکساں محرکات یا دعوت ہائے مقابلہ پیش آئیں لیکن ہر جزو کا ردعمل یا جواب مختلف تھا۔ اس کی توضیح کے لیے یونانی تاریخ سے ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ جس ''کل'' یا معاشرے سے انگلستان متعلق ہے، وہ مغربی مسیحی دنیا ہے۔ مختلف اوقات و آوان میں اس کے مکانی توسیع کا جائزہ لیا گیا ہے، نیز زمانی لحاظ سے اس کے مآخذ پر نظر ڈالی گئی ہے؛ معلوم ہوا کہ اس معاشرے کی عمر اجزائے ترکیبی سے زیادہ ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔ اس کے اوائل کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے ایک اور معاشرہ موجود تھا جو اب مر چکا ہے یعنی یونان و رومہ کا معاشرہ یا ''یونانی معاشرہ'' جس کے ساتھ ہمارے معاشرے کو رشتۂ ابنیت حاصل ہے۔ نیز ظاہر ہے کہ اور بھی زندہ معاشرے موجود ہیں ——— آرتھوڈکس مسیحی معاشرہ، اسلامی معاشرہ، ہندو معاشرہ اور مشرق بعید کے معاشرے ——— بعض غیر مشخص معاشروں کی متحجر باقیات ہیں جن کی اصل کے باب میں اس مرحلے پر تعین نہیں ہو سکا مثلاً یہودی اور پارسی۔

۲۔ تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ تمام معاشروں یا تہذیبوں کی تشخیص و تعریف کی جائے، نیز ان کے نام بتائے جائیں، بعض ابتدائی دور کے معاشرے بھی ہیں جنھیں ''غیر مہذب'' معاشرے سمجھنا چاہیے۔ تحقیق اور چھان بین کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ جو تہذیبیں مشخص ہو چکیں، ان کے ماخذ کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ آیا ہمیں ایسی تہذیبیں بھی مل سکتی ہیں اور اب معدوم ہو چکی ہیں اور ان سے موجودہ تہذیبوں کو ویسا ہی رشتۂ ابنیت حاصل ہے جیسا ہماری معلومات کے مطابق مغربی تہذیب کو یونانی تہذیب سے حاصل ہے؟ اس تعلق کی علامتیں یہ ہیں: (الف) ایک ہمہ گیر سلطنت (مثلاً رومی سلطنت) جو خود دور مصائب کی پیداوار ہو، اس کے بعد (ب) عبوری دور آئے جس میں (ج) ہمہ گیر مذہبی نظام اور (د) عہد شجاعت یا سورماؤں کے زمانے میں بربریوں کی مہاجرت پیش آئی ہے، مذہبی نظام اور مہاجرت علی الترتیب دم توڑتی ہوئی تہذیب کے داخلی اور خارجی پرولتار کی پیداوار ہیں۔ ان کلیدی نکتوں سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے:

آرتھوڈکس مسیحی معاشرہ، خود ہمارے مغربی معاشرے کی طرح یونانی معاشرے سے رشتۂ ابنیت رکھتا ہے۔

اسلامی معاشرے کے ماخذ کا سراغ لگایا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو معاشروں کے امتزاج سے پیدا ہوا جو اصل میں بالکل جدا جدا تھے یعنی ایرانی اور عربی معاشرہ۔ ان کے ماخذ کی چھان بین کرتے ہوئے ہم یونانی مداخلت کی ایک ہزار سالہ مدت سے آگے چلے جائیں تو ہم ایک معدوم معاشرے پر پہنچ جاتے ہیں جسے سریانی معاشرے کا نام دے دیا گیا۔

ہندو معاشرے کے عقب میں ہمیں ہندی معاشرہ ملتا ہے۔

مشرق بعید کے معاشرے کے عقب میں چینی معاشرہ ہے۔

جن معدوم معاشروں کی تشخیص ہو چکی ہے، متحجر آثار انھیں میں سے کسی ایک کی باقیات ہیں۔

یونانی معاشرے کے عقب میں ہمیں منوی معاشرہ ملتا ہے، ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ نسبت ابنیت رکھنے والے دوسرے مشخص معاشروں کے برعکس یونانی معاشرے نے اپنے پیش رو کے داخلی پرولتار کا دریافت کردہ مذہب

قبول نہ کیا لٰہذا اسے سابقہ معاشرے سے حقیقی معنوں میں رشتۂ ابنیت کا حامل نہیں سمجھا جا سکا۔

چینی معاشرے کے عقب میں شنگ ثقافت ملتی ہے۔

ہندی معاشروں کے عقب میں دریائے سندھ کی ثقافت ہے جسے معاصر سمیری معاشرے سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ سمیری معاشرے سے دو معاشرے پیدا ہوئے، ایک ہٹی، دوسرا بابلی۔

مصری معاشرے کا نہ کوئی سلف تھا اور نہ خلف گویا نہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس سے پیدا ہوا۔

نئی دنیا میں ہم چار معاشروں کا سراغ لگا سکتے ہیں: آنڈی، یوکاٹانی، میکسیکی اور مایانی۔

اس طرح ہمارے پاس "تہذیبوں" کے کل اکیس نمونے جمع ہو گئے، اگر ہم آرتھوڈکس مسیحی معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں ——— آرتھوڈکس بیزنطینی (اناطولیہ اور بلقان میں)، آرتھوڈکس روسی ——— اسی طرح مشرق بعید کے معاشرے کو دو حصوں میں بانٹ لیں ——— چینی اور جاپانی و کوریائی ——— تو تعداد تیئس پر پہنچ جاتی ہے۔

۳۔ معاشروں کی صلاحیت تقابل

۱۔ تہذیبیں اور قدیم معاشرے: تہذیبوں میں ایک قدر مشترک ہے یعنی وہ قدیم معاشروں سے بالکل الگ اور جداگانہ صنف اور گروہ ہیں۔ قدیم معاشرے تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن ان کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے۔

۲۔ وحدت تہذیب کا غلط تصور: اس غلط خیال کا جائزہ لیا گیا ہے کہ تہذیب صرف ایک ہے یعنی ہماری تہذیب اور اسے رد کیا گیا ہے، اس نظریۂ انتشار کو بھی رد کیا گیا ہے کہ تمام تہذیبوں کا ماخذ مصر ہے۔

۳۔ تہذیبوں کی صلاحیت تقابل کا مسئلہ: اضافی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو تاریخ انسانیت میں تہذیبوں کی نمود بہت قریب زمانے کا واقعہ ہے، قدیم ترین تہذیب کے آغاز کی عمر بھی چھ ہزار سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی، انہیں فلسفیانہ لحاظ سے ایک نوع کے معاصر افراد قرار دے کر زیر بحث لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس ادھوری سچائی کا پردہ فاش کیا گیا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہراتی، مجوزہ طریق بحث کے خلاف اس اعتراض

کو معقول نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

۴۔ تاریخ، سائنس اور افسانہ: اپنے فکر کے مقاصد کو جن میں زندگی کے کوائف بھی شامل ہیں، زیر غور لانے اور پیش کرنے کے یہی تین طریقے ہیں، ان تینوں کے درمیان اختلافات کا جائزہ لیا گیا ہے، نیز تاریخی موضوع کی پیش کش کے سلسلے میں سائنس اور افسانے کے فوائد پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرا حصہ

تہذیبوں کی تکوین

۴۔ مسئلہ اور اسے حل نہ کرنے کی ترکیب

۱۔ صورت مسئلہ: ہمارے تیئس مہذب معاشروں میں سے سولہ سابقہ تہذیبوں سے ملحق ہیں اور چھ قدیم زندگی سے براہ راست ابھرے۔ جو قدیم معاشرے اب تک باقی ہیں، وہ حالت سکون میں ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ابتدا میں وہ بھی پورے زور اور قوت سے ترقی کر رہے ہوں گے۔ مجلسی اور اجتماعی زندگی خود حیات انسانی سے بھی پہلے کی ہے، اس کا سراغ کیڑوں مکوڑوں اور جانوروں میں بھی ملتا ہے۔ قدیم معاشروں ہی کی سرپرستی میں تحت البشر وجود ترقی کرکے انسانیت کی سطح پر پہنچا ——— یہ ترقی کی راہ میں ایک ایسی جست تھی جو آج تک کسی تہذیب سے بن نہ آئی تاہم قدیم معاشرے اب ہماری معلومات کے مطابق ساکن ہیں۔ سوال یہ ہے کہ رسم و رواج کا یہ قدیم بندھن کیوں اور کس طرح ٹوٹا؟

۲۔ نسل: ہم جس عامل کی تلاش میں ہیں، اسے یا تو ان انسانوں کا کوئی خاص وصف و جوہر قرار دینا چاہیے جن سے تہذیبوں کا آغاز ہوا۔ یا سمجھنا چاہیے کہ فی الوقت ان کے ماحول میں خاص پہلو رونما ہوئے ہوں گے یا ان دونوں (یعنی خاص جوہر اور ماحول کے خاص پہلو)

کے درمیان کسی نہ کسی نوع کا تعامل ہونا چاہیے ۔ ان میں سے پہلا نظریہ یہ ہوا کہ دنیا میں کوئی نسل فطرتاً اعلیٰ ہوتی ہے مثلاً نارڈک نسل جو تخلیق تہذیب کی ذمہ دار بنی ۔ اس نظریے کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسے رد کیا گیا ہے ۔

۳۔ ماحول : اس نظریے کا جائزہ لیا گیا ہے کہ بعض ماحول زندگی کے سہل اور آرام دہ حالات مہیا کرتے ہیں ، آیا یہ تہذیبوں کے مبدا کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کلیہ بن سکتے ہیں ؟ اس نظریے کو قابل رد سمجھا گیا ہے ۔

۵۔ دعوت مقابلہ اور جواب

۱۔ اساطیری سراغ : جن دو نظریوں کو جائزے کے بعد ہم رد کرچکے ہیں ، ان میں اصل مغالطہ یہ ہے کہ جو علوم مادی چیزوں سے متعلق ہیں ، ان کے طریقے ایک ایسے مسئلے کے سلسلے میں استعمال کیے جاتے ہیں جو روحانی ہے ۔ جن عظیم الشان اساطیر میں نسل انسانی کی عقل و دانش کا اظہار ہوا ہے ، ان کے موازنے سے واضح ہوتا ہے کہ انسان تہذیب پر اس وجہ سے نہیں پہنچا کہ خدا نے اسے اعلیٰ حیاتیاتی عطیہ دے دیا یا اس غرض سے جغرافیائی ماحول کو موزوں بنا دیا ؛ صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کبھی اس پر خاص مشکلات کا ہجوم ہوا تو ان سے عہدہ برآئی کے لیے اس نے بے مثال اور غیر معمولی کوششیں شروع کر دیں (اس طرح تہذیب معرض وجود میں آ گئی) ۔

۲۔ مسئلے پر اساطیر کا اطلاق : تہذیب کے طلوع سے پیشتر افریشیائی سطح مرتفع (صحرائے اعظم اور صحرائے عرب) کو شاداب سبزہ زار کی حیثیت حاصل تھی ، پھر اس سبزہ زار پر خشک سالی کا دور آ گیا جو طویل مدت تک جاری رہا اور اس کی شدت میں تدریجاً اضافہ ہوتا گیا ۔ اس صورت حال نے وہاں کے باشندوں کو ایک ایسی دعوت مقابلہ دے دی جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُنھوں نے مختلف طریقے اختیار کیے ۔ بعض طبقات اپنے اپنے مقامات پر بیٹھے رہے ، عادتیں بدل لیں اور آہستہ آہستہ خانہ بدوشی کے اوضاع و اطوار اختیار کر لیے ۔ بعض طبقات نے جگہیں چھوڑ دیں اور وہ سبزہ زار کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف حرکت کرتے کرتے

منطقہ حارہ میں پہنچ گئے۔ اس نقل و حرکت سے انھوں نے اپنا سابقہ اور قدیم طریق حیات قائم رکھا، آج بھی اسی طریق کے پابند ہیں۔ بعض طبقات وادیٔ نیل کی دلدلوں اور جنگلوں میں داخل ہو گئے، مشکلات کا مقابلہ کیا، دلدلیں خشک کر لیں اور مصری تہذیب کے نشو وارتقا کا بندوبست کر لیا۔

سمیری تہذیب بھی دجلہ و فرات کی وادی میں اسی طرح اور ایسے ہی اسباب کی بنا پر پیدا ہوئی، وادیٔ سندھ میں سندھی ثقافت کی بھی یہی کیفیت تھی۔

شنگ ثقافت دریائے زرد کی وادی میں پیدا ہوئی۔ ہمیں اس دعوت مقابلہ کی نوعیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں جو اس کا باعث ہوئی لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ حالات سہل نہ تھے بلکہ دشوار اور کٹھن تھے۔

مایائی تہذیب منطقہ حارہ کی دعوت مقابلہ کے جواب میں اور آنڈی تہذیب بے آب و گیاہ سطح مرتفع کی دعوت مقابلہ کے جواب میں پیدا ہوئی۔

منوی تہذیب بحری دعوت مقابلہ کے جواب میں ظہور پذیر ہوئی، اس تہذیب کے بانی وہ پناہ گیر تھے جو سواحل افریقہ کی خشکی اور خشک سالی سے مجبور ہو کر سمندر میں اتر پڑے اور کریٹ یا بحیرۂ ایجہ کے دوسرے جزیروں میں آباد ہو گئے۔ وہ اولاً ایشیا یا یورپ کی سرزمینوں سے نہ آئے تھے حالاں کہ وہ ان جزیروں سے قریب تر تھے۔

باقی رہا ملحقہ تہذیبوں کا معاملہ تو جو دعوت مقابلہ ان کا باعث ہوئی، وہ جغرافیائی عوامل سے نہیں بلکہ ان کے ''انسانی'' ماحول سے پیدا ہوئی تھی۔ ''انسانی ماحول'' سے مراد ہے ان معاشروں کی مقتدر اقلیتیں جن سے وہ تہذیبیں ملحق ہوئیں۔ مقتدر اقلیت اس حکمران طبقے کو کہتے ہیں جو قیادت و رہنمائی کے جوہروں سے عاری ہو جاتا ہے اور مستبدانہ حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ زوال پذیر تہذیب کے داخلی اور خارجی پرولتار اس دعوت مقابلہ کے پیش آنے پر اصل تہذیب سے الگ ہو جاتے ہیں اور نئی تہذیب کی طرح ڈال دیتے ہیں۔

۶۔ ناسازگاری کی برکات

تہذیبوں کی تکوین کے متعلق جو کچھ گذشتہ باب میں عرض کیا جاچکا ہے،

وہ اس تقدیر پر مبنی ہے کہ تہذیبیں سہل حالات میں نہیں بلکہ دشوار اور کٹھن حالات میں پیدا ہوتی ہیں، یہ تقدیر اب ان مقامات کی مثالوں کے ذریعے سے ثبوت کے قریب پہنچتی ہے جہاں ایک زمانے میں تہذیبیں فروغ پر تھیں، پھر وہ لا کام ہو گئیں اور زمین اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ گئی (اشارہ اس حالت کی طرف ہے جو تہذیب کے وجود پذیر ہونے سے پیش تر تھی)۔

جو مقام ایک زمانے میں مایائی تہذیب کا مامن تھا، وہ آج منطقہ حارہ کا جنگل ہے۔

ہندی تہذیب جزیرہ سیلون کے اس نصف حصے میں فروغ پذیر ہوئی جہاں بارش بالکل نہ ہوتی تھی، یہ حصہ آج پھر بالکل بنجر ہے اگرچہ ہندی نظام آبپاری کے کھنڈر اب تک موجود ہیں اور اس تہذیب کی شہادت دے رہے ہیں جس کا چراغ ایک زمانے میں وہاں روشن تھا۔

پیٹرا اور تدمر کے کھنڈر صحرائے عرب کے چھوٹے سے نخلستان میں محفوظ ہیں۔

جزیرہ ایسٹر بحر الکاہل کے دور افتادہ ترین مقامات میں سے ہے، اس کے سنگین مجسموں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جزیرہ ایک زمانے میں پالی نیشیائی تہذیب کا مرکز تھا۔

نیو انگلینڈ کے یورپی آباد کاروں نے شمالی امریکہ کی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا لیکن یہ امریکہ کے نہایت افسردہ اور نہایت بنجر حصوں میں سے ہے۔

رومی کمپگنا کے لاطینی قصبوں نے رومی اقتدار کو فروغ دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا لیکن یہ حصہ ماضی قریب تک ایک ایسا ویرانہ تھا جہاں موسمی بخار عام تھا۔ اس کے بالمقابل کاپوآ کے سازگار حالات کو پیش نظر رکھیے اور دیکھیے کہ اس کا کردار کتنا فرومایہ تھا۔ ہیرو ڈوٹس کی تاریخ، ہومر کی کتاب آڈلیسے اور توریت کی کتاب خروج سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

نیاسالینڈ میں زندگی کے حالات بڑے خوش‌گوار ہیں لیکن وہاں کے باشندے یورپ کے دور افتادہ اور ناسازگار حصوں سے حملہ آوروں کے ورود تک قدیم وحشیانہ حالات پر قائم رہے۔

۷- ماحول کی دعوت مقابلہ

۱- مشقت خیز ملکوں کا محرک: متصلہ ماحولوں کے جوڑوں کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا ہے؛ ہر جوڑے میں سے پہلی مثال ایسے خطے کی ہے جس میں انتہائی مشقت کے بغیر چارہ نہ تھا، ان کے باشندوں نے کسی نہ کسی شکل میں تہذیب کی بنیاد رکھی اور اس سلسلے میں نہایت شان‌دار کارنامے انجام دیے: وادی زرد اور وادی ینگسی؛ اٹیکا اور بوئی اوٹیا؛ بیزنطیم اور کالی سی ڈون؛ اسرائیل، خونیقیا اور فلسطیا؛ برینڈن برگ اور رھائن لینڈ؛ سکاٹ لینڈ اور انگلینڈ؛ شمالی امریکہ میں یورپی آبادکاروں کے مختلف گروہ۔

۲- نئی زمین کا محرک: حالات و واقعات کی شہادت یہ ہے کہ ''نئی زمین'' جس پر آبادکاری کا کوئی نشان نہ ہو، اس زمین کے مقابلے میں زیادہ قوی اور زبردست تحریک عمل پیدا کرتی ہے جس میں کھیتی باڑی اور آبادی ہو چکی ہو اور جسے پیشرو ''تہذیب یافتہ'' قابض لوگ سہل و خوش‌گوار بنا چکے ہوں۔ اگر ہم ملحقہ تہذیبوں میں سے ایک ایک کو لے کر ان کے حالات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان تہذیبوں نے ان مقامات پر اپنی صلاحیت کے سب سے بڑھ کر حیرت انگیز ابتدائی مظاہرے کیے جو پیشرو تہذیبوں کے مقبوضہ علاقوں سے باہر تھے۔ اگر نئی زمین تک پہنچنے کے لیے سمندر کے راستے جانا ناگزیر ہوتا تو جوابات کی برتری اور بھی حیرت انگیز بن جاتی ہے۔ اس کے وجوہ و دلائل پیش کیے گئے ہیں، نیز اس کیفیت کے اسباب واضح کیے گئے ہیں کہ ڈراما ہمیشہ اور رزمیہ نظمیں ہمیشہ سمندر پار کی نو آبادیوں میں نشو و نما پاتی ہیں۔

۳- ضربوں کا محرک: یونان اور مغربی دنیا کی تاریخ سے مختلف مثالیں پیش کر کے یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر اچانک تباہ کن شکست سے سابقہ آ پڑے تو اس سے شکست خوردہ فریق میں اپنے حالات کی درستی اور فتح‌مندانہ جواب مہیا کرنے کی تیاری کا زبردست جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

۴- دباؤ کا محرک: مختلف مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ سرحدیں سنبھالے بیٹھے ہوں اور مسلسل و متواتر حملوں کا ہدف بن سکتے ہوں، وہ ان ہمسایوں کے مقابلے میں زیادہ شان‌دار صلاحیتیں پیدا کر لیتے ہیں

جو نسبةً محفوظ مقامات پر رہتے ہوں۔ عثمانی ترکوں کو مشرقی روسی سلطنت کی سرحد پر بٹھایا گیا تھا؛ وہ قرہ مانیوں کے مقابلے میں جو مشرقی جانب تھے، زیادہ بہتر رہے۔ آسٹریا طویل مدت تک ترکوں کی یورشوں کا ہدف بنا رہا تھا لہٰذا وہ بویریا کے مقابلے میں زیادہ شان‌دار کارنامہ انجام دے سکا۔ اسی نقطہ نگاہ سے رومہ کے زوال اور نارمن فتوحات کی درمیانی مدت کے درمیان برطانیہ کے مختلف گروہوں کے احوال و وقائع کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۵۔ تعزیرات کا محرک: بعض طبقے اور نسلیں صدیوں سے تعزیرات کی مختلف شکلوں کا ہدف بنی رہی ہیں جو دوسرے طبقوں اور نسلوں نے تسلط پا کر ان پر عائد کر دیں۔ زیر تعزیر طبقے بعض مواقع یا حقوق سے محرومی کی دعوت مقابلہ کا جواب یوں پیش کرتی ہیں کہ مواقع ان کے لیے کھلے رہتے ہیں، ان کے تعلق میں غیر معمولی سرگرمیوں سے کام لیتی ہیں اور ان کے لیے غیر معمولی صلاحیتیں پیدا کر لیتی ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح اندھوں میں حس سامعہ غیر معمولی ترقی کر جاتی ہے۔ غلامی غالباً سب سے بڑی اور بوجھل تعزیر ہے لیکن مشرق بحیرۂ روم سے قبل مسیح کی آخری دو صدیوں میں غلاموں کے جو گروہ اٹلی لائے گئے تھے، ان میں سے آزاد غلاموں کا ایک طبقہ پیدا ہوا جو حیرت انگیز قوت و اقتدار کا مالک بن گیا؛ غلاموں ہی کی دنیا کے داخلی پرولتار میں نئے مذاہب پیدا ہوئے، انھیں میں مسیحیت شامل تھی۔

اسی نقطۂ نگاہ سے ان مفتوح مسیحی اقوام کے مختلف گروہوں اور ان کے احوال کا جائزہ لیا گیا ہے جو عثمانی ترکوں کی سلطنت میں رہتے تھے۔ ان میں سے فنری یونانیوں کا معاملہ خاص طور قابل ذکر ہے، اس مثال اور یہودیوں کی مثال سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نام نہاد نسلی خصائص درحقیقت نسل سے مخصوص نہیں بلکہ زیر بحث گروہوں کے تاریخی تجربات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۸۔ زریں اوسط

۱۔ کافی اور حد سے زیادہ: کیا ہم کہ سکتے ہیں کہ دعوت مقابلہ جتنی شدید ہوگی، جواب اتنا ہی اعلیٰ اور عمدہ ہوگا؟ یا کیا دعوت مقابلہ

اتنی شدت بھی اختیار کر سکتی ہے کہ جواب کی تحریک پیدا ہی نہ ہو؟ یقیناً بعض ایسی دعوت ہائے مقابلہ بھی ہمارے علم میں ہیں کہ ان سے ایک یا زیادہ فریقوں کو سابقہ پڑا اور وہ جواب میں ناکام رہے لیکن انجام کار فاتحانہ جواب پیش کرنے میں کامیاب ہوئے مثلاً توسیع پذیر یونانیت کی دعوت مقابلہ سیلٹوں کے لیے مصیبت خیز بن گئی اور ان کے جانشین ٹیوٹانیوں نے اس کا فاتحانہ جواب پیش کر دیا۔ سریائی دنیا میں یونانیوں کی مداخلت نے سریائی جوابات کا ایک سلسلہ پیش کر دیا ——— زرتشتیت، یہودیت (مکابی)، نسطوریت، یعقوبیت ——— لیکن وہ سب ناکام رہے لیکن پانچواں جواب یعنی اسلام کامیاب ہوا۔

۲- حدود سہ گانہ میں مقابلے: بہ ہر حال یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دعوت ہائے مقابلہ حد سے زیادہ شدید بھی ہو سکتی ہیں یعنی انتہائی شدت کی دعوت مقابلہ ضروری نہیں کہ ہر حال میں مناسب جواب پیش کرے۔ جو وائی کنگ اپنے وطن ناروے سے نکل کر آئس لینڈ پہنچے تھے، انہوں نے نئے وطن میں بڑے شان دار کارنامے انجام دیے لیکن جب گرین لینڈ کی شدید تر دعوت مقابلہ سے سابقہ پڑا تو ناکام ہو گئے۔ یورپی آبادکاروں کے لیے ''ڈکسی'' کے بجائے مساچوسٹس (امریکہ) کی دعوت مقابلہ زیادہ سخت تھی اور اس کا جواب بہتر طریق پر مہیا کیا گیا؛ اس کے مقابلے میں لبراڈار کی شدید تر دعوت مقابلہ نے انہیں بے بس بنا دیا۔ اس سلسلے میں دوسری مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں مثلاً ضربوں کا محرک حد درجے شدید ہو سکتا ہے خصوصاً اس حالت میں جب ان ضربوں کا سلسلہ طویل مدت تک برابر چلا جائے جیسا کہ اٹلی پر محاربات ہینی بال کے اثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ چینی ترک وطن کر کے ملایا پہنچے تو وہاں انہیں مجلسی دعوت مقابلہ پیش آئی، اس وجہ سے ان میں خوب حرکت عمل پیدا ہوئی لیکن سفید فام لوگوں کے وطن کیلی فورنیا میں انہیں شدید تر مجلسی دعوت مقابلہ سے سابقہ پڑا تو شکست کھا گئے۔ آخر میں ان دعوت ہائے مقابلہ کے مختلف درجات پر تبصرہ کیا گیا ہے جو تہذیبوں کی طرف سے ہمسایہ بربریوں کو پیش آئیں۔

۳- دو عقیم تہذیبیں: اس حصے میں سابقہ حصے کی آخری مثال پر استدلال جاری رکھا گیا ہے۔ مغربی مسیحی دنیا کی سرگزشت کے پہلے دور میں اس

کی سرحدوں پر دو بربری گروہ آباد تھے - ان میں ایسی حرکت عمل پیدا ہوئی کہ انھوں نے اپنی دو حریف تہذیبوں کی داغ بیل ڈال دی لیکن یہ دونوں بالکل ابتدائی دور ہی میں کچل دی گئیں ؛ ان میں ایک مغرب بعید کے مسیحی سیلٹوں کی تہذیب تھی (آئر لینڈ اور آئی اونا میں)، دوسری سیکنڈے نیویا کے وائی کنگوں کی تہذیب تھی - ان دو مثالوں پر غور کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر رومہ اور رھائن لینڈ سے روشنی پانے والی مسیحی تہذیب ان دو حریفوں کو نگل نہ جاتی اور اپنے اندر جذب نہ کر لیتی تو نتائج کیا ہوتے -

۴- مسیحیت پر اسلام کا فشار: مغربی مسیحی دنیا پر اس فشار کا اثر تمام تر اچھا تھا، قرون وسطیٰ میں مسیحی ثقافت بڑی حد تک مسلمانان آئبیریا (ھسپانیہ) کی ممنون تھی - بیزنطینی مسیحی دنیا پر یہ اثر حد سے بڑھ گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ لیو شامی کی سرکردگی میں رومی سلطنت کو بڑے زور شور سے از سرنو قائم کیا گیا - ابی سینیا (حبشہ) کے معاملے پر بھی غور کیا گیا جو اسلامی دنیا سے محصور حصار میں ایک مسیحی متحجر کی حیثیت رکھتا ہے -

تیسرا حصہ

تہذیبوں کا نشو و ارتقا

۹- درماندہ تہذیبیں

۱- پالی نیسیائی، اسکیمو اور خانہ بدوش: شاید خیال ہو کہ تہذیب ایک دفعہ معرض وجود میں آ جائے تو پھر خود بخود بڑھتی اور پھولتی پھلتی رہتی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ؛ اس کا ثبوت ان تہذیبوں کی سرگزشتوں سے ملتا ہے جو پیدا ہوئیں مگر نشو و ارتقا میں ناکام رہیں - ان واماندہ تہذیبوں کو مقدر نے ایسی دعوت مقابلہ سے دو چار کر دیا جس کا درجہ اس شدت (جو کامیاب جواب کا باعث ہوتی ہے) اور بڑے درجے کی شدت (جو

شکست پر منتج ہوتی ہے یعنی قوت عمل کو معطل کر دیتی ہے) کے درمیان رہا (مطلب یہ کہ نہ کامیاب جواب کی نوبت آئی اور نہ بے دست و پائی کی)۔ تین مثالیں ایسی پیش کی گئی ہیں جن میں اس قسم کی دعوت ہائے مقابلہ مادی ماحول کی طرف سے پیش آئی۔ تینوں میں جواب دھندوں نے قوت کا بڑا کارنامہ انجام دیا اور اس کارنامے کے سرانجام میں ان کی تمام عملی قوتیں اس طرح جذب ہو گئیں کہ مزید نشو و نما کی صلاحیت بھی باقی نہ رہی۔

پالی نیسیوں نے جزائر بحرالکاہل کے درمیان آمد و رفت کا کارنامہ انجام دیا، انجام کار وہ ناکام ہوئے اور اپنے اپنے جزیروں میں بیٹھ کر قدیم ترین طریق زندگی اختیار کر لیا۔

اسکیمو نے بحر منجمد کے کناروں پر سال بھر کے موسموں کے مطابق زندگی بسر کرنے میں حیرت انگیز مہارت و اختصاص کا درجہ حاصل کر لیا۔

خانہ بدوشوں نے بھی نیم صحرائی سطح مرتفع پر گلہ بانوں کی طرح زندگی بسر کرنے میں ویسی ہی مہارت پیدا کر لی۔ سمندر میں جزیرے ہوتے ہیں اور صحراؤں میں نخلستان لہٰذا سمندر اور صحرا میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ خشک سالی کے ادوار میں خانہ بدوش کے نشو و ارتقا کا تجزیہ کیا گیا ہے، ایسے ہی زمانے میں شکار پیشہ لوگ پہلے کاشت کاری شروع کرتے ہیں، پھر خانہ بہ‌دوش بنتے ہیں، قابیل اور ہابیل کاشت کار اور خانہ بہ دوش کی مثالیں ہیں۔ خانہ بہ دوش تہذیب کے علاقوں میں دو وجہ سے آتے ہیں: اول اس وقت جب بڑھتی ہوئی خشک سالی انہیں صحرا سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیتی ہے؛ دوم اس حالت میں جب تہذیب معرض شکست میں آ چکی ہو؛ اس طرح خلا پیدا ہوتا ہے جو خانہ بہ دوش کو کھینچ کر حرکت میں شریک کر لیتا ہے۔

۲- عثمانی: جس دعوت مقابلہ کے جواب میں عثمانی نظام پیدا ہوا، وہ یہ تھی کہ ایک خانہ بہ دوش جمیعت ایسے ماحول میں منتقل ہوئی جہاں اسے حضری آبادیوں پر حکومت کرنی پڑی۔ عثمانیوں نے اس مسئلے کو یوں حل کیا کہ اپنی رعایا کو انسانی گلے اور ریوڑ فرض کر لیا؛ خانہ بہ دوش اپنے پاس پھرے دار کتے رکھتے ہیں، عثمانیوں نے "انسانی کتے" مہیا کر لیے۔ یہ ناظموں اور سپاہیوں کا وہ گروہ تھا جسے غلام گھرانے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ خانہ بہ دوشوں کی ایسی ہی دوسری سلطنتوں کا ذکر

کیا گیا ہے مثلاً مملوکوں کی سلطنت؛ لیکن عثمانی نظام صلاحیت اور پائداری میں سب سے بڑھا ہوا تھا لیکن خانہ بہ دوشی کی طرح یہ مہلک صلابت کی بنا پر تباہ ہوا۔

۳- اہل سپارٹا: یونانی دنیا کو کثرت آبادی کی دعوت مقابلہ سے سابقہ پڑا تو اہل سپارٹا نے قوت کا ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو عثمانیوں کے کارنامے سے ملتا جلتا تھا، فرق صرف یہ تھا کہ سپارٹا کا جنگی طبقہ وہاں کے امرأ پر مشتمل تھا لیکن عملاً وہ بھی غلام تھے۔ انھوں نے اپنے ہم جنس اور ہم‌وطن یونانیوں کو دبائے رکھنے کا جو ''فرض'' خود بہ خود اپنے ذمے لے لیا تھا، اس کا حلقہ غلاموں کی طرح ان کی گردنوں میں پڑ گیا تھا۔

۴- عمومی خصوصیات: اسکیموؤں، خانہ بہ دوشوں، عثمانیوں اور اہل سپارٹا میں دو باتیں مشترک ہیں: اول تخصیص، دوم ذات۔ (پہلے جوڑے میں کتے، بارہ سنگھے، گھوڑے اور مویشی وہ فرائض انجام دیتے ہیں جو عثمانی ترک اپنے غلاموں سے پورے کراتے تھے)۔ ان تمام معاشروں میں انسانوں کو تخصیص نیچے گرا دیتی ہے اور گرد و پیش کے آدمیوں کے مقابلے میں وہ تحت البشر سطح پر ملاح، سوار اور جنگجو رہ جاتے ہیں، ہر جہتی انسان نہیں رہتے جنھیں پیریکلیز کی تعزیتی تقریر میں نصب العین کی حیثیت حاصل تھی، ایسے ہی آدمی تہذیب میں نشو و ارتقا کی روح پیدا کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ یہ درماندہ معاشرے شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کے معاشروں سے مشابہ ہیں جو روئے زمین پر انسانی زندگی کی صبح اول سے بھی پیشتر سے ایک حالت پر چلے آ رہے ہیں۔ یہ ان معاشروں سے بھی مشابہ ہیں جن کے نقشے یوٹوپیاؤں میں پیش کیے گئے ہیں؛ اس سلسلے میں یوٹوپیاؤں پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یوٹوپیائیں عموماً ان تہذیبوں کی پیداوار ہوتی ہیں جو معرض انحطاط میں ہوں، اس ذریعے سے کوشش کی جاتی ہے جس حد تک حالات مساعدت کریں، انحطاط کو روکا جائے اور معاشرہ جس حالت میں ہے، اسے اسی حالت میں میخیں ٹھونک کر جما دیا جائے۔

۱۰- تہذیبوں کے نشو و ارتقا کی نوعیت

۱- دو غلط سراغ: نشو و ارتقا کا عمل اس وقت جاری ہوتا ہے جب

ایک خاص دعوت مقابلہ کا جواب نہ صرف کامیابی سے دیا جائے بلکہ اس سے ایک اور دعوت مقابلہ پیدا ہو جائے اور اس کا جواب بھی کامیابی سے دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے نشو و ارتقا کا اندازہ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ کیا اس غرض کے لیے معاشرے کے خارجی ماحول پر بڑھتے ہوئے ضبط و نظم کو معیار بنایا جائے؟ بڑھتا ہوا ضبط و نظم دو قسم کا ہوتا ہے: انسانی ماحول پر بڑھتا ہوا ضبط و نظم جو طبعاً ہمسایہ اقوام کی تسخیر کی شکل اختیار کرتا ہے اور مادی ماحول پر بڑھتا ہوا ضبط و نظم جو مادی ٹکنیک میں اصلاحات کی صورت اختیار کرتا ہے؛ پھر مثالیں پیش کی گئی ہیں جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی چیز ——— نہ سیاسی اور فوجی توسیع اور نہ ٹکنیک کی اصلاح ——— حقیقی نشو و ارتقا کا تسلی بخش معیار نہیں بن سکتی، توسیع عسکریت کا نتیجہ ہوتی ہے جو بجائے خود انحطاط کی علامت ہے؛ زرعی یا صنعتی ٹکنیک میں اصلاح کو حقیقی نشو و ارتقا سے یا تو بالکل تعلق نہیں یا ہے تو بہت کم ہے، حقیقت یہ ہے کہ ٹکنیک کی اصلاح اس زمانے میں بھی ہوتی رہی ہے جب تہذیب زوال میں تھی اور اس کے برعکس مثالیں بھی ملتی ہیں۔

۲- مختاریت کی طرف ترقی: حقیقی ترقی اس عمل پر مشتمل ہے جسے ''تلطیف'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی مادی مشکلات پر قابو پا لینا جس کی وجہ سے معاشرے کے قوائے عمل ان دعوت ہائے مقابلہ کے جواب مہیا کرنے کے لیے فارغ ہو جاتے ہیں جو اس وقت سے خارجی نہیں داخلی، مادی نہیں بلکہ روحانی ہوتی ہیں۔ اس تلطیف کی نوعیت واضح کرنے کے لیے یونان اور دور جدید کی مغربی تاریخ سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

۱۱- نشو و ارتقا کا تجزیہ

۱- معاشرہ اور فرد: فرد کے ساتھ معاشرے کے تعلق کی نسبت دو روایتی نظریے رائج ہیں: ایک کے مطابق معاشرے کو محض افراد کا مجموعہ قرار دے لیا گیا ہے، دوسرے کے مطابق معاشرے کو کیا ایک جسم فرض کیا ہے، افراد اس کے اعضا قرار پاتے ہیں؛ گویا افراد کو اس معاشرے کے ارکان یا ''خلیے'' ماننا لازم ہے جس سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ یہ دونوں نظریے غیر تسلی بخش ثابت کیے گئے ہیں، صحیح نظریہ یہ ہے کہ معاشرہ

افراد کے درمیان تعلقات کا ایک نظام ہوتا ہے ۔ انسان انسان ہو ہی نہیں سکتے جب تک اپنے ہم جنسوں سے تعامل کا سلسلہ قائم نہ کر لیں اور معاشرہ متعدد انسانی افراد کے لیے ایک میدان عمل ہوتا ہے لیکن عمل کا سر چشمہ تو خود افراد میں ہوتا ہے ۔ نشو و ارتقا کا آغاز خلاق افراد یا ایسے افراد کی ایک اقلیت سے ہوتا ہے ؛ ان کا کام دوگونہ ہے : اول الہام و اکتشاف حاصل کرنا ، خواہ اس کی حیثیت کچھ ہو ، دوم معاشرے کو اس نئے طریق زندگی کا قائل کر لینا ۔ قائل کرنے کے لیے نظری اعتبار کے دو طریقوں میں کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے : یا تو تمام افراد اس تجربے میں سے گزریں جس نے خلاق افراد میں تغیر پیدا کیا یا ظواهر میں ان خلاق افراد کی پیروی اختیار کر لیں جسے دوسرے لفظوں میں تقلید کہا جاتا ہے ۔ عملاً ایک چھوٹی سی اقلیت کے سوا سب کے لیے تقلید ہی کا متبادل راستہ کھلا ہوا ہے ۔ تقلید قریب‌ترین راستہ ہے ، اسی پر چلتے ہوئے عوام اپنے لیڈروں کی پیروی کرتے ہیں ۔

۲۔ <u>کنارہ گیری اور بازگشت ــ افراد :</u> خلاق افراد کے عمل کو کنارہ گیری اور باز گشت کی دو گونہ حرکت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ؛ کنارہ گیری اس غرض سے کہ اپنے لیے روشنی کا انتظام کرے ، بازگشت اس مقصد سے کہ وهی روشنی اپنے ہم جنسوں تک پہنچاوے ۔ اسے افلاطون کی غار والی مثال ، پولوس رسول کی بیج والی تمثیل ، انجیل کی کہانی اور بعض دوسرے واقعات پیش کر کے واضح کیا گیا ہے ۔ پھر بڑے بڑے علم داران عالم انسانیت کی زندگیوں سے اس کی عملی مثالیں پیش کی گئی ہیں مثلاً پولوس رسول ، سینٹ بینی ڈکٹ ، سینٹ گریگوری اعظم ، مہاتما بدھ ، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ، میکیاولی ، دانتے ۔

۳۔ <u>کنارہ گیری اور باز گشت ــ خلاق اقلیتیں :</u> کنارہ گیری کے بعد باز گشت ان ضمنی معاشروں کی بھی خصوصیت ہے جو حقیقی معاشروں کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں ۔ جس دور میں یہ ضمنی معاشرے بڑے معاشروں کے نشو و ارتقا میں معاون بنتے ہیں جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے ، اس دور سے پیش‌تر یہ اپنے معاشرے کی عمومی زندگی سے واضح طور پر الگ ہو جاتے ہیں مثلاً ایتھنز یونانی معاشرے کی نشو و نما کے دوسرے دور میں ، اٹلی مغربی معاشرے کی نشو و نما کے دوسرے دور میں اور انگلستان تیسرے دور

میں - اس امر پر غور کیا گیا ہے کہ ممکن ہے روس چوتھے دور میں اسی قسم کا کردار ادا کرے -

۱۲- نشو و ارتقا میں تفریق

نشو و ارتقا کی جو تفصیل سابقہ باب میں بیان کی گئی ہے ، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ارتقا پذیر معاشرے کے مختلف حصوں کے درمیان تفریق پیدا ہوگی ، ہر مرحلے پر بعض حصے جدید اور کامیاب جواب مہیا کریں گے ، بعض حصے تقلیداً اپنے لیڈروں کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں گے ، بعض حصے جدت یا تقلید دونوں میں ناکام رہیں گے اور گر جائیں گے - مختلف معاشروں کی سرگزشتوں میں بھی تفریق بڑھتی جائے گی - ظاہر ہے کہ مختلف معاشرے مختلف غالب خصوصیتوں کے حامل ہوتے ہیں ؛ بعض فنون لطیفہ میں آگے نکل جاتے ہیں ، بعض مذہب میں اور بعض صنعتی ایجادات میں مگر تہذیبوں کے مقاصد کی بنیادی یکسانی فراموش نہ ہونی چاہیے - ہر بیج کی تقدیر جدا گانہ ہوتی ہے لیکن بیج ایک ہی قسم اور ایک ہی نوع کے ہوتے ہیں ، ایک ہی بونے والے نے بوئے اور ایک ہی فصل کی امید پر بوئے -

چوتھا حصہ

تہذیبوں کی شکست

۱۳- مسئلے کی نوعیت

ہم نے جن اٹھائیس تہذیبوں کا پتا لگایا ہے (درماندہ تہذیبوں کو شامل کرتے ہوئے) ، ان میں سے اٹھارہ مر چکی ہیں ، باقی دس میں سے نو ——— غرض ہماری تہذیب کے سوا سب ——— کے متعلق ہم ثابت کر چکے ہیں کہ وہ معرض شکست میں آ چکی ہیں - شکست کی حیثیت کا خلاصہ تین نکتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے : خلاق اقلیت میں تخلیقی قوت کا فقدان ، یہ فقدان اسے مقتدر اقلیت بنا دیتا ہے ؛ اکثریت کی جانب سے اطاعت گزاری اور تقلید

کی باز داشت ۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے میں بہ حیثیت مجموعی مجلسی وحدت ناپید ہو جاتی ہے ۔ ہمارا کام اب یہ ہے کہ شکست کے اسباب دریافت کریں ۔

۱۴۔ جبریانہ حل

فکر و نظر کے بعض دبستانوں کی رائے ہے کہ تہذیبوں کی شکست ان اسباب کی بنا پر عمل میں آتی ہے جو انسانی ضبط و نظم کے دائرے سے باہر ہیں ۔

۱۔ یونانی تہذیب کے عہد زوال میں بت پرست اور مسیحی مصنفین دونوں کہتے رہے کہ ان کے معاشرے کا زوال کائنات کی پیری اور سال خوردگی کا نتیجہ ہے ، لیکن موجودہ زمانے کے علمائے طبیعات کائنات کی پیری کو ناقابل یقین حد تک دور لے گئے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات کی پیری اور سال خورگی کسی گذشتہ یا موجودہ تہذیب پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی ۔

۲۔ سپینگلر اور بعض دوسرے اصحاب کی رائے ہے کہ معاشرے اجسام نامیہ کی طرح ہیں ، ان کو بھی طبعی طور پر دوسری مخلوق کی مانند جوانی اور کمال بلوغ کے بعد انحطاط سے سابقہ پڑتا ہے لیکن معاشرہ جسم نامی نہیں ۔

۳۔ ایک گروہ کے نزدیک تہذیب بجائے خود فطرت انسانی پر ناگریز ضعف و انحطاط کا اثر پیدا کر دیتی ہے اور تہذیب کا ایک دورگزر جانے کے بعد نسل انسانی کی قوت بحال کرنے کے لیے لازم ہے کہ اس کی رگوں میں بربریت کا نیا خون داخل کیا جائے ۔ اس نظریے کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسے رد کیا گیا ہے ۔

۴۔ آخر میں تاریخ کا دوری نظریہ رہ جاتا ہے جس کا ذکر افلاطون کی کتاب ’’ٹمائی اس‘‘ ، ورجل کی چوتھی نظم ، نیز دوسری کتابوں میں آیا ہے ۔ یہ نظریہ غالباً ہمارے نظام شمسی کے متعلق کلدانیوں کے اکتشافات سے لیا گیا ۔ موجودہ دور کے علم ہیئت کا تصور حد درجے وسیع ہو گیا ہے ، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے کلدانی نظریہ علم ہیئت کی بنیاد سے محروم ہو گیا ہے ؛ اس کے حق میں کوئی شہادت نہیں اور خلاف خاصی شہادت موجود ہے ۔

۱۴- ماحول پر قدرت کا فقدان

اس باب کا طریق استدلال دسویں باب کے طریق استدلال کا عکس ہے۔ دسویں باب میں یہ دکھایا گیا تھا کہ مادی ماحول پر قدرت میں اضافے کا اندازہ ٹکنیک میں اصلاح سے کیا جا سکتا ہے اور انسانی ماحول پر قدرت میں اضافے کا جغرافیائی توسیع یا فوجی تسخیر ہے، یہ چیزیں نشو و ارتقا کے اسباب یا معیارات کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتیں، موجودہ باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ٹکنیک میں زوال آنا یا بیرونی حملے کے باعث حدود کا سمٹ جانا شکست کے اسباب یا معیارات نہیں بن سکتے۔

۱- مادی ماحول: متعدد مثالیں پیش کرکے واضح کیا گیا ہے کہ ٹکنیک میں انحطاط شکست کی علت نہیں معلول ہوتا ہے۔ رومیوں کی بنائی ہوئی سڑکوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا یا عراق کے نظام ہائے آب یاری کا تباہ ہونا متعلقہ تہذیبوں کی شکست کا سبب نہیں تھا بلکہ شکست کا نتیجہ تھا۔ جو تہذیبیں ان چیزوں کو برقرار رکھنے کی ذمہ دار تھیں، وہ نہ رہیں تو چیزیں بھی برباد ہو گئیں۔ موسمی بخار کی آمد کو تہذیبوں کا شکست کا سبب قرار دیا گیا تھا، دکھایا گیا ہے کہ یہ تہذیبوں کی شکست کا نتیجہ تھا۔

۲- انسانی ماحول: گبن کے اس نظریے کا جائزہ لیا گیا کہ سلطنت رومہ کا زوال و انحطاط ''بربریت'' اور ''مذہب'' (مسیحیت) کا نتیجہ تھا اور اسے رد کیا گیا ہے۔ یونانی معاشرے کے داخلی اور خارجی پرولتار کے بہ مظاہر اصل معاشرے کی شکست کے نتائج تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ شکست پیش آچکی تھی۔ گبن اپنی داستان پہلے سے شروع نہیں کرتا؛ وہ اینٹونینوں کے عہد کو سلطنت کا زریں دور سمجھ لیتا ہے حالاں کہ یہ خزاں سے پیش تر کا دور سکون تھا۔ تہذیبوں کے خلاف کامیاب جارحانہ اقدامات کی بہت سی مثالیں پیش نظر لائی گئی ہیں اور ہر مثال سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ کامیاب جارحانہ اقدامات شکست تہذیب کے بعد پیش آئے۔

۳- ایک سلبی فتویٰ: جو معاشرہ دور نشو و ارتقا میں ہو، اس کے خلاف جارحانہ اقدام ہو تو معاشرے میں زبردست تر کوششوں کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے، جب کوئی معاشرہ حالت انحطاط میں ہو اور اس کے خلاف جارحانہ اقدام عمل میں آئے تو اس میں سرگرمیٔ عمل کا خاص جوش پیدا

ہو جاتا ہے جس سے اسے زندگی کی مزید مہلت مل جاتی ہے ۔ (مرتب کتاب نے ایک نوٹ سے شکست کی فنی اصطلاح کے وہ معنی واضح کر دیے ہیں جن میں یہ اصطلاح مصنف نے استعمال کی ہے) ۔

۱۶۔ مختاریت کی ناکامی

۱۔ تقلید کی میکانکیت : صرف ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر غیر خلاق اکثریت خلاق لیڈروں کی پیروی کر سکتی ہے اور وہ تقلید ہے ۔ یہ قواعد (ڈرل) کی ایک قسم ہے یعنی عظیم القدر اور الہام یافتہ سابقین کی میکانکی اور سطحی نقالی ۔ بلا شبہ یہ ترقی کا نزدیک تر راستہ ہے اور اسے اختیار کیے بغیر چارہ بھی نہیں لیکن اس کے خطرات بھی بالکل واضح ہیں ۔ ہو سکتا ہے لیڈر اپنے پیرووں کی میکانکیت کا اثر قبول کر لیں ، نتیجہ یہ ہوگا کہ تہذیب و ماندہ رہ جائے گی ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لیڈر ''نے نواز'' کا طریق دل نوازی چھوڑ کر جبر کا تازیانا اٹھا لیں ، اس صورت میں ''خلاق اقلیت'' ''مقتدر اقلیت'' بن جائے گی ، ''شاگرد'' یعنی پیرو ناراضمند و بے تعلق پرولتار کی حیثیت اختیار کر لیں گے ۔ یہ حالت پیش آ جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ معاشرہ انحلال کی راہ پر چل پڑا ، وہ مختاریت کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے ۔ کتاب کے جو حصے آئندہ پیش کیے جا رہے ہیں ، وہ ان طریقوں کو واضح کریں گے جن میں انحلال صورت پذیر ہوتا ہے ۔

۲۔ نئی شراب پرانی بوتلوں میں : خیال یہ ہونا چاہیے کہ خلاق اقلیتیں جو نئی قوتیں بروئے کار لائی ہیں ، وہ اپنے عمل کے لیے نئے ادارے پیدا کریں گی ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ پرانے اداروں ہی سے کام لیتی ہیں جو دوسرے مقاصد کے لیے معرض وجود میں آئے تھے مگر پرانے ادارے اکثر ناموزوں اور تغیر ناپذیر ثابت ہوتے ہیں ۔ اس سلسلے میں دو نتیجوں میں سے ایک ضرور برآمد ہوتا ہے : یا تو ادارے ٹوٹ جاتے ہیں (انقلاب) یا نئی قوتیں ان اداروں کے ذریعے سے کام کرتے کرتے بگڑ جاتی ہے (بے اعتدالی) ۔ انقلاب کی تعریف یہ ہے کہ وہ تقلید کا رکا ہوا اور اس وجہ سے ایک اشتعال خیز مظاہرہ ہوتا ہے ؛ بے اعتدالی کو ہم تقلید کی ناکامی کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں ۔ اگر ادارے نئی قوتوں سے ہم آہنگ ہو جائیں تو نشو و ارتقا کا سلسلہ جاری رہے گا ، اگر انقلاب رو نما ہوگا تو نشو و ارتقا خطرے میں

پڑ جائے گا؛ اگر بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ معاشرے میں شکست کا عمل شروع ہو گیا۔ اس کے بعد پرانے اداروں پر نئی قوتوں کے فشار کی بہت سی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے مثالوں کا پہلا سلسلہ وہ ہے جس میں دور جدید کے مغربی معاشرے کی دو بڑی اور نئی قوتوں کے فشار کی کیفیت واضح کی گئی ہے:

غلامی کا فشار فن کاری پر مثلاً جمہوریۂ امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں۔

جمہوریت اور صنعت کاری کا فشار جنگ پر جیسا کہ انقلاب فرانس کے بعد جنگوں کی شدت سے واضح ہوتا ہے۔

جمہوریت اور صنعت کاری کا فشار علاقائی حکومتوں پر، اس کا اظہار قومیت میں مبالغہ آرائی اور دور جدید کی مغربی دنیا کے اندر آزاد تجارت کی ناکامی میں ہوا۔

صنعت کاری کا فشار ذاتی جائداد پر، جس کا اظہار سرمایہ داری اور اشتمالیت (کمیونزم) کے بروز میں ہوا۔

جمہوریت کا فشار تعلیم پر، اس کا اظہار اشتعال انگیز جرائد اور فاشسٹ ڈکٹیٹریوں کی شکل میں ہوا۔

اطالوی صلاحیت کا فشار الپس پار کی حکومتوں پر جیسا کہ (بہ استثنائے انگلستان) مطلق العنان بادشاہیوں کی شکل میں ہوا۔

سولنی انقلاب کا فشار یونان کی شہری ریاستوں پر، اس کا اظہار استبداد، خانہ جنگی اور قیادت کی شکل میں ہوا۔

علاقائی ریاستوں کا فشار مغربی مسیحیت کے نظام کلیسا پر، اس سلسلے میں پراٹسٹنٹ انقلاب، بادشاہوں کے خاص خدا داد حقوق اور حب وطن کے روبرو مسیحیت کے گہنا جانے کی شکل میں ہوا۔

حس اتحاد کا فشار مذہب پر، اس کا اظہار تعصب و تعذیب کی شکل میں ہوا۔

مذہب کا فشار ذات پات پر، اس کا مظاہرہ ہندو تہذیب میں ہوا۔

تہذیب کا فشار تقسیم کار پر، اس کا اظہار یوں ہوا کہ لیڈر اپنے رازوں کو چھپانے لگے، پیرووں میں توازن باقی نہ رہا۔ آخری نقص کے سلسلے میں زیر تعذیب اقلیتوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں مثلاً یہودی، نیز موجودہ زمانے کا ورزش میں انہاک سے انحرافات۔

تہذیب کا فشار تقلید پر ، تہذیب میں تقلید کا رخ ابتدائی دور کے معاشروں کی طرح قبیلے کی روایات کی طرف نہیں بلکہ عمل داروں کی طرف ہوتا ہے ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن لیڈروں کو تقلید کی غرض سے منتخب کیا جاتا ہے وہ خلاق لیڈر نہیں ہوتے بلکہ محض تجارتی نفع جو یا سیاسی شورش پسند ہوتے ہیں ۔

۳- مکافات تخلیق ، اپنے عارضی وجود کی پرستش : تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو گروہ ایک دعوت مقابلہ کا کامیاب جواب مہیا کر دیتا ہے ، وہ دوسری دعوت مقابلہ کے جواب میں شاذ ہی کامیاب ہوتا ہے ۔ مختلف مثالیں پیش کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ صورت حال یونانی اور عبرانی فکر کے بعض بنیادی مسلمات کے عین مطابق ہے - جو لوگ ایک مرتبہ کامیابی حاصل کر لیتے ہیں ، ہو سکتا ہے کہ دوسرا موقع پیش آئے تو ''وہ اپنے چپوؤں پر استراحت فرما رہے ہوں''- یہودیوں نے عہد نامۂ قدیم کی تمام دعوت ہائے مقابلہ کا جواب مہیا کیا لیکن عہد نامۂ جدید کی دعوت مقابلہ نے انہیں شکست دے دی ۔ پریکلیز کا ایتھنز پولوس رسول کے ایتھنز میں گم ہو گیا ۔ اٹلی کی نشأۃ ثانیہ میں جن مرکزوں نے تحریک احیائے علوم کے لیے سبقت کا درجہ حاصل کیا تھا ، وہ غیر مؤثر ثابت ہوئے اور پیڈ مانٹ نے قیادت کا علم سنبھال لیا حالاں کہ اٹلی کے سابقہ شان دار کارناموں میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا ۔ جمہوریۂ امریکہ کو دیکھو ، انیسویں صدی کے ربع اول اور ربع ثانی میں جنوبی کیرولینا اور ورجینیا کی ریاستیں پیش پیش رہی تھیں لیکن خانہ جنگی کے دور میں وہ شمالی کیرولینا کے برابر پہنچنے میں بھی ناکام رہیں حالاں کہ آخر الذکر ریاست پہلے بالکل بے حیثیت تھی -

۴- مکافات تخلیق ، عارضی اداروں کی پرستاری : شہری ریاستوں کے نظام کی پرستاری یونانی تاریخ کے متاخر مراحل میں ایک پھندا بن گئی جس میں اہل یونان پھنس گئے لیکن رومی نہ پھنسے ، رومی سلطنت ایک ''بھوت'' آرتھوڈکس مسیحی معاشرے کی شکست کا باعث بنا ۔ بادشاہوں ، پارلیمنٹوں ، حکمران طبقوں (خواہ وہ دفتری حکومتوں پر مسلط ہوں یا مذہبی نظاموں پر) کی پرستاری کے برے اثرات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔

۴- مکافات تخلیق ، عارضی ٹکنیک کی پرستاری : حیاتیاتی ارتقا کی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ ٹکنیک میں درجۂ کمال حاصل کرنا یا ماحول

سے کامل مطابقت پیدا کر لینا اکثر اندھی گلی میں پہنچاتا ھے ۔ جو اجسام تخصیص میں کمال پیدا نہیں کرتے اور بین بین رھتے ھیں ان میں زندہ رھنے کی صلاحیت زیادہ ھوتی ھے ۔ ذو حیاتین مچھلیوں کے مقابلے میں زیادہ کام یاب ھوئے ، اسی طرح انسان کے موش نما اجداد اپنے معاصر عظیم الجثہ حشرات کے مقابلے میں حالات سے بہتر طریق پر عہدہ برآ ھو سکے ۔ صنعت کاری کے حالات پر نظر ڈالیے ، ایک خاص گروہ نے نئی ٹکنیک کے ابتدائی مراحل میں اس کے اندر خوب کامیابی حاصل کی مثلاً چرخی والے جہاز کا معاملہ سامنے لائیے ؛ جس گروہ نے اس جہاز کی ساخت میں کمال حاصل کیا یا اسے چلانے میں مہارت تامہ حاصل کر لی ، وہ پیچ گھما کر چلانے والے جہاز کی بہتر اور مفید تر ایجاد اختیار کرنے میں مقابلۃً پیچھے رہ گیا ۔ داؤد[۴] اور جالوت کے عہد سے آج تک کے فن جنگ کی تاریخ پر عہد بہ عہد تبصرہ کیا گیا ھے اور دکھایا گیا کہ ایک نئی چیز پیدا کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے تھوڑی دیر کے بعد مصروف استراحت ھو گئے اور دشمنوں کو موقع دے دیا کہ وہ دوسری نئی چیزیں پیدا کر لیں ۔

۶- <u>عسکریت کی خود کشی</u> : کتاب کے تین سابقہ حصوں میں ان گروھوں کی مثالیں پیش کی گئی ھیں جو چپوؤں کے سہارے استراحت کرتے رھے یعنی تخلیق کی مکافات میں بے دست و پا ھو جانے کے بعد مغلوب ھو کر رہ گئے ۔ اب ھم انحراف کی فعال صورت کو زیر غور لاتے ھیں جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل یونانی فارمولے کی شکل میں پیش ھوا ھے : (kopos, vBpis, ary) شکم سیری ، ھتک آمیز روش اور تباھی ، عسکریت اس کی بدیہی مثال ھے ، آشوری کیوں اپنے اوپر تباھی لانے کے موجب بنے ؟ اس لیے نہیں کہ جن فاتحوں کے حالات پر گزشتہ باب کے آخر میں تبصرہ کیا جا چکا ھے ، ان کی مانند اشوری بھی اپنے ھتھیاروں کو زنگ لگا لینے پر راضی ھو گئے تھے ۔ واقعہ یہ ھے کہ عسکری نقطۂ نگاہ سے انھوں نے اپنی صلاحیت نہ صرف مسلسل برقرار رکھی بلکہ اس میں اضافہ کرتے رھے ؛ وہ اس وجہ سے تباہ ھوئے کہ جارحانہ اقدامات ان کی قوت کھا گئے اور وہ تھک کر چُور ھو گئے ، نیز ھمسایوں کے لیے وہ نا قابل برداشت بن گئے تھے ۔ اشوری ایک ایسے عسکری سرحدی صوبے کی مثال پیش کر رھے ھیں جس نے ھتھیاروں کا رخ اپنے معاشرے کے داخلی صوبوں کی طرف پھیر دیا تھا ۔ آسٹریشیائی

فرینکوں اور تیمورلنگ کی مماثل مثالوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مزید مثالیں پیش کی گئی ہیں -

۷- فتح و ظفر کی سیہ مستی : جیسے موضوع پر سابقہ پارے میں بحث ہوئی تھی ، ویسے ہی موضوع کو غیر عسکری دائرے کی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے - اس سلسلے میں پاپائی نظام کو سامنے لایا گیا ہے جو ہلڈی برینڈ نے تیار کیا تھا - یہ ایک ایسا ادارہ تھا جس نے مسیحیت کو پستی کی گہرائیوں سے اٹھایا اور انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ، اس کے بعد یہ ناکام ہو گیا ؛ اس وجہ سے ناکام ہو گیا کہ اپنی کامیابی کی سیہ مستی میں اس نے غیر مناسب مقاصد کے لیے سیاسی اسلحہ کا ناجائز استعمال کیا - اس سلسلے میں اسقفوں کے تقرر کا متنازعہ فیہ مسئلہ سامنے رکھ کر اس کا جائزہ لیا گیا ہے -

پانچواں حصہ

تہذیبوں کا انحلال

۱۷- نوعیت انحلال

۱- ایک عمومی جائزہ : کیا انحلال شکست کا ایک ضروری اور لازمی نتیجہ ہے ؟ مصر اور مشرق بعید کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک متبادل صورت بھی ہے جسے ہم تحجر قرار دے سکتے ہیں - یونانی تہذیب کا حشر بھی تقریباً یہی ہوا تھا اور خود ہماری تہذیب کا حشر بھی یہی ہو سکتا ہے - انحلال کا نمایاں معیار یہ ہے کہ معاشرے میں انشقاق پیدا ہو اور وہ تین طبقوں میں بٹ جائے : مقتدر اقلیت ، داخلی پرولتار اور خارجی پرولتار ؛ ان اجزا کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے ، اس کا اعادہ کرتے ہوئے آئندہ ابواب کا نقشہ واضح کیا گیا ہے -

۲- انشقاق اور نشأۃ ثانیہ : کارل مارکس کے الہامی فلسفے کا اعلان

یہ ہے کہ طبقاتی جنگ کے بعد پرولتار کی ڈکٹیٹری کا دور آئے گا، پھر معاشرے کا نیا نظام وجود پذیر ہوگا۔ فکر مارکس کے اس مخصوص اطلاق سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم کہ سکتے ہیں کہ جب کوئی معاشرہ مذکورہ بالا تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے تو یہی صورت حال پیش آتی ہے، ہر جزو تخلیق کا ایک خاص کام انجام دیتا ہے، مقتدر اقلیت ہمہ گیر سلطنت پیدا کرتی ہے، داخلی پرولتار ہمہ گیر مذہبی نظام معرض وجود میں لاتے ہیں، خارجی پرولتار بربری جنگی جتھے مہیا کرتے ہیں۔

۱۸- معاشرے میں انشقاق

۱- مقتدر اقلیتیں: مقتدر اقلیتوں میں اگرچہ عسکریت دوست اور نفع جُو بھی بہت نمایاں ہوتے ہیں لیکن ان میں انسانیت کے شریف تر نمونے بھی پائے جاتے ہیں مثلاً قانون ساز اور ارباب نظم و نسق جو ہمہ گیر سلطنتوں کا انتظامی کار و بار چلاتے ہیں، فلسفی محققین جو دورزوال میں معاشروں کے لیے مخصوص فلسفے بہم پہنچاتے ہیں؛ اس کی مثال یونانی فلسفیوں کے اس طویل سلسلے سے مل سکتی ہے جو سقراط سے شروع ہوکر پلوٹی نس پر ختم ہوا، دوسری تہذیبوں سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

۲- داخلی پرولتار: یونانی معاشرے کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے داخلی پرولتار تین ماخذوں سے لیے گئے: اول یونانی ریاستوں کے وہ شہری جو سیاسی یا اقتصادی انقلابات میں ہر شے سے محروم اور تباہ ہوئے، دوم مفتوحہ اقوام، سوم بردہ فروشی کے مظلوم۔ یہ سب اس وجہ سے پرولتار تھے کہ اپنے آپ کو معاشرے میں شامل محسوس کرتے تھے مگر اس کے جزولاینفک نہ تھے۔ ان لوگوں کا پہلا ردّ عمل تشدد آمیز ہوتا ہے لیکن تدریجاً یہ ردّ عمل حلیمی کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے۔ تا آں کہ وہ ایک اعلیٰ مذہب کے اکتشاف میں کامیاب ہو جاتا ہے مثلاً مسیحیت۔ یہ مذہب متھرا ازم (آفتاب پرستی) اور یونانی دنیا کے دوسرے حریف مذاہب کی طرح ایک اور ''مہذب'' معاشرے میں پیدا ہوا تھا جسے یونانی فوجیں مسخر کر چکی تھیں۔ دوسرے معاشروں کے داخلی پرولتار کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں بھی اس قسم کی صورت حال مشاہدے میں آئی ہے مثلاً یہودیت اور زرتشتیت بابلی معاشرے کے داخلی پرولتار میں پیدا ہوگئیں، مسیحیت اور متھرا ازم یونانی معاشرے کے داخلی

پرولتار میں اگرچہ پیش کردہ وجوہ کی بنا پر ان کی بعد کی نشو و نما مختلف تھی۔ مہاتما بدھ کے قدیم فلسفے کی ہیئت بدل کر اسے مہایان کی شکل دی گئی، اس طرح چینی معاشرے کے داخلی پرولتار کے لیے ایک مذہب مہیا ہوا۔

۳- مغربی دنیا کے داخلی پرولتار: یہاں داخلی پرولتار کے وجود کے متعلق بہ کثرت شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں ——— دوسرے امور کے علاوہ داخلی پرولتار میں سے ایک "روشن خیال" طبقے کا پیدا ہونا جو مقتدر اقلیت کا کارندہ ہوتا ہے۔ روشن خیال طبقے کے اوصاف و خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ دور جدید کے مغربی معاشرے کے داخلی پرولتار نئے اعلیٰ مذاہب پیدا کرنے میں بالکل غیر زرخیز اور بنجر ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مسیحی کلیسا جس سے مغربی مسیحی دنیا پیدا ہوئی، مسلسل سرگرم عمل رہا۔

۴- خارجی پرولتار: جب تک تہذیب ارتقا پذیر رہتی ہے، اس کے ثقافتی اثرات کی کرنیں قدیم وضع کے ہمسایوں میں لا محدود فاصلے تک پہنچتی اور گھر کرتی رہتی ہیں؛ چناں چہ وہ لوگ اس غیر خلاق اکثریت کا جزو بن جاتے ہیں جو خلاق اقلیت کے پیچھے پیچھے چلتی ہے لیکن تہذیب معرض شکست میں آتی ہے تو اس کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، آس پاس کے بربری لوگ حریف بن کر میدان میں نکل آتے ہیں، معاشرے اور حملہ آور بربریوں کے درمیان ایک فوجی سرحد قائم ہو جاتی ہے جو وقتی طور پر کتنی ہی آگے پیچھے چلی جائے، انجام کار ایک حالت پر قائم ہو جاتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر وقت بربریوں کے سازگار ہو جاتا ہے؛ ان حقائق کی توضیح کے لیے یونانی تاریخ سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ خارجی پرولتار کی طرف سے متشددانہ اور نرم جوابات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حریف تہذیب کا دباؤ خارجی پرولتار کے پیدا کیے ہوئے قدیم دور کے مذاہب زرخیزی کی ہیئت بدل کر انھیں اولمپیائی آسمانی جنگی جتھوں کے نمونے بنا دیتا ہے۔ فاتح خارجی پرولتار کی خاص تخلیق رزمیہ شاعری ہے۔

۵- مغربی دنیا کے خارجی پرولتار: خارجی پرولتار کی سرگزشتوں پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے متشددانہ اور نرم جوابات کی مثالیں دی گئی ہیں۔ دور جدید کے مغربی معاشرے کی حد سے بڑھی ہوئی مادی صلاحیت نے

تاریخی نمونے کی بربریت کو تقریباً محو کر ڈالا ہے ، اس کے صرف دو حصار باقی رہ گئے ہیں ، ایک افغانستان اور دوسرا سعودی عرب ۔ ان ملکوں کے دیسی حکمران مغربی ثقافت کی پیروی کر کے اپنی حفاظت کے سامان بہم پہنچا رہے ہیں لیکن مغربی مسیحی دنیا کے قدیم مرکزوں میں ایک نئی اور حد درجہ ظالمانہ بربریت پرورش پا رہی ہے ۔

۶- اجنبی اور ملکی فیضان : مقتدر اقلیتیں اور خارجی پرولتار اگر اجنبی فیضان سے متاثر ہوں تو ان کے لیے مشکلات پیش آتی ہیں مثلاً جو ہمہ گیر سلطنتیں اجنبیوں نے قائم کیں (مثلاً ہندوستان میں برطانوی راج) ، وہ اپنے آپ کو منوانے میں اتنی کامیاب نہ ہوئیں جتنی کہ ملکی ہمہ گیر سلطنتیں کامیاب ہوگئیں مثلاً رومی سلطنت ۔ بربریوں کے جنگی جتھوں میں اگر اجنبی تہذیب کے اثرات کا رنگ نمایاں ہو تو ان کے خلاف نہایت سخت اور پر جوش جذبۂ مخالفت پیدا ہو جاتا ہے مثلاً مصر میں ہکسوس اور چین میں تاتاری ۔ اس کے برعکس داخلی پرولتار نے جو اعلیٰ مذاہب پیدا کیے ، وہ عموماً اجنبی فیضان ہی کی بناء پر زیادہ جاذب بنے ، تقریباً تمام اعلیٰ مذاہب اس حقیقت کی توضیح کر رہے ہیں ۔

یہ واقعہ ہے کہ کسی اعلیٰ مذہب کی تاریخ اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک دو تہذیبوں کے حالات پیش نظر نہ رکھ لیے جائیں —— اول وہ تہذیب جہاں سے اعلیٰ مذہب نے فیضان حاصل کیا ، دوم وہ تہذیب جہاں اس نے جڑ پکڑی —— اس سے ظاہر ہو گیا کہ جس مفروضے کی بناء پر یہ کتاب اب تک مبنی چلی آئی —— یعنی تہذیبیں تنہا مطالعے کا قابل فہم دائرہ ہیں —— وہ اس مقام پر پہنچ کر معرض تزلزل میں پڑ گیا ۔

۱۹- روح میں انشقاق

۱- روش ، احساس اور زندگی کے متبادل طریقے : جب ایک معاشرے میں عمل انحلال شروع ہوتا ہے تو روش ، احساس اور زندگی کے جو طریقے دور نشو و ارتقا میں افراد کے لیے وجۂ امتیاز رہے تھے ، ان کی جگہ دوسرے طریقے لے لیتے ہیں اور ان میں سے ہر جوڑے کا پہلا طریقہ انفعالی ہوتا ہے اور دوسرا فعالی ۔

حوالگی اور ضبط نفس تخلیق کے ، فرار اور شہادت تقلید کے بدل ہیں۔

سیلان کی حس اور گناہ کی حس اس جوش و جذبہ کے بدل ہیں جو نشو و ارتقا میں ساتھ ساتھ رہتا ہے ، حس اختلاط اور حس اتحاد ''حس نمونہ'' کے بدل ہیں جو تفریق و امتیاز کے خارجی عمل کا داخلی مثنٰی ہے ، تفریق و امتیاز نشو و ارتقا کے رفیق ہیں۔

جس عمل کو ہم پہلے تلطیف سے تعبیر کر چکے ہیں ، اس میں دائرہ عمل عالم کبیر سے عالم صغیر کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حرکت زندگی کی سطح پر متبادل تغیرات کے دو جوڑے پیدا کرتی ہے۔ پہلا جوڑا ـــــ قدامت پرستی اور مستقبلیت ـــــ منتقلی کو درجۂ اتمام پر پہنچانے میں ناکام رہتا ہے اور تشدد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے؛ دوسرا جوڑا ـــــ قطع تعلق اور تبدیل ہیئت ـــــ اصل کام کو اتمام پر پہنچا دیتا ہے ، اس جوڑے کی خصوصیت نرمی اور حلیمی ہے۔ قدامت پرستی وقت کو پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش ہے ، مستقبلیت کی غرض یہ ہوتی ہے کہ روئے زمین پر ایک ایسے عہد سعادت کے لیے قریب ترین راستہ تلاش کرے جس کا ظہور ممکن نہ ہو۔ قطع تعلق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قدامت پرستی میں روحانیت پیدا کی جائے یعنی انسان کنارہ گیر ہو کر روح کے حصار میں بند ہو جائے اور دنیا سے دست برداری اختیار کر لے۔ تبدیل ہیئت مستقبلیت کو روحانیت کا جامہ پہناتی ہے ، یہ روح کا وہ عمل ہے جس سے اعلیٰ مذاہب پیدا ہوتے ہیں۔ ان چاروں طریقوں اور ان کے باہمی تعلقات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ، آخر میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے احساس اور زندگی کے بعض طریقے مقتدر اقلیتوں کی روحوں سے مخصوص ہوتے ہیں اور بعض پرولتار کی روحوں سے۔

۲- <u>حوالگی اور ضبط نفس</u>: تعریفیں بیان کی گئی ہیں اور مثالیں دی گئی ہیں۔

۳- <u>فرار اور شہادت</u>: تعریفیں بیان کی گئی ہیں اور مثالیں دی گئی ہیں۔

۴- <u>حس سیلان اور حس گناہ</u>: حس سیلان اس احساس کا نتیجہ ہے کہ دنیا پر یا تو اتفاق حکمران ہے یا ضرورت ، یہ دونوں اصل میں ایک ہیں۔ عقیدے کے وسیع دائرے کی توضیح کی گئی ہے۔ بعض مذاہب جبریت

مثلاً کیلون ازم حیرت انگیز سرگرمی عمل اور اعتماد کا موجب بنا ، اس کے سبب پر غور کیا گیا ہے جو بادیٔ النظر میں عجیب معلوم ہوتا ہے ۔

حس سیلان قوائے عمل کو بالکل سن کرکے رکھ دیتی ہے ، اس کے برعکس حس گناہ کو محرک و مہیج عمل ہونا چاہیے ۔ ''کرم'' اور ''پہلے گناہ'' (جس میں گناہ اور جبریت مل گئے ہیں) کے نظریوں پر بحث کی گئی ہے ۔ عبرانی انبیاء کرام اس امر کی معیاری مثال پیش کرتے ہیں کہ گناہ قومی مصائب کا بدیہی نہیں تو حقیقی سبب ضرور ہے ۔ ان انبیاء کی تعلیمات کو مسیحی کلیسا نے اپنایا اور یونانی دنیا کو ان سے روشناس کیا جو انھیں قبول کرنے کے لیے صدیوں سے نادانستہ تیار ہو رہی تھی ۔ مغربی معاشرے نے مسیحی روایات لے لیں مگر حس گناہ کو نظر انداز کر دیا حالاں کہ وہ ان روایات کا ایک اہم جزو تھی ۔

۵- حس اختلاط: یہ حس نمونہ کا انفعالی بدل ہے اور حس نمونہ تہذیبوں کے دور نشو و ارتقا کی ایک خاص خصوصیت ہوتی ہے ، اس کا اظہار مختلف طریقوں پر ہوتا ہے :

(الف) اوضاع و اطوار میں سوقیت و بربریت : مقتدر اقلیت داخلی پرولتار کی سوقیت اور خارجی پرولتار کی بربریت اختیار کرکے پرولتار بننے کے قریب پہنچ جاتی ہے تاآں کہ برھمئی شیرازہ کے آخری مرحلے پر طریق زندگی کے اعتبار سے مقتدر اقلیت اور پرولتار میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ۔

(ب) فنون میں سوقیت و بربریت : انحلال پذیر تہذیب کے فنون چوں کہ بہت وسیع دائرے میں پھیل جاتے ہیں ، اس لیے ان میں سوقیت اور بربریت آجاتی ہے ۔

(ج) لنگوا فرینکا ''مشترک زبان'' : مختلف اقوام کے میل جول سے افراتفری پھیلتی ہے اور زبانوں میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ ان میں سے بعض لنگوا فرینکا کی حیثیت سے پھیل جاتی ہیں لیکن توسیع کے ساتھ ساتھ لازماً ان کے درجے اور حیثیت میں بھی تسفل پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالوں کا جائزہ بہ غرض توضیح کیا گیا ہے ۔

(د) مذہب میں امتزاج : اس سلسلے میں تین تحریکوں کو الگ الگ ذہن نشین کر لینا چاہیے : اول فلسفے کے مختلف دبستانوں میں امتزاج ، دوم مختلف مذاہب میں امتزاج (مثلاً ہمسایہ دینی مسالک اختیار کر لینے کے

باعث یہودیوں کے مذہب میں ملاوٹ جس کی مخالفت عبرانی انبیاء نے بڑی شدت سے کی اور انجام کار کامیاب ہوئے) ، سوم فلسفوں اور مذاهب کا باهم امتزاج - بعض فلسفے مقتدر اقلیتوں نے پیدا کیے اور اعلیٰ مذاهب داخلی پرولتار پیدا کرتے هیں ، ان کا تعامل نمبر الف میں واضح کیا جا چکا ہے ؛ وهاں کی طرح یہاں بھی پرولتار مقتدر اقلیت کے مقام کی طرف بڑھتے هیں لیکن مقتدر اقلیت بہت لمبا فاصلہ طے کرکے داخلی پرولتار کی طرف بڑھتی ہے مثلاً مسیحیت نے اپنے نظام کے لیے یونانی فلسفے کا ڈھانچہ استعمال کیا لیکن یہ تبدیلی اس تبدیلی کے مقابلے میں بے حقیقت ہے جو یونانی فلسفے کو افلاطون اور جولئن کے درمیانی عہد میں پیش آئی -

(ہ) کیا حکمران مذہب کا فیصلہ کرتا ہے: بحث کا یہ حصہ اصل موضوع سے انحراف ہے جو اس وجہ سے ضروری ہوا کہ گزشتہ بحث کے آخر میں فلسفی شاهنشاہ جولئن کا ذکر آ گیا تھا - سوال یہ ہے کہ کیا مقتدر اقلیتیں اپنے دل پسند مذہب یا دل پسند فلسفے کو سیاسی قوت کے بل پر عائد کرکے اپنی روحانی کمزوری کی تلافی کر سکتی هیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ناکام هوں گی اگرچہ اس میں بعض مستثنیات بھی هیں اور جو مذہب سیاسی قوت کا سہارا لیتا ہے ، وہ اپنے آپ کو شدید نقصان پہنچاتا ہے - اس سلسلے میں بداهۃً مستثنیٰ معاملہ اسلام کا ہے ؛ جائزہ لے کر واضح کیا گیا ہے کہ یہ در اصل استثناء نہیں جیسا کہ بادیٔ النظر میں معلوم ہوتا ہے - اس کے برعکس یہ فارمولا زیادہ قرین حقیقت ہے کہ اکثریت کا مذہب بادشاہ کا مذہب ہوتا ہے ؛ جو حمکران عقیدت یا بد عقیدگی سے رعایا کا مذہب اختیار کر لے ، وہ مزے میں رهتا ہے -

٦- حس اتحاد: یہ اختلاط کے انفعالی احساس کا فعال ضد ہے - مادی صورت میں اس کا اظہار همہ گیر سلطنتوں کی تسخیر میں ہوتا ہے ، یہی روح همہ گیر قانون اور حاضر و ناظر خدا کے تصورات میں کار فرما ہے جو پوری کائنات پر حکومت کر رها ہے - ان دو تصوروں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی مثالیں پیش کی گئی هیں - آخرالذکر سلسلے میں یہودہ کے پورے حالات بتائے گئے هیں جو سینیائی آتش افشاں پہاڑ کے ''جن'' سے شروع ہو کر عبرانیوں کا غیور خدا بنا ، انجام کار وہ بلند ہو کر ایک سچے خدا کے خالص اور اعلیٰ تصور کا تاریخی مظہر بن گیا - اسی کی پرستش مسیحی کلیسا

کر رہا ہے۔ حریفوں کے مقابلے میں اس کی کامیابی کا سبب بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ قدامت پرستی: یہ ایک کوشش ہے جس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ انحلال پذیر معاشرے کی زندگی کے ابتدائی دور کو از سرنو ترتیب دے کر ناقابل برداشت ''حال'' سے بچاؤ کی صورت نکالی جائے۔ اس سلسلے میں قدیم و جدید مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ جدید مثالوں کے سلسلے میں گاتھوں کی طرز تعمیر کا احیاء اور قومی مقاصد کے لیے مختلف قسم کی کم و بیش معدوم زبانوں کا مصنوعی احیاء بھی شامل ہے۔ قدامت پرستی کی تحریکیں عموماً بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں یا تبدیل ہیئت سے اپنی ضد یعنی مستقبلیت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

۸۔ مستقبلیت: اس کوشش کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ''حال'' سے بچنے کے لیے غیر معلوم مستقبل کے اندھیرے میں جست لگائی جائے۔ اس میں ماضی کی تمام روایتی کڑیاں توڑ دی جاتی ہیں اور یہ در اصل ایک قسم کی انقلابی تحریک ہوتی ہے۔ فنون میں یہ بت شکنی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

۹۔ مستقبلیت کی رفعت نفس: جس طرح قدامت پرستی مستقبلیت کی خلیج میں گر سکتی ہے اسی طرح مستقبلیت بلندی کو پہنچ کر تبدیل ہیئت کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سطح ارض پر ''یوٹوپیا'' (ایک خیالی مثالی نظام تمدن و سیاست) کو پانے کی موہوم امید چھوڑ کر اسے روح کی زندگی میں تلاش کر سکتی ہے جو زمان و مکان کے اثرات سے پاک ہے۔ اس سلسلے میں یہودیوں کے عہد اسیری کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مستقبلیت نے ازرؔوبابل سے برکوکبا تک زمین پر یہودی سلطنت قائم کرنے کی کئی ایسی کوششیں کیں جو خود کشی کے مترادف تھیں۔ تبدیل ہیئت سے مسیحی مذہب پیدا ہوا۔

۱۰۔ قطع تعلق اور تبدیل ہیئت: قطع تعلق ایک روش ہے جس نے اس فلسفے میں بہترین اظہار کی شکل اختیار کی جو بدھ کی تعلیمات پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ خود کشی ہے اس لیے کہ حقیقی قطع تعلق صرف خدا کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس مسیحی مذہب ایک ایسے خدا کی دعوت دیتا ہے جس نے خود بہ خود قطع تعلق سے دست برداری اختیار کر لی حالاں کہ اس سے متمتع ہونا واضح طور پر اس کے اختیار میں تھا۔ 'خدا کو دنیا سے اتنی محبت تھی -----'

۱۱- نشأۃ ثانیہ : زندگی کے جن چار طریقوں کا یہاں جائزہ لیا گیا ہے، ان میں سے صرف تبدیل ہیئت حقیقی شاہراہ ہے، اس میں دائرۂ عمل عالم کبیر سے عالم صغیر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ قطع تعلق کی بھی یہی صورت ہے لیکن وہ صرف کنارہ گیری ہے۔ تبدیل ہیئت کنارہ گیری اور بازگشت ہے یعنی نشأۃ ثانیہ۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرانی نوع از سر نو پیدا ہو، صرف یہ ہے کہ معاشرے کی ایک نئی قسم وجود میں آ جائے۔

۲۰- انحلال پذیر معاشروں اور افراد کا تعلق

۱- خلاق ذہانت، نجات دھندے کی حیثیت میں: دور نشو و ارتقا میں خلاق افراد پے درپے دعوت ہائے مقابلہ کے کامیاب جواب مہیا کرتے رہتے ہیں۔ دور انحلال میں وہ انحلال پذیر ''معاشروں کے نجات دھندے'' یا ان ''معاشروں سے نجات دھندے'' ثابت ہوئے ہیں۔

۲- شمشیر بہ کف نجات دھندہ: یہ لوگ ہمہ گیر سلطنتوں کے بانی اور محافظ ہوتے ہیں لیکن تلوار کے کاموں میں ثبات نہیں، یہ صرف عارضی ثابت ہوتی ہے۔

۳- وقت کی مشین والا نجات دھندہ: یہ قدامت پرست ہوتا ہے اور مستقبلی۔ یہ بھی بالآخر تلوار اٹھاتے ہیں اور تلوارچلانے والوں کے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

۴- بادشاہ کے پس پردہ فلسفی: یہ افلاطون کا تجویز کردہ مشہور علاج ہے۔ اس میں بدیں وجہ ناکامی ہوتی ہے کہ فلسفی کے قطع تعلق اور سیاسی فرماں روا کے طریق جبر میں مطابقت کی کوئی صورت رونما نہیں ہوتی۔

۵- خدا بہ شکل انسان: اصل مقصد کے قریب پہنچنے کی جتنی کوششیں کی گئیں، وہ سب ناکام ہو گئیں، صرف یسوع ناصری موت کی تسخیر میں کامیاب ہوا۔

۲۱- انحلال کا زیر و بم

انحلال ایک نہج پر نہیں چلتا بلکہ اس میں پس پائی اور از سر نو اجتماع کا تبادل جاری رہتا ہے مثلاً ''دور مصائب'' کی شکست کے بعد ہمہ گیر سلطنت کا قیام از سرنو اجتماع کا بندوبست کر دیتا ہے، اس کے خاتمے کو آخری

پس پائی سمجھنا چاھیے - چوں کہ عام طور پر دور مصائب کی پس پائی کے بعد ایک اجتماع اور ھمہ گیر سلطنت کے اجتماع کے بعد ایک اور پس پائی پیش آتی ھے ، اس وجہ سے طبعی زیر و بم یہ بنتا ھے : پس پائی ، اجتماع ، پس پائی ، اجتماع ، پس پائی ، اجتماع ، پس پائی یعنی ساڑھے تین ضربیں - متعدد معدوم معاشروں کی تاریخوں سے اس کی مثالیں پیش کی گئی ھیں ، پھر اسے مغربی مسیحیت کی تاریخ میں استعمال کیا گیا ھے تاکہ معلوم ھو سکے ھمارا معاشرہ ارتقا کے کس مرحلے پر ھے -

۲۲- انحلال میں معیاریت

نشو و ارتقا کا نشان تفریق و امتیاز ھیں اور انحلال کا نشان معیاریت ھے - یہ باب ان مسائل کی تصریح پر ختم ھوتا ھے جن کا جائزہ آئندہ جلدوں میں لیا جائے گا -

چھٹا حصہ

ھمہ گیر سلطنتیں

۲۳- مقاصد یا ذرائع

اس مقام تک جو کچھ لکھا جا چکا ، اس کا ملخص پیش کیا گیا ھے ، نیز وجوہ بتائے گئے ھیں کہ بعد کے حصوں میں کیوں ھمہ گیر سلطنتوں ، ھمہ گیر مذھبی نظاموں اور بربری جنگی جتھوں کے بارے میں مزید غور و تحقیق ضروری ھے - کیا ھمہ گیر سلطنتوں کو تہذیبوں کے آخری دور سمجھنا چاھیے یا مزید نشو و ارتقا کی تمہیدیں قرار دینا چاھیے ؟

۲۴- لافانیت کا سراب

ھمہ گیر سلطنتوں کے شہری اکثر حالتوں میں نہ محض ان کے قیام کا خیر مقدم کرتے ھیں بلکہ انھیں لافانی سمجھ لیتے ھیں - جب یہ سلطنتیں

انتشار کے کنارے پر پہنچ جاتی ہیں ، اس وقت بھی مذکورہ بالا عقیدہ قائم رہتا ہے بلکہ سلطنتوں کے ناپید ہو جانے کے بعد بھی اس میں فرق نہیں آتا ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اس ادارے کا بھوت از سر نو نمودار ہو جاتا ہے مثلاً یونانی و رومی دنیا کی رومی سلطنت نے مغربی مسیحی دنیا کے ملحقہ معاشرے میں مقدس رومی سلطنت کی شکل اختیار کی ۔ اس کی توضیح کے لیے یہ واقعہ پیش نظر رکھ لینا چاہیے کہ ہمہ گیر سلطنت دور مصائب کے بعد بکھری ہوئی قوتوں کو اکٹھا کرنے کی ایک حرکت ہوتی ہے ۔

۲۵۔ مکھیو ! شہد بناؤ

ہمہ گیر سلطنت کے ادارے انجام کار اس کی ہستی کو محفوظ رکھنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں ، ساتھ ہی یہ دوسرے اداروں کے مقاصد پورا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔ خصوصاً داخلی پرولتار کے پیدا کردہ اعلیٰ مذاہب اپنے مقاصد ان کے ذریعے سے پورے کر لیتے ہیں ۔

۱۔ ہمہ گیر سلطنتوں کی ناقلیت : ہمہ گیر سلطنتیں اپنے دوائر میں نظم و یکسانی پیدا کر دیتی ہیں ، اس طرح اعلیٰ پیمانے کی ناقلیت کا ایک واسطہ اور ذریعہ مہیا ہو جاتا ہے ۔ یہ واسطہ اور ذریعہ محض علاقائی ریاستوں کے درمیان جغرافیائی اعتبار ہی سے نہیں جو پہلے الگ الگ تھیں بلکہ معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان مجلسی و اجتماعی حیثیت میں بڑی خوبی سے نقل و ایصال کا کام دیتا ہے ۔

۲۔ نفسیات امن : ہمہ گیر سلطنتوں کے حکمرانوں کو خود اپنی بقا کے لیے رواداری سے کام لینا پڑتا ہے ، اس سازگار حالت میں اعلیٰ مذہب اشاعت پاتے ہیں جیسا اس عام خیال سے واضح ہے (مثلاً جس کا اظہار ملٹن نے ولادت حضرت مسیح[۴] والی نظم میں کیا) کہ رومی سلطنت خدا کی طرف سے مسیحی کلیسا کے نفع کے لیے قائم ہوئی تھی ۔ تاہم یہ رواداری نہ عام ہوتی ہے اور نہ مطلق ؛ اس رواداری کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عسکریت کے بارے میں جذبہ افسردہ ہو جاتا ہے ، اس بناء پر باہر کے حملہ آوروں ——— بربریوں یا ہمسایہ تہذیبوں ——— کو فائدہ پہنچتا ہے ۔

۳- سامراجی ادارات کی صلاحیت خدمت :

وسائل حمل و نقل : سڑکوں ، بحری راستوں کو درست حالت میں قائم رکھنا حکومت کے علاوہ دوسروں کو بھی کام دیتا ہے مثلاً پولوس رسول نے رومیوں کی بنائی ہوئی سڑکوں سے تبلیغی سفروں میں فائدہ اٹھایا۔ دور جدید کی مشینی صنعت‌کاری نے حمل و نقل کا جو عالم‌گیر نظام قائم کیا ہے ، کیا آج کے اعلیٰ مذاہب ان سے بھی وہی فائدہ اٹھائیں گے ؟ اگر ایسا ہوا تو انھیں ایسے ہی مسائل سے سابقہ پڑے گا جن کی توضیح کے لیے مسیحی مبلغوں کی تاریخوں سے مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو ابتدائی دور میں انھیں غیر مسیحی دنیا میں پیش آئے۔

چھاؤنیاں اور نو آبادیاں : یہ تہذیب کے مقاصد بھی پورے کرتی ہیں اور حکومت کے بھی ، ساتھ ہی یہ پرولتاری کے عمل کو تقویت پہنچاتی ہیں جو معاشروں کی انحلال پذیری کا نشان ہے۔ ان سے بربری جنگی جتھے حد درجہ فائدہ اٹھاتے ہیں ، اعلیٰ مذاہب کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اسلام کی اشاعت سے مثالیں۔ متھرائیت (آفتاب پرستی) رومی سلطنت کی سرحد کے ساتھ ساتھ ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی تک پہنچتی رہی ، مسیحیت ایک نو آبادی سے دوسری نو آبادی میں گئی۔ اس سلسلے میں کارنتھ اور لیائنز کی اہمیت کی مثالیں پیش کی گئی ہیں جو انھیں مسیحی کلیسا کی ابتدائی تاریخ میں حاصل ہوئی ، یہ نو آبادیاں رومی سلطنت نے قائم کی تھیں۔

صوبے : متفاوت پالیسیوں کی مثالیں چین کی ہمہ گیر سلطنت سے پیش کی گئی ہیں اور ایک اعلیٰ مذہب نے صوبائی نظم و نسق کے ڈھانچے سے جو فائدہ اٹھایا ، اس کی توضیح مسیحی کلیسا کے نشو و ارتقا کی مثالوں سے کی گئی ہے۔

حکمرانی کے مرکز : ان کی موقعیت پر مختلف عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ جو لوگ ہمہ گیر سلطنتیں قائم کرتے ہیں ، ضروری نہیں کہ ان کا ابتدائی مرکز حکومت ہمیشہ کے لیے موزوں ثابت ہو ؛ چناں‌چہ مراکز حکومت اور ان کی تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ بعض ایسے مراکز حکومت بھی تھے جن کی کوئی سیاسی اہمیت باقی نہ رہی تاہم وہ مذاہب کے مراکز کی حیثیت سے قابل یادگار بن گئے۔

سرکاری زبانیں اور رسم الخط: ہمہ گیر سلطنتوں فرماں رواؤں کو سرکاری زبانوں کے انتخاب میں کن مسائل سے سابقہ پڑتا ہے اور ان کے حل کی مختلف صورتیں۔ بعض زبانوں مثلاً آرامی اور لاطینی کا رواج زمان و مکان میں اس درجہ وسعت پذیر ہوا کہ جن سلطنتوں میں وہ ابتداءً مروج ہوئی تھیں، ان کی حدیں بھی پیچھے رہ گئیں۔

قانون: اپنے نظام ہائے قانونی کو رعایا پر عائد کرنے کے سلسلے میں بھی ہمہ گیر سلطنتوں کے فرماں رواؤں کی روش مختلف رہی ہے۔ بعض سلطنتوں کے نظام ہائے قانونی سے ان گروہوں نے فائدہ اٹھایا جن کے لیے وہ وضع نہیں ہوئے تھے مثلاً رومی قانون سے مسلمانوں اور مسیحی کلیسا نے فائدہ اٹھایا اور حمورابی کے ضوابط سے موسوی قانون کے واضعین نے۔

تقویم، اوزان، پیمانے، زر: تقویم سازی کا مسئلہ اور مذہب سے اس کا گہرا تعلق۔ وقت پیمائی کے جو طریقے ہم نے اختیار کر رکھے ہیں، وہ جزواً رومی ہیں اور جزواً سمیری۔ انقلاب فرانس ان طریقوں میں انقلاب پیدا نہ کر سکا۔ اوزان اور پیمانے: دہ گنہ نظام اور دوازدہ گنہ نظام میں کش مکش۔ زر: اس کی اہمیت، یونانی شہروں میں اس کی ابتدا، جب یہ شہر لیڈیا کی سلطنت اور ہخامنشی سلطنت میں جذب ہوئے تو زر کا رواج بھی پھیل گیا۔ چینی دنیا میں کاغذی سکے کی ترویج۔

باقاعدہ فوجیں: رومی فوج مسیحی کلیسا کے لیے جوش و سرگرمی کا سر چشمہ بن گئی۔

سول سروس: آگسٹس، پیٹر اعظم اور ہندوستان میں برطانوی راج کی پالیسیوں کا مقابلہ کرکے سول سروس کے مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ سول سروس کی خصوصیات چین اور برطانوی ہند کے ملازموں میں۔ مغربی مسیحی دنیا کے بانی، تین بڑے پادری، رومی سول سروس کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔

شہریت: شہریت کی توسیع ایک حق ہے جو ہمہ گیر سلطنتوں کے بانی عطا کرتے ہیں۔ اس طرح مساوات کے وہ احوال پیدا ہوتے ہیں جن میں اعلیٰ مذاہب فروغ پاتے ہیں۔

ساتواں حصہ

ہمہ گیر مذہبی نظام

۲۶- ہمہ گیر مذہبی نظاموں اور تہذیبوں کا تعلق

متبادل تصور

۱- مذہبی نظام بہ حیثیت سرطان : مذہبی نظام ہمہ گیر سلطنتوں کے زوال پذیر دائروں میں نشو و نما پاتے ہیں لہٰذا مخالف معاصروں اور دور جدید کے مورخوں کا ایک طبقہ انہیں سرطان سمجھنے لگا ہے - اس نقطۂ نگاہ کی تقلیط کے وجوہ پیش کیے گئے ہیں - مذہب اپنے پیرووں میں اجتماعی فرائض کے احساس کو تباہ نہیں کرتے بلکہ تیز تر کرتے ہیں -

۲- مذہبی نظام بہ حیثیت پیلہ : تیسری نسل کی ہر تہذیب جو آج زندہ ہے ، اپنے پس منظر میں کسی مذہبی نظام کی حامل ہے جس کے ذریعے سے یہ دوسری نسل کی کسی تہذیب سے ملحق ہوئی - دور جدید کی مغربی تہذیب نے مسیحی کلیسا سے جو کچھ حاصل کیا ، اس کا تجزیہ کیا گیا ہے - اس کے برعکس دوسری نسل کی تہذیبیں کسی اور ذریعے سے پیش رو تہذیبوں کے ساتھ ملحق ہوئی تھیں - اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہم تاریخ کے متعلق اب تک جس نقشے کو درست مانتے آئے ہیں ، اس میں تبدیلی ہونی چاہیے -

۳- مذہبی نظام معاشروں کی اعلٰی صنف کی حیثیت میں :

(الف) نئی گروہ بندی : تہذیبوں کے عروج و زوال کو پہیے کے چکروں سے تشبیہ دی گئی ہے جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی گاڑی کو منزل مقصود پر پہنچا دے - مذہبی ترقی کے سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ ، حضرت موسیٰؑ ، عبرانی انبیاؑ اور حضرت مسیحؑ نے جو قدم اٹھائے ، وہ علی الترتیب سمیری ، مصری ، بابلی اور یونانی معاشروں کے انحلال کی پیداوار تھے - آج دنیا جس اتحاد کی طرف قدم بڑھا رہی ہے ، کیا اس سے مزید پیش قدمی کی امید پیدا ہوتی ہے ؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات

میں ہے تو آج جو اعلیٰ مذاہب موجود ہیں ، انہیں مشکل سبق سیکھنے چاہیں۔

(ب) مذہبی نظاموں کے ماضی کی اہمیت : اس حقیقت کا اعتراف کہ جو کردار مذہب کے ذمے لگایا گیا ہے ، مذہبی نظام کا سابقہ ریکارڈ پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس کردار کے اہل نہیں سمجھے جا سکتے ۔

(ج) قلب و دماغ میں کش مکش : دور جدید کی سائنس کا فشار مذہب پر اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں ۔ ابتدائی دور کے مسیحی کلیسا اور یونانی فلسفے میں بھی کش مکش شروع ہوئی تھی ، وہ مفاہمت پر ختم ہو گئی ۔ فلسفیوں نے مسیحی الہام کی حقیقت کو تسلیم کر لیا ، شرط یہ لگائی کہ الہام کو فلسفیوں کی زبان کا لباس پہنا دیا جائے ۔ یہ فرسودہ یونانی پارچے مدت سے پریشانی کا سامان بنے ہوئے ہیں ۔ اس کی وجہ سے مسیحی کلیسا کو ایسے کئی غیر مذہبی مقاصد کی حمایت کرنی پڑی جن سے مسیحیت کو کوئی تعلق نہ تھا ۔ مذہب کو چاہیے کہ ذہنی علوم کے ان تمام دوائر کو سائنس کے لیے چھوڑ دے جن پر سائنس اپنا حق جمانے میں کامیاب ہو جائے ۔ مذہب اور سائنس کو حقیقت کی دو الگ الگ قسموں سے تعلق ہے ، نفس کے تحت الشعور کے متعلق دور حاضر کا علم النفس اختلاف کی نوعیت پر گہری روشنی ڈالتا ہے ۔

(د) مذہبی نظاموں کا مستقبل : مذہبی نظاموں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان سب میں ایک سچا خدا مشترک ہے ۔ یہ چیز انہیں معاشروں کے دوسرے نمونوں سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے ۔ اس امتیاز کی توضیح کی گئی ہے ۔

۲۷۔ مذہبی نظاموں میں تہذیبوں کا کار منصبی

۱۔ تہذیبیں تشبیبوں کی حیثیت میں : مسیحی کلیسا نے جو اصطلاحیں یونانی تہذیب سے لیں اور انہیں نئے معنی پہنائے ، ان کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ یہ تلطیف کی مثالیں ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونانی تہذیب نے مسیحیت کے لیے تشبیب کا کام دیا ۔

۲۔ تہذیبیں رجعت قہقہری کی صورت میں : ان اصطلاحات کو مغربی معاشرے نے دنیوی مقاصد کے لیے استعمال کیا تو ان کی حیثیت گر گئی اور

معاشرہ مذکورہ مسیحی کلیسا ہی میں سے پیدا ہوا تھا مگر اس سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔

۲۸- زمین پر عسکریت کی دعوت مقابلہ

ملحق تہذیبیں مذہبی نظاموں کے غلط اقدامات کے باعث ان سے علاحدگی اختیار کرتی ہیں۔ جب مذہب کی روح زمین پر جنگ جوئی کی غرض سے کلیسائی اداروں کی شکل میں منتقل ہوتی ہے تو تہذیبوں کی علاحدگی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ غلط اقدامات کے تین نمونوں کا ذکر: (۱) سیاسی سامراج دنیوی حاکموں کو رنجش کا معقول موقع بہم پہنچاتا ہے اس لیے کہ وہ ان کے فرائض کی بجا آوری میں حارج ہوتا ہے۔ (۲) اقتصادی کامیابی جو اقتصادی واجبات میں دل لگا کر کام کرنے کا طبعی نتیجہ ہوتی ہے۔ (۳) کسی مذہبی نظام کا اپنے وجود کو بت بنا کر پرستاری کی دعوت دینا۔

کیا مذہب اپنے سفر کے اختتام پر کسی ''عہد زریں'' کی امید نہیں دلاتا؟ ممکن ہے عالم عقبیٰ میں دلاتا ہو مگر اس عالم میں نہیں دلاتا۔ پہلا گناہ ایک ایسی مشکل پیش کرتا ہے جس سے گزرنا ممکن نہیں۔ دنیا خدا کی سلطنت کا ایک صوبہ ہے لیکن یہ صوبہ سر کشی اختیار کر چکا ہے اور بہ ظاہر حالت ایسی ہے کہ یہ سرکش ہی رہے گا۔

آٹھواں حصہ

سورماؤں کا زمانہ

۲۹- المیے کی رفتار و روش

۱- ایک مجلسی بند: کسی انحلال پذیر تہذیب کی ہمہ گیر سلطنت اور سرحد پار کے بربریوں کے درمیان جو فوجی سرحد ہوتی ہے، جب وہ

ایک معین شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس کے مجلسی و نفسیاتی نتیجے میں سورماؤں کا دور یا دور شجاعت پیدا ہوتا ہے ، اسے ہم ایک وادی کے آر پار بند سے تشبیہ دے سکتے ہیں؛ یہ بند پانی کا ذخیرہ پیدا کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اس تمثیل کے متعلقات کو اس حصے اور آئندہ حصوں میں کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

۲- دباؤ کا تراکم : سرحد پار کے بربری جس تہذیب کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں ، جب اس کی فوجی ٹکنیک سیکھ لیتے ہیں تو سرحد یا بند پر ان کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ تہذیب کے محافظ اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بربریوں کو حفاظت کی غرض سے ملازم رکھیں۔ یہ تنخواہ دار اپنے آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سلطنت کے قلب پر آخری ضرب لگا دیتے ہیں۔

۳- طوفان اور اس کے نتائج : فاتح بربری اپنی کامیابی ہی کے باعث ناگزیر طور پر تباہ ہو جاتے ہیں ، وہ جو نازک صورت حالات پیدا کر دیتے ہیں ، اس سے عہدہ برآ ہونے کے اہل نہیں ہوتے۔ با ایں ہمہ وہ نزع و احتضار کی حالت میں افسانہ ہائے شجاعت پیدا کرتے ہیں اور کردار کے ایسے اعلیٰ نمونے سامنے لاتے ہیں جنھیں ہومر نے Aidos (شرم) اور Nemesis (غصہ ، انتقام) سے تعبیر کیا اور امویوں نے ''حلم'' سے۔ بد نظمی کا دور شجاعت حیرت انگیز حد تک ناگہانی طور پر ختم ہو جاتا ہے ، اس کے بعد تاریکی کا دور شروع ہو جاتا ہے جس میں نظم و قانون کی قوتیں تدریجاً اپنے آپ کو بحال کرتی ہیں۔ دور خلا ختم ہوتا ہے اور نئی تہذیب کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

۴- خیال اور حقیقت : ادوار کے متعلق ہیسئڈ کی عجیب سکیم ــــــــ سنہری ، روپہلی ، برنجی اور آہنی ــــــــ آخری دو دوروں کے درمیان سورماؤں کا دور رکھ دیا گیا ہے۔ در حقیقت یہ برنجی دور ہے جسے دوبارہ نئے نام سے پیش کر دیا گیا لیکن اس سلسلے میں تاریخی حقائق پر نظر رکھنے کے بجائے ہومر کی پرواز تخیل سے کام لیا۔ فاتح بربریت نے جو رزمیہ شاعری پیدا کی ، اس کی عظمت و شان نے ہیسئڈ کو دھوکے میں ڈال دیا۔ وہ اس ''عہد تاریک'' کا شاعر تھا جو سورماؤں کے دور کے بعد آیا۔ تیسری رایش کے علم داروں نے بھی اس سے دھوکا کھایا ، وہ

نارڈک بربریت کے بھورے بالوں والے عفریتوں کی عظمت و شان کے گیت گاتے رہے۔ بربریوں نے ایک خدمت ضرور انجام دی۔ دوسری نسل کی جن تہذیبوں نے اعلیٰ مذاہب پیدا کیے، وہ بربریوں کی اتصالی کڑی ہی کی وجہ سے پہلی نسل کی تہذیبوں سے ملحق ہوئے۔

نوٹ: عورتوں کا غیر طبعی اقتدار

اس امر کی تشریح کہ شیطان صفت عورتیں عہد شجاعت کے الم ناموں میں کتنا نمایاں کردار ادا کرتی ہیں، عض عہد شجاعت کے افسانوں ہی میں نہیں بلکہ حقیقت میں۔

نواں حصہ

تہذیبوں کے درمیان مکانی تعلقات

۳۰- دائرۂ مطالعہ میں توسیع

تہذیبوں کا مطالعہ دور تکوین، دور نشو و ارتقاء اور دور شکست میں الگ الگ رکھ کر خاصی حد تک کیا جا سکتا ہے لیکن وہ انحلال کے آخری دور میں پہنچتی ہیں تو یہ دائرۂ مطالعہ قابل فہم نہیں رہتا۔ اس دور میں ان کے روابط و علائق کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے، بعض جغرافیائی خطے ـــــــــــ شام اور جیحوں و سیحوں کے طاس ـــ ان روابط و علائق کی سرگزشتوں میں برابر نمایاں رہے ہیں اور یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں کہ یہی خطے یا ان کے قریبی ملحقات اعلیٰ مذاہب کی پیدائش گاہوں ہی کے حامل ہیں۔

۳۱- معاصر تہذیبوں کے درمیان مقابلوں کا موازنہ

۱- <u>نقشہ عمل:</u> ہم اس موازنے کا آغاز دور جدید کی مغربی تہذیب

اور دوسری معاصر تہذیبوں کے مقابلے سے کرنا چاہتے ہیں - مغربی معاشرے کی تاریخ میں دور جدید کا آغاز دو واقعوں سے ہوتا ہے ؛ ایک پندرھویں صدی مسیحی کے اختتام سے ذرا پہلے پیش آیا اور دوسرا سولھویں کا آغاز ہو جانے پر رونما ہوا - پہلا یہ تھا کہ بحر پیمائی کی ٹکنیک میں درجۂ کمال مہارت پیدا کر لیا گیا ؛ دوسرا یہ تھا کہ قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحی دولت اقوام کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا ، اسے صرف پاپائیت نے جوڑ رکھا تھا - تحریک اصلاح مذہب در اصل اس عمل ارتقا میں ایک منزل تھی جو تیرھویں صدی مسیحی میں شروع ہو چکا تھا اور سترھویں صدی میں اتمام پر پہنچا لیکن تحریک اصلاح مذہب نے بھی اسی نسل کو جا لیا جس نے کولمبس اور واسکوڈےگاما کے بحری سفروں کا مشاہدہ کیا تھا - اب ہم زمانی لحاظ سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر مغربی معاشرے کے دور قرون وسطیٰ کے تعلقات کا جائزہ لیں گے جو دو حریف معاشروں سے اس نے پیدا کیے ، دونوں سے اسے سابقہ پڑا تھا - بعد ازاں یونانی معاشرے کے تعلقات پر غور کریں گے ، آخر میں اسی قسم کے ابتدائی تعلقات پر ایک نظر ڈال لیں گے -

دور جدید کے مغرب کے تعلقات پر بات چیت کرتے ہوئے ہمیں معلوم ہوگا کہ اگرچہ تاریخ کے ان ابواب کا ہمیں تفصیلاً علم ہے تاہم ان میں سے اکثر ——— اور شاید سب کے سب ——— ناتمام رہ گئے اور ہر ایک کے آخر میں استفہامی علامت لگی ہوئی -

۲- نقشہ عمل کے مطابق اقدامات :

(الف) دور جدید کی مغربی تہذیب کے مقابلے

(i) دور جدید کا مغرب اور روس : روسی آرتھوڈکس مسیحیت کی اصل جاگیر پر پولینڈ اور لتھوانیا کے حملے شروع ہوئے اور فتوحات عمل میں آئیں - پولینڈ اور لتھوانیا مغربی یورپ کی علاقائی حکومت تھی اور یہ حملے چودھویں صدی سے شروع ہوئے ——— نقصانات کی پوری تلافی ۱۹۴۵ء تک نہ ہو سکی تھی - مغربی ثقافت کی تنویر نے پیٹر اعظم کی طرف سے خیر مقدم کا جواب (ہیرودیسی) پایا لیکن دو صدی تک ان خطوط پر چلتے رہنے کے بعد جنہیں مغرب کی تصدیق حاصل تھی ، پیٹر کے شروع کیے ہوئے طور طریقوں کا نظام پہلی عالم گیر جنگ کی امتحان گاہ میں

آزمایا گیا اور ناکام ہوا لہٰذا اسے نکال کر اس کی جگہ ایک ملحدانہ مغربی نظام یعنی کمیونزم نے لے لی۔

(ii) دور جدید کا مغرب اور آرتھوڈکس مسیحیت: اس معاشرے میں جو سیاسی اعتبار سے ایک اجنبی ہمہ گیر سلطنت ——— عثمانی سلطنت ——— کے تحت آ گیا تھا، دور جدید کی مغربی ثقافت ساتویں صدی مسیحی سے روس کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف نہیں بلکہ نیچے سے اوپر کی طرف نفوذ کرتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ فناری یونانیوں کے زیر اثر عثمانی سلطنت مغربیت کے طور طریقے اختیار کر لیتی۔ بد قسمتی سے قومی تحریکات بروے کار آ گئیں اور سلطنت علاقائی حکومتوں میں بٹ گئی۔ روس ان قوموں کی قیادت حاصل کرنے میں ناکام رہا، نہ آرتھوڈکس معاشرے کے اتحاد کی بنیاد پر اسے یہ قیادت ملی اور نہ سلافی قوم کے اتحاد کی بناء پر البتہ روس نے کمیونزم کا اتحاد ان میں سے بعض پر عائد کر دیا ہے۔

(iii) دور جدید کا مغرب اور ہندو دنیا: یہاں مغرب نے ایک اجنبی ہمہ گیر سلطنت قائم کی جس نے سابقہ اجنبی سلطنت یعنی مسلم مغل راج کی جگہ لے لی جو پہلے ہی اپنا وقار کھو کر ختم ہو چکا تھا۔ برطانوی راج نے منتخب ہندوستانیوں کو اپنے ماتحت ملازم رکھا جس طرح عثمانی بادشاہوں نے مشرقی آرتھوڈکس مسیحی باشندوں میں سے منتخب افراد کو ملازم رکھا تھا۔ یہ ہندوستانی ملازمین راج کو ہندوستانی بنانے میں کامیاب ہوئے (جہاں فناری یونانی ناکام ہوئے تھے) اور پاکستان کی علیٰحدگی کے باوجود انھوں نے ہندوستان کے بڑے حصے کو محفوظ رکھا۔ برطانوی ہند کی سول سروس کے اچھے اور برے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، نیز آبادی کا مسئلہ زیر غور لایا گیا ہے جو ہندوستان سے مستقبل کے افق پر ایک بادل کی صورت میں نمایاں ہے۔

(iv) دور جدید کا مغرب اور اسلامی دنیا: مغرب میں دور جدید کا افتتاح ہوا تھا تو دو اسلامی معاشرے ——— عربی اور ایرانی ——— مغربی دنیا اور روس سے دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرف جانے والے خشکی کے تمام راستوں کو سنبھالے بیٹھے تھے لیکن مسلمانوں کی اس اعلیٰ حیثیت

میں سنسنی پیدا کرنے والا تغیر قریب آ گیا تھا اور یہ تغیر مسلمانوں کے لیے نقصان رساں تھا۔ توازن قویٰ میں جب سے یہ تغیر رو نما ہوا ہے، متعدد مسلمان حکومتیں پیٹر اعظم کی ہیرو دیس والی پالیسی اختیار کرتی رہی ہیں اور ان کی کامیابی کے درجات مختلف تھے۔ اسلامی دنیا پرانی دنیا کی ابتدائی چار تہذیبوں میں سے تین کے مرزبوموں پر مشتمل ہے اور ان خطوں کی طبعی زرعی حالت میں اس وجہ سے مزید اضافہ ہو گیا ہے کہ جا بجا تیل کے چشمے نکل آئے ہیں؛ اس وجہ سے یہ علاقے بیسویں صدی کی دنیا میں مغرب اور روس کے درمیان کش مکش کے سلسلے میں ''نیباتھ کا تاکستان''[1] بن گئے ہیں۔

(v) دور جدید کا مغرب اور یہودی: یہودی قوم یک آہنگ علاقائی حکومتوں کے مغربی نظام میں سما نہ سکتی تھی۔ تاریخی حالات کا جائزہ لیا جائے تو مغرب کی تاریخ کے دور افتتاح سے نہیں بلکہ مغربی مسیحی معاشرے کے آغاز کے وقت سے تین دور معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں (مثلاً مغربی گاتھوں کے عہد میں) اگرچہ یہودی غیر ہر دل عزیز تھے اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ ہوتا تھا لیکن وہ مفید سمجھے جاتے تھے اس لیے کہ اس وقت تک مغربی مسیحی ''مالی اعتبار سے بچے'' تھے۔ دوسرے دور میں مغربی مسیحیوں نے ''اپنے یہودی آپ بننا'' سیکھ لیا اور یہودیوں کا اخراج شروع ہو گیا (مثلاً انگلستان سے یہودی ۱۲۹۱ء میں نکالے گئے)۔ تیسرے دور میں مغربی معاشرہ مالی اعتبار سے اتنی صلاحیت پیدا کر چکا تھا کہ یہودیوں کو واپسی کی اجازت دے دی گئی (مثلاً انگلستان نے ۱۶۵۵ء میں) اور کاروبار میں ان کے اختصاص کا خیر مقدم کیا گیا، پھر آزاد خیالی کا دور آگیا لیکن اس پر اصل کہانی ختم نہ ہوئی۔ کتاب کا یہ حصہ سامیوں کی مخالفت کی تحریک اور صیہونیت کے جائزے پر ختم ہوا ہے۔

(vi) دور جدید کا مغرب، مشرق بعید اور امریکہ کی وطنی تہذیبیں:

۱۔ نیباتھ (Naboth) کا تاکستان سامریہ کے بادشاہ اخیاب کے محل سے ملا ہوا تھا، بادشاہ یہ لینا چاہتا تھا۔ نیباتھ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ کی بیوی ایزبل نے ایک تدبیر سے نبوت کو مروا دیا اور تاکستان پر قبضہ کر لیا۔

ان تہذیبوں کو مغرب سے اس وقت تک کوئی تعلق پیدا نہ ہوا جب تک یہ دور جدید میں داخل نہ ہو گیا - بہ ظاہر امریکی تہذیبیں کاملاً مٹا دی گئیں (اگرچہ یہ مغالطہ آمیز ہو سکتا ہے) - دور جدید کے مغرب نے چین اور جاپان پر جو اثرات ڈالے، وہ حیرت انگیز حد تک متوازی جا رہے ہیں۔ دونوں نے مغربی ثقافت کو ابتدائی دور جدید کی مذہبی شکل میں قبول کر لیا، پھر اسے ٹھکرا دیا؛ بعد ازاں متاخر دور جدید کی مشینی صنعت کاری کا اثر ہوا - دونوں کی سرگزشتوں میں جو فرق ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ چین وسیع سلطنت ہے، جاپان ایک دوسرے سے مربوط جزیروں پر مشتمل ہے - یہ سطریں سپرد قلم کرتے وقت دونوں معاشرے گہن میں آئے ہوئے ہیں؛ چین کمیونزم کے زیر اثر ہے اور جاپان امریکہ کے کنٹرول میں ہے - دونوں کو ہندوستان کی طرح آبادی کے مسئلے سے سابقہ پڑا ہوا ہے -

(vii) دور جدید کے مغرب اور اس کے معاصروں کے درمیان مقابلوں کے نمایاں پہلو | دور جدید کی مغربی تہذیب دراصل طبقۂ وسطیٰ کی تہذیب ہے - جن غیر مغربی تہذیبوں میں طبقۂ وسطیٰ نشو و ارتقا پا چکا تھا، انہوں نے مغربی خصوصیات کا خیر مقدم کیا - جس غیر مغربی تہذیب کے حکمرانوں کے پاس مغربیت کے طور طریقوں کو فروغ دینے کے لیے طبقۂ وسطیٰ موجود نہ تھا، اس نے اس مقصد کے لیے مصنوعی طور پر یہ طبقۂ اہل علم کی شکل میں پیدا کر لیا - یہ اہل علم انجام کار اپنے آقاؤں کے مخالف بن جاتے ہیں -

(ب) قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحی دنیا سے مقابلے :

(i) صلیبی مہموں کا مد و جزر : قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحی دنیا نے گیارھویں صدی میں توسیع شروع کی تھی، پھر یہ سلسلہ درہم برہم ہو گیا اور بعض سرحدوں سے دو صدی بعد کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی اگرچہ تمام سرحدوں سے نہیں - اس توسیع اور بعد کی مراجعت کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے -

(ii) قرون وسطیٰ کا مغرب اور سریانی دنیا : صلیبی جنگ جوؤں اور ان کے مسلمان حریفوں میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں - نارمن ''فرینک'' اور سلجوقی ترک دونوں کچھ مدت پیش تر بربری تھے؛ جس معاشرے میں وہ داخل ہوئے تھے، اس کے اعلیٰ مذہب کے وہ حلقہ بہ گوش بنے اور بعض

پہلوؤں سے انہوں نے معاشرے پر اقتدار حاصل کر لیا۔ سریائی تہذیب کی ثقافتی تنویر کم ترقی یافتہ مغربی مسیحی معاشرے میں پہنچی اور اس کی شاعری، تعمیرات، فلسفے اور سائنس پر اثر ڈالا۔

(iii) قرون وسطیٰ کا مغرب اور یونانی آرتھوڈکس مسیحی دنیا: دونوں مسیحی معاشروں میں اتنی نفرت و مخالفت تھی کہ ان میں سے کسی کو ویسی نفرت اپنے مسلمان ہمسایوں سے نہ تھی۔ اس نفرت کی مثالیں ایک طرف لمبارڈی کے بشپ لیوٹ پرانڈ کی تحریرات سے پیش کی گئی ہیں جسے قسطنطنیہ میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا، دوسری طرف اس کا نقشہ صلیبی جنگ جوؤں کی ان تصویروں سے پیش کیا گیا جو اینا کومنینا نے اپنی تاریخ میں کھینچی ہیں۔

(ج) پہلی دو نسلوں کی تہذیبوں کے درمیان مقابلے:

(i) سکندر کے بعد کی یونانی تہذیب کے ساتھ مقابلے: اس دور میں یونانی تہذیب کو پرانی دنیا کی ہر معاصر تہذیب سے مقابلے پیش آئے اور یونانی تنویر سے جو اثرات پیدا ہوئے، وہ اس وقت تک بروے کار نہ آ سکے اور مکمل نہ ہو سکے جب تک یونانی معاشرے کے انتشار پر متعدد صدیاں نہ گزر گئیں۔ یونانی تہذیب یونانی فوجوں کی فتوحات سے بھی بہت آگے پہنچی مثلاً چینی دنیا میں۔

سکندر کا دور فتوحات یونانی تاریخ میں ویسی ہی توسیع کا دور ہے جیسی مغربی مسیحی دنیا میں سمندروں کی تسخیر سے ہوئی۔ مغرب دور جدید میں مذہب کے پہلے —— مسیحیت —— سے آزادی حاصل کر رہا تھا، اس کے برعکس یونانی تہذیب میں ایسا کوئی مذہبی پیلہ موجود نہ تھا اور مذہب کے لیے اس کی طلب روز افزوں تھی۔

(ii) سکندر سے پیش تر یونانی تہذیب کے ساتھ مقابلے: بحیرۂ روم کے طاس پر قبضہ جمانے کے لیے تین حریفوں کے درمیان مقابلہ شروع ہوا تھا: ان میں سے ایک حریف سکندر سے پیش تر کا یونانی معاشرہ تھا، دوسرا سریائی معاشرہ، تیسرا ھٹی معاشرے کا متحجر بقیہ حصہ تھا یعنی اٹرسکن۔ سریائی معاشرے نے ابتدائی دور میں فونیقیوں کی بحری قوت کی شکل میں مظاہرہ کیا اور آخری دور میں ھخامنشی سلطنت کی شکل میں۔ اس دور میں یونانیوں نے جو سب سے بڑھ کر اہم فتح حاصل کی، یہ تھی کہ رومہ کو یونانیت

کے رنگ میں رنگ دیا ، یہ کارنامہ بالواسطہ انجام دیا گیا یعنی اس سے پیش‌تر اٹرسکن یونانیت کے طور طریقے اختیار کر چکے تھے (ان سے رومیوں نے یہ طریقے لے لیے) -

(iii) موٹھ اور گیہوں : تہذیبوں کے درمیان مقابلوں کا صرف ایک مفید ثمرہ ہوتا ہے یعنی انتظامات امن - پہلی نسل کی تہذیبوں ——— ہندی ، چینی ، مصری ، سمیری ——— پر ایک نظر ڈالی گئی ہے -

۳۲- معاصروں کے درمیان مقابلوں کا ڈراما

۱- مقابلوں کی سلسلہ بندی : عسکری سطح پر ایک فریق کی طرف سے دعوت مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرے فریق کی طرف سے دعوت مقابلہ دی جاتی ہے ، اس طرح توازن کی بحالی کے بعد جوابی اقدامات کیے جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اقدامات پر مشتعل کیا جاتا ہے - شرق و غرب کے درمیان اس قسم کے مقابلوں کے ایک سلسلے کا سراغ لگایا گیا ہے جس کا آغاز یونان پر ہخامنشی سلطنت کی یورش سے ہوا اور یہ بیسویں صدی تک مغربی سامراج کے رد عمل تک چلا آیا ہے -

۲- جوابات کا تنوع : صرف عسکری جواب آخری ممکن جواب نہیں - کمیونسٹ روس نے نظریاتی جنگ کے ہتھیاروں سے اپنی تقویت کا بندوبست کیا ہے - جہاں عسکری جواب ممکن نہ تھا یا اس کے لیے سعی کی گئی اور ناکامی ہوئی تو وہاں بعض مفتوح اقوام نے اپنی انفرادی حیثیت بحال رکھی اور اپنے مذہب کے زبردست نشو و ارتقا پر توجہ مرتکز کر دی - اس جواب کی معیاری مثال یہودی اس وقت سے بنے ہوئے ہیں جب انہیں پہلی مرتبہ منتشر ہونا پڑا - اس سلسلے میں اعلیٰ ترین جواب اعلیٰ مذہب ہوتا ہے جو انجام کار فاتحین کو مسخر کر لیتا ہے -

۳۳- معاصروں کے درمیان مقابلوں کے نتائج

۱- ناکام حملوں کے بعد کی پیداوار : ایک جارحانہ اقدام میں کامیاب شکست کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فاتح عسکریت میں درجۂ اختصاص پیدا کر لے اور انجام کار تباہ ہو جائے - ہخامنشی حملہ آوروں کے مقابلے میں جیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پچاس سال کے اندر اندر یونانی تہذیب معرض شکست میں آ گئی -

(۲) کام یاب حملوں کے بعد کی پیداوار :

(الف) معاشرے پر اثرات : جارحانہ اقدامات کرنے والی تہذیب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اسے جو مجلسی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ، یہ ہوتی ہے کہ اجنبی مفتوح کی ثقافت قطرہ قطرہ ہو کر اس تہذیب کی جوئے حیات میں شامل ہوتی جاتی ہے ۔ جارحانہ اقدام کے ہدف پر بھی ایسا ہی اثر پڑتا ہے لیکن وہ زیادہ پُر پیچ ہوتا ہے ۔ غیر مغربی معاشروں میں مغربی نظریات و ادارات کا اجرا عموماً حوصلہ فرسا نتائج کا موجب ہوتا ہے اس لیے کہ ایک شخص کا گوشت دوسرے کے لیے زہر ہو سکتا ہے ۔ اجنبی ثقافت کے کسی ایک عنصر کو جاری کرنا اور دوسروں کو خارج رکھنا لازماً ناکامی پر منتج ہوتا ہے ۔

(ب) روح کے جوابات :

(i) انسانی خصائص سے محرومی : کام یاب حملہ آور مفتوح کو انسانیت سے فرو تر سمجھ لیتا ہے ، اس طرح انسانی اخوت سے انکار کیا جاتا ہے ۔ اگر اسے ''کافر'' قرار دیا جائے تو وہ تبدیل مذہب سے اپنا انسانی درجہ دوبارہ حاصل کر سکتا ہے ، اگر اسے بربری قرار دیا جائے تو وہ تہذیب کا امتحان پاس کر کے اپنے اصل درجے پر فائز ہو سکتا ہے ؛ لیکن اگر اسے ''نیٹو'' (دیسی باشندہ) قرار دیا جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے آقا کا تختہ اُلٹے بغیر یا اسے اپنے مذہب کے حلقہ بہ گوش بنائے بغیر اس کے لیے کوئی راہ نجات نہیں رہتی ۔

(ii) مذہبی جنون اور ہیرودیسیت : یہ اصطلاحات فاتح کی خصوصیات کامل رد اور قبول کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ رہی ہیں لیکن گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امتیاز و فصل اتنا واضح نہیں جتنا بادی‌النظر میں دکھائی دیتا ہے ۔ اس نکتے کو دور جدید کے جاپان نیز گاندھی اور لینن کی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے ۔

(iii) تبلیغ انجیل : ابتدائی دور کے مذہبی جنونیوں اور ہیرودیسیوں کی خود شکنی کے مقابلے میں پولوس رسول کے کارنامے کو پیش کیا گیا ہے ۔

نوٹ

ایشیا اور یورپ ، حقائق و اوہام

ایشیا اور یورپ کے نام مقابل کے ساحلی علاقوں کے لیے تجویز ہوئے تھے جن سے یونانی ملاحوں کو بحیرۂ ایجہ سے بحیرۂ اسود میں جاتے وقت سابقہ پڑا ۔ ان اصطلاحوں کے ساتھ سیاسی اور ثقافتی اہمیت وابستہ کر دینے کا نتیجہ پریشان خیالی کے سوا کچھ نہیں ہوا ۔ یورپ در اصل یوریشیا کے بر اعظم کا ایک حصہ ہے جس کی حدیں ٹھیک ٹھیک متعین نہیں ہوئیں ۔

دسواں حصہ

تہذیبوں کے درمیان زمانی تعلقات

۳۴۔ مختلف دوائر میں احیاء کا جائزہ

۱۔ تمہید : احیاء سے کیا مراد ہے ؟ لفظ احیاء کی اصل بتائی گئی ہے ، نیز یہ واضح کیا گیا ہے کہ مطالعہ تاریخ میں اسے کن معنی میں استعمال کیا گیا ہے ۔

۲۔ سیاسی افکار و ادارات کا احیاء : متاخر قرون وسطیٰ کا اطالوی احیاء پہلے شروع ہوگیا تھا اور اس نے ادبی یا فنی سطح کے بجائے سیاسی سطح پر زیادہ پائدار اثر ڈالا ۔ شہری ریاستیں ، لا دینی بادشاہیاں ، مقدس رومی سلطنت ۔ کلیسائی تاج پوشی عہد نامۂ قدیم کی ایک رسم کا احیاء تھی ۔

۳۔ نظام ہائے قانون کا احیاء : مشرق آرتھوڈکس مسیحی دنیا اور مغربی مسیحی دنیا میں رومی قانون کا احیاء ، کلیسا اور حکومت کے لیے اس کے اثرات ۔

۴۔ فلسفوں کا احیاء : مشرق بعید کے معاشرے میں چین کے اندر کنفیوشیئس کے فلسفے کا احیاء اور قرون وسطیٰ کی مغربی مسیحی دنیا میں

ارسطو کے یونانی فلسفے کا احیاء متعدد حیثیتوں سے متوازی واقعات تھے۔ سابق الذکر (کنفیوشیئس کا فاسفہ) اس وقت تک زندہ رہا جب تک بیسویں صدی کے آغاز پر دور جدید کی مداخلت پیشہ مغربی خصوصیات نے اسے شکست نہ دی۔ آخر الذکر کو پندرھویں صدی میں یونانی ادبیات کے احیاء نے متزلزل کر دیا، سترھویں صدی میں بیکن کی سائنٹیفک تحریک نے اسے آخری شکست دی۔

۵- السنہ و ادبیات کا احیاء: اس دائرے میں احیاء کے لیے بادشاہوں نے بڑا نمایاں حصہ لیا مثلاً بعض چینی شاھنشاھوں نے بڑے بڑے کتب خانے جمع کیے۔ اٹلی میں یونانی السنہ و ادبیات کا جو احیاء ھوا، اس سے پیشتر کارولنجی حکم رانوں کے ماتحت احیاء کی ایک ناکام تحریک جاری ہو چکی تھی اور اس کی جڑیں نارتھمبریا کے احیاء میں ملتی ھیں۔ احیاء اس وقت تک کام یاب نہیں ھو سکتا جب تک معاشرہ نشو و ارتقا کی اس خاص سطح پر نہ پہنچ جائے جہاں وہ مردہ تہذیب تھی جس کے بھوت کو از سر نو کھڑا کیا جا رہا ھے، اسی حالت میں معاشرہ ساحری کا کرشمہ دکھا سکتا ھے۔

مرئی فنون کا احیاء: مغرب کی مثال کے علاوہ جسے عام طور پر احیاء سے تعبیر کیا جاتا ھے، متعدد دوسری مثالیں پیش کی گئی ھیں۔ احیاء کے عمل کا سراغ تعمیرات، مجسمہ تراشی اور مصوری میں لگایا گیا ھے۔ تینوں شعبوں میں احیاء کا نتیجہ یہ ھوا کہ جدت معطل ھو گئی۔

۷- مذھبی نظریات و ادارات کا احیاء: یہودیت نے اپنے کام گار مسیحی مولود کے بارے میں حقارت آمیز روش اختیار کی اور مسیحی کلیسا یہودیت کے تصورات توحید و بت پرستی کے تعلق میں مبہم روش پر کاربند ھوا، ان دونوں معاملوں پر بحث کی گئی ھے۔ سولھویں صدی سے پروٹسٹنٹوں نے سبت پرستی اور بائیبل پرستی پر جو زور دیا، وہ اس امر کی واضح مثال ھے کہ خود مغربی مسیحیت کے اندر یہودیت کا احیاء بڑی قوت سے ھوا اور ھر دل عزیز ھو گیا۔

گیارھواں حصہ

تاریخ میں قانون اور آزادی

۳۵- صورت مسئلہ

۱- قانون کا مفہوم : قانون قدرت اور قانون الٰہی کے درمیان فرق -

۲- دور حاضر کے مغربی مؤرخوں کا انکار قانون اخلاق : تاریخ کے متعلق پہلے یہ تصور تھا کہ اس کے ذریعے سے خدا اپنی مشیت کا اظہار کرتا ھے ، یہ تصور بوسوے کے زمانے تک قائم رھا ، اب بے وقعت ھو چکا ھے - لیکن سائنس دان ـــــــــ جنھوں نے تحقیق کے مختلف دوائر میں قانون الٰہی کی جگہ قانون قدرت کو دے دی ھے ـــــــــ اس بات پر بے حد پریشان ھیں کہ تاریخ کو بے آئین کی حالت میں چھوڑ دیں جہاں کسی واقعے سے کوئی واقعہ پیدا ھو سکتا ھے جیسا کہ ایچ - اے - ایل فشر کا نظریہ ھے -

۳۶- قانون قدرت کے روبرو انسانی معاملات کی جواب دھی

۱- شہادت کا جائزہ

(الف) افراد کے نجی معاملات : انشیورنس (بیمہ) کمپنیوں کا انحصار انسانی معاملات کی باقاعدگی پر ھے -

(ب) دور جدید کے مغربی معاشرے کے صنعتی معاملات : ماھرین اقتصادیات تجارتی دوروں کی طوالت امواج کا حساب لگا لیتے ھیں -

(ج) علاقائی حکومتوں کی رقابتیں ؛ توازن قویٰ : متعدد تہذیبوں کی سرگزشتوں میں جنگ و صلح کے دوروں کا ایک خاص باقاعدگی کے ساتھ وقوع -

(د) تہذیبوں کا انحلال : اجتماع اور پس پائی کے تبادلوں کی باقاعدگی اور ان کی توضیح -

(ہ) تہذیبوں کا نشو و ارتقا: جس باقاعدگی کا سراغ ہم نے تہذیبوں کی شکست انحلال میں لگایا ، وہ یہاں ناپید ہے۔

(و) تقدیر کے روبرو کوئی ہتھیار کام نہیں دیتا: ایک رجحان کو کسی ایک موقع یا دوسرے موقع پر مزاحمت سے سابقہ پڑے تو بعض اوقات وہ استقامت کی بناء پر آخر کار کام یاب ہو جاتا ہے۔ اس کی مزید مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

۲- تاریخ میں قانون قدرت کے رواج کی ممکن توضیح : جو یک سانیاں ہم نے دریافت کی ہیں ، ممکن ہے وہ ان قوانین کا نتیجہ ہوں جو انسان کے غیر انسانی ماحول میں جاری ہیں یا ان قوانین کا نتیجہ ہوں جو انسان کی نفسیاتی ترکیب میں مضمر ہیں ، ان متبادل صورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشینی صنعت کاری میں انسان نے جتنی ترقی کی ، غیر انسانی قدرت کے قوانین پر اس کا انحصار گھٹتا گیا۔ انسانی نسلوں کے توارث کی خاص اہمیت۔ تین نسلوں کے اندر ذہنی عادات میں مختلف اقسام کے تغیرات ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد تحت الشعور نفس کے قوانین پر غور کیا گیا جن کے بارے میں ماہرین نفسیات نے تحقیق کا ابھی آغاز کیا ہے۔ تاریخ پر ان کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔

۳- جو قوانین قدرت تاریخ میں جاری ہیں ، کیا وہ اٹل ہیں یا انہیں ضبط میں لایا جا سکتا ہے؟ غیر انسانی قدرت کے قوانین کو انسان بدل نہیں سکتا البتہ اپنے مقاصد کے لیے ان سے کام لے سکتا ہے۔ جو قوانین خود انسانی فطرت پر اثرانداز ہوتے ہیں ، ان کے بارے میں محتاط جواب درکار ہے۔ نتیجے کا انحصار انسانوں کے باہمی تعلقات پر نہیں بلکہ خدا کے ساتھ انسان کے تعلقات پر ہے جو اس کا نجات دہندہ بھی ہے۔

۳۷- قوانین قدرت سے انسانی فطرت کا انحراف

اس انحراف کی توضیح دعوت مقابلہ اور جواب کی متعدد مثالوں سے کی گئی ہے۔ جب انسان کو دعوت مقابلہ پیش آجائے تو وہ خاص حدود کے اندر تغیر کی رفتار بدلنے میں آزاد ہوتا ہے۔

۳۸- قانون الٰہی

انسان صرف قانون قدرت کے ماتحت نہیں رہتا بلکہ خدا کا قانون بھی

اس پر حاوی ہے جو کامل آزادی ہے۔ خدا اور اس کے قانون کے مختلف نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بارھواں حصہ

مغربی تہذیب کے متعلق امیدوں کا نقشہ

۳۹- زیر غور تحقیق کی ضرورت

یہ تحقیق اس نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانے کا نشان ہے جو تاریخ سے شناسا تہذیبوں کے بارے میں غور و بحث کے متعلق اس کتاب میں اب تک قائم رہا۔ اس نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانے کو اس بناء پر حق بہ جانب ثابت کیا گیا ہے کہ زندہ معاشروں میں سے صرف مغربی معاشرہ ہے جو اب تک بدیہی طور پر معرض انحلال میں نہیں آیا؛ وہ بعض اعتبارات سے عالم گیر بن چکا ہے اور اس کی امیدوں کا نقشہ در اصل مغربی طور طریقے اختیار کرنے والی دنیا کی امیدوں کا نقشہ ہے۔

۴۰- قیاسی جوابات کی غیر فیصلہ کن حیثیت

نیم سائنٹیفک بنیادوں پر یہ فرض کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ دوسری تہذیبیں تباہ ہو گئیں یا تباہ ہو رہی ہیں لہٰذا مغربی تہذیب کے لیے بھی یہ راستہ ناگزیر ہے۔ جذباتی رد عمل ——— عہد وکٹوریا کی رجائیت اور شپینگلر کی قنوطیت ——— دونوں بہ لحاظ شہادت قوت سے عاری ہیں۔

۴۱- تہذیبوں کی سرگزشتوں کی شہادت

۱- غیر مغربی نمونوں کے ساتھ مغرب کے تجربے: ہم شکستوں اور انحلالات کے بارے میں جو چھان بین کر چکے ہیں، اس سے پیش نظر مسئلے

پر کیا روشنی پڑتی ہے ؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنگ اور عسکریت معاشروں کی شکست کا سب سے قوی سبب بنے رہے ہیں ۔ مغرب نے تاحال اس بیماری کے روک تھام کے لیے جو جد و جہد کی ، اس میں کام یابی نہیں ہوئی البتہ دوسرے دائروں میں وہ بے مثال کام یابی حاصل کر چکا ہے مثلاً غلامی کا خاتمہ ، جمہوریت اور تعلیم کا نشو و ارتقا ۔ مغربی معاشرے میں بھی مقتدر اقلیت ، نیز داخلی اور خارجی پرولتار کی خطرناک تقسیم کے آثار دکھائی دے رہے ہیں ۔ اس کے برعکس مغربیت مآب دنیا کے داخلی پرولتار کے مسائل افلاس کو حل کرنے کے لیے نمایاں کام یابی حاصل کی جا چکی ہے ۔

۲- مغرب کے بے مثال تجربات : مغربی معاشرے میں انسان نے غیر انسانی قدرت پر جو دسترس حاصل کر لی ، نیز اجتماعی تغیرات جس تیزی سے واقع ہوئے سابقہ تہذیبوں کی سرگزشتوں میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ آئندہ ابواب کا نقشہ پیش کیا گیا ہے ۔

۴۲- مشینی صنعت کاری ، جنگ اور حکومت

۱- تیسری عالمی جنگ کے امکانات : ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویٹ یونین کی خصوصیات اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق باقی عالم انسانیت کی روش ۔

۲- مستقبل کا عالمی نظام : عالم انسانیت کی امیدوں کا نقشہ پیش کرتے ہوئے ہیرڈھل کی کشتی ”کون ٹیکی“ کی مثال دی گئی ہے ، چٹانوں کے قریب پہنچ رہی ہے ۔ مستقبل کے عالمی نظام لازماً موجودہ انجمن اقوام متحدہ سے بہت مختلف ہوگا ۔ امریکیوں کے اوصاف قیادت پر بحث کی گئی ہے ۔

۴۳- مشینی صنعت کاری ، طبقاتی کش مکش اور روزگار

۱- نوعیت مسئلہ : دور حاضر کی مشینی صنعت کاری نے جو کام یابیاں حاصل کیں ، ان کے پیش نظر احتیاج سے آزادی کے مطالبے نے غیر معمولی حیثیت اختیار کر لی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا عالم انسانیت اس مطالبے کی تسکین کے لیے مطلوبہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہوگا !

۲- مشینی صنعت کاری اور انفرادی سعی و ہمت : دور جدید کی

صنعت کاری میں محض مشین ہی نہیں بلکہ تنظیم بھی ضروری ہوگی اور تنظیم محض ہاتھ سے کام کرنے والوں کی نہیں بلکہ ان کے آقاؤں کی بھی (صنعتوں کو قومی بنانا وغیرہ)، نیز سول سروس (سرخ فیتے) کی تنظیم اور سیاست دانوں کی تنظیم (جماعتی نظم و ضبط) ۔ مزدوروں کے وسائل مزاحمت (ٹریڈ یونینوں) میں مزید تنظیم کی ضرورت ۔ جن لوگوں نے صنعتی انقلاب بپا کیا، وہ غیر منظم معاشرے سے اٹھے تھے ۔

۳- اجتماعی یک آہنگی کے متبادل طرق رسائی: امریکی، روسی اور مغربی یورپ خصوصاً برطانیہ کے طرق رسائی کا تجزیہ اور مقابلہ ۔

۴- مجلسی انصاف کے ممکن مصارف: شخصی آزادی اور مجلسی انصاف دونوں کو کسی نہ کسی حد تک قائم رکھے بغیر مجلسی زندگی کے لیے کوئی امکان باقی نہیں رہتا ۔ صنعت کاری نے ترازو کا پلڑا آخر الذکر (مجلسی انصاف) کی طرف جھکا دیا ہے ۔ جب انسدادی ادویہ کے استعمال سے شرح موت بہت گھٹ جائے گی تو بچے پیدا کرنے کے سلسلے میں بے روک ٹوک شخصی آزادی کے نتائج کیا ہوں گے؟ ایسے حالات میں جس بڑے قحط کا خطرہ درپیش ہے، اس پر بحث کی گئی ہے، نیز بتایا گیا ہے کہ اس سے کیا کیا کشمکشیں پیدا ہو سکتی ہیں ۔

۵- کیا بعد ازاں دائمی خوشی کی زندگی بسر ہوگی؟ فرض کرو کہ دنیا کا معاشرہ ان مسائل کے حل میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو کیا اس کے بعد عالم انسانیت دائمی خوشی کی زندگی بسر کرے گا؟ اس کا جواب نفی میں ہے اس لیے کہ جو بچہ دنیا میں قدم رکھتا ہے، وہ اپنے ساتھ پہلے گناہ کو بھی لے آتا ہے ۔

تیرھواں حصہ

خاتمۂ سخن

۴۴- یہ کتاب کیوں کر تصنیف ہوئی

راقم الحروف عہد وکٹوریا کی رجائیت کے آخری دور میں پیدا ہوا ۔

شباب کے ابتدائی دور میں اسے پہلی عالمی جنگ سے سابقہ پڑا ۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے معاشرے کے تجربے اور یونانی معاشرے کے تجربے کی یک سانی سے متاثر ہوا جس کے مطالعے نے اس کی تعلیم کے لیے بنیاد مہیا کی تھی ۔ اس سے اس کے دل میں مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوئے :

۱- تہذیبیں کیوں مرتی ہیں ۔

۲- کیا دور جدید کی مغربی تہذیب کے لیے یونانی تہذیب ہی کا انجام مقدر ہے ؟

ان سوالات پر غور کے سلسلے میں اس نے دوسری معلوم تہذیبوں کی شکستوں اور انحلالات کو بھی اپنی تحقیق کے دائرے میں شامل کر لیا تاکہ اصل سوالات پر روشنی ڈالنے کے لیے مزید شہادتیں مل جائیں ؛ آخر میں اس نے تہذیبوں کی پیدائش اور نشو و ارتقا کے متعلق تحقیقات شروع کی ۔ اس طرح وہ کتاب مرتب ہو گئی جس کا نام مطالعۂ تاریخ ہے ۔

GLOSSARY

اس میں وہ الفاظ شامل نہیں کیے گئے جو پہلی جلد کے آخر میں درج ہو چکے ہیں

Accumulation تراکم

Agnostic لا ادری

(وہ لوگ جن کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ خدا اور دوسرے غیر مادی معاملات کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں) -

Aniconism بت پرستی

Anthropology علم الانسان ، بشریات

Anthropomorphic تشبیہی

Antiquary محقق عہد قدیم

Antinomianism انکار قانون اخلاق

Approuch طریق رسائی

Archipelago مجمع الجزائر

Bibliolatry بائیبل پرستی

Binocular دو چشمی دور بین

Black-letter day یوم ماتم

Caesura وقف شعر

Centrifugal مرکز گریز

Common law قانون رواج

Concatenation سلسلہ بندی

Conducivity ناقلیت

Cornucopia افراط مال

Covenant میثاق

Curiosity شوق تجسس

Decalogue احکام عشرہ

Demograghy اعداد پیدائش و مرگ

Determinist جبری

Dimensions ابعاد

Dogmatsim ادعائیت

Elemental بنیادی ، بسیط

Epicurean لذتی

Equation مساوات

Etherealization تلطیف

Ex Nihilo عدم محض

Fertile Crescent ہلال زرخیز (عرب کا وہ ہلالی خطہ جو آباد ہے)

Gamut سرگم

Geocentric Theory مسئلۂ مرکزیت زمین

Geometrical progression سلسلۂ ہندسیہ

Hieroglyphy تصویری رسم الخط

Hypothesis تقدیر (وہ دعویٰ جو فرض کر لیا جائے)

Iconophiles حامیان بت پرستی

Iconophobes مخالفین بت پرستی

Ideogram تصوری رسم الخط

Incontinence نفس پرستی

Major-domo میر سامان

Malaise الجھن ، بدمزگی

Metamorphosis قلب ماہیت ، کایا پلٹ

Monophysite یعقوبی فرقہ

Multiplicity تعدد

Negative proposition قضیۂ سالبہ

Notation ترسیم اعداد

Palaestra ورزش گاہ

Parochial state علاقائی حکومتیں

Perjurative sense تحقیرآمیز انداز

Phonems صوتی رسم الخط

Plural Economy مجموعی اقتصادیات

Poles apart بعد المشرقین

Potentially بالقوہ

Precocious پیش رس

Promised Land ارض موعود

Procrustean operation عمل جبر و تشدد

(پروکرسٹس ایک مشہور ڈاکو تھا ، اس نے ایک چارپائی بنا رکھی تھی ، جس شخص کو پکڑتا ، اس پر لٹا دیتا ۔ اگر اس کے پاؤں چارپائی کے برابر نہ ہوتے تو اسے شکنجے میں کس دیتا ، اگر پاؤں چارپائی کی لمبائی سے باہر نکل جاتے تو کاٹ دیتا ۔ اس سے یہ محاورہ پیدا ہوا)

Ptolemaic system بطلیموسی نظام

Raison d'etre غائت وجود

Reformation تحریک اصلاح مذہب

Regression رجعت قہقری

Repetitiveness ترجیح تکرار

Role کردار ، کار منصبی

Sabbatarianism سبت پرستی

Sackers of the cities غارتگران بلاد

Savant عالم

Scepticism تشکک

Serviceability صلاحیت خدمت

Shibboleth شبلت ۔ کلمہ امتیاز

(یہ لفظ بائیبل سے لیا گیا ہے ۔ یہودیوں کے قبیلے افرائیمی کے لوگ 'ش' نہ بول سکتے تھے اور اس کی جگہ 'س' بولتے تھے۔ ان کے دشمن کہتے بولو ''شبلت'' ، وہ کہتے ''سبلت'' ، لٰہذا انھیں قتل کر دیتے ۔ اس طرح یہ لفظ امتیاز کے معنی میں استعمال ہونے لگا)

Spectre کابوس

Theodicy اثبات عدل الٰہی

Valhalla ولہلا ، قصر شہدا

Variety تنوع

Willy nilly طوعاً او کرھاً

[م جھنڈیر]

مطبوعات مجلس ترقیٔ ادب

۲ - نرسنگھ داس گارڈن ، کاب روڈ ، لاہور -

۱- 'تعارف جدید سیاسی نظریہ' ۲/۷۵
۲- 'غیب و شہود' ۳/۲۵
۳- 'مقدمۂ حکمت قرآن' ۱/۰۰
۴- 'فلسفۂ شریعت اسلام' ۵/۰۰
۵- 'نظام معاشرہ اور تعلیم' ۴/۰۰
۶- 'تعارف فلسفۂ جدید' ۲/۰۰
۷- 'فلسفۂ ہند و یونان' ۲/۰۰
۸- 'دولت اقوام'
جلد اول، دوم و سوم- فی جلد ۱۲/۰۰
۹- 'جمالیات'
(قرآن حکیم کی روشنی میں) ۴/۰۰
۱۰- 'مطالعۂ تاریخ' جلد اول ۱۰/۰۰
جلد دوم ۱۶/۰۰
۱۱- 'اسلام اور تحریک تجدد
مصر میں' ۵/۰۰
۱۲- 'مقدمۂ تاریخ سائنس'
حصہ اول و دوم فی جلد ۱۰/۰۰
۱۳- 'سائنس سب کے لیے'
حصہ اول و دوم فی جلد ۲۰/۰۰
۱۴- 'دولت مغلیہ کی ہیئت
مرکزی' ۱۲/۰۰
۱۵- 'نفسیات واردات روحانی' ۱۰/۰۰
۱۶- 'تاریخ اقوام عالم'
حصہ اول و دوم ۱۰/۰۰
۱۷- 'تشکیل انسانیت' ۵/۰۰
۱۸- 'حیات مجددؒ' ۵/۰۰
۱۹- 'شاہ جہان نامہ' (فارسی)
جلد اول ، دوم وسوم فی جلد ۵/۰۰
۲۰- 'قطبی برفستان' ۳/۰۰
۲۱- 'سیاسیات ارسطو' ۱۰/۰۰

۲۲- 'تاریخ بخارا' ۷/۰۰
۲۳- 'توزک جہان گیری' ۱۱/۰۰
۲۴- 'مقدمۂ تاریخ ادبیات عرب' ۵/۰۰
۲۵- 'میراث اسلام' ۹/۵۰
۲۶- 'اصول انتقاد ادبیات' ۹/۰۰
۲۷- 'مکتوبات سرسیدؒ' ۱۰/۰۰
۲۸- 'قدیم یونانی فلسفہ' ۶/۰۰
۲۹- 'مادام کیوری' ۱۰/۰۰
۳۰- 'مسلمانوں کی سیاسی تاریخ' ۱۰/۰۰
۳۱- 'سیاسی وثیقہ جات' ۵/۰۰
۳۲- 'عظما کے معاشی نظریات' ۶/۰۰
۳۳- 'سیاست نامہ' ۴/۵۰
۳۴- 'تنقیدات طٰہٰ حسین' ۴/۵۰
۳۵- 'مومن' ۵/۵۰
۳۶- 'اخلاقیات' ۳/۵۰
۳۷- 'دربار ملی' (فارسی) ۶/۰۰
۳۸- 'میراث ایران' ۱۵/۰۰
۳۹- 'نام ور مسلم سائنس دان'
سفید کاغذ پر ۶/۵۰
اخباری کاغذ پر ۴/۵۰
۴۰- 'نام ور مغربی سائنس دان'
(بیکن سے نیوٹن تک)
سفید کاغذ پر ۶/۵۰
اخباری کاغذ پر ۴/۵۰
۴۱- 'کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن' ۱/۷۵
۴۲- 'حکایات پنجاب' (۳ جلدیں)
فی جلد ۶/۰۰
۴۳- 'فرائڈ اور لاشعور' ۳/۰۰
۴۴- 'تاریخ جمالیات' ہر دو جلد ۳۱/۰۰
۴۵- 'ماہیت الامراض' پہلی جلد ۳۰/۰۰

زرین آرٹ پریس ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور -